شرح چہل حدیث

(چالیس حدیثیں)

مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینیؒ
بین الاقوامی امور

بسم الله الرحمن الرحیم

شرح چہل حدیث

(چالیس حدیثیں)

مؤسسه تنظیم ونشر آثار امام خمینیؒ
بین الاقوامی امور

خمینی، روح‌الله، رهبر انقلاب و بنیانگذار جمهوری اسلامی ایران، ۱۲۷۹ـــ۱۳۶۸.
شرح چهل حدیث (اردو) / مؤلف امام خمینی. [ویرایش ۲] ـــ تهران: مؤسسه تنظیم ونشر آثار امام خمینی (س)، ۱۳۷۶. ۷۶۸ ص.
ISBN: 964 - 335 - 244 - 7
فهرستنویسی بر اساس اطلاعات فیپا.
اردو. کتابنامه
۱. اربعین حدیث ـــ نقد وتفسیر. ۲. اربعینات ـــ قرن ۱۴. ۳. احادیث شیعه ـــ قرن ۱۴.
الف. مؤسسه تنظیم ونشر آثار امام خمینی (س) ـ معاونت امور بین‌الملل. ب. عنوان.
BP ۱۴۲/۹/ خ ۸ الف ۹۰۴۶   ۲۹۷ / ۲۱۸
کتابخانه ملی ایران   ۷۸ـ۱۱۴۶۱ م
کد / م ۶۷۳

شرح چہل حدیث

حضرت امام خمینیؒ (رضوان اللہ تعالیٰ علیہ)

ناشر: مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینیؒ ـ بین الاقوامی امور

پتہ: ایران تہران خیابان شہید باہنر خیابان یاسر خیابان سودہ / ۵
پوسٹ بکس: ۳۶۳ـ ۱۹۵۷۵   کوڈ: ۱۹۷۷۶

ٹیلی فون: ۵ ـ ۲۲۲۹۰۱۹۱   ۲۲۲۸۳۱۳۸   فیکس: ۲۲۲۹۰۴۷۸ (۰۰۹۸ ۲۱)

طبع سوم: ۱۴۲۹ھ ـ ۲۰۰۸ء

تعداد: ۱۵۰۰   قیمت: ۷۸۰۰۰ ریال

ای میل: international-dept@imam-khomeini.ir

(شرح چہل حدیث بزبان اردو)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین

والصلاۃ والسلام علیٰ خاتم الانبیاء والمرسلین

سیدنا محمد وآلہ المعصومین

واللعن الدائم علیٰ أعدائهم أجمعین

اما بعد:

حضرت خاتم المرسلین ؐ کی مشہور ومعروف حدیث ہے:

﴿من حفظ علیٰ امتي أربعین حدیثاً ینتفعون بها بعثه اللّٰه یوم القیامة فقیهاً عالماً﴾

جو شخص میری امت کیلئے ایسی چالیس حدیثیں حفظ کرے جن سے لوگ نفع اٹھائیں خدا اس کو قیامت میں عالم وفقیہ محشور کرے گا۔

چوتھی صدی ہجری سے علمائے شریعت نے ''اربعون حدیثاً'' (چالیس احادیث) کے نام سے احادیث کا مجموعہ لکھنا شروع کیا اور بہت سے علمانے اپنی منتخب کردہ چہل احادیث پر شرح اور تفسیری نوٹ بھی لکھے، پھر اربعینیات کا سلسلہ قائم ہو گیا اور وہ اربعینیات تالیف کرنے والوں کے ناموں سے مشہور ہو گئیں مثلاً ''اربعین شیخ بہائی ؒ'' وغیرہ۔

اس صدی میں بھی اربعین نامی کتابیں لکھی گئی ہوں گی۔ لیکن زیر نظر کتاب اربعین حدیث جس کو حضرت آیت اللہ العظمیٰ امام خمینی (طاب ثراہ) نے چالیس سال کی عمر میں تحریر فرمایا ہے، عجوبۂ روزگار ہے۔ کیونکہ اس کا مصنف نابغۂ دہر اور نوادر روزگار میں سے ہے۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ آپ پڑھتے چلے جایئے اور یہ کتاب آپ کے دل ودماغ پر قبضہ کرتی چلی جائے گی۔ کتاب کا نام پڑھے بغیر آپ کتاب کا

مطالعہ کریں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس کا مصنف ایک عارف کامل، مرشد اکمل اور فقیہ مسلم ہے۔

حدیث شریف میں ہے: ﴿الموعظة اذا خرجت من القلب دخلت فی القلب واذا خرجت من اللسان لم يتجاوز الآذان﴾ ''جب موعظہ دل سے نکلتا ہے تو دل میں داخل ہو جاتا ہے اور جب صرف زبان سے کہا جاتا ہے تو کانوں سے آگے نہیں بڑھتا''۔ اس کتاب کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مواعظ قلب سے نکلے ہیں۔

حضرت امام خمینی (طاب ثراہ) کا مخاطب اس کتاب میں کوئی مخصوص طبقہ نہیں ہے، بلکہ ہر شخص اس کا مخاطب ہے چاہے وہ عالم ہو یا جاہل، مؤمن ہو یا فاسق، بوڑھا ہو یا جوان، حکیم ہو یا عارف، فقیہ ہو یا اصولی بلکہ مسلمان ہو یا کافر!

اسی طرح اس کتاب میں صرف تشخیص مرض ہی نہیں ہے اس کا علاج بھی ہے اور اس میں علمی نکات، عرفانی لطائف، مکاشفات، معارف ربانی وغیرہ بھی ہیں۔ یہ کتاب کیا ہے ایک کوزہ ہے جس میں سمندر کو بند کر دیا گیا ہے۔

ایسی ہی چیزوں کیلئے کہا گیا ہے کہ" مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" بہر حال ہمارے ادارے کو فخر ہے کہ حضرت امام خمینی (طاب ثراہ) کی اس "سفر قیم" کو اردو زبان میں پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہے۔ اب ہم آپ کو زیادہ دیر تک کتاب سے الگ نہیں رکھنا چاہتے ہیں۔ آپ خود ہی کتاب کا مطالعہ فرمائیں اور اپنی رائے سے ادارے کو ضرور مطلع کریں تاکہ آپ کی رائے کی روشنی میں آئندہ اشاعتوں میں اصلاح کی جاسکے۔ ہمیں آپ کی ہر تعمیری تنقید اور تبصرہ قابل قبول ہوگا جو مخلصانہ ہو مغرضانہ نہ ہو۔

مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینیؒ

بین الاقوامی امور

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمد للہ رب العالمین
والصلاۃ علی محمد وآلہ أجمعین
ولعنۃ اللہ علی أعدائھم الی یوم الدین

خداوند دل کے آئینے کو نور اخلاص سے روشنی بخش دے اور لوح دل سے نفاق اور شرک کو دور کر دے۔ ہم صحرائے حیرت وضلالت کے بھٹکے ہوؤں کی شاہراہ سعادت ونجات کی طرف رہنمائی کر دے۔ہم کو اخلاق حسنہ سے متصف کر دے، اپنے مخصوص جلووں اور ان خاص نعمتوں میں سے جو تیرے مقربین بارگاہ کیلئے مخصوص ہیں کچھ ہمیں نصیب بھی ہو جائے۔ ہمارے دل کی مملکت سے جہالت وشیطان کی افواج کو باہر نکال دے اور ان کی جگہ علم وحکمت اور خدائے رحمان کی فوجوں کو مستقر فرما۔ہم کو اپنی اور اپنی بارگاہ کے مخصوص افراد کی محبت کے ساتھ اس دنیائے فانی سے اٹھا۔مرتے وقت اور مرنے کے بعد ہمارے ساتھ اپنی رحمت ہمارے شامل حال فرما۔محمد وآل محمد ﷺ کے طفیل میں ہماری عاقبت بخیر فرما۔

اما بعد:

یہ بندۂ ناچیز وضعیف ایک مدت سے یہ سوچ رہا تھا کہ اہل بیت عصمت وطہارت علیہم السلام کی ان احادیث میں سے جو اصحاب ائمہؑ اور علمائے کرام (رضوان اللہ علیہم) کی معتبر کتابوں میں درج ہیں، چالیس حدیثوں کو اکٹھا کر کے ان کی ایسی تشریح کروں جو عوام الناس کے استفادے کیلئے مناسب ہو اور اسی لیے میں نے ان حدیثوں کو فارسی زبان میں تحریر کیا تا کہ فارسی بولنے والے اس سے فائدہ حاصل کر سکیں۔

انشاءاللہ میں (بھی) حضرت خاتم الانبیاء ﷺ کی حدیث شریف کا مصداق بن سکوں۔ چنانچہ

(۱۰)... چهل حدیث

آنحضرتؐ نے فرمایا ہے:

﴿مَنْ حَفِظَ عَلَى أُمَّتِي أَرْبَعِينَ حَدِيثاً يَنْتَفِعُونَ بِهَا بَعَثَهُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَقِيهاً عَالِماً﴾[1]

''جو شخص میری امت کے استفادے کیلئے چالیس احادیث یاد کرلے خدا اسے قیامت کے دن فقیہ اور عالم محشور کرے گا'' چنانچہ خدا کے فضل وکرم سے مجھے اس کام کے آغاز کی توفیق حاصل ہوئی اور خداوند متعال سے میری دعا ہے کہ اس کے خاتمے کی توفیق بھی مجھے عطا کرے۔ بے شک خدا ہی توفیق عطا کرنے والا ہے۔

۱۔ اس روایت کا متن نبی کریمؐ اور ائمہ اطہار علیہم السلام سے مختلف تعبیروں کے ساتھ نقل ہوا ہے۔

علامہ مجلسی بحار الانوار ج ۲ ص ۱۵۹ پر اسی روایت کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں:

یہ حدیث سنی و شیعہ کے درمیان مشہور و مستفیض ہے، بلکہ کہا گیا ہے کہ یہ متواتر احادیث میں سے ہے۔

اس حدیث کی چند اسناد اس طرح ہیں:

خصال، ج ۲، باب الاربعین، حدیث نمبر ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹۔

الاختصاص ص ۲۔

عیون اخبار الرضا، ج ۲ ص ۳۷۔

بحار الانوار، ج ۲ ص ۱۵۳ تا ۱۵۷۔

صحیفہ امام رضاؑ، ص ۲۵، حدیث ۱۱۴۔

پهلی حدیث

اخبرني اجازة مكاتبةً ومشافهةً عدة من المشايخ العظام، والثقاة الكرام منهم:

الشيخ العلامة المتكلم، الفقيه الأصولي الأديب المتبحر الشيخ محمّد رضا آل العلامة الوفي الشيخ محمّد تقي الأصفهاني ٢ أدام الله توفيقه حين تشرفه بقم المشرفة.

والشيخ العالم الجليل المتعبد الثقة الثبت الحاج الشيخ عباس القمي ٣ دام توفيقه.

وكلاهما عن المولى العالم الزاهد العابد الفقيه المحدث الميرزا حسين النوري ٤ نوّر الله مرقده الشريف عن العلامة الشيخ مرتضى الأنصاري ٥.

ومنهم السيد السند الفقيه المتكلم الثقة الثبت العلامة السيد محسن الأمين العاملي ٦ أدام الله تأييداته، عن الفقيه العلامة صاحب المصنفات العديدة السيد محمّد بن هاشم الموسوي الرضوي الهندي ٧ المجاور في النجف الأشرف حياً وميتاً (قدس الله سره)، عن العلامة الأنصاري. ومنهم العالم الثقة الثبت السيد أبو القاسم الدهكردي الأصفهاني ٨، عن السيد السند الأمجد الميرزا محمّد هاشم الأصفهاني ٩ (قدس سره)، عن العلامة الأنصاري.

ولنا طرق أخرى غير منتهية الى الشيخ تركناها، عن المولى الأفضل أحمد النراقي ١٠، عن السيد مهدي الملقب بـ"بحر العلوم" صاحب الكرامات ١١ (رضوان الله عليه)، عن أستاذ الكل الآقا محمّد باقر البهبهاني ١٢، عن والده الأكمل محمّد أكمل ١٣، عن المولى محمّد باقر المجلسي ١٤، عن والده المحقّق المولى محمّد تقي المجلسي ١٥، عن الشيخ المحقّق البهائي ١٦، عن والده الشيخ حسين ١٧، عن الشيخ زين الدين الشهير بـ"الشهيد الثاني" ١٨، عن الشيخ علي بن عبد العالي الميسي ١٩، عن الشيخ شمس الدين محمّد ابن المؤذن

الجزيني ٢٠، عن الشيخ ضياء الدين علي ٢١، عن والده الحائز للمرتبتين الشيخ شمس الدين محمّد بن مكي ٢٢، عن الشيخ أبي طالب محمّد فخر المحققين ٢٣، عن والده آية الله الحسن بن مطهر العلامة الحلي ٢٤، عن الشيخ أبي القاسم جعفر بن الحسن بن سعيد الحلي المحقّق على الاطلاق ٢٥، عن السيد أبي علي فخار بن معد الموسوي ٢٦، عن الشيخ شاذان بن جبرئيل القمي ٢٧، عن الشيخ محمّد بن أبي القاسم الطبري ٢٨، عن الشيخ أبي علي الحسن ٢٩، عن والده شيخ الطائفة، أبي جعفر محمّد بن الحسن الطوسي ٣٠، (رحمه الله)، جامع "التهذيب والاستبصار" عن امام الفقهاء والمتكلمين، الشيخ أبي عبدالله محمّد بن النعمان "الشيخ المفيد" ٣١، عن شيخه رئيس المحدثين الشيخ أبي جعفر محمّد بن علي بن الحسين بن موسى بن بابويه القمي ٣٢، صاحب كتاب "من لا يحضره الفقيه"، عن الشيخ أبي القاسم جعفر بن قولويه ٣٣، عن الشيخ الأجل ثقة الاسلام محمّد بن يعقوب الكليني ٣٤ صاحب "الكافي"، عن علي بن ابراهيم ٣٥، عن أبيه ٣٦، عن النوفلي ٣٧، عن السكوني ٣٨، عن ابي عبد الله (الامام جعفر الصادق عليه السلام)

﴿انَّ النَّبِيَّ ﷺ، بَعَثَ سَرِيَّةً، فَلَمَّا رَجَعُوا، قَالَ مَرْحَباً بِقَوْمٍ قَضَوُا الْجِهَادَ الأَصْغَرَ وَبَقِيَ عَلَيْهِمُ الْجِهَادُ الأَكْبَرُ!

فَقِيلَ يَا رَسُولَ اللهِ وَمَا الْجِهَادُ الأَكْبَرُ؟ قَالَ جِهَادُ النَّفْسِ﴾ ٣٩

ترجمہ: سکونی نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے

آنحضرت ﷺ نے ایک "سریہ" کو جنگ کیلئے روانہ فرمایا۔ جب وہ لوگ واپس آئے تو آنحضرتؐ نے فرمایا کیا کہنا اس قوم کا جس نے جہاد اصغر تو پورا کر لیا لیکن ابھی جہاد اکبر باقی ہے۔

پوچھا گیا یا رسول اللہ! جہاد اکبر کیا ہے؟ فرمایا نفس سے جہاد کرنا۔

شرح: "سریہ" فوج کے ایک دستے کو کہا جاتا ہے اور بہترین سریہ وہ فوجی دستہ ہے جو چار سو افراد پر مشتمل ہو ۴۰ باقی روایت کے الفاظ معلوم ہیں۔

جان لو! انسان ہی وہ عجوبہ ہے جس کی دو زندگیاں اور دو کائنات ہیں۔

۱۔ بدن! اسی کو حیات و مقام ظاہری دنیوی کہا جاتا ہے۔

۲۔ نفس! اس کو حیات و مقام باطنی غیبی ملکوتی کہا جاتا ہے۔

انسانی نفس کا تعلق عالم غیب وملکوت سے ہوتا ہے اور اس کے متعدد درجات و مقامات ہیں

۱۔ کبھی ان کی تقسیم سات حصوں میں کی گئی ہے۔[۱]

۲۔ کبھی ان کی تقسیم چار حصوں میں کی گئی ہے۔[۲]

۳۔ کبھی ان کی تقسیم تین حصوں میں کی گئی ہے۔[۳]

۴۔ کبھی ان کی تقسیم دو حصوں میں کی گئی ہے۔[۴]

تمام درجات و مقامات کے دو قسم کے لشکر ہیں

۱۔ لشکر رحمانی وعقلائی اس لشکر کا کام یہ ہے کہ وہ انسان کو ملکوت اعلیٰ کی طرف لے جاتا ہے اور نیکی کے راستے پر لگاتا ہے۔

۲۔ لشکر جہالت وشیطانی یہ انسان کو عالم سفلی کی طرف گھسیٹتا ہے اور شقاوت وبدبختی کی طرف دعوت دیتا ہے۔

یہ دونوں لشکر ہمیشہ برسرپیکار رہتے ہیں اور ان کا میدان کارزار خود انسانی ذات ہوتی ہے۔ اگر رحمانی لشکر غالب آگیا تو انسان سعید وخوشبخت اور رحمت پانے والا اور صف ملائکہ میں شامل ہو جاتا ہے اور اس کا شمار انبیاء واولیاء وصالحین میں ہونے لگتا ہے۔ لیکن اگر جہالت وشیطانی لشکر غالب آجائے تو انسان شقی اور اہل غضب میں شمار ہونے لگتا ہے اور وہ شیاطین، کفار اور خدا کی رحمت سے محروم ہونے والوں کے زمرے میں محشور ہوتا ہے۔

چونکہ اس کتاب میں تفصیل کی گنجائش نہیں ہے اس لیے نفس کے بعض مقامات کی طرف اشارہ کرکے اس کے اسباب سعادت وشقاوت کا ذکر کرتے ہوئے انشاء اللہ ”جہاد نفس“ کی کیفیت کو بیان کریں گے۔

مقام اول

اس میں چند فصلیں ہیں:

پہلی فصل: نفس کے مقام اول

جان لو کہ نفس کا پہلا مقام اور نچلی منزل اس کی ظاہری دنیا ہے جس پر اس کو تسلط حاصل ہے، چنانچہ

انسان کے محسوس ہونے والے بدن اور ظاہری ڈھانچے پر اس کی غیبی روشنی کی شعاعیں چمکنے لگتی ہیں اور اس کو ظاہری زندگی عطا کرتی ہیں اور اس جسم میں لشکر بندی کرتی ہیں۔ نفس کا میدان جنگ بھی یہی بدن ہے اور اسی بدن کی ظاہری قوتیں نفس کے لشکر ہیں اور وہ لشکر نفس کی زیر تسلط سات اقلیموں ''کان، آنکھ، زبان، پیٹ، شرمگاہ، ہاتھ اور پاؤں'' میں پھیلا ہوا ہے اور مقام وہم میں ان ساتوں ملکوں میں پھیلی ہوئی تمام طاقتیں نفس کے زیر تصرف ہیں، کیونکہ نفس کی تمام باطنی وظاہری قوتوں کا بادشاہ بھی وہم ہے۔

اب اگر وہم خود ان ممالک پر حکومت کرے یا شیطان کے ذریعہ ان قوتوں پر تصرف کرے تو ساری قوتیں شیطانی فوج بن جاتی ہیں اور پورے ملک جسم پر شیطان کی حکومت قائم ہو جاتی ہے۔ رحمانی لشکر اور عقل کی فوج کمزور ہو کر شکست کھا جاتی اور انسان کی دنیا سے اپنا بوریا بستر سمیٹ کر چل دیتی ہے اور پورے ملک پر شیطان کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر وہم عقل وشرع کی نگرانی میں ساتوں قوتوں پر تصرف کرے اور ان فوجوں کی نقل وحرکت، نظام عقل وشرع کی پابند ہو تو مملکت جسم رحمانی ہوتی ہے اور شیطان اور اس کا لشکر وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔

لہذا ''جہاد نفس'' عظیم جہاد ہے، اور راہ خدا میں قتل ہونے سے بالاتر ہے اور یہاں اس سے مراد انسان کا اپنی ظاہری قوتوں پر غلبہ حاصل کرنے، ان کو حکم خالق کے مطابق چلانے اور مملکت جسم کو شیطان اور اس کی فوجوں سے خالی کر دینے کا نام ہے۔

دوسری فصل: غور و فکر

یہ بھی جان لو! ''جہاد نفس'' اور حرکت الی اللہ کی پہلی شرط ''غور وفکر'' ہے۔ اگرچہ بعض علمائے اخلاق نے اس کو ابتدائی شرائط کے پانچویں ۵ویں درجے میں رکھا ہے، اور اپنی جگہ پر یہ بھی صحیح ہے۔

یہاں پر غور وفکر سے مراد یہ ہے کہ انسان ۲۴ گھنٹوں میں چاہے تھوڑی ہی دیر کیلئے ہو، یہ سوچے کہ جس خدا نے اس کو اس دنیا میں پیدا کیا ہے، تمام راحت وآرام کے اسباب اس کیلئے مہیا کئے ہیں، اس کو صحیح وسالم بدن بخشا ہے، اس بدن کو ایسی طاقتیں مرحمت فرمائی ہیں کہ ان میں سے ہر قوت نفع بخش ہے اور جن سے عقل حیران ہے، اور اس کیلئے نعمت ورحمت کی بساط بچھائی ہے اور دوسری طرف سے یہ بھی سوچے کہ اسی خدا نے ہم لوگوں کیلئے اتنے انبیاء بھیجے، کتابیں نازل کیں، ہماری ہدایت کا انتظام کیا ہے۔ پس مالک الملوک خد

کے سامنے ہمارا فریضہ کیا ہے؟

کیا یہ تمام نعمتیں صرف شہوت پرستی اور حیوانی خواہشات کی تکمیل کیلئے ہیں کہ جس میں ہم دوسرے تمام حیوانات کے ساتھ شریک ہیں یا ان کا کچھ اور بھی مقصد ہے؟

انبیائے کرامؑ، اولیائے عظام، ہر قوم وملت کے علمائے اعلام جو لوگوں کو عقل و شرع کے قانون کی دعوت دیتے تھے، شہوت پرستی اور دنیائے فانی سے پرہیز کرنے کی تاکید کرتے تھے، کیا یہ سب لوگوں سے دشمنی رکھتے تھے اور لوگوں کے اب بھی دشمن ہیں؟ یا ہم جیسے لوگوں کی اصلاح سے واقف نہیں ہیں جو دنیا کی خواہشات میں غرق ہیں؟!

ایک عقلمند انسان اگر تھوڑی دیر بھی غور وفکر کرے تو وہ سمجھ لے گا کہ اس زندگی کا مقصد کچھ اور ہے۔ اس خلقت کا مقصد اس عالم (دنیا) سے بالاتر عالم ہے اور یہ حیوانی زندگی بالذات مقصود نہیں ہے۔ عاقل انسان کو اپنی فکر کرنی چاہئے اور اپنی بیچارگی پر رحم کھانا چاہئے۔

اس کو اپنے نفس سے خطاب کرکے کہنا چاہئے: اے سرکش نفس! بہت دنوں سے تک خواہشات کے پیچھے تو نے اپنی عمر کو برباد کیا اور سوائے حسرت و افسوس کے کچھ تیرے ہاتھ نہ آیا۔ کتنا اچھا ہوتا کہ تم اپنی حالت پر کچھ رحم کھاتے، مالک الملوک سے شرم کرتے، اصل مقصد کے حصول کی راہ میں دو چار قدم آگے بڑھاتے جو حیات دائمی و سعادت ابدی کا سبب ہے۔ ابدی سعادت کو چند روزہ فانی خواہشات کے بدلے میں نہ بیچ، کیونکہ بے پناہ زحمتوں کے بعد بھی وہ تیرے ہاتھ آنے والی نہیں ہے۔ گزشتہ زمانوں سے لے کر آج تک کے دنیا پرست لوگوں کے بارے میں تھوڑا سا غور کر کہ ان کے رنج وغم اور زحمتیں ان کی راحتوں کے مقابلے میں کتنی زیادہ تھیں جبکہ ہر شخص کیلئے راحت وخوشی کا میسر ہونا ممکن نہیں ہے۔ جو شخص انسان کی صورت میں شیطان کا نمائندہ ہے اور شیطانی فوج کا سپاہی ہے جس کو شیطان نے اس لئے بھیجا ہے تاکہ تمہیں اپنی خواہشات کی تکمیل کی دعوت دے، وہ کہتا ہے دنیا کی مادی ضرورتوں کو پورا کرو، لیکن خود اس کے بارے میں ذرا سوچو اور اس سے پوچھو کہ کیا وہ اپنی موجودہ حالت سے راضی ہے یا وہ خود تو مبتلا ہے اب کیا وہ دوسرے کو بھی اس میں مبتلا کرنا چاہتا ہے؟!

بہر حال اپنے خدا سے دعا کرو، گریہ وزاری و عاجزی سے تمنا کرو کہ تم کو تمہاری ان ذمہ داریوں سے آشنا کردے جو تمہارے اور اس کے مابین مقرر ہیں۔

میں امید کرتا ہوں کہ یہ غور وفکر جو شیطان ونفس امارہ سے مقابلے کی خاطر ہے، تمہارے لیے دوسری زندگی پیدا کر دے گا اور اس مقابلے سے تمہیں دوسری منزل کی توفیق نصیب ہوگی۔

تیسری فصل: عـــزم و ارادہ

انسان مجاہد کیلئے تفکر کے بعد جو دوسری منزل پیش آتی ہے اس کا نام ''عزم وارادہ'' ہے۔ لیکن یہ ارادے سے علیحدہ ہے۔ جس کو شیخ الرئیس (بو علی سینا)[26] نے اپنی کتاب ''اشارات'' میں عارفین کا سب سے پہلا درجہ قرار دیا ہے۔[27]

ہمارے بعض مشائخ (اطال اللہ عمرہم) نے فرمایا عزم انسانیت کا جوہر اور انسان کیلئے میزان امتیاز ہے۔ انسان کے درجات کا فرق، عزم کے تفاوت کے اعتبار سے ہوا کرتا ہے۔

یہاں پر عزم سے مراد یہ ہے کہ انسان پختہ ارادہ کرلے کہ معصیت کا ارتکاب نہیں کرے گا اور کسی واجب کو ترک نہیں کرے گا اور زندگی میں جو واجب چھوٹ گیا ہے یا معصیت ہوگئی ہے اس کا ازالہ کرے گا، یعنی اپنی ظاہری حالت وصورت سے اپنے کو ایک ایسا شرعی وعقلی انسان بنالے گا کہ شرع اور عقل برحسب ظاہر دونوں فیصلہ کریں گے کہ یہ شخص انسان ہے اور انسان شرعی کا مطلب بھی یہی ہے کہ شریعت کے تقاضوں کے مطابق عمل کرے اور اس کا ظاہر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت حبیبہ کے مطابق ہو اور تمام افعال واعمال وحرکات وسکنات میں آنحضرتؐ کی پیروی کرے اور یہ بات ناممکن نہیں، بلکہ ممکن ہے، کیونکہ اپنے ظاہر کو آنحضرتؐ کے ظاہر کے مطابق ڈھالنا ہر بندۂ خدا کیلئے مقدور ہے۔

یہ بات سمجھ لیجئے کہ معارف الٰہی کا کوئی بھی راستہ ظاہر شریعت سے ابتدا کئے بغیر طے نہیں کیا جاسکتا اور جب تک انسان شریعت حقہ کے آداب کا پابند نہ ہو جائے کسی قسم کا اخلاق حسنہ حقیقت نہیں بن سکتا اور نہ ہی معرفت الٰہی کے نور کا اس کے دل میں جلوہ گر ہونا ممکن ہے اور نہ علم باطن واسرار شریعت کا انکشاف اس کیلئے ہوسکے گا، اگر اس کے دل میں حقیقت منکشف ہو بھی جائے اور انوار معارف ظاہر ہو بھی جائیں تو بھی دل ظاہری آداب سے مزین ہوگا۔ اسی لئے جن لوگوں نے دعویٰ کیا ہے کہ ''ترک ظاہر سے علم باطن حاصل ہوتا ہے'' ان کا یہ دعویٰ باطل ہے: یا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ ''باطن کے جلوہ گر ہوتے کے بعد آداب ظاہرہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی'' کیونکہ یہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ کہنے والا آداب بندگی اور مدارج انسانیت

سے ناواقف ہے۔ شاید میں ان صفحات میں بعض چیزوں کو بیان کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔

چوتھی فصل

اے عزیز! اس بات کی کوشش کرو کہ صاحب عزم و مالک ارادہ بن سکو، کیونکہ خدانخواستہ گر اس دنیا سے بے عزم کوچ کر گئے تو ایک بے مغز ظاہری انسان ہو گے اور اس عالم میں انسانی صورت میں محشور نہیں ہو سکو گے اس لئے کہ وہ عالم کشف باطن اور ظہور سریرہ کی جگہ ہے اور ارتکاب گناہ رفتہ رفتہ انسان کو بے عزم بنا دیتا ہے اور عزم جیسے شریف و قیمتی گوہر کو اس سے چھین لیتا ہے۔ میرے استاد معظم (دام ظلہ) فرماتے تھے ''گانے سننے سے سب سے زیادہ انسان کے عزم و ارادے سلب ہو جاتے ہیں''۔

لہذا میرے بھائی! گناہوں سے بچو اور خدا کی طرف ہجرت کرنے کا عزم (مصمم) کرو اور اپنے ظاہر کو انسان کے سانچے میں ڈھالو اور اپنے کو ارباب شرائع کی لڑی میں پرو دو اور تنہائی کی لمحات میں (گڑگڑا کر) اپنے خدا سے دعا کرو کہ وہ اس مقصد میں تمہاری مدد کرے۔ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اہل بیت علیہم السلام کو شفیع اور وسیلہ قرار دو کہ خدا تم کو توفیق عنایت فرمائے اور تمہارے سامنے جو کٹھن منزلیں ہیں ان میں مدد کرے، کیونکہ انسان اپنی زندگی میں بڑی لغزشوں کا مرتکب ہوتا ہے اور ممکن ہے ایک وقت ایسے ہلاکت کے گڑھے میں جا گرے جہاں اپنے لئے کوئی چارہ و تدبیر نہ کر سکے۔ بلکہ شاید چارہ جوئی کی سوچ بھی نہ کر سکے، شاید شفاعت کرنے والوں کی شفاعت بھی اس کے شامل حال نہ ہو سکے۔ اللہ ہمیں اس حالت سے محفوظ رکھے۔

پانچویں فصل

عہد، مراقبہ اور احتساب نفس

مجاہد کیلئے جو چیزیں ضروری ہیں ان میں عہد، مراقبہ اور احتساب نفس شامل ہیں۔

۱۔ عہد کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً پہلے دن ہی یہ عہد کرلے کہ آج میں خدا کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کروں گا اور اس بات کا عزم محکم کرلے۔ ظاہر ہے کہ ایک دن خلاف ورزی نہ کرنا بہت آسان ہے۔ انسان بہت آسانی کے ساتھ اس سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔

تم عزم مصمم کرو اور عہد کر و پھر تجربہ کر لو کہ یہ کتنا آسان ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شیطان اور اس کے چیلے اس

بات کو تمہارے لئے بہت بڑھا چڑھا کر پیش کریں۔ لیکن یہ صرف شیطانی دھوکہ ہے۔ اس پر دس سے حقیقی لعنت کرو اور باطل و بے ہودہ خیالات کو اپنے دل سے نکال دو۔ ایک دن تجربہ کر کے دیکھو اس وقت تم خود اس کی تصدیق کرو گے۔ اس کے بعد مراقبے کا مرحلہ آتا ہے

۲۔ مراقبہ اور مراقبے سے مراد یہ ہے کہ عہد کی پوری مدت میں اس پر عمل کی طرف پوری توجہ رکھو اور اپنے کو اس پر عمل کرنے کا پابند سمجھو، اگر خدا نخواستہ اس دوران تمہارے دل میں حکم خدا کے خلاف کچھ کرنے کا خیال پیدا ہو تو یقین کر لو کہ یہ شیطان اور اس کے جیسوں کا کام ہے جو تم کو اپنے عہد سے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں، ان شیطانوں پر لعنت کرو اور ان سے خدا کی پناہ مانگو اور اس باطل خیال کو دل سے نکال دو اور شیطان سے کہو میں نے آج کے دن اپنے آپ سے عہد کر لیا ہے کہ حکم خدا کی خلاف ورزی نہیں کرونگا۔ حالانکہ میرے ولی نعمت نے سالہا سال سے مجھے نعمت دی ہے۔ صحت و سلامتی اور امن و عافیت مرحمت فرمائی ہے اور ایسی ایسی کرم فرمائیاں کی ہیں کہ اگر میں ابد تک اس کی خدمت کرتا رہوں تب بھی اس کی نعمتوں میں سے ایک نعمت سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا کسی طرح مناسب نہیں ہے کہ میں ایک معمولی عہد کا پابند رہوں۔ امید ہے اس طرح شیطان بھاگ جائے گا اور اپنے ارادے سے منصرف ہو جائے گا انشاء اللہ اور رحمانی لشکر غالب آ جائے گا اور یہ مراقبہ تمہارے کسی کام سے مثلاً تجارت، سفر، حصول علم وغیرہ سے تضاد (بھی) نہیں رکھتا اسی طرح پورا دن گزار دو یہاں تک کہ رات کا وقت آ جائے جو محاسبۂ نفس کا وقت ہے۔

۳ محاسبہ اور محاسبۂ نفس کا مطلب ہے کہ اپنے نفس سے حساب لو کہ کیا تم نے اپنے خدا کے ساتھ جو عہد کیا تھا اس کو پورا کر دیا ہے؟ اس سلسلہ میں اپنے ولی نعمت سے کوئی معمولی سی بھی غداری تو نہیں کی؟

اگر پابند عہد رہے ہو تو اس توفیق پر خدا کا شکر ادا کرو اور یہ یقین کر لو کہ تم ایک قدم آگے بڑھ گئے ہو اور رضایت الٰہی حاصل کی ہے اور انشاء اللہ خدا دنیا و دین کی ترقی میں تمہاری راہنمائی کرے گا اور مستقبل میں آسانی ہوگی کچھ دنوں تک اسی طرح پابندی سے یہ عمل کرتے رہو تو امید ہے کہ تمہیں اس کی عادت ہو جائے گی پھر تمہارے لئے اس کام کو کرنے میں کوئی تکلیف نہ ہوگی، بلکہ آسانی ہوگی اور اسی دنیا میں گناہوں سے پرہیز اور حکم خدا کی اطاعت کا مزہ چکھ سکو گے۔ اگر چہ یہ دنیا دار جزا نہیں ہے مگر پھر بھی تم کو لذت حاصل ہوگی اور جزائے الٰہی تمہارے اندر اثر انداز ہوگی اور تم احساس لذت کرنے لگو گے

یہ بات اپنے ذہن میں ہمیشہ رکھو کہ خدا نے تم کو تمہاری طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دی ہے اور جو چیز

تمہارے بس میں نہیں اور تمہاری طاقت سے باہر ہے اس کا بوجھ تمہارے اوپر نہیں ڈالا۔ لیکن شیطان اور اس کے چیلے تمہارے سامنے کام کو مشکل کر کے پیش کرتے ہیں۔

اور اگر خدانخواستہ احتساب نفس کے وقت تم دیکھو کہ خدا سے کیے ہوئے عہد میں تم نے کچھ سستی برتی ہے کچھ خامی رہ گئی ہے تو اپنے خدا سے معافی مانگو اور یہ ٹھان لو کہ کل مردانہ وار پابند عہد رہوں گا۔ اسی طرح رہو یہاں تک کہ خدا سعادت و توفیق کے دروازے تمہارے لئے کھول دے اور تم کو انسانیت کے سیدھے راستے تک پہنچا دے۔

چھٹی فصل: (ذکر و) تذکر

شیطان اور نفس سے جہاد کرنے میں جو چیز انسان کی بہت زیادہ مدد کرتی ہے اور ایک سالک و مجاہد انسان کو جس کی پابندی کی بہت زیادہ ضرورت ہے وہ "تذکر" اور "ذکر" ہے۔ ہم اس مقام اول کو اسی تذکر و ذکر پر ختم کرتے ہیں، حالانکہ ابھی بہت سے مطالب باقی ہیں۔

خداوند عالم اور اس کی مرحمت کی ہوئی نعمتوں کو "یاد" کرنے کا نام "ذکر" ہے۔

یہ بات ذہن نشین کر لو کہ اپنے منعم کا احترام کرنا ایک فطری و عقلی بات ہے۔ جو انسان بھی اپنی کتاب ذات میں غور کرے گا وہ دیکھے گا کہ اس کتاب فطرت میں لکھا ہوا ہے جو شخص انسان کو نعمت دے اس کا احترام کرنا چاہئے، اور یہ بھی معلوم ہے کہ نعمت جتنی عظیم ہوگی اور انعام کرنے والا جس قدر بے غرض ہوگا فطرت کی نظر میں اس کا احترام اتنا ہی زیادہ ضروری اور زیادہ ہوگا

مثلاً ایک شخص تم کو ایک گھوڑا دیتا ہے اور اس کی نظر میں یہ ہے کہ اس نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، جبکہ ایک شخص پورا ایک دیہات بغیر احسان جتائے دے دیتا ہے تو دونوں کے احترام میں واضح فرق ہوگا۔ اسی طرح ایک ڈاکٹر تم کو اندھے پن سے نجات دے دیتا ہے تو فطرتاً اس کا احترام لازم ہے۔ لیکن اگر وہ موت سے بچا دے تو یقیناً تم اس کا احترام زیادہ کرو گے

اب ذرا تم خود غور کرو اور دیکھو کہ خداوند مالک الملوک نے کتنی ظاہری و باطنی نعمتیں ہم کو مرحمت فرمائی ہیں۔ اگر جن و انس مل کر بھی ان میں سے کوئی ایک نعمت ہم کو دینا چاہیں تو نہیں دے سکتے مگر افسوس ہم اس سے غافل ہیں۔ مثال کے طور پر یہ ہوا جس سے ہم لوگ دن رات فائدہ اٹھاتے ہیں اور ہماری (بلکہ)

ماحولیات میں پائی جانے والی تمام مخلوقات کی زندگی کا دارومدار اس سے وابستہ ہے، چنانچہ اگر یہ صرف ۱۵ منٹ منقطع ہوجائے تو کوئی حیوان زندہ نہیں رہ سکتا۔ کتنی عظیم نعمت ہے یہ کہ تمام جن وانس مل کر اس کی مانند کوئی چیز ہم کو نہیں دے سکتے۔

اسی طرح خدا کی دوسری نعمتوں کو یاد کرو جیسے بدن کی صحت، ظاہری قوتیں، منجملہ آنکھ، کان، قوت ذائقہ، قوت لامسہ یا باطنی قوتیں جیسے خیال، وہم، عقل وغیرہ کہ ان میں سے ہر ایک قوت کے اتنے فوائد ومنافع ہیں جن کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ ہمارے چاہے بغیر اور ہم پر احسان جتائے بغیر خدا نے ہم کو یہ ساری نعمتیں عطا کی ہیں۔ انہیں پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ اس نے انبیاء وپیغمبروں کو بھی بھیجا، کتابوں کا نازل فرمایا، سعادت وشقاوت اور جنت ودوزخ کا راستہ بھی ہم کو دکھایا، دنیا وآخرت میں ہم کو جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ ہم کو عطا فرمائیں جبکہ وہ ہماری اطاعت وعبادت کا محتاج نہیں ہے اور نہ ہماری اطاعت ومعصیت سے اس پر کوئی فرق پڑتا ہے، اس کے باوجود وہ صرف ہمارے مفاد کی خاطر وامر ونہی فرماتا ہے۔ ان نعمتوں پر اور ان جیسی ہزاروں ایسی نعمتوں پر جن کی جزئیات تو درکنار ان کی کلیات شمار کرنے سے انسان عاجز ہے۔ کیا آپ کی فطرت میں ایسے عظیم منعم کیلئے احترام ضروری نہیں ہے؟! اور ایسے ولی نعمت کے ساتھ غداری کرنا از روئے عقل کیسا ہے؟!

نیز جو بات فطرت میں درج اور اس کے عین مطابق ہے وہ ارفع واعلیٰ اور عظیم شخص کا احترام ہے۔ لوگ جو اہل دنیا اور دولتمندوں نیز سرکردہ افراد اور بادشاہوں کا احترام کرتے ہیں وہ صرف اس وجہ سے کہ ان کی نگاہوں میں وہ بڑے اور عظیم لوگ ہیں، اب کیا لوگوں کی بڑائی کا مقابلہ مالک الملوک کی عظمت وبڑائی سے کیا جاسکتا ہے؟ وہ صانع وخالق جس کی مخلوقات میں ہماری یہ دنیا حقیر ترین دنیا ہے اور خدا کی کائنات کا سب سے چھوٹا جزو ہے اس کے باوجود کسی مخلوق کی عقل اب تک اس مختصر عالم کا احاطہ نہ کرسکی، دوسری دنیاؤں کو جانے دیجئے! خود ہمارا یہ نظام شمسی جو دیگر شمسی نظاموں میں سب سے چھوٹا ہے اور ہمارا یہ سورج جو دیگر کرات کے بلے میں شمار کئے جانے کے بھی لائق نہیں ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے ماہرین فلکیات اب تک اس کا اندازہ نہیں لگا سکے ہیں۔ کیا فطرت عقل میں ایسا عظیم خدا جس نے ایک اشارے میں ان تمام دنیاؤں اور ہزاروں ہزار غیبی عوالم کو پیدا کردیا ہے، واجب الاحترام نہیں ہے؟!

ایک بات یہ بھی ہے کہ کتاب فطرت میں ہر وہ شخص جو سامنے ہو واجب الاحترام ہے۔ آپ دیکھئے

ہو نگے کے خدانخواستہ کوئی کسی کی بدگوئی کر رہا ہو اور وہ شخص آجائے تو برائی کرنے والا فطرتاً خاموش ہو جاتا ہے وراس کا احترام کرنے لگتا ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ خدا ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور تمام مخلوقات عالم کا انتظام اس کے تحت نظر ہوتا ہے، بلکہ تمام مخلوقات اس کے سامنے حاضر ہیں ،ور تمام عالم خدا کی بارگاہ میں حاضر ہے ۔اب تم غور کرو ا اے میرے خبیث نفس اگر تو اپنے عظیم خدا کی معصیت کرے کہ تیری توانائیاں بھی اس کی نعمت ہیں اور اس کی مقدس بارگاہ میں تو گناہ کرے تو یہ کتنا بڑا ظلم ہے اور کتنا عظیم گناہ ہے

اگر تم میں رائی کے دانے کے برابر بھی غیرت و حیا ہے تو کیا تم کو شرم سے پانی پانی نہیں ہو جانا چاہئے اور تم کو زمین میں دھنس نہیں جانا چاہئے؟ لہذا میرے عزیز! اپنے خدا کی عظمت کو یاد کرو اس کی احسانوں اور رحمتوں کو یاد کرو (نفس) اور اس کے حضور کو یاد کرو، اس کی نافرمانی چھوڑ دو، وراس عظیم جنگ میں شیطان ور اس کی فوج پر غالب آ جاؤ اپنی مملکت (نفس) کو رحمانی وحقانی مملکت بناؤ، پنی ذات کو شیطانی لشکر کی جگہ حق تعالیٰ کے لشکر کا مرکز قرار دو تا کہ خدا تم کو جہاد کے دوسرے مقام پر اور س سے بڑے میدان کارزار میں جو تم کو درپیش ہے، تمہاری مدد فرمائے اور وہ بڑا میدان کارزار عالم باطن کا جہاد نفس" اور نفس کا مقام دوئم ہے جس کی طرف ہم انشاء اللہ اشارہ کریں گے۔

ہم ایک بار پھر یاد دہانی کراتے ہیں کہ ہرگز اپنی ذات سے امیدیں وابستہ نہ رکھو کیونکہ خدا ے بزرگ و برتر کے علاوہ کوئی اور چارہ ساز نہیں ہے۔ خداوند عالم سے عجز و انکساری کے ساتھ توفیق کی دعا کرو کہ اس جہاد میں تمہاری مدد کرے تا کہ تم اس میں انشاء اللہ غالب آسکو اللہ ولي التوفيق۔

مقام دوئم

اس میں بھی چند فصلیں ہیں

پہلی فصل

نفس کے باطنی رحمانی وشیطانی لشکروں کی جنگ

جان لو کہ انسان کے نفس کا ایک اور ملک و مقام بھی ہے جو انسان کے باطن کی دنیا اور اس کی ملکوتی زندگی سے عبارت ہے۔ نفس کی قوتیں اس مملکت میں مملکت ظاہری نسبت زیادہ اور اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ رحمانی وشیطانی طاقتوں میں یہاں پر ٹکراؤ بہت زیادہ سخت ہوتا ہے۔ اس مملکت میں غلبے کی اہمیت

زیادہ ہوتی ہے، بلکہ مملکت ظاہر میں جو کچھ بھی ظاہر ہوتا ہے وہ باطن سے آکر مملکت ظاہر میں نمایاں ہوتا ہے۔ شیطانی یا رحمانی افواج میں سے جو بھی مملکت باطن میں غالب آتی ہے وہی مملکت ظاہر میں بھی غالب آتی ہے۔ سیر و سلوک اور اخلاقیات کے صاحب نظر مشائخ عظام کی نظر میں یہاں پر "جہاد نفس" کی زیادہ اہمیت ہے، بلکہ اس کو تمام انسانی سعادتوں، شقاوتوں، اعلیٰ انسانی اقدار اور پستیوں کا سرچشمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس جہاد میں انسان کو اپنی ذات کی طرف زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

خدانخواستہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مملکت باطن میں رحمانی قوتوں کی شکست اور ان کی جگہ خالی ہونے پر، نااہل وغاصب شیطانی قوتوں کے قبضہ ہو جانے پر انسان کیلئے ایسی دائمی ہلاکت مہیا ہو جائے جس کا ازالہ نہ کیا جا سکے اور شفاعت کرنے والوں کی شفاعت بھی اس کے شامل حال نہ ہو سکے اور خدانخواستہ خدائے "ارحم الراحمین" بھی اس کی طرف غیظ و غضب کی نگاہ ڈالے، بلکہ کہیں اس کے شفیع بھی اس کے دشمن نہ بن جائیں اور وائے ہو اس پر جس کے شفیع اس کے دشمن ہو جائیں! خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا کہ ایسی صورت میں کیسے عذاب ہونگے، کیسی تاریکیاں ہوں گی، کیسی سختیاں ہوں گی، کسی بدبختیاں ہوں گی جو صرف غضب الٰہی اور خدا کے مقرب بندوں کی دشمنی کا نتیجہ ہوں گی۔ جن کے مقابلے میں جہنم کی عظیم آگ، تھوہر کے پودے، سانپ، بچھو اس کے سامنے ہیچ ہوں گے۔ حکماء، عرفاء، اہل ریاضت و سلوک ان عذابوں کے بارے میں جو خبر دیتے ہیں خدا نہ کرے ہم ضعیفوں اور کمزوروں اور بے چاروں کے سر پر آ پڑے کیونکہ تمام وہ عذاب جس کا تم تصور کر سکتے ہو اس کے سامنے آسان ہے اور تمام جہنم جس کے بارے میں تم نے سنا ہے اس کے مقابلے میں رحمت و بہشت ہے۔

قرآن مجید اور انبیاء و اولیاء کی روایات میں جس، جنت و دوزخ کا وصف بیان کیا گیا ہے غالباً وہ اعمال کی جنت و دوزخ ہے، یعنی اس کو اچھے اور برے عمل کے جزا کیلئے مہیا کیا گیا ہے۔ اسی طرح اخلاق کے جنت و دوزخ کی طرف بھی مخفی اشارہ کیا گیا ہے اور اخلاق کے جنت و دوزخ کی اہمیت زیادہ ہے اور کبھی جنت لقاء اور جہنم فراق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو سب سے زیادہ اہم ہے۔ لیکن یہ سب باتیں در پردہ ہیں اور صرف حیثیت رکھنے والوں کیلئے ہیں۔ ہم اور تم اس کے اہل تو نہیں ہیں۔ لیکن ہمارے لئے اس کا انکار کرنا بھی مناسب نہیں ہے، بلکہ جو کچھ خداوند عالم نے اور اس کے اولیاء نے فرمایا ہے ہم کو ان پر ایمان رکھنا چاہئے اور ہو سکتا ہے یہ اجمالی ایمان بھی ہمارے لئے فائدہ مند ہو، بے جا انکار، بغیر جانے اور بغیر سمجھے

بوجھے بے موقع تردید بھی شاید ہمارے لئے کبھی بہت زیادہ نقصان دہ ہو۔ اس دنیا میں ان نقصانات کی طرف توجہ نہیں کی جاسکتی اور نہ یہ دنیا اس کیلئے ہے۔ مثلاً اگر تم سنو کہ فلاں حکیم یا فلاں ریاضت کرنے والے یا فلاں عارف نے کوئی بات کہی ہے اور وہ تمہارے ذوق اور مزاج کے مطابق نہیں ہے تو سنتے ہی نہ تو اس کو خیالی باتیں سمجھو اور نہ اسے باطل قرار دو۔ ہوسکتا ہے وہ بات کتاب وسنت اور عقل کی بنیاد پر کہی گئی ہو اور تمہاری اطلاع میں وہ بات نہ آسکی ہو۔ مثلاً ایک فقیہ دیت کے بارے میں ایک فتویٰ دیتا ہے جس سے آپ واقف نہیں ہیں اور آپ اس کی سند دیکھے بغیر اس کو مسترد کردو یا خدا کی طرف سفر کرنے والا ایک عارف الٰہی معارف الٰہیہ کے سلسلہ میں کوئی بات کہے یا بہشت و دوزخ کے بارے میں کوئی بات کہے اور آپ اس کی سند کو دیکھے بغیر اس کی بات کو رد کردو، تو یہ رد کرنا یا توہین کرنا یا کسی کی شان میں جسارت کرنا بہت آسان ہے۔ (اس لئے کہ تردید کرنے کیلئے کسی علم کی ضرورت نہیں ہے) ممکن ہے اس شخص کے پاس جو اس شعبے سے تعلق رکھتا ہے اور اس فن کا ماہر ہے ممکن ہے اس کے پاس کتاب خدا یا اخبار ائمہ ہدیٰ علیہم السلام سے ایک سند ہو جس کی اطلاع آپ کو نہ ہو۔ ایسی صورت میں آپ نے بغیر کسی معقول وجہ کے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تردید کردی ہے اور یہ کہہ دینا کہ "میرے ذوق کے اعتبار سے وہ بات درست نہیں تھی" یا "میرے علم میں یہ بات نہیں تھی" یا "اہل منبر سے میں نے اس کے برخلاف سنا تھا" ظاہر ہے کوئی معقول عذر نہیں ہے

بہر حال ہم اپنے مقصد سے دور نہ ہو جائیں۔ بہشت، خلائق وملکات کے بارے میں اولیاء نے جو کچھ کہا ہے اور خلائق و درجات جہنم کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے وہ ایسی (عظیم) مصیبت ہے جس کی ہم میں سننے کی بھی تاب وتوان نہیں ہے۔

پس اے عزیز! فکر کرو، کوئی چارہ جوئی کرو، اپنے لئے کوئی چھٹکارے کا ذریعہ اور نجات کا راستہ تلاش کرو۔ ارحم الراحمین خدا کی پناہ حاصل کرو، تاریک راتوں میں تضرع وزاری کے ساتھ اس ذات مقدس یکتا و بے ہمتا سے منت وسماجت کرو کہ اس "جہاد نفس" میں تمہاری مدد کرے تاکہ انشاء اللہ تم کو غلبہ حاصل ہو تاکہ تم اپنے وجود کی مملکت کو رحمانی سانچے میں ڈھال سکو، شیطانی فوج کو وہاں سے بھگاؤ اور منزل دل کو اس کے مالک کے حوالہ کردو تاکہ خداوند عالم تم کو سعادت، مسرت، رحمت عطا کرے۔ تم نے جنت وحور وقصور کے بارے میں جو کچھ سنا ہے وہ اس سعادت ورحمت کے مقابلہ میں کچھ بھی تو نہیں ہے۔ یہی خدا کی وہ عظیم سلطنت ہے جس کی خبر مت ہیں اور کے منتخب اولیاء نے دی ہے۔ یہ سلطنت ان تمام چیزوں سے بالاتر

ہے اس کے بارے میں نہ کسی کان نے سنا ہے نہ کسی آنکھ نے اس کو دیکھا ہے اور نہ کسی بشر کے دل میں اس کا خیال آیا ہے۔۴۸

دوسری فصل

بعض باطنی قوتیں

یہ بات جان لو کہ دست قدرت وحکمت الٰہی نے انسان کے عالم غیب اور باطن نفس میں ایسی قوتیں تخلیق فرمائی ہیں جن کے منافع بے شمار ہیں۔ یہاں پر ہم صرف تین قوتوں پر بحث کریں گے۔

ا۔ واہمہ ۲۔ غضبیہ ۳۔ شہویہ

خود ان قوتوں میں انسانی بقا اور فرد کی دنیا وآخرت کی تعمیر کے اعتبار سے بے انتہا فوائد ہیں جن کو علما نے ذکر کیا ہے۔ فی الحال ہمیں ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں پر ہم صرف اتنا بیان کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ تینوں قوتیں تمام اچھے برے ملکات کا سرچشمہ ہیں اور تمام ملکوتی غیبی صورتوں کا منبع ہیں

تفصیل

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کی اس دنیا میں ایک دنیوی ہیئت ہے اور خداوند عالم نے اس کو نہایت حسین انداز میں اور ایسی بے مثال ترتیب سے پیدا کیا ہے کہ تمام فلاسفہ اور بزرگوں کی عقل متحیر ہے اور انسانی عضو اور علم تشریح الابدان کے ماہرین اب تک اس کی صحیح معرفت نہیں حاصل کر سکے ہیں اور جس طرح خدا نے تمام مخلوقات کے درمیان انسان کو حسن ترکیب، حسن وجمال وظاہری خوبصورتی سے نوازا ہے اسی طرح موت کے بعد کے عالم میں خواہ وہ برزخ ہو یا قیامت کیلئے ایک ملکوتی وغیبی شکل وصورت معین کی ہے۔ البتہ یہ ملکوتی صورت اس کے نفس کے ملکات اور باطنی اخلاق کے تابع ہوتی ہے۔ (یعنی) اگر انسان کا باطن اس کی سیرت وملکہ انسانی ہوگا تو اس کی ملکوتی صورت بھی انسانی صورت پر ہوگی لیکن اگر اس کے ملکات غیر انسانی ملکات ہوں گے تو پھر اس کی صورت انسانی نہیں ہوگی بلکہ اسی ملکہ اور سیرت کے تابع ہوگی۔ مثلاً اگر اس کے باطن پر نفسانی اور حیوانی خواہشات کا غلبہ ہو تو اس کی باطنی مملکت پر بھی حیوانیت کا عنصر غالب آئے گا اور انسان کی ملکوتی صورت بھی کسی ایسے جانور کے مطابق ہوگی جو جانور اس کے اخلاق کے مطابق ہوگا اور اگر باطن پر غیظ وغضب اور درندگی کے صفت کا غلبہ ہوگا تو اس کے مملکت باطن کا حکم درندہ کا

حکم ہوگا اور اس کی ملکوتی وغیبی صورت کسی درندہ کے مناسب ہوگی اور اگر انسان پر وہم وگمان اور شیطانی صفات کا غلبہ ہو اور باطن پر شیطانی اقتدار غالب آجائیں جیسے مکروفریب، دھونس اور دھاندلی، چغلی اور غیبت وغیرہ تو اس کی ملکوتی صورت ان صفات سے موافقت رکھنے والے کسی شیطان کی صورت پر ہوگی۔

یہ بھی ممکن ہے کہ دو یا کئی صفات سے مرکب ہو کر انسان کی ملکوتی صورت تشکیل پائے۔ ایسی صورت میں انسان کی ملکوتی صورت کسی بھی حیوان کی شکل میں نہ ہوگی بلکہ ایسی عجیب وغریب اور وحشت ناک ہوگی جس کی اس عالم میں کوئی مثال نہیں ملے گی چنانچہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے ''قیامت میں کچھ لوگ ایسی شکل وصورت میں محشور ہوں گے جن کی شکل وصورت سے کہیں اچھی شکل بندروں اور گوریلوں [۴۹] کی ہوتی ہے'' بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس دنیا میں ایک شخص کی کئی صورتیں ہوں، کیونکہ وہ دنیا اس دنیا کی طرح نہیں ہے جو ایک صورت سے زیادہ کو قبول نہیں کرتی اور یہ بات دلیل وبرہان کے بھی مطابق ہے جو اپنی جگہ مذکور ہے۔

یہ بات جان لو کہ ان مختلف صورتوں میں جن میں ایک انسان ہے اور باقی دوسری چیزیں ہیں، انسان کی شکل وصورت کا دارومدار اسی کیفیت پر ہوتا ہے جب اس کی روح بدن سے نکلتی ہے اور برزخ کی حکومت شروع ہوتی ہے جو آخرت کی قلمرو کا آغاز ہے اور روح جس انداز سے اس دنیا سے جاتی ہے، آخرت میں اسی کے مطابق اپنا روپ دھار لیتی ہے۔ روح بدن سے نکلنے کے بعد سب سے پہلے اسے برزخ میں جانا ہوگا اور برزخ کی ملکوتی آنکھ اس کو دیکھے گی، بلکہ اگر اس کو آنکھ ملی ہے تو وہ خود بھی اپنی برزخی آنکھ کھولنے کے بعد اپنے کو اسی صورت میں دیکھے گا جس میں ہے۔ اس لئے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی جس صورت پر یہاں ہے وہاں بھی اسی صورت پر رہے۔

خداوند عالم بعض لوگوں کی حکایت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ بعض لوگ محشور ہوتے وقت کہیں گے ''پالنے والے جب میں دنیا میں آنکھوں والا تھا تو تو نے مجھے اندھا کیوں محشور کیا؟'' خدا جواب دے گا ''کیونکہ تو نے میری نشانیوں کو بھلا دیا تھا اس لئے آج تجھ کو بھلا دیا گیا ہے'' [۵۰] اے بیچارے تو ظاہری دنیا میں چشم بینا رکھتا تھا لیکن اپنے وجود باطن میں تو اندھا تھا اپنے اندھے پن کا احساس تجھے اب ہوا ہے۔ ارے تو تو ابتدا ہی سے اندھا تھا تو وہ باطنی چشم بصیرت رکھتا ہی نہیں تھا جس سے آیات الٰہی کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اے بیچارے تو قد رعنا اور اچھی صورت ضرور رکھتا تھا (لیکن) ملکوت اور باطن کا معیار کچھ اور ہے

تمہیں باطن میں ثابت قدمی پیدا کرنی پڑے گی تاکہ قیامت میں قدرعنا کے مالک بنو۔ تمہاری روح، انسانی روح ہونی چاہئے تاکہ عالم برزخ اور عالم آخرت میں تمہاری صورت انسانی صورت رہے۔ تم خیال کرتے ہو کہ عالم غیب و باطن جو کشف سرائر و ظہور ملکات کا عالم ہے، اس دنیا کے عالم ظاہری طرح ہے کہ جہاں شکوک و شبہات اور غلطیوں کا ارتکاب ہوتا ہے۔ سنو! تمہارے کان، تمہاری آنکھ، تمہارے ہاتھ پیر بلکہ تمہارے سارے اعضا ملکوتی زبان سے، بلکہ بقول بعضے ملکوتی صورت سے ہر اس چیز کی گواہی دیں گے جو تم نے کیا ہے۔

(لہذا) میرے عزیز! دل کے کان کھول کر سنو، دامن ہمت کو تھام لو اور اپنی بدبختی پر رحم کرو۔ ہوسکتا ہے اپنے کو انسانی شکل دے سکو اور اس دنیا سے آدمی کی صورت میں جاؤ اور ایسا کرنے پر تمہارا شمار اہل سعادت و اہل نجات میں سے ہوگا۔ خبردار! یہ گمان نہ کرنا کہ یہ تو ایک موعظہ ہے، ایک تقریر ہے۔ (نہیں، بلکہ) یہ سب حکمائے عظام کے براہین و دلائل کا نتیجہ ہے اور اصحاب ریاضت کا کشف ہے۔ معصومین و صادقین کی روایت ہیں۔ ان صفحات میں نہ تو اقامہ برہان مقصود ہے اور نہ زیادہ اخبار و آثار کا ذکر کرنا مطلوب ہے۔

تیسری فصل
اسباء کی فطری میلانات پر معقول پابندی

جہاں واہمہ و غضب و شہوت کا جنود رحمانی سے ہونا ممکن ہے۔ اگر ان کو عقل سلیم اور انبیائے کرامؑ کے بتائے ہوئے راستہ کا پابند بنا دیا جائے تو یہی چیزیں انسان کی سعادت و خوش بختی کو یقینی بنادیتی ہیں اور اگر ان کو آزاد چھوڑ دیا جائے اور واہمہ کو دوسری دونوں قوتوں پر حکمرانی کا موقع دے دیا جائے تو یہ شیطانی فوج محسوب ہوتی ہیں۔

یہ بات بھی واضح ہو جانا چاہئے کہ انبیاء کرامؑ میں سے کسی ایک نے بھی شہوت، غیظ و غضب اور واہمہ کو پوری طرح کچلنے کا کبھی حکم نہیں دیا اور نہ کسی داعی الی اللہ نے ابھی تک یہ کہا ہے کہ شہوت کو کلی طور سے ختم کردیا جائے اور آتش غضب کو مکمل طور پر بجھا دیا جائے یا واہمہ کی قوت سے بالکل کام ہی نہ لیا جائے، بلکہ ان حضرات نے فرمایا ہے کہ ان فطری قوتوں کو اس طرح لگام دیا جائے کہ یہ عقل کے مطابق اور قوانین الہی کے موافق کام کریں۔ اس لئے کہ ان میں سے ہر قوت یہ چاہتی ہے کہ اپنا مقصد حاصل کرے چاہے اس سے

بیگانہ پیدا ہو یا قرآن کریم کا مثلاً درندہ صفت و خود سر نفس، شہوانی قوت میں مست اور بے لگام ہو کر اپنے مقصد کو حاصل کرنا چاہتا ہے، چاہے خانہ کعبہ میں زنائے محصنہ (شوہر دار عورت سے زنا) کے ذریعے ہی سہی اور غیظ و غضب میں بھرا نفس، اپنے مطلب کو حاصل کرنا چاہتا ہے، خواہ اس کیلئے انبیاء و اولیاء کو قتل کرنا پڑے۔ اسی طرح شیطانی واہمے میں مبتلا نفس، اپنی غرض کی تکمیل چاہتا ہے، چاہے زمین میں فساد برپا ہو جائے یا عالم درہم و برہم ہو جائے۔

انبیائے کرامؑ (دنیا میں) تشریف لائے (اپنے ساتھ) قوانین لائے، ان پر (خدا نے) آسمانی کتابیں نازل کیں تاکہ فطرت انسانی کی سرکشی پر پابندی لگائی جا سکے اور نفس انسانی کو عقل و شرع کے قانون کا پابند بنایا جا سکے۔ نفس کی ایسی تربیت کی جائے اور اس کا تزکیہ کیا جا سکے جس کی بنا پر وہ عقل یا شرع کے خلاف کوئی کام نہ کرے۔ اس لئے جو نفس، الٰہی قوانین اور عقلی بنیادوں پر اپنے ملکات کی تشکیل کرے گا وہ سعید ہوگا اور اہل نجات سے ہوگا اور جو نفس، ایسا نہ کرے اس کو چاہئے کہ در پیش ہونے والی شقاوتوں، بدبختیوں، تاریکیوں اور سختیوں سے خدا کی پناہ مانگے اور ان وحشت ناک اور دہشت ناک صورتوں سے (بھی) خدا کی پناہ مانگے جو برزخ، قبر، قیامت اور جہنم میں اس کے ساتھ ہوں گی اور ان ملکات و اخلاق فاسدہ کے نتائج سے بھی خدا کی پناہ مانگے جو اس کے ہمراہ ہمہ وقت ہوں گے۔

چوتھی فصل قوت تخیل کی تہذیب

اس باب اور اس کے علاوہ دوسرے مقامات پر مجاہد کو شیطانی اوہام سے چھٹکارا حاصل کرنے کیلئے پہلی ضروری شرط قوت تخیل کی بلند پروازی کو کنٹرول کرنا ہے کیونکہ (انسانی) تخیل ہمیشہ ایک پرندے کی طرح حالت پرواز میں رہتا ہے اور ہر لمحہ کسی شاخ پر بیٹھے ہوئے بے چین رہتا ہے، یہ بلند پروازی کبھی بدبختیوں کا سبب بن جاتی ہے۔ یہ تخیل شیطان کا آلہ کار بھی ہے اور یہ انسان کو ہمیشہ بدبختی کے گڑھے میں دھکیلتا ہے۔ جو مجاہد اپنی اصلاح کی فکر میں ہے اپنے باطن کو جلا دینا چاہتا اور شیطانی وسوسوں سے اپنی حفاظت کرنا چاہتا ہے اس کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ لگام خیال پر اپنی گرفت مضبوط رکھے۔ اس کو اس کی مرضی پر نہ چھوڑے بلکہ اسے حیوانات و پستیوں کے قریب بھٹکنے نہ دے۔ مشاہدہ کار ہے کہ وہ شیطنت کا تصور کرے، بلکہ ہمیشہ اپنے خیالات کو نیک کاموں کی طرف موڑ دے، یہ بات اگرچہ شروع میں مشکل ضرور معلوم ہوگی، اور

شیطان اور اس کے چیلے اس بات کو اس کی نظروں میں اور بڑا کر کے دکھائیں گے، لیکن مسلسل پابندی و مراقبت و نگرانی سے کام آسان ہو جائے گا۔

ممکن ہے تم بھی تجربہ کرو اور تھوڑی سی توجہ و کوشش سے اپنے تخیل کو ادھر اُدھر بھٹکنے سے روکو اور مکمل طور پر اس پر کنٹرول کرو۔ جب بھی تم یہ دیکھو کہ تمہارے خیالات پست اور ذلیل چیزوں کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں تو ان کو پاکیزہ اور نیک چیزوں کی طرف متوجہ کرو۔ اگر تم دیکھو کہ تم کو اپنی کوششوں میں کامیابی نصیب ہو رہی ہے تو اس توفیق پر اپنے خدا کا شکر ادا کرو اور اپنی کوشش جاری رکھو۔ ہو سکتا ہے پروردگار عالم تم پر اپنی رحمت سے ملکوت کا کوئی راستہ کھول دے جس سے انسانیت کے صراط مستقیم کی طرف تمہاری ہدایت ہو جائے اور سلوک الی اللہ کا راستہ تمہارے لئے آسان ہو جائے۔

اس بات کی طرف خصوصی توجہ رکھو کہ مذموم اور برے خیالات اور باطل تصورات شیطانی القاءات ہیں۔ شیطان اپنے چیلوں کو تمہاری سلطنت باطن میں قدم جمالینے کی بھرپور کوشش کرتا ہے اور تم جو شیطان اور اس کے چیلوں سے جہاد کیلئے نکلے ہو اور اپنے نفس کی قلمرو کو رحمانی و الٰہی مملکت بنانا چاہتے ہو اس لعین کی مکاریوں سے تم کو بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے اور ان تمام خیالات کو جو مرضی الٰہی کے خلاف ہیں، اپنے سے دور کرو تاکہ اس داخلی جنگ میں انشاء اللہ اس اہم مورچے کو شیطان اور اس کے چیلوں سے خالی کرو، کیونکہ یہ ایک سرحدی مورچہ ہے۔ اگر یہاں کامیاب ہو گئے تو آگے بھی کامیابی کی امید ہے۔

اے عزیز! ہر وقت خداوند عالم سے مدد مانگو۔ اپنے معبود سے بصد عجز و نیاز، گڑگڑا کر استغاثہ کرتے ہوئے کہو

بار الٰہا! شیطان ایک بہت بڑا دشمن ہے جو تیرے انبیاء و اولیاء کو بہکانے کی طمع رکھتا تھا اور رکھتا ہے۔

اے خدا! تو اپنے اس مجبور و ناتواں بندے کی مدد کر جو بیہودہ امیدوں، پست اور برے خیالات اور خرافات کے جال میں گرفتار ہے، تاکہ وہ اس طاقتور دشمن سے عہدہ برآ ہو سکے۔

خدایا! تو اس میدان جنگ میں اس طاقتور دشمن سے جو میری سعادت و انسانیت کیلئے خطرہ ہے مجھے محفوظ رکھ اور میری مدد کر، تاکہ اس کی فوج کو تیری مخصوص مملکت سے نکال سکوں اور مجھے توفیق دے کہ جو گھر تیرے مخصوص ہے اس تک اس غاصب کے ہاتھ نہ پہنچنے دوں۔

پانچویں فصل: موازنہ سے متعلق

ان باتوں میں سے ایک بات جو راہ سلوک میں انسان کی مددگار ہوتی ہے اور انسان کو اس کی پابندی کرنی چاہئے وہ "موازنہ" ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر عقلمند انسان کو چاہئے کہ قوائے شہویہ وغضبیہ اور واہمہ سے پیدا ہونے والے اخلاق رذیلہ اور پست ملکات کے فوائد ونقصانات کا جو بے قید وبند ہونے کے ساتھ شیطان کے تابع ہوتے ہیں، نفسانی فضائل اور اچھے اقدار کے فوائد ونقصانات سے موازنہ کرے جو عقل وشرع کی بنیادوں پر مبنی ہوتے ہیں اس کے بعد یہ دیکھ لے کہ ان میں سے کونسے اقدار اچھے ہیں پھر ان پر عمل پیرا ہو جائے۔

۱۔ **قوۂ شہویہ** مثال کے طور پر جس نفس پر شہوت اور ہوس کا مطلق العنان قبضہ ہے اور نفسانی خواہشات اس میں کوٹ کوٹ کر بھر چکی ہیں، یہاں تک کہ یہ خواہشات اس شخص کے کردار کا حصہ بن چکی ہیں، اس کے فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ اس سے بہت سے دوسرے رذائل اور دوسری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور پھر یہ قوت کسی بھی فسق وفجور کے ارتکاب میں کوتاہی نہیں کرتی اور جو مال جس راہ سے بھی حاصل ہو جائے اس سے ہاتھ نہیں اٹھاتی ہے اور جو بھی چیز اس کے میلان کے مطابق ہو اس کے حاصل کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتی ہے اور چاہے ان کے نتائج کتنے ہی برے ہوں۔

۲۔ **قوۂ غضبیہ** اگر اس کو اتنی چھوٹ مل گئی کہ یہ ملکہ کی صورت اختیار کر جائے تو اس سے دوسرے بہت سے رذائل اور خرابیاں پیدا ہو جائیں گی۔ (مثلاً) جو شخص بھی اس کے ہاتھ لگ جائے گا اس پر ظلم وستم کرے گا اور اگر کسی نے ایسے شخص کی معمولی سی مزاحمت کر لی تو یہ اس کو شکست دینے کیلئے جو بھی ممکن ہو گا کرے گا۔ ذرا سی اختلافی بات پر ہنگامہ برپا کر دے گا اور اپنی مزاج کے خلاف ہر بات کو بہر صورت دور کرنے پر تل جائے گا، چاہے اس سے دنیا زیر وزبر ہو جائے۔

۳۔ **قوۂ واہمہ** اسی طرح جو شخص شیطانی قوۂ واہمہ کا مالک ہو گا اور یہ صفت اس پر غالب آ جائیگی اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ ہر شیطانی طریقے سے اپنے شہوت وغضب کو تسکین وتشفی دے کر ہر جائز وناجائز طریقے سے بندگان خدا پر تسلط حاصل کرنا چاہے گا، چاہے اس کیلئے ایک خاندان کو تباہ کرنا پڑے یا ایک شہر یا ملک کو اجاڑنا پڑے۔

ان قوتوں (شہویہ، غضبیہ اور وہمیہ) کے درج بالا نتائج اس وقت حاصل ہوتے ہیں جب یہ قوتیں شیطان کے زیر تصرف ہوں۔

ویسے اگر آپ واقعی اور صحیح طریقہ سے ایسے لوگوں کے حالات کے بارے میں غور و فکر کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ کوئی بھی شخص، چاہے کتنا ہی طاقتور ہو اور چاہے جتنی اس کی خواہشیں پوری بھی ہو چکی ہوں پھر بھی اس کی لاکھوں خواہشیں ایسی ہوں گی جو پوری نہ ہوئی ہوں گی۔ بلکہ حقیقت امر یہ ہے کہ اس دنیا میں تمام امیدوں کا پورا ہونا اور ہر شخص کا اپنے مقصد کا حاصل کر لینا ناممکن ہے کیونکہ یہ دنیا ''عالم مزاحمت'' ہے اور اس کے عناصر ہمارے ارادوں کی تکمیل میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ دوسری چیز یہ بھی ہے کہ ہماری امیدوں کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔ مثلاً انسان کی شہوانی قوت کچھ اس طرح کی ہے کہ بفرض محال ایک شہر کی عورتیں اس کے قبضہ میں آ جائیں تب بھی وہ دوسرے شہر کی عورتوں پر نظر رکھتا ہے! اگر اس کو ایک مملکت مل جائے تو بھی وہ دوسری مملکت حاصل کرنے کا خواہشمند رہتا ہے۔ ہمیشہ جو چیز اس کے دسترس میں نہیں ہے اسی کی خواہش کرتا ہے حالانکہ مذکورہ بالا خواہشوں کی تکمیل ناممکنات میں سے ہے اور خام خیالی کے سوا کچھ نہیں لیکن اس کے باوجود تنور شہوت ہمیشہ دہکتا ہی رہتا ہے اور انسان کبھی بھی اپنی آرزوؤں کو نہیں حاصل کر پاتا۔

اسی طرح انسان کے اندر قوۂ غضبیہ کی تخلیق کچھ اس طرح کی گئی ہے کہ اگر وہ پوری ایک مملکت کا بلا شرکت غیرے مالک بن جائے پھر بھی وہ دوسری ایسی مملکت کے حصول کی کوشش کرے گا جو اس کو نہیں مل سکی ہے، بلکہ جتنا بھی اس کو ملے گا اتنا ہی اس قوت میں اور اضافہ ہوگا۔ اگر کسی کو ہماری بات پر یقین نہیں ہے تو خود اپنے حالات کا جائزہ لے اور اہل دنیا کے حالات کا بھی جائزہ لے۔ مثلاً بادشاہوں اور زور اور جاہ و حشم کے مالکوں کی زندگیوں کو دیکھے تو خود ہی ہماری بات کی تصدیق کرے گا۔

(دیکھئے) انسان ہمیشہ ایسی چیز کا دلدادہ ہوتا ہے جو اس کے پاس نہیں ہوتی یا اس کی دسترس میں نہیں ہوتی ہے اور یہ ایسی انسانی فطرت ہے جس کو مشائخ عظام اور اسلام کے علمائے اعلام، خصوصاً معارف الٰہیہ میں ہمارے استاد جناب عارف کامل آغا شیخ میرزا محمد علی شاہ آبادی (روحی لہ الفداء)[۵۱] نے اس سے بہت سے معارف الٰہیہ کو ثابت فرمایا ہے جس کا ہماری بحث سے تعلق نہیں ہے۔[۵۲]

بہر حال اگر بفرض انسان اپنے تمام مقاصد کو حاصل بھی کر لے تو ان سے وہ کب تک لطف اندوز ہوتا

رہے گا؟ اس کی جوانی کی قوتیں کتنے دنوں تک برقرار رہیں گی؟ جب زندگی کے موسم بہار پر خزاں آتی ہے تو دل سے نشاط و سرور اور اعضاء سے طاقت سلب ہو جاتی ہے۔ قوت ذائقہ بیکار ہو جاتی ہے، چیزوں کے مزے کا صحیح ادراک نہیں ہو سکتا۔ آنکھیں، کان، قوۂ لامسہ اور دیگر قوی بیکار ہو جاتے ہیں۔ لذتیں یا تو ایک دم سے ختم یا ناقص ہو جاتی ہیں۔ بیماریاں انسان پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ نظام ہاضمہ، قوۂ جاذبہ، قوۂ دافعہ، نظام تنفس، یہ سب اپنے فرائض کی انجام دہی سے قاصر ہو جاتی ہیں۔ ٹھنڈی آہوں، درد بھرے دل اور حسرت وندامت کے علاوہ انسان کا دامن ہر چیز سے خالی ہو جاتا ہے۔ پچھلے برس کی پچپن کی عمر سے انسانی قوتوں کے ناکارہ یا ناقص ہونے کے زمانے تک طاقتور اور صحتمند جسم کے مالک شخص کی بھی ان جسمانی قوتوں سے استفادے کی مدت تیس چالیس سال سے زیادہ نہیں ہوتی، بشرطیکہ وہ بیماریوں اور دیگر قسم کی مصیبتوں سے دوچار نہ ہو جس کا روزمرہ سابقہ پڑتا ہی رہتا ہے اور ہم ان سے غافل ہو جایا کرتے ہیں

میں سرسری طور پر آپ کیلئے عالم تصور میں، جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، یہ فرض کئے لیتا ہوں کہ آپ کی عمر ۱۵۰ سال ہے اور فرض کرتے ہیں کہ آپ نے ان تینوں قوتوں شہویہ، غضبیہ اور واہمہ کا بغیر کسی الجھن اور تکلیف کے استعمال بھی کیا ہے اور اس دوران آپ نے مقصد کی راہ میں کسی قسم کی رکاوٹ بھی حائل نہیں ہونے دی، تو کیا اس مختصر مدت کے بعد جو ہوا کے جھونکے کی طرح گزر جانے والی ہے، آپ کا نتیجہ کیا ہوگا؟ ان فانی لذتوں سے آپ نے اپنی دائمی زندگی کیلئے کیا ذخیرہ کیا ہے؟ اپنے بیچارگی کے دن کیلئے آپ نے کیا کیا؟ اپنی تنہائی و فقر و فاقہ کے دن کیلئے کونسا ذخیرہ اکٹھا کیا؟ برزخ و قیامت کیلئے کونسا توشہ محفوظ کیا؟ ملائکہ الٰہی، اولیائے خدا اور انبیائے خدا سے ملاقات کیلئے آپ نے کونسا تحفہ تیار کیا؟ سوائے پچھلے برے اعمال کے جو برزخ و قیامت میں ایسی شکلوں میں نظر آئیں گے جن کو خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ شکلیں کیسی ہوں گی؟

تم نے جہنم کی آگ، عذاب قبر و قیامت وغیرہ کو سن کر جو آتش دنیا اور عذاب دنیا پر قیاس کیا۔ یہ غلط قیاس ہے اور اس کے سمجھنے میں سخت غلطی کی ہے۔ اس دنیا کی آگ بہت ہلکی اور دھیمی ہے۔ اس دنیا کا عذاب بہت سہل و آسان ہے۔ اس دنیا میں تمہارا ادراک بہت ہی ناقص اور نا تمام ہے۔ اس دنیا کی تمام آگ کو جمع کر لیا جائے تو بھی وہ انسانی روح کو نہیں جلا سکتی، لیکن آخرت کی آگ جسم کو جلانے کے ساتھ، روح کو بھی بھسم کر دیتی ہے۔ دل کو پگھلا کر اسے جلا دیتی ہے۔ تم نے اب تک جس جہنم کے بارے میں سنا

ہے وہ تمہارے اعمال کا جہنم ہے جو حقیقت بن کر وہاں تمہارے سامنے حاضر ہوگا۔ ارشاد خداوند عالم ہے:

﴿ ووجدوا ما عملوا حاضراً ﴾ ۵۳؎ اور جو کچھ انہوں نے (دنیا میں) کیا تھا اس کو حاضر پایا۔

(تم نے اس دنیا میں جو کچھ کیا ہے اس کی سزا آخرت میں بھگتنی ہے)۔ اگر تم نے یہاں یتیم کا مال ہڑپ کیا ہے اور اس کے مزے اڑائے ہیں تو خدا ہی جانتا ہے کہ آخرت میں جہنم کے اندر تم کس صورت میں اس کو دیکھو گے اور وہاں کتنی ذلت اٹھاؤ گے اور اس ذلت کی حقیقت کیا ہوگی؟ یہاں تم نے اگر اپنے سخت دست الفاظ سے لوگوں کے دل جلائے ہیں تو اب یہ تو خدا ہی جانتا ہے کہ آخرت میں اس کا کیا عذاب ہے۔ جب تم خود دیکھو گے تو تمہاری سمجھ میں آئے گا کہ خود تم نے اپنے لئے کیسا عذاب مہیا کر رہا ہے؟ اگر تم نے کسی کی غیبت کی ہے تو اس غیبت کی جو اخروی شکل ہے وہ تم کو دے دی جائے گی اور تم اسی کے ساتھ محشور ہو گے اور اس کے عذاب کا مزہ چکھو گے۔

یہ سب اس جہنم کی بات ہے جو برے اعمال کا دوزخ ہے جو نسبتاً سرد، آسان ہلکا اور قابل برداشت ہے اور یہ ان گنہگاروں کیلئے ہے جو گناہ کر کے اہل معصیت میں شمار ہوتے ہیں۔ لیکن ان لوگوں کیلئے جن کی سرشت میں برائیاں اور پست و باطل ملکات کا غلبہ ہو چکا ہے جیسے طمع، حرص و لالچ، من مانی، جنگ وجدال، شر و فساد، حب مال اور جاہ و منصب، دنیا پرستی وغیرہ قسم کے پست ملکات کا، ان کیلئے ایسا جہنم ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس دوزخ میں عذاب کی صورتوں کا تصور بھی ہمارا اور تمہارا ذہن نہیں کر سکتا۔ حالانکہ یہ خود نفس کے باطن سے ظاہر ہوں گے اور ان کے عذاب سے خود اہل جہنم بھی گریزاں ہوں گے اور وحشت کریں گے۔

بعض موثق روایات میں ہے کہ جہنم میں متکبرین کیلئے ایک وادی ہے جس کا نام "سقر" ہے۔ اس وادی نے ایک مرتبہ حرارت و گرمی کی شدت کی وجہ سے خداوند عالم سے اجازت چاہی کہ مجھے ایک سانس لینے کی اجازت دی جائے۔ اجازت حاصل ہونے کے بعد جب اس نے سانس لی تو اس کے اثر سے جہنم تڑپ اٹھی۔ ۵۴؎

کبھی یہی ملکات انسان کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جہنمی بنانے کا سبب بن جاتے ہیں، کیونکہ یہ انسان سے ایمان کو ختم کر دیتے ہیں۔ جیسے حسد ہے اس کے بارے میں ہماری صحیح روایات میں آیا ہے: "حسد ایمان کو اسی طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے"۔ ۵۵؎

اسی طرح دنیا پرستی، شہرت اور حب مال کیلئے صحیح روایات میں آیا ہے "بھیڑوں کے ایسے ریوڑ پر جس کا کوئی رکھوالا نہ ہو اگر ایک بھیڑیا آگے سے اور ایک پیچھے سے چھوڑ دیا جائے تو یہ دونوں بھیڑیے اس کو اتنی جلدی ختم نہیں کر سکیں گے جتنی جلدی شہرت کا لالچ اور دنیا پرستی مومن کے ایمان کو ختم کر دیتی ہے"۔[۵۶]

خدا نہ کرے انسان کی معصیتیں فاسد ملکات تک پہنچ جائیں اور بداخلاقی کے ملکہ تک پہنچ جائیں اور پھر ان فاسد و باطل ملکات پر عمل کرنے کا انجام ایمان کے خاتمہ کی صورت میں ظاہر ہو اور وہ کافروں کی موت مرے۔ کیونکہ ایسے لوگوں کو کافروں کے اور باطل عقائد والوں کے جہنم میں ڈالا جائے گا اور یہ دونوں جہنم دوسرے جہنموں سے بہت زیادہ سخت، بہت زیادہ گرم، اور بہت زیادہ تاریک ہیں۔

اے عزیز! علوم عالیہ[۵۷] میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ "شدت کے مراتب لامتناہی ہیں" تم چاہے جتنا تصور کرو اور تمام عقول چاہے جتنے زیادہ شدت عذاب کا تصور کریں اس سے شدید تر کا امکان موجود ہے۔ کیا تم نے حکما کے براہین کو نہیں دیکھا؟ کیا تم نے اہل ریاضت کے کشف پر یقین نہیں کیا؟! اچھا تم تو، بحمد للہ، مومن ہو۔ انبیاءؑ کو تو سچا مانتے ہو، ہماری معتبر کتابوں میں منقول روایت جن کو تمام علمائے امامیہ قبول کرتے ہیں ان کو تو صحیح مانتے ہو۔ ائمہ معصومین صلوات اللہ علیہم اجمعین، سے منقول دعاؤں اور مناجات کو تو درست تسلیم کرتے ہو۔ تم نے مولائے متقیان امیر المومنین علیہ السلام کی مناجات کو تو دیکھا ہی ہوگا۔ سید الساجدین علیہ السلام کی مناجات جو دعائے ابو حمزہ ثمالی کے اندر ہے اس کو تو دیکھا ہی ہوگا۔ ذرا اس کے مطالب میں غور کرو۔ ان کے جملوں میں تھوڑا سا تامل کرو۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک لمبی دعا کو ایک مرتبہ میں جلدی جلدی پڑھ ڈالو اور اس کے مطلب میں غور و فکر نہ کرو۔ ہم ہوں یا تم، سید سجاد علیہ السلام کا عالم تو نہیں پیدا کر سکتے کہ اس سی دعا کو خضوع و خشوع سے پڑھ لیں۔ ہر رات ایک چوتھائی یا ایک تہائی پڑھو۔ لیکن سمجھ کے پڑھو، ہر ہر فقرے میں غور کرو۔ ہو سکتا ہے تم بھی صاحب حال ہو جاؤ۔

سب سے بڑھ کر تھوڑا سا قرآن میں غور کرو اور یہ دیکھو کہ اہل جہنم کیلئے کس کس قسم کے عذاب کا وعدہ کیا گیا ہے۔ وہ لوگ خدا سے موت کی دعائیں مانگتے ہیں۔ مگر افسوس موت بھی ان کے دکھ درد کا مداوا نہیں! دیکھو خدا کا ارشاد ہے: ﴿ یا حسرتی علی ما فرّطتُ فی جنب الله ﴾[۵۸] (ہائے افسوس میری اس کوتاہی پر جو میں نے خدا کا تقرب حاصل کرنے میں کی)۔ اب یہ کونسی حسرت ہے جس کو خدا اپنی اس عظمت کے ساتھ اور اس تعبیر کے ساتھ ذکر کر رہا ہے؟ قرآن کی آیت شریفہ میں غور کرنا چاہیے اور بغیر تدبر

کے اس سے نہیں گزرنا چاہئے۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے

﴿یوم ترونها تذهل کل مرضعة عما ارضعت، وتضع کل ذات حمل حملها، وتری الناس سکاری وما هم بسکاری ولکن عذاب الله شدید﴾ ۵۹ (اس آیت میں) خداوند عالم روز قیامت کی تعریف کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ جس دن تم اسے دیکھ لو گے تو ہر دودھ پلانے والی (ڈر کے مارے) اپنے دودھ پیتے (بچے) کو بھول جائے گی اور ساری حاملہ عورتیں اپنے اپنے حمل (وحشت سے) گرا دیں گی اور (گھبراہٹ میں) لوگ تجھے متوالے معلوم ہوں گے حالانکہ وہ متوالے نہیں ہیں، بلکہ خدا کا عذاب بہت سخت ہے (کہ لوگ بدحواس ہو رہے ہیں)۔

میرے عزیز! ذرا سوچو! قرآن مجید (نعوذ باللہ) کوئی قصہ کہانی کی کتاب نہیں ہے۔ تم سے مذاق نہیں کرتا۔ دیکھو تو کیا کہتا ہے؟ آخر یہ کس قسم کا عذاب ہے جو عزیز رشتہ دار کو بھلا دیتا ہے' حاملہ عورتوں کا حمل ساقط ہو جاتا ہے؟ آخر یہ کیسا عذاب ہے جس کا ذکر خدا اپنی تمام عظمتوں کے باوجود لفظ "شدت" کے ساتھ اور دوسری جگہ لفظ "عظمت" کے ساتھ کر رہا ہے' وہ خدا جس کی عظمت کی حد انتہا نہیں اور جس کی عزت وسلطنت کی قلمرو لامتناہی ہے وہ کسی چیز کا ذکر شدت اور عظمت کے الفاظ کے ساتھ کرے، وہ چیز کیا ہو سکتی ہے؟ خدا جانتا ہے کہ میری اور تمہاری عقل اور تمام انسانوں کی فکر اس کے تصور سے بھی عاجز ہے۔ اگر اہل بیت عصمت وطہارتؑ کے اخبار واحادیث کا مطالعہ کیجئے اور ان میں غور وفکر کیجئے تو معلوم ہو جائے گا کہ آخرت کا عذاب، ان عذابوں سے ہٹ کر سخت عذاب ہے جن کے بارے میں تم سوچتے ہو اور اس کا قیاس اس دنیا کے عذاب سے کرنا غلط اور باطل ہے۔

میں تمہارے لئے ہمارے فرقے کے جلیل القدر عالم دین شیخ صدوقؒ کی ایک حدیث شریف نقل کرتا ہوں تاکہ تم سمجھ لو کہ مطلب کیا ہے اور مصیبت کتنی عظیم ہے؟ حالانکہ یہ حدیث اعمال کے دوزخ سے متعلق ہے جو تمام جہنموں سے سرد تر ہے۔ پہلے تو تم یہ سمجھ لو کہ شیخ صدوقؒ جن کی یہ حدیث ہے، وہ بزرگوار ہیں جن کے سامنے تمام علمائے اعلام، اپنے کو چھوٹا سمجھتے ہیں اور ان کی جلالت قدر کے قائل ہیں۔ یہ وہ بزرگوار ہیں جو امامؑ کی دعا سے پیدا ہوئے ہیں اور یہ وہ عظیم شخص ہیں جو امام زمانہ (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کے لطف وکرم سے مالا مال رہے ہیں اور میں اکابر علمائے امامیہ کے ذریعے جو متعدد طریقوں سے شیخ صدوق (رحمت اللہ علیہ) سے متصل ہوتے ہیں، اس حدیث کو نقل کرتا ہوں اور ہمارے اور شیخ صدوقؒ کے درمیان جتنے

مشائخ ہیں وہ سب کے سب بزرگوں میں سے اور اصحاب ثقات میں سے ہیں لہذا اگر آپ مومن ہیں تو اس حدیث پر عقیدہ تمند رہیے

روی الصدوق، باسناده عن مولانا الصادق علیہ السلام، قال:

﴿بينا رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ ذات يوم قاعداً إذ أتاه جبرئيل وهو كئيب حزين متغير اللون، فقال رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ: يا جبرئيل مالي أراك كئيباً حزيناً؟ فقال: يا محمد فكيف لا أكون كذلك وإنما وضعت منافيخ جهنم اليوم. فقال رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ: وما منافيخ جهنم يا جبرئيل؟ فقال: إن الله تعالى أمر بالنار فأوقد عليها ألف عام حتى احمرت، ثم أمر بها فأوقد عليها ألف عام حتى ابيضت، ثم أمر بها فأوقد عليها ألف عام حتى اسودت وهي سوداء مظلمة، فلو أن حلقة من السلسلة التي طولها سبعون ذراعاً وضعت على الدنيا لذابت الدنيا من حرها ولو أن قطرة من الزقوم والضريع قطرت في شراب أهل الدنيا لماتوا من نتنها، قال: فبكى رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وبكى جبرئيل فبعث الله إليهما ملكاً، فقال: إن ربكما يقرأكما السلام ويقول: إني آمنتكما من أن تذنبا ذنباً أعذبكما عليه﴾ [۲۰]

حدیث شریف کے ترجمے کا خلاصہ یہ ہے کہ "ایک دن رسول خدا تشریف فرما تھے کہ جبرئیل علیہ السلام افسردہ وغمگین، چہرے کا رنگ اڑا ہوا آنحضرت کی خدمت میں آئے۔ رسول خدا نے پوچھا جبرئیل میں تم کو غمگین وافسردہ دیکھ رہا ہوں؟ جبرئیل نے کہا اے محمدؐ! میں کیوں افسردہ نہ ہوں، جبکہ میں نے دیکھا ہے کہ آج "منافیخ" جہنم میں دم بھر دیا گیا تھا۔ رسول خدا نے پوچھا منافیخ جہنم کیا ہے؟ جبرئیل نے عرض کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ آگ کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ہزار سال تک شعلہ ور ہو جائے یہاں تک کہ وہ سرخ ہو جائے۔ اس کے بعد پھر اس کے دہکانے کا حکم ہوا اور وہ ہزار سال تک دہکتی رہی یہاں تک کہ وہ آگ سفید ہوگئی اس کے بعد پھر اس کو دہکانے کا حکم ہوا اور وہ ہزار سال تک دہکتی رہی یہاں تک کہ سیاہ ہوگئی اور بالکل سیاہ وتاریک ہوگئی ہے۔ اب اگر اس (دہکتی) زنجیر کا ایک حلقہ جس کا طول ستر ذراع ہے دنیا پر گر جائے تو اس کی گرمی سے پوری دنیا پگھل جائے اور اگر اس (جہنمی) درخت زقوم اور (جہنمی غذا) ضریع کا ایک قطرہ اہل دنیا کے پینوں میں ٹپک جائے تو اس کی بدبو سے پوری دنیا کے لوگ مر جائیں۔ (یہ سن کر) رسول خدا رونے لگے اور جبرئیل پر بھی گریہ طاری ہوگیا۔ اس وقت خدا نے ایک فرشتے کو بھیجا جس نے آ کر کہا

آپ کا خدا آپ کو سلام کہہ رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ میں نے آپ دونوں کو اس بات سے امان دے دی کہ آپ دونوں کوئی گناہ کریں اور اس گناہ کی وجہ سے میں آپ پر عذاب کروں"۔

میرے عزیز! اس حدیث شریف کی طرح بہت سی حدیثیں ہیں۔ جہنم کا وجود اور اس کا دردناک عذاب دنیا کے تمام ادیان کے نزدیک مسلمہ امر ہے اور اس کے براہین واضح ہیں (بلکہ) اس کی حقیقت اسی دنیا میں صاحبان کشف و ارباب قلب پر ظاہر ہو چکی ہے۔ اس کرشکن حدیث کے بارے میں ٹھیک سے غور وفکر کرو۔ اگر اس کے صحیح ہونے کا احتمال بھی ہو تو کیا دیوانہ وار صحراؤں کی طرف بھاگ نہیں نکلنا چاہیے؟ آخر کیا بات ہے کہ ہم اس قدر خواب غفلت اور عالم نادانی میں محو ہیں! کیا رسول خدا اور جبرئیلؑ کی طرح ہمارے اوپر بھی کوئی ملک نازل ہوا ہے؟ اور ہم کو عذاب الٰہی سے امان کی خوش خبری سنائی گئی ہے؟ جبکہ رسول خدا اور اولیائے الٰہی تمام عمر خوف خدا سے تڑپتے رہے۔ ان کا کھانا، پینا، سونا سب چھوٹ گیا تھا۔ ولی خدا حضرت امام زین العابدین علیہ السلام خوف خدا سے غش کھا جاتے تھے۔ اس امام معصومؑ کی گریہ وزاری، نالہ ومناجات دل کے ٹکڑے کر دیتی ہے۔ آخر ہم کو کیا ہو گیا ہے کہ نہایت بے شرمی سے خدا کی بارگاہ میں ہتک حرمت کرتے اور نوامیس الٰہی کی بے حرمتی کا ارتکاب کرتے ہیں؟ وائے ہو ہمارے اوپر اور ہماری غفلتوں پر۔ وائے ہو ہمارے اوپر اور سکرات موت کی شدت پر۔ ہائے افسوس وائے ہو ہمارے اوپر دوزخ میں اور اس کی سختیوں پر، قیامت میں اور اس کی تاریکیوں کے وقت۔ وائے ہو ہمارے اوپر جہنم میں اور اس کے عذاب وعقاب کے دوران۔

چھٹی فصل: اخلاقی امراض کا علاج

اے عزیز! خواب (غفلت) سے جاگو، اپنی (کوتاہیوں) سے ہوشیار رہو، کمر ہمت باندھو اور جب تک وقت ہے فرصت کو غنیمت شمار کرو، جب تک عمر باقی ہے اور تمہارے قویٰ تمہارے بس میں ہیں، جب تک جوانی قائم ہے اور اخلاقی برائیوں کا ابھی تم پر غلبہ نہیں ہوا ہے، پست وذلیل ملکات نے ابھی تم پر تسلط نہیں حاصل کیا ہے، ان کے علاج کی کوئی تدبیر کرو۔ فاسد و برے اخلاق دور کرنے کا راستہ نکالو۔ آتش شہوت وغضب کے خاموش کرنے کی کوئی ترکیب سوچو۔

علمائے اخلاق واہل سلوک نے ان اخلاقی بیماریوں کو دور کرنے کا سب سے بہترین علاج یہ تجویز کیا

ہے کہ جب بھی اپنے آپ میں تمہیں ان اخلاقی برائیوں میں سے کوئی بری نظر آئے اس کو اپنی نظر میں رکھو اور اس کے خلاف مردانہ وار جدوجہد کرو اور ہمت کر کے اپنے نفس کے خلاف ایک مدت تک اقدام کرتے رہو۔ اس مذموم خواہش کے خلاف عمل کرو اور ہر حالت میں اپنے خدا سے دعا کرو کہ اس جہاد میں تمہاری مدد کرتا رہے۔ یقین رکھو تھوڑے ہی دنوں کے بعد یہ بری عادت دور ہو جائے گی اور شیطان اور اس کا لشکر اس محاذ سے بھاگ جائے گا اور رحمانی لشکر اس کی جگہ لے لے گا

مثلاً اخلاقی برائیوں میں سے ایک برائی جو انسان کی ہلاکت کا سبب اور فشار قبر کا سبب بنتی ہے اور انسان کو دونوں جہان میں عذاب میں گرفتار رکھتی ہے وہ اہل خانہ، پڑوسیوں، ہم پیشہ لوگوں، اہل محلہ وغیرہ کے ساتھ بداخلاقی سے پیش آنا ہے اور یہ صفت غصہ اور شہوت کی پیداوار ہوتی ہے۔

اگر یہ شخص ایک مدت تک اس بات پر تل جائے کہ جب بھی اس کی زندگی میں کوئی اونچ نیچ پیدا ہو جس کی وجہ سے اس کے غیظ و غضب کی آگ شعلہ ور ہو جائے جو اس کے باطن کو جلا ڈالے اور اس کو نازیبا الفاظ استعمال کرتے ہوئے (کسی کو) برا بھلا کہنے کی ترغیب دے تو وہ اپنی خواہش نفس کے خلاف قدم اٹھائے گا اور برائی کے برے انجام کو سوچے گا اور اس واقعے پر تحمل کا اظہار کرتے ہوئے اپنے دل میں شیطان پر لعنت کرے گا اور اس سے خدا کی پناہ مانگے گا تو میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر وہ اس پر کاربند رہا تو چند مرتبہ تکرار کے بعد اس کے اخلاق و عادات بالکل بدل جائیں گے اور مملکت باطن میں اس کی جگہ اچھی عادات اپنا گھر بنا لیں گی۔ لیکن اگر نفسانی خواہشات کے مطابق عمل کریں گے تو ممکن ہے یہ بات تم کو اسی دنیا میں نیست و نابود کر دے۔

میں غیظ و غضب سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ کیونکہ یہ ایک پل میں انسان کی دونوں دنیا کو تباہ کر دیتا ہے۔ خدانخواستہ غصہ کسی کے قتل کا باعث بھی ہو سکتا ہے یہ بھی ممکن ہے انسان غصہ کی حالت میں نوامیس الٰہی کے بارے میں کچھ اول فول بک دے۔ جیسے کہ ہم نے لوگوں کو غصہ کی حالت میں کفر کے کلمات بکتے اور مرتد ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔

حکما نے فرمایا ہے بغیر ملاح کے شدید طوفانی موجوں میں گھری ہوئی کشتی کا نجات پا جانا، غصے میں آگ بگولا ہونے والے شخص کی نجات سے کہیں زیادہ قریب ہے۔[۱۱]

اور اگر خدانخواستہ تمہارا شمار علمی مباحث میں بحث و تکرار کرنے والوں میں ہوتا ہے، جیسے کہ ہم طلبہ

میں بعض اس بری عادت میں گرفتار ہیں، تو ایک مدت تک اپنی اس عادت کے خلاف عمل کرو (مخصوصاً) ان باقاعدہ محافل میں جہاں علما اور عوام دونوں ہوتے ہیں، اگر کوئی بحث چھڑ جائے اور تم دیکھو کہ تمہارا مقابل صحیح کہہ رہا ہے تو اپنی غلطی مان لو اور اس کی تصدیق کرو۔ امید کی جاتی ہے کہ ایسا کرنے سے ایک مدت کے بعد تمہاری یہ بری عادت چھوٹ جائے گی۔ خدا نہ کرے ایک عام دین دار مکاشفے کا دعوے کرنے والے کا یہ قول (تمہارے بارے میں) صادق ہو، جس نے کہا ہے "بعض مکاشفات میں میرے اوپر یہ بات کشف ہوئی کہ "تخاصم اہل النار" (جہنم والوں کے جھگڑے) سے مراد اہل علم و حدیث کا جھگڑا کرنا ہے"۔

انسان کو اگر اپنے صحیح ہونے کا امکان بھی ہو، تب بھی اس خصلت کے دور کرنے کی فکر میں رہنا چاہئے

روي عن عدة من الأصحاب أنهم قالوا: ﴿خرج علينا رسول الله صلى الله عليه وآله يوماً ونحن نتمارى في شيء من أمر الدين، فغضب غضباً شديداً لم يغضب مثله ثمّ قال: إنما هلك من كان قبلكم بهذا، ذروا المراء فإنّ المؤمن لا يماري، ذروا المراء فإنّ المماري قد تمّت خسارته، ذروا المراء فإنّ المماري لا أشفع له يوم القيامة، ذروا المراء فإنّي زعيم بثلاث أبيات في الجنّة في رياضها وأوسطها وأعلاها لمن ترك المراء وهو صادق، ذروا المراء فإنّ أوّل ما نهاني عنه ربّي بعد عبادة الأوثان المراء﴾[۴۲]

وعنه أيضاً ﴿لا يستكمل عبد حقيقة الإيمان حتى يدع المراء وإن كان محقّاً﴾[۴۳]

روایت میں ہے "ایک مرتبہ ہم لوگ کسی دینی مسئلہ پر آپس میں بحث کر رہے تھے کہ رسول خدا تشریف لے آئے اور (آتے ہی) آپ اس قدر غضب ناک ہوئے کہ اس طرح کبھی غضب ناک نہیں ہوئے تھے اس کے بعد فرمایا تم سے پہلے والے لوگ بھی اسی وجہ (بحث و جدال) سے ہلاک ہوئے تھے۔ بحث و جدال چھوڑ دو، کیونکہ مؤمن کبھی ایسا نہیں کرتا۔ اس عادت کو ترک کر دو، کیونکہ بحث و جدال کرنے والا مکمل خسارہ اٹھا چکا ہے۔ بحث و جدال کو اس لئے بھی ترک کر دو کہ میں جھگڑالو شخص کی شفاعت نہیں کرونگا۔ بحث و جدال کو چھوڑ دو تو میں تمہارے لئے جنت میں تین گھروں کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ (ایک) اس کے باغوں میں ہوگا، (دوسرا) درمیان میں اور (تیسرا) اس کے اوپر کے حصے میں ہوگا اور یہ (گھر) اس شخص کیلئے ہوں گے جو سچا ہونے کے باوجود بحث و جدال کو چھوڑ دے۔ بحث و جدال کو ترک کر دو اس لئے کہ میرے خدا

نے بت پرستی کی ممانعت کے بعد سب سے پہلے جس بات سے روکا ہے وہ بحث وجدال ہے۔

آنحضرتؐ سے یہ بھی منقول ہے کہ "کسی بندے کے ایمان کی حقیقت اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک وہ بحث وجدال کو چھوڑ نہ دے خواہ وہ بحث میں حق پر ہی کیوں نہ ہو"۔

اس سلسلے میں بہت سی احادیث منقول ہیں۔ کتنی بری بات ہے کہ وقتی کامیابی کیلئے انسان رسول خداؐ کی شفاعت سے محروم ہو جائے، جبکہ اس کا حاصل بھی کچھ نہیں ہے اور (اسی طرح) علمی بحث کو جو خدا کی عبادتوں اور اطاعتوں میں سب سے افضل ہے، بشرطیکہ صحیح نیت سے ہو، سب سے بڑی مصیبت میں تبدیل کر کے بت پرستی کا ثانی بنا دے۔

بہرحال انسان کو چاہئے کہ تمام اخلاقی برائیوں کو ایک ایک کر کے نظر میں رکھے اور نفس کی مخالفت کر کے اپنی مملکت روح سے اس کو خارج کر دے اور جب غاصب چلا جائے گا تو مالک مکان خود ہی اس میں آ جائے گا۔ کسی دوسری زحمت کی ضرورت ہی نہیں ہوگی ورنہ عذر خواہی کی ضرورت ہوگی۔

خاتمہ

چونکہ اس مقام پر پہنچ کر مجاہدہ نفس کا بیان مکمل ہو گیا ہے اور اس مرحلہ پر انسان ابلیسی قوتوں کو اس مملکت سے نکال باہر کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں اس کی مملکت ملائکہ خدا کا مسکن اور خدا کے نیک بندوں کی عبادت گاہ بن جاتی ہے، اس لئے سلوک الی اللہ کا کام آسان ہو جاتا ہے نتیجتاً صراط مستقیم واضح و روشن ہو جاتی ہے۔ تمام جنتوں اور برکتوں کے دروازے اس پر کھل جاتے ہیں اور جہنم اور اس کے درجات کے دروازے اس کیلئے بند ہو جاتے ہیں۔ پروردگار عالم اس کی طرف لطف و کرم کی نظر ڈالتا اور اہل ایمان کی لڑی میں اس کو پرو دیتا ہے اور اس شخص کا شمار نیک بختوں اور اصحاب یمین میں ہوتا ہے۔ معارف الٰہیہ کے دروازے جو جن وانس کی تخلیق کی غرض وغایت ہیں، اس پر کھل جاتے ہیں[۶۳] اور اس خطرناک راستے میں خدا اس کی مدد کرتا ہے۔

میں چاہتا تھا کہ نفس کے "مقام سوم" اور اس کی کیفیت جہاد کا ذکر کرنے کے ساتھ شیطان کی مکاریوں کا بھی ذکر کروں، لیکن میں نے مناسب نہیں سمجھا اس لئے اس سے صرف نظر کیا اور خداوند عالم سے توفیق وتائید کا طلبگار ہوں کہ اس موضوع پر ایک علیحدہ رسالہ لکھ سکوں۔

توضیحات (۱)

۱۔ حدیثوں کو جھوٹوں اور جعلی حدیث گھڑنے والوں کی دستبرد سے حفاظت کیلئے اور نااہل و ناآشنا راویوں کے توسط سے نقل حدیث کرنے کی حفاظت کی خاطر قدیم زمانے سے علمائے علم حدیث نے ''اجازۂ روایت'' دینے اور لینے کی ایک رسم بنائی ہے۔ مشائخ حدیث جس شخص کے تقویٰ اور علم کو آزما لیتے تھے اس کو اجازۂ روایت دیتے تھے۔ طلاب علوم بھی اس علم کے علماء و مشائخ کے پاس جا کر ''علم حدیث'' سیکھتے تھے پھر ان سے اجازے کی درخواست کرتے تھے تاکہ ان کی بیان کردہ روایت معتبر سمجھی جائیں۔ کم و بیش یہ طریقہ کار اب تک جاری ہے۔

مشائخ جو اجازے دیتے تھے وہ بھی مختلف ہوا کرتے تھے۔ بعض اجازے تحریری اور بعض زبانی ہوا کرتے تھے۔ اور جس کے پاس اس طرح کا اجازہ ہوتا تھا وہ حدیث بیان کرتے وقت کہتا تھا ''فلاں شخص نے تحریری یا زبانی اجازے کے ذریعے مجھے اس طرح خبر دی ہے'' کی سنت جاریہ کے پیش نظر امام خمینیؒ نے بھی ابتدا میں اپنے سلسلہ اجازت کو پشت در پشت شیخ محمد بن یعقوب کلینی (قدس اللہ سرہ) تک نقل فرمایا ہے۔

۲۔ شیخ محمد رضا مسجد شاہی متوفی ۱۳۶۲ ھ ق اصفہان کے ایک علمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ آپ'' کا تعلق شیخ محمد تقی اصفہانی'' کے خاندان سے تھا اور آپ میرزائے شیرازی'' سید محمد فشارکی'' اور آخوند خراسانی'' کے شاگردوں میں سے تھے۔ نیز آیت اللہ شیخ عبدالکریم حائری'' کے ہم مباحثہ اور دوستوں میں سے تھے۔ شیخ (۱۳۴۴ سے ۱۳۴۵ ھ ق) تک قم میں مشغول تدریس تھے لیکن اپنے چچا حاج ''آقا نور اللہ اصفہانی'' کی شہادت کے بعد اصفہان واپس چلے گئے تھے اور عمر کے آخر تک وہیں قیام پذیر رہے۔ آپ شیعوں کے مرجع تھے۔ اصفہان میں آپ کا حوزۂ درس آپ کی زندگی تک باقی تھا۔ آپ نے جد محترم شیخ محمد تقی اصفہانی'' متوفی ۱۲۴۸ ھ ق، مشہور ترین فقہا میں تھے اور حضرت وحید بہبہانی'' کے شاگردوں میں تھے۔ آپ کا حوزۂ درس اصفہان میں تھا۔ میرزائے شیرازی'' اور سید حسن مدرس آپ کے شاگردوں میں سے تھے۔ آپ'' کی مشہور ترین تصنیف ''ہدایۃ المسترشدین'' ہے جو ''معالم الدین'' کی شرح ہے

۳۔ حاج شیخ عباس قمی (۱۲۹۴-۱۳۵۹ ھ ق) چودھویں صدی ہجری کے مشہور ترین شیعہ محدث تھے۔ آپ کا شمار مشائخ روایت میں ہوتا ہے خود امام خمینی'' نے ان سے اجازہ حاصل فرمایا تھا۔ شیخ عباس قمی'' سالہا سال علامہ متبحر محدث کبیر میرزا حسین نوری'' کے ساتھ رہے تھے اور محدث نوری'' کی تمام کتب کی تصنیف اور استنساخ و موازنہ میں ان کے مددگار تھے۔ شیخ عباس قمی'' محقق و کثیر التصنیف انسان تھے۔ آپ کی ایک مشہور تصنیف ''سفینۃ البحار'' ہے جس کی تصنیف میں ۲۷ سال کی

مدت صرف ہوئی تھی۔ آپ کی دیگر تصانیف میں مفاتیح الجنان، منتہی الآمال، تتمۃ المنتہی، فوائد رضویہ وغیرہ ہیں۔

۴۔ حاجی میرزا حسین (نوری) بن محمد تقی نوری طبرسی (۱۲۵۴ – ۱۳۲۰ ھ ق) فقیہ، مفسر، علم حدیث میں کم نظیر اور علم رجال میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ آپ نے احادیث اہل بیت کی نشر و اشاعت میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ آپ شیخ العراقین، شیخ مرتضیٰ انصاری اور میرزائے شیرازی کے شاگرد تھے اور اپنے بعد آنے والوں جیسے شیخ [illegible] کے استاد تھے۔ شیخ عباس قمی اور آقا بزرگ تہرانی آپ کے شاگردوں میں تھے اور ان حضرات نے آپ سے سند اجازہ لی تھی۔ مستدرک الوسائل، [illegible]، دار السلام، النجم الثاقب، لؤلؤ و مرجان، تحیۃ الزائر آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔

۵۔ شیخ مرتضیٰ انصاری (۱۲۱۴ – ۱۲۸۱ ھ ق) آپ کا لقب خاتم الفقہاء و المجتہدین تھا۔ آپ جناب جابر بن عبد اللہ انصاری صحابی رسول اللہ کی اولاد میں سے تھے۔ آپ کا شمار علم اصول کے نوابغ میں ہوتا تھا۔ اس فن میں آپ نے عظیم انقلاب پیدا کیا۔ آپ کی آراء و نظریات اور تصانیف آج تک فقہاء کیلئے ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں اور اسی وجہ سے مرکز ہیں۔ آپ کی کتابوں پر بہت سے حواشی و شروح تحریر کئے جا چکے ہیں۔ آپ کے بعض اساتذہ یہ تھے: شیخ موسیٰ کاشف الغطاء، شیخ علی کاشف الغطاء، ملا احمد نراقی، سید محمد مجاہد وغیرہ (رحمہم اللہ)۔ آپ کے مشہور شاگردوں میں آخوند خراسانی، میرزائے شیرازی، میرزا محمد حسن آشتیانی (رحمہم اللہ) تھے۔ آپ کی بہترین تصانیف رسائل، مکاسب اور طہارت ہیں۔

۶۔ سید محسن بن عبد الکریم بن علی بن محمد حسینی جبل عاملی، ملقب بہ امین (۱۲۸۴ – ۱۳۷۱ ھ ق) اکابر علمائے امامیہ و شیعہ کی عصر حاضر کے مفاخر میں سے تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن جبل عامل (سن [illegible]) میں حاصل کی۔ اس کے بعد نجف اشرف تشریف لے گئے اور آخوند خراسانی، شریعت اصفہانی، حاجی آقا رضا ہمدانی، شیخ محمد طٰہٰ نجف اور دیگر بزرگوں (رحمہم اللہ) سے تکمیل فرمائی۔ دینی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے وطن جبل عامل، پھر شام تشریف لے گئے اور تحقیق، تدریس اور تصنیف میں مشغول ہو گئے۔ آپ کی تصانیف تو بہت ہیں مگر مشہور ترین تصنیف میں "اعیان الشیعہ" ہے جو متعدد مرتبہ چھپ چکی ہے [illegible] "[illegible] الشیعہ" ہے۔ دیگر تصانیف میں، [illegible]، المجالس السنیۃ، معادن الجواہر فی علوم [illegible] وغیرہ ہیں۔

۷۔ محمد بن ہاشم موسوی رضوی ہندی (۱۲۴۲ – ۱۳۲۳ ھ ق) آپ کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی اور نجف اشرف میں تحصیل علم فرمایا اور وہیں انتقال فرمایا و دفن ہوئے۔ آپ شیخ مرتضیٰ انصاری کے شاگردوں میں تھے۔ آپ کی تصانیف میں علم رجال کی کتاب نظم اللآلی، ارجوزۃ فی الفقہ، [illegible] اصول، الاربعہ، شرح الشرح، و تقریرات درس شیخ انصاری قابل ذکر ہیں۔

۸۔ سید ابو القاسم حسینی دہکردی، متوفی (۱۳۵۳ ھ ق) آپ میرزا حسن شیرازی، شیخ زین العابدین مازندرانی اور میرزا حسین نوری (علیہم الرحمۃ) کے شاگرد تھے۔ آپ کی تصانیف میں حاشیہ بر تفسیر صافی، حاشیہ بر وافی، حاشیہ بر مکاسب اور [illegible] فی السیر والسلوک قابل ذکر ہیں۔

۹۔ محمد ہاشم بن زین العابدین موسوی اصفہانی ”معروف بہ ”چہار سوقی“ (۱۲۳۵-۱۳۱۸ھ ق) فقہائے امامیہ میں سے تھے۔ آپ صاحب ”روضات الجنات“ کے بھائی تھے۔ شیخ انصاری سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ سید محمد کاظم یزدی اور شیخ شریعت اصفہانی“ کے مشائخ اجازہ میں سے تھے۔ آپ کی تصانیف میں استصحاب، اصول آل رسول، حاشیہ بر معالم، حاشیہ شرح لمعہ، حاشیہ قوانین اور حاشیہ معالم کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

۱۰۔ احمد بن محمد مہدی بن ابی ذر نراقی ”متوفی (۱۲۴۴ھ ق) فقیہ و محدث تھے۔ علم رجال، علم ریاضی اور علوم عقلیہ کے استاد تھے۔ آپ زہد و تقویٰ میں مشہور تھے۔ زیادہ تر علوم اپنے والد ماجد ملا محمد مہدی نراقی“ سے حاصل کیے۔ ملا محمد مہدی نوادر روزگار میں سے تھے۔ آپ کے دیگر اساتذہ میں سید مہدی بحر العلوم“ اور شیخ جعفر کاشف الغطاء“ تھے۔ وہ شیخ انصاری“ اور سید محمد شفیع جاپلقی کے استاد تھے۔ آپ کی تصانیف میں معراج السعادۃ، مفتاح الاحکام، عوائد الایام، مناہج الاصول الی علم الاصول، مستند الشیعہ اور دیوان شعر فارسی قابل ذکر ہیں۔

۱۱۔ سید مہدی بن مرتضیٰ طباطبائی بروجردی“ (۱۱۵۴-۱۲۱۲ھ ق) معروف بہ ”بحر العلوم“ بہت بڑے فقیہ اور عارف کامل تھے۔ آپ صاحب کرامات اور عوام و خواص کی نظر میں بہت زیادہ محترم تھے۔ آپ ان چند مخصوص شخصیتوں میں سے ہیں جو غیبت کبریٰ میں متعدد مرتبہ امام زمانہ“ کی خدمت میں مشرف ہوئے تھے۔ بحر العلوم“ علمی و اجتماعی ریاست کے مالک تھے، آپ کے خوان میں عظیم فقہاء، مثلاً شیخ جعفر کاشف الغطاء، سید محمد جواد عاملی، شیخ محمد تقی اصفہانی، ملا احمد نراقی، ابو علی حائری، شیخ اسد اللہ شوشتری، عظیم رجالی کی تربیت ہوئی تھی۔ آپ کی مشہور ترین تصانیف میں مصابیح فقہ میں، الدرۃ النجفیہ اور کتاب رجال کے نام سے جانتے ہیں۔

۱۲۔ محمد باقر بن محمد اکمل بہبہانی“ (۱۱۱۷-۱۲۰۸ھ ق) معروف بہ ”وحید“، ”آقا“ و ”استاد کل“۔ آپ مشہور فقیہ اصولی اور رجالی عالم تھے۔ آپ نے کربلائے معلیٰ کو اپنا مرکز قرار دیا تھا اور بہترین قسم کے طلاب کی تربیت اور بحث و مناظرے کے ذریعے فقہ میں اخباریوں کی حاکمیت ختم کر دی تھی۔ آپ کے مشہور ترین شاگردوں کی فہرست میں یہ حضرات آتے ہیں: سید مہدی بحر العلوم، شیخ جعفر کاشف الغطاء، میرزائے قمی (صاحب قوانین)، ملا محمد مہدی نراقی، سید علی طباطبائی (صاحب ریاض)، سید مہدی شہرستانی، سید محمد باقر شفتی اور سید جواد عاملی (صاحب مفتاح الکرامہ)، (قدس اللہ اسرارہم)۔

۱۳۔ ملا محمد اکمل محمد باقر بہبہانی“ کے والد۔ آپ علم و تقویٰ میں مشہور تھے اور مشائخ اجازہ میں سے تھے۔

۱۴۔ ملا محمد باقر بن ملا محمد تقی مجلسی اصفہانی۔ آپ علامہ مجلسی کے نام سے مشہور ہیں (۱۰۳۷-۱۱۱۰ھ ق) آپ ”شیعوں کے اکابر علماء میں سے تھے۔ علم حدیث میں تو متبحر تھے ہی اس کے علاوہ بہت سے علوم میں مہارت کامل رکھتے تھے۔ آپ کے اساتذہ میں خود آپ کے والد ماجد ”شیخ حر عاملی“ اور سید علی خان شیرازی“ تھے۔ آپ نے بہت سے شاگرد تربیت کیے، چند کے اسمائے گرامی یہ ہیں: میرزا عبد اللہ آفندی“ (مؤلف ریاض العلماء)، سید نعمت اللہ جزائری اور ملا صالح مازندرانی“۔ آپ نے مذہب امامیہ میں احادیث کی جمع آوری میں سعی بلیغ فرمائی تھی۔ آپ“ کی عربی و فارسی کتابوں کی تعداد ۱۰۰ جلدوں سے زیادہ

ہے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور بحار الانوار، مرآۃ العقول فی شرح الکافی، حیوۃ القلوب، زاد المعاد، حق الیقین، جلاء العیون، حلیۃ المتقین اور اربعون حدیثاً ہیں۔

۱۵۔ ملا محمد تقی بن مقصود علی اصفہانی "مشہور بہ مجلسی اول" ہیں (م ۱۰۷۰ ھ ق) آپ بھی فقیہ، محدث اور رجالی عالم تھے آپ بہت ہی عابد و زاہد تھے۔ احادیث شیعہ کی نشر و اشاعت میں بڑا حصہ آپ کا بھی ہے۔ آپ کے اساتذہ میں شیخ بہائی اور ملا عبد اللہ شوشتری تھے۔ آپ کے آثار بہت زیادہ ہیں ان میں مشہور ترین یہ ہیں شرح زیارت جامعہ، روضۃ المتقین در شرح من لا یحضرہ الفقیہ، احیاء الاحادیث در شرح تہذیب شیخ طوسی، اربعون حدیثاً اور حاشیہ صحیفہ سجادیہ۔

۱۶ شیخ بہاء الدین محمد بن حسین بن عبد الصمد عاملی معروف بہ شیخ بہائی (۹۵۳۔۱۰۳۰ ھ ق) متعدد علوم و فنون میں استاد اور ریگانۂ زمانہ تھے۔ اپنے زمانہ میں شیخ الاسلام اصفہان کے لقب سے پکارے جاتے تھے آپ کے شاگردوں میں صدر المتألہین (ملا صدرائے شیرازی) محمد تقی مجلسی "محقق سبزواری" اور فاضل جواد وغیرہ تھے مختلف علوم میں آپ کی تصانیف موجود ہیں، مثلاً جامع عباسی اور حواشی بر قواعد شہید فقہ میں، رسالہ تشریح الافلاک علم ہیئت میں، مشرق الشمسین، حبل المتین، شرح دعائے صباح، شرح اربعین حدیث ادعیہ میں، صمدیہ تہذیب نحو اور زبدۃ الاصول علم ادب

۱۷۔ شیخ حسین بن عبد الصمد عاملی (۹۱۸۔۹۸۴ ھ ق) شیخ بہائی کے والد تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب حارث بن عبد اللہ ہمدانی سے ملتا تھا۔ حارث بن عبد اللہ حضرت علی علیہ السلام کے قریبی اصحاب میں سے تھے شیخ حسین عاملی شہید ثانی اور محقق کرکی کے شاگرد تھے اور بہت بڑے استاد، شاعر، محقق و ادیب تھے آپ کے درس میں بہت سے طلاب شریک ہوتے تھے۔

آپ کی تصانیف میں، درایۃ الحدیث، اربعون حدیثاً اور شرح قواعد کے نام سے جانتے ہیں

۱۸۔ شیخ زین الدین بن شیخ نور الدین عاملی مشہور بہ شہید ثانی (۹۱۱۔۹۶۶ ھ ق) بزرگان فقہائے شیعہ میں سے تھے آپ مختلف علوم کے جامع اور زاہد و عابد تھے آپ اہل سنت کے چاروں فقہی مذاہب پر تسلط رکھتے اور ان کا درس بھی دیتے تھے۔ آپ کی تصانیف میں، شرح لمعہ، مسالک الافہام فی شرح شرائع الاسلام، منیۃ المرید فی آداب المفید والمستفید، اسرار الصلوٰۃ اور کشف الریبۃ فی احکام الغیبۃ قابل ذکر ہیں

۱۹۔ شیخ علی بن عبد العالی میسی مشہور بہ "محقق کرکی یا محقق ثانی" تھے (۹۳۸ ھ ق) آپ فقیہ اور اصول علم رجال کے بڑے علمائے شیعہ میں تھے آپ صفوی خاندان کے دور میں ایران آئے اور قزوین و اصفہان میں حوزہ درس تشکیل دیا اور بڑے بڑے شاگردوں کی تربیت فرمائی۔ مثلاً شیخ علی منشار، سید میر اسد اللہ، شیخ عبد العالی کرکی۔ آپ کی مشہور ترین کتاب جامع المقاصد فی شرح القواعد ہے، یہ علامہ حلی کی مشہور کتاب قواعد کی شرح ہے۔

۲۰۔ محمد بن محمد بن داؤد موذن عاملی جزینی آپ شہید اول کے چچا زاد بھائی تھے۔ دانشمند، فاضل و شاعر تھے۔

۲۱۔ شیخ ضیاء الدین علی بن محمد مکی شہید اول کے دوسرے بیٹے تھے عالم فاضل محقق تھے شیخ محمد بن محمد بن داؤد

سے ان سے روایت کی ہے

۲۲۔ شیخ شمس الدین محمد بن مکی عاملی معروف بہ "شہید اول" (۷۳۴۔ ۷۸۶ھ ق) عظیم ترین فقہائے شیعہ میں تھے۔ مختلف علوم میں مسلم استاد تھے۔ فقہ میں آپ کو "امام الفقہ" کہا جاتا تھا۔ آپ کی تربیت علم و ادب کے درمیان ہوئی تھی۔ آپ کی بیٹیاں اور بیٹے سب ہی علما و فقہا تھے۔ شہید نے بہت سے اساتذہ سے استفادہ کیا تھا اور مختلف اسلامی فرقوں کے علما سے اجازے بھی حاصل کیے تھے۔ آپ کے مشہور شاگردوں میں "شیخ زین الدین علی بن خازن" "شیخ عبد العال کرکی" "شیخ حسن بن سلیمان" اور "شیخ مقداد سیوری" تھے۔ آپ کی مشہور کتابوں میں الدروس، الذکری، البیان، قواعد، اللمعۃ الدمشقیہ، اربعون حدیث قابل ذکر ہیں۔

۲۳۔ فخر المحققین ابو طالب محمد بن الحسن "(۶۸۲۔ ۷۷۱ھ ق) کابر فقہائے امامیہ میں سے تھے۔ آپ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دس سال کی عمر میں اجتہاد کے درجہ پر فائز ہو چکے تھے۔ اپنے والد ماجد علامہ حلی" کے شاگرد اور علمی وارث تھے۔ آپ کے مشہور شاگردوں میں شہید اول" "سید حیدر آملی" "سید تاج الدین" اور آپ کے بیٹے ظہیر الدین" شامل تھے۔

۲۴۔ آیت اللہ شیخ جمال الدین حسن بن یوسف بن علی بن مطہر حلی" (۶۴۸۔ ۷۲۶ھ ق) آپ فقیہ، محدث، مفسر، متکلم، ادیب، جامع معقول و منقول اور اپنے زمانے میں مذہب امامیہ کے رئیس اور 'علامہ' کے لقب سے مشہور تھے۔ آپ نے شیعہ و سنی علما سے کسب فیض کیا تھا۔ آپ کے اساتذہ میں محقق حلی" "خواجہ نصیر الدین طوسی" "سید احمد بن طاووس" و "شیخ نجیب الدین" شامل تھے اور خواجہ نصیر الدین طوسی" نے علامہ حلی" کے درس فقہ سے استفادہ کیا تھا۔ آپ کے صاحبزادے فخر المحققین بھی آپ کے شاگرد تھے۔ آپ کی تصانیف میں تبصرۃ المتعلمین، مختلف، القواعد، تذکرۃ الفقہاء فقہ میں، کشف المراد فی شرح تجرید الاعتقاد علم کلام میں، الفین اثبات امامت (حضرت علی علیہ السلام) میں، الخلاصہ علم رجال میں اور تلخیص الکشاف تفسیر میں ہیں

۲۵۔ شیخ ابو القاسم نجم الدین جعفر بن حسن حلی" (۶۰۲۔ ۶۷۶ھ ق) آپ محقق کے لقب سے مشہور تھے۔ شیعوں کے صف اول کے فقہاء میں شمار ہوتے ہیں۔ علامہ حلی" ان کے بھانجے" اور سید غیاث الدین بن احمد بن طاووس" جیسے فقہا آپ کے شاگرد تھے۔ آپ کی کتاب شرائع الاسلام اب تک فقہاء کیلئے ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ مشہور فقیہ شیخ محمد حسن نجفی" نے جواہر الکلام کے نام سے شرائع کی شرح لکھی ہے۔ آپ کی دیگر تصانیف میں معتبر فی شرح المختصر، مختصر النافع، المعارج (اصول میں) معروف ہیں۔

۲۶۔ سید شمس الدین ابو علی فخار بن معد موسوی حلی" (۶۳۰ھ ق) آپ فاضل، ادیب، محدث اور صاحب کتاب "الرد علی الذاہب الی تکفیر ابی طالب" ہیں۔

۲۷۔ شیخ جلیل ثقہ ابو الفضل شاذان ابن جبرئیل قمی" بہت بڑے عالم و فاضل اور فقیہ جلیل القدر تھے۔ "ازاحۃ العلۃ فی معرفۃ القبلۃ" اور کتاب "الفضائل" آپ کی بہترین تصانیف ہیں

۲۸۔ عماد الدین ابو جعفر محمد بن ابی القاسم طبری بن ابی القاسم علی بن محمد آملی ؒ۔ آپ کی تصانیف میں، بشارۃ المصطفیٰ لشیعۃ المرتضیٰ، الفرج فی الاوقات اور شرح مسائل الذریعہ قابل ذکر ہیں۔

۲۹۔ ابو علی حسن بن محمد طوسی ؒ شیعہ مذہب کے بڑے فقیہ اور اپنے باپ شیخ طوسی ؒ کے مشہور شاگرد تھے شیخ طوسی کے انتقال کے بعد ان کی مسند درس پر بیٹھے اور ان کے شاگردوں کو تعلیم دی آپ کے درس میں کثرت سے طلاب شرکت کرتے تھے۔ شیخ طوسی (۵۵۵ ھ ق) تک زندہ تھے۔ آپ کی تصانیف میں، مرشد الی سبیل التعبد، امالی اور شرح نہایۃ الاحکام معروف ہیں۔

۳۰۔ ابو جعفر محمد بن حسن طوسی ؒ (۳۸۵۔۴۶۰ ھ ق) آپ کا لقب ' شیخ الطائفہ ' تھا۔ دنیائے اسلام کے عظیم ترین دانشمند تھے۔ اپنے زمانے کے فقہاء و متکلمین کے رئیس تھے اور ادب، رجال، تفسیر اور حدیث میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے آپ کے اساتذہ میں شیخ مفید، سید مرتضیٰ علم الہدیٰ، ابن غضائری اور ابن عبدون (علیہم الرحمہ) شامل تھے۔ آپ کی یہ دو کتابیں حدیث شیعہ میں بہت ہی مشہور ہیں استبصار اور تہذیب، ان دونوں کا شمار فرقہ امامیہ کے کتب اربعہ میں ہوتا ہے فقہ میں نہایہ اور خلاف بہت مشہور کتب ہیں۔ مبسوط بھی فقہ میں ہے اس میں فقہ کے بہت سے فروعات کا تذکرہ ہے۔ آپ کی تصانیف میں یہ کتابیں بھی قابل ذکر ہیں فہرست، رجال، اختیار معرفۃ الرجال عدۃ الاصول، الغیبہ، التبیان فی تفسیر القرآن تلخیص الشافی، مصباح المتہجد وغیرہ۔ سن (۴۴۸ ھ ق) میں جب آپ کا کتب خانہ جلا دیا گیا تو آپ نے بغداد سے نجف اشرف کی طرف ہجرت فرمائی اور وہاں پر حوزہ علمیہ نجف اشرف کی بنیاد رکھی۔

۳۱۔ شیخ ابو عبداللہ محمد بن نعمان ؒ (۳۳۶ یا ۳۳۸۔۴۱۳ ھ ق)۔ آپ کا لقب 'مفید' ، 'ابن معلم' تھا۔ مذہب امامیہ کے زبردست متکلم، محدث اور فقیہ تھے۔ اپنے زمانے میں بغداد کی علمی ریاست آپ ہی کے پاس تھی۔ آپ پر حضرت امام زمانہ کی خصوصی توجہ تھی۔ بارہویں امام ؑ کی طرف سے جو دو خط علامہ شیخ مفید ؒ کے پاس آئے ہیں ان میں حضرت ؑ نے آپ کو 'سدید' ، 'شیخ مفید' ، 'ولی رشید' ، 'ولی مخلص' ، 'ناصر حق' اور 'داعی الی الحق' جیسے القاب سے نوازا ہے۔ شیخ مفید ؒ نے شیعہ کی دربدری علماء خاص طور پر جعفر بن محمد قولویہ، شیخ صدوق، ابن جنید، سکافی، ابو علی بن ابی الجیش بلخی (علیہم الرحمہ) سے درس حاصل کیا تھا آپ کے مشہور شاگردوں میں سید مرتضیٰ علم الہدیٰ، سید رضی جامع نہج البلاغہ، شیخ طوسی، نجاشی، کراجکی، سلار بن عبدالعزیز وغیرہ (رحمۃ اللہ علیہم) شامل تھے۔ چھوٹی بڑی دو سو کتابیں آپ کے آثار میں باقی ہیں، جن میں مشہور ترین یہ ہیں ارشاد، اختصاص، اوائل المقالات، امالی اور مقنعہ۔

۳۲۔ محمد بن علی بن حسین بن موسیٰ بن بابویہ قمی ؒ آپ کی کنیت ابو جعفر اور 'ابن بابویہ' اور 'صدوق' کے القاب سے مشہور تھے (۳۸۱ ھ ق)، بزرگان علماء اور مشائخ فقہائے شیعہ میں سے تھے غیبت صغریٰ اور امام زمانہ ؑ کی دعا کی برکت سے آپ کی ولادت ہوئی۔

آپ نے اپنے والد علی بن بابویہ ؒ محمد بن ولید اور جعفر بن محمد قولویہ سے روایت کی ہے اور شیخ مفید ، ابن غضائری ؒ ان

شاذان" اور شیخ ابو جعفر محمد دوریستی" نے آپ سے روایت کی ہے۔ آپ کی تصانیف کو علماء نے تقریباً تین سو لکھا ہے جن میں سے مشہور ترین یہ ہیں: من لا یحضرہ الفقیہ، اکمال الدین و تمام النعمۃ، الخصال، التوحید، عیون اخبار الرضا، امالی، معانی الاخبار، علل الشرائع، ہدایہ اور مقنع ہیں۔ آپ کا مزار شہر رے میں دوستان اہل بیت کی زیارت گاہ ہے۔

۳۳۔ ابو القاسم جعفر بن محمد بن قولویہ قمی" (۳۶۸ ھ ق) چوتھی صدی ہجری کے بڑے شیعہ محدث وفقیہ تھے۔ آپ نے کلینی، ابن عقدہ، علی بن بابویہ قمی (شیخ صدوق" کے والد)، سے روایت کی ہے۔ شیخ مفید" نجاشی" اور دیگر حضرات نے آپ سے روایت لی ہے۔ فقہ وحدیث میں آپ کی متعدد تصانیف موجود ہیں۔ کامل الزیارت آپ کی سب سے مشہور کتاب ہے۔

۳۴۔ محمد بن یعقوب بن اسحاق کلینی رازی" مشہور بہ ثقۃ الاسلام (۳۲۸ یا ۳۲۹ ھ ق) شیعہ مذہب کے عظیم ترین محدث اور مشائخ اہل حدیث میں سے تھے۔ آپ" نے تقریباً چالیس اکابرین سے علم حدیث حاصل کیا۔ بہت سے بزرگوں مثلاً جعفر بن محمد قولویہ" اور ہارون بن موسیٰ تلعکبری" نے آپ سے حدیث نقل کی ہے۔

امامیہ مذہب کی کتب اربعہ کے مصنفین میں سے کلینی" سب سے پہلے مصنف ہیں کہ ۲۰ سال کی محنت کے بعد "کافی" کو تین حصوں (اصول، فروع، اور روضہ) میں لکھا گیا۔ آپ کی تصانیف میں کتاب الرجال، رسائل الائمہ، کتاب الرد علی القرامطہ اور کتاب تعبیر الرؤیا ہے۔

۳۵۔ علی بن ابراہیم بن ہاشم قمی" محدث، مفسر وفقیہ تھے۔ آپ کا زمانہ تیسری صدی ہجری کے آخر اور چوتھی صدی ہجری کے اوائل پر مشتمل ہے۔ کلینی" کے مشائخ میں ہیں۔ آپ کی تصانیف بہت زیادہ ہیں۔ مثلاً کتاب المناقب، قرب الاسناد، کتاب الشرائع، کتاب مغازی، کتاب الانبیاء اور تفسیر القرآن۔ آپ کا مدفن قم میں ہے۔

۳۶۔ ابراہیم بن ہاشم قمی" امام محمد تقی علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھے اور اصحاب امام" سے بہت روایت کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے قم میں کوفیوں کی احادیث نشر کی ہیں۔ کتاب نوادر اور قضایائے امیر المومنین" ان کی تصانیف میں سے ہیں۔

۳۷۔ حسین بن یزید نوفلی" شاعر وادیب تھے۔ رے کے ساکن تھے۔ شیخ طوسی" نے اپنے رجال میں ان کو امام ہفتم" کے اصحاب میں سے شمار کیا ہے۔ آپ کا انتقال بھی رے میں ہوا۔

۳۸۔ اسماعیل بن ابی زیاد سکونی" کوفی تھے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے۔ شیخ طوسی" نے عدۃ الاصول میں لکھا ہے: علمائے امامیہ نے ان کی روایتوں پر عمل کیا ہے۔ (جلد ۱، ص ۳۸)۔

۳۹۔ فروع کافی، ج ۵، ص ۲، کتاب جہاد، باب وجوب جہاد، حدیث ۳۔

۴۰۔ سریہ فوج کے ایک دستے کو کہتے ہیں اور کہا گیا ہے کہ بہترین سریہ وہ ہے جس میں ۴۰۰ سپاہی شامل ہوں۔

امام جعفر صادق" سے بھی منقول ہے: خیر السرایا اربعمائۃ بہترین سریہ چار سو افراد کا ہوتا ہے۔ وسائل الشیعہ، ج ۱۱، ص ۱۰۳، کتاب الجہاد، باب ۵۲، حدیث ۔

۳۱۔ حاج ملا ہادی سبزواری نے نفس کی اقسام ہفتگانہ کو اسفار کے حاشیہ (ج ۷، ص ۳۶) پر اس ترتیب سے ذکر کیا ہے "نفس، قلب، عقل، روح، سر، خفی، اخفیٰ" مرحوم شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی کتاب "لسان الفطرۃ" میں عقل کو قلب سے پہلے تحریر کیا ہے جبکہ صدر المتالہین نے اس طرح شمار کیا ہے "طبع، نفس، قلب، عقل، روح، سر، خفی" جبکہ "اخفیٰ" کو ذکر نہیں کیا ہے۔ اس کے بجائے "طبع" کو لکھا ہے۔ (اسفار، ج ۷، ص ۳۶)۔

۳۲۔ انسانی عقل کیلئے چار مرتبے شمار کئے گئے ہیں عقل ہیولانی، عقل بالملکہ، عقل بالفعل اور عقل بالمستفاد (شواہد الربوبیہ ص ۲۰۲ تا ۲۰۷) اسی طرح صدر المتالہین نے نفس انسانی کو سر و علن میں اور پھر دونوں کو ظاہر و باطن میں تقسیم کیا ہے کہ اس سے نفس کیلئے چار مراتب شمار کئے جا سکتے ہیں۔ (اسفار، ج ۷، ص ۳۶)۔

۳۳۔ بوعلی سینا نے قوائے نفس کو پہلی تقسیم میں تین مرتبوں میں قرار دیا ہے نفس نباتی، نفس حیوانی، نفس انسانی اور پھر دوسری تقسیم ملک و روح و عقل کے تین مراتب کے اعتبار سے کیا ہے (یعنی امام خمینیؒ) اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے نفس کیلئے تین مقام و مرتبے کے قائل ہوئے ہیں

مقام اول مقام ملک و ظاہر و دنیائے نفس ہے۔

مقام دوم باطن و ملکوت نفس ہے۔

مقام سوم کی طرف حدیث کی شرح کرتے ہوئے آپ نے آخر میں اشارہ فرمایا ہے اور اس کی شرح نہیں کی ہے اور وہی مقام عقل ہے۔ جیسا کہ شرح حدیث ۲۴ اربعین میں بیان کیا گیا ہے۔

۳۴۔ دوسری مرتبہ کی تقسیم سے اشارہ ہے نفس کے ظاہر و باطن کی تقسیم کی طرف یا دوسری تعبیرات میں سر و علن، ملک و ملکوت اور دنیا و آخرت کہا گیا ہے۔

۳۵ منازل السائرین، خواجہ عبداللہ انصاری" ص ۳

۳۶ حسین بن عبداللہ بن سینا" تقریباً ۳۷۰ تا ۴۲۷ یا ۴۲۸ ھ ق) "ابوعلی سینا" اور "شیخ الرئیس" کے لقب سے مشہور تھے۔ مسلمان علماء میں بے مثل اور حکمائے مشائین میں شمار ہوتے تھے۔ دیگر علوم میں بھی صاحب نظر تھے۔ آپ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ قوی ترین قوت حافظہ ان کی خصوصیت تھی اسی وجہ سے بہت کم عمر میں اپنی تعلیم کو مکمل کر لیا تھا۔ مختلف علوم میں آپ کی بے مثال تصانیف ہیں۔ مثلاً
اشارات و التنبیہات، جو منطق، طبیعیات و الٰہیات پر مشتمل ہے۔ جس کی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں جن میں مشہور ترین، شرح فخر رازی" اور خواجہ نصیر الدین طوسی" کی ہے۔ شفاء اس میں بھی منطق، ریاضیات، طبیعیات و الٰہیات کی بحث ہے اور بڑی تفصیل سے لکھی گئی ہے۔ فلسفے میں النجاۃ اور مبدأ و معاد ہے۔ طب میں قانون ہے۔ قصیدہ عینیہ اور التعلیقات بھی ان کی مشہور کتابیں ہیں۔

۳۷۔ شیخ الرئیس (بوعلی سینا) نے اشارات و تنبیہات کی فصل ہفتم نمط نہم میں لکھا ہے عارف کے سفر کے پہلے درجے کو

''ارادہ'' کہا جاتا ہے اور یہ خداوند عالم کی مضبوط رسی کو محکم پکڑ لینا ہے۔ اس لئے کہ یقین سے بلند ہو کر بہت سے بینا ہو گیا ہے یا اس کی خودی کو ایمان سے سکون مل گیا اور اس کے نتیجے میں اس کا سر قدس کی طرف سیر کرتا ہے اور پھر ''روح اتصال'' کو پا لیتا ہے۔ جب تک عارف اس زینے پر رہتا ہے اس کو مرید کہا جاتا ہے۔

۴۸۔ یہ رسول خدا ؐ کی اس حدیث کی طرف اشارہ ہے جس میں فرمایا گیا ہے ﴿إنّ اللہ یقولُ أعددتُ لعبادي الصالحین ما لا عینٌ رأتْ ولا أذنٌ سمعتْ ولا خطر علی قلب بشر (حدیث)﴾ خداوند عالم کا ارشاد ہے میں نے اپنے نیک بندوں کیلئے ایسی چیزوں کو مہیا کیا ہے جس کو کسی آنکھ نے دیکھا ہے، نہ کسی کان نے سنا ہے، نہ کسی بشر کے دل میں اس کا خیال آیا ہے۔

مجمع البیان در تفسیر آیہ ۸ سورہ سجدہ، بحار الانوار، ج ۸، ص ۱۹۸ اور کتاب العدل والمعاد، باب الجنۃ، حدیث ۶۸۔

۴۹۔ ﴿یحشر بعض الناس علی صورٍ یحسن عندها القردةُ والخنازیر﴾۔ علم الیقین، ج ۲، ص ۹۰۱

۵۰۔ ﴿قال ربّ لِمَ حشرتني أعمی وقد کنتُ بصیراً ☆ قال کذلک أتتک آیاتنا فنسیتها وکذلک الیوم تُنسی﴾۔ سورہ طٰہٰ/ ۱۲۵، ۱۲۶

۵۱۔ میرزا محمد علی بن محمد جواد حسینی آبادی اصفہانی شاہ آبادی (۱۲۹۲۔ ۱۳۶۹ ھ ق) فقیہ، اصولی، عارف اور چودہویں صدی ہجری کے عظیم ترین فلسفی تھے۔ آپ کی تعلیم حوزہ علمیہ اصفہان، تہران اور نجف اشرف میں مکمل ہوئی تھی۔ آپ کے اساتذہ میں آپ کے بھائی شیخ احمد، میرزا محمد ہاشم چہار سوقی اصفہان میں، میرزا ہاشم اشکوری اور میرزا حسن آشتیانی تہران میں، آخوند خراسانی، شریعت اصفہانی اور میرزا محمد تقی شیرازی نجف اشرف میں تھے۔ آپ تدریس کے فرائض ابتداء میں سامرہ میں پھر قم و تہران میں ادا کرتے رہے۔ قم میں (۱۳۴۷۔ ۱۳۵۴ ھ ق) کے دوران امام خمینی بھی آپ کے درس اخلاق وعرفان میں شریک ہوتے تھے۔ امام خمینی بڑے احترام سے ان کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔ مرحوم شاہ آبادی قم سے واپسی کے بعد تہران میں قیام پذیر ہو گئے اور نفوس کو ارشاد و ہدایت کرتے تھے۔ تہران ہی میں انتقال ہوا اور حضرت عبد العظیم حسنی کے جوار میں مقبرہ ابو الفتوح رازی کے اندر مدفون ہوئے۔ آپ کی تصانیف میں شذرات المعارف، الانسان والفطرۃ، القرآن والعترۃ، الایمان والرجعۃ، منازل السالکین اور حاشیہ بر کفایہ قابل ذکر ہیں۔

۵۲۔ رشحات البحار، کتاب الانسان والفطرۃ۔

۵۳۔ سورۂ کہف، آیت ۴۹۔

۵۴۔ عن أبي عبد اللہ ؑ قال ﴿إنّ في جهنّم لوادیاً للمتکبّرین یقال له سقر شکی إلی اللہ عزّ وجلّ شدّة حرّه وسأله أن یأذن له أن یتنفّس فتنفّس فأحرق جهنّم﴾۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۱۰، کتاب الایمان والکفر، باب الکبر، حدیث ۱۰

۵۵۔ عن أبي عبد اللہ ؑ قال ﴿إنّ الحسد یأکلُ الإیمان کما تأکل النارُ الحطب﴾۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۰۶۔

کتاب الایمان والکفر، باب الحسد، حدیث۲۔

۵۶۔ عن ابی عبد اللہؑ قال ﴿ما ذئبان ضاریان فی غنم لیس لها راع، هذا فی اولها وهذا فی آخرها باسرع فیها من حب المال والشرف فی دین المؤمن﴾۔ اصول کافی، ج۲، ص۳۰۵، کتاب الایمان والکفر، باب حب الدنیا والحرص علیها، حدیث۳۔

۵۷۔ صدر المتألہین اور دیگر الٰہی علماء نے اس حقیقت کو اپنے اسفار علمی میں بیان کیا ہے۔ اسفار، ج۸، ص۳۵، ۴۵، ۴۹۔

۵۸۔ سورۂ زمر، آیت/۵۶۔

۵۹۔ سورۂ حج، آیت/۲۔

۶۰ علم الیقین، مقصد۴، باب۱۵، فصل ۱، ص۱۰۳۲۔

۶۱۔ ابن مسکویہ نے اپنی کتاب تہذیب الاخلاق و تطہیر الاعراق (باب شہوت و جنین) ص۶۲ میں اس کلام کو عربی سے نقل کیا ہے۔

۶۲۔ بحار الانوار، ج۲، ص۳۸۔

۶۳۔ بحار الانوار، ج۲، ص۱۳۹۔

۶۴۔ یہ سورہ ذاریات کی ۵۶ ویں آیت کی طرف اشارہ ہے ﴿وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون﴾ اس آیت میں عبادت کی تفسیر معرفت سے کی گئی ہے۔ امام حسینؑ سے ایک حدیث منقول ہے اس میں حضرت نے فرمایا ﴿ایها الناس ان اللہ عز وجل ذکرہ ما خلق العباد الا لیعرفوہ﴾ اے لوگو خداوند عالم نے اپنے بندوں کو صرف اپنی معرفت حاصل کرنے کیلئے ہی خلق فرمایا ہے۔ علل الشرائع، ج۱، ص۹، باب۹، حدیث۱۔

دوسری حدیث

بالسند المتصل الی محمد بن یعقوب عن علی بن ابراہیم عن ابیہ عن ابن ابی عمیر عن یزید بن خلیفۃ قال

قال أبو عبد اللہ علیہ السلام

﴿کُلُّ رِیَاءٍ شِرْکٌ اِنَّہُ مَنْ عَمِلَ لِلنَّاسِ کَانَ ثَوَابُہُ عَلَی النَّاسِ وَمَنْ عَمِلَ لِلّٰہِ کَانَ ثَوَابُہُ عَلَی اللّٰہِ﴾

بہ سند مذکور یزید بن خلیفہ نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے حدیث نقل کی ہے کہ حضرتؑ نے فرمایا

''ہر قسم کی ریاکاری شرک ہے۔ جو کام لوگوں کیلئے ہوگا اس کا ثواب بھی لوگوں پر ہوگا اور جو کام خدا کیلئے ہوگا اس کا ثواب بھی خدا پر ہوگا''۔

ریاکاری اور اس کے درجات

شرح: جان لو کہ ریاکاری کا مطلب لوگوں کو دکھانے کیلئے نیک اعمال بجالانا اور پسندیدہ صفات کا اظہار کرنا یا عقائد مذہب حقہ پر عمل پیرا ہونا ہے تاکہ حسن و خوبی، درستی، دینداری اور امانتداری کی بنیادوں پر ان کے دلوں میں عزت و احترام اور شہرت و مقام حاصل کیا جاسکے اور ان اعمال کے بجالانے میں رضائے الٰہی حاصل کرنے کا صحیح ارادہ نہ ہو۔

ریاکاری کا اظہار چند مقامات پر ہوتا ہے

مقام اول

اس کے دو درجے ہیں

پہلا درجہ: عقائد حقہ اور معارف الہیہ کا اظہار صرف اس لئے کرتا کہ اس سے دینداری کی شہرت ہو جائے اور لوگوں کے دلوں میں اس کا احترام پیدا ہو جائے۔ مثلاً کوئی یہ کہے میں کائنات کے اندر خدا کے علاوہ کسی کو وجود میں موثر نہیں مانتا یا یہ کہے میں خدا کے علاوہ کسی پر بھی بھروسہ نہیں کرتا۔ یا اشارے کنائے سے دوسروں پر اپنے صحیح عقائد کا اظہار کرے یہی دوسرا طریقہ زیادہ رائج ہے۔ مثلاً اپنی گفتگو میں خدا پر بھروسہ اور قضائے الٰہی پر رضامندی کا بہت ذکر کرتا ہو، ریاکار ایک ٹھنڈی آہ بھر کر یا سر کو جھکا کر اپنے کو انہی لوگوں میں شمار کرانے کی کوشش کرتا ہے۔

دوسرا درجہ: باطل عقائد کو اپنے سے دور کرے اور اپنے نفس کا تزکیہ کرے مگر اس کا مقصد صرف لوگوں کے دلوں میں جاہ و منزل حاصل کرنا ہو، چاہے کھل کر اس کا اظہار کرے یا اشارے کنائے میں۔

مقام دوئم

اس کے بھی دو درجے ہیں:

پہلا درجہ: اچھے صفات اور نیک اخلاق کا اظہار کرے۔

دوسرا درجہ: بری عادتوں سے بچے اور ان سے نفس کو پاک و پاکیزہ رکھے مگر مقصود وہی ہو۔

مقام سوئم

وہ ریاکاری جو ہمارے فقہاء کرام رضوان اللہ علیہم کے یہاں مشہور ہے اس کے بھی یہی دو درجے ہیں

پہلا درجہ: لوگوں کو دکھانے اور ان کے دلوں میں مقام پیدا کرنے کیلئے شرعی عبادتوں و اعمال کو یا میل نات عقلی کو بجالاتا ہے، خواہ کسی عمل کو ریاکاری کی نیت سے کرتا ہو یا اس کی کیفیت، شرط یا جزء کو اس طرح بجالاتا ہو جس طرح فقہ کی کتابوں میں لکھا گیا ہے۔[۱]

دوسرا درجہ: اسی قصد و ارادے سے کسی عمل کو ترک کرتا ہو۔

ہم اس کتاب میں انہی تینوں مقامات کی بعض برائیوں کی تشریح کریں گے اور جو علاج نظر آتا ہے مختصر طور سے اس کا بھی ذکر کریں گے۔

مقام اول

اس میں چند فصول ہیں

پہلی فصل

مذہبی عقائد میں ریاکاری

ریاکاری کے جملہ اقسام میں سب سے بدترین ریاکاری بنیادی عقائد اور معارف الہیہ میں "ریا" ہے اس کا انجام سب سے بدتر اور اس کی تاریکی تمام ریاکاریوں کی تاریکی سے زیادہ اور سخت ہے۔ اگر کوئی شخص ایسے عقائد و نظریات کا سچے دل سے معتقد نہ ہو جن کا وہ اظہار کرتا ہے اس کا شمار منافقین میں ہے، اس کی سزا دائمی جہنم ہے اور اس کیلئے بڑی ہلاکت اور سب سے زیادہ شدید عذاب ہے اور اگر وہ معتقد تو ہے مگر لوگوں کی نظر اور دل میں عظمت و منزلت حاصل کرنے کی خاطر اس کا مظاہرہ کرتا ہے تو اگرچہ وہ منافق نہیں ہے لیکن اس ریا کی وجہ سے نور ایمان اس کے دل سے چلا جائے گا اور اس کی جگہ کفر کی تاریکی لے لے گی، کیونکہ ایسا شخص بنیادی طور پر شرک خفی میں مبتلا ہونے کی وجہ سے مشرک ہے، کیونکہ الہی نظریات اور عقائد فقط خالص خدا کیلئے ہونے چاہئیں اور ان کا مالک بھی خالق حقیقی ہے اور اس شخص نے اپنے عقائد کو لوگوں کے حوالے کر کے، دوسرے کو اس میں شریک بنانے اور اس کو شیطان کے تصرف میں دینے کا جرم کیا ہے اور اس کا دل خدا کیلئے خالص نہیں رہا۔

میں کسی فصل میں بیان کروں گا کہ "ایمان محض علم کا نام نہیں بلکہ اس کیلئے قلبی تعلق بہت ضروری ہے" جیسا کہ اس حدیث شریف میں آیا ہے۔ "ہر ریا شرک ہے" مگر یہ ہلاک کرنی والی معصیت، تاریک سیرت اور خبیث صفت اور انسان کو اس منزل تک پہنچا دیتی ہے کہ اس کا دل غیر خدا کا گھر بن جاتا ہے، پھر رفتہ رفتہ اس بری خصلت کی تاریکی انسان کو اس منزل تک پہنچا دیتی ہے کہ وہ دنیا سے بے ایمان چلا جاتا ہے یہ خیالی ایمان (درحقیقت) ایک جسم بے روح، ایک صورت بے معنی، ایک بے مغز چھلکا ہوتا ہے اور خدا کے نزدیک قابل قبول نہیں ہے۔ جیسا کہ اس فرمان کی طرف کافی شریف کی اس حدیث میں اشارہ

موجود ہے جو "علی بن سالم" سے مروی ہے۔ ﴿سمعت ابا عبد الله علیه السلام یقول قال الله عز وجل انا خیر شریک من اشرک معی غیری فی عمل عمله لم اقبله الا ما کان لی خالصا﴾
راوی کہتا ہے میں نے امام جعفر صادق کو فرماتے ہوئے سنا کہ خداوند متعال فرماتا ہے "میں سب سے بہتر شریک ہوں۔ اگر کوئی شخص اپنے کسی کام میں میرے علاوہ دوسرے کو بھی شریک قرار دیدے تو میں اس عمل کو قبول نہیں کرتا ہوں۔ میں صرف اس عمل کو قبول کرتا ہوں جو خالص میرے لئے ہوتا ہے"۔

واضح ہے دل سے تعلق رکھنے والے اعمال اگر خالص نہ ہوں خدا ان کو قبول نہیں کرتا اور اس کو اس شریک کے حوالے کر دیتا ہے اور وہ شریک ایسا شخص ہے جس کو دکھانے کیلئے یہ عمل کیا گیا ہے۔ اس طرح قلبی اعمال اس شخص کیلئے مخصوص ہو جاتے ہیں اور وہ اعمال شرک کی حد سے نکل کر کفر میں داخل ہو جاتے ہیں، بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ شخص بھی منافقین میں سے ہے۔ جس طرح اس کا شرک خفی ہے اس کا نفاق بھی خفی ہے۔ (حالانکہ) اس بے چارے کو یہی گمان رہا کہ وہ مومن ہے مگر وہ تو ابتدا ہی سے مشرک تھا جو بالآخر منافق ہے اور نفاق کا عذاب اس کو بہر حال چکھنا ہوگا اور وائے ہو اس شخص کی حالت پر جس کے کام کا انجام نفاق پر ختم ہو!

دوسری فصل

علم و ایمان کا فرق

جان لو کہ ایمان ایک الگ چیز ہے اور خدا کی معرفت و وحدانیت نیز دیگر صفت کمالیہ، مثلاً صفات ثبوتیہ، جلالیہ و سلبیہ کا علم ملائکہ، انبیاء، آسمانی کتابوں اور قیامت کا علم الگ چیز ہے، کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی ان تمام چیزوں کا علم رکھتا ہو مگر مومن نہ ہو۔ شیطان ان تمام مراتب کا کم از کم ہمارے اور آپ کے برابر علم رکھتا ہے مگر اس کے باوجود وہ کافر ہے، بلکہ ایمان ایک قلبی عمل ہے اور اگر ایمان کا تعلق دل سے نہ ہو تو پھر وہ ایمان نہیں ہے۔

اگر کوئی شخص دلیل عقلی کے ذریعہ یا دینی ضرورت کی بنا پر کسی چیز کا علم حاصل کرے تو پھر دل سے بھی اس کو قبول کرنا پڑے گا اور قلبی عمل کو بھی جو ایک قسم کا مان لینا (اور اس کے سامنے) سر تسلیم خم کرنا، قبول کرنا اور عقیدت سے سر جھکانا ہے، انجام دے تاکہ مومن ہو سکے۔ ایمان کے کامل ہونے کی دلیل اطمینان قلب کا حصول ہے۔ نور ایمان جتنا قوی ہوگا دل کو اتنا ہی اطمینان حاصل ہوگا اور یہ تمام چیزیں علم کے علاوہ ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ برہان ودلیل کے ذریعے آپ کی عقل ایک چیز کا ادراک کرے اگر آپ کا دل اس کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو تو وہ علم بیکار و بے فائدہ ہے۔ مثلاً آپ نے اپنی عقل کے ذریعے یہ ادراک کر لیا کہ مردہ کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا اور دنیا کے سارے مردے ایک مکھی کے پر کے برابر بھی حس وحرکت پر قادر نہیں ہیں۔ اس لئے کہ اس کی تمام جسمانی اور روحانی طاقتیں اس سے جدا ہو چکی ہیں لیکن اگر اس مطلب کو آپ کے دل نے قبول نہیں کیا اور آپ کے ذہن میں نہیں سما سکا ہے تو آپ کسی تاریک رات میں ایک مردے کے پہلو میں شب بسر نہیں کر سکیں گے اور اگر آپ کے دل نے عقل کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے اس کا فیصلہ قبول کر لیا ہے تو یہ کام آپ کیلئے کوئی مشکل نہیں ہے اور اگر کہیں آپ نے چند بار عقل کی تسلیم کردہ بات پر عمل بھی کر لیا ہے تو پھر مردے کے ساتھ رات بسر کرنا آپ کیلئے معمولی بات ہوگی۔

پس اس سے پتہ چلا کہ تسلیم وسپردگی جو صفت قلب ہے وہ اس علم کے علاوہ ہے جو "صفت عقل" ہے۔ ممکن ہے کہ انسان دلیل وبرہان سے خدا کا وجود اس کی وحدانیت قیامت اور دیگر عقائد حقہ کا اثبات کر سکے۔ لیکن ان عقیدوں کو ایمان نہیں کہہ سکتے اور نہ اس شخص کو مومن کہہ سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس شخص کا شمار کفار یا مشرکین یا منافقین میں ہو کیونکہ آج آپ کی دل کی آنکھ بند ہے اور آپ ملکوتی بصیرت نہیں رکھتے اور دنیاوی آنکھ اس کا ادراک نہیں کر سکتی۔ اس لیے جب پردہ اٹھے گا اور الٰہی حکومت کا ظہور ہوگا اور کائنات ختم ہو جائے گی تو حقیقت سامنے آئے گی۔ تب آپ کو پتہ چلے گا کہ آپ خدا پر ایمان نہیں رکھتے تھے اور آپ کی عقل کا یہ حکم آپ کے ایمان سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا۔ اس لئے جب تک انسان کی صاف وشفاف لوح دل پر عقل کے قلم سے ﴿لا الٰہ الا اللہ﴾ لکھا نہ جائے انسان وحدانیت خدا کا مومن نہیں ہو سکتا اور جب کلمہ طیبہ الٰہیہ قلب میں سما جاتا ہے تو انسان کے دل کی دنیا خود بخود مملکت خدا بن جاتی ہے اور پھر انسان حق کی مملکت میں کسی دوسرے کے عمل دخل کو نہیں مانتا اور نہ کسی اور سے جاہ وجلال کی توقع رکھتا اور نہ ہی دوسروں سے منزلت وشہرت کا طالب ہو سکتا ہے۔ اس کے حدود میں نہ دنیا کا رہتا ہے نہ [illegible]

لہٰذا اگر اپنے دل میں یہ دیکھو تو سمجھ لو کہ تمہارے دل نے عقل کی بات نہیں مانی اور ایمان کی روشنی تمہارے دل میں نہیں پڑی اور تم کسی دوسرے کو خدا اور عالم پر اثر انداز مانتے ہو اور تمہارا شمار منافقین یا مشرکین یا کفار میں سے ہوتا ہے۔

تیسری فصل: ریا کی برائیاں

اے ریا کار انسان! تو نے سچے عقائد اور الٰہی معارف کو دشمن خدا "شیطان" کے حوالہ کر دیا جو چیزیں خدا کیلئے مخصوص تھیں تو نے ان کو دوسروں کے سپرد کر دیا جو انوار روح وقلب کو روشنی بخشنے والے تھے، ابدی فلاح وسعادت کے سرمائے کا باعث تھے، لقائے الٰہی کا سرچشمہ اور محبوب (حقیقی) کا قرب حاصل کرنے کے بیج تھے، ان کو تو نے وحشت ناک تاریکیوں، ابدی شقاوت وہلاکت محبوب حقیقی کی مقدس بارگاہ اور خداوند متعال کی لقا کے راستے سے ہٹا دیا ہے۔ اب تو ان تاریکیوں کیلئے تیار ہو جا جن کے بعد کوئی نور نہ ہوگا، ان تنگیوں کیلئے آمادہ ہو جا جس کے بعد کوئی وسعت نہ ہوگی اور ایسی بیماریوں کیلئے تیار ہو جا جن کیلئے شفا نہیں ہے ایسی موت کیلئے تیار ہو جا جس کے بعد زندگی نہیں ہے۔ ایسی آگ کو برداشت کرنے کیلئے آمادہ ہو جا جو قلب کے اندر سے اٹھے گی اور روح وبدن کو اس طرح جلائے گی جس کے بارے میں میرا اور تمہارا دل سوچ بھی نہیں سکتا۔ جیسے کہ خدا نے اپنی کتاب قرآن مجید کی اس آیت میں اس آگ کی طرف اشارہ فرماتا ہے جو دلوں میں داخل ہو کر ان کو جلا دیتی ہے ﴿نارُ اللهِ المُوقَدَةُ الّتي تطّلعُ على الأفئدة﴾۵ وہ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں تک پہنچ جائے گی۔

آتش الٰہی کے علاوہ کوئی بھی آگ دل کو جلانے والی نہیں ہے۔ اگر فطرت توحید ہاتھوں سے نکل گئی جسے "فطرۃ اللہ" کہا گیا ہے اور اس کی جگہ کفر وشرک کا قبضہ ہو گیا تو پھر ایسے انسان کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت بھی فائدہ نہ پہنچا سکے گی اور وہ دائمی عذاب میں مبتلا رہے گا اور وہ بھی کیسا عذاب؟ جو عذاب قہر الٰہی اور غیرت خداوندی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

اس لئے اے عزیز! صرف ایک خیال باطل کیلئے ایک معمولی سی مقبولیت کیلئے اور وہ بھی خدا کے کمزور اور بے بس بندوں کے درمیان اور مجبور ونا چار انسانوں کی تھوڑی سی توجہ حاصل کرنے کیلئے اپنے کو قہر وغضب الٰہی کا مستحق نہ بنا اور خدا کی محبتوں، غیر متناہی کرامتوں اور پروردگار کی مہربانیوں اور رحمتوں کو لوگوں کی نظروں میں محبوبیت کے عوض بیچ نہ دے، جس کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور اس سے حسرت وندامت کے علاوہ اور کچھ بھی نہ پائے گا جب اس دنیا تک تیری دسترس نہ رہے گی جو کسب وحصول کی دنیا ہے اور تیرے اعمال کا سلسلہ قطع ہو جائے گا۔ اس وقت پشیمانی کا کوئی فائدہ نہ ہوگا اور خدا کی طرف رجوع بے سود رہے گا۔

چوتھی فصل۔ ریا کی بیخ کنی کا علمی طریقہ

یہاں پر ہم ایسی چیز کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو اس مقام پر اور دوسرے مقامات پر اس قلبی بیماری کیلئے مفید ہے اور یہ بات عقلی اصولوں اور دلائل کے ساتھ ساتھ مکاشفہ وعیان اور خبر معصومینؑ اور قرآن کے بھی مطابق ہے اور اس کو تمہاری عقل بھی ماننے پر مجبور ہے اور وہ یہ ہے۔

چونکہ قدرت الٰہی تمام موجودات پر محیط ہے اور اس کی سلطنت تمام کائنات میں پھیلی ہوئی ہے اور اس کی حکومت کا احاطہ تمام ممکنات پر ہے۔ اس لئے تمام بندوں کے دل اس کے زیر تصرف اور خدا کی قدرت اور سلطنت کے قبضے میں ہیں اور کوئی شخص لوگوں کے دلوں پر خدا کے اذن اور قوت تخلیق کی اجازت کے بغیر کسی قسم کا تصرف نہیں کر سکتا، بلکہ خود صاحبان دل بھی خدا کی مشیت اور اجازت کے بغیر اپنے دلوں پر تصرف نہیں کر سکتے۔ شریعتاً وکنایتاً وصراحتاً اسی مطلب کی طرف قرآن اور اخبار اہل بیتؑ میں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

پس پروردگار عالم ہی تمہارے دل کا مالک اور اس پر تصرف کرنے والا ہے اور آپ جو خدا کے ایک ضعیف و عاجز بندے ہیں خود بھی مشیت الٰہی کے بغیر اپنے دلوں پر تصرف نہیں کر سکتے، بلکہ اس کا ارادہ آپ کے اور تمام مخلوقات کے ارادوں پر غالب و حاکم ہے اس لئے اگر تمہارے ریاکاری و چاپلوسی لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچنے کیلئے اور کسی کا دل رکھنے یا دلوں میں اپنی قدر و منزلت بڑھانے کیلئے ہے اور دنیا میں شہرت حاصل کرنے کیلئے ہے تو یہ بات عملی طور پر آپ کیلئے ناممکن ہے جبکہ خداوند متعال اس پر قادر ہے چونکہ خدا دلوں کا مالک ہے اور دلوں کو جس شخص کی طرف چاہتا ہے متوجہ کر دیتا ہے، بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ نتیجہ آپ کے مقصد کے بالکل ہی برخلاف ہو۔ کیونکہ ہم نے سنا بھی ہے اور دیکھا بھی ہے کہ ریاکار و منافق قسم کے لوگ جن کے دل پاک نہیں تھے وہ ذلیل و رسوا بھی ہوئے ہیں اور جو وہ چاہتے تھے نتیجہ اس کے برخلاف نکلا ہے۔ چنانچہ کافی کی ایک حدیث میں اسی مطلب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے

عن جراح المدائني عن أبي عبد الله عليه السلام في قول الله عزّ وجلّ ﴿فمن كان يرجو لقاء ربّه فليعمل عملاً صالحاً ولا يُشرك بعبادة ربّه أحداً﴾ قال عليه السلام الرّجل يعمل شيئاً من الثّواب لا يطلب به وجه الله إنّما يطلب تزكية النّاس يشتهي أن يُسمع به النّاس فهذا الّذي أشرك

بعبادة ربّه ثُمّ قال: ما من عبدٍ أسرّ خيراً فذهبت الأيام أبداً حتى يُظهِر الله له خيراً، وما من عبدٍ أسرّ شرّاً فذهبت الأيام أبداً حتى يُظهِر الله له شرّاً"؛

راوی جراح مدائنی نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے خداوند عالم کے اس کلام: "جو شخص خواہشمند ہے اپنے پروردگار کے سامنے حاضر ہو اس کو اچھے کام کرنے چاہئیں اور خدا کی عبادت میں کسی کو شریک نہیں کرنا چاہئے" کی تفسیر میں نقل کیا ہے "انسان کوئی کار ثواب کرے مگر وہ خدا کی رضا حاصل کرنے کیلئے نہ ہو بلکہ اس کا مقصد یہ ہو کہ لوگ اس کو بڑا پرہیزگار خیال کریں اور اس کو اس بات کا شوق ہو کہ لوگ اس کے اعمال وکردار کے بارے میں سن لیں تو گویا اس نے اپنے رب کی عبادت میں شریک قرار دیا"۔ اس کے بعد فرمایا "اگر کوئی شخص (صرف خدا کیلئے) کوئی کام چھپا کر کرے تو کچھ دن گزرنے کے بعد خدا اس کی نیکیوں کو ظاہر کر دیتا ہے۔ (اسی طرح) جو بھی انسان اپنے برے اعمال کو ہمیشہ چھپاتا رہے پھر بھی خدا کبھی نہ کبھی اس کی برائیوں کو ظاہر کر دیتا ہے"۔

پس اے عزیز! اپنی نیک نامی کو خدا سے طلب کرو۔ لوگوں کے دلوں کو جذب کرنا چاہتے ہو تو دلوں کے مالک سے اس کی خواہش کرو۔ تم ہر کام خدا کیلئے کرو۔ خداوند عالم آخرت میں تم پر عنایت وکرم کرنے اور تم کو عالم آخرت کی نعمتوں سے نوازنے کے علاوہ اس دنیا میں بھی تم پر اپنی نوازشیں کرے گا۔ تم کو ہر دلعزیز بنادے گا۔ دلوں میں تمہاری عزت زیادہ کرے گا اور دونوں عالم میں تم کو سربلند کر دے گا۔

اور اگر کہیں تم ریاضت وزحمت سے اپنے دل کو اس محبت سے بھی پوری طرح خالی کر کے اپنے باطن کو پاک وپاکیزہ کر لو، تب تو اس اعتبار سے بھی تمہارا عمل خالص ہو جائے گا۔ دل خدا کی طرف متوجہ ہو جائیگا۔ روح کثافتوں اور آلائشوں سے پاک وصاف ہو جائے گی۔ نفس کی کدورت دور ہو جائے گی۔ (خدا کے مقابلہ میں) کمزور وناتواں بندوں کی محبت ونفرت اور خدا کے حقیر بندوں کے نزدیک شہرت کا آخر کیا فائدہ ہے؟ اور اگر بالفرض کوئی فائدہ ہو بھی تو ایک معمولی اور چند روزہ عارضی فائدہ ہے۔ (یہ بھی) ممکن ہے کہ حب جاہ ومقام کی وجہ سے انسان کے کاموں میں ریا کا عنصر شامل ہو جائے جو خدا نخواستہ آدمی کو مشرک ومنافق وکافر بنادے۔

(جس کے نتیجہ میں) اگر تمہاری اس دنیا میں رسوائی نہ بھی ہوئی۔ پھر بھی دوسری دنیا میں خدا کی عدالت میں، خدا کے نیک بندوں، انبیائے عظام وملائکہ مقربین کے سامنے تو بہرحال ذلت ورسوائی ہوگی (شرم

سے) سر نیچا کرنا پڑے گا اور اس دن تم ناچار ہو جاؤ گے۔ اس دن کی رسوائی کا تو تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ کیسی رسوائی ہوگی؟ اس بارگاہ میں ہونے والی ذلت و رسوائی کے پیچھے کتنی بھیانک تاریکیاں ہیں اس کا علم صرف خدا کو ہے۔ وہ دن ایسا ہوگا کہ بقول پروردگار عالم ''کافر کہے گا اے کاش میں مٹی ہوتا، لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا''۔8

اے بے بس (انسان)! لوگوں کی معمولی محبت حاصل کرنے کیلئے، ان کے سامنے ایک بے فائدہ شہرت کی خاطر تو نے کیسی فضیلتوں کو کھو دیا، رضائے الٰہی کو اپنے ہاتھ سے نکل جانے دیا اور اپنے کو غضب الٰہی کا مستحق بنایا، جن اعمال کے ذریعہ فضیلت کا گھر اور ابدی و دائمی خوشی حاصل کرتا، بہشت کے اعلیٰ علیین میں اپنے لئے جگہ حاصل کرتا۔ ان کو شرک و نفاق کی تاریکیوں میں تبدیل کیا اور اپنے لئے حسرت و ندامت اور عذاب شدید کو مہیا کر لیا اور اپنے کو جہنمی بنا لیا۔

اصول کافی میں ایک روایت امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے جس میں حضرت نے فرمایا رسول خدا کا ارشاد ہے ''جب فرشتہ کسی بندے کے اعمال کو خوشی سے اوپر لے جاتا ہے تو جیسے ہی وہ اس کے نیک کاموں کو لے کر اوپر پہنچتا ہے خدا کہتا ہے اس کے اعمال کو سجین (جہنم) میں ڈال دو اس لئے کہ اس نے ان اعمال کو صرف میرے لئے نہیں انجام دیا''۔9

میں اور تم تو اس حالت میں سجین کا تصور نہیں کر سکتے ورنہ فاسق و فاجر لوگوں کے نامۂ اعمال کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ ان اعمال کی (اصلی) صورتوں کو جو سجین میں ہوں گی دیکھ سکتے ہیں اور جب حقیقت امر کو دیکھیں گے تو (وقت گزر چکا ہوگا) ہمارے ہاتھ کوتاہ ہو چکے ہوں گے راہ چارہ و تدبیر ختم ہو چکی ہوگی

(اس لئے) اے عزیز! بیدار ہو جاؤ اور غفلت و مستی کو اپنے سے دور کر دو، اپنے اعمال کو عقل کی ترازو میں تول لو، اس سے پہلے کہ یہاں اس عالم میں تولے جائیں۔ تمہارا حساب کیا جائے اس سے پہلے تم خود اپنا حساب کرو، اپنے آئینۂ دل کو شرک و نفاق اور دوغلے پن سے پاک کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کفر و شرک کا اس پر ایسا رنگ لگ جائے جس کو دوسری دنیا کے آتشیں شعلے بھی ختم نہ کر سکیں۔ ایسا نہ کرو کہ نور فطرت، ظلمت کفر میں بدل جائے۔ (ارشاد خداوندی ہے) ﴿فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا﴾10 یہی خدا کی وہ فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ ایسا کام نہ کرو کہ ''فطرۃ اللہ'' برباد ہو جائے۔ امانت الٰہی میں (اب اتنی بھی) خیانت نہ کرو۔ آئینۂ دل کو (اتنا) پاک کرو کہ جمال حق کا نور اس میں جلوہ گر ہو سکے پھر

تم کو دنیا وما فیہا سے بے نیاز کر دے اور محبت الٰہی کی آگ دل میں روشن ہو کر تمام دوسری چاہتوں کو اس طرح جلا دے کہ تم پورے عالم کو اس کے ایک لمحے کے عوض بیچنا پسند نہیں کرو گے، اور ذکر الٰہی و یاد خدا سے وہ لذت تم کو حاصل ہوگی جس کے مقابلے میں تمام حیوانی لذتیں بازیچہ اطفال معلوم ہوں گی اور اگر تم اس مقام کے اہل نہیں ہو اور یہ مطالب تم کو عجیب (وغریب) معلوم ہوتے ہیں تو (کم از کم) دوسری دنیا کی ان الٰہی نعمتوں کو جن کی خبر قرآن مجید نے اور ائمہ معصومینؑ کی حدیثوں نے دی ہے، اپنے ہاتھ سے تو نہ جانے دو اور چند روزہ خیالی سی شہرت اور خدا کی کمزور مخلوق کے دلوں میں جگہ پانے کیلئے ان تمام ثواب کو ضائع و برباد تو نہ کرو، اپنے آپ کو خدا کی ان ساری کرامتوں سے محروم نہ کرو اور ابدی سعادت کو دائمی بدبختی سے نہ بدلو۔

پانچویں فصل: خلوص عمل

یہ سوچو کہ وہ خدا جو حقیقی مالک الملوک اور واقعی ولی نعمت ہے کس نے ہم کو یہ تمام کرامتیں عطا فرمائی ہیں اور یہ سارے انتظامات ہمارے لئے کئے ہیں کہ ہمارے اس دنیا میں آنے سے پہلے ہم کو ایک ایسی عمدہ غذا سے نوازا جس میں اچھے اور مناسب اجزاء موجود ہیں اور ہمارے کمزور معدے کیلئے نہایت ہی موزوں ہے، ہمارے لئے تربیت کرنے والے اور ذاتی وفطری طور سے محبت کرنے والے، بے لوث خدمت کرنے والے (ماں باپ) مناسب ماحول اور خوشگوار آب وہوا اور ظاہری وباطنی نعمتوں کو مہیا کیا اور (صرف اسی دنیا میں نہیں بلکہ) عالم آخرت اور برزخ میں بھی ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے ڈھیر سارے انتظامات کئے ہیں اور ہم سے صرف یہ چاہا کہ اس دل کو صرف اس کیلئے یا اس کی کرامتوں کیلئے خالص رکھیں تاکہ اس کے نتیجے میں فائدہ بھی ہم ہی کو پہنچے، اس کے بعد بھی ہم اس کی بات پر کان نہ دھریں، اس کی نافرمانی کریں، اس کی مرضی کے خلاف قدم کریں تو کتنا بڑا ہم نے ظلم کیا ہے اور کیسے مالک الملوک سے جنگ کی ہے؟ تو پھر اس کا نتیجہ بھی ہم ہی کو بھگتنا ہوگا (ہماری نافرمانی سے) اس کی سلطنت وحکومت کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا اور نہ ہم اس کی مملکت وسلطنت سے خارج ہو سکتے ہیں۔ ہم مشرک ہوں یا موحد، خدا کیلئے کوئی فرق نہیں پڑتا، ہم عارف خدا، باتقویٰ اور اچھے نفس کے مالک بنیں تو ہمارا اپنا فائدہ ہے اور کافر ومشرک ہو جائیں تب بھی ہم نے اپنے آپ کو نقصان پہنچایا ہے۔ ﴿فَإِنَّ اللهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ﴾[1] بے شک خدا سارے جہان سے بے نیاز ہے۔ وہ نہ تو ہماری عبادت کا محتاج ہے اور نہ ہی ہمارے اخلاص اور بندگی کا، ہماری نافرمانی،

شرک ورنفاق ورود وغلے پن سے اس کی حکومت کا کچھ نہیں بگڑتا۔

لیکن چونکہ خدا ارحم الراحمین ہے، اس کی رحمت واسعہ اور حکمت بالغہ اس بات کی متقاضی ہے کہ ہم کو ہدایت کرے، خیر وشر، اچھائی وبرائی کا راستہ ہم کو دکھائے راہ انسانیت کی بلندی سے نیچے گرنے اور سعادت کے رستوں پر لغزش کھانے سے ہم کو آگاہ کرے۔ خداوند عالم کا ہماری ہدایت ورہنمائی کرنے میں، بلکہ ان عبادتوں اور اخلاص وبندگی میں ہم پر بہت بڑا احسان وکرم ہے۔ اس کے ان حسنات کا بدلہ ہم کو اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک ہماری چشم بصیرت نہ کھلے اور اصلیت کو دیکھنے اور پرکھنے کی برزخی آنکھ نہ کھلے اور جب تک ہم اس تنگ وتاریک دنیا میں ہیں اور فطرت کے ظلمت کدہ میں سیر ہیں۔ زنجیر زمان میں بستہ مختلف مقامات کے تسلسل کی تاریکی میں مقید ہیں۔ خدا کی عظیم نعمتوں کا ادراک نہیں کرسکتے اور نہ یہ خیال کرسکتے ہیں کہ یہی خلاص وعبادت خدا کی نعمتوں کا شکریہ ہیں اور اس کی راہنمائی کا یہی حق ہے۔ تم تو بھول کر بھی گمان نہ کرنا کہ انبیائے الہیؑ اور اولیائے خدا یا علمائے امت جو ہماری سعادت وفلاح کے رہنما ہیں اور ہم کو جہالت وتاریکی اور بدبختی سے نجات دلاتے اور عالم نور، سرور اور خوشی وعظمت کی طرف دعوت دیتے ہیں اور ان تمام تاریکیوں سے جو باطل عقائد کا نمونہ (بلکہ) جہل مرکب ہیں ان سے نجات دلانے اور ہماری تربیت کرنے کیلئے تمام زحمتوں اور مشقتوں کو برداشت کیا ہے اور کرتے ہیں اور برے اخلاق وبرے ملکات سے ہمیں نجات دلانے کیلئے جو عذاب وفشار کی صورت میں ہم سے ناقابل جدائی ہیں اور ہمارے برے افعال واعمال وحشت ناک ووحشت ناک صورتوں سے چھٹکارا دلانے کیلئے سعی وکوشش کرتے ہیں اور ایسے انوار مقدسہ، بہجت وسرور، خوشی ومسرت اور حور وقصور تک ہمیں پہنچانے کوشش کرتے ہیں جن کا ہم تصور بھی نہیں کرسکتے ان حضرات پر ہم عبادت کر کے احسان کررہے ہیں۔

یہ دنیا اپنی تمام تر وسعت کے باوجود اس میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ بہشتی مقامات میں سے ایک مقام بھی یہاں لایا جاسکے اور ہماری آنکھوں میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ حورالعین کے یک بال کا نظارہ کرسکیں۔ (البتہ) یہ ان عقائد اور اخلاق واعمال کی ملکوتی صورتیں ہیں۔ جن کا ادراک انبیائے کرامؑ نے کیا ہے خاص کر صاحب کشف اور مکمل ضابطۂ حیات دینے والے خاتم الانبیاء ﷺ نے ان کا ادراک وحی الٰہی کے ذریعے کر لیا تھا دیکھا بھی تھا، سنا بھی اور ہم کو بھی ان کی طرف دعوت دی تھی۔ (لیکن) ہم لوگ بے چارے ان بچوں کی طرح ہیں جو (اپنی ناسمجھی کی وجہ سے) عقلاء کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں، بلکہ حکم عقل ہی کو غلط

بتاتے ہیں اور ہمیشہ عقلاء سے برسر پیکار رہتے ہیں۔ مگر ان مطمئن اور صاف شفاف نفوس اور پاک و پاکیزہ مقدس ارواح نے اپنی اس شفقت و مہربانی کی وجہ سے جو ان کو بندگان خدا سے ہے کبھی بھی ہماری نادانی کی وجہ سے اپنی دعوت میں کوتاہی نہیں کی، (بلکہ) ہمیشہ ہم کو بہشت وسعت حق کی طرف کھینچتے رہے اور اس عظیم کارنامے پر ہم سے کسی اجرت کے بھی درخواست نہیں، بلکہ اگر رسول اکرمؐ نے اپنی اجرت کو ذوی القربٰی کی مودّت ۱۲؎ میں منحصر بھی کیا ہے تو شاید اس لئے کہ دوسری دنیا میں یہ محبت و مودت تمام صورتوں سے نورانی تر ہوگی اور وہ بھی خود ہمارے لئے اور ہمیں سعادت و رحمت تک پہنچنے کیلئے ہے۔ پس رسالت کی اجرت بھی ہماری ہی طرف پلٹے گی اور اس سے ہم ہی کو فائدہ ہوگا۔ بھلا ہم بے چاروں کا ان ہستیوں پر کیا احسان ہے؟ ہمارے اخلاص اور ہماری عقیدتمندی سے آخر ان کو کیا فائدہ پہنچے گا؟ ہم اور آپ نے علمائے کرام پر کیا احسان کیا ہے؟ دینی مسائل سے آگاہ کرنے والے ایک عالم دین سے لے کر حضور سرورکائنات تک اور آنحضرتؐ سے لے کر خداوند عالم تک ہر ایک نے اپنے اعتبار سے ہم کو ہدایت کی اور ہم پر احسان کیا ہے۔ جس کی جزا اس عالم میں دینا ہمارے لئے ناممکن ہے۔ یہ عالم اس لائق نہیں ہے کہ ان حضرات کو جزا دی جاسکے۔ درحقیقت خدا اور رسولؐ اور اس کے اولیاء کا احسان ہے۔ جیسے کہ خداوند متعال نے اعلان کیا ہے:

﴿قُلْ لَا تَمُنُّوا عَلَيَّ إِسْلَامَكُمْ بَلِ اللَّهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيمَانِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ☆ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ﴾ ۱۳؎

تم کہہ دو کہ تم اپنے اسلام کا مجھ پر احسان نہ جتاؤ (بلکہ) اگر تم (دعوائے ایمان میں) سچے ہو تو (سمجھ لو کہ) خدا نے تم پر احسان کیا ہے کہ تم کو ایمان کا راستہ دکھایا ہے۔ بے شک خدا تو سارے آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی باتوں کو جانتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔

پس (بالفرض) اگر ہم اپنے دعوائے ایمان میں سچے بھی ہوں تو اس ایمان میں بھی خدا کا ہمارے اوپر احسان ہے۔ خدا عالم غیب کا جاننے والا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہمارے اعمال اور ہمارے ایمان و اسلام کی صورتیں عالم غیب میں کیسی ہیں؟ ہم بے چاروں کو حقیقت پر اطلاع نہیں ہے لہذا (دینی) مسائل بیان کرنے والے مولوی سے علم حاصل کرتے ہیں اور (پھر الٹا) اسی پر احسان جتاتے ہیں! عالم دین کی تقلید کرتے ہیں اور اس پر دھونس جماتے ہیں! کسی عالم کے پیچھے نماز جماعت پڑھتے ہیں اور پھر اس پر احسان جتاتے ہیں! حالانکہ ان لوگوں کا ہمارے اوپر احسان ہے۔ لیکن ہمیں اس کا علم نہیں ہے۔ یہ احسانات کا جتانا

سارے اعمال کو الٹ پلٹ دیتا ہے، جہنم رسید کر دیتا اور سب کو فنا کر دیتا ہے۔

دوسرا مقام

اس میں دو فصلیں ہیں

پہلی فصل

جان لو کہ اگرچہ یہاں پر، ریاکاری اتنی شدید نہیں ہے جتنی مقام اول میں تھی پھر بھی ایک مطلب کی طرف متوجہ ہونے کے بعد یہ امکان ہے کہ مقام دوم کا ریاکار مقام اول کے ریاکار کے برابر ہو جائے۔ ہم نے پہلے حدیث کی شرح میں یہ بیان کر دیا تھا کہ ہو سکتا ہے عالم ملکوت میں انسان کی صورتیں کئی ہوں جو اس دنیا کے برخلاف ہوں، اور وہ صورتیں نفس کے دائرہ اختیار میں ہیں اور نفسانی خواہشات کی تابع ہوتی ہیں۔ اگر تم اچھے انسانی ملکات کے حامل ہو گے تو ان کی بنا پر تمہاری صورت انسانی ہو سکتی ہے کہ تم انہی ملکات کے ساتھ محشور ہو جاؤ اس حالت میں کہ وہ اعتدال کی حد سے تجاوز نہ کر چکے ہوں، بلکہ تمہارے ملکات اسی وقت اچھے اخلاق کہلائیں گے جب نفس امارہ نے ان میں کسی قسم کا تصرف نہ کیا ہو اور ان کے تشکیل پانے میں نفس کا ذرہ بھی شائبہ نہ رہا ہو۔

ہمارے استاد و شیخ فرمایا کرتے تھے ''ریاضت باطل اور صحیح شرعی ریاضت میں فرق یہ ہے کہ اس میں نفس کی مداخلت کتنی ہے اور حق کا دخل کتنا ہے؟ اگر سالک نفس کی پیروی کرتا ہے اور اس کا مقصد (اس ریاضت سے) نفس کی قوتوں کو مضبوط بنانا ہے اور نفس کی سلطنت و قدرت کو وسیع کرنا ہے تو پھر وہ ریاضت باطل ہے اور اس کا سلوک، آخرت میں اس کیلئے نقصان دہ ہوگا، اسی قسم کے لوگ جھوٹے اور کھوکھلے دعوے کیا کرتے ہیں۔ لیکن اگر سالک حق کے راستے میں قدم بڑھاتا ہے اور اس کا مقصد خدا کی جستجو ہے تو اس کی ریاضت شرعی اور حق پر مبنی ہے اور خدا اس کی مدد کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے ﴿والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا﴾ [۱۴] ''اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں جہاد کیا انہیں ہم ضرور اپنی راہ کی ہدایت کریں گے''۔ اس لئے ایسے انسان کو سعادت نصیب ہوتی ہے۔ اس کی نفس پرستی و خود غرضی دور ہو جاتی ہے اور خود نمائی اس کے پاس نہیں آپاتی''۔

یہ بات سب ہی کو معلوم ہے اگر کسی کا مقصد اپنے اخلاق اور ملکات حسنہ سے یہ ہو کہ وہ لوگوں کا مرکز

نظر بن جائے اور لوگ اس کو دیکھیں تو اس کا یہ اقدام نفس پرستی، خود بینی وخود غرضی وخود پرستی ہے اور خود بینی کے ساتھ خدا بینی وخدا خواہی کا تصور ایک خام خیال اور باطل وناممکن امر ہے۔ جب تک تمہارے وجود کی مملکت حبِّ نفس، حبِّ جاہ وجلال، بندگان خدا میں حصول شہرت اور ان پر حکومت وریاست سے پر ہے اس وقت تک تمہارے اخلاق وصفت کو نہ ملکات فاضلہ میں شمار کیا جا سکتا ہے اور نہ تمہارے اخلاق کو اخلاق الٰہی کہا جا سکتا ہے۔

(ایسی صورت) میں تمہاری مملکت کا کارکن شیطان ہے اور تمہارا باطن بھی انسانی صورت کے مطابق نہیں ہے اور برزخ میں پہنچ کر اپنی ملکوتی آنکھ کھولنے کے بعد اپنے ملکوتی برزخ کو غیر انسانی صورت میں، مثلاً شیطانوں میں سے کسی شیطان کی صورت میں پاؤ گے اور ایسے قلوب کیلئے "جو شیطان کی منزل ہے" صحیح توحید اور معارف الٰہی کا حصول محال ہوا کرتا ہے اور جب تک تمہارا ملکوت انسانی نہ ہو جائے اور تمہارا دل ان ناہمواریوں اور خود خواہیوں سے پاک نہ ہو جائے وہ خداوند عالم کا گھر نہیں بن سکتا۔

حدیث قدسی میں ارشاد ہے ﴿لا تسعني أرضي ولا سمائي، بل يسعني قلب عبدي المؤمن﴾[۱۵] "میری زمین اور میرے آسمان میں، میں نہیں سما سکتا، میں صرف اپنے مؤمن بندے کے دل میں سما سکتا ہوں"۔ مؤمن کے دل کے علاوہ کوئی بھی مخلوق محبوب حقیقی کے حسن وجمال کا آئینہ نہیں بن سکتا۔ مؤمن کے دل پر حق کا راج ہے نفس کا نہیں، مؤمن کا دل خود سر اور ہرجائی نہیں ہے ﴿قلب المؤمن بين إصبعي الرحمن يقلبه كيف يشاء﴾[۱۶] "مؤمن کا دل خدائے رحمان کے دونوں انگلیوں کے درمیان ہے وہ جس طرح چاہتا ہے اس کو الٹتا پلٹتا ہے"۔ مؤمن کی مملکت قلب میں خداوند عالم کا قبضہ ہے اور اس کے دل میں تغییر وتبدل کا عمل خدا انجام دیتا ہے۔ لیکن اے بے چارے تو تو اپنے نفس کی عبادت کرتا ہے، تیری مملکت قلب پر شیطان اور جہالت کا غلبہ ہے اور تو نے اپنے دل کو خدا کے تسلط سے آزاد کر دیا ہے اب تم کس طرح ایمان رکھ سکتے ہو کہ حق وحقیقت اور مطلق (خدائی) حکومت کی جلوہ گاہ بن سکتے ہو۔ پس تو سمجھ لے جب تک تیری یہ حالت ہے اور یہ ریاکاری کی بری صفت تیرے اندر ہے تو کافر باللہ ہے اور تیرا شمار منافقین میں ہے، چاہے تو اپنے کو مؤمن ومسلمان ہی سمجھتا رہے۔

دوسری فصل

اے عزیز جاگ! اپنے کان سے غفلت کی روئی نکال، خواب غفلت کو اپنی آنکھوں پر حرام قرار دیدے اور یہ سمجھ لے کہ خدا نے تجھ کو اپنے لئے پیدا کیا ہے۔ جیسا کہ حدیث قدسی میں ارشاد ہے ﴿یابن آدم خلقت الاشیاء لاجلک وخلقتک لاجلی﴾ ''اے بنی آدم! ساری چیزوں کو میں نے تیرے لئے پیدا کیا ہے اور تجھ کو اپنے لئے پیدا کیا ہے'' اور تم اپنے دل کو میرا گھر بنا دو۔ تم اور تیرا دل دونوں ناموس الٰہی میں سے ہیں اور خدا اپنے ناموس کے بارے میں بہت غیور ہے۔ ناموس الٰہی کا پردہ اس حد تک چاک مت کرو ورنہ ناموس خدا کی طرف دست درازی نہ کر، غیرت الٰہی سے ڈر، کہیں ایسا نہ ہو کہ خدا اسی دنیا میں تجھ کو اتنا ذلیل کر دے کہ تو جتنی بھی اصلاح کرنا چاہے تیرے لئے ممکن نہ ہو۔ تو اپنی باطن کی دنیا میں ملائکہ اور انبیاء کرامؑ کے سامنے ناموس الٰہی کی پردہ دری کرتا ہے۔ وہ اخلاق حسنہ جن کے واسطے سے اولیائے خدا سے محبت پیدا کرتے ہیں تو انہی کو غیر حق کے سپرد کر دیتا ہے اور اپنے دل کو دشمن خدا کے حوالہ کر دیتا ہے۔ اپنے باطن کے اندر شرک اختیار کر لیتا ہے۔

اس بات سے ڈر کہ کہیں خدا تیری مملکت باطن کی ناموس کو پردہ پردہ نہ کر دے اور تجھے انبیائے عظام اور ملائکہ مقربین کے سامنے ذلیل و رسوا نہ کر دے۔ اسی دنیا میں تجھ کو رسوا کر دے۔ ایسی ذلت میں تجھ کو مبتلا کر دے جس کا ازالہ ممکن نہ ہو سکے اور تیری پاکبازی کے پردے کو اس طرح چاک کر دے کہ پھر وہ پیوندکاری کے قابل نہ رہ جائے۔ یہ درست ہے کہ خدا ستار (عیبوں کو چھپانے والا) ہے۔ مگر اس کے ساتھ غیرتمند بھی ہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ ارحم الراحمین ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ وہ اشد المعاقبین (سب سے شدید عتاب کرنے والا) بھی تو ہے۔ وہ اسی وقت تک خامیوں کی پردہ داری کرتا ہے جب تک وہ حد سے نہ گزر جائے۔ ممکن ہے کہ خدانخواستہ یہ برا فعل اور ذلت آمیز رسوائی اس کی غیرت کو ستاری پر غلبہ عطا کر دے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں تم نے سن لیا۔ ۱۸

لہٰذا اپنے آپ میں آ جاؤ، خدا کی طرف رجوع کرو اور اس کی طرف بازگشت کرو، کیونکہ خدا رحیم ہے اور اپنی رحمت کیلئے بہانہ ڈھونڈتا ہے۔ اگر تم نے اس کی طرف رجوع کر لیا تو تمہارے گزشتہ گناہوں کو دامن عفو میں چھپا دے گا اور کسی کو اس پر مطلع نہ کرے گا اور تجھ کو صاحب فضیلت بنا دے گا، تیرے اندر اخلاق حسنہ

اچاگر رے گا اور تجھے اپنی صفات کا آئینہ بنادے گا و تیرے ارادے کو عالم آخرت میں اس طرح کارفرما بنا دے گا جس طرح خود اس کا ارادہ پوری کائنات میں نافذ ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے

جب اہل جنت، جنت میں اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ جائیں گے تو ان کے پاس خدا کا یہ پیغام آئیگا اس زندہ و پائندہ (خدا) کی طرف سے۔ اپنی اس زندہ و پائندہ بندے کیلئے جس کو اب موت نہیں ہے۔ میں جس چیز کو چاہتا ہوں کہ وہ پیدا ہو جائے کہتا ہوں کہ ایسا ہو جائے پس وہ پیدا ہو جاتی ہے۔ تجھ کو بھی (آج سے) یہ اختیار دیتا ہوں جس بات کو چاہے کہ ہو جائے اس کو حکم دیدے کہ ہو جا! وہ ہو جائے گی۔ ۱۹ لہذا تو اتنی خود پسندی نہ کر، تو اپنے ارادے کو حق کے حوالے کردے۔ ذات اقدس الٰہی تجھ کو بھی اپنے ارادے کا مظہر بنادے گی تجھ کو اپنے تمام امور میں متصرف بنادے گی۔ مملکت ایجاد کو آخرت میں تیری قدرت کے تابع کردے گی اور یہ وہ تفویض نہیں ہے جو باطل ہے۔ جیسا کہ اپنی جگہ پر معلوم ہے۔

میرے عزیز! اب چاہے اس راستے کو قبول کرو یا دوسری راہ کو، خدا تو ہم سے اور تم سے بلکہ تمام مخلوقات سے بے نیاز ہے اور ہمارے، ور تمام موجودات کے اخلاق سے بھی بے نیاز ہے۔

تیسرا مقام

اس میں بھی چند فصلیں ہیں

پہلی فصل

جان لو! اس مقام پر ریاکاری دوسرے مقامات سے بہت زیادہ عام ہے، کیونکہ ہم لوگ عموماً پہلے والے دو مقام کے اہل نہیں ہوا کرتے۔ اسی لئے شیطان بھی ان راستوں سے ہمارے پاس نہیں آتا۔ لیکن چونکہ زیادہ تر عبادت گزار لوگ، مناسک بجالانے والے اور ظاہری عبادات انجام دینے والے ہوتے ہیں۔ اس لئے شیطان بھی اسی جگہ زیادہ کوشش کرتا اور نفس کی چالبازیاں زیادہ تر اسی مقام پر نظر آتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں، کثر لوگ جسمانی اعمال کے ذریعے بہشت کے طالب ہوتے ہیں ور اچھے اعمال انجام دے کر اور برے اعمال چھوڑ کے اخروی مقامات کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے شیطان بھی اسی راستہ سے آ کر ان کے اعمال (و عبادات) میں ریاکاری و چاپلوسی کے بیج بو دیتا ہے تاکہ ان میں شاخیں اور پتے نکل آئیں اور ان کے اچھے اعمال برے اعمال میں بدل جائیں۔ لہذا وہ لوگ مناسک و عبادات کے راستے

سے جہنم میں پہنچ جائیں اور جن چیزوں سے لوگ اپنی آخرت آباد کرنا چاہتے ہیں۔ شیطان انہی چیزوں سے ان کی آخرت کو برباد کر دیتا ہے اور جو چیز علیین میں شامل ہے، اس کیلئے یہ کام کرتا ہے کہ حکم خدا سے ملائکہ اس کو سجین میں قرار دیتے ہیں۔

بہرحال جن لوگوں کے پاس صرف یہی پہلو (عبادت) ہے اور اعمال کے علاوہ ان کے پاس کوئی زادراہ نہیں ہے، انہیں تو مکمل طور سے اس بات کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ خدانخواستہ کہیں یہ بھی ان کے ہاتھ سے نہ نکل جائے اور وہ جہنمی ہو جائیں، سعادت کا ان کے پاس کوئی راستہ ہی نہ ہو اور کہیں بہشت کے دروازے ان کیلئے بند نہ ہو جائیں اور جہنم کے دروازے ان پر کھل نہ سکیں۔

دوسری فصل: ریاکاری کے بارے میں غور وفکر

کثر ایسا ہوتا ہے کہ خود ریاکار اس بات سے غافل ہوتا ہے کہ ریاکاری نے اس کے اعمال کو برباد کر دیا ہے اور اس کے ریاکاری پر مبنی اعمال ناچیز و بیکار ہو چکے ہیں۔ اس لئے کہ شیطان اور نفس کا دام فریب کس حد تک نازک اور مشکل ہے اور انسانیت کا رستہ تنگ و تاریک ہے کہ انسان یہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ وہ کیا ہے؟ جب تک کہ وہ باقاعدہ اور مکمل موشگافی نہ کرے۔ خود تو یہی خیال کرتا ہے کہ میرے تمام اعمال خدا کیلئے ہیں، حالانکہ وہ شیطان کیلئے ہوتے ہیں، کیونکہ انسان کی تخلیق حب نفس پر ہے۔ اس سے خود پرستی کا پردہ اس کی خامیوں کو چھپائے رکھتا ہے۔ انشاء اللہ اگر ممکن ہو سکا تو اس مطلب کی تھوڑی سی شرح بعض حدیثوں کے ضمن میں آئے گی۔ بشرطیکہ توفیق الٰہی شامل حال رہے۔ ؎

مثلاً علم دین کا حاصل کرنا اہم ترین اطاعت وعبادات میں سے ہے لیکن کبھی آدمی اس بڑی عبادت میں بھی ریاکاری کا مرتکب ہو جاتا ہے، حالانکہ نفسانی خواہشات کے دبیز پردوں کی بنا پر وہ خود بھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہے۔ (مثال کے طور پر) علماء اکابرین اور فضلاء کی موجودگی میں انسان کبھی کسی مطلب کو اس طرح حل کرنا چاہتا ہے کہ کسی نے اس کو اس طرح (ابھی تک) حل ہی نہ کیا ہو اور جیسے وہ اس مسئلے کے سمجھنے میں منفرد ہے اور پھر جس قدر خوبی سے اس کو بیان کرے گا اور اہل مجلس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرے گا، اتنا ہی وہ اس پر فخر کرے گا اور جو بھی اس کی مخالفت کرے گا وہ اس کو مغلوب کرنا چاہے گا اور لوگوں کے سامنے اس کو ذلیل و رسوا کرکے اپنی بات کو چاہے حق ہو یا باطل مخالف سے منوانا چاہے گا اور اس پر غلبہ

پانے کے بعد اپنے دلائل اور علم وفضل پر ایک قسم کا گھمنڈ وناز محسوس کرنے لگے گا اور اگر کہیں کسی بڑی شخصیت نے اس کی تائید کردی پھر تو ''نور علیٰ نور'' والی بات ہو جائے گی، حالانکہ اس بے چارے کو یہ بھی نہیں معلوم کہ یہاں تو علما وفضلا کی نظر میں اس کی اہمیت وقابلیت کا سکہ بیٹھ گیا، لیکن ان کے اور تمام کائنات کے مالک خدا کی نظر میں اس کی اہمیت ختم ہو گئی اور اس کا عمل خدا کے حکم سے سجین (جہنم) میں ڈال دیا گیا۔

(یہی نہیں بلکہ) اس ریاکاری کے ساتھ چند اور گناہ بھی ہیں۔ مثلاً، ایک برادر مؤمن کو ذلیل ورسوا کرنا اور اس کو اذیت پہنچانا۔ کبھی اس مؤمن کے ساتھ جسارت کرنا اور اس کی توہین کرنا بھی شامل ہو جاتا ہے اور یہ چیزیں خود اپنی جگہ پر ہلاک کرنے والی اور جہنمی بنانے والی ہیں۔ لیکن اگر اس کے بعد بھی نفس اپنا جال تمہارے اوپر یہ کہہ کر پھینکتا ہے کہ ''میرا مقصد (اس مشکل کو حل کرنے سے) صرف حکم شرعی کا بیان اور کلمۂ حق کا اظہار تھا جو بہترین عبادات میں ہے۔ میرا مقصد اظہار قابلیت اور خودنمائی ہرگز نہیں تھا۔ تو تم خود ہی اپنے باطن سے سوال کرو کہ اگر اس حکم شرعی کو دوسرا کوئی دوست اور ہم مرتبہ بیان کرتا اور اس مشکل کو حل کرتا اور تم خود بھری محفل میں مغلوب ہو جاتے تو کیا اس سے تمہارے لئے کوئی فرق نہ پڑتا؟ اگر واقعاً کوئی فرق نہ پڑتا تب تو تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو اور اگر اس کے بعد بھی تمہارا نفس تم کو دھوکہ دینے پر کمربستہ رہے اور تم سے کہے ''سچائی کا اظہار کرنے میں فضیلت ہے اور خدا کی بارگاہ میں اس کا ثواب ہے، اس لئے میں اس فضیلت کو حاصل کرنا چاہتا ہوں اور ثواب الٰہی کے طفیل (جنت میں) گھر بنانا چاہتا ہوں'' تو تم اس نفس سے کہو ''فرض کرو مغلوب ہو جانے اور حق کی تصدیق ہونے کی صورت میں بھی خدا تم کو وہی فضیلت عطا کردے تو کیا اس کے بعد بھی اے نفس! تو (دوسروں پر) غلبہ کا متمنی رہے گا؟'' اب اگر اپنے باطن میں (جھانک کر) دیکھو کہ تمہارا نفس اس کے باوجود قہر وغلبہ چاہتا ہے، علما کے سامنے علم وفضل میں اپنی شہرت کا خواہشمند ہے اور یہ علمی بحث صرف ان کے دلوں میں عظمت پیدا کرنے کیلئے تھی تو جان لو کہ اس علمی بحث میں، جو افضل ترین طاعت وعبادت ہے، تم ریاکار ہو اور کافی شریف کی روایت کی بنا پر تمہارا یہ عمل جہنم میں ڈال دیا جائے گا اور تم مشرک ہو، تمہارا یہ عمل صرف حب جاہ ومقام کیلئے ہے اور تمہارا یہ عمل بنابر روایت تمہارے ایمان کیلئے ان دو بھیڑیوں سے زیادہ نقصان دہ ہے جو بھیڑوں کے اس گلے پہ جا پڑیں جن کا چرواہا موجود نہ ہو۔[۲۱]

لہذا، تم جو اہل علم ہو، امت کی اصلاح کے ذمہ دار، آخرت کے رہنما اور امراض نفس کے طبیب ہو،

تمہارے اوپر لازم ہے کہ پہلے اپنی اصلاح کرو اور اپنے نفس کے مزاج کو صحتمند بناؤ تا کہ تمہارا شمار بے عمل علما میں نہ ہو۔ جن کا حال کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ پروردگار! شرک ونفاق کی کدورت سے ہمارے دل کو پاک کر اور ہمارے دلوں کو حب دنیا کے رنگ لگنے سے بچالو جو ان تمام باتوں کی منشا ہے اور ہم ہو وہوس کے پیروں کے حب جاہ ومنزلت کے اس خطرناک سفر میں اور پیچ وخم اور تنگ وتاریک راستوں میں ہمارا ہاتھ تھام لو۔ تو ہر چیز پر قادر وتوانا ہے۔

اسی طرح اسلام کی ایک بزرگترین عبادت نماز جماعت ہے اور پیش نماز کی فضیلت بہت ہے اس لئے شیطان اس میں سب سے زیادہ رخنہ اندازی کرتا اور پیش نماز کا سب سے زیادہ دشمن ہوتا ہے اور اسی فکر میں رہتا ہے کہ کسی طرح اس کو اس فضیلت سے روک دے اور اس کے اس عمل کو خلاص سے خالی کر کے اس کو جہنم میں داخل کر دے اور اس کو مشرک بنا دے۔ اس لئے وہ بعض پیش نمازوں کے دلوں میں مختلف طریقوں سے داخل ہوتا ہے جیسے عجب وتکبر، جس کا ذکر بعد میں انشاءاللہ آئے گا، اور ریاکاری۔ اس کا مطلب لوگوں کے دلوں میں عظمت ومنزلت پیدا کرنا اور اپنی عظمت وبزرگی کی شہرت کرنا مثلاً (پیش نماز کو معلوم ہو جائے کہ) فلاں مقدس شخص اس کی جماعت میں آیا ہے تو اس کو اپنی طرف متوجہ کرنے کیلئے اور زیادہ خضوع وخشوع کرنا اور مختلف حیلوں، بہانوں سے اس کو اپنے جال میں پھانسنا، محفلوں میں اس مقدس شخص کا صرف اس لئے ذکر کرنا تا کہ جو لوگ جماعت میں نہیں تھے ان کو پتہ چل جائے کہ ایسے (ایسے) مقدس اشخاص ہماری جماعت میں شریک ہوتے ہیں اور کیونکہ اپنی جماعت میں شریک ہوا ہے اس شخص کے متعلق دل میں عقیدت کا اظہار کرنا اور اس سے اتنا خلوص اور اتنی محبت کرنا کہ شاید اس نے کبھی خدا اور اولیائے خدا کیلئے بھی اتنا خلوص نہ برتا ہو خصوصاً وہ مقدس شخص اگر تاجر حضرات میں سے ہو تب تو اظہار عقیدت کی انتہا ہی نہیں ہے!

اور اگر خدانخواستہ اشرافی میں سے کوئی شخص راستہ بھول کر اسے پیش نماز کے پیچھے صف میں کھڑا ہو جائے تب تو مصیبت اور زیادہ ہے اور جہاں نمازیوں کی تعداد کم ہو، اس جگہ پر بھی شیطان امام جماعت کو نہیں بخشتا، بلکہ اس کی زبان سے کہلاتا ہے: "میں تارک الدنیا ہوں، محلے کی چھوٹی سی مسجد میں غریبوں اور کمزوروں کے ساتھ گزر بسر کر لیتا ہوں" یہ ریاکاری پہلے ہی کی طرح ہے یا پھر اس سے بھی بدتر ہے، کیونکہ اس سے اس کے دل میں حسد جیسی برائی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بے چارہ دنیا سے تو محروم تھا ہی (شیطان) اس سے

(ریا کاری کی وجہ سے) اس کی آخرت بھی چھین لیتا ہے اور یہ دنیا و آخرت دونوں میں دیوالیہ ہو جاتا ہے۔ ہم اور آپ جیسے جماعت نہ پڑھنے والوں کو بھی شیطان معاف نہیں کرتا، بلکہ ہم لوگوں کو بھی جو اپنی کم مائیگی سے افسردہ رہتے ہیں ان کو گمراہ کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ ہم کو آمادہ کرتا ہے کہ ہم مسلمانوں کی جماعت پر نکتہ چینی کریں، ان پر طعن کریں۔ (اپنی طرف سے) جماعت میں کیڑے نکالیں۔ اپنی جماعت سے دوری کی تحسین کریں اور اپنے کو تارک دنیا اور حب جاہ و نفس سے عاری متعارف کرائیں۔

اور ہم تو دونوں گروہوں سے بدتر ہیں نہ پہلے گروہ کی طرح بظاہر پوری دنیا کے مالک ہیں اور نہ ہی دوسرے گروہ کی، دنیائے ناقص کے حصے دار ہیں اور نہ ہی آخرت رکھتے ہیں، حالانکہ اگر ہمارا بس چلتا تو ہم دونوں گروہوں سے بڑھ کر جاہ طلب، عزت و مقام اور مال و منال کے طلبگار ہوتے!

شیطان کی صرف پیش نماز ہی پر اکتفا کر کے وہ اس کو جہنمی بنانے کے بعد آتش شہوت خاموش نہیں ہوتی، بلکہ وہ نمازیوں کو بھی نہیں بخشتا اور نمازیوں میں بھی چونکہ پہلی صف کو تمام صفوں میں اور پہلی صف میں بھی داہنی طرف کو بائیں طرف پر زیادہ فضیلت ہے، لہذا اس کا نشانہ بھی زیادہ تر وہی لوگ ہوتے ہیں، چنانچہ وہ بے چارے شریف نمازی کو گھر سے دوڑا کر صف اول کے داہنی طرف بٹھا دیتا ہے اور اس کے دل میں یہ خیال پیدا کر دیتا ہے کہ اس جگہ پر بیٹھنے کی فضیلت پر لوگوں کے سامنے فخر کرنا چاہئے اور وہ یہ جانے بغیر کہ اس کا ڈنڈا کہاں سے مل رہا ہے، بڑے فخر و مباہات سے اپنی اس فضیلت کا اظہار کرتا ہے، اس طرح وہ اپنے شرک باطن کو ظاہر کر کے اپنے عمل کو خود ہی جہنم میں بھیج دیتا ہے۔ اس کے بعد شیطان بعد کی صفوں میں داخل ہو کر اپنی توجہ ان کی طرف مبذول کر دیتا ہے اور دوسری صفوں کے لوگوں کو صف اول کے افراد کو اشارہ و کنایہ سے جھڑ کنے، نیز ان بے چارے شریفوں پر لعن طعن کرنے کی ترغیب دیتا ہے، چنانچہ وہ سوچنے لگتے ہیں کہ ان میں یہ برائیاں پائی نہیں جاتیں اور اکثر ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ شیطان کسی محترم شخص کو خصوصاً گر وہ اہل علم و فضل ہو آخری صف میں لا کر بٹھا دیتا ہے تاکہ لوگوں میں یہ تاثر پیدا کرے کہ اسے اس مقام پر موجود افراد کے ساتھ نماز نہیں پڑھنا چاہئے لیکن چونکہ وہ تارک امداد ہے، خواہشات نفس کا شکار نہیں ہوتا، اس لئے آخری صف میں نماز پڑھتا ہے۔ آپ بعض ایسے اشخاص کو کبھی صف اول میں نہ دیکھیں گے۔

شیطان نماز جماعت کے پیش نماز و ماموین کو چھوڑ کر کبھی فرادی (اکیلے) نماز پڑھنے والے کو بہکانے میں لگ جاتا ہے۔ اس طرح کہ اس کے گلے میں رسی ڈال کر گھر یا زور سے نکال کر مسجد کے ایک

گوشے میں پہنچا دیتا ہے جہاں وہ ناز نخرے کے ساتھ جا نماز بچھا کر سب سے الگ تھلگ اپنی نماز میں مشغول رہتا ہے، کسی کو عادل نہیں سمجھتا اس لئے کسی کے پیچھے نماز نہیں پڑھتا اور لوگوں کی موجودگی میں بڑے لمبے چوڑے ذکر اور طویل رکوع وسجود کے ساتھ نماز پڑھتا ہے۔ یہ شخص باطن میں بدمست اور نشۂ تکبر میں چور ہے۔ یہ لوگوں کو سمجھانا چاہتا ہے کہ میں اتنا شریف محتاط ہوں کہ نماز جماعت نہیں پڑھتا صرف اس ڈر سے کہ کہیں میری کوئی نماز غیر عادل کے پیچھے نہ ہوجائے۔ اس کے علاوہ کہ یہ شخص ریاکار و تکبر میں گرفتار ہے۔ شرعی مسائل سے بھی واقف نہیں ہے، کیونکہ خود اس کا مرجع تقلید بھی غالباً صحت اقتداء کیلئے حسن ظاہر کے علاوہ دوسری شرطیں نہیں لگاتا ہوگا۔ لیکن مسئلہ یہ نہیں ہے۔ وہ تو ریاکاری کرنا چاہتا ہے وہ لوگوں کو دکھانے کیلئے ان کے دلوں میں اپنی قدر ومنزلت بڑھانا چاہتا ہے۔ اسی طرح ہمارے سارے کام شیطان کے زیر تصرف ہوتے ہیں اور شیطان ملعون جس دل میں بھی پاکیزگی نہیں پاتا اسی کو اپنا گھر بنالیتا اور تمام ظاہری وباطنی اعمال کو جلا دیتا ہے اور ہم کو اعمال حسنہ کے ذریعے جہنمی بنا دیتا ہے

تیسری فصل: اخلاص کی دعوت

لہذا میرے عزیز! اپنے کاموں میں اور زیادہ غور وفکر سے کام لو اور اپنے نفس سے اپنے ہر عمل کا حساب لو اور ہر کام سے پہلے اس سے پوچھو کہ بھلائی اور نیک کاموں میں حصہ لینے سے اس کا مقصد کیا ہے؟ وہ نماز شب کے مسائل کیوں پوچھ رہا ہے اور نماز شب کے اوراد و اذکار کیوں کر رہا ہے؟ وہ خدا کی خاطر دینی مسائل سمجھانا یا بیان کرنا چاہتا ہے یا اپنے آپ کو اس امر کے قابل دکھانا چاہتا ہے؟ وہ آخر اپنے زیارتی سفر کو بیان کی شان کی طرح لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے؟ تجا یہ ہے سفر زیارت کی تعداد بھی بتاتا ہے پوشیدہ طور پر دیے گئے صدقے کو بیوں کسی پر ظاہر کرتا ہے؟ ہر ممکن طریقے سے اس کا تذکرہ کر کے لوگوں کو بتاتا ہے۔ اگر یہ کام خدا کیلئے ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اس کو دیکھ کر دوسرے بھی اس کی پیروی کرنے لگیں اور وہ ﴿الدال علی الخیر کفاعله﴾ ۲۲ ”خیر کی طرف رہنمائی کرنے والا اس کے انجام دینے والے کے برابر ہے“ کا مصداق بننا چاہتا ہے تب تو درست ہے اور اس پر شکر خدا کرنا چاہئے کہ اس کو خدا نے یہ صاف ضمیر اور پاک دل عطا کیا ہے لیکن متوجہ رہنا چاہئے کہ کہیں نفس سے جہاد کے عمل میں شیطان نے اس کو دھوکہ نہ دیا ہو اور ریاکاری کو تقدس کی صورت میں نہ پیش کیا ہو۔ لیکن اگر یہ کام خدا کیلئے نہیں ہے تو پھر اس کا

طلب نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ ایسی صورت میں وہ "مسمع" (لوگوں کو سنانے کیلیے) ہو جائے گا اور ریا کاری کے شجرہ ملعونہ کا پھل سمع ہوتا ہے۔ خداوند منان اس کے عمل کو قبول نہیں کرتا۔ خدا (اپنے ملائکہ کو) حکم دیتا ہے کہ اس عمل کو سجین میں ڈال دیں۔

نفس کی مکاریوں کی برائیوں سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے، کیونکہ نفس کی مکاریاں بہت ہی گہری ہوتی ہیں۔ البتہ ہم کو اجمالاً تو ضرور معلوم ہے کہ ہمارے اعمال خالص نہیں ہیں اور اگر ہم (واقعی) خدا کے مخلص بندے ہیں تو پھر شیطان کا ہمارے اوپر تسلط کیوں ہے؟ جبکہ اس نے خدا سے عہد کر لیا ہے کہ "تیرے مخلص بندوں سے کوئی تعلق نہ رکھوں گا اور ان کی مقدس حریم کی طرف ہاتھ بھی نہ بڑھاؤں گا۔ ۲۳

ہمارے شیخ بزرگوار (دام ظلہ) ۲۴ کے بقول "شیطان درگاہ خداوندی کا ایک کتا ہے اگر کوئی خداوالا ہوتا ہے تو اس پر نہیں بھونکتا۔ ورنہ اس کو کوئی اذیت پہنچاتا ہے۔ جیسے دنیا میں کسی مالک مکان کا کتا، مالک کے شناسا لوگوں پر نہیں بھونکتا، (اسی طرح) شیطان جس کو مالک دو جہاں کا دوست نہیں پاتا اس کو بارگاہ ایزدی تک پہنچنے نہیں دیتا"۔ اس لیے اگر تم دیکھو کہ شیطان تم سے کچھ سروکار رکھتا ہے تو یقین کرو تمہارے افعال صحیح سے خالی تھے، خدا کیلیے نہیں تھے۔ اگر آپ مخلص ہیں تو آپ کے دل سے حکمت کے چشمے پھوٹ کر آپ کی زبان پر کیوں نہیں جاری ہوئے جبکہ آپ بخیال خود چالیس سال سے قربۃ الی اللہ عمل کر رہے ہیں۔ حالانکہ حدیث شریف میں آیا ہے "جو شخص چالیس صبح خدا سے اخلاص برتے اس کے دل سے حکمت کے چشمے پھوٹ کر اس کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں"۔ ۲۵ اس لیے یہ جان لیجئے کہ ہمارے اعمال خدا کیلیے نہیں ہیں اور ہم خود بھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہیں اور یہی مرض لاعلاج ہے۔

ان طاعت وعبادت گزار، اہل جمعہ و جماعت اور علم و دیانت کی حالت پر وائے ہو کہ جب سلطان آخرت خیمے لگائے گا اور یہ لوگ اپنے کو بڑے گناہوں کے مرتکب فرد کے زمرے میں پائیں گے، بلکہ اہل کفر و شرک سے بھی بدتر اپنے کو دیکھیں گے اور اپنے نامہ اعمال کو سیاہ سے سیاہ تر پائیں گے۔ اس شخص کی حالت پر وائے ہو جو اپنی نماز و طاعت کے باوجود جہنم میں جائے گا۔ الامان (والحفیظ) اس شخص سے جو اپنے صدقات و زکات و نماز (و روزہ) کی صورتوں کو اتنی بدمنظر و بدشکل پائے گا جس سے زیادہ بری صورت کا تصور بھی نہیں ہو سکتا ہے۔

اے "ریاکار" تو تو مشرک ہے۔ (کاش تو صرف گنہگار ہوتا) کیونکہ موحد اہل معصیت کو خدا انشاء

اللہ اپنے فضل وکرم سے بخش دے گا، لیکن خدا کا ارشاد ہے کہ ''مشرک اگر بغیر توبہ کئے مر جائے تو اس کی بخشش کا سوال ہی نہیں ہے'' [۲۶]

احادیث شریفہ میں جس طرح تو نے آگے سنا ہے، خدا کا ارشاد ہے ''ریاکار مشرک ہے'' جو شخص لوگوں کے دلوں میں اپنی قدر و منزلت بڑھانے کیلئے اپنی دینی قیادت، اپنی امامت، اپنی تدریس، اپنی تعلیم، نماز و روزہ مختصر یہ کہ تمام نیک اعمال کو اسی نیت (ریاکاری) سے بجا لائے وہ مشرک ہے اور بموجب روایت اہل بیت صلوات اللہ علیہم، وبموجب آیہ شریفہ کبھی بھی بخشا نہیں جائے گا۔ پس کاش تو گناہان کبیرہ کا مرتکب ہوتا، کھلا ہوا فاسق و فاجر ہوتا، قابل احترام چیزوں کا تقدس پامال کرتا، مگر موحد ہوتا خدا کیلئے کوئی شریک نہ ٹھہراتا!

لہذا اے عزیز! ذرا فکر کر اور اپنے لئے کوئی چارہ پیدا کر، اور یہ جان لے کہ ناچیز لوگوں کے سامنے شہرت کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ لوگوں کے دل اتنے مختصر ہیں کہ اگر کوئی چڑیا کھا جائے تو اس کا بھی پیٹ نہ بھرے۔ [۲۷] اس کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہے اور اس ضعیف مخلوق میں کوئی طاقت ہی نہیں ہے۔ طاقت تو صرف اور صرف بارگاہ قدس ربوبیت میں پیدا ہوتی ہے۔ فاعل علی الاطلاق اور مسبب الاسباب وہی ذات مقدس احدیت ہے۔ تمام مخلوق مل کر بھی ایک مچھر نہیں پیدا کر سکتی اور اگر مچھر ان سے کوئی چیز اچانک لے جائے تو یہ مخلوق واپس نہیں لے سکتی۔ [۲۸] قدرت صرف خدا کے پاس ہے۔ تمام مخلوقات میں وہی مؤثر ہے۔ جس زحمت و ریاضت سے بھی ممکن ہو اپنے صفحہ دل پر قلم عقل سے لکھ لے ﴿لا مؤثر فی الوجود الا اللہ﴾ ''عالم ہستی میں خدا کے علاوہ کوئی مؤثر نہیں ہے''۔

توحید فعلی کو جو توحید کا پہلا درجہ ہے، جس طرح بھی ممکن ہو دل میں جاگزیں کر اور دل کو مؤمن و مسلم بنا اور کلمہ طیبہ ﴿لا الٰہ الا اللہ﴾ کی مقدس مہر اپنے دل پر لگائے اور قلب کی صورت کو کلمہ توحید کی صورت میں کرکے منزل اطمینان تک پہنچا کر اس کو سمجھا دے کہ لوگ کسی بھی قسم کا نفع و نقصان نہیں پہنچا سکتے، نفع و نقصان پہنچانے والا صرف خدا ہے۔ نابینائی اور اندھے پن کو اپنی آنکھوں سے دور کر، کہیں ایسا نہ ہو کہ ﴿رب لم حشرتنی اعمیٰ وقد کنت بصیرا﴾ [۲۹] ''پالنے والے مجھے کیوں اندھا محشور کیا'' کے مصداق بن جاؤ اور جس دن چھپے ہوئے حقائق ظاہر ہوں گے اس دن تم اندھے محشور ہو۔ خدا کا ارادہ تمام ارادوں پر غالب ہے۔ اگر تمہارا دل اس کلمہ طیبہ کا اطمینان حاصل کرلے اور اس عقیدے کو تسلیم کرلے تب تو امید ہے کہ تمہارا

نجام بخیر ہو اور شرک و ریا، نیز کفر و نفاق کی جڑیں تمہارے دل سے کٹ جائیں اور یہ بھی سمجھ لو کہ یہ عقیدہ حقہ عقل و شرع (دونوں) کے مطابق ہے، یہاں جبر کا توہم نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے بعض وہ لوگ جو اس کے مبادی و مقدمات سے مطلع نہ ہوں اور جن کے کان ان مطالب سے نا آشنا ہوں وہ اس کو جبر خیال کریں، حالانکہ اس کا جبر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ توحید ہے اور جبر شرک ہے۔ یہ ہدایت ہے اور جبر گمراہی ہے۔ یہاں پر جبر و قدر کا بیان مناسب نہیں ہے۔ البتہ جو اس کے اہل ہیں ان پر مطلب واضح ہے اور دوسروں کو ان مطالب میں دخل دینے کا حق نہیں ہے، بلکہ صاحب شریعت نے ان مطالب میں داخل ہونے سے ممانعت فرمائی ہے۔[۳۰]

بہر حال ہر وقت خصوصاً تنہائیوں میں طمانینہ اور تضرع و زاری کے ساتھ اپنے خدائے مہربان سے دعا کرو کہ تم کو نور توحید کی ہدایت کرے اور تمہارے دل کو نظریہ توحید و یکتا پرستی کے نور سے منور کرے تاکہ تمام دنیا سے تم آزاد ہو جاؤ اور ہر چیز کو ناچیز سمجھو۔ (اسی طرح) اس ذات مقدس سے دعا کرو کہ تمہارے اعمال کو خالص کرے اور تمہاری راہ خلوص و عقیدت کی طرف ہدایت فرمائے۔ اب اگر تم صاحب حال ہو جاؤ تو اس بندۂ ضعیف و کاہل اور حقیقت سے عاری کیلئے جس نے اپنی پوری زندگی ہوا و ہوس میں گزاردی اور گناہوں کی آلودگی و امراض قلبی کی وجہ سے اس کا دل ایسا ہو گیا ہے کہ نہ کوئی نصیحت اس پر اثر کرتی ہے اور نہ کوئی آیت و روایت، اور نہ کوئی دلیل و برہان ورنہ اس کا دل متاثر ہوتا ہے۔ اپنی دعاؤں میں اسے یاد کرو شاید تمہاری دعاؤں سے اسے کوئی نجات کا راستہ مل جائے۔ کیونکہ خدا مومن کو اپنی بارگاہ سے خالی ہاتھ واپس نہیں کرتا اور اس کی دعاؤں کو بھی قبول کرتا ہے۔[۳۱]

ان مطالب کے ذکر کے بعد جنہیں تم خود بھی جانتے ہو اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، کچھ عرصہ اپنے دل کو پابند بناؤ اپنی حرکات و سکنات، اپنے اعمال و رفتار کے بارے میں دقت نظر سے کام لو۔ دل میں چھپی ہوئی باتوں کی تفتیش کرو اور اس کا سختی کے ساتھ اسی طرح محاسبہ کرو جس طرح دنیا کے کاروباری شریک ایک دوسرے سے حساب میں سختی کرتے ہیں۔ جس عمل میں ریاکاری و چاپلوسی کا شائبہ بھی ہو اس کو چھوڑ دو چاہے خواہ وہ عمل کتنا ہی اعلیٰ ہو یہاں تک کہ اگر واجبات کو بھی ظاہراً خالص نہیں ادا کر سکتے تو مخفی طریقے سے بجا لاؤ، حالانکہ واجبات کا علی الاعلان بجا لانا مستحب ہے، بلکہ واجب عمل میں بذات خود ریاکاری کا اتفاق کم ہوتا ہے۔ زیادہ تر خصوصی زائد اور مستحب اعمال میں ریا ہوتا ہے۔

بہرصورت مکمل سنجیدگی اور سخت جدوجہد کے ذریعے اپنے دل کو شرک کے شائبے سے پاک کرو۔ کہیں خدانخواستہ اسی حالت زندگی میں دنیا سے چلے جاؤ تو سارا کام خراب ہوگا اور پھر تمہاری نجات کی کوئی امید نہ رہے گی اور خدا بھی تم پر غضب ناک ہوگا۔ چنانچہ (کتاب) وسائل الشیعہ میں قرب الاسناد کے حوالے سے منقول ہے جس کا سلسلۂ سند حضرت علیؑ تک منتہی ہوتا ہے۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ﴿قال رسول الله صلى الله عليه وآله: من تزين للناس بما يحب الله وبارز الله في السر بما يكرهه الله لقي الله وهو عليه غضبان وله ماقت﴾ ۳۲ "جو شخص لوگوں کیلئے اپنے کو ایسی چیز سے مزین کرے جو خدا کو محبوب ہو اور باطن میں ایسی چیز کا اظہار کرے جس کو خدا ناپسند کرتا ہو تو وہ خدا سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ خدا اس پر غضب ناک اور برہم ہوگا"۔

اس حدیث میں دو احتمال ہیں

پہلا یہ کہ کوئی شخص نیک عمل لوگوں کو دکھانے کیلئے کرے اور برے اعمال باطن میں بجا لائے

دوسرا یہ کہ وہ لوگوں کو صرف نیک عمل دکھائے اور باطن میں ریاکاری کا قصد رکھتا ہو

دونوں صورتوں میں ریاکاری شامل ہے، کیونکہ واجبات مستحب کا بغیر قصد ریا بجا لانا سبب غضب (خدا) نہیں ہوسکتا، بلکہ دوسرے معنی کو بہتر کہا جاسکتا ہے، کیونکہ برے عمل کو آشکارا بجا لانا زیادہ برا ہے۔ بہر حال خدا نہ کرے کہ مالک الملوک اور ارحم الراحمین کسی انسان پر غضب ناک ہو جائے ﴿اعوذ بالله من غضب الحليم﴾ "خدا کی پناہ مانگتا ہوں بردبار کے غصے سے"۔

چوتھی فصل۔ حدیث علویؑ کا بیان

ہم اس بحث کو اس حدیث شریف پر ختم کرتے ہیں جس کو کافی شریف میں حضرت علیؑ سے نقل کیا گیا ہے اور شیخ صدوق رضوان اللہ علیہ ۳۳ نے اسی سے مشابہ حدیث امام جعفر صادقؑ سے نقل کی ہے۔ یہ حدیث حضرت علیؑ نے امام رسول خداؐ کی وصیتوں میں سے ہے اور وہ یہ ہے

﴿باسناده عن ابي عبد الله قال: قال امير المؤمنين: ثلاث علامات للمرائي ينشط اذا رأى الناس ويكسل اذا كان وحده ويحب ان يحمد في جميع اموره﴾ ۳۴

یعنی امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ حضرت علیؑ نے فرمایا ہے ریاکار کی تین علامتیں ہیں "لوگوں کو

دیکھ کر وہ خوش ہوتا ہے، تنہائی میں سست ہوتا ہے اور تمام امور میں اپنی تعریف کو پسند کرتا ہے"۔ یہ بری عادت کبھی تو مخفی ہوتی ہے کہ خود انسان اس بات سے بے خبر ہوتا ہے کہ وہ باطناً اہل ریا میں سے ہے۔ وہ تو یہی گمان کرتا ہے کہ اس کا عمل خالص ہے۔ اس لئے (ہمارے ائمہؑ نے) اس کیلئے علامتوں کا ذکر کیا ہے تاکہ انسان ان علامتوں کی بنا پر اپنے باطن کے بارے میں اطلاع حاصل کر لے اور پھر اس کا علاج کر ڈالے۔ (اس کا طریقہ یہی ہے) کہ جب تنہا ہو تو دیکھتا ہے اس کا نفس اطاعت کی طرف مائل ہے نہیں اور اگر بادل نخواستہ یا عادت کی بنا پر کوئی عبادت کرتا بھی ہے تو عمل کے ہاتھ پاؤں کو توڑ دیتا ہے، پاک و پاکیزہ عمل نہیں کرتا۔ لیکن جب مسجدوں میں یا مجمع عام میں مشغول ہوتا ہے تو بڑی خوشی و مسرت اور دلچسپی و حضور قلب کے ساتھ بجالاتا ہے۔ بڑے طولانی رکوع و سجود کرتا ہے۔ مستحبات سے لے کر اس کے اجزاء و شرائط کو بہت اچھی طرح انجام دیتا ہے۔

اگر انسان اس بات کی طرف ذرا بھی متوجہ ہو اور اپنے نفس سے سوال کرے کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ عبادات کا مقدس جال بچھا کر اپنے آپ کو لوگوں کی توجہ کا مرکز بنانا چاہتا ہے؟ ممکن ہے وہ اپنے آپ کو اطمینان دلانے کی کوشش کرے کہ ایسا نہیں ہے، مثلاً یہ کہے کہ چونکہ نماز کا ثواب مسجد میں زیادہ اور باجماعت پڑھنے میں زیادہ تر ثواب ہے وغیرہ، اسی لئے خوشی ہوتی ہے۔ یا مثلاً اگر جماعت و مسجد نہیں ہے تو اس طرح تاویل کر سکتا ہے کہ عمل کو نیک لوگوں کی موجودگی میں بجالانا چاہئے تاکہ دوسرے لوگ بھی دیکھ کر پیروی کریں اور دوسروں کو بھی دین و مذہب کی طرف رغبت ہو!

(نفس) انسان کو ہر طریقے سے دھوکہ دیتا ہے، یہ کوئی سرور و نشاط نہیں ہے۔ یہ صرف وہ قلبی بیماری ہے جس میں بیچارہ انسان مبتلا ہے۔ وہ چونکہ اپنے کو صحیح و سالم سمجھتا ہے اس لئے علاج و معالجے کی فکر نہیں کرتا، ویسے بھی جو مریض اپنے کو صحتمند سمجھتا ہو اس سے امید صحت منقطع ہو جاتی ہے۔ اس کی بدبختی یہ ہے کہ اپنے باطن میں عبادت گزاری کی نمائش کا میلان رکھتا ہے اور اپنے اس گناہ سے نہ صرف یہ کہ خود غافل ہے، بلکہ یک گناہ کو عبادت سمجھ کر اظہار کرتا ہے اور اس کے ساتھ اپنی خود نمائی کو دین و مذہب کے فروغ کا نام دیتا ہے، حالانکہ مستحبات کا خلوت میں بجالانا مستحب ہے۔

آخر نفس کیوں ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ اس کو علی الاعلان کیا جائے؟ مجمع عام میں ہی خوف خدا سے گریہ کرنے میں اس کو کیوں خوشی و مسرت حاصل ہوتی ہے؟ لیکن تنہائی میں وہ چاہے جتنا اپنے اوپر زور ڈالے

اس کی آنکھ تر نہیں ہوتی (یہ آخر کیوں؟)۔ خوف خدا مجمع ہی میں کیوں ہوتا ہے؟ شب قدر میں چند ہزار لوگوں کے درمیان ہی کیوں نالہ وفغاں اور سوز وگداز پیدا ہوتا ہے؟ (مجمع عام میں) سو رکعت نماز پڑھنے، دعائے جوشن کبیر وصغیر کے پڑھنے اور چند قرآنی پاروں کی تلاوت کرنے سے نہ اس کے ابرو پر خم آتا ہے نہ تھکن کا احساس ہوتا ہے! اگر واقعی انسان کے تمام امور رضائے الٰہی کیلئے یا حصول رحمت یا خوف جہنم یا شوق جنت میں ہیں تو پھر اس کو اپنے ہر کام پر لوگوں کی مدح سرائی کی توقع کیوں ہے؟ اس کے کان لوگوں کی زبان کی طرف اور دل لوگوں کی گفتگو کی طرف کیوں لگا رہتا ہے کہ دیکھوں کہ کون اس کی مدح کرتا ہے کون یہ کہتا ہے "دیکھئے یہ کتنے شریف آدمی ہیں، اول وقت نماز کے پابند اور مستحبات کے دلدادہ ہیں" حاجی صاحب کتنے اچھے آدمی ہیں، معاملات میں تو جناب ایسے ہیں ویسے ہیں! اگر ان کی نظر میں خدا ہے تو اس اظہار محبت کا کیا مطلب ہے اور جنت ودوزخ نے اس عمل پر مجبور کیا ہے تو کسی کے کہنے سے دلچسپی کیوں؟ متوجہ رہئے کہ یہ محبت اسی شجرۂ خبیثہ ریا کا پھل ہے۔ جب تک ممکن ہے اس کی اصلاح کی کوشش کرو اور اگر ممکن ہو تو اپنے کو اس قسم کی محبتوں سے خالص کرو۔

ہم یہاں پر ایک مطلب کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ تمام نفسانی صفات کیلئے، خواہ وہ صفات حسنہ ہوں یا صفات خبیثہ، بہت زیادہ مراتب ہیں، ایک مرتبہ تو یہ ہے کہ ان اچھے صفات سے متصف ہونا اور برائیوں سے منزہ ہونا عارفان خدا اور اولیاء اللہ کیلئے مخصوص ہے، (یہ بہت اہم مرتبہ ہے)۔ دیگر اشخاص کیلئے وہ صفات خبیثہ جو خاصان خدا کیلئے باعث نقص ہیں ان کیلئے نقص نہیں ہیں، بلکہ ایک اعتبار سے ان کیلئے باعث کمال ہیں۔ جیسا کہ کہا گیا ہے ﴿حسنات الأبرار سیئات المقربین﴾ اسی طرح جو چیزیں دیگر اشخاص کیلئے اچھائیاں سمجھی جاتی ہیں وہ خاصان خدا کیلئے باعث نقص ہیں۔

ان چیزوں میں سے ایک ریا ہے اور اس وقت میں اسی موضوع پر گفتگو کر رہا ہوں۔ اخلاص صرف اولیائے خدا کا درجہ ہے، دوسرے لوگ اس میں شریک نہیں ہو سکتے۔ عوام الناس اگر اس اخلاص کے کسی درجہ تک پہنچ بھی جائیں تو درجۂ اخلاص تک نہ پہنچنا ان کیلئے نقص نہیں ہے اور نہ یہ کسی ان کے ایمان واخلاص کیلئے نقصان رساں ہے۔ مثلاً عوام الناس فطری طور سے اس بات کی طرف مائل ہیں کہ ان کی نیکیوں کا اظہار لوگوں کے سامنے ہو، چاہے وہ نیکیاں اس نیت سے نہ کرتے ہوں، لیکن چونکہ ان کے نفس کی تخلیق ہی اس چاہت پر ہے، لہذا وہ ایسا کرتے ہیں تو ان کی یہ خواہش ان کے عمل کے بطلان کا سبب نہیں ہے اور نہ

موجب شرک وکفر ہے۔ اگرچہ یہی چیز اولیاء وخاصانِ خدا کیلئے باعث نقص ہے اور ولی اللہ اور عارف باللہ کی نظر میں شرک ونفاق ہے۔ مطلق شرک سے پاکیزگی اور اس کے تمام مراتب سے اخلاص یہ اولیاء کے ابتدائی مقامات میں سے ہے۔ اس کے دیگر مقامات بھی ہیں جن کا تذکرہ یہاں پر مناسب نہیں ہے، بلکہ ہمارے ائمہ کا یہ فرمانا کہ "ہماری عبادت آزاد لوگوں کی عبادت ہے ہم صرف خدا کی محبت میں اس کی عبادت کرتے ہیں نہ جنت کی طمع میں اور نہ ہی جہنم کے خوف سے"۔ ۳۵ یہ بھی ایک عام مقام ورروایت کا ابتدائی درجہ ہے۔ ائمہ معصومینؑ کی عبادتوں میں ایسے حالات ہیں جو ہماری اور آپ کی عقل میں نہیں سما سکتے۔

ہمارے اس بیان سے اس حدیث میں جو حضرت علیؑ اور رسول خداؐ سے منقول ہے اور اس حدیث میں جو زرارہ نے امام باقرؑ سے نقل کیا ہے جمع کیا جا سکتا ہے۔ زرارہ کی روایت یہ ہے

محمد بن يعقوب باسناده عن أبي جعفر عليه السلام قال: ﴿سألته عن الرّجل يعمل الشيء من الخير فيراه إنسان فيسرّه ذلك قال: لا بأس، ما من أحد إلّا وهو يحبّ أن يظهر له في النّاس الخير إذا لم يكن صنع ذلك لذلك﴾ ۳۶

زرارہ کہتے ہیں "میں نے حضرت امام باقرؑ سے ایک شخص کے بارے میں پوچھا کہ وہ شخص کوئی اچھا کام کرتا ہے اور جب اس کے اچھے کام کو کوئی دیکھتا ہے تو اسے یہ بات بہت مسرور کرتی ہے! حضرتؑ نے فرمایا "کوئی حرج نہیں ہے۔ کوئی شخص نہیں مگر یہ کہ وہ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ لوگوں میں اس کا (کار) خیر ظاہر ہو، بشرطیکہ اس نے اس کار خیر کو اسی نیت سے نہ کیا ہو" (یعنی لوگوں کو دکھانے کیلئے نہ کیا ہو)۔

دونوں حدیثوں میں سے ایک کے اندر تعریف کو ریا کی علامت قرار دیا گیا ہے اور دوسری میں نیکیوں کے ظاہر ہونے والی خوشی کو مستثنیٰ کیا گیا ہے اور یہ اشخاص کے مراتب میں اختلاف کی بنا پر ہے۔ (ان دو حدیثوں میں) ایک دوسری وجہ جمع بھی ہے مگر اس سے اعراض کر لیا گیا ہے۔

تتمہ

جان لو کہ "سمعہ" کا مطلب لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف (اور شہرت) کیلئے لوگوں کے کانوں تک اپنی خوبیوں کو پہنچانا ہے۔ یہ بھی چونکہ شجرۂ خبیثہ ریا ہی سے تعلق رکھتا ہے اسی لئے ہم نے اس کو بھی ریا کے ساتھ ہی ذکر کر دیا۔ اس کیلئے الگ باب قائم نہیں کیا۔

توضیحات (۲)

۱۔ اصول کافی، ج۲، ص۲۹۳، کتاب ایمان وکفر، باب ریا، حدیث ۳۔

۲۔ فقہائے نیت نماز کی بحث میں ریا کو موضوع بحث بنایا ہے، ملاحظہ ہو: جواہر الکلام، ج۹، ص۱۸۷۔۱۹۵، کتاب الصلوٰۃ، بحث نیت؛ عروۃ الوثقیٰ، ص۲۰۸۔۲۰۰، کتاب الصلوٰۃ، فصل نیت؛ تحریر الوسیلہ، ج۱، ص۱۳۲۔۱۳۱، کتاب الصلوٰۃ، بحث نیت

۳۔ یہی حدیث فصل "ایمان علم" کے علاوہ باب میں ہے

۴۔ اصول کافی، ج۲، ص۲۹۵، کتاب ایمان وکفر، باب ریا، حدیث ۹۔

۵۔ سورۂ بقرہ آیت ۹۔

۶۔ علامہ طباطبائی کا کہنا ہے: ﴿واعلموا أن الله يحول بين المرء وقلبه﴾ یہ جملہ خدا انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے (سورۂ انفال ۲۴) اور روایت: «فإن القلوب بين إصبعين من أصابع الله، يقلبها كيف يشاء ساعة كذا وساعة كذا وإن العبد ربما وفق لتحيّره» تمام قلوب خدا کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں وہ جس طرح چاہتا ہے ان کو ادھر سے ادھر پھیر دیتا ہے۔ اس روایت سے جبری توفیق پیش ہے۔ بحار الانوار، ج۷۰، ص۴۸، کتاب الکفر، باب ۴۴، حدیث ۹۔

۷۔ اصول کافی، ج۲، ص۲۹۴، کتاب ایمان وکفر، باب ریا، حدیث ۴۔

۸۔ یہاں اس آیت کی طرف اشارہ ہے: ﴿يوم ينظر المرء ما قدمت يداه ويقول الكافر يا ليتني كنت ترابا﴾ جس دن انسان اپنے پہلے بھیجے ہوئے اعمال کو دیکھے گا اور کافر کہے گا کاش میں مٹی ہوتا۔ سورۂ نبأ آیت ۴۰۔

۹۔ متن حدیث یہ ہے: «إن الملك ليصعد بعمل العبد مبتهجا به فإذا صعد بحسناته يقول الله عز وجل اجعلوها في سجّين إنه ليس إياي أراد بها» اصول کافی، ج۲، ص۲۹۴، کتاب ایمان وکفر، باب ریا، حدیث ۷

۱۰۔ سورۂ روم آیت ۳۹

۱۱۔ سورۂ آل عمران آیت ۹۷

۱۲۔ یہ آیہ مبارکہ: ﴿قل لا أسألكم عليه أجرا إلا المودة في القربى﴾ اے رسول! آپ کہہ دیجیے میں تم سے اپنے قرابت داروں کی محبت کے علاوہ کوئی اجر رسالت نہیں چاہتا۔ سورۂ شوریٰ آیت ۲۳۔

۱۳۔ سورۂ حجرات آیت ۱۷، ۱۸

۱۴۔ سورہ عنکبوت، آیت ۶۹

۱۵۔ "میں آسمان اور زمین میں نہیں سماتا لیکن مومن کے دل میں سما جاتا ہوں" یہ حدیث تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ کتاب شرح عجائب القلب در احیاء علوم الدین ج ۳، ص ۱۵ میں بیان کی گئی ہے۔

۱۶۔ حدیث ۲، حاشیہ ۶

۱۷۔ علم الیقین، ج ۱، ص ۳۸

۱۸۔ حدیث ۲، فصل ۴۔

۱۹۔ متن حدیث یہ ہے ﴿من الحيّ القيّوم الذي لا يموت الى الحيّ القيّوم الذي لا يموت اما بعد فاني اقول للشيء كن فيكون وقد جعلتك تقول للشيء كن فيكون﴾ علم الیقین، ج ۲، ص ۱۰۶۰۔

۲۰۔ حدیث ۳، فصل ۵

۲۱۔ حدیث ۵، حاشیہ ۵

۲۲۔ "نیکی کی طرف ہدایت کرنے والا اس کا انجام دینے والے کی طرح ہے"۔ بحار الانوار، ج ۹۳، ص ۱۷۱، کتاب زکات وصدقہ، باب ۲۰، حدیث ۔

۲۳۔ یہ اس آیت کی طرف اشارہ ہے ﴿قال رب بما اغويتني لازينن لهم في الارض ولاغوينهم اجمعين الا عبادك منهم المخلصين﴾ (شیطان نے) کہا کہ اے میرے خدا چونکہ تو نے مجھے رستے سے الگ کیا اس لئے میں بھی دنیا میں ان کیلئے رذائل کو آراستہ بنا کر دکھاؤں گا اور سب کو بہکاؤں گا سوائے تیرے خالص بندوں کو نہ بہکا سکوں گا۔ سورہ حجر، آیت ۳۹، ۴۰۔

۲۴۔ مرحوم آیت اللہ شاہ آبادی ہیں

۲۵۔ بحار الانوار، ج ۷۰، ص ۲۴۲، کتاب الایمان والکفر، باب اخلاص، حدیث ۱۰

۲۶۔ یہ اس آیہ مبارکہ کی طرف اشارہ ہے ﴿ان الله لا يغفر ان يشرك به ويغفر ما دون ذلك﴾ یقیناً خدا شرک کو نہیں بخشے گا اس کے علاوہ کو بخش سکتا ہے۔ سورہ نساء، آیت ۴۸، ۱۱۶۔

۲۷۔ قال ابو عبد الله: ﴿يابن آدم لو اكل قلبك طائر لم يشبعه﴾ اے ابن آدم تیرے دل کو اگر ایک پرندہ کھالے تو اس کا بھی پیٹ نہ بھرے گا۔ اصول کافی، ج ۱، ص ۹۳، کتاب التوحید، باب النہی عن الکلام فی الکیفیہ، حدیث ۸۔

۲۸۔ یہ آیہ مبارکہ کی طرف اشارہ ہے ﴿ان الذين تدعون من دون الله لن يخلقوا ذبابا ولو اجتمعوا له وان يسلبهم الذباب شيئا لا يستنقذوه منه ضعف الطالب والمطلوب﴾ تم لوگ خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہو وہ سب کے سب اکٹھا ہو کر بھی ایک مکھی نہیں پیدا کر سکتے اور اگر مکھی ان سے کچھ چھین لے تو یہ لوگ اس سے چھڑا نہیں سکتے، عجیب بات ہے کہ پکارنے والا اور جس کو پکارا گیا ہے دونوں کمزور ہیں۔ سورہ حج، آیت ۷۳۔

۲۹۔ پالنے والے مجھے کیوں اندھا محشور کیا۔ سورہ طہٰ آیت ۱۲۵۔

۳۰۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں ایک شخص نے حضرت علیؑ سے قدر کے بارے میں پوچھا تو حضرتؑ نے فرمایا ﴿بحرٌ عمیقٌ فلا تلجه﴾ یہ بہت گہرا سمندر ہے اس میں داخل نہ ہو۔ اس نے دوبارہ پوچھا تو حضرت علیؑ نے فرمایا ﴿طریقٌ مظلمٌ فلا تسلکه﴾ یہ بہت تاریک راستہ ہے اس پر چلنے کی کوشش نہ کرو۔ اس نے تیسری بار پوچھا تو حضرت علیؑ نے فرمایا ﴿سرُّ الله فلا تتکلفه﴾ یہ خدا کا راز ہے اپنے کو تکلیف میں نہ ڈالو۔ بحار الانوار ج ۵ ص ۹۷ کتاب العدل والمعاد باب القضاء والقدر حدیث ۲۲۔

۳۱۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ﴿ما ابرز عبدٌ یده الی الله العزیز الجبار الا استحیی الله عزوجل ان یردها صفرا حتی یجعل فیها من فضل رحمته ما یشاء فاذا دعا احدکم فلا یرد یده حتی یمسح علی وجهه ورأسه﴾ جب بھی کوئی بندہ خدائے عزیز و جبار کے سامنے ہاتھوں کو پھیلا کر دعا کرتا ہے تو خدا کو حیا آتی ہے کہ اسے خالی ہاتھ واپس کرے یہاں تک کہ اپنے فضل و رحمت سے اس میں جو چاہتا ہے ڈال دیتا ہے۔ جب تم میں سے کوئی ہاتھ دعا کیلئے اٹھائے تو جب تک ان کو سینے اور چہرے پر مل نہ لے واپس نہ کرے۔

اصول کافی ج ۲ ص ۴۷۱ کتاب الدعا باب ان من دعا استجیب له حدیث ۲

۳۲۔ وسائل الشیعہ ج ۱ ص ۵۰ کتاب طہارت ابواب مقدمات عبادات باب ۱ حدیث ۳۔

۳۳۔ حدیث ۱ حاشیہ ۳۲۔

۳۴۔ اصول کافی ج ۲ ص ۲۹۵ کتاب ایمان و کفر باب ریا حدیث ۸

۳۵۔ قال ابو عبداللہؑ ﴿العبادة ثلاثة قوم عبدوا الله عزوجل خوفا فتلک عبادة العبید وقوم عبدوا الله تبارک وتعالی طلب الثواب فتلک عبادة الاجراء وقوم عبدوا الله عزوجل حبا له فتلک عبادة الاحرار وهي افضل العبادة﴾ عبادت تین قسم کی ہوتی ہے ایک قوم خدا کی عبادت (جہنم کے) خوف سے کرتی ہے یہ غلاموں کی عبادت ہے۔ کچھ لوگ خدائے تبارک وتعالیٰ کی عبادت ثواب کی خاطر کرتے ہیں یہ مزدوروں کی عبادت ہے (اور) کچھ لوگ خدا سے محبت کی بنا پر اس کی عبادت کرتے ہیں یہ آزاد لوگوں کی عبادت ہے اور یہی سب سے افضل عبادت ہے

وسائل الشیعہ ج ۱ ص ۴۵ ابواب مقدمات عبادات باب ۹ حدیث ۱ اور اصول کافی ج ۲ ص ۱۳۱ کتاب ایمان و کفر باب عبادت حدیث ۵۔

۳۶۔ اصول کافی ج ۲ ص ۲۹۷ کتاب ایمان و کفر باب ریا حدیث ۸

تیسری حدیث

بالسند المتصل الى محمد بن يعقوب، عن علي بن ابراهيم عن أبيه، عن علي بن أسباط عن أحمد بن عمر الحلال عن عليّ بن سويد عن أبي الحسن عليه السلام قال: سألته عن العُجب الّذي يُفسدُ العملَ فقال:

﴿العُجْبُ دَرَجاتٌ مِنْها أنْ يُزَيَّنَ لِلعَبْدِ سُوءُ عَمَلِه فيراهُ حسناً فيُعجبه ويحسَبُ أنّه يُحسنُ صنعاً ومِنْها أنْ يُؤمِنَ العبْدُ بربّه فيمُنَّ على الله عزّوجلَّ ولله عليه فيه المنُّ﴾[1]

ترجمہ: علی بن سوید کہتے ہیں: میں نے حضرت امام موسیٰ کاظمؑ سے اس عجب کے بارے میں پوچھا جو عمل کو خراب کر دیتا ہے تو حضرت نے فرمایا "عجب (خود پسندی) کے کئی درجے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کا برا عمل اس کیلئے باعث زینت ہو۔ پس وہ شخص اس عمل کو اچھا سمجھے اور اس کی وجہ سے اس میں "عجب" پیدا ہو جائے اور اس کو گمان ہو کہ اس نے اچھا عمل کیا ہے اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ بندہ اپنے خدا پر ایمان لائے اور اس ایمان لانے کو خدا پر احسان کرنا سمجھے حالانکہ ایمان لانے میں خدا کا بندے پر احسان ہے"۔

شرح: علمائے کرام رضوان اللہ علیہم کے نزدیک عجب کا مطلب "اپنے اچھے عمل کو بڑا سمجھنا اور زیادہ خیال کرنا اور اس پر خوش و مسرور ہونا اور اس عمل پر ناز کرنا اور اپنے کو حد تقصیر سے خارج سمجھنا ہے" لیکن اس عمل پر خوش ہونا اور خدائے بزرگ و برتر کیلئے تواضع و فروتنی کرنا اور اس توفیق پر خدا کا شکر ادا کرنا اور مزید توفیق طلب کرنا، عجب نہیں، بلکہ قابل تعریف ہے۔[2]

عظیم محدث علامہ مجلسی (علیہ الرحمہ) سے عظیم محقق اور دانشور شیخ اجل بہاء الدین عاملی (شیخ بہائی) سے کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ شیخ جلیل القدرؒ نے فرمایا "بے شک نیک اعمال بجالانے والے، مثلاً روزہ رکھنے والے، شب بیداری کرنے والے حضرات کے دل میں ان اعمال سے ایک خوشی و سرور پیدا ہوتا ہے۔ پس اگر یہ مسرت وخوشی اس وجہ سے ہے کہ خدا نے اس کو اتنی بڑی نعمت عطا کی ہے کہ اس سے یہ اعمال صالحہ سرزد ہوئے ہیں اور اسی کے ساتھ وہ ان کی کمیوں اور نقائص کی طرف سے خوفزدہ بھی ہو کہ کہیں یہ نعمت مجھ سے چھین نہ لی جائے، اس لئے خدا سے اس میں مزید اضافہ طلب کرے تو یہ مسرت وسرور عجب نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ مسرت و سرور اس وجہ سے ہو کہ اس نے ان اعمال کو کیا ہے اور اس کے اندر یہ صفت پائی جاتی ہے ور اپنے ان اعمال کو بہت اہمیت دے اور ان پر اعتماد و بھروسہ کرے اور اپنے کو حد تقصیر سے خارج سمجھے، ور اس کی نتیجہ یہ ہو جائے کہ گویا وہ خدا پر ان عمال کی وجہ سے احسان جتا رہا ہے تو یہ خوشی "عجب" ہے"۔ انتہی ؎

فقیر (مؤلف کتاب) کہتا ہے

خود پسندی کی جو تفسیر (ہمارے علما نے) کی ہے صحیح ہے۔ لیکن عمل کی دونوں قسموں (قلبی اور جوارحی اعمال) کو مد نظر رکھنا چاہئے۔ اسی طرح عمل میں اچھے اور برے دونوں عمال پر نظر رکھنا چاہئے، کیونکہ عجب جیسے اعمال جوارح پر ہوتا ہے۔ اسی طرح اعمال قلب و باطن پر بھی ہوتا ہے، ور ان کو خراب و برباد کر دیتا ہے اور جس طرح نیک خصلت وا خود پسند ہوتا ہے۔ بری عادتوں وا بھی اپنی عادت پر گھمنڈ کرتا ہے۔ جیسا کہ س حدیث شریف میں دونوں کی تصریح کر دی گئی ہے اور دونوں کا ذکر کر دیا گیا ہے، کیونکہ یہ بات اغلب لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہے۔ گر خدا نے چاہا تو ہم آگے دونوں کا ذکر کریں گے۔ نیز یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ جس مسرت وخوشی سے خود پسندی کی نفی کی گئی ہے یا اس کو اچھے صفات میں شمار کیا گیا ہے اس کا نحصار خود شخص کی حالت اور کیفیت پر ہے۔ جیسا کہ آئندہ کسی فصل میں بیان کیا جائے گا۔ ؎

نیز حدیث شریف کے مطابق خود پسندی کے درجات ہیں جن کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے

پہلا درجہ ایمان ور معارف حقہ پر خود پسندی۔ اس کے مقابلہ میں کفر و شرک اور عقائد باطلہ پر گھمنڈ ہے۔

دوسرا درجہ صفات پسندیدہ و ملکات فاضلہ پر عجب۔ اس کے مقابلہ میں برے اخلاق اور برے ملکات پر گھمنڈ ہے۔

تیسرا درجہ: نیک اعمال اور افعال حسنہ پر عجب۔ اس کے مقابلے میں اعمال قبیحہ اور برے افعال پر خودپسندی ہے

ان کے علاوہ بھی عجب کے درجات ہیں۔ مگر اس جگہ کیلئے ان کی خاص اہمیت نہیں ہے۔ ہم انشاء اللہ ان کے درجات، اسباب اور ان کے علاج کے سلسلہ میں چند فصلوں میں ان سب کا ذکر کریں گے۔

﴿وبہ نستعین﴾

پہلی فصل

خودپسندی کے مراتب

یہ جان لو کہ ان سابق الذکر درجات میں خودپسندی کے کئی درجے و مرتبے ہوتے ہیں بعض تو بہت ہی واضح اور روشن ہوتے ہیں کہ انسان تھوڑی سی توجہ و دقت سے اس کو سمجھ لیتا ہے۔ (البتہ) بعض اتنے دقیق و باریک ہوتے ہیں کہ جب تک انسان اس کی مکمل تحقیق نہ کرے اور بڑی دقت نظر سے کام نہ لے تو اس کا ادراک نہیں کر سکتا اور بعض مرتبے دوسرے مرتبوں سے شدید و زیادہ سخت اور مہلک ہوتے ہیں

پہلا مرتبہ: جو سب سے بڑا اور جس کی ہلاکت سب سے زیادہ ہے وہ حالت ہے جو انسان میں خودپسندی کی شدت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے ایمان اور اچھی خصلتوں کا احسان اپنے ولی نعمت و مالک الملوک پر رکھتا اور اپنے دل میں گمان کرتا ہے کہ میرے ایمان کی وجہ سے خدا کی مملکت میں وسعت یا دین خدا میں رونق پیدا ہوگئی ہے یا اس کی ترویج شریعت یا وعظ و ہدایت یا اس کے امر بالمعروف و نہی از منکر یا اجرائے حدود یا اس کے محراب و منبر کی وجہ سے دین خدا کی رونق بڑھ گئی ہے یا (یہ گمان کرے کہ) مسلمانوں کی جماعت میں میرے آنے سے یا امام حسین علیہ السلام کی مجلس عزاداری منعقد کرنے سے دین کی رونق بڑھ گئی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ خدا و امام معصومؑ و رسول خداؐ پر احسان رکھے، خواہ زبان سے نہ بھی کہے (مگر) دل میں یہ احساس رکھے۔

اسی طرح بندگان خدا پر دینی امور کے سلسلے میں احسان جتانا، مثلاً واجبی و مستحبی صدقہ دینے میں، کمزوروں اور فقیروں کی مدد کرکے ان پر احسان جتانا، یہ بھی عجب کے پہلے مرتبہ میں شامل ہے۔ البتہ یہ منت گزاری کبھی اتنی مخفی ہوتی ہے کہ خود انسان اس کو نہیں سمجھ پاتا۔ خدا کا اپنے بندوں پر احسان جتانا اور بندوں کا خدا پر کسی قسم کا احسان نہ ہونے کی تفصیل دوسری حدیث کی شرح میں گزر چکی ہے۔

دوسرا مرتبہ: دل میں موجود خود پسندی کی وجہ سے خداوند عالم سے ناز و نخرے کرنا۔ یہ احسان جتانے والے عجب کے علاوہ ہے اگرچہ بعض حضرات نے دونوں میں کوئی فرق نہیں کیا ہے۔ اس مرتبہ والا شخص اپنے کو محبوب خدا سمجھتا ہے اور خدا کے مقرب بندوں اور سابقین میں شمار کرتا ہے اور اگر کہیں اولیائے حق یا محبوبین و محبین یا مجذوب سالکین کا ذکر کیا جائے تو یہ اپنے دل میں اپنے کو بھی انہی لوگوں میں شمار کرتا ہے۔ لیکن ہوسکتا ہے کسر نفسی کر کے اس کے خلاف اظہار کرے یا اپنے لئے اس مقام کے اثبات کی خاطر اس طرح نفی کرے کہ اس سے اثبات لازم آئے اور اگر خدا اس کو کسی بلا میں مبتلا کردے تو «البلاء للولاء» یعنی "بلا تو دوستوں ہی کیلئے ہوتی ہے" کا نعرہ لگائے۔ عرفاء صوفیہ اور اہل سلوک و ریاضت میں سے جو وعظ و ہدایت کے دعوے کرتے ہیں وہی لوگ عجب کے اس درجے سے بہ نسبت دوسروں کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔

تیسرا درجہ: ایمان یا صفات و اعمال کی بنا پر خدا سے صلے کا طالب ہو اور اپنے کو ثواب کا مستحق سمجھتا ہو۔ نیز خدا کیلئے ضروری جانتا ہو کہ اس کو اس دنیا میں عزیز رکھے اور آخرت میں بلند مرتبہ عطا کرے، اور اپنے کو مومن و پاک باز خیال کرتا ہو اور جب کہیں ان مومنین کا ذکر آجائے جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں تو اپنے سر کو اس طرح ہلا رہے جیسے کہ وہ خود بھی انہی میں سے ہے اور دل میں یہ سوچے کہ اگر خدا اپنے عدل سے بھی میرے ساتھ سلوک کرے تو بھی میں اجر و ثواب کا مستحق ہوں، بلکہ بعض تو ایسے بے حیا و بے شرم ہوتے ہیں کہ اس باطل کلام کی تصریح بھی لفظاً کر دیتے ہیں اور اگر کبھی کسی بلا میں مبتلا ہو گئے اور کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آئے تو دل میں خدا پر اعتراض کرتے ہیں اور خدا کے عادلانہ کاموں پر تعجب کرتے ہیں کہ اس نے مومن پاک کو مبتلائے بلا کیوں کیا اور منافق و فاسق کو رزق (و نعمت) کیوں دی؟ اور باطن میں خدا اور اس کی تقدیر پر غضبناک ہوتے ہیں مگر ظاہر میں اظہار رضامندی کرتے ہیں۔ اپنے غصے کا اظہار اپنے ولی نعمت پر کرتے ہیں اور مخلوق پر رضا بہ قضا کا اظہار کرتے ہیں اور جب سنتے ہیں کہ خدا دنیا میں مومنین کو مبتلائے مصیبت کرتا ہے تو اپنے دل کو تسلی دے دیتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ منافق بھی کثیر تعداد میں مبتلا ہیں اور ہر پریشان شخص مومن نہیں ہوتا۔

چوتھا درجہ: عجب کا ایک اور درجہ یہ ہے کہ انسان، ایمان کی بنیادوں پر غیر مومنین سے اپنے کو ممتاز و بہتر سمجھے اور مومنین سے زیادہ اپنے کو کامل الایمان سمجھے اور جو لوگ اچھے اوصاف کے مالک نہیں ہیں ان سے صفات حسنہ سے متصف ہونے کی وجہ سے اپنے لئے برتری کا قائل ہو اور اس کے مقابل والوں سے

اپنے کو اس سے بہتر سمجھے کہ خود تمام واجبات کا پابند ہے اور تمام محرمات کا تارک ہے اور عوام الناس سے اپنے کو اس لئے کامل وممتاز سمجھے کہ وہ مستحبات کو بھی بجا لاتا ہے۔ جمعہ و جماعات و دیگر مناسک اور ترک مکروہات کا پابند بھی ہے۔ نیز وہ اپنے اوپر اور اپنے ایمان اور اعمال پر اعتماد و بھروسہ کرتا ہے اور دوسرے لوگوں کو ناقص و ناچیز سمجھتا ہے۔ تمام لوگوں کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتا، اپنے دل میں یا زبان سے تمام بندگان خدا کی سرزنش کرتا اور طعن وطنز کرتا ہے۔ ہر شخص کو رحمت الٰہی سے دور جانتا اور رحمت حق کو صرف اپنے لئے اور اپنے جیسے چند لوگوں جیسے مخصوص سمجھتا ہے۔ اس درجہ کا آدمی ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کے کسی بھی عمل صالح پر نکتہ چینی کئے بغیر رہتا نہیں اور اپنے دل میں اس پر تشویش کا اظہار کرتا ہے اور اپنے اعمال کو ان تمام نکتہ چینیوں اور تشویش کے مقامات سے پاک جانتا ہے۔ لوگوں کے اعمال حسنہ کو ناچیز سمجھتا ہے اور اگر وہی عمل خود کرے تو اس کو بڑا اہم سمجھتا ہے۔ لوگوں کی معمولی خامیوں کو بھی دیکھ لیتا ہے اور اپنے بڑے سے بڑے عیب سے بھی غافل رہتا ہے۔ یہ سب عجب کی علامتیں ہیں اگرچہ خود انسان ان سے غافل ہے۔ عجب کے اور بھی درجات ہیں۔ بعض کا ہم نے خود ذکر نہیں کیا اور بعض سے مجبوراً غفلت برتی ہے۔

دوسری فصل: اہل فساد کا عجب

کفار، منافقین، مشرکین، ملحدین، برے اخلاق والے، پست ملکات والے، اور گنہگار و نافرمان لوگ کبھی اس نوبت تک پہنچ جاتے ہیں کہ اپنے کفر و الحاد، برے اخلاق اور بد کردار ہونے پر گھمنڈ اور فخر و مباہات کرنے لگتے ہیں اور اس طرح اپنے کو اندھی تقلید سے آزاد اور توہم پرستی سے الگ ہو کر حریت فکر وضمیر کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے اس عقیدے کو مردانگی خیال کرتے ہیں اور ایمان باللہ کو توہم پرستی، دینداری کو تنگ نظری خیال کرتے ہیں، اخلاق حسنہ وملکات فاضلہ کو بے بسی اور نفس کی کمزوری شمار کرتے ہیں، اعمال حسنہ اور مناسک وعبادات کو ضعف نفس اور حواس باختگی سمجھتے ہیں اور بزعم خود شریعت سے لاپرواہ اور توہمات سے متنفر و لاابالی آزاد روح، تعریف وتمجید کے لائق سمجھتے ہیں۔ اخلاقی معائب اور بری خصلتیں جو ان کے دل میں جڑ پکڑ چکی ہیں اور وہ ان سے مانوس ہو چکے ہیں اور ان کی آنکھیں ان چیزوں کی عادی اور کان ان سے بھر چکے ہیں ان کی نظروں میں یہی چیزیں باعث زینت ہیں اور انہی کو وہ لوگ کمال سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اس حدیث شریف میں اسی جگہ اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جہاں ارشاد ہے کہ ''ان کے درجات میں

ے ایک درجہ یہ ہے کہ بندے کی نظر میں اس کا برا عمل اچھا معلوم ہونے لگے اور باعث زینت بن جائے" اور یہ خدا کے اس قول کی طرف اشارہ ہے ﴿أفمن زُيّن له سُوءُ عمله فرآهُ حسناً﴾۸ "بھلا وہ شخص جسے اس کا برا کام شیطانی اغوا سے اچھا کر دکھایا گیا ہو اور وہ اسے اچھا سمجھنے لگا ہو۔ (کبھی مومن نیکوکار کے برابر ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں)"۔ جیسے فرمایا گیا ہے کہ "اس کو گمان ہے کہ وہ اچھا عمل کرتا ہے"۔ یہ خدا کے اس قول کی طرف اشارہ ہے

﴿قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالأَخْسَرِينَ أَعْمَالاً ☆ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعاً ☆ أُولَئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْناً﴾۹ "(اے رسولؐ) تم کہہ دو کہ کیا ہم ان لوگوں کا پتہ بتا دیں جو لوگ اعمال کی حیثیت سے بہت گھاٹے میں ہیں (یہ) وہ لوگ (ہیں) جن کی دنیوی زندگی کی سعی و کوشش سب اکارت ہو گئی اور وہ اس خام خیال میں ہیں کہ وہ یقیناً اچھے اچھے کام کر رہے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کی آیتوں سے اور (قیامت کے دن) اس کے سامنے حاضر ہونے سے انکار کیا تو ان سب کا کیا کرایا اکارت ہو گیا۔ تو ہم اس کے لیے قیامت کے دن میزان حساب بھی قائم نہ کریں گے" (اور ان کو سیدھے جہنم میں بھیج دیں گے)"۔

لوگوں کا یہ گروہ جو جاہل و بے خبر ہے مگر اپنے کو عالم و آگاہ خیال کرتا ہے یہ گروہ سب سے زیادہ بے چارہ اور بدبخت ہے نفسیاتی ماہرین اس کے علاج سے عاجز ہیں۔ دعوت و نصیحت کا اثر اس گروہ پر ہوتا ہی نہیں ہے، بلکہ کبھی تو نصیحت کا اثر الٹا ہو جاتا ہے۔ یہ گروہ نہ دلائل کو سنتا ہے نہ انبیاءؑ کی ہدایت اور حکماء کے براہین اور علماء کے وعظ و نصیحت پر کان دھرتا ہے۔ نفس کے شر اور اس کی چالبازیوں سے خدا کی پناہ مانگنی چاہئے نفس انسان کو گناہ سے کفر کی طرف کھینچ لے جاتا ہے اور کفر سے عجب کی طرف اور وہ کفر پر گھمنڈ تک پہنچا دیتا ہے۔

نفس و شیطان بعض گناہوں کو چھوٹا کر کے دکھانے کی وجہ سے انسان کو معصیت پر آمادہ کر دیتے ہیں اور پھر دل میں گناہ کے گھر کر جانے اور اس گناہ کو معمولی سمجھنے سے انسان اس سے بڑی معصیت میں مبتلا ہو جاتا ہے اور تکرار کے بعد اس کی بھی اہمیت گھٹ جاتی ہے اور پھر انسان بڑی سی بڑی معصیت میں مبتلا ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح انسان قدم بہ قدم آگے بڑھتا جاتا ہے اور بڑی سے بڑی معصیت انسان کی نظر میں

چھوٹی نظر آنے لگتی ہے، اور پھر نوبت یہ آجاتی ہے کہ کسی بھی معصیت کی کوئی اہمیت اس کی نظر میں باقی نہیں رہتی اور شریعت وقانون الٰہی، رسولؐ اور خدا اس کی نظر میں بے معنی الفاظ بن جاتے ہیں اور وہ کفر وارتداد تک پہنچ جاتا ہے اور پھر اس پر تراتا ہے، ممکن ہے آئندہ فصلوں میں اس کا ذکر آئے

تیسری فصل: شیطان کی مکاریاں

جس طرح عجب والے گناہ میں ایک درجہ سے ترقی کر کے دوسرے درجہ تک اور اسی طرح وہ کفر وارتداد کے درجہ تک پہنچ جاتے ہیں اسی طرح طاعت میں گھمنڈ کرنے والے عجب کے ناقص درجے سے بڑھتے بڑھتے اس کے کامل درجہ تک ترقی کر جاتے ہیں۔ نفس کی مکاری اور دل میں شیطانی خیالات، یہ سب (دفعتاً نہیں ہوتے، بلکہ) ایک اصول ومیزان کے ماتحت انجام پاتے ہیں اگر آپ متقی اور دل میں خوف خدا رکھنے والے ہیں تو کسی طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ کا نفس (امارہ) آپ کو زنا یا کسی کے قتل پر (فوراً) آمادہ کردے یا جس کے اندر شرافت اور نفس کی پاکیزگی کی صفت پائے جاتے ہیں اس کو چوری یا ڈکیتی پر آمادہ کرادے۔ اسی طرح ابتدائے امر میں یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ شیطان تم سے کہے اپنے عقیدہ وعمل میں خدا پر احسان رکھو یا اپنے کو محبوبین ومحبین ومقربین بارگاہ الٰہی میں شمار کرنے لگو۔ (وہ تو) شروع میں بالکل پست درجے سے تمہارے دل میں وسوسہ پیدا کرنا شروع کرے گا اور (پہلے) تم کو مستحبات اور وظائف واذکار کی پابندی پر سختی سے آمادہ کرے گا اور اسی ضمن میں کسی گنہگار کی حالت کو جو تمہارے مناسب حال ہو، تمہارے سامنے پیش کرے گا اور تمہارے کان میں کہے گا کہ تم عقل وشرع دونوں اعتبار سے اس گنہگار سے بہتر ہو، اور تمہارے اعمال تمہاری نجات کے سبب ہیں اور تم بحمد اللہ پاک وپاکیزہ ہو، گناہوں سے عاری اور بری ہو اسی طرح (تمہارے ذہن میں یہ بات بٹھا کر) وہ دو نتیجے حاصل کرے گا پہلا نتیجہ خدا کے بندوں کی نسبت بدبینی اور دوسرا خود پسندی کے طور پر سامنے آئے گا۔ اور یہ دونوں صفتیں نہ صرف یہ کہ ہلاک کرنے والی ہیں، بلکہ تمام برائیوں کی جڑ ہیں۔

تم اپنے نفس اور شیطان سے کہو ہوسکتا ہے اس گنہگار میں کوئی ایسی صفت ہو یا کوئی دوسرے ایسے اعمال ہوں کہ خدا کی رحمت اس کے شامل حال ہوجائے اور اس صفت اور عمل کا نور اس کی ہدایت کا سبب بن جائے اور اس کا انجام بخیر ہوجائے، نیز یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ خدا نے اس کو گناہ میں اس لئے مبتلا کردیا ہو کہ یہ

خود پسندی سے بچ جائے جو گناہ سے زیادہ بدتر ہے۔ جیسا کہ کافی کی یک حدیث میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ حضرتؑ نے فرمایا ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلِمَ اَنَّ الذَّنْبَ خَیْرٌ لِلْمُؤْمِنِ مِنَ الْعُجْبِ وَلَوْلَا ذٰلِکَ مَا ابْتَلٰی مُؤْمِناً بِذَنْبٍ اَبَداً﴾ ۱۰؎ ''چونکہ خدا کو علم ہے کہ مومن کیلئے گناہ خود پسندی سے بہتر ہے (اس لیے اس کو گناہ میں مبتلا کرتا ہے) ورنہ اگر ایسا نہ ہوتا تو مومن ہرگز گناہ میں مبتلا نہ ہوتا'' (اور اس بدبختی کی وجہ سے کہیں میرا انجام خراب نہ ہو جائے)۔

ہمارے شیخ بزرگ، عارف کامل شاہ آبادی (روحی فداہ) ۱۱؎ فرمایا کرتے تھے۔ ''اپنے دل میں کافر کو بھی سرزنش ومذمت نہ کرو! ہوسکتا ہے نور فطرت اس کو ہدایت کردے اور تمہاری اس سرزنش وملامت سے تمہارا انجام برا ہو جائے''۔

امر معروف ونہی از منکر قلبی سرزنش ومذمت کے علاوہ ہے، بلکہ فرماتے تھے ''جن کافروں کے بارے میں معلوم نہ ہو کہ کفر کی حالت میں اس دنیا سے گئے ہیں ان پر بھی لعنت نہ کرو! ہوسکتا ہے وہ مرتے وقت ہدایت یافتہ ہو گئے ہوں اور ان کی روحانیت تمہاری ترقی کے مانع بن جائے''۔ مختصر یہ کہ نفس اور شیطان پہلے تو آپ کو عجب کے پہلے مرحلے میں داخل کرتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ دوسرے مرحلے میں اور پھر بڑھتے بڑھتے نفس کو اس جگہ پہنچا دیتے ہیں جہاں پہنچ کر وہ اپنے عقائد و عمل کا احسان اپنے ولی نعمت، مالک الملوک پر رکھنے لگتا ہے، اور پھر اس کا انجام آخری درجے تک پہنچ جاتا ہے۔

چوتھی فصل۔ خودپسندی کی برائیاں

یہ جان لو کہ خود پسندی بذات خود ہلاکت میں ڈالنے والے خطرناک عناصر میں سے ہے اور انسان کے عقائد واعمال کو بھی برباد کردیتی ہے۔ چنانچہ راوی نے اس خود پسندی کے بارے میں پوچھا جو اعمال کو خراب کردیتی ہے تو امامؑ نے اس کے ایک درجے کو ایمان میں پیدا ہونے والی خود پسندی قرار دیا ہے اور اس سے پہلے والی حدیث میں آپ نے پڑھا کہ خود پسندی خدا کے نزدیک گناہ سے بدتر ہے اور اسی لئے خدا بندۂ مومن کو گناہ میں مبتلا کردیتا ہے تاکہ وہ عجب سے بچ جائے۔ خود رسول خداؐ نے بھی ہلاک کرنے والی چیزوں میں خود پسندی کو بھی شمار کرایا ہے۔ ۱۲؎

امالی صدوقؒ میں سند روایت حضرت علیؑ تک پہنچا کر حضرت علیؑ کا قول نقل کیا گیا ہے ﴿مَنْ دَخَلَهُ

﴿العُجبُ هلک﴾ ۳؎ ''جس کے اندر خودپسندی پیدا ہوگئی وہ ہلاک ہوگیا''۔ برزخ اور موت کے بعد عجب کی صورت جتنی ہولناک و وحشت ناک ہوتی ہے کسی اور چیز کی اتنی وحشت ناک صورت نہیں ہوتی۔ ہوسکتا ہے رسول خدا نے حضرت علیؑ کو جو یہ وصیت فرمائی ہے کہ ﴿ولا وحشۃ اوحش من العجب﴾ ۴؎ ''عجب سے زیادہ کسی بھی تنہائی کی وحشت اتنی نہیں ہوتی'' اس سے اسی طرف اشارہ مقصود ہو

حضرت موسیٰ بن عمران علی نبینا وآلہ وعلیہ السلام، نے شیطان سے پوچھا مجھے وہ گناہ بتاؤ کہ اگر اولاد آدمؑ اس کا ارتکاب کرے تو تم اس پر غلبہ پا کر مسلط ہوسکو! شیطان نے کہا جب وہ اپنی ذات پر عجب وگھمنڈ کرتا ہے اور اپنے عمل کو بڑی اہمیت دیتا ہے اور اپنے گناہ کو ہیچ سمجھتا ہے (تو پھر میں اس پر قابو پا لیتا ہوں)۔ ۵؎

خداوند عالم نے حضرت داودؑ سے فرمایا اے داود گناہگاروں کو بشارت وخوشخبری دو اور سچے لوگوں کو ڈراؤ جناب داودؑ نے کہا کیسی بشارت دوں اور ان کو کیونکر ڈراؤں؟ خدا کا حکم ہوا گنہگاروں سے کہدو کہ میں ان کی توبہ کو قبول کروں گا اور ان کے گناہوں کو بخش دوں گا اور سچوں کو اس بات سے ڈراؤ کہ اپنے اعمال پر عجب وگھمنڈ نہ کریں کیونکہ کوئی ایسا بندہ نہیں ہے جس سے میں حساب لینے پر اتر آؤں تو وہ ہلاک نہ ہوجائے ۶؎

میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں حساب میں جھگڑا کرنے میں کیونکہ خدا کا حساب لینے میں جھگڑا کرنا سچے نیکوکاروں سے بھی بڑے لوگوں کو ہلاک کردے گا

جناب شیخ صدوق رحمت اللہ علیہ نے خصال میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ حضرت نے فرمایا شیطان کہتا ہے اگر میں تین چیزوں میں اولاد آدم پر غالب آجاؤں تو پھر مجھے کوئی فرق نہیں کہ وہ کیا کرتا ہے، کیونکہ اس کے بعد کوئی نیک عمل قبول نہیں ہوتا'' (اور وہ چیزیں یہ ہیں)

جب وہ اپنے عمل کو بہت زیادہ سمجھنے لگے، اپنے گناہوں کو بھول جائے اور اس میں عجب وغرور پیدا ہوجائے ۷؎

خود پسندی ان برائیوں کے علاوہ جن کا ذکر کیا جا چکا ہے یہ ایک ایسا خبیث درخت ہے کہ اس کے پھل بڑے گناہ اور ہلاک کرنے والے عوامل ہوتے ہیں اور جس دل میں یہ جڑ پکڑ لیتا ہے اس شخص کو کفر وشرک اور اس سے اوپر درجے تک پہنچا دیتا ہے۔ اس کی ایک خرابی یہ ہے کہ خود پسند انسان اپنے گناہوں کو معمولی سمجھنے

لگتا ہے، بلکہ ایسا شخص کبھی اپنے نفس کے اصلاح کی کوشش نہیں کرتا۔ اپنے کو ہمیشہ پاک و پاکیزہ خیال کرتا ہے۔ اس کی کبھی فکر ہی نہیں کرتا کہ اپنے کو گناہوں سے پاک کرے، غرور و تکبر اور خود پسندی کا دبیز پردہ اپنی برائیوں کے بارے میں کبھی سوچنے ہی نہیں دیتا اور یہ ایسی مصیبت ہے جو انسان کو تمام کمالات سے روک دیتی ہے اور برائیوں کے اقسام میں مبتلا کر دیتی ہے اور انسان کو ہلاکت ابدی کے گڑھے میں گرا دیتی ہے۔ ماہرین نفسیات بھی اس کے علاج سے عاجز ہو جاتے ہیں۔

دوسری خرابی یہ ہوتی ہے کہ انسان اپنے اعمال اور اپنے نفس پر بھرپور اعتماد کرنے لگتا ہے جس کے نتیجے میں بے چارہ جاہل انسان اپنے کو خدا سے (بھی) بے نیاز سمجھنے لگتا ہے، اور خدا کے فضل و کرم کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور اپنی چھوٹی سی عقل میں خدا پر لازم جانتا ہے کہ اس کو اجر و ثواب دے، اور یہاں تک گمان کرتا ہے کہ اگر خدا نے عدل سے بھی کام لیا تو میں ثواب کا مستحق ہوں گا اس کا ذکر انشاء اللہ بعد میں آئے گا۔

ایک اور خرابی یہ بھی ہوتی ہے کہ یہ شخص خدا کے بندوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور لوگوں کے اعمال کو حقیر شمار کرتا ہے، چاہے دوسروں کے اعمال اس کے اعمال سے بہتر ہوں، یہ بھی انسان کی ہلاکت کا ایک طریقہ ہے اور اس کے راستے کا کانٹا ہے۔

اور خود پسندی کی ایک اور خرابی یہ ہے کہ انسان کو ریاکار بنا دیتی ہے۔ اس لئے کہ جو شخص اپنے اعمال کو حقیر خیال کرے گا، اپنے اخلاق کو برا سمجھے گا، ان کو کسی قابل شمار نہ کرے گا وہ اپنے اعمال و صفات اور اپنی ذات پر کبھی بھی غرور و تکبر نہیں کرے گا، بلکہ وہ تو خود ہی اپنے کو اور اپنی تمام چیزوں کو برا سمجھے گا، ان کی نمائش نہیں کرے گا اور خود نمائی بھی نہیں کرے گا۔ برے اور خراب مال کو کوئی بھی شخص بازار میں نہیں رکھتا۔ ہاں! اگر خود کو کامل اور اپنے اعمال کو قابل سمجھے گا تو ان کی نمائش کی بھی فکر کرے گا اور خود فروشی کی بھی سعی کرے گا۔

دوسری حدیث میں ریاکاری کی برائیوں کا ذکر ہو چکا ہے۔ انہی برائیوں کو عجب و خود پسندی کی برائیاں بھی سمجھنا چاہئے۔ خود پسندی کی ایک اور خرابی یہ ہے کہ یہ کبر و غرور کی مہلک برائی کا باعث بنتی ہے اور انسان کو تکبر میں بھی مبتلا کر دیتی ہے (خدا نے چاہا تو اس کا بھی ذکر بعد میں آئے گا)۔ اس خود پسندی کی بالواسطہ یا بلاواسطہ دوسری خرابیاں بھی ہیں جن کی تشریح طوالت کا سبب بن جائے گی۔

پس خود پسند کو یہ بات بھی معلوم ہونی چاہئے کہ خود پسندی دیگر برائیوں کی جڑ ہے اور یہ ایسے امور کو جنم دیتی ہے جن میں سے ہر ایک بذات خود ابدی ہلاکت اور ہمیشہ جہنم کے عذاب میں مبتلا رہنے کا مستقل سبب

ہے۔ اگر کوئی شخص ان برائیوں کو اچھی طرح سمجھ لے اور دقت نظر سے کام لے اور رسول اکرمؐ اور ان کے اہل بیتؑ کے اخبار و احادیث کی طرف رجوع کرے تو اپنے لئے واجب سمجھ کر وہ نفس کی اصلاح کے درپے ہو کر اپنے کو اس برائی سے پاک کرے گا اور باطن نفس سے اس کی جڑوں کو اکھاڑ پھینکے گا کہ کہیں خدانخواستہ اسی بری صفت کے ساتھ دوسرے عالم میں منتقل نہ ہو جائے۔ جب اس کی دنیاوی آنکھیں بند ہو جائیں گی اور برزخ و قیامت کا سورج طلوع کرے گا تو وہ دیکھے گا کہ گناہ کبیرہ کرنے والوں کا حال بھی اس سے بہتر ہے۔ گناہاں کبیرہ کرنے والوں کو بھی رحیم آخرت نے اپنی دریائے رحمت میں غوطہ زن کر دیا ہے یا تو ان کی ندامت و پشیمانی کی بنا پر یا اس اعتماد و بھروسے کی وجہ سے جو ان کو پروردگار کے فضل و کرم سے تھا، لیکن چونکہ یہ شخص اپنے کو خود مختار اور باطن میں اپنے کو خدا کے فضل و کرم سے بے نیاز سمجھتا تھا اس لئے خدا نے اس کے ساتھ حساب میں سختی کی اور اس کو اس کی خواہش کے مطابق میزان عدل پر لا کر سمجھا دیا کہ اس نے کوئی عبادت حق کیلئے نہیں کی تھی۔ اس کی تمام عبادتیں رحمت الٰہی سے دور تھیں، اس کے سارے اعمال و عقائد باطل و ناچیز تھے جن سے اس نے تبادلہ برتا اور آج وہی ہلاکت کے باعث اور دردناک عذاب کا منبع، ورثا ابد جہنم میں رہنے کا سبب بن گئے۔

خدا نہ کرے پروردگار کسی کے ساتھ انصاف پر اتر آئے اگر اس طرح کسی کا نامۂ اعمال پیش ہو تو اولین و آخرین میں سے کسی کو نجات نہیں مل سکتی۔ ائمہ معصومین علیہم السلام اور انبیاء کرامؑ اپنی مناجات میں ہمیشہ فضل خداوندی کی دعا کرتے تھے۔ عدل اور حساب کتاب کے جھگڑے سے خوفزدہ رہتے تھے۔[۴۰] خاصان بارگاہ الٰہی و ائمہ معصومین صلوات اللہ علیہم کی مناجات میں اپنی تقصیر کا اعتراف اور حق بندگی کے ادا نہ کر سکنے کا اعتراف ہمیشہ موجود رہا ہے۔[۴۱] جہاں فضل ممکنات و قرب موجودات (آخری رسول کائنات) فرمایا کرتے تھے ﴿ما عرفناک حقّ معرفتک و ما عبدناک حقّ عبادتک﴾[۴۲] (جو تیری معرفت کا حق ہے وہ ہم ادا نہ کر سکے اور جو تیری عبادت کا حق ہے ہم اس سے عاجز رہے) تو دوسرے لوگوں کا کیا حال ہوگا؟ یہ حضرات عظمت الٰہی کے عارف تھے، وہ ممکن کی واجب سے کیا نسبت ہے، اس کو وہ جانتے تھے۔ ان حضرات کو معلوم تھا کہ دنیا کی عمر کے برابر اگر خدا کی اطاعت و عبادت میں مشغول رہ کر تحمید و تسبیح کی جائے تب بھی خدا کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کیا جا سکتا، چہ جائیکہ کوئی ذات و صفات حق کی مدح و ثنا کر سکے۔ یہ حضرات جانتے تھے کہ کسی مخلوق کے پاس کچھ نہیں ہے۔ حیات، قدرت، علم و قوت اور دیگر

کمالات سب اس ذات کے کمال کا سایہ ہیں اور ممکنات ذاتاً فقیر، بلکہ سراسر فقر ہے وہ تو دوسرے کے سائے سے استفادہ کرتا ہے خود مستقل نہیں ہوتا۔ موجودات ممکن کے پاس کونسا کمال ہے جو کمال فروشی کرے گا؟ اس کے پاس کونسی قدرت ہے جو عمل فروشی کرے گا؟ وہ حضرات عارف باللہ تھے، جمال وجلال الٰہی کے عارف تھے، وہ لوگ شہود وعیان کے ذریعے اپنے نقص وعجز کا اور کمال واجب کا مشاہدہ کرتے تھے۔ یہ تو ہم بے چارے لوگ ہیں جن کے یہاں جہالت ونادانی اور غفلت وخود پسندی کا حجاب اور جن کی روح اور جسم پر معصیتوں کا پردہ ہے، آنکھ، کان اور عقل وہوش اور دیگر حسوں پر اس طرح حجاب پڑا ہوا ہے کہ خدا کی طاقتور مملکت کے مقابلے میں اپنے لئے بھی استقلال اور شئے ہونے کے قائل ہیں!

اے بے چارے ممکن الوجود! اے اپنے اور اپنے خالق کی نسبت سے بے خبر! اے ممکن الوجود انسان جو اپنے مالک الملوک کی نسبت اپنے فرائض سے غافل! یہی جہالت ونادانی ہے جو تمام بدبختیوں کا سبب ہوتی ہے اور اسی نے ہم کو تمام ظلمتوں اور کدورتوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ خرابی سرچشمہ میں پیدا ہوتی ہے اور چشمہ گندا ہو تو سارا پانی گندہ ہو جاتا ہے۔ ہماری معرفت کی آنکھیں اندھی ہیں۔ ہمارے دل مردہ ہیں اور یہی تمام مصیبتوں کا سبب ہے اور ہم اس کی اصلاح کی فکر میں بھی نہیں ہیں

اے معبود! تو ہم کو توفیق عنایت فرما۔ تو ہم کو ہمارے فرائض سے واقف کر۔ تو نے اپنے انوار معارف سے اولیاء وعرفا کے قلوب کو لبریز کر دیا، اس کی ایک جھلک ہمیں نصیب فرما۔ تو اپنی قدرت وسلطنت کی وسعتوں سے ہم کو بھی آگاہ فرما۔ ہماری خامیوں کی ہم کو نشاندہی کر دے۔ تو الحمدللہ ربّ العالمین کے معنی کو ہم غافلوں کو، جو تمام تعریفوں کو مخلوق کی طرف نسبت دیتے ہیں، سمجھا۔ تو ہمارے دلوں کو اس بات سے آشنا کر دے کہ کوئی تعریف مخلوق کیلئے نہیں ہے۔ خداوندا! تو ہمیں اپنے اس ارشاد کی حقیقت سے آشنا کر ﴿ما اصابک من حسنۃ فمن اللہ وما اصابک من سیّئۃ فمن نفسک﴾ [۴۳] (جب تم کو کوئی فائدہ پہنچے تو سمجھو کہ، خدا کی طرف سے ہے اور جب تم کو کوئی تکلیف پہنچے تو سمجھو کہ، خود تمہاری وجہ سے ہے)۔ کلمہ مبارکہ توحید کو ہمارے گناہگار اور سخت دلوں میں جاگزیں فرما۔ ہم اہل حجاب وظلمت ہیں، ہم اہل شرک ونفاق ہیں، ہم خودخواہ وخود پسند ہیں۔ اے معبود! تو حبّ نفس اور حبّ دنیا کو ہمارے دلوں سے باہر کر دے۔ تو ہم کو خدا سے محبت کرنے والا اور خداپرست بنا دے ﴿انک علی کلّ شیء قدیر﴾ [۴۴] "بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے"۔

پانچویں فصل: عجب کا سرچشمہ حب نفس ہے

عجب ایک ایسی برائی ہے جو "حب نفس" سے پیدا ہوتی ہے، چونکہ حب نفس، انسان کی تخلیق سے وابستہ ہے اور تمام انسانی خطاؤں اور اخلاقی برائیوں کا سرچشمہ حب نفس ہے۔ اس لئے انسان اپنے چھوٹے اعمال کو بھی بہت بڑا سمجھتا ہے اور اپنے کو ان اعمال کی بنا پر بارگاہ خداوندی کے مقرب بندوں میں شمار کرنے لگتا ہے اور انہی ناقابل و ہیچ اعمال کے بل بوتے پر اپنے کو تعریف و مدح کے لائق خیال کرنے لگتا ہے۔

حد یہ ہے کہ کبھی اس کے برے اعمال بھی اس کی نظر میں اچھے معلوم ہونے لگتے ہیں اگر کسی نے دوسرے کو دیکھ کر اس کے اعمال اس کے اپنے اعمال سے کہیں بہتر اور اچھے ہیں تو ان کو کوئی اہمیت نہیں دیتا، بلکہ دوسروں کے اچھے اعمال کی توجیہ بھی ایسی کرتا ہے کہ گویا وہ برے اعمال ہیں اور اپنے برے اعمال کو اس طرح پیش کرتا ہے جیسے وہ بہت اچھے اعمال ہوں۔ مخلوق خدا کے بارے میں ہمیشہ بدظن ہوتا ہے لیکن اپنے بارے میں بہت خوش بین ہوتا ہے۔ اپنی اسی حب نفس کی بنا پر ایک معمولی سے عمل کو جو ہزاروں غلاظتوں اور خدا سے دور کرنے والے عناصر سے بھرا ہوتا ہے، رحمت الٰہی کا طلبگار اور مستحق سمجھتا ہے۔

اس لئے مناسب ہے کہ یہاں پر ہم اپنے نیک اعمال کے بارے میں بھی ذرا غور و فکر کریں اور جو عبادتی افعال ہم سے سرزد ہوتے ہیں ان کو عقل کی کسوٹی پر جانچ کر انصاف کی نظر سے دیکھیں کہ آیا ان اعمال کی وجہ سے ہم مدح و تعریف کے لائق اور مستحق ثواب و رحمت ہیں یا ملامت و عقاب اور غضب و عذاب کے مستحق ہیں؟ اور اگر خدا ہمارے انہی اعمال کی بنا پر جو ہماری نظر میں اچھے ہیں ہم کو آتش قہر و غضب میں جلائے تو یہ صحیح ہے اور مطابق عدل ہے؟

اس بارے میں آپ ہی سے ایک سوال کر کے آپ ہی کو منصف بھی بناتا ہوں اور غور و فکر کے بعد آپ سے مبنی بر انصاف فیصلے کا خواہشمند ہوں۔ وہ سوال یہ ہے: اگر رسول اکرمؐ جو صادق و مصدق ہیں، آپ کو یہ خبر دیں کہ تم چاہے پوری عمر خدا کی عبادت کرو، اوامر و نواہی کی اطاعت کرو، شہوات و خواہشات نفسانی کو ترک کر دو یا تمام عمر آپؐ کے قول کے خلاف عمل کرتے ہوئے اپنی نفسانی خواہشات اور شہوات کو پورا کرو، آخرت میں تمہارے درجات میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ ہر حال میں جنت ملے گی اور تم اہل بہشت سے ہوگے اور عذاب الٰہی سے بچو گے، چاہے آپ نماز پڑھتے رہیں یا مصروف زنا رہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

البتہ خدا کی مرضی یہ ہے کہ تم عبادت کرو، اس کی مدح وثنا کرو، اس دنیا میں اپنی شہوتوں اور نفسانی خواہشات کو چھوڑ دو مگر ایسا کرنے پر بھی نہ کوئی اجر ملے گا نہ ثواب ملے گا تو ایسی صورت میں آپ اہل معصیت میں ہوتے یا اہل عبادت میں؟ آپ صرف خوشنودی خدا کیلئے شہوتوں کو ترک کرتے ہیں، نفسانی لذتوں کو اپنے اوپر حرام قرار دیتے ہیں یا نہیں؟ آپ مستحبات جمعہ وجماعات کی طرف رغبت کرتے ہیں یا نفسانی خواہشات کے اسیر ہوتے ہیں، لہو ولعب، اور رقص وسرور کی محفلوں میں منہمک ہوتے ہیں؟ ریاکاری وظاہر سازی کے بغیر ایک منصفانہ نظر میں آپ کا کیا جواب ہوگا؟

میں اپنی طرف سے اور اپنے جیسے دیگر افراد کی طرف سے آپ کو بتاتا ہوں کہ اس صورت میں ہم اہل معصیت سے ہوتے، حاجتوں کو ترک کرتے اور نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے۔ پس اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارا تمام کام نفسانی لذتوں اور پیٹ بھرنے وجنسی خواہش کو پورا کرنے سے متعلق ہے، ہم شکم پرست بھی ہیں اور شہوت پرست بھی، جو ترک لذت کرتے ہیں وہ بھی بڑی لذتوں کے حصول کیلئے کرتے ہیں۔ ہمارا نقطہ نظر اور ہماری امیدوں کا مرکز بساط شہوت کو بچھانا ہے۔ نماز جو قرب الٰہی کی معراج ہے ہم صرف جنت کی عورتوں سے تقرب حاصل کرنے کیلئے کرتے ہیں اس کا قرب الٰہی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ امر الٰہی کی طاعت سے مربوط نہیں ہے۔ رضائے الٰہی سے تو ہزاروں فرسخ دور ہے۔

اے معارف الٰہیہ سے بے خبر! تو اپنی شہوت وغضب کی تسکین کے علاوہ کسی اور چیز کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ اے عابد اور شریف انسان! تو اذکار، مستحبات اور واجبات کا پابند ضرور ہے، مکروہات ومحرمات کے قریب بھی نہیں پھٹکتا، اخلاق حسنہ سے متصف ہے، بری عادتوں سے بچتا بھی ہے۔ مگر اپنے اعمال کو ذرا انصاف کی ترازو میں رکھ کر دیکھ کہ کیا تو ان اعمال کو صرف نفسانی خواہشات کی تکمیل، زمرد کے تخت پر بیٹھنے، شوخ چنچل حوران بہشتی سے ہم آغوش ہونے، حریر ودیبا کے لباس پہننے، بہترین وشاندار محلوں میں رہنے اور نفسانی خواہشات کی تکمیل کی بنا پر نہیں کرتا؟ کیا یہ سب خود خواہی اور نفس پرستی کیلئے نہیں ہے؟ کیا اس کو خدا کیلئے اور حق کی پرستش کہا جا سکتا ہے؟ آپ جن مزدوروں سے کام لیتے ہیں ان میں اور آپ میں کیا فرق ہے؟ اگر وہ مزدور کہنے لگیں کہ ہم نے تو مالک کی خوشنودی کیلئے کام کیا ہے تو کیا تمام لوگوں کے ساتھ آپ بھی ان کو نہیں جھٹلائیں گے؟ کیا آپ کا اسی طرح یہ کہنا کہ ہم تقرب خدا کیلئے نماز پڑھتے ہیں جھوٹ نہیں ہے؟ آپ کی نماز خدا سے قرب کیلئے ہے یا حوران بہشتی سے تقرب اور ہوا وہوس کی تسکین کیلئے ہے؟

میں کھل کر کیوں نہ کہہ دوں کہ عرفاء اور اولیائے خدا کے نزدیک ہماری تمام یہ عبادتیں گناہ کبیرہ ہیں۔ اے شخص! تو خدا کے سامنے، اس کے ملائکہ مقربین کے سامنے مرضی خدا کے خلاف عمل کرتا ہے اور جو عبادت تقرب حق کیلئے معراج ہے اس کو نفس امارہ کی خاطر اور شیطان کیلئے بجا لاتا ہے، پھر بھی تیری بے حیائی کی انتہا یہ ہے کہ خدا اور اس کے ملائکہ مقربین کے سامنے عبادت میں جھوٹ وافترا پردازی و منت گزاری کرتا ہے اور ناز ونخرے، عجب وگھمنڈ کرتا ہے۔ تجھے شرم نہیں آتی کہ میری اور تیری عبادت میں اور اہل معصیت کی معصیت میں کیا فرق رہا؟ کیونکہ اہل معصیت بھی ریاکاری کرتے ہیں، ہم اور تم بھی۔ اس لئے کہ ریاکاری شرک ہے اور ریا اس لئے بڑا اور بڑا گناہ ہے کہ تم نے خدا کی خاطر عبادت نہیں کی۔ (اسی طرح) ہماری تمام عبادتیں شرک محض ہیں۔ ان میں خلوص واخلاص کا شائبہ تک نہیں ہے، بلکہ رضائے الٰہی تو بطور اشتراک بھی اس میں شامل نہیں۔ ہم تو صرف پیٹ بھرنے اور جنسی خواہشات کی تکمیل کیلئے ہی سب کچھ کرتے ہیں!

میرے دوست! جو نماز عورت حاصل کرنے کیلئے پڑھی جائے، چاہے وہ دنیا کی عورت ہو یا جنت کی حور، وہ نماز خدا کیلئے نہیں ہے۔ جو نماز حصول دنیا یا حصول آخرت کیلئے ہو وہ بہرحال خدا کیلئے نہیں ہے۔ پس کیوں (ایسی نمازوں پر) فخر ومباہات کرتے، ناز نخرے دکھاتے اور خدا کے بندوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے، نیز اپنے آپ کو بارگاہ الٰہی کے مقرب بندوں میں سے شمار کرتے ہو؟ تم تو اسی نماز کی بدولت عذاب کے مستحق اور ستر ہاتھوں والی زنجیر کے لائق ہو۔ ۲۵ پس تم اپنے کو قرض خواہ کیوں خیال کرتے اور اسی قرض خواہی اور خود پسندی کی بنا پر اپنے سے دوسرے عذاب بھی مہیا کرتے ہو؟ تم اپنے ذمہ معین کئے گئے اعمال کو بجا لاتے رہو اور یہ بھی پیش نظر رہے کہ یہ اعمال خدا کیلئے نہیں ہیں، بلکہ جنت میں جانا صرف خدا کے فضل وکرم اور رحم ومہربانی پر موقوف ہے اور بندوں کی ضعف وکمزوری کی وجہ سے خدا ان کے ایک قسم کے شرک میں تخفیف کر دیتا اور اپنی رحمت ومغفرت کی بنا پر ان پر پردے ڈال دیتا ہے۔ (لہذا) تم اس پردے کو چاک نہ ہونے دو ورنہ گناہوں پر جن کو عبادات کہا جاتا ہے جو مغفرت حق کے پردے پڑے ہوئے ہیں کم از کم اسی طرح باقی رہنے دو، ورنہ اگر یہ پردہ ہٹ گیا اور میزان عدل کی زد میں ہمارے اعمال آگئے تو گناہگاروں کی تباہ کن معصیت کی بدبو سے کہیں زیادہ ہماری عبادتوں کی بدبو ہوگی۔

میں نے اس سے پہلے ثقۃ الاسلام کلینیؒ ۲۶ کی کافی والی روایت کی طرف اشارہ کیا تھا جس کو امام جعفر صادقؑ سے نقل کیا گیا ہے اور یہاں پر میں تیمناً وتبرکاً اس حدیث کے ایک حصے کی عبارت کو من وعن نقل کرتا

چاہتا ہوں

عن ابي عبدالله علیہ السلام قال: قال رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: قال الله عزّ وجلّ لداوُد علیہ السلام ﴿يا داوُدُ بشِّرِ المُذنبين وأنذِرِ الصّدّيقين قال: كيف أبشِّرُ المُذنبين وأُنذِرُ الصّدّيقين؟ قال: يا داوُدُ بشِّرِ المُذنبين أنّي أقبلُ التّوبة وأعفو عن الذّنب، وأنذِر الصّدّيقين أن لا يُعجبوا بأعمالهم فإنّهُ ليس عبدٌ أنصبُهُ للحساب إلّا هلك﴾ ۲۷

حضرت امام جعفر صادقؑ، رسول خداؐ سے نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: خداوند عالم نے حضرت داودؑ سے فرمایا: ”اے داود! گنہگاروں کو بشارت دیدو اور سچوں کو خوف دلاؤ۔ داودؑ نے کہا گنہگاروں کو کس طرح بشارت دوں اور سچوں کو کس طرح ڈراؤں؟ ارشاد ہوا اے داود گناہگاروں سے کہدو میں ان کی توبہ قبول کرلوں گا اور ان کے گناہوں کو معاف کردوں گا اور سچوں کو اس طرح ڈراؤ کہ وہ اپنے اعمال پر عجب نہ کریں، کیونکہ جس بندے کا میں حساب لینے بیٹھوں گا وہ ہلاک ہوجائے گا“۔

جب سچے لوگ ہلاک ہوسکتے ہیں جو گناہ و معصیت سے پاک ہیں تو ہم اور آپ کس شمار میں ہیں؟ اور یہ سب تو اس وقت ہے جب ہمارے اور آپ کے اعمال اس دنیاوی ریاکاری سے پاک ہوں جو حرام و ہلاک کرنے والی ہے اور شاید ایسا کم ہی اتفاق ہوتا ہے کہ ہمارا عمل ریاکاری اور منافقت سے خالی ہوتا ہو۔ جانے دیجئے نہ کہنا ہی بہتر ہے! اب اگر اس کے بعد بھی عجب اور فخر و مباہات کی گنجائش باقی رہتی ہے تو کرتے رہو۔ لیکن اگر انصاف اور شرمندگی اور خطاؤں کے اعتراف کی جگہ ہے تو پھر ہر اس عبادت کے بعد جس کو تم بجالائے ہو اور واقعی اس کیلئے کوشش کی ہے اور پروردگار کے حضور میں جھوٹ بولے ہو اور ان نسبتوں سے جو تم نے اپنی طرف غلط طور پر منسوب کی ہیں، توبہ و استغفار کرو۔ کیا نماز میں داخل ہونے سے پہلے تم نے جو یہ کہا تھا ﴿إنّي وجّهتُ وجهيَ للّذي فطر السّمٰوٰتِ والأرضَ حنيفاً وما أنا من المُشركين ☆ إنّ صلاتي ونُسُكي ومحيايَ ومماتي للّٰه ربِّ العالمين﴾ ۲۸ (میں نے تو اپنا رخ پوری یکسوئی سے اس ذات کی طرف کیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ بے شک میری نماز، مناسک، میری زندگی، میری موت سب اس خدا کیلئے ہے جو رب العالمین ہے)۔ وہ جھوٹ نہیں ہے۔ اس سے توبہ کی ضرورت نہیں ہے؟ کیا واقعاً تم یکسوئی کے ساتھ خالق آسمان و زمین کی طرف متوجہ ہوئے ہو؟ کیا تم سچے مسلمان اور شرک سے خالص ہو؟ آیا تمہاری نماز، عبادت، زندگی اور موت سب خدا

کیلئے ہے؟ کیا یہ باعث شرم نہیں ہے کہ نماز میں تم ﴿الحمد للہ رب العالمین﴾ کہتے ہو (اور عملاً ایسا نہیں کرتے ہو)؟ کیا واقعی تم تمام تعریفیں خدا ہی کیلئے سمجھتے ہو یا خدا کے بندوں کیلئے؟ بلکہ کہیں تم خدا کے دشمنوں کیلئے حمد و ثنا کے قائل تو نہیں ہو رہے ہو؟ کیا تمہارا رب العالمین کہنا جھوٹ نہیں ہے؟ جبکہ تم اسی دنیا میں ربوبیت کو دوسروں کیلئے ثابت کرتے ہو تو کیا یہ بات توبہ کے قابل نہیں ہے؟ کیا ﴿ایاک نعبد وایاک نستعین﴾ جو تم کہتے ہو اس پر تم کو شرم نہیں آتی؟ کیونکہ کیا تم خدا کی عبادت کرتے ہو یا پیٹ کی پوجا کرتے اور جنسی خواہش کی تسکین کرتے ہو؟ کیا تم خدا کو چاہتے ہو یا حور العین کو؟ کیا واقعی خدا سے مدد چاہتے ہو یا اپنے امور میں ایسی چیز کو خدا سمجھتے ہو جو نظروں میں نہیں ہے؟ تم جو حج کیلئے جاتے ہو اس سے تمہارا مقصد و مقصود کیا ہے؟ تمہارا مطلب و مطلوب خانہ خدا ہے یا مالک خانہ؟ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ﴿وما حب الدیار شغفن قلبی﴾ ۔۲۹؎ کیا تم واقعی خدا کے آثار جمال و جلال کو تلاش کر رہے ہو (یا کسی اور چیز کو)؟ آپ امام حسین علیہ السلام کیلئے مجلس عزا برپا کرتے اور سر و سینہ پیٹتے ہیں تو کیا یہ امام مظلومؑ کیلئے ہے یا اپنی امیدوں اور آرزوؤں کی تکمیل کیلئے؟ کہیں تمہارا پیٹ تو تم کو آمادہ نہیں کرتا ہے کہ امام حسینؑ کی مجلس عزا برپا کرو؟ کہیں ریاکاری تو تم کو نماز جماعت پر آمادہ نہیں کرتی ہے؟ کیا کہیں نفسانی خواہشات تو مناسک و عبادات کی طرف نہیں کھینچتی؟

میرے بھائی! نفس و شیطان کی مکاریوں میں بہت زیادہ غور کرو۔ جان لو! یہ تجھ لاچار کو ایک خالص عمل بھی نہیں کرنے دیں گے اور انہی ناپسندیدہ اعمال کو جن کو خدا اپنے فضل و کرم سے قبول کر لیتا ہے، نفس و شیطان تمہیں منزل تک پہنچانے نہیں دیں گے۔ یہ دونوں ایسا کام کریں گے جس سے یہ عجب و بے جا ناز و نخرے تمہارے سارے اعمال کو برباد کر دیں گے اور یہ فائدہ بھی ہاتھ سے نکل جائے گا۔ خدا اور اس کی رضا کے حصول سے تو دور ہی ہو جاؤ گے، بلکہ جنت اور حور تک بھی تمہاری رسائی نہیں ہوگی (یہ تو) آسان ہے، لیکن ابدی عذاب اور خدا کے قہر و غضب کی آگ تمہارا مقدر بن جائے گی۔ تم یہ گمان کرتے تھے کہ تمہارے یہ سڑے گلے گندے اور ٹوٹے پھوٹے لولے لنگڑے اعمال، جو ریا اور سمعہ جیسی ہزاروں دوسری آلودگیوں میں ملوث ہیں جن میں سے ہر ایک خود اپنی جگہ قبولیت اعمال سے مانع ہے۔ ان کے ذریعہ خداوند عالم پر منت جتا سکتے ہو یا محبوبین و مقربین میں سے ہو جاؤ گے؟! اے محبین کی حالت سے بے خبر! اے محبین اور ان کی آتش دل سے بے خبر بدبخت شخص! اے خدا کے مخلص بندوں کے سوز و گداز اور ان کے نور اعمال سے

غافل! کیا تجھے یہ گمان تھا کہ ان کے اعمال بھی میرے اور تیرے جیسے ہیں تم کو تو یہی خیال ہوگا کہ حضرت علیؑ اور ہماری نماز میں بس اتنا فرق ہے کہ وہ ﴿وَالضَّآلِّیْنَ﴾ کے مد کو زرا لمبا کر دیتے ہوں گے یا ان کی قرائت ہماری قرائت سے بہتر تھی یا ان کا رکوع وسجدہ اور اذکار و اوراد زیادہ طولانی ہوتے تھے یا پھر آنحضرتؐ کو یہ امتیاز تھا کہ ایک رات میں کئی سو رکعت نماز پڑھتے تھے؟ یا تم سوچتے ہوگے کہ حضرت سید الساجدینؑ کی مناجات ہماری اور تمہاری مناجات کی طرح تھی؟ کیا وہ بھی حور العین اور ناشپاتی و انار (جیسے بہشتی میووں) کی خاطر گریہ و زاری کرتے تھے؟ انہی بزرگ ہستیوں کی قسم ﴿وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ عَظِیْمٌ﴾ ۳؎ ''اور یقیناً یہ عظیم قسم ہے'' اگر ہم سب مل کر ایک بار بھی حضرت علیؑ کی طرح ﴿لا الٰہ الا اللّٰہ﴾ کہہ سکیں تو ناممکن ہے۔ میرے سر پر خاک اگر میں خیال کروں کہ یہ کہہ کر میں نے ولایت علیؑ کے مقام کی معرفت کا حق ادا کر دیا۔ مقام حضرت علیؑ کی قسم اگر رسولؐ کے علاوہ جو حضرت علیؑ اور دوسروں کے بھی مولا ہیں۔ ملائکہ مقربین اور انبیائے مرسلینؑ بھی حضرت علیؑ کی طرح ایک تکبیر کہنا چاہیں تو نہیں کہہ سکتے۔ ان کے دل کا حال ان کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

اے عزیز! اس قدر خدا خدا کا رٹ مت لگاؤ۔ خدا کی محبت کا اتنا دعوے نہ کر۔ اے وہ جو عارف ہے، اے صوفی، اے حکیم، اے مجاہد، اے عبادت گزار، اے فقیہ، اے مومن، اے عابد و زاہد، اے بیچارو مبتلا ہو گو! نفس کی مکاریوں اور ہوا و ہوس کے بد بخت اسیرو، اے آرزوؤں اور خواہشات نفسانی کے بے بس غلامو! تم سب بے بس ہو، بیچارہ ہو، خلوص و حب الٰہی سے کوسوں دور ہو۔ اپنے سے اتنا زیادہ حسن ظن نہ رکھو۔ اس قدر رونا رو نخرے نہ کرو۔ ذرا اپنے دلوں سے پوچھو کہ وہ خدا پرست ہے یا خود غرض ہے؟ موحد اور ایک ذات کا طالب ہے یا مشرک؟ پھر بتاؤ کہ اس عجب کے کیا معنی ہیں؟! اپنے عمل پر اتنا خوش ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ بالفرض کوئی ایسا عمل ہو جس کے اجزاء و شرائط مکمل ہوں، ریاکاری، عجب، شرک اور دیگر برائیوں سے خالی ہو تب بھی اس کا مقصد اگر پیٹ بھرنا اور جنسی خواہشات کی تکمیل ہے تو وہ ملائکہ کے حوالے کرنے کی کونسی قابلیت رکھتا ہے؟ ایسے اعمال کو تو نظروں سے چھپانا چاہئے، (کیونکہ) یہ برے اعمال اور المناک برائیوں کا مجموعہ ہیں۔ ان پر شرمندہ ہونا چاہئے اور ان کو پوشیدہ رکھنا چاہئے۔

پروردگار! ہم بے چارے (اور کمزور) لوگ شیطان اور نفس امارہ کے شر سے تیری پناہ مانگتے ہیں۔ معبود! تو خود ہی ہم کو محمد و آل محمد علیہم الصلاۃ والسلام کے طفیل میں ان کی مکاریوں سے محفوظ رکھ۔

توضیحات (۲)

۱۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۱۳، کتاب ایمان و کفر، باب عجب، حدیث ۳۔

۲۔ جامع السعادات، ج ۱، ص ۸ ـ ۳۵۷؛ المحجۃ البیضاء، ج ۶، ص ۲۷۶۔

۳۔ اس کی تفصیل حدیث دو کی توضیحات ۱۳ میں ملاحظہ ہو۔

۴۔ اس کی تفصیل حدیث دو کی توضیحات ۱۶ میں دیکھیے۔

۵۔ مرآۃ العقول، ج ۱، ص ۲۱۸، کتاب ایمان و کفر، باب عجب، ذیل حدیث

۶۔ حدیث ۳ فصل ۵۔

۷۔ یہ کلام احادیث سے ماخوذ ہے کہ دنیوی بلاؤں کو کسی شخص کی ایمانداری اور خدا کی محبت پر دلیل قرار دیا جائے۔ چنانچہ امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں ﴿یبتلی المرء علی قدر حبّہ﴾ انسان اپنے خدا کی محبت کے برابر بلا میں گرفتار ہوتا ہے اور امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں ﴿وما احبّ اللہ قوماً الا ابتلاھم﴾ خدا کسی گروہ کو دوست نہیں رکھتا مگر یہ کہ اس کو بلاؤں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ بحار الانوار، ج ۶۴، ص ۲۳۶، کتاب ایمان و کفر، باب شدۃ ابتلاء المومن۔

۸ سورۂ فاطر، آیت ۸۔

۹ سورۂ کہف، آیت ۱۰۳ـ۱۰۵۔

۱۰۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۱۳، کتاب ایمان و کفر، باب عجب، حدیث ۱۔

۱۱۔ ملاحظہ ہو حدیث دو، حاشیہ ۱۵

۱۲۔ قال رسول اللہؐ ﴿ثلاث مھلکات شحّ مطاعٌ وھوی متّبعٌ، واعجاب المرء بنفسہ وھو محبطٌ للعمل، وھو داعیۃ المقت من اللہ سبحانہ﴾ تین چیزیں (انسان کو) ہلاک کرنے والی ہیں: اطاعت کیا جانے والا بخل، پیروی کی جانے والی خواہش، انسان کی خود پسندی۔ یہ نیک کاموں کو برباد کر دیتی ہے اور خدا کے غصے کو بھڑکاتی ہے۔ بحار الانوار، ج ۶۹، ص ۳۲۱، کتاب ایمان و کفر، باب ۱۱۷، حدیث ۳۷۔

۱۳ وسائل الشیعہ، ج ۱، ص ۸۰، ابواب مقدمہ عبادات، کتاب طہارت، باب ۲۳، حدیث ۸

۱۴۔ ﴿لا مال اعود من العقل، ولا وحدۃ اوحش من العجب﴾ عقل سے زیادہ کوئی مال سودمند نہیں ہے، عجب سے زیادہ کسی بھی تنہائی کی وحشت اتنی نہیں ہوتی۔ وسائل الشیعہ، ج ۱، ص ۸۰، کتاب طہارت، ابواب مقدمہ عبادات، باب ۲۳، حدیث ۱۳۔

۱۵۔ فقال موسى: ﴿فأخبرني بالذنب الذي إذا أذنبه ابن آدم استحوذت عليه؟ قال: إذا أعجبته نفسه واستكثر عمله وصغر في عينه ذنبه﴾۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۱۴، کتاب ایمان وکفر، باب عجب، حدیث ۸۔

۱۶۔ حدیث ۳، فصل ۵، حاشیہ نمبر ۲۷

۱۷۔ ملاحظہ ہو حدیث ۱، حاشیہ ۳۲۔

۱۸۔ عن أبي عبد الله: ﴿قال إبليس (لعنه الله عليه) لجنوده: إذا استمكنت من ابن آدم في ثلاث لم أبال ما عمل فإنه غير مقبول منه: إذا استكثر عمله ونسي ذنبه ودخله العجب﴾۔

خصال، ص ۱۱۲، باب ۳، حدیث ۸۴۔

۱۹۔ حدیث ۳، فصل ۵۔

۲۰۔ چنانچہ امام سجاد دعائے ابو حمزہ ثمالی میں فرماتے ہیں: ﴿لست أتكل في النجاة من عقابك على أعمالنا بل بفضلك علينا لأنك أهل التقوى وأهل المغفرة﴾ تیرے عذاب سے بچنے کیلئے میں اپنے عمل پر بھروسہ نہیں کرسکتا، بلکہ تیرے اس فضل پر بھروسہ کرتا ہوں جو تیرا ہمارے اوپر ہے، اس لئے کہ تو ہی تقویٰ اور بخشنے کا سزاوار ہے۔

۲۱۔ امام سجاد فرماتے ہیں:

﴿ولا يبلغ مبلغاً من طاعتك وإن اجتهد إلا كان مقصراً دون استحقاقك بفضلك فأشكر عبادك عاجز عن شكرك وأعبدهم مقصر في طاعتك﴾ (اپنی کوشش کے باوجود) کوئی تیری اطاعت کے درجے تک نہیں پہنچ سکتا، مگر یہ کہ تیرے فضل وکرم کے استحقاق کے مقابلے میں بہرحال مقصر ہوگا۔ تیرے بندوں میں سب سے زیادہ شاکر بندہ بھی تیرا شکر ادا کرنے سے عاجز ہے اور سب سے زیادہ عبادت کرنے والا بھی تیری اطاعت میں کوتاہی کرتا ہے۔

صحیفہ سجادیہ، دعائے ۳۷، امام چہارمؑ کی ۱۵ مناجاتوں میں شامل مناجات مطیعین۔

۲۲۔ مرآۃ العقول، ج ۸، ص ۱۳۶، کتاب ایمان وکفر، باب شکر، حدیث ۸۔

۲۳۔ سورۂ نساء، آیت ۹۰۔

۲۴۔ سورۂ آل عمران، آیت ۲۶۔

۲۵۔ اس آیہ مبارکہ کی طرف اشارہ ہے: ﴿خذوه فغلّوه ثم الجحيم صلّوه ثم في سلسلة ذرعها سبعون ذراعاً فاسلكوه﴾ اسے گرفتار کرکے طوق پہنا دو پھر اسے جہنم میں جھونک دو پھر ایک زنجیر میں جو ستر گز کی ہے اس کو خوب جکڑ دو

سورۂ حاقہ، آیت ۳۰ تا ۳۲۔

۲۶۔ ملاحظہ ہو حدیث ۱، حاشیہ ۳۴۔

۲۷۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۱۴، کتاب ایمان وکفر، باب عجب، حدیث ۸۔

۲۸۔ سورۂ انعام، آیت ۹۱۔

۲۹۔ یہ اس بیت کا پہلا مصرع ہے

وما حبُّ الديارِ شغفن قلبي ولكن حبُّ من سكن الديارا

مرے میں یہ شہر کی محبت میں میرا دل مشغول نہیں ہے۔ میرا دل تو اس میں لگا ہے جو اس شہر میں ساکن ہے

جامع الشواہد، ج ۳ ص ۲۴۴ باب واو بعد و کسم میں ہے کہ اس کا شاعر معلوم نہیں ہے۔

۳۰۔ یہ اس آیت سے ماخوذ ہے ﴿وانّه لقسمٌ لو تعلمون عظيمٌ﴾ اور تم جانتے ہو کہ یہ قسم بہت بڑی ہے۔

سورۂ واقعہ، آیت ۷۶ ہے۔

چوتھی حدیث

بالسند المتصل الی محمد بن یعقوب عن علی بن ابراھیم، عن محمد بن عیسی عن یونس، عن ابان، عن حکیم، قال

سألتُ أبا عبدِاللهِ عن أدنی الالحادِ، فقال ﴿الکبرُ أدناہ﴾

ترجمہ حکیم نے کہا میں نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے "الحاد" کے سب سے پست ترین درجے کے بارے میں پوچھا تو حضرتؑ نے فرمایا "اس کا سب سے پست درجہ تکبر ہے"۔

شرح تکبر! کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر ایک ایسی نفسیاتی حالت (وکیفیت) پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے وہ اپنے کو اونچا اور بڑا سمجھے اور دوسروں پر بڑائی جتائے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان سے ایسے اعمال سرزد ہوتے اور ایسے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں کہ لوگ کہتے ہیں یہ شخص تکبر کرتا ہے

تکبر، عجب کے علاوہ ہے، بلکہ جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا یہ بری صفت اور غلط عادت عجب سے پیدا ہوتی ہے اور یہ عجب ہی کا پھل ہے، کیونکہ عجب کا مطلب خود پسندی ہے اور تکبر کا مطلب دوسروں پر اپنی بڑائی جتانا اور فخر کرنا ہے۔ انسان جب اپنے اندر کوئی کمال دیکھتا ہے تو اس کے اندر ایک قسم کی خوشی اور فخر وغرور پیدا ہو جاتا ہے، اسی کو عجب کہتے ہیں اور جب اس میں یہ احساس ہوتا ہے کہ دوسرے کے اندر یہ خیالی کمال نہیں ہے تو پھر اس کے اندر ایک دوسری کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو احساس برتری اور تقدم ہے اور اس احساس سے وہ بڑائی، عظمت اور برتری کا گمان کرنے لگتا ہے، چنانچہ اس حالت وکیفیت کو تکبر کہتے ہیں۔ یہ ساری چیزیں قلب اور باطن کے اندر پیدا ہوتی ہیں، البتہ ان کا اثر ظاہر میں ہوتا ہے، اب یہ اثر خواہ عقت

وجوارح میں ہو یا قول وفعل میں تکبر کہلاتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ خود بین انسان خود غرض ہو جاتا ہے اور جب خود غرضی میں اضافہ ہو جاتا ہے تو خود پسند ہو جاتا ہے اور جب وہ خود پسندی سے لبریز ہو جاتا ہے تو اپنی ذات پر گھمنڈ کرنے لگتا ہے۔

یہ بات واضح کر دوں کہ صفات نفسانیہ خواہ نقص ورذائل کی طرف ہوں یا کمال وفضائل کی طرف یہ بہت باریک اور آپس میں مخلوط ہوتے ہیں۔ بہذا اس اعتبار سے ان میں سے ایک دوسرے میں فرق کرنا بہت ہی مشکل کام ہے اور زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ ان صفات کی حد بندی میں علمائے اعلام کے درمیان شدید اختلاف واقع ہو یا پھر وجدانی صفت کی کوئی ایسی تعریف ممکن نہ ہو جس میں خدشہ نہ ہو۔ اس لئے سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ ان چیزوں کو وجدان کے حوالے کر دیا جائے اور اپنے کو مفہوم تراشی کی قید سے آزاد کر دیا جائے تاکہ اصل مقصد ومقصود تک رسائی حاصل کرنے سے باز نہ رہ سکیں۔

اسی لئے یہ معلوم ہو جانا چاہئے کہ عجب کی طرح تکبر کے بھی درجات ہیں اور عجب کے بعض وہ درجات جن کی نظیر بھی ہے لیکن وہاں ان کی زیادہ اہمیت نہیں تھی (اس لئے ذکر نہیں کئے گئے ہیں) مگر یہاں ان کی اہمیت ہے، اس لئے یہاں پر ذکر کئے جائیں گے۔ لیکن وہ چیزیں جن کی شبیہ عجب میں گزر گئی ان کے چھ درجے ہیں۔

۱۔ ایمان وعقائد حقہ کی بنا پر تکبر،

۲۔ اس کا مقابل کفر اور عقائد باطلہ پر تکبر ہے۔

۳۔ ملکات فاضلہ اور صفات حمیدہ کی بنا پر تکبر ہے،

۴۔ اس کا مقابل میں اخلاقی برائیوں اور ملکات خبیثہ پر تکبر ہے۔

۵۔ مناسک وعبادات اور نیک اعمال کی بنا پر تکبر ہے،

۶۔ اس کے مد مقابل گناہوں اور برے افعال پر تکبر کرتا ہے۔

ان میں سے ہر ایک کیلئے جہاں یہ امکان ہے کہ اسی درجہ کے عجب کی پیداوار ہے وہاں اس کا بھی امکان ہے کہ ان کی پیدائش کے اسباب دوسرے ہوں، جن کی طرف اشارہ کیا جائے گا۔ مگر یہاں پر جس تکبر سے بالخصوص بحث کی جائے گی وہ ایسا تکبر ہے جو بیرونی امور کی وجہ سے ہوتا ہے، مثلاً حسب ونسب، مال ومنال، سیادت وقیادت وغیرہ اور ہم انشاء اللہ چند فصلوں کے اندر اس بری عادت کی بعض

برائیوں اور ان کے علاج معالجے کی طرف حتی المقدور اشارہ کریں گے اور خداوند عالم سے دعا کرتے ہیں کہ ہم سب کو اس سے اثر قبول کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔

پہلی فصل: تکبر کے درجات کا بیان

یہ جان لو کہ دوسرے اعتبار سے تکبر کے کئی درجے ہیں

۱۔ خدا کے مقابلے میں تکبر کرنا۔

۲۔ انبیاء، رسولوں اور اولیاء صلوات اللہ علیہم کے مقابلے میں تکبر کرنا۔

۳۔ احکام الٰہی سے تکبر کرنا ان دونوں قسم کے تکبر کا انجام بھی خدا سے تکبر کرنے کے مترادف ہے۔

۴۔ بندگان خدا سے تکبر کرنا اس کی بھی بازگشت اہل معرفت کے نزدیک خدا سے تکبر کی طرف ہے۔

سب سے بڑا اور مہلک تکبر خدا سے تکبر کرنا ہے۔ اس قسم کا تکبر اہل کفر وجحود اور ربوبیت کے دعویداروں میں پیدا ہوتا ہے اور کبھی تو اس قسم کے تکبر کے نمونے بعض اہل دیانت کے اندر بھی پائے جاتے ہیں۔ جس کا ذکر مناسب نہیں ہے اور یہ نہایت جہالت ونادانی سے اور ممکن الوجود (انسان) کا اپنی حد اور واجب الوجود (خدا) کے مقام کو نہ جاننے سے ہوتا ہے۔

جہاں تک انبیاء اور اولیاء سے تکبر کرنا ہے اس تکبر کا اتفاق انبیاء کے زمانے میں بہت ہوتا تھا، خود خداوند عالم نے اس زمانے کے لوگوں کی حالت کو بتایا ہے۔ (مثلاً) ارشاد ہوتا ہے ﴿أنؤمن لبشرين مثلنا﴾ ۳؎ (بنی اسرائیل کے سرکش لوگ اپنے تئیں کہنے لگے) "کیا ہم اپنے جیسے دو آدمیوں (موسیٰ وہارون) پر ایمان لائیں؟" (اور کفار قریش کے سرکش لوگ اپنی قوم سے کہنے لگے) ﴿لولا نزّل هذا القرآن على رجلٍ من القريتين عظيم﴾ ۴؎ "یہ قرآن ان دو بستیوں (مکہ وطائف) کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں نازل کیا گیا" اور صدر اسلام میں اولیائے خدا کے ساتھ بہت زیادہ تکبر کیا گیا، خود اس زمانے میں بھی بعض نام نہاد مسلمانوں کے اندر یہ تکبر پایا جاتا ہے۔

احکام الٰہی کے سلسلے میں تکبر بعض اہل معصیت کے اندر پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً حج کے دوران لباس احرام وغیرہ کو اپنے شایان شان نہ سمجھتے ہوئے حج کو چھوڑ دینا، سجدہ کی حالت کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہوئے نماز ترک کر دینا اور کبھی یہ تکبر بعض اہل مناسک وعبادات اور اہل علم ودیانت کے اندر بھی پیدا ہو جاتا

ہے۔ مثلاً از روئے تکبر اذان کو ترک کر دینا یا اپنے جیسے اور اپنے سے کمتر شخص سے حق بات کو سن کر قبول نہ کرنا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کوئی بات اپنے دوست یا اپنے جیسے آدمی سے سنتا ہے تو بڑی شدت کے ساتھ اس کی تردید کرتا اور کہنے والے پر طعن وطنز کرتا ہے لیکن اسی بات کو اگر کسی دینی یا دنیاوی شخصیت سے سنتا ہے تو فوراً قبول کر لیتا ہے، بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ شروع میں بڑی سختی سے تردید کر دے لیکن بعد میں پھر اسی سختی کے ساتھ قبول بھی کر لے۔ ایسا شخص حق کا طالب نہیں ہے۔ اس کے تکبر نے حق کے اوپر پردہ ڈال رکھا ہے اور بڑوں سے چاپلوسی نے اس کو بہرا اور اندھا بنا دیا ہے، یاد رکھئے یہ بڑوں سے چاپلوسی کوئی ایسی صفت نہیں کہ جو لائق تعریف ہو۔ تکبر کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ (مدرس) ایسے علوم یا کتابوں کو نہ پڑھائے جو اس کی شان کے مناسب نہ ہوں یا ایسے لوگوں کو نہ پڑھائے جو ظاہری عنوان اور فضیلت نہیں رکھتے یا کم لوگوں کو نہ پڑھائے۔ (اسی طرح) چھوٹی سی مسجد میں جماعت نہ پڑھانا اور تھوڑی تعداد پر یہ جانتے ہوئے بھی کہ رضائے الٰہی اسی میں ہے قناعت نہ کرنا (بھی تکبر ہے)۔ البتہ کبھی معاملہ اتنا نازک ہوتا ہے کہ خود متکبر اس بات کو نہیں سمجھ پاتا کہ اس کی یہ صفت تکبر پر مبنی ہے۔ ہاں! اگر وہ تزکیۂ نفس پر اتر آئے اور نفس کی مکاریوں کو سمجھنے میں بہت دقت نظر سے کام لے (تو شاید سمجھ لے)۔

بندگان الٰہی سے تکبر میں سب سے زیادہ برا تکبر وہ ہے جو علمائے الٰہی اور دانشمندوں سے برتا جائے، کیونکہ اس کی برائیاں سب سے زیادہ اور اس کا نقصان سب سے بڑا ہے، غریبوں کے ساتھ نشست و برخاست نہ کرنا، مجلسوں اور محفلوں میں، نیز لوگوں کے ساتھ برتاؤ میں سب پر مقدم کرنا بھی تکبر ہے اور یہ تکبر اشراف واعیان کے تمام طبقوں سے لے کر علما اور محدثین تک اور مالداروں سے لے کر فقیروں تک میں پایا جاتا ہے۔

ہاں! خدا کسی کی حفاظت کرے تو اور بات ہے۔ تواضع اور چاپلوسی، تکبر اور انکار نفس میں فرق وتمیز کرنا بہت مشکل ہے۔ اس لئے انسان کو خدا کی پناہ مانگنی چاہئے تاکہ وہ اس کی ہدایت کرے اور اگر انسان (واقعی) اپنی اصلاح کرنے پر اتر آئے اور مطلوب کی جانب رواں دواں ہو جائے تو خداوند عالم اپنی رحمت واسعہ کے ذریعے اس کی رہنمائی کرتا اور سفر کو آسان کر دیتا ہے۔

دوسری فصل: تکبر کا اصلی سبب

یوں تو تکبر کے بہت سے اسباب ہیں مگر سب کی بازگشت اس بات کی طرف ہے کہ انسان میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر ایک کمال ہے اور اس خیالی کمال کی وجہ سے اس کے اندر عجب پیدا ہو جاتا ہے جو حب نفس سے مل کر دوسروں کے کمال (کو سمجھنے) کا حجاب بن جاتا ہے اور وہ شخص دوسروں کو اپنے سے ناقص سمجھنے لگتا ہے اور یہی بات ظاہری اور باطنی طور پر احساس برتری کا سبب بن جاتی ہے۔ مثلاً کبھی علمائے عرفان و طریقت میں سے کوئی اپنے کو اہل معارف و شہود سمجھنے لگتا ہے اور اصحاب قلوب میں سے اپنے کو شمار کرتا ہے اور نیکیوں میں دوسروں پر مقدم سمجھنے لگتا ہے، اسی لئے وہ دوسروں پر اپنی برتری اور بڑائی کے گمان میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ حکماء و فلاسفہ کو قشری، فقہاء و محدثین کو ظاہر بین اور باقی تمام لوگوں کو جانور سمجھتا اور تمام بندگان خدا کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے، جبکہ خود فناء فی اللہ و بقاء باللہ کی ڈینگ مارنے لگتا ہے اور اپنے لئے اس کے تحقق و ثبوت کا ڈنکا بجانے لگتا ہے۔ حالانکہ معارف الہیہ کا تقاضا ہے کہ مخلوقات کے بارے میں خوش بین ہو۔ اگر معرفت الٰہی اس کے شامہ میں پہنچ چکی ہوتی تو جلال و جمال حق کے مظاہر کے ساتھ تکبر نہ کرتا۔ چنانچہ مقام بیان و علم میں وہ خود اپنی اس حالت کے خلاف تصریح کرتا ہے اور یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ اس کے دل میں معارف کا وجود ہی نہیں ہے اور نہ بے چارہ مقام ایمان تک پہنچ سکا ہے۔ مگر عرفان و سلوک کا دم بھرتا ہے اور عرفان کا کوئی حصہ اس کے پاس نہیں ہے جبکہ وہ ثبوت و تحقق کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔

حکماء میں بھی ایسے اشخاص ہوتے ہیں جو اپنے کو عالم بحقائق (اشیاء) اور صاحب برہان جانتے ہیں اور اپنے کو خدا، اس کے ملائکہ، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر یقین رکھنے والا شمار کرتے ہیں، مخلوقات الٰہی کو نظر حقارت سے دیکھتے اور دوسرے کسی بھی علم کو علم نہیں سمجھتے ہیں۔ تمام بندگان خدا کو علم و ایمان میں ناقص جانتے ہیں اور اپنے دل ہی دل میں ان پر تکبر کرتے، بلکہ ظاہر میں بھی لوگوں کے ساتھ نخوت و تکبر کا برتاؤ کرتے ہیں، حالانکہ مقام ربوبیت کا علم اور ممکن کی احتیاج اس کے برخلاف کی متقاضی ہے اور حکیم (دراصل) وہی ہوتا ہے جو مبدأ و معاد کا علم رکھنے کی وجہ سے تواضع کی صفت رکھتا ہو۔

نص قرآن کے مطابق پروردگار عالم نے جناب لقمان کو حکمت عطا فرمائی۔[۵] تو انہوں نے اپنے بیٹے کو جو دستور و حکم دیئے ہیں۔ قرآن ان کی حکایت کرتے ہوئے کہتا ہے ﴿ولا تصعّر خدّک للناس

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا، إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ﴾ لوگوں کے سامنے غرور سے اپنا منہ نہ پھلانا اور زمین پر اکڑ کر نہ چلنا، کیونکہ خدا کسی اکڑنے والے اور اترانے والے کو دوست نہیں رکھتا۔

ارشاد و تصوف اور تہذیب باطن کے دعویداروں کے اندر بھی ایسے اشخاص پیدا ہو جاتے ہیں جو لوگوں کے ساتھ متکبرانہ برتاؤ کرتے ہیں اور علماء وفقہا اور ان کے ماننے والوں کے بارے میں بدبین ہوتے اور حکماء وعلماء پر طعن وطنز کرتے ہیں، اپنے اور اپنے ماننے والوں کے علاوہ سب ہی کو اہل ہلاکت سمجھتے ہیں، چونکہ ان کا دامن علم سے خالی ہے اس لئے علوم کو راستے کا کانٹا خیال کرتے ہیں اور اہل علم کو سالکین کے رستے کا شیطان جانتے ہیں۔ حالانکہ وہ اپنے لئے جس مقام کے مدعی ہیں اس کا تقاضا اس کے برخلاف ہے (اس لئے) مخلوق کے ہادی اور گمراہوں کے مرشد کو مہلکات اور عذاب وعقاب کے باعث امور سے مبرا ہونا چاہئے اور دنیا کو ہیچ سمجھ کر جمال حق میں محو ہو کر بندگان خدا سے تکبر نہیں کرنا چاہئے اور نہ ہی ان کے بارے میں بدبین ہونا چاہئے۔

فقہاء، علمائے فقہ وحدیث اور ان کے طلاب میں بھی کبھی ایسے لوگ پیدا ہو جاتے ہیں جو لوگوں کو حقیر سمجھتے اور ان سے تکبر کرتے ہیں اور اپنے کو تمام اکرام واحترام کا مستحق سمجھتے ہیں اور اپنے لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ ہر شخص ان کی طاعت کرے۔ وہ جو کہہ دیں بے چون وچرا اس کو قبول کر لیا جائے، وہ اپنے کو کسی کے سامنے جوابدہ نہیں سمجھتے، بلکہ ساری دنیا کو اپنے سامنے جوابدہ سمجھتے ہیں۔ یہ اپنے اور اپنے جیسے چند لوگوں کے علاوہ کسی کو اہل بہشت نہیں سمجھتے۔ جس علم کے جس طبقے کا بھی ذکر آ جائے اس پر حسن طعن کرتے ہیں، اپنے علم کے علاوہ۔ حالانکہ ان کے پاس علم نہیں ہوتا، تمام علوم کو بے سمجھے بوجھے رد کر دیتے اور سب ہلاکت خیالات کرتے ہیں، علماء اور تمام علوم کو نادانی کی بنا پر رد کر دیتے ہیں اور ایسا ظاہر کرتے ہیں گویا ان کی دیانتداری ان کو ان سب کو مسترد کرنے پر مجبور کر رہی ہے اور ان کی توہین وتذلیل پر آمادہ کر رہی ہے، حالانکہ علم و دیانت اس قسم کے اخلاق واطوار سے مبرا ہے۔ بغیر جانے بوجھے جو بات کہی جائے شریعت نے اس کو حرام قرار دیا ہے۔ مسلمان کے احترام کو واجب قرار دیا ہے۔ مگر اس قسم کے اشخاص علم ودین سے بے خبر، خدا اور رسولؐ کے قول کے برخلاف اپنی باتوں کو دین قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ سلف وخلف کے اکابر علماء کی سیرت ہمیشہ اس کے خلاف رہی ہے۔

یہ حال تو علوم شرعیہ کا ہے جس کا ہر علم اس بات کا مقتضی ہوتا ہے کہ علماء کے اندر تواضع ہو اور دوسروں سے

تکبر کی جڑ کو اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ (ویسے دنیا کا) کوئی علم نہ تکبر سکھاتا ہے نہ فروتنی کا مخالف ہے اور آگے جا کر ہم بیان کریں گے کہ مذکورہ بالا اشخاص کا عمل ان کے علم کے مطابق کیوں نہیں ہے؟ دیگر علوم کے ماہرین، مثلاً علم طب، ریاضی، طبیعیات، اور ہر ایک صنعتوں کے ماہرین جیسے بجلی اور مشینی صنعت وغیرہ میں بھی تکبر زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ لوگ اپنے علم کے علاوہ دوسرے علوم کو چاہے وہ جو ہو، کچھ بھی نہیں سمجھتے (بلکہ) دوسرے علوم کے ماہرین کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ہر فن کا ماہر یہی سمجھتا ہے کہ اصلی علم وہی ہے جو اس کے پاس ہے، اور یہ حضرات بظاہر اور دل میں بھی لوگوں کے ساتھ تکبر کا برتاؤ کرتے ہیں، حالانکہ وہ علم اس کا مقتضی نہیں ہے۔

اب رہے غیر اہل علم جیسے بعض اہل مناسک وعبادات وہ بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ تکبر کا برتاؤ کرتے اور لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے اور حقیر خیال کرتے ہیں۔ تمام لوگوں کا تو ذکر کیا ہے۔ علما کو بھی وہ اہل نجات نہیں جانتے۔ جب بھی علم کی بات آتی ہے تو وہ کہتے ہیں عمل کے بغیر علم کا کیا فائدہ؟ اصل چیز تو عمل ہے اور جس کام میں وہ خود مشغول ہیں، اس کو اہمیت دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر طبقے کے لوگوں کو تکبر وعجب کی نظر سے دیکھتے ہیں، حالانکہ اگر یہ لوگ واقعی اہل عبادت و اخلاص ہوتے تو ان کا عمل خود ان کی اصلاح کرتا۔ نماز فحشاء ومنکر سے روکتی ہے اور مومن کی معراج ہے مگر یہ پچاس سال سے نماز پڑھنے والا اور واجب ومستحب اعمال کا پابند صفت کبر میں گرفتار ہے جو الحاد ہے اور عجب کا اسیر ہے جو دیگر برائیوں اور منکرات سے شدید تر ہے۔ شیطان اور اس کی عادتوں سے نزدیک ہے جو نماز فحشاء سے نہ روک سکے اور قلب کی حفاظت نہ کر سکے، بلکہ کثرت نماز سے دل برباد ہو جائے وہ نماز، نماز نہیں ہے۔ جو نماز زیادتی سے پابندی کرنے کے بعد بھی شیطان اور اس کی خاص صفت تکبر سے نزدیک کر دے وہ نماز، نماز نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ نماز کی خاصیت ہو، بلکہ یہ علم وعمل سے حاصل شدہ تکبر کی وجہ سے ہے۔ ان کے علاوہ اور جن چیزوں سے تکبر پیدا ہوتا ہے ان کی بھی بازگشت اپنے اندر ایک قسم کے کمال کی پیدائش اور دوسرے کے یہاں اس کے فقدان کی وجہ سے ہوتا ہے۔ مثلاً کبھی ایک شخص اپنے عالی نسب اور بلند حسب کی بنا پر اس شخص پر تکبر کرے جس میں یہ نہ ہو یا صاحب حسن وجمال اس شخص پر تکبر کرے جس میں حسن نہ ہو یا حسن وجمال کا طالب ہو یا ایسا شخص جس کے پیرو بہت ہوں، مددگار بے انتہا ہوں، صاحب قبیلہ ہو، بہ کثرت شاگرد رکھتا ہو وہ ایسے پر فخر کرے جو ان تمام چیزوں سے محروم ہو۔ پس کم از کم تکبر کا سبب خیالی کمال ہے اور اس خیالی کمال

پر خوش ہونا اور عجب وتکبر کا باعث ہونا اور دوسرے کا اس سے خالی ہونا بھی سبب تکبر ہے۔حدیہ ہے کہ برے اخلاق اور اعمال قبیحہ کے مرتکب افراد بھی کبھی دوسروں کے مقابلہ میں تکبر کرتے ہیں، کیونکہ اپنے اندر کی صفت کو (خواہ وہ بری ہوں) وہ ایک قسم کا کمال تصور کرتے ہیں۔

یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ خود متکبر آدمی بعض اسباب کی بناپر کبھی اظہار تکبر سے پرہیز کرتا ہے اور تکبر کی کوئی نشانی اس سے ظاہر نہیں ہوتی۔مگر اس خبیث درخت کی جڑیں اس کے دل میں موجود رہتی ہیں۔ اس لئے اس کے آثار کبھی کبھی ظاہر ہو جاتے ہیں اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنی طبیعی حالت سے خارج ہو جاتا ہے۔ مثلاً جب وہ غصہ میں بے قابو ہو جائے اس وقت اپنی عظمت وکبریائی کا بیان شروع کر دیتا ہے اور اپنے سرمائے پر خواہ وہ علم ہو یا عمل ہو یا کچھ اور، دوسرے کے سامنے ظاہر کر دیتا ہے اور اس پر فخر کرنے لگتا ہے اور کبھی اسباب خارجی کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنے تکبر کا اظہار کر بیٹھتا ہے اور شدت تکبر کی وجہ سے اس کے ہاتھوں سے لگام چھوٹ جاتی ہے۔پس کبھی تو اس کے اعمال اور حرکات وسکنات میں تکبر کا اظہار ہونے لگتا ہے۔ مثلاً مجالس میں جاتے وقت سب پر مقدم ہونا چاہے اور جاتے و نکلتے وقت دوسروں پر سبقت لے جانے کی کوشش کرے۔غریبوں کو اپنی مجلس میں آنے نہ دے اور ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا چھوڑ دے۔ اپنے اردگرد احترام کا ایک ہالا بنائے۔راستہ چلنے میں لوگوں کے سوال کا جواب دینے میں اور دوسرے کاموں میں تکبر کرنے لگے۔ہم نے اس حدیث سے متعلق ایک محقق کی بنیادی باتوں کو لے کر ان کا ترجمہ کیا ہے۔ اس محقق نے فرمایا ہے کہ ایک عالم دین میں تکبر کا سب سے کم درجہ یہ ہے کہ لوگوں کی طرف سے منہ پھیر لے، گویا ان سے دور ہو جائے اور عابد میں سب سے کم درجہ تکبر کا یہ ہے کہ لوگوں کو دیکھ کر صورت بگاڑ لے اور اس کی پیشانی پر بل پڑ جائیں۔ گویا وہ لوگوں سے پرہیز کرنا چاہتا ہے یا لوگوں پر غضب ناک ہے، حالانکہ بیچارے کو یہ بھی نہیں معلوم کہ تقویٰ پیشانی اور ماتھے پر بل ڈالنے میں نہیں ہوا کرتا اور نہ صورت بگاڑنے میں ہوتا ہے اور نہ لوگوں سے منہ پھیرنے اور چہرے کو پلٹا لینے میں ہوتا ہے اور نہ گردن کو ٹیڑھی کرنے اور سر کو جھکانے میں ہوتا ہے نہ دامن سمیٹ کر چلنے میں ہوتا ہے۔تقویٰ تو صرف دل میں ہوتا ہے۔ حضور سرور کائنات نے فرمایا "تقویٰ یہاں ہے"۔ یہ فرما کر اپنے سینہ کی طرف اشارہ فرمایا"۔

کبھی تکبر اس شخص کی زبان سے اور دوسروں سے فخر و مباہات کرنے سے ظاہر ہوتا ہے اور اپنے نفس کی پاکیزگی بیان کرنے سے ہوتا ہے۔ جیسے کوئی عبادت گزار فخریہ انداز میں کہے میں نے تو فلاں عمل کیا ہے اور

اس سے اپنے عمل کو بڑا شمار کرنا اور دوسروں کے اعمال کی تنقیص کرنا مراد ہو۔ کبھی متکبر کھل کر تکبر کا اظہار نہیں کرتا مگر ایسی بات کرتا ہے جس سے مراد اپنے نفس کی پاکیزگی ہے۔ (یا جیسے) ایک عالم دوسرے سے کہے تم کو کیا معلوم؟ میں نے فلاں کتاب اتنی مرتبہ پڑھی ہے۔ کتنے ہی سال میں حلقوں میں رہا ہوں، میں نے اساتذۂ فن کو دیکھا ہے۔ بڑی زحمتیں اٹھائی ہیں، کتابوں کی کتابیں لکھ ڈالی ہیں، تصنیف و تالیف اتنی کی ہے جو بے شمار ہیں اور اسی طرح کی باتیں۔ پس ہر حالت میں نفس اور اس کی مکاریوں سے برابر خدا کی پناہ حاصل کرنی چاہئے۔

تیسری فصل

تکبر سے پیدا ہونے والی برائیاں

یہ جان لو کہ تکبر وہ برائی ہے جو نہ صرف اپنے اندر بہت سی برائیاں رکھتی ہے، بلکہ اس سے دوسری بے شمار برائیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ یہ صفت جہاں انسان کے ظاہری و باطنی کمالات میں رکاوٹ بنتی اور دنیوی و اخروی مسرتوں کے حصول سے مانع ہوتی ہے، وہیں بغض اور دشمنی کا بھی وسیلہ بنتی ہے اور انسان کو خلق خدا کی نظروں سے گرا دیتی ہے اور وہ دوسروں کی نظروں میں حقیر و ذلیل ہو جاتا ہے اور پھر دوسرے لوگ بھی اس کے ساتھ اسی طرح برتاؤ کرنے لگتے ہیں اور اس کو ذلیل و رسوا کرنے لگتے ہیں۔

حضرت امام جعفر صادقؑ کی ایک حدیث کافی میں ہے کہ آپؑ فرماتے ہیں "کوئی بندہ ایسا نہیں ہے جس کے منہ میں ایک لگام نہ ہو اور ایک فرشتہ اس کی نگرانی پر معین نہ ہو، جب بندہ تکبر کرتا ہے، تو فرشتہ کہتا ہے تواضع کر خدا تجھے ذلیل کرے۔ پس وہ شخص ہمیشہ اپنی نظر میں سب سے بڑا ہے اور لوگوں کی نظروں میں سب سے چھوٹا ہے اور جب بندہ تواضع کرتا ہے تو اس لگام کو جو اس کے منہ میں ہے بلند کر کے کہتا ہے تو بلند ہو جا، خدا نے تجھے ارفع و اعلیٰ بنایا۔ ایسا آدمی اپنی نظر میں سب سے چھوٹا ہے مگر لوگوں کی نظروں میں سب سے بڑا ہوتا ہے" [۱]

اے عزیز! جس طرح تیری ناک ہے اسی طرح دوسروں کی ناک ہے، اور جس طرح تیری عزت نفس ہے اسی طرح دوسرے بھی عزت نفس رکھتے ہیں۔ اگر تم فروتنی کرو گے تو فطری طور سے لوگ تمہارا احترام کریں گے اور تم کو بڑا مانیں گے اور اگر تکبر کرو گے تو تمہاری ترقی کا راستہ مسدود ہو جائے گا اور لوگوں کو قدرت حاصل ہو گئی تو تم کو ذلیل و رسوا کریں گے اور تمہاری کوئی پرواہ بھی نہ کریں گے اور اگر قدرت نہ حاصل

ہوسکی تو دس ہی دن میں تم کو رسوا کریں گے اور ان کی نظروں میں تم ذلیل ہو گے، تمہارا کوئی احترام نہ ہوگا۔ تم تواضع و انکساری سے لوگوں کے دل جیت لو۔ جب لوگوں کا دل تمہارے ہاتھ میں ہوگا تو اس کے آثار خود بخود ظاہر ہوں گے اور اگر تمہاری طرف سے دل پلٹ گئے تو اس کے آثار تمہارے مقصد کے خلاف ہوں گے۔ فرض کرو تم احترام طلب ہو اور بزرگی چاہتے ہو تو تم وہی راستہ اختیار کرو جو ادھر لے جاتا ہو اور وہ لوگوں سے تواضع اور خوش اخلاقی سے پیش آنا ہے۔ غرور اور تکبر کا نتیجہ تمہارے مطلب کے خلاف ہی نکلے گا۔ اس کے علاوہ تمہارے برے اخلاق کا کوئی دنیاوی فائدہ تو ہوگا ہی نہیں، یہ تو آسان ہے لیکن اس کا برعکس نتیجہ نکلے گا اور اس بدخلقی سے آخرت میں بھی تمہاری ذلت و خواری کے اسباب فراہم ہوں گے۔ جس طرح اس دنیا میں تم نے لوگوں کو حقیر شمار کیا اور بندگان خدا پر اپنی برتری جتائی اور ان کے سامنے اپنی عزت، عظمت، اور جاہ و حشم کا مظاہرہ کیا، اسی طرح آخرت میں یہ بڑائی ذلت و رسوائی کا سبب ہوگی۔

چنانچہ کافی کی حدیث شریف میں آیا ہے باسنادہ، عن داؤد بن فرقد، عن اخیہ، قال سمعت ابا عبد اللہ علیہ السلام یقول ﴿انّ المتکبرین یجعلون فی صور الذر یتوطاھم الناس حتی یفرغ اللہ من الحساب﴾ [۱] داؤد بن فرقد کے بھائی کہتے ہیں میں نے امام جعفر صادقؑ کو فرماتے ہوئے سنا "تکبر کرنے والوں کو کمزور چونٹیوں کی طرح قرار دے دیا جائے گا۔ جب تک خدا بندوں کے حساب سے فارغ نہ ہو جائے اس وقت تک لوگ ان کو روندتے رہیں گے"۔

حضرت امام جعفر صادقؑ نے اپنے اصحاب کو وصیت کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا ﴿ایاکم والعظمۃ والکبر، فانّ الکبر رداءُ اللہ عزّ و جلّ، فمن نازع اللہ رداءہٗ قصمہ اللہ واذلّہٗ یوم القیامۃ﴾ [۲] "خبردار! تکبر اور بڑائی نہ کرنا۔ اس لئے کہ تکبر ذات خدا کیلئے مخصوص ہے اور جو شخص خدا سے اس میں جھگڑا کرے گا، خدا اس کو برباد کر دے گا اور قیامت میں ذلیل کرے گا" اور جب خدا کسی کو ذلیل کرے تو معلوم نہیں اس کے ساتھ کیا برتاؤ کرے گا اور وہ شخص کس حال میں مبتلا ہوگا؟ کیونکہ آخرت کے امور دنیاوی امور سے فرق رکھتے ہیں۔ آخرت کی ذلت دنیا کی ذلت سے مختلف ہوتی ہے۔ جیسے وہاں کی نعمتوں اور عذاب اور دنیا کی نعمتوں اور عذاب میں فرق ہے۔ وہاں کی نعمت ہمارے تصورات سے بالاتر ہے اور وہاں کا عذاب ہمارے برداشت سے خارج ہے۔ وہاں کی کرامت ہمارے خیال سے مافوق ہے۔ وہاں کی ذلت و خواری کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے اور متکبر کا آخری انجام جہنم ہے۔ ایک حدیث میں ہے ﴿الکبر مطایا

النَّارِ﴾ [13] "جو شخص تکبر کی سواری پر سوار ہے وہ سواری اس کو جہنم میں لے جائے گی" اور جب تک اس شخص میں اس صفت کا اثر باقی ہے وہ جنت کی صورت نہیں دیکھ سکتا۔

چنانچہ رسول اکرم ﷺ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا ﴿لن یدخل الجنة من کان في قلبه مثقال حبة من خردل من کبر﴾ [14] "جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہو وہ ہرگز جنت میں نہیں جا سکتا"۔ حضرت امام محمد باقرؑ اور حضرت امام جعفر صادق علیہما السلام نے بھی تقریباً یہی فرمایا ہے۔ [15] اور کافی کی حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضرت امام محمد باقرؑ نے فرمایا ﴿العزُّ رداءُ الله والكبرُ إزارُهُ، فمن تناول شيئاً منه أكبّهُ اللهُ في جهنم﴾ [16] "اس حدیث کا ماحصل یہ ہے کہ عزت و کبریائی صرف خدا کیلئے ہے۔ جو کوئی اس میں حصہ بنائے گا خدا اس کو منہ کے بل جہنم میں پھینک دے گا اور وہ بھی کیسا جہنم! جو جہنم متکبرین کیلئے ہے وہ علاوہ اس جہنم کے ہے جو عام لوگوں کیلئے ہے۔ کافی ہے کہ میں اس کمرشکن حدیث کو یہاں ذکر کروں، اس حدیث کی یہی جگہ ہے، اس کا ترجمہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے

عن محمد بن يعقوب، عن علي بن ابراهيم، عن أبيه عن ابن أبي عمير، عن ابن بكير عن أبي عبدالله عليه السلام قال ﴿إنّ في جهنم لوادياً للمتكبرين يقال له سقر، شكى إلى الله عزّ وجلّ شدّة حرّه وسأله أن يأذن له أن يتنفّس، فتنفّس فأحرق جهنّم﴾ [17] یہ حدیث بہت معتبر ہے، بلکہ مثل صحیح ہے۔ ابن بکیر نے امام صادقؑ سے نقل کیا کہ حضرت صادقؑ نے فرمایا "جہنم میں متکبرین کیلئے ایک (مخصوص) وادی ہے جس کو "سقر" کہتے ہیں۔ اس وادی نے خدا سے اپنی شدت حرارت کی شکایت کی اور خدا سے اجازت مانگی کہ اس کو (ایک مرتبہ) سانس لینے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ (اجازت ملنے کے بعد) اس نے ایک مرتبہ جب سانس لی تو پورا جہنم جل گیا"

میں خدا کی پناہ اس جگہ سے مانگتا ہوں کہ جو خود عذاب کی جگہ ہے مگر اپنے حرارت کی شکایت کرتی ہے اور اپنے ایک تنفس سے جہنم کو جلا دیتی ہے۔ آتش آخرت کی شدت حرارت و سختی کا ہم اس عالم میں ادراک نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ عذاب کی شدت و ضعف کے اختلاف کا سبب، ایک تو خود ادراک کی قوت و ضعف ہوا کرتی ہے کہ درک کی جانے والی چیز جتنا قوی اور ادراک جتنا کامل اور خالص ہوگا اتنا ہی درد و الم کا ادراک زیادہ ہوگا۔

دوسرے اختلاف کا سبب، مادے پر ہوتا ہے کہ وہ حرارت جہنم کا اثر کس حد تک قبول کرتے ہیں؟

کیونکہ حرارت کے قبول کرنے میں مادوں میں اختلاف ہوتا ہے۔ مثلاً جست اور سیسے کے مقابلے میں سونا اور لوہا حرارت کو زیادہ قبول کرتے ہیں اور یہ دونوں لکڑی اور کوئلے کے مقابلے میں حرارت کو زیادہ جذب کرتے ہیں اور یہ سب چیزیں گوشت و پوست کے مقابلے میں حرارت کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

تیسرا فرق، حس کرنے کی صلاحیت کا باہمی تفاوت بھی ہوا کرتا ہے۔ مثلاً انسانی دماغ جو ہڈیوں وغیرہ کے مقابلے میں حرارت کو کم قبول کرتا ہے مگر اس پر حرارت کا اثر اس لئے کہیں زیادہ ہوتا ہے کہ اس کی قوت حس بہت تیز ہوتی ہے۔

چوتھا سبب اختلاف، خود حرارت کی کمی اور زیادتی پر ہوتی ہے۔ مثلاً اگر آگ ۱۰۰ درجہ سینٹی گریڈ پر ہوگی تو زیادہ شدید اور جلانے والی ہوگی بہ نسبت اس آگ کے جو ۵۰ درجہ سینٹی گریڈ پر ہو۔

پانچواں سبب اختلاف یہ بھی ہوتا ہے کہ حرارت پیدا کرنے والے مادے اور اس کو قبول کرنے والے مادے کے درمیان کتنا ربط اور کتنا فاصلہ ہے؟ مثلاً آگ ہاتھ کے قریب رکھی جائے یا ہاتھ پر رکھی جائے تو دونوں کے جلانے میں فرق ہوگا۔

یہ پانچوں اسباب جن کا اوپر ذکر کیا گیا اس دنیائے فانی میں بہت ہی زیادہ ناقص ہیں اور عالم آخرت میں اپنی پوری قوت اور پورے کمال پر ہوں گے۔ (یہی نہیں) اس دنیا میں ہمارے تمام ادراکات اور احساسات ناقص وضعیف اور بے شمار پردوں میں چھپے ہوئے ہیں جن کا ذکر موجب تطویل ہونے کے ساتھ اس مقام کے مناسب بھی نہیں ہے۔

آج ہماری آنکھیں ملائکہ، بہشت اور جہنم کو نہیں دیکھ سکتیں۔ ہمارے کان برزخ اور اہل برزخ وقیامت اور اہل قیامت کی عجیب وغریب آوازوں کو نہیں سن سکتے۔ ہم وہاں کی حرارت کا احساس نہیں کرسکتے۔ یہ خود ان چیزوں کا نقص ہے۔ آیات واحادیث اہل بیت صلوات اللہ علیہم ان باتوں سے صراحتاً وکنایتاً بھرے پڑے ہیں اور اپنی جگہ دلیل وبرہان کے مطابق بھی ہے۔ لیکن انسان کا بدن اس دنیا میں حرارت کو برداشت کرنے والا نہیں ہے۔ اگر اس دنیا کی آگ میں جو (آخرت کی آگ کے مقابلے میں بہت ہی) سرد ہے، ایک گھنٹہ بھی رہ جائے تو جل کر خاکستر ہو جائے گا۔ لیکن خدائے قادر اسی بدن کو قیامت میں اس طرح خلق کرے گا کہ آتش جہنم میں باقی رہے گا، خاکستر نہیں ہوگا اور نہ ختم ہوگا جبکہ جہنم کی تمازت کے بارے میں جبرئیل امین "فرماتے ہیں کہ اہل جہنم کی ستر ہاتھ زنجیر میں سے صرف ایک کڑی اس دنیا

میں لائی جائے تو اس کی شدت حرارت سے دنیا کے تمام پہاڑ پگھل جائیں۔۱۹ قیامت میں انسانی بدن کی صلاحیت بھی اس دنیا سے قابل قیاس نہیں ہے۔

(اسی طرح) اس دنیا میں جسم و روح کا جو ربط ہے وہ بہت ضعیف و ناقص ہے۔ اس عالم میں اس کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ روح اس میں اپنی قوتوں کا ظہور کر سکے۔ البتہ عالم آخرت روح کے ظہور کی محل ہے۔ وہاں روح کا جسم کے ساتھ فاعلیت اور خلاقیت کا رشتہ ہے اور یہ رشتہ اپنی جگہ پر ثابت و قائم رہے گا۔۲۰ اس لئے یہ ربط کی انتہائی شکل اور مکمل ترین درجہ ہے

اور اس دنیا کی آگ ایک افسردہ اور ٹھنڈی قسم کی آگ ہے اور ایک عارضی چیز ہے جس میں خارجی چیزیں اور غیر خالص چیزیں ملی ہوئی ہیں۔ لیکن جہنم کی آگ خالص ہے۔ اس میں کسی چیز کی ملاوٹ نہیں ہے۔ وہ جوہر قائم بالذات، حسی، مرید اور باشعور ہے۔ اہل جہنم کو جلائے گی اور جتنا اس کو حکم دیا گیا اس کے مطابق ان جسموں کو فشار دے گی۔ جبرئیل امین جو صادق و مصدق ہیں ان کا قول آپ نے جہنم کے بارے میں پڑھا ہی ہے۔ قرآن اور روایات معتبرہ جہنم کی صفات سے پر ہیں۔ البتہ آتش جہنم کے انسانی جسم پر اثر انداز ہونے کی اس دنیا میں کوئی مثال نہیں ہے۔ اس دنیا کی تمام آگ اگر کسی انسان کو گھیر لے تب بھی وہ صرف ظاہری سطح ہی کا احاطہ کر سکتی ہے۔ لیکن آتش جہنم کا حصار اتنا وسیع ہے کہ وہ اپنے تمام متعلقات کے ساتھ انسان کے ظاہر و باطن اور اس کے تمام حواس کے دروازوں کا احاطہ کر لے گی۔ یہ وہ آگ ہے جو دل و روح اور قویٰ کو بھی جلا دے گی اور پھر ان میں ایک ایسا آتش دیدہ ہو جائے گا جس کی اس دنیا میں کوئی نظیر نہیں ہے

پس معلوم ہوا کہ اس دنیا میں عذاب کے اسباب کسی بھی طرح فراہم نہیں ہیں۔ نہ یہاں کا مادہ وہ صلاحیت رکھتا ہے کہ حرارت کا پورا اثر قبول کر سکے، نہ یہاں کی حرارت پوری طرح کسی پر اپنا اثر ڈال سکتی ہے اور نہ ہی مکمل ادراک ہو سکتا ہے۔ وہ آگ جس کے سانس لینے سے پورا جہنم جل جائے، ہم نہ اس کا ادراک کر سکتے ہیں اور نہ ہی تصور کر سکتے ہیں مگر یہ کہ خدانخواستہ ہمارا شمار متکبروں میں ہونے لگے اور اس مہلک صفت کا علاج کئے بغیر ہم اس دنیا سے کوچ کر جائیں اور دوسری دنیا میں اپنی آنکھوں سے دیکھیں ﴿فلبئس مثوى المتكبرين﴾۲۱ "پس تکبر کرنے والوں کا کتنا برا ٹھکانا ہے"

چوتھی فصل۔ تکبر کے اسباب وعلل

جان لو! جن باتوں کا ذکر کیا گیا، ان سے تکبر پیدا ہونے کے مندرجہ ذیل اسباب وعلل بھی ہیں دماغ کا چھوٹا ہونا۔ قابلیت کی کمی یا فقدان۔ پست فطرتی اور حوصلہ وبرداشت کی کمی۔ مختصر یہ کہ آدمی کم ظرف ہوتا ہے۔ اسی لئے اپنے اندر ایک کمال دیکھنے کے ساتھ ہی یا ایک امتیاز کا مشاہدہ کرتے ہیں اس کو یہ گمان ہو جاتا ہے کہ اب وہ ایک مقام ومرتبے کا مالک ہوگیا حالانکہ اگر وہ بہ نظر انصاف یا بہ نظر اعتبار دیکھتا کہ جو امتیاز سے حاصل ہوا ہے یا جس کمال سے وہ متصف ہوا ہے تو وہ خود ہی سمجھ لیتا کہ جس کو اس نے کمال سمجھا ہے اور جس پر تکبر وفخر کررہا ہے وہ درحقیقت کمال نہیں ہے یا، گر ہے بھی تو دوسروں کے کمالات کے مقابلے میں قابل اعتناء نہیں ہے۔ (اور وہ یہ سمجھ جاتا) کہ اس کا منہ تو طمانچہ مار مار کر سرخ کیا گیا ہے۔ یعنی ﴿امتنـــمـن ذ وزمِ﴾ ۲۲ مثلاً ایک عارف جو اپنے عرفان وسلوک کی وجہ سے دوسروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا، ور تکبر کرتا ہے اور دوسروں کو قشری وظاہری کہتا ہے اس کے پاس بھی بعض ان مفاہیم کے مجموعے کے علاوہ جو حق تک کیلئے سد راہ اور حجاب بنے ہوئے ہیں، معارف الٰہیہ میں سے کیا ہے؟ اور زرق وبرق دل فریب اصطلاحات کا بھلا معارف الٰہیہ سے کیا ربط ہے؟ یہ چیزیں خداشناسی اور اسماء وصفات کے علم سے کوسوں دور ہیں۔ معرفت ایک قلبی صفت ہے۔ میرے نظریہ کے مطابق یہ تمام کے تمام علوم عملی ہیں۔ محض مفاہیم کا سمجھ لینا اور صطلاحات کا وضع کرینا علم نہیں ہے۔ میں نے اپنی اس کم عمری وکم علمی کے باوجود ان نام نہاد عرفا اور دیگر علوم کے علماء کے درمیان اسی علم وعرفان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایسے اشخاص بھی دیکھے ہیں کہ ان اصطلاحات نے ان کے دلوں پر کوئی بھی اثر نہیں کیا، بلکہ الٹا اثر کیا ہے۔

اے عزیز! بقول تمہارے عرفان باللہ، قلب کو اسماء وصفات کی تجلیات کا محل اور جلوۂ ذات کا مرکز بناتا ہے ور سلطان حقیقی کے نزول جلال کے قابل ہونے کی فضیلت عطا کرتا ہے۔ غلاظت وگندگیوں کے رنگ برنگ مختلف آثار کو مٹا دیتا ہے۔ رکاوٹوں کے زنگ کو دور کر دیتا ہے۔ ﴿انَّ المُـلُوکَ اِذا دَخلُوا قَريَةً افَسدُوها وَجَعلُوا اعِزَّةَ أَهْلِها أَذِلَّةً﴾ ۲۳ ''بادشاہ لوگ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو ان کو اجاڑ دیتے ہیں اور وہاں کے معزز لوگوں کو ذلیل ورسوا کر دیتے ہیں'' اور (جب قلب پر سلطان حقیقی کا قبضہ ہو جاتا ہے تو) وہ قلب کو حدی اور احمدی بنا دیتا ہے۔ پس تم نے آخر کیوں اپنے قلب کو اپنے ہی جمال میں محو (نظارہ) بنا

دیا ہے اور تمام رنگینوں کو سمیٹ کر رکاوٹوں اور اضافات کا میلہ لگا رکھا ہے؟ تم نے اپنے دل کو کیوں حق اور اس کے اسماء کی تجلیات سے غافل بنا رکھا ہے؟ آخر تم اپنے دل کو کیوں شیطان کی منزل بنا کر بندگان الٰہی، بارگاہ خداوندی کے مقرب بندوں اور جمال محبوب کے جلووں کو حقارت و پستی کی نظر سے دیکھتا ہے؟ اے (نام نہاد) عارف تیری حالت پر افسوس ہے تیری حالت تو سب سے بدتر ہے اور حجت تیرے اوپر تمام ہے (تعجب ہے) تو حق کے ساتھ تکبر کرتا ہے! تو اسماء وصفات وتجلیات ذات کے سامنے بھی فرعونیت کا مظاہرہ کرتا ہے؟

اے مفاہیم کے رٹو طوطے، اے حقیقتوں سے گمراہ، ذرا غور تو کر! تیرے پاس معارف کا کیا علم ہے؟ ذات وصفات حق کا اثر تو اپنے میں کتنا پاتا ہے؟ علم موسیقی اور آوازوں کی ہم آہنگی، شاید تیرے علم سے زیادہ دقیق ہو، علم ہیئت، ٹیکنالوجی، تمام طبیعی علوم، سائنسی اور ریاضی اصطلاحات اپنی پیچیدگی ونزاکت کے اعتبار سے شاید تیرے علم کے مساوی ہوں۔ جس طرح یہ علوم عرفان خدا سے تعلق نہیں رکھتے اسی طرح تیرا علم بھی عبارات ومفاہیم واصطلاحات کے پردوں میں چھپ ہوا ہے نہ اس سے کوئی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے نہ حال!!! بلکہ شریعت علم کے اعتبار سے سائنس ورریاضی علوم تیرے علم سے بہتر ہیں، کیونکہ ان سے کچھ نہ کچھ حاصل تو ہوتا ہے مگر تیرا علم نہ صرف یہ کہ لا حاصل ہے، بلکہ کبھی اس کا الٹا اثر ہوتا ہے۔ انجینیر اپنے علم سے انجینیرنگ میں فائدہ اٹھاتا ہے، سنار اپنی صنعت کا فائدہ اٹھاتا ہے۔ لیکن تم اپنے علم سے دنیاوی فائدہ تو درکنار، معرفت بھی نہیں حاصل کر سکتا! تمہاری آنکھوں پر دبیز پردہ پڑا ہوا ہے۔ جب بھی ذات احدیت کا ذکر ہوتا ہے تم وسیع ظلمتوں کا تصور کرتے ہو اور جب بھی اسماء وصفات حق کی کوئی بات ہوتی ہے تو تم غیر متناہی کثرت (کے شور وغل) میں ایک گفتگو بھی نہیں سن سکتا اور انہیں اصطلاحات کی بھول بھلیوں میں تجھے حقائق ومعارف کا رستہ بھی نہیں دکھائی دیتا۔ اس کے باوجود تو اسی سرمایے پر علمائے حق کے سامنے فخر ومباہات اور تکبر کرتا ہے۔ جو معرفت دل کی کدورت بڑھا دے وہ معرفت نہیں ہے۔ ان معارف پر وائے ہو جو اپنے مالک کے انجام کو شیطان کا وارث بنا دیں۔

تکبر شیطان کا خاصہ ہے، اس نے تیرے باپ آدم علیہ السلام سے تکبر کیا تھا، جس کی بنا پر درگاہ الٰہی سے نکال گیا۔ ورنہ تو آدمیوں یا آدم زادوں سے تکبر کرتا ہے۔ لہذا تو بھی راندۂ بارگاہ الٰہی ہو جائے گا۔ اسی سے تمام علوم کی حقیقت کو سمجھو کہ حکیم اگر (واقعی) حکیم ہے اور حق تعالیٰ کے مقام کو مخلوق کی نسبت نیز اپنی نسبت سے سمجھتا

ہے تو اس کے دل سے غرور چلا جائے گا اور وہ اس برائی سے آزاد ہو جائے گا۔ لیکن یہ بے چارہ انہیں مفاہیم واصطلاحات کے پیچھے دوڑنے والا اسی دھوکہ میں رہتا ہے کہ (اصل) حکمت یہی ہے اور وہ خود ان کا ماہر حکیم وعالم ہے۔ (اسی لئے) کبھی وہ اپنے کو صفات واجب الوجود سے متصف سمجھنے لگتا ہے اور کہتا ہے حکیم (ہونا) خدا کی صفت ہے ﴿الحکمۃ ھی التشبہ بالالہ﴾ ۲۵؎ اور کبھی اپنے کو انبیاء ومرسلین کے زمرے میں شمار کرنے لگتا ہے اور ﴿ویعلمھم الکتاب والحکمۃ﴾ ۲۶؎ کی تلاوت کرنے لگتا ہے اور کبھی ﴿الحکمۃ ضالۃ المؤمن﴾ ۲۷؎ ﴿ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا﴾ ۲۸؎ کا رٹ لگانے لگتا ہے! حالانکہ اس کا دل حکمت سے بے خبر نیکیوں سے ہزاروں منزل دور اور حکمت سے بے بہرہ ہے۔

حکیم الٰہی واسلام کے عظیم فلسفی جناب محقق داماد (رضوان اللہ علیہ) ۲۹؎ فرماتے ہیں ''حکیم وہ ہے جس کا بدن (درحقیقت) اس کیلئے لباس ہو (جب چاہے اس کو پہن لے) جب چاہے اتار دے''۔ (سوچئے) وہ کیا فرماتے تھے اور ہم کیا کہتے ہیں؟ انہوں نے حکمت سے کیا سمجھا تھا اور ہم نے کیا سمجھا ہے؟ پس تو چند (رٹی ہوئی) اصطلاحوں اور مفاہیم پر ناز کرتا اور لوگوں سے غرور سے پیش آتا ہے، یہ تیری کم ظرفی وکم حوصلگی اور کم علمی ہے۔

وہ شخص جو اپنے کو لوگوں کا مرشد اور ہادی سمجھتا ہے اور مسند ارشاد وتصاف پر براجمان ہے اس کا حال ان دو گروہوں سے بدتر ہے۔ اس نے اصطلاحات کا ذخیرہ ان دونوں گروہوں سے چرا کر اپنی متاع کو ان سے سجالیا ہے تاکہ بازار میں اس کے اونچے دام لگیں، ان کے ذریعے سے اس نے بندگان خدا کے دلوں کو حق سے منحرف کر کے اپنا گرویدہ بنالیا ہے اور ان سادہ لوح اور پاک دل لوگوں کو علما اور دیگر لوگوں کا مخالف بنادیا ہے، اپنے بازار کو چمکانے کیلئے جان بوجھ کر یا بلا سوچے سمجھے چند جاذب نظر اصطلاحات سے بے چارے عوام کو پھنسا لیا ہے۔ اس کو یہ غلط فہمی ہوگئی ہے کہ ''مجذوب علی شاہ'' یا ''محبوب علی شاہ'' (نام رکھ لینے) سے مجذوبیت ومحبوبیت کی کیفیت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے!

اے طالب دنیا، اے مفاہیم کے چور! تیری یہ کارکردگی جو تخیل پر مبنی ہے، اس قدر غرور وتکبر کے باعث تو نہیں ہے۔ بے چارہ اپنے چھوٹے دماغ اور پست حوصلگی کی وجہ سے دھوکے میں رہا۔ اپنے آپ کو صاحب مقام سمجھتا رہا۔ تمہارے اندر نفسانی خواہشات، دنیا پرستی چرائے ہوئے مفاہیم غیر ضروری صفت اور پیوند لگے ہوئے اعتبارات کے آمیز سے ایک ناپسندیدہ صفت نے جنم لیا ہے اور ان سب کی ملاوٹ سے

ایک عجیب خمیر اور نرالا معجون بن گیا ہے اور پھر (ستم بالائے ستم) ان تمام خامیوں کے ساتھ اپنے کو مرشد خلائق اور نجات امت کا (ضامن و) ہادی اور شریعت کا رازدار سمجھتا رہا۔ بے شرمی کی انتہا یہ ہو گئی کہ اپنی حدوں سے بڑھ کر اپنے کو ولایت مطلقہ کا حامل سمجھنے لگتا ہے! اور یہ بھی استعداد و قابلیت کی کمی، سینے کی تنگی اور دل کی کوتاہی کی وجہ سے ہے۔

تم فقہ و حدیث و دیگر علوم شرعیہ کا طالب علم بھی بعض اصطلاحات کے علاوہ جو اصول و حدیث میں رائج ہیں کچھ بھی تو نہیں جانتا۔ مگر اس علم نے جو تمام کا تمام عمل سے مربوط ہے تمہارے اندر کوئی اضافہ نہیں کیا، تمہاری کوئی اصلاح نہیں کی، بلکہ (اس کے بجائے) عملی و اخلاقی برائیاں بڑھا دیں تو تمہارا کردار دیگر تمام علوم کے علماء سے پست و ناچیز ہے، بلکہ تمام عوام کے کردار سے بھی بدتر ہے۔ یہ عرضی مفاہیم اور حرفی معانی اور بے فائدہ اختلافی اصطلاحات جن میں سے اکثر کا دین خدا سے کوئی تعلق نہیں ہے، نہ علوم میں ان کا شمار ہے، جن کا تم نے ثمرۂ علمیہ نام دے رکھا ہے! ایسی نہیں ہیں کہ تم ان پر اتراؤ اور غرور کرو، خدا شاہد ہے ﴿وکفی به شهیدا﴾۔ اگر علم کا یہی نتیجہ ہے، اور وہ تم کو ہدایت نہیں کر سکتا، اخلاقی و عملی برائیوں کو تم سے دور نہیں کر سکتا تو سب سے پست درجے کا پیشہ بھی اس سے بہتر ہے، کیونکہ ان کا فائدہ تو فوری ہوتا ہے اور ان میں دنیاوی و اخروی برائیاں بھی کم ہیں اور تم کو نتیجے میں وبال (و جنجال) کے علاوہ کچھ نہ ملے گا اور اخلاقی برائیوں اور برے اعمال کے علاوہ کوئی ثمرہ نہ ہوگا۔ پس علمی اعتبار سے بھی تو تمہارا علم باعث تکبر نہیں ہے۔ بس چونکہ تمہاری فکر کا دائرہ بہت ہی تنگ ہے اس لئے دو چار علمی اصطلاحوں کو ادھر ادھر (استعمال) کر کے تم اپنے کو بہت بڑا عالم اور تمام لوگوں کو جاہل سمجھنے لگتے ہو اور ملائکہ مقربین کے پروں کو روندنے لگتے ہو۔ ۳
مجلس میں دوسروں کیلئے جگہوں کو اور گلیوں کوچوں میں راستوں کو لوگوں کیلئے تنگ کرنے لگتے ہو۔ علم اور اس کے جاننے والوں کو ضائع کرتے اور اپنے ہم پیشہ افراد کی توہین کرتے ہو۔

اور ان سب میں ذلیل و حقیر وہ شخص ہے جو ظاہری امور جیسے مال و منال، حشم و خدم اور قبیلہ و برادری پر تکبر کرے یہ بیچارہ تو آدمیت کے تمام اخلاق اور انسانی آداب سے بھی دور ہے، اس کا ہاتھ تمام علوم و معارف سے خالی ہے، لیکن چونکہ اس نے بھیڑ کی اون کا لباس پہن رکھا ہے اور اس کا باپ فلاں بن فلاں ہے لہذا وہ لوگوں پر غرور کرتا ہے۔ کتنی کوتاہ ذہنیت اور تاریک دل والا آدمی ہے کہ تمام کمالات سے منہ موڑ کر بہترین لباس اور زیب و زینت کو چھوڑ کر ٹوپی اور قبا کی خوبصورتی پر قانع ہے۔ اس بے چارے نے جانوروں

کے مقام کا حامل اور حیوانی صفات سے متصف ہونے کے علاوہ تمام اعلیٰ انسانی اقدار سے عاری ہو کر مغز و فکر سے خالی سر اور حقیقت سے مبرا شکل وصورت پر اکتفا کیا ہے، اس کے باوجود اپنے آپ کو صاحب مقام و مرتبہ سمجھتا ہے۔ یہ تو اتنا نالائق ہے کہ اگر کوئی دنیاوی اعتبار سے اس سے ذرا اونچا ہو تو اس سے ایسا برتاؤ کرتا ہے جیسے غلام اپنے آقا سے کرتا ہے۔

ہاں! یہ صحیح ہے کہ جس کی نظر میں صرف دنیا ہی دنیا ہو وہ دنیا اور اہل دنیا کا غلام ہی ہوتا ہے، ورنہ اس کے سامنے پست وخوار ہو جاتا ہے اور اس کا معبود وہی ہے جس کے پاس دنیا ہو۔

بہر حال غرور کے اہم ترین عوامل میں سے ایک کوتاہی فکر اور صلاحیت کی کمی ہے۔ اسی لئے جو چیز کمال نہیں ہے یا کمال سمجھے جانے کے لائق نہیں ہے اس میں یہ شدت کے ساتھ اثر پیدا کرتی ہے اور اس میں عجب وغرور پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے اندر حب نفس اور حب دنیا جتنا زیادہ ہوگی یہ چیزیں اس میں زیادہ اثر انداز ہوں گی۔

پانچویں فصل
تکبّر کا علاج

اب جب کہ غرور کی برائیاں تم کو معلوم ہو چکی تو اب نفس کے علاج کی فکر کرو اور دل کو کدورت سے پاک کرنے کی ہمت کرلو اور آئینہ دل کو اس غلیظ غبار سے صاف کر ڈالو اور اگر تم (واقعی) قوت ارادی اور کشادگی قلب کے مالک ہو اور (ابھی) حب دنیا تمہارے دل میں مضبوط نہیں ہوئی اور زیبائش دنیا تمہارے قلب میں جلوہ گر نہیں ہوئی اور چشم انصاف واعتبار کھلی ہے تو گزشتہ فصل ہی اس کے علمی علاج کیلئے کافی ہے اور اگر ابھی تم اس مرحلے میں نہیں پہنچے ہو تو اپنے حالات میں تھوڑا غور وفکر کرو، ہوسکتا ہے تمہارا دل بیدار ہو جائے۔

اے انسان تو ابتدا میں کچھ نہ تھا۔ تو انتہائی زمانوں میں پردہ عدم میں محو تھا۔ معدوم اور محو شدہ شے کیا ہوسکتا ہے؟ پھر جب تیری پیدائش سے ارادہ حق کا تعلق ہوا تو چونکہ ناقص القابلیہ تھا اور پست وناچیز تھا اور فیض کے قبول کی تیرے اندر صلاحیت نہ تھی اس لئے تجھ کو اس عالم مادی سے، جو محض بالقوۃ تھا اور خالص ضعف وناتوانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اسے عنصری اور جسمانی صورت میں لایا، جو ذلیل ترین موجودات اور پست ترین کائنات ہے اور پھر وہاں سے نطفے کی صورت میں لایا یہ وہ چیز ہے کہ اگر تمہارے ہاتھ میں لگ

جائے تو تم اس کو بہت ہی گندہ سمجھو گے اور بڑی زحمت سے پاک کرو گے اور اس نطفے کو نہایت تنگ و تاریک جگہ کے اندر جو باپ کے دو بیضتین ہیں قرار دیا اور پھر اس کو پیشاب کی نالیوں کے ذریعے نہایت ہی بری حالت میں رحم مادر میں پہنچایا اور تجھ کو ایسی جگہ رکھا جس کے ذکر سے بھی تمہیں کراہت و نفرت ہوگی۔ وہاں پر تجھے لوتھڑے اور گوشت کے ٹکڑے کی صورت عطا کی اور ایسی چیز تیری غذا قرار دی گئی (خون حیض) جس کے سننے سے بھی تجھ کو وحشت ہوگی اور شرم آئے گی لیکن چونکہ سب ہی اس ایسے میں مبتلا ہیں اس لئے شرم نہیں آتی ﴿والبلیة اذا عمت طابت﴾ ۳۲ "مصیبت جب عام ہو جاتی ہے خوشگوار بن جاتی ہے"۔

ان تمام تبدیلیوں کے دوران تو ایک حقیر ترین اور پست ترین مخلوق اور تمام ظاہری و باطنی ادراکات سے خالی اور تمام کمالات سے تہی دست تھا۔ پھر جب خدا نے اپنی وسیع رحمت سے تجھ کو زندگی بخشی اس وقت بھی تیرے اندر زندگی اتنی ناقص تھی کہ تو ایک کیڑے سے بھی بدتر تھا اور یہ سب تیری قابلیت کے نقص کی وجہ سے تھا۔ پھر رفتہ رفتہ خداوند عالم نے زندگی اور زندگی کے آثار تیرے اندر زیادہ کر دیئے یہاں تک کہ تم دنیا میں آنے کے لائق ہوئے اور پست ترین راستہ سے اور پست ترین حالت میں اس (کشادہ) فضا میں آنے کے قابل ہوئے اور اس وقت بھی تم اپنی صلاحیتوں کو کام میں لانے کے اعتبار سے تمام حیوانات کے بچوں سے زیادہ کمزور و پست تھے۔ پھر خدا نے اپنی قدرت کاملہ سے تم کو ظاہری اور باطنی قوتوں سے نوازا، لیکن پھر بھی تو اتنا ضعیف و ناتواں ہے کہ اپنی کسی قوت کو نہ استعمال کر سکتے ہو اور نہ اپنی صحت کی حفاظت کر سکتے ہو۔ نہ اپنی زندگی و طاقت کی حفاظت کر سکتے ہو اور بڑا ہونے کے بعد بھی ان چیزوں پر قادر نہیں ہے، بلکہ تو اپنی خوبصورتی و جوانی کو بھی محفوظ رکھنے پر قدرت نہیں رکھتا اور اگر کوئی مصیبت یا بیماری تجھ پر ٹوٹ پڑے تو اس کو اپنے سے دور نہیں کر سکتا۔

مختصر یہ ہے کہ تمہارے بس میں کچھ نہیں ہے۔ اگر ایک دن بھی بھوکا رہنا پڑ جائے تو تم کوئی بھی مردار اور گندی چیز کھانے پر تیار ہو جاؤ گے اور اگر پیاس کا غلبہ ہو جائے تو کوئی بھی گندا اور ناپاک پانی پینے پر تیار ہو جاؤ گے۔ اسی طرح ہر معاملے میں تم ایک ایسے بندۂ ذلیل ہو جو کسی چیز پر قادر نہیں ہے اور اگر تم اپنا قیاس دنیا کی دوسری مخلوقات اور ان کے کمالات سے کرو تو دیکھو گے کہ صرف تم ہی نہیں بلکہ پورا کرۂ ارض اور پورا نظام شمسی اس عالم طبیعی کے مقابلے میں جو تمام دنیاؤں میں پست ترین اور سب سے چھوٹی چیز ہے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

میرے عزیز! تم نے ابھی اپنے سواد یکھا ہی کیا ہے؟ اور اگر دیکھا بھی ہے تو جانچا اور پرکھا نہیں ہے۔ تم (پہلے) اپنے آپ اور اپنے تمام سرمایہ حیات اور دنیا کی رنگینیوں کا اپنے شہر سے مقابلہ کرو، پھر اپنے شہر کا اپنی مملکت سے مقابلہ کرو اور پھر اپنی مملکت کا مقابلہ دوسرے تمام ممالک سے کرو جن سے بہت سے ممالک کے نام تم نے نہ سنے ہوں گے ور پھر ان تمام کا مقابلہ کرۂ ارض سے کرو اور کرۂ ارض کا مقابلہ نظام شمسی سے اور اس کے دیگران وسیع وعریض سیاروں سے کرو جو سورج کی شعاعوں سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ پھر اس نظام شمسی کا جو ہمارے اور تمہارے ذہنوں کی حدوں سے کہیں زیادہ وسیع ہے، ان دوسرے نظامہائے شمسی سے مقابلہ کرو جن کے سامنے ہمارا سورج اپنے تمام سیاروں سمیت اس کے کرات میں سے ایک کرے کے برابر ہے، کیونکہ ان میں سے یک کا بھی ہمارے سورج اور اس کے کرات سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا اور ان میں سے اب تک جیسا کہ کہا جاتا ہے، جو دریافت ہو چکا ہے وہ کئی ملین کہکشاؤں پر مشتمل ہے اور نزدیک ترین ور سب سے چھوٹی کہکشاں میں کئی ملین نظام شمسی موجود ہیں جن میں سب سے چھوٹا ہمارے سورج سے کروڑوں گنا بڑا اور نورانی تر ہے اور یہ سب عالم مادی ہے کہ جس کی مقدار ان کے خالق کے سوا کوئی نہیں جانتا اور سائنسدان اور موجدین اب تک اس کی ایک تھوڑی سی مقدار کو دریافت کر سکے ہیں اور یہ تمام عالم اجسام، عالم ماورء الطبیعہ کے مقابلے میں قابل حس بھی نہیں ہیں اور س عالم میں ایسی بھی دنیائیں ہیں جو انسانی فکروں میں سمانہیں سکتیں۔

تمہارے اسباب زندگی یہی ہیں ور یہ اس عالم وجود سے ہمارا اور تمہارا حصہ ہیں۔ پھر جب خدا تم کو اس دنیا سے اٹھانا چاہتا ہے تو تمہاری تمام قوتوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ کمزور ہو جائیں، تمہارے سارے دراکات کو حکم دیتا ہے کہ اپنی کارکردگی روک دیں، تمہارے کارخانہ وجود کو مختل کر دیتا ہے اور سماعت، بصارت، طاقت وقدرت کو تم سے واپس لے لیتا ہے اور پھر تم یک جامد (لاش) ہو جاتے ہو اور چند روز کے بعد تمہاری گندگی اور عفونت سے لوگوں کے مشام کو اذیت ہونے لگتی ہے اور لوگ تمہاری شکل وصورت سے بھاگنے لگتے ہیں۔ پھر ایک مدت کے بعد تمام اعضاء یک ایک کر کے گلنے سڑنے لگتے ہیں اور پھر بکھر جاتے ہیں یہ تو تمہارا جسم کا حال ہے۔ مال ومتاع، ور جاہ وحشم کی بے اعتباری تو اور زیادہ واضح ہے۔

اگر تم نے خدانخواستہ اپنے عالم برزخ کی اصلاح نہ کی تو خدا جانتا ہے کہ تمہاری کیا صورت اور کیسی حالت ہوگی، کیونکہ اس دنیا والوں کے حواس ان کے دیکھنے، سننے، ور سونگھنے سے قاصر ہیں۔ تم نے فشار قبر اور

قبر کی وحشت، تاریکی (وغیرہ) کے بارے میں جو کچھ بھی سن رکھا ہے اس دنیا کی وحشت وتاریکی اور سختیوں کا اس پر قیاس ہی نہیں کیا جا سکتا اور، اگر کیا جائے تو وہ قیاس باطل ہے۔ خدایا! ہم نے اپنے ہاتھوں سے اپنے لئے جو کچھ تیار کر رکھا ہے اس پر ہماری فریاد کو سن کر فریاد رسی کر۔

عذاب قبر جو عذاب آخرت کا نمونہ ہوگا، جس سے بچنے کیلئے بعض روایات کی بنا پر ہمیں شفاعت کرنے والوں کی شفاعت بھی نصیب نہ ہوگی۔ ۳۳؎ خدا جانے وہ کیسا عذاب ہوگا؟ آخرت کا حال تو تمام سابقہ حالتوں سے بدتر اور زیادہ وحشت ناک ہوگا آخرت کا دن، حقائق کے ظاہر ہونے کا، رازوں کے منکشف ہونے، اخلاق واعمال کے مجسم ہونے، حساب (وکتاب) اور ذلت ورسوائی کا دن ہوگا۔ موقف حساب میں کھڑا ہونے کا دن ہوگا۔ یہ ہے قیامت!

اب قیامت کے بعد جہنم ہے اس کا بھی حال معلوم ہے۔ جہنم کے بارے میں کچھ معلوم کرنا چاہتے ہو؟ (تو سنو!) عذاب جہنم صرف آگ ہی نہیں ہے۔ تمہاری آنکھوں کے سامنے اس کا ایک ہولناک دروازہ کھول دیا جائے گا۔ اگر وہ ہولناک دروازہ اس دنیا میں کھول دیا جائے تو تمام دنیا والے ہلاک ہو جائیں۔ اسی طرح ایک دروازہ تمہارے کان کیلئے اور ایک تمہاری ناک کی طرف کھول جائے گا جن میں سے ایک بھی گر اس مادی دنیا کے رہنے والوں کیلئے کھولا جائے تو سب کے سب اس کی شدت عذاب سے ہلاک ہو جائیں گے۔

آخرت کی حقیقت سے آگاہ ایک عالم کہتا ہے جس طرح جہنم کی گرمی کمال شدت پر ہے، اسی طرح اس کی سردی بھی اپنی شدت کے کمال پر پہنچی ہوئی ہے۔ خدا شدید گرمی اور شدید سردی کو یکجا کرنے پر قادر ہے۔ ۳۴؎ یہ تمہارا انجام ہے۔

پس جس کی ابتداء ایک ناچیز عدم ہو اور جب سے وہ اس دنیا میں قدم رکھے اس کے تمام تغیرات برے ہوں اور جن حالات میں وہ زندگی بسر کرے وہ ایک سے بڑھ کر ایک شرم آور ہوں، اس کی دنیا، برزخ، اور آخرت ہر ایک دوسرے سے بدتر ہو اور رسوا کن ہو وہ بھلا کس چیز پر تکبر وغرور کر سکتا ہے یا کس حسن وخوبی اور کمال پر فخر کر سکتا ہے؟ پس معلوم ہوا کہ غرور صرف جہالت وناوانی کی بنا پر ہوا کرتا ہے جس کی جہالت زیادہ ہوگی اور عقل ناقص ہوگی اس کا غرور زیادہ ہوگا اور جس کا علم زیادہ ہوگا روح وسیع ہوگی سینہ کشادہ ہوگا وہ متواضع اور فروتنی کرنے والا ہوگا۔

رسول خداﷺ کا علم چونکہ وحی الٰہی سے ماخوذ تھا اور آپؐ کی روح اتنی وسیع تھی کہ تن تنہا اربوں آدمیوں کے روح پر بھاری تھی۔ اس لئے آپ نے جاہلی عادتوں اور ادیان باطلہ کو پیروں تلے کچل دیا اور تمام آسمانی کتابوں کو منسوخ کر دیا تھا۔ اسی لئے آپؐ کی ذات گرامی پر گزشتہ آسمانی ادیان منسوخ ہوگئیں اور آپؐ ہی پر دائرہ نبوت کا خاتمہ ہوگیا۔ بحکم خدا حضورؐ پرنور سلطان دنیا و آخرت ہونے کے ساتھ ساتھ تمام دنیاؤں پر متصرف بھی تھے۔ بندگان الٰہی کے ساتھ آپ کی تواضع سب سے زیادہ تھی۔ آپؐ کو یہ بات سخت ناگوار تھی کہ آپؐ کے اصحاب آپؐ کی تعظیم کیلئے کھڑے ہوں، جہاں بھی تشریف لے جاتے تھے سب سے آخر میں بیٹھتے تھے۔ زمین پر بیٹھ کر کھانا تناول فرماتے تھے اور زمین ہی پر نشست و برخاست رکھتے اور فرمایا کرتے تھے ''میں خدا کا بندہ ہوں، لہذا غلاموں کی طرح کھاتا ہوں اور غلاموں ہی کی طرح بیٹھتا ہوں''۔ ۳۵

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے تھے: آنحضرتؐ بے پالان کے گدھے پر بیٹھنے کو پسند فرماتے تھے، بندگان الٰہی کے ساتھ پست (معمولی) جگہوں پر کھانا تناول فرمانے کو اچھا سمجھتے تھے اور فقراء کو اپنے دونوں ہاتھوں سے دینے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ آپؐ جب بھی گدھے پر سوار ہوتے تھے، اپنے پیچھے اپنے غلام یا کسی اور کو بٹھا لیتے تھے۔ ۳۶ اور آنحضرتؐ کی سیرت میں یہ بھی ہے کہ آپؐ اپنے اہل خانہ کا گھریلو کاموں میں ہاتھ بٹاتے، گوسفندوں کو اپنے ہاتھ سے دوہتے، اپنے کپڑوں اور جوتیوں کو خود ہی ٹانک لیتے تھے، اپنے خادم کے ساتھ مل کر چکی پیستے، آٹا گوندتے اور اپنا سامان اپنے دست مبارک سے اٹھا کر لے جاتے، نیز غریبوں اور مساکین کے ساتھ اٹھتے اور بیٹھتے اور ان کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ ۳۷ ان جیسی اور ان سے بالاتر چیزوں کے بارے میں آنحضرتؐ کی یہی سیرت تھی۔ تواضع آپؐ کی مخصوص صفت تھی حالانکہ آنحضرتؐ مقامات معنوی کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ سلطنت ظاہری پر بھی فائز تھے۔ اسی طرح حضرت علیؑ بھی رسول خداؐ کی پیروی میں ان تمام امور کو انجام دیا کرتے تھے اور آپؐ کی سیرت بالکل رسول خداؐ کی سیرت تھی۔ ۳۸

لہذا میرے عزیز! اگر تجھے روحانی کمال پر غرور ہے تو رسول خداؐ اور ائمہؑ کے مراتب کا تصور کر جو سب سے بلند مرتبہ تھے اور اگر قیادت و سلطنت پر تکبر ہے تو وہ حضرات سلطنت حقیقی کے مالک تھے، لیکن سب سے زیادہ متواضع تھے۔ پس اس حقیقت کو تسلیم کر لو کہ تواضع اور انکسار علم و معرفت کی پیداوار ہے اور غرور و سرکشی

جہالت وناداني کی پیداوار ہے۔ اس جہل وناداني کی ذلت ،ور فکر ونظر کی پستی کو اپنے سے دور کر کے انبیاء کے صفات اپنے اندر پیدا کرو، شیطانی صفات سے چھٹکارا حاصل کر، خدا کی کبریائی میں اس سے جھگڑا نہ کر، اس لئے کہ حق سے جھگڑا کرنے والا اس کے قہر وغضب کا نشانہ بنتا ہے اور منہ کے بل آتش جہنم میں ڈال دیا جاتا ہے۔

اگر تم اپنے نفس کے اصلاح میں کامیاب ہوجاؤ تو تھوڑی سی احتیاط و پابندی کے بعد اس راستے پر چلنا تمہارے لئے آسان ہوجائے گا۔ ہمت مردانہ، آزادی فکر ،ور بلندی نظر سے کام لو تو اچانک پیش آجانے والے خطرات سے بھی محفوظ رہو گے۔ نفس امارہ اور شیطان پر غلبہ حاصل کرنے اور راہ نجات حاصل کرنے کیلئے صرف ایک ہی راستہ ہے کہ نفس امارہ وشیطان کی خواہشات کے برخلاف ہمیشہ عمل کرتے رہو۔ نفس کو کچلنے کیلئے اس سے بہتر کوئی راستہ نہیں ہے کہ فروتنی کرنے والوں کی صفت کو اپنا لو اور ان کے کردار وسیرت کے سانچے میں اپنے کو ڈھال لو تمہارا غرور چاہے جس درجے کا ہو اور علم وعمل کے جس کسی مخصوص شعبے میں تمہاری چاہے جتنی مہارت ہو کچھ دنوں تک اپنی نفسانی خواہشات کے خلاف عمل کرتے رہو ،ور علمی نکات پر غور وفکر کے ساتھ ساتھ دنیاوی اور اخروی نتائج پر بھی غور کرو تو امید ہے کہ تمہاری راہ آسان ہوجائے اور تم اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاؤ۔ (مثلاً) اگر نفس کی خواہش ہے کہ صدر مجلس پر قبضہ کر کے اپنے اہم مرتبہ لوگوں پر فوقیت حاصل کرو تو تم اس کے برخلاف عمل کرو اگر غریبوں ،ور مسکینوں کے ساتھ نشست وبرخاست کو دل نہیں چاہتا تھا تو دل کی ناک رگڑ دو اور غریبوں کے ساتھ اٹھو بیٹھو، کھاؤ پیو سفر کرو، مذاق کرو۔ ویسے یہ بھی ممکن ہے کہ نفس تم سے بحث کرے اور کہے تم ایک باعزت آدمی ہو شریعت کے فروغ کیلئے اپنی عزت ووقار کو باقی رکھو۔ غریبوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے لوگوں کے دلوں میں تمہارا مقام گر جائے گا۔ اپنے ماتحتوں سے ہنسی مذاق کرنے سے تمہارے وقار کو دھچکہ لگے گا۔ محفلوں میں پیچھے بیٹھنے سے تمہاری عزت واحترام میں بٹہ لگ جائے گا اور پھر تم باقاعدہ اپنے شرعی فریضے پر عمل نہیں کر پاؤ گے۔ سمجھ لو کہ یہ سب شیطان کی فریب کاریاں اور نفس کی مکاریاں ہیں (کیونکہ) دنیا میں رسول اکرم ﷺ کا احترام ووقار اور اقتدار وحکومت تم سے کہیں زیادہ تھا مگر آپؐ کی سیرت وہ تھی جو تم نے چند سطروں پہلے پڑھی۔

میں نے اپنے زمانے میں خود اپنے دور کے علماء کے اندر ایسے اشخاص کو دیکھا ہے جو ایک ملک پر مکمل اقتدار کے حامل تھے، بلکہ شیعوں کی ایک اقلیم پر کامل طور سے اقتدار رکھتے تھے لیکن ان کی سیرت رسول اکرمؐ

کی سیرت جیسی تھی۔

جناب استاد معظم وفقیہ مکرم حاج شیخ عبدالکریم حائری یزدیؒ ۱۳۳۹ھ جو ۱۳۴۰ سے ۱۳۵۵ ہجری شمسی تک دنیائے تشیع پر مکمل اقتدار رکھتے تھے اور مرجع کل تھے ہم سبھوں نے دیکھا ہے کہ ان کی سیرت کیسی تھی، وہ اپنے نوکروں چاکروں کے ساتھ ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھاتے تھے، زمین پر بیٹھتے اور چھوٹے چھوٹے طلاب سے عجیب وغریب مذاق فرمایا کرتے تھے! آخری عمر میں جب ان کی صحت گر چکی تھی تو مغرب کے بعد بغیر عباء اپنے سر پر مختصر سا عمامہ لپیٹ کر پیروں میں چپل پہن کر گلی میں ٹہلنے نکلا کرتے تھے۔ اس سے لوگوں کے دلوں میں ان کا وقار (کم نہیں ہوا بلکہ) بڑھ گیا اور ان کی عزّت واحترام میں کوئی کمی نہیں آئی۔

ان مرحوم کے علاوہ بھی قم کے علما میں کئی ایسے محترم اشخاص تھے جن کے اندر اس قسم کے تکلفات نہیں تھے جن میں تمہارے شیطان نے تم کو مبتلا کر رکھا ہے، وہ حضرات اپنی ضرورت کی چیزوں کو بازار سے خود ہی خرید لیتے تھے۔ اپنے گھروں کیلئے پانی کے ذخیرے سے خود ہی پانی لاتے اور اپنے گھریلو کاموں میں حصہ لیتے تھے۔ لوگوں سے آگے یا پیچھے (چلنا) اور صدر نشینی وخاک نشینی دونوں ان کی نظروں میں یکساں تھیں۔ ان کی تواضع وانکساری پر لوگوں کو حیرت ہوتی تھی، ساتھ ہی ان کی عظمت لوگوں کی نظروں میں بہت تھی اور دلوں میں ان کا احترام بہت زیادہ تھا۔

بہرحال (یہ بات طے شدہ ہے کہ) رسول اکرمؐ اور حضرت علیؑ کی سیرت پر عمل کرنا انسان کو چھوٹا نہیں بناتا۔ لیکن انسان کو نفس کی مکاریوں سے چوکنا رہنا چاہئے کہ کہیں اپنے جال میں پھنسا کر کسی اور راستے سے تم کو نہ کھینچ لے۔ مثلاً تم بعض لوگوں کو دیکھو گے کہ وہ مجلس میں بالکل آخر میں اس طرح بیٹھیں گے کہ حاضرین کو سمجھائیں 'میرا مقام تو بہت اونچا ہے، لیکن انکساری کی وجہ سے میں یہاں بیٹھا ہوں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص جس کو اپنے بلند مرتبہ ہونے کا خیال ہوتا ہے ایسے شخص کو اپنے آپ سے آگے بٹھا دیتا ہے جس کی حیثیت سب ہی کی نظروں میں اس سے کم ہوتی ہے اور اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ لوگ سمجھ جائیں کہ یہ عمل محض انکساری وفروتنی کی وجہ سے ہے۔ اس قسم کی سینکڑوں نفس کی مکاریاں ہیں جن میں غرور کے علاوہ ریاکاری اور دھوکہ بھی شامل ہوتا ہے۔

نفس کی اصلاح اسی وقت ممکن ہوسکتی ہے جب خالص ارادے سے جدوجہد کی جائے۔ اسی طرح تمام نفسانی صفات قابل اصلاح ہیں، مگر شروع میں زحمت ضرور ہوتی ہے۔ البتہ اگر کوئی نفس کی اصلاح کرنے کو

طے ہی کرلے تو پھر اس میدان میں اترنے کے بعد مسئلہ سہل و آسان ہو جاتا ہے۔ اصل بات اصلاح اور بہتری کا سچا اور پکا ارادہ کرنا اور خواب غفلت سے بیدار رہنا ہے۔

"بیداری" انسانیت کی پہلی منزل

انسانیت کی سب سے پہلی منزل "خواب غفلت سے بیداری" طبیعت کے نشے سے ہوشیاری اور یہ سمجھنا ہے کہ انسان ایک مسافر ہے اور ہر مسافر کیلئے زاد راہ کی ضرورت ہوتی ہے اور انسان کا زاد راہ اس کی اچھی خصلتیں ہیں۔ اس سفر کی سواری خوفناک و خطرناک اور راستہ اتنا تنگ و تاریک ہے جو تلوار سے تیز تر اور بال سے باریک تر ہے جس کیلئے ہمت مردانہ چاہئے۔ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے راستے کی روشنی ایمان اور اچھی عادتیں ہیں۔ اگر کسی نے سستی برتی تو اس صراط سے گزر نہیں سکے گا، منہ کے بل جہنم میں گرے گا۔ خاک ذلت و رسوائی میں گرے گا اور ہلاکت کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا۔ اور جو اس صراط سے نہیں گزر سکے گا وہ صراط آخرت سے بھی نہیں گزر سکے گا۔

اے عزیز! ذرا ہمت کر اور جہالت و نادانی کے پردے کو تار تار کر کے اس خطرناک بھنور سے نجات حاصل کر۔ مولائے متقیان اور ہمارے حقیقی حضرت علیؑ مسجد میں اس طرح نالہ و فریاد کرتے تھے کہ مسجد کے پڑوس میں رہنے والے بھی سنتے تھے ﴿تجهزوا رحمكم الله، فقد نودي فيكم بالرحيل﴾ (خدا تم پر رحم کرے! سامان سفر درست کر لو اس لئے کہ کوچ کا نقارہ بج چکا ہے)۔ نفسانی کمالات، تقوائے قلب، اعمال صالح، صفائے باطن اور ہر عیب سے پاک و پاکیزہ ہونے کے علاوہ اس راہ میں کوئی سامان کام نہ آئے گا۔

بالفرض اگر تم ایمان کی ظاہری صورت رکھنے والے ناقص (گروہ سے) ہو تو اپنے کو اس کھوٹ سے خالص کرنا پڑے گا تاکہ نیکوکاروں اور صالحین کے گروہ میں شامل ہو جاؤ۔ (اس کے علاج کا طریقہ یہ ہے کہ) نفس کو عتاب و ملامت کی بھٹی میں رکھو، پشیمانی و ندامت اور توبہ کی آگ کے ذریعہ اس کو جلا کر پگھلا دو۔ یہی خدا کی طرف واپسی کا ایک طریقہ ہے۔ اسی دنیا میں تم خود ہی اپنا علاج کر لو ورنہ عذاب الٰہی کی بھٹی ﴿نار الله الموقدة ☆ التي تطلع على الأفئدة﴾ ۳۲ میں تم کو پگھلا دیا جائے گا اور خدا ہی جانے آخرت کی کتنی صدیاں اس کی اصلاح کیلئے درکار ہوں گی۔ اس دنیا میں پاک ہونا سہل و آسان ہے، یہاں

پر تبدیلیاں اور تغیرات بہت تیزی سے واقع ہوتے ہیں، لیکن آخرت میں تغیرات دوسرے ڈھنگ سے ہوتے ہیں اور نفسانی صفات میں سے کسی ایک صفت کے زوال کیلئے صدیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

لہذا میرے بھائی! جب تک عمر و جوانی، طاقت و اختیار باقی ہے نفس کی اصلاح کر لے۔ یہاں کے جاہ و مقام کی فکر نہ کرو، ان وقتی چیزوں کو روندڈالو۔ تم آدمؑ کی اولاد ہو اس لئے شیطان کی صفت کو اپنے سے دور کرو، ممکن ہے شیطان غرور کو دیگر برے صفت کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت دے، کیونکہ یہ خود اس کی صفت ہے اور اسی کی وجہ سے بارگاہ خدا سے اس کو نکالا گیا تھا۔ اسی لئے وہ چاہتا ہے ہر عارف شخص، عام آدمی اور جاہل کو اپنا ہم مسلک بنالے (اور پھر) جب اس بری صفت میں مبتلا ہو کے عالم آخرت میں اس سے ملاقات کرو گے تو تم کو اس کی ملامت کا بھی سامنا کرنا پڑے گا، وہ تم سے کہے گا اے آدم زادے! کیا انبیاء نے تجھے نہیں بتایا تھا کہ تیرے باپ سے تکبر ہی کی وجہ سے مجھے بارگاہ ایزدی سے نکال دیا گیا۔ اپنی تعظیم اور آدم کی تحقیر کی وجہ سے میں ملعون قرار دیا گیا پھر تم نے اپنے کو اس بلا میں کیوں مبتلا کر لیا؟!

اس وقت تم کو عذابوں، مصیبتوں، حسرتوں اور ندامتوں میں مبتلا ہونے کے علاوہ جن میں سننے کی بھی تاب لانا مشکل ہے، دنیا کی ذلیل ترین اور پست ترین مخلوق کی لعنت و ملامت بھی سننی پڑے گی! (دیکھو شیطان نے خدا کے ساتھ تکبر نہیں کیا تھا۔ اس نے تو جناب آدمؑ کے ساتھ جو بہر حال مخلوق خدا تھے، یہ کہہ کر تکبر کیا تھا ﴿خلقتني من نارٍ و خلقته من طين﴾ ۳۳ (مجھے آگ (جیسی بلند چیز) سے پیدا کیا اور آدمؑ کو (پست) مٹی سے)۔ شیطان نے اسی بنا پر اپنے کو برتر اور آدمؑ کو پست تر سمجھا تھا۔ (مگر) تم بھی آدمؑ کے بیٹوں کو اپنے سے کمتر سمجھتا ہے۔ تم بھی تو احکام الٰہی سے سرکشی کرتے ہو۔ (خدا نے فرمایا) انکساری کرو، تواضع کرو، مگر تم بندگان الٰہی کے ساتھ تکبر کرتے ہو اور اتراتے ہو (جب ایسا ہے تو) صرف شیطان ہی پر کیوں لعنت بھیجتے ہو؟ اپنے خبیث نفس کو بھی لعنت میں شریک کرو، کیونکہ اس بری صفت میں تیرا نفس بھی تو شیطان کا شریک ہے۔ تم خود شیطان کے مظہر ہو (بلکہ) مجسم شیطان ہو۔ ہو سکتا ہے تمہاری اخروی اور برزخی صورت بھی شیطانی ہو۔ اس لئے کہ آخرت میں صورتوں کا معیار ملکات نفس ہیں۔ لہذا تم شیطان کی صورت رکھ سکتے ہو، چیونٹی بھی ہو سکتے ہو۔ عالم آخرت کے معیارات یہاں سے مختلف ہیں۔

چھٹی فصل: حسد بھی کبھی غرور کا مبدأ ھوتا ھے

یہ بات سمجھ لو کہ کبھی محروم کمال، صاحب کمال سے تکبر کرنے لگتا ہے جیسے غریب امیر سے اور جاہل عالم سے تکبر کرے۔ اسی طرح یہ بھی سمجھ لو کہ جس طرح کبھی عجب (خود پسندی) تکبر کا سرچشمہ بنتا ہے اسی طرح حسد بھی غرور و تکبر کا مبدأ بن جاتا ہے۔ ورممکن ہے جب انسان اپنے میں وہ کمال نہ پائے جو دوسرے کے اندر ہے تو وہ اس سے حسد کرنے لگے اور پھر یہ حسد دوسرے سے غرور و تکبر کا سبب بن جائے اور پھر وہ اس صاحب کمال کی جس طرح چاہے تذلیل و توہین کرے۔

کافی شریف میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے حدیث مروی ہے کہ حضرتؑ نے فرمایا "ہر طبقے کے شریر اشخاص میں تکبر کا پایا جانا ممکن ہے"۔ اس کے بعد کچھ گفتگو کرنے کے بعد فرمایا "رسول خداؐ مدینہ کی بعض گلیوں سے گزر رہے تھے کہ ایک سیہ فام عورت اپلے چن رہی تھی، اس سے کہا گیا کہ رسول خداؐ کے رستے سے ہٹ جا! اس نے جواب دیا کہ راستہ کشادہ ہے۔ بعض اصحاب نے اس کو ہٹانا چاہا مگر رسول خداؐ نے فرمایا اس کو چھوڑ دو کہ یہ متکبر ہے"۔ ۴۴

کبھی بعض اہل علم کے اندر بھی یہ صفت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ مالداروں کے ساتھ تواضع اچھی بات نہیں ہے اور نفس امارہ ان سے کہتا ہے مالداروں کے ساتھ انکساری برتنا ایمان کو ناقص کر دیتا ہے۔ (دراصل) اس غریب کو پتہ ہی نہیں ہے کہ مالداروں سے تواضع ان کی مالداری کی بنا پر کرنا اور ہے اور کسی اور بات کی وجہ سے انکساری کرنا اور ہے۔ اگر حب دنیا کی بری صفت اور جذبہ طلب جاہ و منزلت انسان کو تواضع پر آمادہ کرتا ہے تو یہ عادت تواضع نہیں ہے یہ تو تملق و چاپلوسی اور نفسانی برائیوں میں سے ہے، ایسے اخلاق والا شخص کبھی غریبوں کے سامنے فروتنی کا اظہار نہیں کرتا۔ ہاں! اگر غریبوں سے کوئی مفاد وابستہ ہے یا کسی مقرب تر کا سراغ ملتا ہے تب وہ ان کی بھی تواضع کرتا ہے۔

اور کبھی فطری تواضع انسان کو دوسرے کے احترام اور اس کے ساتھ انکساری سے پیش آنے پر مجبور کرتی ہے، چاہے وہ دوسرا شخص غریب ہو یا مالدار یا اس سے کوئی غرض وابستہ ہو یا نہ ہو۔ یعنی اس کی تواضع بے لوث ہوتی ہے اور اس کی روح پاک و پاکیزہ ہوتی ہے۔ جاہ و منزلت (کی طمع) نے اس کو اپنا اسیر نہیں کیا ہے۔ یہ تواضع غریبوں اور امیروں (دونوں) کیلئے خوب ہے۔ یعنی ہر شخص کا اس کے مقام کے مطابق احترام کیا جانا

چاہیے۔ لیکن صاحبان حیثیت ومقام کے ساتھ تمہارا تکبر کرنا اور ان کی تحقیر کرنا اس وجہ سے نہیں ہے کہ تم تملق وچاپلوسی نہیں کرتے، بلکہ یہ صرف حسد کی وجہ سے ہے اور تم اپنے کو دھوکہ دے رہے ہو۔ اسی لئے اگر تم کسی کو غیر متوقع طور پر اپنا احترام کرتے ہوئے دیکھو تو اس کے ساتھ تواضع وانکساری سے پیش آتے ہو۔

بہر حال نفس کی مکاریوں اور اس کے کارنامے اس حد تک دقیق ہوتے ہیں کہ خدا سے پناہ مانگنے کے علاوہ انسان کے پاس کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

والحمد للہ أولاً وآخراً

توضیحات (۲)

۱۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۰۹ کتاب ایمان و کفر، باب کبر، حدیث

۲۔ حدیث ۴ تفصیل ۲۔

۳۔ سورۂ مومن، آیت ۶۰/۴۰

۴۔ سورۂ زخرف، آیت ۳۱/۔

۵۔ ﴿ولقد آتینا لقمان الحکمة ان اشکر للہ﴾ ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تا کہ آپ اللہ کا شکر ادا کریں۔ سورۂ لقمان آیت ۱۲/ ۔

۶۔ سورۂ لقمان، آیت ۱۸

۷۔ سورۂ نساء، آیت ۳۶/۔

۸۔ سورۂ بنی اسرائیل/۳۶ اور سورۂ نور ۱۵ اسی طرح اصول کافی، کتاب فضل العلم، باب النہی عن القول بغیر علم میں بھی ہے اور اس سلسلے میں ۹ حدیثیں آئی ہیں اور مسلمانوں کے مال، خون، عزت و آبرو کے احترام میں بہت سی آیات وارد ہوئی ہیں منجملہ ان کے یہ ہے ﴿حُرمَةُ النَّبِيِّ وَالمُؤمِنِ اعظم من حرمة البيت﴾ رسول و مومن کا احترام خانہ کعبہ کے احترام سے زیادہ ہے۔

وسائل الشیعہ، ج ۱۰، ص ۳۲۲ اصول کافی، کتاب ایمان و کفر میں مومن کے سلسلے میں بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں مثلاً "حق المؤمن علی اخیه واداء حقه"، "باب من اذی المسلمين واحتقرهم"، "باب من طلب عثرات المؤمنين"۔

۹۔ اسی حدیث کا تسلسل۔

۱۰۔ بحار الانوار، ج ۷۰، ص ۹۸-۹۹، کتاب ایمان و کفر، باب کبر؛ مرآة العقول، ج ۱۰، ص ۱۹۰، کتاب ایمان و کفر، باب کبر، عن انس قال ﴿كان رسولُ الله ﷺ يقولُ الاسلام علانيةٌ و الايمان في القلب قال ثمّ يشيرُ بيده الى صدره ثلاث مرات قال ثمّ يقولُ التقوى ههنا التقوى ههنا﴾ انس کہتے ہیں رسول خداؐ نے فرمایا اسلام ظاہر ہے اور ایمان قلب میں ہے انس کہتے ہیں پھر رسولؐ نے اپنے ہاتھ سے اپنے سینے کی طرف تین مرتبہ اشارہ فرمایا اور کہا تقویٰ یہاں ہے، تقویٰ یہاں ہے۔ مسند ابن حنبل، ج ۳، ص ۱۳۴۔

۱۱۔ عليُّ بن ابراهيم عن ابيه، عن ابن ابي عُمير، عن بعض اصحابه عن ابي عبد الله عليه السلام قال ﴿ما من عبد لا

وفي رأسه حكمة وملك يمسكها، فاذا تكبّر قال له: اتّضع وضعك الله، فلا يزال أعظم الناس في نفسه وأصغر الناس في أعين الناس، وإذا تواضع رفعه الله عزّوجلّ ثمّ قال له: انتعش نعشك الله، فلا يزال أصغر الناس في نفسه وأرفع الناس في أعين الناس﴾۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۱۲، کتاب ایمان وکفر، باب کبر، حدیث ۱۶

۱۲۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۱۱، کتاب ایمان وکفر، باب کبر، حدیث ۱۱۔

۱۳۔ وسائل الشیعہ، ج ۱۱، ص ۳۰۰، ابواب جہاد النفس، باب ۵۸، حدیث ۹۔

۱۴۔ وسائل الشیعہ، ج ۱۱، ص ۳۰۱، ابواب جہاد النفس، باب ۵۸، حدیث ۱۴۔

۱۵۔ وسائل الشیعہ، ج ۱۱، ص ۳۰۷، ابواب جہاد النفس، باب ۶۰، حدیث ۹

۱۶ اصول کافی ج ۲ ص ۳۱۰، کتاب ایمان وکفر، باب کبر، حدیث ۹؛ معانی الاخبار شیخ صدوق ص ۲۴۱، باب معنی کبر، حدیث ۲؛ ثواب الاعمال وعقاب الاعمال، ص ۲۶۴، عقاب المتکبرین، حدیث ۱۔

۱۷۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۰۹، کتاب ایمان وکفر، باب کبر، حدیث ۳؛ ثواب الاعمال وعقاب الاعمال، ص ۲۶۴، عقاب المتکبرین، حدیث ۱۔

۱۸ اصول کافی ج ۲ ص ۳۱۰، کتاب ایمان وکفر، باب کبر، حدیث ۱۰؛ ثواب الاعمال وعقاب الاعمال، ص ۲۶۵، عقاب المتکبرین، حدیث ۷۔

۱۹ ﴿ ولو أنّ ذراعاً من السلسلة التي ذكرها الله تعالى في كتابه وضع على جميع جبال الدنيا لذابت عن حرّها﴾۔ بحار الانوار، ج ۸، ص ۳۰۵، کتاب العدل والمعاد، باب النار، حدیث ۶۴؛
تفسیر برہان ج ۴، ص ۳۷۰، تفسیر آیہ ۳۲ سورہ الحاقہ۔

۲۰۔ بحار، ج ۸، ص ۱۲۷، ۱۴۳، ۱۵۴، ۱۵۵، السفر الرابع (او ثالث)، فصل ۱۱ و ۱۵

۲۱۔ سورہ نحل، آیت ۲۹۔

۲۲۔ تاج العروس، ج ۹، ص ۲۲۹ میں لفظ "مثویٰ" کے ضمن میں "استقامت، اقامت" کے ضمن آیا ہے۔

۲۳۔ سورہ نحل، آیت ۲۳۔

۲۴۔ پورا شعر اس طرح ہے: علم رسمی سر بسر قیل است وقال — نہ از او کیفیتی حاصل نہ حال
کشکول شیخ بہائی، ج ۱، ص ۲۰۹۔

۲۵۔ حکمت کے معنی حد کے مانند ہونے کے ہیں۔ اسفار اربعہ، ج ۱، ص ۲۲۔

۲۶۔ ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ سورہ بقرہ، آیت ۱۲۹۔

۲۷۔ حکمت گمشدہ مومن ہے۔ نہج البلاغہ فیض الاسلام، ص ۱۱۲، حکمت ۷۷۔

۲۸۔ جس کو حکمت دی گئی اس کو خیر کثیر دے دیا گیا۔ سورہ بقرہ، آیت ۲۶۹

۲۹۔ میر محمد باقر بن شمس الدین محمد معروف بہ "میر داماد" (۱۰۴۱ھ ق) اصفہان میں پیدا ہوئے اور نجف اشرف میں دفن

ہوئے۔ مذہب امامیہ کے کم نظیر دانشمند، بہت بڑے فلسفی، جامع معقولات و منقولات تھے۔ فقہ و حدیث کی بعض مشکلات کو حل کرنے میں بے مثال تھے۔ گیارہویں صدی ہجری میں فلسفۂ یونانی کے فروغ، فلسفۂ اشراق کی اہمیت کو اجاگر کرنے اور (میر داماد کے شاگرد) ملا صدرا کی عظمت متعالیہ کیلئے زمین ہموار کرنے کا سہرا آپ ہی کے سر ہے۔ آپ کی تالیفات میں قبسات، تقدیسات، سدرۃ المنتہیٰ، من لا یحضرہ الفقیہ پر حاشیہ ہے۔ شاعری میں آپ تخلص اشراق کرتے تھے۔

۳۰۔ خدا کی گواہی کافی ہے۔ سورۂ نساء، آیت ۱۶۶۔

۳۱ یہ طالب علوم دینی کی فضیلت پر دلالت کرنے والی حدیثوں کی طرف اشارہ ہے۔ ملاحظہ ہو اسی کتاب کی حدیث ۲۹۔

۳۲۔ مصیبت جب عام ہو جاتی ہے تو خوشگوار بن جاتی ہے۔

۳۳۔ قلت لأبي عبد الله علیہ السلام ﴿إني سمعتك وأنت تقول: كلّ شيعتنا في الجنّة على ما كان فيهم قال صدقتك، كلّهم والله في الجنّة قال قلت جعلت فداك إنّ الذّنوب كثيرة كبار فقال أما في القيامة فكلّكم في الجنّة بشفاعة النّبيّ المطاع أو وصيّ النّبيّ، ولكنّي والله أتخوّف عليكم في البرزخ قلت وما البرزخ؟ قال القبر منذ حين موته الى يوم القيامة﴾

راوی کہتا ہے میں نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ فرماتے ہیں ہمارے شیعہ اپنی برائیوں کے باوجود بھی جنت میں جائیں گے؟ فرمایا میں نے تم سے سچ کہا ہے، خدا کی قسم سارے شیعہ جنت میں جائیں گے۔ میں نے کہا میں آپ پر قربان جاؤں گناہ بہت ہیں اور بڑے گناہ بھی ہیں۔ حضرت نے فرمایا جہاں تک قیامت کا مسئلہ ہے نبی کریمؐ یا ان کے وصیؑ کی شفاعت کی بنا پر تم سب جنت میں جاؤ گے، لیکن بخدا میں تمہارے لئے برزخ سے ڈرتا ہوں۔ میں نے عرض کیا برزخ کیا ہے؟ فرمایا قبر ہے، موت سے لے کر قیامت تک۔

فروع کافی، ج ۳، ص ۲۴۲، کتاب جنائز، باب ما یلحق بہ موضع القبر، حدیث ۳۔

۳۴ فتوحات مکیہ، ج ا، فصل ا، باب ۹۱

۳۵ متعدد روایات میں رسول خداؐ کی بے تکلفی اور اخلاق کے بارے میں ذکر ہوا ہے ان میں سے کچھ اس کتاب میں بھی ہے: عن أنس بن مالك، قال ﴿لم يكن شخص أحبّ إليهم من رسول الله ؐ وكانوا إذا رأوه لم يقوموا إليه لما يعرفون من كراهيته﴾

عن ابن عباس قال ﴿كان رسول الله ؐ يجلس على الأرض ويأكل على الأرض ويعتقل الشاة ويجيب دعوة المملوك ويقول ؐ إنّما أنا عبد آكل كما يأكل العبد وأجلس كما يجلس العبد﴾۔

کتاب مکارم الاخلاق، ص ۱۶، فصل ۲۔

۳۶ و ۳۷۔ ﴿وكان يجلس على الأرض وينام عليها ويأكل عليها وكان يخصف النعل ويرقع الثوب ويفتح الباب ويحلب الشاة ويعقل البعير فيحلبه، ويطحن مع الخادم إذا أعيى ويحمل في مهنة أهله ويقطع اللحم، وإذا جلس على الطعام جلس محقراً يركب ما أمكنه من فرس أو بغلة أو حمار ويركب الحمار بلا

سراج وعليه العز يحب الفقراء ويؤاكل المساكين ويناولهم بيده».

بحار الانوار، ج ۱۶، ص ۲۳۶، تاریخ نبینا، باب مکارم اخلاق، حدیث ۳۳۔

۳۸۔ کشف الغمہ فی معرفۃ الائمہ، ج ۱، ص ۱۶۱، ۲۰۷، فی وصف زہدہ فی الدنیا۔

۳۹۔ آیت اللہ العظمیٰ حاج شیخ عبد الکریم حائری یزدی (۱۲۷۶ھ–۱۳۵۵ھ ق) چودہویں صدی ہجری میں شیعوں کے مراجع تقلید میں سے تھے۔ مقدمات تک پڑھنے کے بعد نجف اشرف و سامرہ کا سفر کیا۔ وہاں مرزائے بزرگ شیرازی، میرزا محمد تقی شیرازی، آخوند خراسانی، سید کاظم یزدی اور سید محمد اصفہانی فشارکی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ سن ۱۳۳۲ھ ق میں اراک واپس آئے اور ۱۳۴۰ھ ق میں قم تشریف لائے۔ وہاں کے بزرگوں کے اصرار اور استخارے کی بنا پر وہیں قیام پذیر ہو گئے اور حوزۂ علمیہ قم کی بنیاد ڈالی۔ آپ کے درس میں بڑے بڑے علما تشریف لاتے تھے۔ خود امام خمینیؒ بھی ان میں سرفہرست تھے۔ آپ کی تالیفات میں "درر الفوائد" (اصول فقہ میں)، الصلاۃ، النکاح، الرضاع، المواریث (فقہ میں) وغیرہ ہیں۔

۴۰۔ چنانچہ حدیث نبویؐ میں ہے: «الصراط ادق من الشعر واحد من السيف واظلم من الليل»۔

علم الیقین، ج ۲، ص ۹۶۹، (المقصد الرابع فی معنی الصراط)۔ یہی مطلب امام جعفر صادقؑ کی روایت میں بھی ہے

امالی صدوقؒ، ص ۱۷۷، مجلس ۳۳، حدیث ۲۔ نیز بحار الانوار، ج ۸، ص ۶۵، کتاب العدل والمعاد، باب ۲۲، حدیث ۲۔

۴۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۵۔

۴۲۔ حدیث ۲، حاشیہ ۵۔

۴۳۔ سورۂ اعراف، آیت ۱۲، سورۂ ص، آیت ۷۶۔

۴۴۔ متن حدیث (اصل کتاب سے کچھ اضافے کے ساتھ) یہ ہے:

عن ابي عبد الله عليه السلام، قال: «سمعته يقول: الكبر قد يكون في شرار الناس من كل جنس، والكبر رداء الله، فمن نازع الله عزوجل رداءه لم يزده الله الا سفالا، ان رسول الله صلى الله عليه وآله مر في بعض طرق المدينة وسوداء تلقط السرقين، فقيل لها: تنحي عن طريق رسول الله، فقالت: ان الطريق لمعرض، فهم بها بعض القوم ان يتناولها، فقال رسول الله صلى الله عليه وآله: دعوها فانها جبارة».

اصول کافی، ج ۲، ص ۳۰۹، کتاب ایمان و کفر، باب کبر، حدیث ۴۔

پانچویں حدیث

بالسند المتّصل الی محمّد بن یعقوب، عن علیّ بن ابراهیم، عن محمّد بن عیسی، عن یونس، عن داود الرّقّی، عن ابی عبد الله علیہ السلام قال

قال رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال اللّٰہ عزّوجلّ لموسی بن عمران

﴿یا ابن عمران لا تحسدنّ النّاس علی ما اٰتیتُهم من فضلی ولا تمدّنّ عینیک الی ذلک ولا تتبعه نفسک فانّ الحاسد ساخطٌ لنعمی صادٌّ لقسمی الّذی قسمتُ بین عبادی ومن یک کذلک فلستُ منه ولیس منّی﴾

ترجمہ داود نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ حضرت نے فرمایا رسول خداؐ نے ارشاد فرمایا کہ: خداوند عالم نے جناب موسیٰ بن عمرانؑ سے کہا اے عمران کے بیٹے! میں نے لوگوں پر جو اپنا فضل کیا ہے اس پر کسی سے حسد نہ کرنا اور نہ اپنی آنکھوں سے ان چیزوں کو نہ دیکھنا اور نہ اپنے نفس کو اس کے پیچھے لگا دینا، کیونکہ حسد کرنے والا میری نعمتوں پر غضب ناک ہے اور جو کچھ میں نے اپنے بندوں کو تقسیم کیا ہے۔ اس سے روگردانی کرنے والا ہے اور جو ایسا ہے میں اس سے نہیں ہوں اور نہ وہ مجھ سے ہے۔

شرح حسد، اس نفسانی حالت کو کہتے ہیں جس کی بنا پر حاسد دوسروں کے کمال کے چھن جانے اور خیالی نعمت کے سلب ہو جانے کی تمنا کرتا ہے، خواہ خود اس کے اندر وہ نعمت ہو یا نہ ہو اور (زوال کے بعد) چاہے وہ نعمت اس کو ملے یا نہ ملے۔ حسد غبطہ سے جدا چیز ہے۔

غبطہ کا مطلب یہ ہے کہ غبطہ کرنے والا چاہتا ہے کہ وہ خیالی نعمت جو دوسرے کے پاس ہے اس کو بھی حاصل ہو جائے اور وہ اس شخص کی نعمت چھن جانے کی آرزو نہیں کرتا۔ میں نے خیالی نعمت وکمال کی قید اس لئے لگائی ہے کہ حاسد جس چیز کے زوال کی تمنا کرتا ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ واقعی کمال یا نعمت ہو، کیونکہ بسا اوقات بہت سی چیزیں بالذات نقائص اور برائیوں میں سے ہوتی ہیں لیکن حاسد ان کے زوال کی تمنا اس لئے کرتا ہے کہ اس کی نظر میں وہ کمال ہیں یا کوئی چیز انسانی نقائص اور حیوانی کمالات سے ہوتی ہے اور حاسد پر چونکہ حیوانیت غالب ہے اس لئے اس کو کمال سمجھتا اور اس کے زوال کی تمنا کرتا ہے۔ مثلاً بعض لوگ قتل وخونریزی کو ہنر سمجھتے ہیں اور جب کسی کو اس میں ماہر دیکھتے ہیں تو اس سے حسد کرنے لگتے ہیں جیسے بعض لوگ بیہودہ گوئی اور فحش کلامی کو کمال سمجھتے ہیں اور جس میں یہ ہنر دیکھتے ہیں اس سے حسد کرنے لگتے ہیں۔ پس معیار خیالی کمال اور خیالی نعمت ہے، خود کمال ونعمت معیار نہیں۔ مختصر یہ ہے کہ جو شخص دوسرے کے اندر کسی نعمت کو دیکھ کر تمنائے زوال کرے وہ حاسد ہے، چاہے وہ شے واقعی نعمت ہو یا نہ ہو۔

اقسام حسد

جان لو کہ حسد کی کئی قسمیں اور درجے ہیں حسد کئے جانے والے کے اعتبار سے، حاسد کے اعتبار سے اور خود حسد کے اعتبار سے۔

حسد کی چند قسمیں ہیں اور چند درجے ہیں

محسود کے اعتبار سے کبھی تو کمالات عقلیہ پر، کبھی اس کے صفات حمیدہ پر، کبھی اس کے مناسک واعمال صالحہ کی بنا پر حسد کیا جاتا ہے، اور کبھی خارجی امور، مثلاً مال ومنال، جاہ وحشم وغیرہ کی بنا پر محسود سے حسد کیا جاتا ہے یہ مذکورہ چیزوں کے مقابل جو چیزیں ہیں ان کی بنا پر حسد کیا جاتا ہے، جبکہ کمال صرف خیالی ہوتا ہے۔

حاسد کے اعتبار سے (حسد کی صورت یہ ہے کہ) کبھی تو حاسد عداوت کی بنا پر، کبھی تکبر کی بنا پر، کبھی خوف کی بنا پر اور کبھی ان دیگر اسباب کی بنا پر حسد کرتا ہے جن کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔

البتہ خود حسد کے اعتبار سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ حسد کے حقیقی درجات (اور حسد کی حقیقی) قسمیں یہ ہیں وہ پہلی والی دونوں قسمیں نہیں ہیں۔

پس شدت وضعف کے اعتبار سے حسد کے بہت سے مرتبے ہیں جو اسباب کے اختلاف کی وجہ سے

مختلف ہوتے رہتے ہیں۔ہم انشاء اللہ اپنی طاقت کے مطابق چند فصلوں میں حسد کی برائیوں اور اس کے علاج کے بارے میں بیان کریں گے۔ ﴿ومن اللہ التوفیق﴾۔

پہلی فصل۔ حسد کے بعض اسباب کا ذکر

یوں تو حسد کے بہت سے اسباب ہیں۔لیکن سب سے اہم سبب اپنے نفس کی ذلت وگراوٹ کا احساس کرنا ہے۔ جیسے تکبر اپنی جگہ اس کے برخلاف ہوتا ہے۔اگر انسان نے اپنے اندر ایک کمال محسوس کیا اور دوسرے کو اس سے محروم سمجھا تو خود بخود اس کے نفس میں ایک قسم کی عزت، برتری و سرکشی پیدا ہوجاتی ہے اور وہ انسان تکبر کرنے لگتا ہے۔اگر دوسرے کے اندر کمال کا احساس کیا (اور اپنے کو محروم سمجھا) تو اس کے اندر ایک ذلت وانکساری کی حالت پیدا ہوجاتی ہے جس میں اگر خارجی عوامل اور نفسانی مصلحتوں کا دخل نہ ہو تو اس کے اندر حسد پیدا ہوجاتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوسرے شخص کے مقابلہ میں کسی کو اپنی کمتری کا احساس ہوتا ہے ایسی صورت میں صاحب نعمت وکمال پر یا کسی دوسرے یا اپنے سے زیادہ کمتر فرد سے حسد کرنے لگتا ہے۔اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے نفس کی کمتری اور تنگ دلی کا (دوسرا) نام حسد ہے۔ جس کی بنا پر انسان دوسرے کی کسی بھی خوبی یا کمال کے زوال کی تمنا کرتا ہے۔ چنانچہ علامہ مجلسی (قدس سرہ) نے نقل فرماتے ہیں کہ (علما نے) حسد کے اسباب کو سات چیزوں میں منحصر قرار دیا ہے۔

اول: عداوت۔

دوئم: احساس عزت وبرتری اس کا مطلب یہ ہے کہ (حاسد یہ خیال کرتا ہے کہ) محسود کے اندر جو کمال ہے یا اس کو جو نعمت حاصل ہے اس نعمت کی وجہ سے وہ حاسد پر تکبر کررہا ہے اور (چونکہ) حاسد میں محسود کے تکبر اور فخر ومباہات کے جواب کی طاقت نہیں ہے اس لئے وہ اس سے زوال نعمت کی تمنا کرتا ہے۔

سوئم: کبر: اس کی صورت یہ ہے کہ حاسد صاحب نعمت پر تکبر کرنا چاہتا ہے مگر جب محسود سے زوال نعمت نہ ہوجائے یہ بات ممکن نہیں ہے (لہذا حاسد محسود سے زوال نعمت کی تمنا کرتا ہے)۔

چہارم: تعجب محسود کی عظیم نعمت پر حاسد کو تعجب ہوتا ہے کہ یہ بڑی نعمت اس شخص کو (کیونکر) حاصل ہوا، جیسے کہ سابق امتوں کی خبر دیتے ہوئے خداوند کا ارشاد ہے ﴿ما انتم الا بشر مثلنا﴾ اسی طرح ان امتوں نے کہا ﴿انؤمن لبشرین مثلنا﴾ یعنی ان کو تعجب ہوا کہ جو شخص ہمارے ہی جیسا ہے وہ مرتبہ

وحی ورسالت پر کیسے فائز ہوگیا؟ اس لئے حسد کرنے لگے۔

پنجم خوف، حاسد اس بات سے ڈرتا ہے کہ کہیں صاحب نعمت اپنی نعمت کی بنا پر اس کے پسندیدہ مقاصد کے راستہ میں حائل نہ ہو جائے اسی لئے وہ حسد کرنے لگتا ہے۔

ششم اقتدار کا لالچ: یہ اس وقت ہوتا ہے جب کسی کا اقتدار اس بات پر موقوف ہو جائے کہ کوئی بھی دوسرا شخص اس کے برابر نہ ہو۔

ہفتم بدطینتی یعنی کوئی ایسا بد باطن ہو کہ وہ کسی کی نعمت کو دیکھ ہی نہ سکتا ہو۔ انتہیٰ کلام المجلسیؒ۔[۵]

اور میں (مصنف) ان میں سے اکثر کی بلکہ سب ہی کی بازگشت احساس ذلت نفس واحساس کمتری کی طرف ہے۔ جیسا کہ اشارہ بھی کیا جا چکا ہے اور مشہور علما نے حسد کی جو تعریف کی ہے حسد کی بلاواسطہ وجہ بھی یہی ہے۔ لیکن ہم نے حسد کے بارے میں جو یہ بات کہی ہے کہ خود یہ حالت حسد ہے یہ بات بھی مذکورہ بالا چیزوں کے مخالف نہیں ہے۔ بہرحال ان معانی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں بحث کرنا ہمارا مقصد نہیں اور نہ ہی ان صفحات میں یہ مطمح نظر ہے۔

دوسری فصل: حسد کے کچھ مفاسد

جان لو کہ حسد خود دل کے مہلک امراض میں سے ہے اور اسی حسد سے بہت سے ایسے قلبی امراض اور ایسے برے اعمال پیدا ہوتے ہیں جن میں سے ہر ایک مہلک ہونے کے ساتھ ساتھ انسان کی ہلاکت کا ایک علیحدہ سبب بن سکتا ہے، جیسے کبر وغیرہ۔ ان میں سے ہم صرف انہیں کا ذکر کریں گے جو بہت ہی واضح ہیں اور یقیناً اس کے اور بہت برے نتائج بھی ہیں جو مجھ جیسے لکھنے والے سے پوشیدہ ہیں۔

حسد کی اپنی برائیاں حد سے زیادہ ہیں، چنانچہ صادق مصدّق نے خبر دی ہے۔ معاویہ بن وہب کی صحیح حدیث میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ﴿آفَةُ الدِّينِ الْحَسَدُ وَالْعُجْبُ وَالْفَخْرُ﴾[۱] "حسد، عجب (خود پسندی) اور تکبر، دین کیلئے آفت ہیں" اور محمد بن مسلم کی صحیح حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے: ﴿إِنَّ الرَّجُلَ لَيَأْتِي بِأَيِّ بَادِرَةٍ فَيَكْفُرُ، وَإِنَّ الْحَسَدَ لَيَأْكُلُ الْإِيمَانَ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ﴾[۲] "اگر کسی شخص سے غصے میں کوئی زبانی یا عملی لغزش ہو جائے تو وہ بخش دی جاتی ہے اور حسد ایمان کو اسی طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا لیتی ہے"۔

یہ بات سب ہی کو معلوم ہے کہ ایمان وہ نورِ خداوندی ہے جس کے فیض سے انسانی دل خدا کی تجلیات کا جلوہ گاہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث قدسی میں ارشاد ہے: ﴿لا یَسَعُنِي أرْضِي ولا سَمَائِي بَلْ یَسَعُنِي قَلْبُ عَبْدِي المُؤمن﴾ ؎ ''میں زمین وآسمان میں تو نہیں سما سکتا، ہاں! اپنے بندۂ مؤمن کے دل میں، سما سکتا ہوں''۔

یہ نورِ معنوی، یہ خدائی روشنی جو قلب کو تمام موجودات سے وسیع تر قرار دیتا ہے اس قلب کی تنگی وتاریکی کے منافی ہے جو دل میں اس خبیث صفت کی کدورتوں سے پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ خبیث اور بری صفت اس حد تک دل کو مرجھا دیتی ہے اور اس کو تنگ کر دیتی ہے جس کے اثرات، انسان کے ظاہر وباطن دونوں میں مرتب ہوتے ہیں، اس سے دل مردہ وافسردہ ہو جاتا، سینہ تنگ اور محزون ہو جاتا اور چہرہ بگڑ جاتا ہے اور آدمی کی پیشانی پر بل پڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ حالت نورِ ایمان کو کمزور کر دیتی ہے، دل کو مردہ کر دیتی ہے، وراں حالت میں جتنی قوت پیدا ہوتی ہے اتنا ہی نورِ ایمان ضعیف ہو جاتا ہے۔

مؤمن کے معنوی وصوری اوصاف، ظاہر وباطن میں حسد سے پیدا ہو جانے والے اثرات سے منافات رکھتے ہیں۔ مؤمن خدا کے بارے میں خوش بین ہوتا ہے اور خدا کی اس تقسیم پر جو اس نے اپنے بندوں کے درمیان فرمائی ہے، راضی رہتا ہے۔ (مگر) حاسد خدا پر غضب ناک ہوتا اور تقدیرات الٰہی سے روگرداں ہوتا ہے۔ جیسا کہ خود حدیث شریف میں آیا ہے مؤمن دوسرے مؤمنوں کی برائی نہیں چاہتا اور ان کو عزیز رکھتا ہے۔ (لیکن) حاسد اس کے برخلاف ہوتا ہے۔ مؤمن پر کبھی حب دنیا کا غلبہ نہیں ہوتا۔ لیکن حاسد حب دنیا کی شدت کی وجہ سے اس بری صفت میں گرفتار ہوتا ہے۔ مؤمن کو خدا کے علاوہ کسی سے خوف نہیں ہوتا، مگر حاسد کا حزن وخوف محسود ہی کے اردگرد گھومتا رہتا ہے۔ مؤمن خندہ پیشانی رکھتا ہے، اس کے چہرے سے اس کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ لیکن حاسد کی پیشانی پر ہمیشہ بل پڑا رہتا ہے۔ مؤمن متواضع ہوتا ہے اور حاسد زیادہ تر تکبر کرتا ہے۔

پس حسد ایمان کیلئے آفت ہے، وہ ایمان کو اسی طرح جلا دیتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو جلا دیتی ہے۔ حسد کی برائی کیلئے یہی بات کافی ہے کہ ایمان جو نجات آخرت کا سرمایہ اور دلوں کی زندگی ہے اسی کو انسان سے چھین لیتا اور انسان کو بے چارہ ومفلس بنا دیتا ہے۔ اسی طرح حسد کی ان برائیوں میں سے ایک جو حسد سے کبھی جدا ہی نہیں ہوتی وہ ولی نعمت وخالق کائنات پر غضب ناک ہوتا اور اس کی تقدیرات سے

روگردانی کرتا ہے۔

مادی دنیا کی حجاب اندر حجاب تاریکیوں اور اس کے مفادات کے حصول میں ہمارے انہماک نے ہمارے تمام حواس پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ ہماری آنکھوں کو اندھا اور کانوں کو بہرا بنا دیا ہے۔ نہ ہم یہ سمجھ پاتے ہیں کہ ہم مالک الملوک پر غضب ناک اور اس کی تقدیر سے ناخوش ہیں اور نہ ہم کو یہ معلوم ہے کہ اس غصے اور بدگمانی کی سزا کے طور پر ملکوت اور دائمی مسکن میں (مسخ ہوکر) ہماری اصلی صورت کیا ہوگی؟ بس امام جعفر صادق علیہ السلام کی یہ آواز ہمارے کانوں تک پہنچی ہے کہ ﴿وَمَن يَكُ كَذٰلِكَ فَلَسْتُ مِنْهُ وَلَيْسَ مِنِّي﴾ ''جو انسان ایسا ہے نہ میں اس سے ہوں اور نہ وہ مجھ سے ہے''۔ یعنی جو مجھ سے روگرداں اور ناراض ہے نہ میں اس سے ہوں نہ وہ مجھ سے ہے۔ ہم کو نہیں معلوم پروردگار کی ہم سے نفرت اور اس کی بیزاری کیسی مصیبت ہے اور اس کے اندر کیا کیا بلائیں ہیں؟ جو شخص بھی ولایت حق سے خارج ہوگیا اور اس کو ارحم الراحمین کے پرچم رحمت کے نیچے سے الگ کردیا گیا پھر اس کیلئے نجات کی کوئی بھی امید باقی نہیں ہے۔ شفاعت کرنے والوں کی شفاعت اس کو نصیب نہیں ہوگی۔ ﴿مَن ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِندَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ﴾[۹] بھلا جو شخص خدا پر غضبناک ہے اور اس کی ولایت کے تحفظ سے خارج ہے، اس کے اور اس کے مالک کے درمیان رشتہ محبت منقطع ہے، اس کی کون شفاعت کرسکتا ہے؟ ہم خود اپنے اوپر جو مصیبت لائے ہیں اور انبیاءؑ واولیاء کے پکارنے اور خواب غفلت سے بیدار کرنے کے باوجود ہماری غفلت روز بروز بڑھتی گئی اور ہماری بدبختی زیادہ ہوتی گئی اس پر حسرت وافسوس ہے۔

علمائے آخرت کی فرمائش کے مطابق حسد کی برائیوں میں سے فشار قبر اور تاریکی قبر بھی ہے، کیونکہ وہ حضرات فرماتے ہیں۔ اس بری اور مردود اخلاقی صفت کی برزخی اور قبری صورت جو روحانی دباؤ اور قلبی کدورت کی حامل ہے قبر کا دباؤ اور اس کی تاریکی ہے۔ قبر کی تنگی اور وسعت سینے کی کشادگی اور تنگی پر موقوف ہوا کرتی ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ ''رسول خداؐ سعدؓ کی تشییع جنازے میں شریک ہوئے جبکہ ۷۰ ہزار فرشتے سعدؓ کے جنازے کی مشایعت کررہے تھے، رسول خداؐ نے اپنے سر کو آسمان کی طرف بلند کیا اس کے بعد فرمایا کیا سعد جیسا آدمی بھی فشار قبر کا شکار ہوسکتا ہے؟'' راوی نے امامؑ سے کہا: ''قربان جاؤں! ہم کو بتایا گیا ہے کہ سعد پیشاب کرتے وقت طہارت کا خیال نہیں رکھتے تھے؟'' امامؑ نے

فرمایا "معاذ اللہ! سعد کے اندر صرف ایک برائی تھی کہ اپنے اہل خانہ سے درشتی اور بد خلقی سے پیش آیا کرتے تھے"۔ انتہی ملخصا

حسد کی وجہ سے دل کے اندر جو تنگی، تاریکی اور کدورت و فشار ہوا کرتا ہے وہ دیگر اخلاقی برائیوں میں کم ہوتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ حاسد دنیا میں بھی عذاب میں مبتلا رہتا ہے اور قبر میں بھی دباؤ و تاریکی میں گھرا رہتا ہے نیز آخرت میں بھی وہ مبتلا و بے چارہ ہوتا ہے۔ یہ تو خود حسد کے برے نتائج ہیں، بشرطیکہ اس سے کوئی اور بری اخلاقی صفت یا باطل عمل پیدا نہ ہو، ویسے بہت کم اتفاق ہوتا ہے کہ حسد سے دوسری برائیاں پیدا نہ ہوں، بلکہ حسد سے اخلاقی اور اعمالی برائیاں (بہت زیادہ) پیدا ہوتی ہیں، جیسے بعض مواقع پر تکبر (جیسا کہ گزر گیا) غیبت، چغلخوری، فحش، ایذا رسانی وغیرہ کہ ان میں سے ہر ایک باعث عذاب اور مہلک ہے۔

اس لئے ہر عقلمند پر لازم ہے کہ کمر ہمت باندھ کر اپنے کو اس ننگ و عار سے اور اپنے ایمان کو اس بھڑکتی آگ اور سخت مصیبت سے نجات دے اور اپنے کو اس فکری دباؤ، تنگی قلب سے اسی دنیا میں جو زندگی بھر ایک مستقل اور دائمی عذاب ہے۔ نجات دے اور تاریکی قبر، فشار قبر، نیز عالم برزخ کے دباؤ اور خداوند عالم کے غیظ و غضب سے رہائی حاصل کرے، اتنا تو سوچے کہ جس چیز کے اندر اتنی برائیاں ہوں وہ بہر حال لازم العلاج ہے اس کے علاوہ تمہارے حسد سے محسود کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، نہ اس کی نعمت زائل ہوگی۔ اس کے برخلاف محسود کیلئے دنیوی اور اخروی منفعت ہے۔ اس لئے کہ تم مبتلا ہو اور اس سے حسد کرتے اور دشمنی کا ظہار کرتے ہو اور تمہارا غم اور عذاب میں مبتلا ہونا خود اس کیلئے ایک نعمت ہے، کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ خود تو نعمت سے مالا مال ہے اور تم اس کی نعمتوں سے مبتلائے عذاب ہو۔ تمہارا غم اور عذاب میں مبتلا ہونا یہ خود اس کیلئے نعمت ہے۔ اگر تم کو اس دوسری نعمت کا احساس ہو اور تم اس پر متنبہ ہو تو یہ تمہارے لئے ایک اور عذاب اور فشار کا باعث ہوگا اور محسود کیلئے یہ تمہارا عذاب و فشار باعث نعمت ہوگا۔ اس طرح یہ سلسلہ بڑھتا جائے گا اور تم ہمیشہ رنج و غم اور دباؤ کا شکار رہو گے اور وہ (ہمیشہ) نعمت و خوشی اور مسرت میں رہے گا، پھر آخرت میں بھی تمہارا حسد اس کیلئے نفع بخش ہوگا۔ خصوصا اس وقت جبکہ حسد کے ساتھ تم نے اس پر تہمت لگائی ہو، غیبت کی ہو یا دیگر ایذاء پہنچانے والے اقدامات کئے ہوں تو تمہاری نیکیاں اس کو دیدی جائیں گی اور تم تہی دست و مفلس و بے چارہ ہو کے رہ جاؤ گے اور وہ نعمتوں اور عظمتوں کا مالک ہو جائے گا۔

البتہ اگر ان امور میں تھوڑا سا غور و فکر کرو تو اپنے کو اس بری صفت سے پاک کر سکو گے اور نفس کو بھی اس

ہلاکت سے نجات دلاسکو گے۔ (البتہ یہ بھی) گمان نہ کرنا کہ نفسانی، اخلاقی اور روحانی برائیوں کا دور کرنا ممکن ہی نہیں ہے، (کیونکہ) یہ سب وہ خام خیالی ہے کہ شیطان اور نفس امارہ نے تمہارے کان میں پھونک دی ہے اور اس سے اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ تم کو نجات آخرت اور اصلاح نفس کے راستہ پر چلنے سے روک دے۔ انسان جب تک اس تغیر پذیر اور لحہ بہ لحہ بدلتی دنیا میں رہتا ہے اس کیلئے (یہ بھی) ممکن ہے کہ تمام اوصاف واخلاق کو بدل دے اور ملکات چاہے جتنے بھی مستحکم ہوں جب تک اس دنیا میں ہیں قابل تغیر وتبدیل ہیں۔ ہاں ایہ ضرور ہے کہ شدت وضعف کے اعتبار سے ان کے تصفیہ کی زحمت میں فرق ہوگا۔

ہاں! اگر نفس میں شروع میں کوئی صفت پیدا ہو جائے تو تھوڑی سی زحمت وریاضت سے اس کو زائل کیا جاسکتا ہے، جیسے اس نئے پودے کو آسانی سے اکھاڑا جاسکتا ہے جس کی جڑیں زیادہ نہ پھیلی ہوں اور زمین میں گہرائی تک نہ گئی ہوں۔ لیکن اگر وہ صفت نفس میں جڑ پکڑ چکی ہے اور یک مستقل نفسانی صفات میں بدل گئی ہو تب بھی اس کا زوال ممکن تو ہے لیکن اس کے زائل کرنے میں کافی زیادہ زحمت کرنی ہوگی۔ (جیسے) جو درخت بہت پرانا ہو چکا ہو اور اس کی جڑیں مضبوط ہو چکی ہوں اس کا اکھاڑنا مشکل ہے۔ اس لئے تم قلب وروح کی برائیوں کو جڑوں سے اکھاڑنے میں جتنی دیر کرو گے۔ اتنی ہی زیادہ زحمت وریاضت کرنی پڑے گی۔

(لہذا) اے عزیز! پہلے تو اپنی مملکت ظاہر وباطن میں عملی یا اخلاقی برائیاں پیدا ہی نہ ہونے دو، کیونکہ ایسا کرنا بہت آسان ہے، لیکن آنے کے بعد اور پھلنے پھولنے کے بعد ان کو نکال باہر کرنا مشکل ہوگا۔ جس طرح دشمن کو ملک کی سرحدوں یا قلعے کے اندر داخل ہونے سے روکنا آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ داخل ہو کر قلعے یا چوکیوں پر قبضہ کرنے کے بعد اس کو نکال باہر کرنے کیلئے جدوجہد کریں لیکن وہ (برائیں) اگر داخل ہو گئیں تو نکالنے میں جتنی دیر کرو گے تنی ہی زحمت زیادہ ہوگی، (کیونکہ) انسان کی اندرونی صلاحتیں اور قوتیں (روز بروز) کم ہوتی جاتی ہیں۔

ہمارے شیخ جلیل اور عارف بزرگوار آقائے شاہ آبادی (روحی فداہ)!!! نے فرمایا ہے جب تک جوانی کی طاقتیں اور ان کا نشاط باقی ہے اخلاقی برائیوں کے خلاف تم بہتر طریقے سے جہاد کر سکتے اور انسانی فرائض کو بڑی عمدگی سے ادا کر سکتے ہو۔ ان طاقتوں کو ضائع نہ ہونے دو کہ بڑھاپا آجائے، کیونکہ بڑھاپے میں ان کو دور کرنے کی توفیق ملنا مشکل ہے اور اگر توفیق مل بھی گئی تو اصلاح کرنے میں بڑی زحمت ہوگی۔

لہذا عقلمند اگر کسی چیز کی برائی کے بارے میں سوچ بچار کرے تو اگر اس برائی میں ابھی داخل نہیں ہو ہے اس کے کنارے بھی نہیں پھٹکے گا اور نہ اپنے کو اس میں آلودہ کرے گا اور اگر خدانخواستہ اس میں پھنس ہی گیا تو جلد از جلد اس کی اصلاح کرے گا اور اس برائی کو جڑ پکڑنے سے پہلے ختم کردے گا اور اگر خدانخواستہ اس نے جڑ پکڑلی ہے تو ہزاروں زحمتوں و مشقتوں سے اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے گا تا کہ وہ اپنے ثمرہ برزخی و آخرتی کو نہ پہنچ جائے اور باقاعدہ پھل پھول نہ جائے، کیونکہ اگر وہ ایسی اخلاقی برائی کے ساتھ اس دنیا سے جو مادی تغیرات اور حیوانی تبدیلیوں کی دنیا ہے، منتقل ہو گیا تو پھر وہاں اس برائی کا قلع قمع کرنا اس کے بس سے باہر کی بات ہوگی اور پھر برزخ یا آخرت میں کسی نفسانی خلق کی تبدیلی ایک سخت اور قابل صد افسوس معاملہ ہے۔

حضرت رسول خدا ؐ نے فرمایا ''اہل جنت، جنت میں اور اہل دوزخ، دوزخ میں اپنی نیتوں کی بنا پر ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے''۔[۱۲] اور بری نیت کا جو برے اخلاق سے پیدا ہوتی ہے اس وقت تک زائل ہونا ناممکن ہے جب تک اس کا سرچشمہ زائل نہ ہو جائے۔

عالم (آخرت) میں ملکات کا ظہور اتنی شدت و قوت سے ہوتا ہے کہ اگر انسان ہمیشہ جہنم میں ہے، اس کا زائل ہونا محال ہو جاتا ہے اور اگر دباؤ، سختیوں اور آگ کی وجہ سے زائل بھی ہو جائے تو شاید زواں کیسے کئی ربوبی (خدائی) صدیوں کی ضرورت ہوگی۔

لہذا اے عاقل! جس چیز کی اصلاح دنیا میں ایک ماہ یا ایک سال کی تھوڑی سی محنت سے ہوسکتی ہے، اور وہ تمہارے اختیار میں بھی ہے اور اس کی وجہ سے دنیا و آخرت کی گرفتاریوں سے نجات بھی پا سکتے ہو تو اس کو اس کی حالت پر نہ چھوڑو (بلکہ اس کی اصلاح کرو) ورنہ وہ تجھے ہلاک کردے گی۔

تیسری فصل۔ اخلاقی برائیوں کی جڑ

اس سے پہلے ذکر کیا جا چکا[۱۳] ہے کہ ایمان جو قلب کی مذت ہے وہ علم کے علاوہ ہے، کیونکہ علم عقل کی مذت ہے۔ تمام اعمالی و اخلاقی برائیوں کا سبب یہ ہے کہ قلب ایمان سے بے خبر ہے اور عقل نے برہان عقلی یا اخبار انبیاء ؑ کے واسطے سے جن چیزوں کا ادراک کیا تھا ان کو قلب تک نہیں پہنچایا اور دل ان چیزوں سے غافل رہا۔

معارف میں سے ایک وہ چیز جس کی حکیم، متکلم، عوام اور اہل شرائع (سب ہی) تصدیق کرتے ہیں اور واقعی اس میں کسی کیلئے کوئی شبہ بھی نہیں ہے، وہ یہ ہے کہ حکیم علی الاطلاق، خداوند عالم کی جنبش قلم سے جو بھی چیز ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً وجود اور اس کے کمالات، وسعت نعمت، رزق و روزی کی تقسیم (وغیرہ) وہ سب بہترین منصوبہ اور خوبصورت ترین نظام کے تحت ہے اور تمام تقاضوں کو پورا کرنے والے جس مکمل اور جامع نظام کا تصور کیا جا سکتا ہے، اس کے مطابق ہے۔ صرف اتنی بات ہے کہ ہر گروہ اپنی مخصوص زبان اور اپنے فن کی مخصوص اصطلاح میں اس مکمل حکمت اور خدائی مہربانی کو بیان کرتا ہے۔

عارف باللہ کہتا ہے "یہ دنیا مطلق جمیل وحسین خدا کی معلق اور خوبصورت ترین پرچھائیں ہے"۔ حکیم کہتا ہے۔ "یہ نظام علمی نظام کے عین مطابق ہے جو ہر قسم کے نقص وعیب وشر سے خالی ہے اور جزئی قسم کے شرکا جو گمان ہوتا ہے، وہ مخلوقات کو ان کے کمالات لائقہ تک پہنچانے کیلئے ہے"۔[۱۴] متکلم و عالم شریعت کہتا ہے۔ "حکیم کے تمام افعال حکمت و مصلحت پر مبنی ہوتے ہیں اور انسانی جزئی ومحدود عقول ان مخفی مصلحتوں کے ادراک سے، جو تقدیرات الٰہی میں جاری ہیں، عاجز ہیں"۔[۱۵] یہ بات سب ہی کی زبان پر جاری ہے اور ہر شخص نے اپنے علم و عقل کی وسعت کے مطابق، اس پر دلیلیں قائم کی ہیں۔ مگر چونکہ صرف قیل وقال کی حد تک محدود ہے اور حال و قلب کے مرتبہ تک نہیں پہنچا، لہذا اعتراض کی زبانیں کھلی ہیں اور جس شخص کے پاس بھی لذت ایمان نہیں ہے وہ خود ہی اپنے قول و برہان کو جھٹلا دیتا ہے۔ تمام اخلاقی برائیوں کی جڑ بھی (فکر و نظر کی کوتاہی) ہے۔

جو شخص حسد کرتا ہے اور دوسرے کی نعمت کے زوال کی تمنا کرتا ہے اور صاحب نعمت کے بارے میں اپنے دل میں کینہ رکھتا ہے، اس کو خود ہی معلوم ہے کہ وہ (واقعی) اس بات پر ایمان نہیں رکھتا کہ خداوند عالم نے مکمل مصلحت کے اعتبار ہی سے یہ نعمت اس شخص کو بخشی ہے۔ مگر ہم اس کو نہیں سمجھ سکتے اور اس کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس کو عدل الٰہی اور عادلانہ تقسیم الٰہی پر ایمان نہیں ہے۔ اسے (حاسد) تو اصول عقائد میں تو کہتا ہے "خدا عادل ہے"۔ مگر یہ صرف زبانی دعویٰ ہے۔ عدل الٰہی پر ایمان حسد کے منافی ہے۔ تو اگر اس کو عادل مانتا ہے تو اس کے منصفانہ ہونے کو بھی تسلیم کر۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے، خداوند عالم کا ارشاد ہے۔ میں نے اپنے بندوں میں جو تقسیم کی ہے حاسد اس سے منحرف ہے اور میری نعمتوں (کی تقسیم) پر غضب ناک ہے۔

دں فطری طور سے منصفانہ تقسیم کے سامنے سر جھکانے پر تیار، ظلم و جور سے گریزاں اور متنفر رہتا ہے۔
فطرت الٰہی جو ذات بشر کے اندر پوشیدہ اور اس کی خمیر میں شامل ہے وہ عدل سے محبت کرتی ہے اور عدل کے سامنے سرنگوں ہے۔ ظلم سے بغض و دشمنی کا اظہار کرتی اور اس کے سامنے سر نہ جھکانے والی ہے۔ اگر فطرت نے خلاف عدل دیکھا تو معلوم ہونا چاہئے کہ اس کی بنیادوں میں نقص ہے اور اگر نعمت پر غضبناک اور تقسیم سے منحرف ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ (حاسد) تقسیم کو غیر عادلانہ سمجھتا ہے، بلکہ نعوذ باللہ، جابرانہ سمجھتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ حاسد تقسیم خداوندی کو عادلانہ سمجھتے ہوئے اس سے اعراض کرتا ہے اور کائنات کے نظم و نسق کو مکمل نظام اور مصلحت کے مطابق مانتے ہوئے اس پر غضبناک ہے۔ (نہیں نہیں) افسوس ہمارا ایمان ہی ناقص ہے، (بلکہ) عقلی و برہانی مطالب، عقل و ادراک کی حدوں سے گزر کر حدود قلب میں داخل ہی نہیں ہوئے۔ ایمان کہنے سننے، پڑھنے، بحث کرنے اور قیل و قال کا نام نہیں ہے۔ ایمان کیلئے خلوص نیت چاہئے۔ خدا کو ڈھونڈنے والا (ہی) خدا تک پہنچتا ہے۔ جس کو معارف کی طلب ہوتی ہے وہ معارف کی جستجو کرتا ہے ﴿ومن كان في هذه أعمى فهو في الآخرة أعمى وأضلُّ سبيلا﴾ ۱۶ ''اور جو شخص اس (دنیا) میں اندھا بنا رہا وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہے گا اور گم گشتہ راہ ہوگا''۔ ﴿ومن لم يجعل اللّٰهُ لهُ نُوراً فما لهُ من نُورٍ﴾ ۱۷ ''اور جسے خدا نے (ہدایت کی) روشنی نہ دی ہو تو اس کیلئے کہیں کوئی روشنی نہیں ہے''۔

چوتھی فصل

حسد کا عملی علاج

حسد کا تھوڑا سا علمی علاج تو گزر چکا، لیکن اس بری صفت کا عملی علاج بھی ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم پہلے محسود کے ساتھ محبت کا اظہار کرو، چاہے وہ تکلفاً ہی ہو اور اس کیلئے فضا سازگار بناؤ اور اس سے تمہارا مقصد مرض باطنی کا علاج کرنا ہو۔ تمہارا دل کہے گا اس کو تکلیف پہنچاؤ، اس کی توہین کرو، اس سے دشمنی کرو، اس کی برائیوں اور عیوب کو اچھالو۔ (مگر) تم اپنے دل کے خلاف عمل کرو، اس پر رحم کرو، اس کا عزت و احترام کرو، زبان کو اس کے ذکر خیر پر آمادہ کرو۔ اس کی اچھائیوں کو اپنے سامنے رکھو اور دوسروں کے سامنے بیان کرو، اس کے اچھے صفات کو اپنے ذہن نشین کرو۔ اگرچہ شروع شروع میں یہ سب کرتے ہوئے تم کو تکلیف کا احساس ہوگا اور یہ سب دکھاوا اور غیر واقعی معلوم ہوگا۔ لیکن چونکہ تمہارا مقصد نفس کی

اصلاح اور حسد کی برائی کو دور کرتا ہے اس لئے (رفتہ رفتہ) حقیقت سے نزدیک ہوتے جاؤ گے اور تھوڑا تھوڑا کر کے تکلیف بھی کم ہو جائے گا، نفس (ان باتوں کا) عادی ہو جائے گا اور اس میں حقیقت کی جھلک پیدا ہو جائے گی۔

کم سے کم نفس پر یہ واضح کر دو اور اس کو سمجھاؤ کہ یہ (بھی) تو خدا کا بندہ ہے۔ ہو سکتا ہے خدا نے اس پر بنا نظر کرم کیا ہو اور اپنی مخصوص نعمتوں سے اس کو نوازا ہو۔ خصوصاً اگر محسود اہل علم و دیانت ہو اور حسد بھی علم و دیانت کی وجہ سے ہو تو ایسی صورت میں حسد اور بھی قبیح ہے اور ایسے افراد سے دشمنی رکھنے کا انجام بہت ہی برا ہے۔ اپنے نفس کو یہ سمجھانا چاہئے کہ یہ حضرات خدا کے مخصوص بندے ہیں۔ توفیق الہٰی ان کے شامل حال ہے، اس لئے اس نے اس عظیم نعمت سے ان لوگوں کو مالا مال فرمایا ہے۔ نعمت تو لوگوں کے دلوں میں اس کے دیکھنے والے کیلئے محبت پیدا کرتی ہے۔ لوگوں کو ایسے شخص (یا اشخاص) کا احترام کرنا چاہئے اور ان کی عزت کرنی چاہئے۔ لیکن اگر یہ دیکھے کہ جو چیزیں نفس کیلئے باعث محبت و خضوع ہونا چاہئیں، اس کے اندر اس کے برخلاف چیزیں پیدا ہو رہی ہیں تو اس کو جان لینا چاہئے کہ اس پر شقاوت کا غلبہ ہو چکا ہے اور اس کے باطن میں تاریکی غالب آ چکی ہے، اور پھر اس کیلئے ضروری ہے کہ علمی و عملی طریقے سے اس کی اصلاح کی کوشش کرے اور یہ یقین کرے کہ محبت پیدا کرنے کی کوشش کرے گا، تو ضرور کامیاب ہوگا۔ کیونکہ محبت کا نور ظلمت و کدورت پر غالب ہے اور خداوند عالم نے وعدہ فرمایا ہے کہ جہاد کرنے والوں کو ہدایت عطا کرے گا۔ اپنے لطف خفی سے ان کی مدد کرے گا اور توفیق دے گا۔ ﴿إِنَّهُ وَلِيُّ التَّوفِيقِ وَالهِدَايَة﴾ ۔

پانچویں فصل: حدیث رفع کا ذکر

یہ سمجھ لو کہ بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا میری امت سے نو چیزوں کو اٹھا لیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک حسد ہے، بشرطیکہ اس کا اظہار ہاتھ یا زبان سے نہ ہو۔[۱۸] لیکن اس قسم کی حدیثیں نفس سے حسد کے شجرۂ خبیثہ کو قلع قمع کر دینے سے مانع نہیں ہیں اور نہ ہی اس آتش ایمان سوز و آفت دین پر مبنی برائی ہے روح کو پاک کرنے سے روکتی ہیں، کیونکہ ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے کہ یہ مادۂ فساد نفس میں داخل ہو اور مختلف قسم کے خرابیاں نہ پیدا کرے اور اس کا کوئی بھی اثر ظاہر نہ ہو اور انسان کا ایمان محفوظ رہ جائے۔

اس کے علاوہ صحیح حدیثوں میں آیا ہے کہ حسد ایمان کو کھا لیتا ہے اور یہ ایمان کیلئے آفت ہے۔[۱۹]

اور خداوند عالم نے حاسد سے بیزاری کا اظہار کیا ہے اور اپنے آپ کی اس سے اور اس کی اپنے سے نفی فرما دی ہے۔

لہذا ایسے اہم معاملے اور بڑی برائی سے کہ جس سے انسان کی ہر چیز کو خطرہ لاحق ہے کبھی بھی غفلت نہیں برتنی چاہئے اور حدیث رفع کی بنا پر دھوکہ نہیں کھانا چاہئے۔ اس لئے (اے حاسد) تو واقعی طور سے کوشش کر اور شجرۂ حسد کی شاخوں کو کاٹ دے۔ اپنی اصلاح کی فکر کر، خارج میں اس کے اثرات کو ظاہر نہ ہونے دے یہاں تک کہ اس کی جڑ کمزور ہو جائے اور یہ ترقی نہ کر سکے اور اگر ریاضت و اصلاح کی کوشش کرتے ہوئے تم کو موت آ جائے تو (انشاء اللہ) رحمت الٰہی تمہارے شامل حال ہوگی اور رسول کرم ؐ کی پر برکت روحانیت اور وسیع رحمت کے طفیل میں معاف کر دیئے جاؤ گے اور اگر کچھ تھوڑا سا رہ بھی گیا ہے تو رحمانیت کا شعلہ اس کو جلا کر نفس کو پاک و پاکیزہ بنا دے گا۔

حمزہ بن حمران کی روایت ہے ﴿ثلاثة لم ینج منها نبیٌّ، فمن دونهُ، التفکّر في الوسوسة في الخلق والطّیرةُ و الحسد الّا أنّ المؤمن لا یستعملُ حسده﴾[۳۰] امام جعفر صادق ؑ فرماتے ہیں "تین چیزیں ایسی ہیں جن سے نبی ؐ اور ان سے کمتر درجے کے لوگ بھی محفوظ نہیں ہیں (اور وہ یہ ہیں) لوگوں کیلئے دل میں (برے) خیالات، فال بد اور حسد لیکن مومن کبھی حسد سے کام نہیں لیتا" البتہ یہ روایت یا تو بطور مبالغہ وارد ہوئی ہے اور امام ؑ کا مقصد ہے کہ زیادہ تر لوگ اس میں مبتلا ہیں یا یہ کہ محض کثرت ابتلا کی طرف کنایہ ہے اور خود مضمون جملہ مقصود بالذات نہیں ہے یا یہاں حسد سے عام معنی مراد ہیں جو حسد اور غبطہ دونوں کو شامل ہے اور یہ بطور مجاز ہے یا اس سے مراد کفار کی ان نعمتوں کے زوال کی طرف اشارہ ہے جس کو وہ اپنے باطل مذہب کی اشاعت کیلئے استعمال کرتے ہیں اور اسی کو حسد کہا گیا ہے۔ ورنہ حسد کے حقیقی معنی سے انبیاء ؑ و اولیاء پاک و پاکیزہ ہوتے ہیں، کیونکہ جو دل اخلاقی برائیوں اور باطنی غلاظت سے پر ہو وہ وحی الٰہی و الہام کا مرکز نہیں بن سکتا اور نہ خدا کی تجلیات ذاتی و صفاتی کا مورد بن سکتا ہے۔ لہذا روایت کی وہی توجیہ ہونی چاہئے جو میں نے کی ہے یا کوئی اور توجیہ کرنی چاہئے یا پھر اس کے علم کو اس کے قائل صلوات اللہ وسلامہ علیہ کی طرف پلٹا دینا چاہئے (کہ حضرت ؑ کا مقصد کیا ہے؟ وہی بہتر سمجھ سکتے ہیں)۔

والحمد لله أولاً وآخراً

توضیحات (۵)

۱ـ اصول کافی، ج۲، ص۳۰۷، کتاب ایمان وکفر، باب حسد، حدیث۶۔

۲ـ حدیث۱، حاشیہ۱۴۔

۳ـ آپ ہم جیسے انسان ہی ہیں سورۂ یاسین، آیت/۱۵۔

۴ـ مومنون، آیت/۴۷۔

۵ـ بحارالانوار، ج۷۰، ص۲۴۰، کتاب ایمان وکفر، باب حسد؛

مرآۃ العقول، ج۱۰، ص۱۵۹، کتاب ایمان وکفر، باب حسد۔

۶ـ اصول کافی، ج۲، ص۳۰۷، کتاب ایمان وکفر، باب حسد، حدیث۵۔

۷ـ اصول کافی، ج۲، ص۳۰۶، کتاب ایمان وکفر، باب حسد، حدیث۱۔

۸ـ حدیث۲، حاشیہ۱۵۔

۹ـ بھلا کون ایسا ہے جو خدا کی اجازت کے بغیر خدا سے (کسی کی) شفاعت کرے؟ سورۂ بقرہ، آیت/۲۵۵

۱۰ـ ﴿إنّ رسولَ اللهِ صلى الله عليه وآله خرج في جنازةِ سعدٍ وقد شيّعَهُ سبعونَ ألفَ مَلَكٍ فرفع رسولُ اللهِ صلى الله عليه وآله رأسَهُ إلى السّماءِ ثُمَّ قالَ: مثلُ سعدٍ يُضَمُّ؟ قال: قلتُ: جُعِلْتُ فداكَ، إنّا نُحدَّثُ أنّهُ كانَ يستخفُّ بالبولِ، فقال: معاذَ اللهِ، إنّما كانَ مِنْ زَعارَةٍ في خُلُقِهِ على أهلِهِ﴾۔

فروع کافی، ج۳، ص۲۳۶، کتاب الجنائز، باب المسألة فی القبر ومن یسأل ومن لا یسأل، حدیث۶۔

۱۱ـ ملاحظہ حدیث۱، حاشیہ۵۱۔

۱۲ـ امام جعفر صادقؑ اپنے آباء واجداد کے ذریعے امیرالمومنینؑ سے روایت فرماتے ہیں

﴿كانَ رسولُ اللهِ صلى الله عليه وآله ذاتَ يومٍ جالساً في مسجدِهِ إذْ دخلَ عليهِ رجلٌ مِنَ اليهودِ، فقالَ اليهوديُّ: فإنْ كانَ ربُّكَ لا يظلمُ فكيفَ يُخلِّدُ في النّارِ أبدَ الآبدينَ مَنْ لَمْ يعصِهِ إلّا أيّاماً معدودةً؟ قال: يُخلِّدُهُ على نيّتِهِ، فمَنْ علمَ اللهُ نيّتَهُ أنّهُ لو بقيَ في الدُّنيا إلى انقضائِها كانَ يعصي اللهَ عزَّ وجلَّ، خلّدَهُ في نارِهِ على نيّتِهِ، ونيّتُهُ في ذلكَ شرٌّ مِنْ عملِهِ، وكذلكَ يُخلِّدُ مَنْ يُخلِّدُ في الجنّةِ بأنّهُ لو بقيَ في الدُّنيا أيّامَها لأطاعَ اللهَ أبداً، ونيّتُهُ خيرٌ مِنْ عملِهِ، فبالنّيّاتِ يُخلَّدُ أهلُ الجنّةِ في الجنّةِ وأهلُ النّارِ في النّارِ﴾۔

ایک دن رسول خداؐ اپنی مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک یہودی آپؐ کے پاس آیا اور عرض کیا اگر آپؐ کا خدا ظالم نہیں

ہے تو جس شخص نے صرف چند روز گناہ کئے ہیں اس کو کیوں ہمیشہ کیلئے جہنم میں ڈال دیتا ہے؟ آنحضرتؑ نے فرمایا اس کو اس کی نیت کی بنا پر ہمیشہ کیلئے جہنم میں ڈال دیتا ہے۔ جس کو خدا جانتا ہے کہ اگر یہ دنیا کی آخری عمر تک بھی زندہ رہتا تو نافرمانی ہی کرتا اس کو اس کی اس نیت کی بنا پر ہمیشہ کیلئے جہنم میں رکھتا ہے اور اس شخص کی یہ نیت اس کے عمل سے بدتر ہے۔ اسی طرح جس کو بہشت میں ہمیشہ کیلئے رکھتا ہے اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ اس شخص کی نیت یہ ہوتی ہے کہ جب تک دنیا باقی ہے اگر اس میں زندہ رہتا تو اس کی اطاعت کرتا اور اس کی یہ نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔ پس اہل جنت اپنی نیت کی بنا پر ہمیشہ جنت میں اور اہل جہنم ہمیشہ اپنی نیت کی بنا پر جہنم میں رہیں گے۔

توحید، ص ۳۹۸، ۳۹۹، باب الاطفال، حدیث ۱۴۔

۱۳۔ حدیث ۲ فصل ۲ پر ذکر ہو چکا ہے۔

۱۴۔ ملاحظہ ہو اسفار اربعہ، ج ۷، ص ۵۵۔۱۰۵، سفر ۳، موقف ۸، فصل ۱ تا ۹

۱۵۔ کشف المراد فی شرح تجرید الاعتقاد، ص ۲۳۲، مقصد ۳، فصل ۲۔

۱۶۔ سورۂ اسراء، آیت ۷۲۔

۱۷۔ سورۂ نور، آیت ۴۰۔

۱۸۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۴۶۳، کتاب ایمان و کفر، باب ما رفع عن الامۃ، حدیث ۲۔

۱۹۔ ملاحظہ ہو حدیث ا، حاشیہ ۵۵ اور حدیث ۵، حاشیہ ۷۔

۲۰۔ روضۂ کافی، ج ۸، ص ۱۰۸، حدیث ۸۶۔

وسائل الشیعہ، ج ۱۱، ص ۴۹۳، کتاب جہاد، باب ۵۵، حدیث ۸۔

چھٹی حدیث

بالسند المتصل الی محمد بن یعقوب، عن محمد بن یحیی، عن احمد بن محمد، عن ابن محبوب، عن عبد اللّٰہ بن سنان وعبد العزیز العبدی عن عبد اللّٰہ بن ابی یعفور، عن ابی عبد اللّٰہ علیہ السلام قال:

﴿من اصبح وامسی والدنیا اکبر همه، جعل اللّٰه الفقر بین عینیه وشتت امره ولم ینل من الدنیا الا ما قسم له، ومن اصبح وامسی والآخرة اکبر همه، جعل اللّٰه الغنی فی قلبه وجمع له امره﴾[1]

ترجمہ: ابن ابی یعفور کہتے ہیں کہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا "جو شخص صبح و شام اس حالت میں کرے کہ اس کا سب سے اہم مقصد دنیا ہو، تو خدا اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان غربت و ناداری لکھ دیتا ہے اور اس کے سارے کام بگاڑ دیتا ہے، اور اسے اپنے حصے کے علاوہ دنیا سے کچھ بھی نہیں ملتا اور جو شخص صبح و شام اس حالت میں کرے کہ اس کا سب سے اہم مقصد آخرت ہو تو خدا اس کے دل کو بے نیاز کر دیتا ہے اور اس کے تمام کاموں کو پورا کر دیتا ہے۔"

شرح: ارباب علوم کے نظریات کے مطابق اور ان کے علوم و معارف کے اعتبار سے دنیا و آخرت کا اطلاق کئی معانی و مفاہیم پر ہوتا ہے۔ علمی اصطلاحوں کے اعتبار سے ان کی حقیقت سے بحث کرنا ہمارے لئے (زیادہ) اہم نہیں ہے۔ (اسی طرح) اصطلاحات کا سمجھنا، رد و قبول کرنا، ان میں جرح و تعدیل کرنا بھی ہمارے مقصد سے دور ہے، کیونکہ یہ چیزیں چلنے والے کو اصل راستہ پر گامزن ہونے سے روکتی ہیں۔[2] اس

سلسلہ میں جو بات اہم ہے وہ مذمت شدہ دنیا کا سمجھنا ہے تا کہ جو شخص آخرت کا طالب ہے وہ اس دنیا سے علم و آگہی کے ساتھ اجتناب کرے اور جو چیزیں انسان کو راہ نجات تک پہنچانے میں مددگار ثابت ہوں وہ بھی ہمارے لئے اہم ہیں۔ ہم انشاء اللہ ان چیزوں کو چند فصلوں کے ضمن میں بیان کریں گے اور خداوند عالم سے اس راستہ پر چلنے کی توفیق چاہتے ہیں۔

پہلی فصل: مذموم دنیا کے بارے میں علامہ مجلسیؒ کا بیان

محقق خبیر محدث بے نظیر علامہ مجلسیؒ فرماتے ہیں،

آیات و احادیث کے مجموعے سے جو بات میری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ جس دنیا کی مذمت کی گئی ہے وہ ایسے امور سے مرکب ہے جو انسان کو خدا کی اطاعت اور محبت اور حصول آخرت سے روکتے ہیں۔ پس دنیا و آخرت ایک دوسرے کے مد مقابل ہیں۔ جو چیز خدا کی خوشنودی اور اس کے تقرب کا سبب ہو وہ آخرت ہے، چاہے بحسب ظاہر وہ دنیا سے ہو۔ جیسے تمام وہ تجارت و زراعت و صنعت جن کا مقصد اطاعت خدا کیلئے اہل و عیال کی معیشت کا انتظام کرنا، نیک کاموں میں خرچ کرنا، غریب و محتاج کی مدد کرنا، صدقہ دینا، لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنا وغیرہ ہو تو یہ سب آخرت ہے، چاہے لوگ اس کو دنیا (داری) سمجھتے ہوں۔

اور دکھاوے کی ریاضتیں، ریاکاری کے اعمال چاہے ان میں ظاہری طور پر زہد و پرہیزگاری اور زحمت و مشقت کی مختلف اقسام موجود ہوں پھر بھی یہ دنیا ہے۔ (اگرچہ بظاہر امور آخرت میں سے ہے)، کیونکہ یہ خدا سے دوری کا سبب ہیں، ان سے خدا کی قربت حاصل نہیں ہوتی، جیسے کفار و مخالفین کے اعمال۔ انتہی

(علامہ مجلسیؒ) ایک محقق کا قول نقل کرتے ہیں کہ تمہاری دنیا و آخرت تمہارے دل کی دو حالتوں سے عبارت ہے۔ جو تم سے نزدیک اور مرنے سے پہلے ہے اس کا نام دنیا ہے اور جو اس کے بعد آئے گا اور مرنے کے بعد ملے گا اس کا نام آخرت ہے۔ پس مرنے سے پہلے جن چیزوں میں تم کو لذت و شہوت اور حصہ ملے تمہارے حق میں وہی دنیا ہے۔ الخ

راقم الحروف عرض کرتا ہے: دنیا کا اطلاق کبھی وجود کے درجہ تنزل پر کیا گیا ہے جو دار فنا اور عالم تغیر و مجاز ہے اور آخرت کا اطلاق اس دنیا سے اپنے باطن اور ملکوت کی طرف واپسی پر کیا جاتا ہے اور آخرت،

منزلِ استحکام و پائیداری اور دارِ ابدیت اور دارِ قرار ہے، اور ان دونوں حالتوں سے ہر نفس اور ہر شخص کو دو چار ہونا پڑے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہر مخلوق کیلئے (ایک) مقامِ ظہور و ملک و شہود ہوتا ہے جو دنیا کا پست مرتبہ ہے اور (ایک) مقامِ بطون و ملکوت و غیب ہے اور یہ آخرت کا مرتبہ اعلیٰ ہے اور دنیا کا پست مرتبہ اگرچہ بذات خود ناقص اور وجود کا آخری مرتبہ ہے، لیکن چونکہ نفوسِ قدسیہ کا گہوارۂ تربیت اور مقاماتِ عالیہ کے حصول کی جگہ اور آخرت کی کھیتی ہے اس لئے اولیائے کرام اور اہلِ سلوک کی نظر میں یہ مشاہدِ وجودیہ میں سب سے احسن اور بہترین عالم اور پر غنیمت دنیا ہے اور اگر یہ مادی دنیا اپنے تغیرات اور طبعی حرکات جوہری وارادی کے ساتھ موجود نہ ہوتی، اور خداوند عالم اس میں قانونِ تبدل و تغیر کو مسلط نہ کرتا تو کسی بھی نفسِ ناطقہ کو اپنے کمال تک پہنچنا نصیب نہ ہوتا اور نہ کوئی اپنے دار ثبات و قرار میں پہنچ جگہ تک پہنچتا (بلکہ) دنیا کے مادہ و روح میں مجموعی طور پر نقص پیدا ہو جاتا۔

قرآن و حدیث میں جو اس دنیا کی مذمت کی گئی ہے وہ حقیقت میں اقسام اور کثرت کے اعتبار سے اس دنیا کی مذمت نہیں ہے، بلکہ اس دنیا سے محبت کرنے اور اس سے قلبی لگاؤ رکھنے کی مذمت ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کیلئے دو دنیائیں ہیں۔ ایک ممدوح ہے اور ایک مذموم۔ اس دنیا میں جو چیز قابلِ تعریف ہے وہ یہ ہے کہ یہ دنیا تیاری کی جگہ اور تعلیم و تربیت کا مرکز ہے۔ اچھائیوں اور اعلیٰ مقامات کے حصول، کسبِ کمالات اور ابدی سعادت حاصل کرنے کی جگہ ہے، اور جب تک انسان اس دنیا میں نہ آئے ان چیزوں کا حصول ناممکن ہے۔ چنانچہ ایک شخص دنیا کی مذمت کر رہا تھا، مولا الموحدین حضرت امیر المومنین صلوات اللہ علیہ نے اس کے جواب میں فرمایا

﴿ إنّ الدُّنیا دارُ صدقٍ لمنْ صدقها، ودارُ عافیةٍ لمنْ فهم عنها، ودارُ غنیً لمن تزوّد منها، ودار موعظةٍ لمن اتعظ بها، مسجد أحبّاء الله، ومُصلّی ملائکة الله، ومهبط وحی الله، ومتجرُ أولیاء الله اکتسبُوا فیها الرّحمة، وربحوا فیها الجنّة ﴾۲

"بے شک دنیا ان لوگوں کیلئے جو باور کریں سچائی کا گھر ہے اور جو اس کی باتوں کو سمجھے اس کیلئے عافیت کی جگہ ہے اور جو اس سے زادِ راہ حاصل کر لے اس کیلئے دولت کی منزل ہے اور جو اس سے وعظ و نصیحت حاصل کرے اس کیلئے وعظ و نصیحت کا مکان ہے۔ دنیا دوستانِ خدا کیلئے عبادت کی جگہ اور خدا کے

فرشتوں کے نماز پڑھنے کا مقام ہے۔ وحی الہٰی کی منزل اور اولیائے خدا کی تجارت گاہ ہے اور انہیں لوگوں نے اس دنیا میں فضل و رحمت کا سودا کیا اور اسی دنیا میں رہتے ہوئے فائدے میں جنت حاصل کی"۔

اور سورہ نحل میں جو ﴿وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِينَ﴾ ہے "پرہیزگاروں کیلئے کیا ہی اچھا ٹھکانہ ہے" آیہ ہے تفسیر عیاشی ۸ میں حضرت امام محمد باقرؑ کی روایت ہے کہ اس دار المتقین سے مراد دنیا ہے۔ ۹ پس عالم ملک (دنیا) جو جمال وجلال کا مظہر اور قدرت مطلقہ کی شہادت کی منزل ہے، کسی اعتبار سے قابل مذمت نہیں ہے۔ ہاں! جو چیز مذموم ہے وہ خود انسان کی دنیا ہے۔ جس کے متعلق قدرت وطبیعت سے انسان کا دلی لگاؤ اور محبت ہے جو تمام برائیوں کی منشأ اور عملی وقلبی (نافرمانیوں و) خطاؤں کا سرچشمہ ہے۔

کافی شریف میں امام جعفر صادقؑ کی حدیث ہے ﴿رَأْسُ كُلِّ خَطِيئَةٍ حُبُّ الدُّنْيَا﴾ ۱۰ (ہر برائی کی جڑ حبِّ دنیا ہے)۔

اور امام محمد باقرؑ سے روایت کی گئی ہے ﴿مَا ذِئْبَانِ ضَارِيَانِ فِي غَنَمٍ لَيْسَ لَهَا رَاعٍ هٰذَا فِي أَوَّلِهَا وَهٰذَا فِي آخِرِهَا بِأَسْرَعَ فِيهَا مِنْ حُبِّ الْمَالِ وَالشَّرَفِ فِي دِينِ الْمُؤْمِنِ﴾ ۱۱ "کسی ایسے ریوڑ پر جس کا کوئی چرواہا نہ ہو دو خونخوار بھیڑیے ایک آگے سے اور ایک پیچھے سے حملہ آور ہو کر اتنی جلدی اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتے جتنا مال ومنال اور جاہ ومنزل کی محبت مومن کے دین کو نقصان پہنچا دیتی ہے"۔

پس معلوم ہو گیا کہ دنیا سے بے حد لگاؤ اور اس سے قلبی محبت ہی مذموم دنیا ہے۔ اس دنیا سے جتنی وابستگی زیادہ ہو گی اتنے ہی انسان اور دار کرامت ورحمت کے درمیان پردے زیادہ ہوں گے اور انسان کے دل اور حق کے درمیان پڑے پردے اتنے ہی دبیز ہوتے جائیں گے۔ بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ خداوند عالم کے ستر ہزار نورانی وظلمانی پردے ہوں گے۔ ۱۲ ہو سکتا ہے یہ ظلمانی حجاب وہی دنیا سے قلبی تعلقات ہوں اور یہ تعلقات جتنے زیادہ ہوتے جائیں گے پردے بھی اتنے ہی زیادہ ہوتے جائیں گے اور تعلق جتنا شدید تر ہو گا، حجاب اتنا دبیز ہو گا اور اس کا چاک کرنا مزید مشکل تر ہو گا۔

دوسری فصل: حبِّ دنیا کے زیادہ ہونے کے اسباب

یہ جان لو کہ انسان اسی طبیعی دنیا کی مخلوق ہے، یہی دنیا اس کی ماں ہے، وہ اسی آب وخاک کی اولاد ہے۔ (اسی لئے) اس دنیا کی محبت اس کے نشوونما کے زمانہ ہی سے اس کے دل میں جڑ پکڑ چکی ہے۔ انسان

جتنا بڑا ہوتا جائے گا دنیا کی محبت بھی اس کے دل میں نشو ونما پاتی رہے گی اور چونکہ پروردگار عالم نے اس کو شہوانی قوتیں اور لذتوں کے ذرائع ووسائل بھی اپنی ذات اور نوع کی حفاظت کیلئے مرحمت فرمائے ہیں۔ (لہذا) انسان کی دنیا سے محبت روز افزوں اور دلبستگی زیادہ ہوتی رہتی ہے۔ نیز انسان اس دنیا کو اپنی لذتوں اور عیش وعشرت کی جگہ سمجھتا ہے، موت کو ان چیزوں سے محرومی کی علت سمجھتا ہے اور عقلی براہین اور انبیاء صلوات اللہ علیہم کے اخبار سے اگر آخرت کا قائل بھی ہو جاتا اور آخرت کی کیفیت اور وہاں کے حالات وکمالات اور زندگی کا معتقد بھی ہو جاتا ہے تب بھی اس کا دل بے خبر ہی رہتا ہے اور وہ قبول نہیں کرتا، چہ جائیکہ مقام اطمینان تک پہنچ جائے۔ اس لئے اس دنیا کی محبت اس کے دل میں زیادہ ہو جاتی ہے۔

نیز انسان فطری طور سے بقا کی محبت رکھتا ہے اور فنا وزوال سے گریزاں اور متنفر رہتا ہے اور عقل کی تصدیق کے باوجود کہ یہ دنیا عالم فنا ہے اور صرف ایک گزرگاہ ہے اور وہ عالم (آخرت) باقی وسرمدی ہے (پھر بھی موت کو فنا گمان کرتا ہے) اور چونکہ سب سے اہم بات یہ ہے کہ دل قبول کرلے، بلکہ اس کا مرتبہ کمال یہ ہے کہ اطمینان کی منزل حاصل ہو جائے، جیسے حضرت ابراہیمؑ نے خدا سے مرتبۂ اطمینان کا سوال کیا تھا اور خدا نے وہ درجہ ان کو مرحمت بھی فرما دیا تھا۔ [۱۳] لیکن یا تو دل ہمارے دلوں کی طرح آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، اگرچہ عقلی تصدیق رکھتے ہیں اور (یا اگر ایمان رکھتے ہیں تو) اطمینان نہیں رکھتے۔ (اس لئے) اس دنیا میں باقی رہنے کو پسند کرتے ہیں اور موت اور اس دنیا سے نکلنے کو ناپسند کرتے ہیں۔ (لیکن) اگر دلوں کو یہ اطلاع ہو جائے کہ یہ دنیا تمام دنیاؤں میں سب سے پست اور دار فنا اور زوال وتغیر اور عالم نقص وہلاکت ہے اور موت کے بعد کی دنیائیں سب کی سب باقی وابدی ودار کمال وثبات وحیات اور منزل مسرت وخوشی ہیں تو فطری طور سے موت کے بعد والی دنیاؤں سے محبت کرنے لگیں اور دنیائے پست سے نفرت کرنے لگیں گے اور اگر کوئی اس سے بھی اونچا چلا جائے اور شہود ووجدان کی منزل تک پہنچ جائے اور دنیائے فانی کی باطنی صورت اور اس سے لگاؤ کو دیکھے۔ (اس طرح) اس دنیائے باقی کی باطنی صورت اور اس سے تعلق اور لگاؤ دیکھ لے تو یہ فانی دنیا اس کی نظروں میں بہت سخت ودشوار ہو جائے گی۔ اس سے نفرت پیدا ہو جائے گی اور اس کا جی چاہنے لگے گا کہ اس ظلمانی دنیا کے قید خانے اور زمان (ومکان) کی قید وبند سے اس کو چھٹکارا مل جائے۔ چنانچہ اولیائے خدا کے کلمات میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: ﴿واللّٰه لابنُ ابي طالبٍ آنسُ بالموتِ من الطِّفلِ بِثَدْيِ اُمِّه﴾ [۱۴]

"خدا کی قسم ابو طالب کا فرزند موت سے اس سے کہیں زیادہ مانوس ہے جتنا کوئی بچہ پستان مادر سے مانوس ہوتا ہے" کیونکہ مولائے کائنات نے چشم ولایت سے اس دنیا کی حقیقت کا مشاہدہ کر لیا تھا اور دونوں عالم کے عوض میں بھی رحمت باری کے پڑوس کو چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے اور اگر (پروردگار کی) مصلحتوں کا تقاضا نہ ہوتا تو یہ نفوس طاہرہ ایک لحہ بھی طبیعت کے تاریک قید خانے میں توقف نہ فرماتے اور خود عالم کثرت میں آنا اور ظاہری دنیا اور دنیوی تدبیرات میں مشغول ہونا، بلکہ ملکوتی تائیدات کے باوجود بھی یہ چیزیں تخمین وحجذوبین کیلئے ایسے رنج وغم کا باعث ہیں کہ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اولیائے الٰہی کے نالہ وفریاد زیادہ تر محبوب کی جدائی، درد فراق اور اس کی کرامتوں سے دوری کی وجہ سے ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ ان حضرات نے اپنی مناجاتوں میں اس کی طرف اشارہ بھی فرمایا ہے۔ ۱۵ حالانکہ ان کے یہاں دنیوی وملکوتی حجاب بھی نہیں تھے وہ (عالم مادی کے) جہنم سے اوپر اٹھ چکے تھے اس جہنم کی آگ خاموش تھی روشن نہ تھی۔ ۱۶ ان کے دلوں میں مادی ودنیاوی تعلقات بھی نہیں تھے اور ان کے دلوں میں گناہ کا شائبہ بھی نہ تھا۔ (اس سب کے باوجود) وہ حضرات اس دنیا میں رہنے ہی کو ایک لذت سمجھتے تھے۔ ان کی نظروں میں فطری لذتیں بھی چاہے کتنی ہی کم ہوں، خدا اور بندے کے درمیان حجاب ہوتی ہیں۔ چنانچہ حضرت رسول خداؐ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا «اِنَّهُ لَيُغَانُ عَلىٰ قَلْبِي وَاِنِّي لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِي كُلِّ يَوْمٍ سَبْعِينَ مَرَّةً» ۱۷ "میرے دل پر ہلکا سا غبار چھا جاتا ہے اور میں (اسی لئے) روزانہ ستر مرتبہ اپنے خدا کی بارگاہ میں استغفار کرتا ہوں"۔

ہوسکتا ہے حضرت آدمؑ کی خطا اسی فطری چیز کا نتیجہ رہی ہو۔ دنیا کی تدبیر، گندم کی احتیاج بھی تو فطری بات تھی۔ (البتہ) یہ چیزیں اولیا اور مجذوبین (وخاصان خدا) کیلئے گناہ ہیں۔ (عام لوگوں کیلئے گناہ نہیں ہیں) اور اگر حضرت آدمؑ اسی جذبۂ الٰہی پر باقی رہتے اور اس مادی دنیا میں نہ آتے تو یہ ساری بساط رحمت ہی نہ پھیلائی جاتی (اور نہ اس دنیا کا وجود ہوتا)۔ اس بحث کو اسی جگہ پر ختم کرتا ہوں، اگرچہ اتنا بھی اس کتاب کے اعتبار سے کچھ زیادہ ہی ہوگیا۔

تیسری فصل

دنیاوی لذتوں کی دلوں میں تاثیر اور اسکے مفاسد

یہ بات جان لو کہ نفس کو اس دنیا سے جو لذت حاصل ہوتی ہے اس کا دل میں اثر ہوتا ہے، کیونکہ یہ اثر

پذیری عالم ملکوت وطبیعت سے ہوتی اور دنیا سے متعلق ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے اور پھر ان لذتوں میں جتنا اضافہ ہوتا جاتا ہے دل اس سے اتنا ہی متاثر ہوتا ہے اور ان سے لگاؤ اور چاہت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا دل اس دنیا اور زیبائش دنیا میں ڈوب جاتا ہے اور پھر اسی سے بہت سی برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ انسان کی ساری خطاؤں اور گناہوں اور معصیتوں میں ابتلا کی علت یہی (دنیا سے) محبت و دوستی ہے۔ جیسا کہ کافی شریف کی حدیث میں گزر چکا۔۱۸

اور اس کی بڑی برائیوں میں جیسا کہ ہمارے شیخ عارف (روحی فداہ)۱۹ فرمایا کرتے تھے۔ یہ بھی ہے کہ اگر انسانی دل محبت دنیا کی صورت اختیار کرلے اور دنیا سے اس کی انسیت بہت بڑھ جائے تو مرتے وقت اس کو یہ احساس ہوتا ہے کہ خدا اس کو اس کے محبوب سے جدا کر رہا ہے اس کے اور اس کی پسندیدہ اشیا کے درمیان جدائی ڈال رہا ہے اور وہ پھر اس دنیا سے اس طرح رخصت ہوتا ہے کہ اس کے دل میں خدا کا بغض بھرا ہوتا ہے اور یہ کمر شکن الفاظ انسان کو بیدار کرنے کیلئے کافی ہیں کہ وہ اپنے دل کی طرف بہت زیادہ متوجہ رہے۔ خدا نہ کرے کوئی شخص اپنے ولی نعمت اور حقیقی مالک الملوک سے غصہ ونفرت رکھتا ہو، کیونکہ اس غصہ اور دشمنی کی صورت کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں ہوتا ہے۔

اسی طرح ہمارے شیخ بزرگوار (دام ظلہ) نے اپنے والد ماجد سے نقل فرمایا کہ وہ اپنے ایک بیٹے سے بہت زیادہ محبت فرماتے تھے اس لیے عمر کے آخری حصہ میں اس محبت سے بہت وحشت ناک تھے۔ پھر کچھ دنوں کی ریاضت کے بعد انہوں نے اس لگاؤ سے چھٹکارا حاصل کر کے خوش ہو گئے۔ اس کے بعد اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ رضوان اللہ علیہ۔

في الكافي باسناده عن طلحة بن زيد، عن أبي عبدالله عليه السلام قال ﴿مَثَلُ الدُّنيا كمثلِ ماءِ البحرِ كُلَّما شرِبَ منهُ العطشانُ ازدادَ عطشاً حتى يقتلَه﴾ ۲۰ حضرت امام صادقؑ نے فرمایا "دنیا کی مثال سمندر کے پانی کی طرح ہے پس جب بھی اس سے پانی پیتا ہے اس کی پیاس بھڑک اٹھتی ہے اور وہ (پانی پیتے پیتے) ہلاک ہو جاتا ہے"۔

دنیا کی محبت انسان کو ہلاکت ابدی تک پہنچا دیتی ہے اور یہی ظاہری و باطنی برائیوں کی جڑ ہے۔ حضرت رسول خداؐ سے مروی ہے: "تم سے پہلے والوں کو درہم و دینار نے ہلاک کیا تھا اور تم کو بھی یہی (دینار و درہم) ہلاک کرنے والے ہیں"۔۲۱

تھوڑی دیر کیلئے فرض کر لیجئے کہ انسان کوئی بھی گناہ نہیں کرتا، اگر چہ یہ فرض بعید ہے، بلکہ محال عادی ہے، پھر بھی دنیا سے لگاؤ اور اس سے محبت ہی اسباب ابتلا ہے، بلکہ قبر اور برزخ میں طولانی مدت تک رہنے اور کم مدت تک قیام کرنے کا دارمدار انہیں دنیاوی تعلقات پر ہوتا ہے کہ یہ تعلقات جتنے کم ہوں گے انسان کی قبر اور عالم برزخ روشن تر ہوں گے اور انسان کو اس میں کم قیام کرنا پڑے گا۔ اسی لئے بعض روایت کے مطابق اولیائے خدا تین دن سے زیادہ قبر میں نہیں رہتے۔ ورنہ یہ تین دن بھی اسی فطری وجبلی دنیاوی تعلق کی بنا پر ہوتے ہیں۔

حب دنیا اور اس سے تعلقات کے برے نتائج میں سے یہ بھی ہے کہ انسان موت سے ڈرتا ہے اور یہ خوف جو دنیا کی محبت اور اس سے دل لگاؤ کی بنا پر پیدا ہوتا ہے، بہت ہی مذموم ہے اور یہ خوف خالق (حق) کے خوف کے علاوہ ہے جو مومنین کے صفات میں سے ہے اور موت کی سب سے بڑی سختی اسی تعلق اور لگاؤ کو توڑنا اور موت سے خوف ہے۔

اسلام کے بے نظیر محقق اور عظیم مدقق سید عظیم الشان (میر باقر) داماد (کرم اللہ وجہہ) ۲۲ اپنی بے نظیر کتاب "قبسات" باب "خوف" میں تحریر فرماتے ہیں: ﴿لا یخیفنک الموت، فانّ مرارته في خوفه﴾ ۲۳ "موت سے نہ ڈرو اس لئے کہ موت کی تلخی اس سے ڈرنے ہی میں ہے"۔

حب دنیا کی بڑی برائیوں میں یہ بھی ہے کہ وہ انسان کو شرعی ریاضتوں، عبادتوں اور مناسک سے روک دیتی ہے، مادیت کے پہلو کو تقویت دیتی اور طبیعت انسانی کو روح کی اطاعت سے روگرداں کرتی ہے اور روح کی نافرمانی پر آمادگی کے ساتھ انسانی عزم وارادے کو کمزور کر دیتی ہے۔ حالانکہ شرعی عبادتوں اور ریاضتوں میں سب سے اہم راز یہی ہے کہ بدن اور اس کی طبعی قوتوں اور ظاہری پہلوؤں کو روح کے تابع ومطیع کر دے، اس طرح کہ نفس کا حکم ان میں کارفرما ہو جائے اور ملکوت نفس، ظاہری پہلو پر غالب آئے اور اس طرح روح کو طاقت واقتدار اور حاکمیت مل جائے کہ محض ارادے کے ساتھ بدن کو جس کام پر آمادہ کرنا چاہے آمادہ کر سکے اور جس سے چاہے روک دے۔ انسانی جسم کی دنیا اور اس کی ظاہری قوتیں اس طرح اس کی باطنی ملکوتی دنیا کی تابع ومقہور ومسخر ہو جائیں کہ بغیر کسی مشقت وتکلف کے جس کام کو کرنا چاہیں، کریں۔

پس مشقت عبادتوں کے فضائل واسرار میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ ان عبادتوں سے یہ مقصد جلد ہی حاصل ہو جاتا ہے اور انسان ان عبادتوں کی بنا پر عزم مصمم کا مالک بن جاتا، عالم طبیعت پر غالب آ جاتا اور

دنیا پر قابض ہو جاتا ہے اور ارادہ پختہ اور مکمل ہو اور عزم مصمم اور مستحکم ہو تو بدن اور اس کی ظاہری و باطنی قوتوں کی مثال خدا کے ملائکہ کے مثل ہو جاتی ہے۔ (یعنی) جس طرح ملائکہ نافرمانی نہیں کرتے اور خدا جو حکم دیدے اس کی اطاعت کرتے ہیں اور جس سے روک دے، رک جاتے ہیں اور اس سلسلہ میں ان کو کوئی زحمت برداشت کرنا نہیں پڑتی، بس اسی طرح انسانی بدن کی قوتیں اگر روح کی مسخر ہو جائیں تو ان میں بھی مشقت و زحمت کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور راحت سے بدل جاتی ہیں اور ملک (بدن) کی ساتوں اقلیم ملکوت (روح) کے تابع اور ساری قوتیں اس کی خادم ہو جاتی ہیں۔

میرے عزیز! اس بات کو سمجھ لو کہ دوسری دنیا کیلئے عزم مصمم اور طاقتور ارادہ بہت ہی ضروری و لازم ہے۔ بہشت کے اونچے مراتب کا معیار جن کا شمار بہترین بہشتوں میں کیا جاتا ہے وہ انسان کا ارادہ و عزم ہی ہے کہ انسان کے اندر جب تک مضبوط ارادہ اور عزم مصمم نہ پیدا ہو جائے وہ بہشت اور اس بلند مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔

حدیث شریف میں ہے جب اہل جنت، بہشت میں ثابت و مستقر ہو جائیں گے تو پروردگار عالم کی طرف سے ایک تحریر آئے گی جس کا مضمون یہ ہوگا "یہ تحریر ہمیشہ باقی رہنے والے خدا کی طرف سے (اپنے) زندہ جاوید (بندوں) کیلئے ہے۔ میں ایسا ہوں کہ جس چیز کیلئے حکم دیدوں کہ ہو جائے، وہ ہو جاتی ہے۔ آج سے تم کو بھی ایسا بنا دیتا ہوں کہ جس چیز کو حکم کرو گے کہ وہ ہو جائے تو ہو جائے گی" ؎

اب ذرا سوچو یہ کونسا مقام اور کونسی حکومت اور کیسی قدرت الٰہی ہے کہ (اب انسانی ارادہ) ارادۂ الٰہی کا مظہر ہے! وہ عدم کو لباس وجود عطا کر سکتا ہے۔ تمام جسمانی جنتوں سے ارادے کی یہ طاقت اور اثر بہتر و بالاتر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تحریر عبث و بے کار تو نہیں ہے۔ جس کا ارادہ حیوانی شہوتوں کا تابع ہوگا، جس کا عزم مردہ اور بجھا ہوگا وہ اس مقام تک کبھی نہیں پہنچ سکے گا۔ خدا کا کام عبث نہیں ہو کرتا۔ جب یہ دنیا نظام و ترتیب، اسباب و مسببات کے تابع ہے تو پھر آخرت میں بھی یہی ہوگا، بلکہ عالم آخرت تو نظام (و ترتیب) اسباب و مسببات کیلئے زیادہ لائق و سزاوار ہے۔ عالم آخرت کا تمام نظام خاص اندازوں اور اسباب پر مبنی ہے۔ لہذا ارادے کے اختیارات کا تعین اسی دنیا سے کر لینا چاہئے (کیونکہ) یہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے اور تمام نعمت ہائے بہشتی اور عذاب ہائے جہنمی کا سرچشمہ یہی دنیا ہے۔

بس جس طرح شرعی عبادتوں اور مناسک کی خود ایک اخروی اور ملکوتی صورت ہوا کرتی ہے، اس کے

علاوہ یہ چیزیں بہشت جسمانی اور اس کے حور وغلمان وقصور کی تعمیر کا ذریعہ بھی ہوتی ہیں اور یہ بات برہان وحدیث کے مطابق بھی ہے۔ ۲۵ اسی طرح ہر عبادت کا اثر نفس میں ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ وہ نفس (روح) کے ارادے کو تقویت دیتا ہے، یہاں تک کہ اس کی طاقت مکمل ہو جاتی ہے۔ اسی لئے عبادت میں جا ہے جتنی مشقت ہو وہ مرغوب ہے ﴿اَفضَلُ الْأَعْمَالِ أَحْمَزُهَا﴾ ۲۶ ''سخت ترین اعمال ہی افضل ترین اعمال ہیں'' مثلاً کڑکڑاتے جاڑے میں رات کو میٹھی نیند سے اٹھ کر خدا کی عبادت کرنا روح کو قوائے بدنی پر تسلط عطا کرتا اور ارادے کو تقویت بخشتا ہے اور شروع میں جو زحمت و ناگواری کا احساس ہوتا ہے اور مشکل معلوم ہوتا ہے وہ رفتہ رفتہ عمل سے کم ہو جاتی اور زحمت کا بھی احساس ختم ہو جاتا ہے اور بدن پر روح کی قدرت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جو اس طرح کی عبادت کرتے ہیں وہ بغیر کسی زحمت وتکلیف کے اس عمل کو انجام دیتے ہیں۔ لیکن چونکہ ہم کاہلی برتتے ہیں اور عمل نہیں کرتے اس لئے ہمارے لئے مشکل اور شاق ہوتا ہے۔ اگر ہم بھی چند مرتبہ زحمت کریں تو یہی زحمت راحت سے بدل جائے گی، بلکہ ہم لوگ شہوات دنیوی سے جتنی لذت اٹھاتے ہیں، خدا کے عبادت گزار بندے عبادت سے اس سے کہیں زیادہ لذت محسوس کرتے ہیں۔

(خلاصہ یہ ہے کہ) عبادت کرنے سے نفس عادی ہو جاتا ہے۔ والخیر عادۃ۔

اس عبادت کے کئی فائدے ہیں:

ایک تو یہ ہے کہ ان عبادتوں کی صورت آخرت میں اتنی حسین وجمیل ہوتی ہے جس کی نظیر اس دنیا میں نہیں ہے اور نہ اس کا (یہاں پر) تصور کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ روح صاحب عزم واقتدار ہو جاتی ہے اور روح کا صاحب اقتدار ہو جانا بھی بکثرت نتائج کا حامل ہے ایک کا تو آپ نے ذکر سن ہی لیا۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ انسان رفتہ رفتہ ذکر وفکر اور عبادت سے مانوس ہو جاتا ہے اور شاید یہی مجازانسان کو حقیقت سے نزدیک کر دیتا ہے، مالک الملوک کی طرف قلبی توجہ ہو جاتی ہے اور محبوب حقیقی کے جمال سے محبت پیدا ہو جاتی ہے اور قلبی محبت دنیا و آخرت دونوں سے اس کا لگاؤ کم ہو جاتا ہے اور اگر (کہیں) جذبۂ ربوبی پیدا ہو جائے اور (بے خودی کی) حالت پیدا ہو جائے اور عبادت کا حقیقی نکتہ اور تذکر وتفکر کا واقعی راز حاصل ہو جائے اور دونوں عالم اس کی نظروں سے گر جائیں اور جلوۂ دوست دوگانگی کے غبار کو دل سے دور

کردے تو پھر خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا کہ ایسے بندے کو خدا کیسی کرامت عطا کرتا ہے اور جس طرح شرعی عبادات وریاضات ومناسک اور ترک شہوات سے عزم کو تقویت حاصل ہوتی اور انسان صاحب عزم وارادہ ہوجاتا ہے۔ اسی طرح گناہوں سے طبیعت کو غلبہ حاصل ہوتا اور انسان کا عزم وارادہ ناقص ہوجاتا ہے۔ چنانچہ اس کا تھوڑا سا ذکر پہلے بھی کیا جاچکا ہے۔

چوتھی فصل

کسی بھی صاحب وجدان سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ انسان اپنی اصلی فطرت اور ذاتی جبلت کی بنا پر کمال تام مطلق کا عاشق ہوتا ہے اور اس کے دل کا ایک حصہ جمیل علی الاطلاق اور ہر پہلو سے کامل ذات (خدا) کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور یہ وہی فطرت الٰہی ہے جس پر خداوند عالم نے بنی نوع انسان کو خلق فرمایا ہے اور اسی حب کمال کے (بل بوتے) پر انسان کو ملک وملکوت کے ارادہ کی قوت مرحمت ہوتی ہے اور عشق کو کمال مطلق تک پہنچنے کے اسباب نصیب ہوتے ہیں۔

لیکن ہر شخص اپنے حال ومقام کے اعتبار سے کسی بھی چیز میں اپنے لئے تشخیص کمال کرتا ہے اور اس کا دل اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ (مثلاً) اہل آخرت، آخرت کے درجات ومقامات میں (ترقی کو) کمال سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان کے دل اسی طرف متوجہ ہوجاتے ہیں اور خدا والے جمال حق میں اس کا کمال اور کمال حق میں اس کا جمال دیکھ کر کہہ اٹھتے ہیں ﴿وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ﴾ [27] "میں نے اپنے چہرے کو خالق زمین وآسمان کی طرف متوجہ کیا" اور کبھی کہتے ہیں ﴿لِي مع اللّٰهِ حَالٌ﴾ [28] "ہمارے اللہ کے ساتھ کچھ" اور ہی "حالات ہیں"۔ اس طرح ان کے دل میں وصال خدا کی محبت اور اس کے حسن وجمال کا عشق ہوتا ہے۔ (لیکن) چونکہ اہل دنیا کمال کو دنیاوی لذتوں میں سمجھتے ہیں اور دنیا کی خوبصورتی ان کی نظروں میں بھاگئی ہے (اس لئے) فطری طور سے اسی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود چونکہ فطری توجہ اور ذاتی عشق کمال مطلق ہی سے ہوتا ہے دیگر قسم کے تعلقات، عارضی اور مطابقت میں غلطی پر مبنی ہوتے ہیں۔ (لہذا) انسان کو جتنے بھی دنیوی اور روحانی فوائد اور نفسانی کمالات یا دنیاوی خزانے یا اقتدار وسلطنت مل جائے (پھر بھی) اس کا شوق روز افزوں بڑھتا ہی رہتا اور آتش عشق بھڑکتی ہی رہتی ہے۔ مثلاً شہوت پرست کی، چاہے جتنی خواہشیں پوری ہوجائیں، الذائذ

حاصل ہو جائیں پھر بھی اس کے نفس کی خواہش یہی ہوتی ہے اور دل یہی چاہتا ہے کہ جو خواہشات اس کی دسترس سے باہر ہیں وہ بھی حاصل ہو جائیں اور اس کے شوق کی آگ مزید شعلہ ور ہوتی ہے۔ اسی طرح جاہ طلب آدمی اگر زمین کا کچھ حصہ اس کے قبضہ میں آجائے تو وہ دوسرے حصہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اگر پورا کرۂ ارض اس کے قبضہ میں آجائے تو دیگر کروں کی طرف پرواز کرنا چاہتا اور ان کو بھی اپنے زیر نگیں لانے کی کوشش میں لگ جاتا ہے، مگر اس بے چارے کو یہ پتہ نہیں ہے کہ فطرت کا تقاضا کچھ اور ہے۔ فطری عشق تو محبوب مطلق سے متعلق ہے۔ تمام جوہری، مادی اور ارادی حرکتوں اور تمام قلبی توجہات اور نفسانی میلانات کا محور تو جمیل علی الاطلاق (خدا) ہی ہے، خود وہ لوگ اس کو نہیں سمجھ پاتے۔ یہ محبت و عشق اور یہ شوق و اشتیاق سب کے سب عروج تک لے جانے والا براق اور (خدا تک پہنچنے والی) رفرف ہیں، مگر لوگ ان کو غلط جگہ استعمال کرتے ہیں اور بے جا قید و بند میں گرفتار کر دیتے ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ ہم اپنے اصلی مقصد سے دور ہو گئے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ چونکہ انسان قلباً کمال مطلق کی طرف مائل ہوتا ہے، اس لئے وہ جتنی دنیاوی دولت اور زیبائش دنیا جمع کرتا ہے اس کا دل اتنا ہی اس میں متوجہ ہو جاتا ہے اور چونکہ اس نے یہ سمجھ لیا ہے کہ دنیا اور زیبائش دنیا ہی کمال ہے، اس لئے اس طرف اس کی طمع بڑھتی ہے در اس کا لگاؤ زیادہ ہوتا ہے اور دنیا کی احتیاج بڑھ جاتی ہے اور غربت و محتاجی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ برخلاف اہل آخرت کے کہ ان کی توجہ دنیا کی طرف ہوتی ہی نہیں وہ لوگ آخرت کی طرف جتنا متوجہ ہوتے ہیں اتنا ہی اس دنیا سے ان کی توجہ کم ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ پوری دنیا سے وہ بے نیاز ہو جاتے ہیں اور ان کے دل میں استغنا پیدا ہو جاتا ہے اور دنیا اور اس کی رنگینیوں کو وہ حضرات ناچیز خیال کرنے لگتے ہیں۔ جیسے خدا والے دونوں جہانوں سے مستغنی ہوتے اور دونوں سے قطع تعلق کر لیتے ہیں، وہ صرف غنی علی الاطلاق کی طرف احتیاج رکھتے ہیں اور غنی بالذات (خدا) کا جلوہ ان کے دل کے آئینہ میں نظر آنے لگتا ہے ﴿هنيئاً لهم﴾ ۴۹ "ان کو یہ چیز گوارا ہو"۔

پس (ابتدا میں ذکر کی گئی) حدیث میں اسی بات کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے جس کی اب تک شرح کی گئی کہ (معصومؑ) فرماتے ہیں: "جو شخص صبح و شام اس حالت میں کرے کہ اس کا اہم ترین مقصد دنیا ہو تو خداوند عالم اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان غربت کو قرار دیتا ہے اور جو صبح و شام اس طرح کرے کہ اس کا سب سے اہم ترین مقصد اس کی آخرت ہو تو خدا اس کے دل میں استغنا پیدا کر دیتا ہے"۔

ظاہر ہے جس شخص کی پوری قلبی توجہ آخرت پر ہوگی، اس کی نظروں میں امور دنیا اور اس کی تمام دشواریاں حقیر و آسان معلوم ہوں گی، وہ شخص اس دنیا کو ختم ہونے والی تغیر پذیر اور اپنی گزرگاہ لیکن دین کا مرکز و تربیت گاہ سمجھے گا۔ دنیا کی کسی سختی یا خوشی پر توجہ نہیں دے گا، اس کی ضروریات کم ہو جائیں گی۔ دنیا اور دنیا والوں کی طرف اس کی احتیاج کم (سے کم) ہو جائے گی، بلکہ وہ اس منزل پر پہنچ جائے گا، جہاں احتیاج ہی نہ ہوگی اور (پھر) اس کے امور منظم ہو جائیں گے اس کے کاموں میں نظم و ترتیب پیدا ہو جائے گی اور قلبی و ذاتی غنا حاصل ہو جائے گا۔

اور اگر تم نے اس دنیا کی طرف عظمت و محبت کی نگاہ ڈالی اور تمہارا دل اس کو چاہنے لگا تو محبت ہی کے اعتبار سے تمہاری ضروریات زیادہ ہو جائیں گی اور تمہارے ظاہر و باطن میں غربت نمایاں ہو جائے گی، تمہارے امور پراگندہ و درہم و برہم ہو جائیں گے، تمہارا دل متزلزل و غمناک اور خوفزدہ ہو جائے گا اور تمہارے امور تمہارے حسب دلخواہ نہیں ہوں گے، تمہاری آرزو اور لالچ میں روز بروز اضافہ ہوتا جائے گا۔ غم و حسرت کا تمہارے اوپر غلبہ ہو جائے گا، مایوسی اور پریشانی تمہارے دل میں جڑ پکڑ لے گی۔ چنانچہ حدیث شریف میں بعض ایسے مفاہیم کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے

في الكافي، باسناده عن حفص بن قرط، عن ابي عبدالله علیہ السلام، انه قال ﴿من كثر اشتباكه بالدنيا كان اشد لحسرته عند فراقها﴾ ۳۰؎ حفص بن قرط سے روایت کی گئی ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ''جو کوئی اپنے آپ کو اس دنیا سے بہت زیادہ ملوث کرے گا اس کو دنیا سے جدا ہوتے وقت اتنا ہی زیادہ افسوس ہوگا''۔

وعن ابي يعفور قال سمعت ابا عبدالله علیہ السلام، يقول ﴿من تعلّق قلبُهُ بالدُّنيا تعلّق بثلاث خصالٍ همٍّ لا يفنى وأملٍ لا يُدرك ورجاءٍ لا ينال﴾ ۳۱؎ ابن ابی یعفور سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے امام جعفر صادقؑ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے ''جس کا دل دنیا سے وابستہ ہوگا اس کے دل میں تین چیزیں پیدا ہوں گی زائل نہ ہونے والا غم، نہ پوری ہو سکنے والی خواہش، نہ ملنے والی امید''۔

لیکن اہل آخرت جیسے جیسے دار رحمت حق سے نزدیک ہوتے جاتے ہیں ان کا دل اتنا ہی مسرور و مطمئن اور دنیا و مافیہا سے گریزاں و متنفر ہوتا جاتا ہے۔ اگر خداوند عالم نے ان کیلئے اس دنیا میں رہنے کی

مدت معین نہ کردی ہوتی تو وہ ایک سیکنڈ بھی اس دنیا میں نہ رہتے۔ چنانچہ مولائے کائنات ؑ[۳۲] فرماتے ہیں ""پس وہ لوگ اس عالم میں اہل دنیا کی طرح رنج وغم نہیں اٹھاتے اور آخرت میں بحر رحمت الٰہی میں ڈوبے رہتے ہیں"﴿جعلنا اللہ وایاکم منھم، ان شاء اللہ﴾ ؑ[۳۳] "خدا ہم اور تم کو بھی انہیں لوگوں میں قرار دے، انشاء اللہ"۔

پس اے عزیز! اس وقت تم نے برائیوں کے اس نطفے سے پیدا ہونے والی برائیوں کا ذکر سنا اور یہ سمجھ لیا کہ انسان کو یہ محبت ہلاکت سے دوچار کردیتی ہے اور اس کے ایمان کو اس سے لے لیتی اور اس کی دنیا وآخرت کو درہم وبرہم کردیتی ہے۔ (لہذا) تم دامن ہمت کو کمر سے باندھ لو اور جتنا ممکن ہو اس دنیا سے دل بستگی کو ختم کردو محبت دنیا کو جڑ سے اکھاڑ دو، اس چند روزہ زندگی کو ناچیز سمجھ لو اور عذاب سے بھری ہوئی نعمتوں اور رنج وغم کو حقیر سمجھو اور خدا سے دعا کرو کہ تم کو توفیق عطا کرے اور تمہاری مدد کرے۔ اس رنج وزحمت سے تم کو چھٹکارا دلائے اور تمہارے دل کو اپنے دار کرامت سے مانوس کردے۔

﴿وما عند اللہ خیر وابقیٰ﴾ ؑ[۳۴]

"خدا کے پاس جو ہے وہ خیر اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے"

توضیحات (۱)

۱۔ اصول کافی، ج۲، ص۳۱۹، کتاب ایمان وکفر، باب حب الدنیا، حدیث۱۵۔

۲۔ خوب بنوشتین بادہ در جیل   بازدہ پیہ دور رجیل

۳۔ حدیث ۱، حاشیہ ۱۴۔

۴۔ بحار الانوار، ج ۷۰، ص ۶۳، کتاب ایمان والکفر، باب حب الدنیا وذمہا؛
مرآۃ العقول، ج ۸، ص ۲۴۳، کتاب ایمان والکفر، باب ذم الدنیا والزہد فیہا۔

۵۔ مرآۃ العقول، ج ۱۰، ص ۲۶۴، کتاب ایمان والکفر، باب حب الدنیا

۶۔ نہج البلاغہ فیض الاسلام، ص ۱۱۳۸، حکمت ۲۲۔

۷۔ سورہ نحل، آیت ۳۰/

۸۔ ابوالنضر محمد بن مسعود بن محمد بن عیاش تمیمی "اکابر علمائے شیعہ میں سے تھے تیسری صدی ہجری کے حدیث، تفسیر اور فقہ کے نیز ستون تھے بڑے بڑے محدثین نے ان سے روایت کی ہے۔ مثلاً شیخ کشی صاحب رجال، شیخ جعفر بن محمد عیاشی (ان کے صاحبزادے) آپ کی تصانیف بہت ہیں۔ شیخ طوسی نے دوسو سے زیادہ کا شمار کیا ہے۔ آپ کی مشہور تصانیف میں تفسیر عیاشی، کتاب الصلاۃ، کتاب الصوم، کتاب معرفۃ الناقلین اور کتاب الغیبہ ہے۔

۹۔ عن ابن مسکان عن ابی جعفرؑ فی قولہ ﴿ولنعم دار المتقین﴾ قال الدنیا۔ تفسیر عیاشی، ج ۲، ص ۲۵۸

۱۰۔ دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۱۵، کتاب ایمان والکفر، باب حب الدنیا والحرص علیہا، حدیث

۱۱۔ حدیث ۱، حاشیہ ۵۲۔

۱۲۔ ﴿عن النبیؐ ان للہ تبارک وتعالی سبعین الف حجاب من نور وظلمۃ﴾۔ بحار الانوار، ج ۵۵، ص ۴۵، کتاب السماء والعالم، باب ۵، ذیل حدیث ۱۳۔

۱۳۔ یہ اس آیت کی طرف اشارہ ہے ﴿واذ قال ابراہیم رب ارنی کیف تحیی الموتی قال اولم تؤمن قال بلی ولکن لیطمئن قلبی﴾۔ ترجمہ: جب ابراہیمؑ نے کہا پالنے والے مجھے دکھا دے کہ تو مردوں کو کیونکر زندہ کرتا ہے۔ خدا نے کہا کیا تم ایمان نہیں لائے؟ ابراہیمؑ نے کہا ایمان لایا ہوں مگر اطمینان قلب کیلئے ہے۔ سورہ بقرہ، آیت ۲۶۰۔

۱۴۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۵، ص ۴۸۔

۱۵۔ حضرت علیؑ نے دعائے کمیل میں فرمایا ﴿الٰہی وربی ہبنی صبرت علی عذابک فکیف اصبر علی

فراقک﴾ خداوندا اگر میں نے تیرے عذاب پر صبر بھی کر لیا تو تیرے فراق کو کیونکر برداشت کروں گا؟

مصباح المتہجد وسلاح المتعبد، ص ۷۸۵، شب نیمہ شعبان کے اعمال کے ضمن میں

۱۶۔ یہاں اس حدیث کی طرف اشارہ ہے: ﴿ولهذا لما سُئل بعض ائمتنا عن عموم الآية المذكورة ﴿وإنْ منكُمْ إلّا واردُها كانَ على ربِّكَ حَتْماً مقْضِيّاً﴾ (مریم/۷۱) قال: ﴿جُزْناها وهيَ خامدةٌ﴾ کہ اسی لئے جب ائمہ اطہار میں سے کسی ایک امام سے آیت کے عموم کے بارے میں پوچھا گیا تو معصومؑ نے فرمایا ہم اس سے گزر چکے وہ تو خاموش تھی۔

علم الیقین، ج ۲، ص ۹۷۱۔

۱۷۔ مستدرک الوسائل، ج ۵، ص ۳۴۰، کتاب الصلاۃ، ابواب الذکر، باب ۲۲، حدیث ۲۔

۱۸۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۱۵، کتاب ایمان وکفر، باب حب الدنیا والحرص علیہا، حدیث ۲ و ۳۔

۱۹۔ اس سے مراد مرحوم آیت اللہ شاہ آبادی ہیں۔ حدیث ۱، حاشیہ ۱۵ کی طرف رجوع کیجئے۔

۲۰۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۶ کتاب ایمان وکفر، باب ذم الدنیا والزہد فیہا، حدیث ۲۳۔

۲۱۔ قال رسول اللہﷺ: ﴿إنّ الدّينار والدّرهم أهلكا من كان قبلكُمْ وَهُما مُهلِكاكُمْ﴾۔

اصول کافی، ج ۲، ص ۳۱۶، کتاب ایمان وکفر، باب حب الدنیا والحرص علیہا، حدیث ۶۔

۲۲۔ حدیث ۴، حاشیہ ۲۹۔

۲۳۔ قیامت، ص ۴۷۹۔

۲۴۔ حدیث ۲، حاشیہ ۹۔

۲۵۔ حدیث ۲۲، حاشیہ ۱۸۔

۲۶۔ بحار الانوار، ج ۷۰، ص ۹۱، کتاب ایمان وکفر، باب ۵۳، ذیل حدیث ۲۔

۲۷۔ سورہ انعام، آیت/۹۷۔

۲۸۔ اربعین مجلسیؒ، ص ۷۱، شرح حدیث ۵۔

۲۹۔ ترجمہ گزر چکا ہے۔

۳۰۔ ۳۱۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۲۰، کتاب ایمان وکفر، باب حب الدنیا، حدیث ۱۴ و حدیث ۷۔

۳۲۔ حضرت علیؑ خطبہ ہمام میں فرماتے ہیں: ﴿ولولا الأجلُ الّذي كتبَ اللهُ عليهِمْ لمْ تستقِرَّ أرْواحُهُمْ في أجسادهِمْ طرفةَ عينٍ شوقاً إلى الثّوابِ وخوفاً من العقابِ﴾ اگر خداوند عالم نے ان کیلئے مہلت معین کی ہوتی تو ثواب کے شوق اور عقاب کے خوف سے ان کی روحیں ان کے جسموں میں نہ ٹھہرتیں

۳۳۔ ترجمہ گزر چکا ہے

۳۴۔ سورہ قصص، آیت/۶۰؛ سورہ شوریٰ، آیت/۳۶۔

ساتویں حدیث

بالسند المتصل الى محمد بن يعقوب عن علي بن ابراهيم، عن محمد بن عيسى، عن يونس، عن داود بن فرقد، قال:

قال ابو عبدالله عليه السلام ﴿الغضب مفتاح كل شر﴾

ترجمہ داود ابن فرقد کہتے ہیں امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ''تمام برائیوں کی کنجی غصہ ہے''۔

شرح محقق کبیر احمد بن محمد معروف بہ ''ابن مسکویہ'' ؒ اپنی کتاب ''طہارة الاعراق'' میں جو بہت عمدہ اور حسن ترتیب وحسن بیان میں بے مثال کتاب ہے تحریر فرماتے ہیں جس کا ترجمہ تقریباً یہ ہے

ابن مسکویہ ؒ نے غضب کی تعریف اس طرح کی ہے ''غضب درحقیقت اس نفسانی حرکت کا نام ہے جس کی بنا پر خواہش انتقام کیلئے خون دل میں ایک جوش وہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر جب یہ حرکت سخت ہو جاتی ہے تو غصہ کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور دل کے خون کا جوش پورے دل پر غالب آ جاتا ہے اور دماغ کی تمام شریانوں (رگوں) میں ایک تاریک ومضطرب دھواں بھر جاتا ہے جس کی وجہ سے عقل کی حالت تباہ وبرباد ہو جاتی ہے اور اس کا عمل کمزور ہو جاتا ہے۔ بقول حکماء غصے کی حالت میں انسان کی مثال اس غار کی سی ہو جاتی ہے جس میں آگ جلانے کے بعد وہ شعلوں سے بھر جائے اور اس غار کی فضا آگ کے شعلوں اور دھویں سے بھر جائے اور سیٹی کی سی آواز نکلنے لگے اور بھڑکتی آگ کی شدت کی وجہ سے اس میں آوازیں گونجنے لگے اس وقت اس کا علاج مشکل اور آگ بجھانا بہت دشوار ہو جاتا ہے اور اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ آگ بجھانے کیلئے جو چیز اس میں ڈالی جائے وہ بھی اسی (آگ) کا جزء بن جاتی ہے اور مادے

(ایندھن) میں مزید شدت پیدا کر دیتی ہے۔ اسی لئے انسان (غصے کے وقت) رشد وہدایت سے اندھا ہو جاتا ہے، وعظ و پند (سننے سے) بہرا ہو جاتا ہے، بلکہ موعظہ غصے میں اضافہ کا سبب بن جاتا اور اس کا شعلہ مزید بھڑک جاتا ہے اور غصے کی حالت میں انسان کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا" اس کے بعد (ابن مسکویہ") فرماتے ہیں "بقراط کہتا ہے جو کشتی طوفان باد (وباراں) میں گھر جائے اور سمندر کی موجیں اس کو ایسے بھنور میں ڈال دیں جہاں سمندری چٹانیں ہوں اس کے بعد بھی اس کشتی کے بچاؤ کیلئے مجھ کو کہیں زیادہ امید ہے بہ نسبت اس غصے کے بچاؤ سے جب انسان کی آتش غیظ و غضب بھڑک اٹھے، کیونکہ ایسی صورت میں کشتی کے ناخدا مہارت اور چارہ جوئی سے اس کو نجات دے سکتے ہیں جبکہ اگر نفس کی غصے کی آگ شعلہ ور ہو جائے تو اس سے بچاؤ کی کوئی امید نہیں ہے، کیونکہ جو بھی صورت اختیار کی جائے گی۔ مثلاً وعظ و نصیحت کرو یا فروتنی کرو، گریہ وزاری کرو۔ اس کا شعلہ اور بھی بھڑکے گا، اور غصے میں اور اضافہ ہوگا"۔ انتہی۔

پہلی فصل: قوۂ غضبیہ کے فوائد

قوت غضبیہ خدا کی ایک عظیم نعمت ہے۔ جس کی وجہ سے دنیا و آخرت کی تعمیر کی جا سکتی ہے اور اس کی وجہ سے خاندانی نظام، نوع اور شخص کے بقاء کی حفاظت کی جا سکتی ہے۔ ایک مثالی معاشرے کی تشکیل اور معاشرتی نظام میں اس کو بہت زیادہ دخل حاصل ہے۔ اگر حیوان کے اندر یہ مستحسن قوت نہ ہوتی تو وہ قدرتی خطرات سے اپنی حفاظت نہ کر پاتا اور زوال و اضمحلال کی نذر ہو جاتا اور اگر انسان کے اندر یہ قوت نہ ہوتی تو نہ ان کمالات اور ترقیوں سے محروم ہو جانے کے علاوہ افراط و تفریط کی بنا پر ایسی اخلاقی برائیوں اور پست اقدار کا شکار ہو جاتا جن پر بہت سی خامیوں اور عیوب مرتب ہوتے ہیں، مثلاً ڈر، کمزوری، سستی، کاہلی، طمع، بے صبری، عدم استحکام ور یہ صفات وہاں ہوتے کہ جہاں نہ ہونا ضروری ہے۔ (اسی طرح) آرام طلبی، پیچھے پیچھے سے رہنے اور لوگوں کے دباؤ کو قبول کر لینے کی عادت، ظلم کے سامنے سر جھکانے کی خصلت، اپنے یا خاندان والوں کو پیش آنے والے رذائل اور برائیوں کو (خاموشی سے) برداشت کر لینے کی صفت، بے غیرتی، کم ہمتی (اگر قوت غضبیہ نہ ہوتی تو) یہ سب چیزیں انسان میں پیدا ہو جاتیں، بلکہ قرآن نے تو خود مومنین میں اس صفت کے ہونے پر مدح فرمائی ہے: ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ "وہ کفار پر بہت سخت اور آپس میں ایک دوسرے پر رحم کرنے والے ہیں"۔

مر بمعروف ونہی از منکر کو بروئے کار لانا، حدود وتعزیرات کا جاری کرنا، دوسری دینی وعقلی حکمت عملیوں کو عملی جامہ پہنانا قوۂ غضبیہ کی مستحسن صفت کے بغیر ناممکن ہے۔ اس لئے جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ قوۂ غضبیہ کو کچل دینا یا اس کو ٹھنڈا کر دینا نفس کا کمال اور اس کیلئے معراج ہے وہ غلطی پر ہیں اور بہت بری خطا (وگناہ عظیم) کے مرتکب ہیں اور حد کمال اور مقام اعتدال (کے درمیان فاصلے) سے غافل ہیں۔ ان بے چاروں کو یہ بھی پتہ نہیں ہے کہ خداوند عالم نے حیوانات کی تمام اقسام میں اس مستحسن صفت کو بے کار نہیں خلق فرمایا ہے۔ خدا نے تو تمام اولاد آدمؑ میں اس قوت کو ملکی وملکوتی زندگی کا سرمایہ، ورخیرات وبرکات کی کنجی قرار دیا ہے۔ اگر یہ اچھی قوت نہ ہوتی تو انسان دشمنان دین کے ساتھ نہ جہاد کر سکتا نہ انسانی معاشرے کے نظام کی حفاظت کر سکتا نہ جان ومال وناموس اور دیگر نوامیس الٰہیہ کی (حمایت و) حفاظت کر سکتا ہے۔ (بلکہ) نساں کا سب سے بڑا دشمن خود اس کا نفس ہے اس سے بھی جہاد نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی معاشرہ اور افراد کو ظلم وتعدی سے بچا سکتا اور نہ ہی حدود وسرحدوں (کا دفاع کر پاتا نہ) موذی اور نقصان دہ چیزوں سے حفاظت کر سکتا نہ معاشرے کی۔ اسی لئے حکما نے اس قوت کی کمی اور سستی کو دور کرنے کیلئے علاج تجویز کئے ہیں۔ اس کو بیدار کرنے ور حرکت میں لانے کیلئے علمی وعملی معالجے معین کئے ہیں۔ (مثلاً) اہم اور حساس امور کیلئے قدم کرنا، میدان جنگ میں جانا اور دشمنان خدا سے جہاد کیلئے اپنے کو پیش کرنا وغیرہ (بلکہ) بعض فلسفیوں سے منقول ہے کہ وہ لوگ خطرناک جگہوں پر جا کر ٹھہرتے تھے اور اس طرح اپنے نفوس کو بڑے خطرات میں ڈال دیتے تھے، سمندر میں شدید طوفان کے وقت کشتی میں سوار ہو کر دھر اُدھر چکر لگاتے تھے تاکہ ان کے نفوس کو خطرات وخوف سے نجات حاصل ہو جائے اور کسالت وسستی سے رہائی حاصل کر سکے۔

بہر صورت نسان وحیوان کے باطن میں قوت غضبیہ موجود ہے ورخدا نے اس میں اس کو ودیعت کیا ہے۔ بس تنی بات ضرور ہے کہ بعض اشخاص میں یہ قوت خاموش وافسردہ ہے، جیسے خاکستر کے اندر انگارے۔ اس لئے ہر شخص پر لازم ہے کہ اگر اپنے ندر خاموشی، سستی اور بے غیرتی محسوس کرے تو (فوراً) اس کی مخالف چیزوں سے اس کا علاج کر کے اپنے نفس کو اس حال سے باہر د کر اس کو معتدل بنائے تاکہ شجاعت کا مستحق بنے اور شجاعت ملکات فاضلہ اور صفات حسنہ میں سے ہے۔ اس کے بعد (انشاء اللہ) اس بارے میں بھی بحث کی جائے گی۔

دوسری فصل: غصے میں افراط کی مذمت

جس طرح غصے کا حد اعتدال سے کم ہو جانا صفت رذیلہ میں سے ہے اور بہت سی برائیوں کا سبب ہے، جیسا کہ آپ نے پڑھا، اسی طرح حد اعتدال سے تجاوز کرنا بھی اخلاقی برائیوں اور بہت سی خامیوں کا سبب ہوا کرتا ہے۔ کافی شریف کی ایک حدیث اس کی برائی پر دلالت کرنے کیلئے کافی ہے:

عن أبي عبدالله علیہ السلام، أنه قال قال رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم. ﴿الغَضَبُ يُفسِدُ الايمانَ كما يُفسِدُ الخلُّ العسلَ﴾ ۸ امام جعفر صادقؑ سے روایت کی گئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: "رسول خداؐ نے فرمایا غصہ ایمان کو اسی طرح خراب کر دیتا ہے جس طرح سرکہ شہد کو خراب کر دیتا ہے" کیونکہ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ نفس غصے کی شدت میں دین خدا سے پلٹ جایا کرتا ہے اور اس کا نور ایمان بجھ جاتا ہے، غصے کی آگ اور اس کی ظلمت عقائد حقہ کو جلا دیتی ہے، بلکہ کفر تک پہنچا کر اس کی ہلاکت ابدی کا سبب بن جاتی ہے اور پھر نفس اس وقت متوجہ ہوتا ہے جب ندامت وپشیمانی کا بھی کوئی فائدہ نہیں رہ جاتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہی غصے کی آگ جو دل میں لگتی ہے وہ شیطان کی چنگاری ہو، جیسا کہ حضرت امام محمد باقرؑ نے فرمایا ﴿إنَّ هذا الغضبَ جمرةٌ مِنَ الشَّيطانِ تُوقَدُ في قلبِ ابنِ آدم﴾ ۹ "یہ غضب کی آگ شیطان کی وہ چنگاری ہے جس کو اس نے اولاد آدم کے دل میں بھڑکائی ہے"۔ عالم آخرت میں یہ غصہ آتش غضب الٰہی کی صورت میں نمودار ہوگا، جیسا کہ امام محمد باقرؑ نے کافی شریف کی یک حدیث میں فرمایا ہے۔ ﴿مكتوبٌ في التوراة فيما ناجى اللهُ عزَّوَجلَّ به موسىٰ: يا موسى أمسِكْ غضبكَ عمَّن ملَّكتُكَ عليه، أكُفَّ عنكَ غضبي﴾ ۱۰ "خداوند عالم نے جناب موسیٰؑ کو جو اسرار بتائے اس کے ضمن میں توریت کے اندر لکھا ہے کہ خدا نے موسیٰؑ سے کہا: اے موسیٰ! جن لوگوں پر میں نے تم کو مسلط کیا ہے ان پر اپنے غصے کو روکو تاکہ میں اپنے غصے کو تم سے روکوں"۔

یاد رکھو آتش غضب الٰہی سے زیادہ دردناک کوئی آگ نہیں ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام سے ان کے حواریوں نے پوچھا تمام چیزوں سے سخت تر کون سی چیز ہے؟ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا۔ غضب خدا۔ انہوں نے پھر پوچھا اے ابن مریم! ہم کس طرح غضب خدا سے اپنے کو بچا سکتے ہیں؟ فرمایا غصہ نہ کرکے۔ ۱۱

اس سے معلوم ہوا کہ غضب خدا ہر چیز سے زیادہ سخت اور شدید ہے اور اس کے غصے کی آگ سب سے زیادہ جلانے والی ہے اور غصے کی صورت اس عالم میں وہی ہے جو عالم آخرت میں غضب خدا کی صورت ہوگی اور جس طرح غصہ دل سے ظاہر ہوتا ہے، ہوسکتا ہے آتش غضب، الٰہی بھی جس کا مبدأ غصہ اور دیگر قلبی برائیاں ہیں، باطن قلب سے ظاہر ہوکر تمام ظاہر کو گھیر لیں اور انسان کے ظاہری حواس خمسہ، آنکھ، کان، زبان وغیرہ سے اس کے بھڑکتے دردناک شعلے ظاہر ہوں، بلکہ یہ حواس خمسہ وہ دروازے ہیں جو جہنم میں کھلتے ہیں۔ انسانی اعمال کے جہنم اور جسمانی دوزخ کی آگ انسان کے ظاہری بدن کو اپنی لپیٹ میں لے کر پھر اس کے باطن کا رخ کرتی ہے پس انسان ان دونوں جہنموں کے درمیان فشار عذاب میں مبتلا ہے۔ ایک جہنم تو وہ ہے جو دل کے اندر سے ظاہر ہو کر مغز کے رستے سے اس کی آگ اور شعلے پورے بدن کو اپنے لپیٹ میں لے لیں گے اور دوسرا جہنم وہ ہے جو برے اعمال و افعال کی ظاہری شکل و صورت کا نتیجہ ہوگا، یہ ظاہر سے باطن کی طرف صعود کرے گا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ جلنے اور جل کر پگھلنے کے علاوہ اور کیسے کیسے دباؤ اور کیسی کیسی زحمتوں کا سامنا ہوگا۔ تم خیال کرتے ہوگے کہ جہنم (کے شعلوں) کا احاطہ اتنا ہی ہے کہ جتنا تم تصور کرتے ہو! یہاں (کے شعلے) صرف ظاہر اور سطح کا احاطہ کرتے ہیں، لیکن وہاں (کے شعلے) اندر، باہر، سطح اور عمق کا حاطہ کر لیتے ہیں اور اگر خدانخواستہ غصہ کسی انسان کی ایسی مستقل صفت بن جائے کہ جس کی آخری شکل غصہ کی صورت ہو جائے تب تو مصیبت اور بڑھ جائے گی، (کیونکہ) برزخ و قیامت میں اس کی صورت ایسے درندے کی ہوگی جس کی اس دنیا میں کوئی مثال نہیں ہے۔ اس لئے کہ (اس حالت میں) انسان کی جو درندہ والی شکل ہوگی اس کا قیاس دنیا کے کسی جانور پر کیا ہی نہیں جاسکتا۔ جس طرح اپنے منفرد کمال کی بنا پر کوئی (جاندار) بھی اس عجوبۂ دہر (انسان) کی برابری نہیں کرسکتا۔ اسی طرح نقص و کمزوری کی انتہا میں اور صفات رذیلہ و ملکات خبیثہ کے اعتبار سے بھی کوئی مخلوق اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ اسی انسان کیلئے ﴿ان ھُمْ الّا کالأنعام بل ھُمْ اضل﴾ ۱۲ "وہ لوگ تو جانور، بلکہ اس سے بھی زیادہ گمراہ و بدتر ہیں" آیا ہے اور انسان ہی کی سنگدلی کے بارے میں ﴿فھی کالحجارۃ او اشدُّ قسوۃ﴾ ۱۳ "یہ مثل پتھر کے سخت ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت ہیں" آیا ہے۔

آپ نے جو کچھ بھی پڑھا یہ اس شعلۂ سوزناک سے پیدا ہونے والی برائیوں کا ایک شمہ ہے، وہ بھی اس صورت میں کہ جب اس سے دوسرے گناہ اور فسادنہ پیدا ہوں، (کیونکہ) یہ ندھیر پھیلانے والی آگ

ہے جو انسان کے دنیائے باطن میں بھر جاتی ہے اور محبوس اور دم گھٹنے والی فضا بن کر نور ایمان کو بجھا دیتی ہے۔ جس طرح باہم پیچیدہ اور گلا گھونٹنے والا شعلہ کالے دھوؤں میں لپیٹ کر روشنی کو بجھا دیتا ہے اور یہ بات نہ صرف بعید ہے، بلکہ یہ ناممکنات میں سے ہے کہ غصے کی شدت اور شعلۂ غضب کے بھڑکتے ہوئے (عالم میں) انسان گناہوں، بلکہ ہلاک کرنے والی چیزوں سے نجات حاصل کر سکے، بلکہ اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ ایک منٹ کے غصہ اور ملعون شیطانی چنگاری کے شدت اشتعال کے وقت انسان فسق اور ہلاکت کے گہرے کھڈ میں گر پڑتا اور نعوذ باللہ انبیاءؑ و مقدسات کو گالی دینے لگتا ہے۔ نفس مظلوم کو قتل کر دیتا محرمات کی ہتک کا مرتکب ہوتا اور اپنی دنیا و آخرت کو برباد کر لیتا ہے۔ جیسا کہ کافی کی ایک حدیث شریف میں ہے:

عن ابي عبداللّٰه علیہ السلام، في حديث له: كان ابي يقول ﴿ايّ شيءٍ اشدُّ من الغضب؟ انّ الرّجل ليغضب فيقتل النّفس الّتي حرّم اللّٰه ويقذف المحصنة﴾ [۱] امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: ''میرے والد ماجد فرمایا کرتے تھے، غصے سے زیادہ کونسی شئے شدید ہے؟ انسان غصے میں نفس محترمہ کو قتل کر دیتا ہے اور شوہر دار عورت پر بدچلنی کا (جھوٹا) الزام لگاتا ہے''۔

زیادہ تر بڑے فتنے اور برے امور اسی غصے کی وجہ سے واقع ہوتے ہیں۔ ہر انسان کو اپنی سلامتی کی حالت میں غصہ کی حالت سے زیادہ خوفزدہ رہنا چاہیے اور جو اس شعلہ ور آگ کا شکار ہو سکون کی حالت میں اس کے علاج کی فکر کرنی چاہیے اور اس کے ابتدائی اسباب و شدت غصہ میں اس کے برے اثرات اور آخر میں اس کی برائیوں سے نجات حاصل کرنے کیلئے غور و فکر کرنی چاہیے۔ اس کو یہ سوچنا چاہیے کہ جس قوت کو خداوند عالم نے نظام عالم کی حفاظت اور نوع و شخص کی بقا، خاندانی نظام کو مرتب کرنے اور بنی نوع انسان کی (ترقی) کی خاطر حدود و حقوق کی حفاظت کیلئے مرحمت فرمایا ہے اور جس کے زیر سایہ ظاہر و باطن کے نظام، عالم غیب و شہادت کی اصلاح ہونی چاہیے۔ اگر انسان اس قوت کو اس کے برخلاف اور مرضی الٰہی کے مخالف اور مقصد پروردگار کے برعکس استعمال کرے تو اس نے کتنی بڑی خیانت کی ہے اور کن ملامتوں اور عقاب کا مستحق اور کن سزاؤں کا سزاوار ہے؟ کتنا ظالم و جاہل ہے کہ اس نے خدا کی دی ہوئی امانت خدا کو واپس نہ کی؟

یہ تو بہت آسان ہے کہ انسان اس قوت کو دشمنی اور غضب الٰہی مول لینے میں خرچ کر دے، مگر ایسے شخص کو غضب الٰہی سے امان نہیں ملے گی۔ اس لئے غصے سے پیدا ہونے والے برے اخلاق و اعمال کے

بارے میں غور وفکر کرے اوراس بری عادت کے اثرات میں سے ہر ایک ہمیشہ کیلئے انسان کو مبتلا کر سکتا ہے اور پھر دنیا میں تو زحمت ومصیبت میں مبتلا رہے گا، بلکہ آخرت میں بھی عذاب وعقاب میں گرفتار رہے گا۔

اس خلاقی برائیوں میں سے ایک بات یہ ہے کہ بندگان خدا میں کینہ پیدا ہو جاتا ہے، بلکہ کبھی تو انبیاءؑ واولیاءؑ سے کینہ ودشمنی کا سبب بن جاتا ہے۔حد یہ ہے کہ کبھی ذات مقدس واجب الوجود (خدا) جو ولی النعم ہے اس سے بھی کینہ پیدا ہوتا ہے۔ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اس کی قباحت اور برائی کس درجہ عظیم ہے؟ میں خدا کی پناہ چاہتا ہوں نفس سرکش کی اس سرکشی سے کہ ایک لمحہ اس کی لگام ڈھیلی چھوڑ دی جائے تو انسان کو خاک مذلت میں گرا دیتا ہے اور ہلاکت ابدی تک پہنچا دیتا ہے۔ اسی طرح غصے کی ایک برائی حسد ہے کہ جس کی تھوڑی سی برائیاں حدیث پنجم میں بھی بیان کی جا چکی ہیں، ان دونوں کے علاوہ دیگر (بے حساب) اخلاقی برائیاں غصے سے پیدا ہوتی ہیں۔

غصے کی حالت میں سرزد ہونے والے اعمال کی برائیوں کی تو کوئی انتہا ہی نہیں ہے، ہو سکتا ہے انسان کفر بکنے لگے یا (نعوذ باللہ) انبیاءؑ واولیاءؑ کو دشنام دینے لگے، حرمات الٰہی کی بے حرمتی کردے، نوامیس محترمہ کی بے عزتی کردے، پاکیزہ نفوس کو قتل کردے، مظلوم گھرانہ کو خاک مذلت میں پہنچا دے، کسی خاندان کے نظام کو برباد کردے، رازوں کو فاش کردے، پردوں کو درمیان سے اٹھا دے، اس کے علاوہ دیگر برائیاں بھی ہیں جو غصے کی جلا کر برباد کر دینے والی آگ کی لپیٹ میں آنے کی صورت میں رونما ہو سکتی ہیں۔ اسی لئے اس عادت کو "نفسانی امراض کی ماں" کہا جا سکتا اور ہر برائی کی کنجی قرار دیا جا سکتا ہے اور غصے کے مقابلہ میں غصہ کو پی لینا اور آتش غضب کو بجھا دینا تمام معاملات کو سدھارنے کا سبب جوامع الکلم ہے اور تمام محاسن کا نقطۂ ارتکاز ہے اور مجموعۂ کرامات ہے۔ چنانچہ کافی کی حدیث شریف میں ہے۔

عِدَّةٌ مِنْ أَصْحَابِنَا، عَنْ أَحْمَدَ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ خَالِدٍ، بِإِسْنَادِهِ عَنْ أَبِي عَبْدِاللهِ عليه السلام، أَنَّهُ قَالَ سَمِعْتُ أَبِي يَقُولُ ﴿أَتَى رَسُولَ اللهِ رَجُلٌ بَدَوِيٌّ، فَقَالَ إِنِّي أَسْكُنُ الْبَادِيَةَ فَعَلِّمْنِي جَوَامِعَ الْكَلَامِ فَقَالَ آمُرُكَ أَنْ لَا تَغْضَبَ فَأَعَادَ عَلَيْهِ الْأَعْرَابِيُّ الْمَسْأَلَةَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ حَتَّى رَجَعَ الرَّجُلُ إِلَى نَفْسِهِ فَقَالَ لَا أَسْأَلُ عَنْ شَيْءٍ بَعْدَ هَذَا، مَا أَمَرَنِي رَسُولُ اللهِ إِلَّا بِالْخَيْرِ قَالَ وَكَانَ أَبِي يَقُولُ أَيُّ شَيْءٍ أَشَدُّ مِنَ الْغَضَبِ؟ إِنَّ الرَّجُلَ لَيَغْضَبُ فَيَقْتُلُ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللهُ وَيَقْذِفُ الْمُحْصَنَةَ﴾[1]

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: میں نے اپنے والد کو فرماتے ہوئے سنا کہ "ایک بادیہ نشین عرب رسول خداؐ کے پاس آکر بولا میں بادیہ نشین ہوں، مجھے جوامع الکلم کی تعلیم فرمائیے؟ (یعنی ایسی چیز جس کے الفاظ کم اور معانی زیادہ ہوں)۔ رسول خداؐ نے فرمایا میں تجھ کو حکم دیتا ہوں کہ غصہ نہ کرنا۔ اس شخص نے تین مرتبہ یہی سوال کیا اور آخر میں اپنے آپ سے کہنے لگا میں اب اس کے بعد کوئی سوال نہیں کروں گا، کیونکہ رسول خداؐ نے مجھے خیر ہی کا حکم دیا ہے۔ امام صادقؑ فرماتے ہیں میرے والد فرماتے تھے، غصے سے زیادہ کونسی چیز سخت ہے؟ انسان کو جب غصہ آجاتا ہے تو نفس محترمہ کو قتل کر دیتا ہے اور شوہردار عورت پر (زنا کا) الزام لگاتا ہے"۔

پس ہر عقلمند انسان کا فریضہ ہے کہ سکون نفس اور عدم غصہ کی حالت میں غصہ کے برے نتائج اور غصہ پی لینے کے فوائد میں غور وفکر کر کے اپنے لئے لازم قرار دے لے کہ ہر قیمت اور ہر رنج و زحمت کے باوجود اس آتش غضب اور شعلہ فروزاں کو اپنے دل سے بجھا کر اپنے دل کو اس کی کدورت وظلمت سے پاک کرے گا اور یہ کام خواہش نفس کے خلاف عمل کرنے، غصے کے نتائج میں غور وفکر کرنے اور نفس کو نصیحت کرنے سے ممکن ہوسکتا ہے اور اس طرح وہ برے اخلاق اور برے ملکات کو اپنے نفس سے دور کر سکتا ہے اور تمام محاسن وملکات حسنہ کو اپنے دل میں جگہ دے کر اپنی روح کو اس سے مزین کر سکتا ہے۔

تیسری فصل۔ غصہ بھڑکنے کی صورت میں اسکا علاج

آتش غضب کے بھڑکنے کی صورت میں بھی اس کیلئے دو قسم کے علاج ہیں "علمی و عملی"۔

علمی طریقہ ذکر شدہ امور میں غور وفکر کرنا اور یہ خود غصے کے عملی علاج کا ایک طریقہ ہے۔

جہاں تک عملی طریقہ ہے، اس کا سب سے عمدہ طریقہ انصراف نفس، یعنی اپنی خواہش نفس کو نظرانداز کرنا ہے، اور یہ غصے کے ابتدائی مرحلہ میں ممکن ہوتا ہے۔ کیونکہ غصہ آگ کی طرح تھوڑا تھوڑا کر کے بھڑکتا اور شدید ہوتا ہے، یہاں تک کہ (جب اس کا تنور گرم ہوجاتا ہے اور اس کے شعلے بھڑکنے لگتے ہیں تب) انسان اپنے آپ سے بے قابو ہوجاتا اور یہ عقل وایمان کے نور کو بجھا دیتا اور چراغ ہدایت خاموش ہوجاتا ہے اور پھر انسان کو بے چارہ وذلیل کر دیتا ہے۔ (اس لئے) انسان کو چاہئے کہ غصہ بھڑکنے سے پہلے اور آتش غضب کے شعلہ ور ہونے سے قبل اپنے کو دوسرے کاموں میں لگادے، (مثلاً) جس جگہ غصہ کے اسباب

فراہم ہوئے ہیں وہاں سے چل دینا یا اپنی حالت میں تغیر پیدا کرنا، (مثلاً) بیٹھا ہے تو کھڑا ہو جائے، کھڑا ہے تو بیٹھ جائے یا ذکر الٰہی میں مشغول ہو جائے، بلکہ بعض حضرات ایسی صورت میں ذکر خدا کو واجب جانتے ہیں یا کسی اور کام میں مشغول ہو جائے۔ بہر حال ابتدا میں اس پر قابو پالینا بہت آسان ہے اور اس کے دو فائدے ہیں

۱۔ ایسی صورت میں اپنے نفس کو سکون میں لائے اور شعلہ غضب کو دھیما کر دے۔

۲۔ انسان نفس کے بنیادی علاج کی طرف توجہ کرے۔ اگر کچھ دن انسان اپنی حالت کو قابو میں رکھے اور نفس سے اسی طرح کا رویہ اپنائے تو اس میں بالکل تغیر پیدا ہو جائے گا اور وہ اعتدال پر آ جائے گا۔ کافی کی بعض احادیث شریفہ میں اس مطلب کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے۔ چنانچہ روایت کی گئی ہے

بإسناده عن أبي جعفر عليه السلام قال: ﴿إنَّ هذا الغضب جمرةٌ من الشيطان توقَدُ في قلب ابن آدم وإنَّ أحدكُمْ إذا غضب احمرَّتْ عيناهُ وانتفختْ أوداجُهُ ودخل الشيطان فيه فإذا خاف أحدكم ذلك من نفسه فليلزم الأرض فإنَّ رجز الشيطان يذهبُ عنه عند ذلك﴾ ۱۸

حضرت باقر العلوم نے فرمایا "بے شک غصہ بنی آدم کے دل میں چمکتی ہوئی چنگاری ہے۔ تم میں سے جب کوئی غصے میں آتا ہے تو اس کی آنکھیں سرخ ہو جاتی اور گلے کی رگیں پھول جاتی ہیں اور شیطان اس میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس لئے جب تم میں سے کسی کو ایسا خطرہ محسوس ہو تو (اگر کھڑے ہو تو زمین پر) بیٹھ جاؤ، کیونکہ اس طرح اس سے شیطانی پلیدی دور ہو جائے گی"۔

وبإسناده، عن ميسر قال: ذكر الغضبُ عند أبي جعفر عليه السلام، فقال: ﴿إنَّ الرَّجُلَ ليغضبُ فما يرضى أبداً حتى يدخُلَ النار، فأيُّما رجُلٍ غضب على قومٍ وهُوَ قائمٌ فليجلس من فوره، ذلك فإنَّهُ سيذهَبُ عنهُ رجزُ الشيطان، وأيُّما رجُلٍ غضب على ذي رحمٍ فليدنُ منهُ فليمسَّهُ، فإنَّ الرحم إذا مُسَّتْ سكنت﴾ ۱۹

راوی کہتا ہے حضرت امام محمد باقر کی مجلس میں غصے کا ذکر آ گیا تو حضرت نے فرمایا "جب انسان کو غصہ آ جاتا ہے تو وہ غصہ انسان کو جہنم پہنچائے بغیر راضی نہیں ہوتا، (اس کا غصہ اس وقت تک ٹھنڈا نہیں ہوتا جب تک اس کو جہنم واصل نہ کر دے)۔ پس تم میں سے اگر کسی کو کسی قوم پر غصہ آ جائے اور وہ کھڑا ہو تو فوراً بیٹھ جائے تاکہ اس سے شیطان کا وسوسہ دور ہو جائے اور جس کو کسی رشتہ دار پر غصہ آ جائے تو وہ اس کے

قریب جاکر اپنے کو اس سے مس کرے، اس لئے کہ رحم کو جب مس کیا جاتا ہے تو وہ غصہ ختم ہو جاتا ہے"۔

اس حدیث شریف میں غضب کے ظہور کے دوران دو عملی علاج کی طرف اشارہ ملتا ہے:

ایک تو عمومی علاج ہے، یعنی (کھڑے سے) بیٹھ جانا اور اپنی حالت میں تغیر پیدا کرنا، جیسا کہ دوسری حدیث میں ہے کہ اگر بیٹھے ہوئے غصہ آجائے تو کھڑا ہو جائے[۲۰] اور اہل سنت کے یہاں روایت ہے کہ رسول خدا کو جب غصہ آتا تھا اور آپ کھڑے ہوتے تو بیٹھ جاتے تھے اور بیٹھے ہوتے تو لیٹ جاتے تھے۔ اس طرح آپ کا غصہ ختم ہو جاتا تھا۔[۲۱]

دوسرا علاج، صرف قرابت داروں سے متعلق ہے کہ اگر ایک قرابت دار کو دوسرے قرابت دار پر غصہ آجائے تو فوراً اس کو جاکر مس کرے غصہ ختم ہو جائے گا، یہ سب طریقہ علاج اس شخص کا ہے جس کو غصہ آجائے اور وہ خود اپنا علاج کرنا چاہے۔

اور اگر دوسرے لوگ اس غصہ میں آئے ہوئے شخص کا علاج کرنا چاہیں تو اگر غصہ ابھی ابتدائی منزل میں ہے تو کسی ایسے علمی یا عملی طریقے سے علاج کریں جس کا ذکر ہو چکا ہے، لیکن اگر غصے میں شدت ہو اور اس کے شعلے بھڑکتے رہیں تو اس کو نصیحت نہ کریں، کیونکہ نصیحت سے برعکس نتیجہ نکلے گا اور اس کا علاج اس طرح مزید دشوار ہو جائے گا۔ البتہ اس کو کسی ایسے شخص سے ڈرایا جائے جس کا اس پر رعب و دبدبہ ہو۔ اس لئے کہ انسان کو صرف انہیں لوگوں پر غصہ آتا ہے جن کے مقابلے میں وہ اپنے آپ کو طاقتور سمجھتا ہے یا کم از کم اپنے برابر کا سمجھتا ہے، لیکن جن لوگوں کو اپنے اوپر غالب سمجھتا ہے ان پر غصہ نہیں کرتا، بلکہ اس کے دل میں خون جوش مارتا ہے اور باطنی اشتعال کا سبب بنتا ہے اور انسان اندر ہی اندر کڑھتا رہتا ہے اور اس کے دل میں ایک حزن و ملال پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے غصے کی شدت و اشتعال کا علاج بہت ہی مشکل و دشوار ہے۔ نعوذ باللہ منہ۔

چوتھی فصل

غصے کا علاج اور اس کے اسباب کی بیخ کنی کرنا

غصے کے بنیادی علاجوں میں ایک تو غصے میں لانے والے اسباب کے مادے کا قلع قمع اور غصہ دلانے والے اسباب وعلل کا ازالہ کرنا ہے ایسے اسباب تو بہت ہیں، مگر میں یہاں صرف ان اسباب کا ذکر کروں گا جو اس کتاب کے متناسب ہوں گے۔

ایک سبب حب نفس ہے اور جس سے حب مال، حب جاہ، حب عزت و منزلت ارادے کی بالادستی اور اقتدار پرستی بھی پیدا ہوتی ہے اور یہ سب نوعاً آتش غضب کو ہیجان میں لانے والے اسباب ہیں، کیونکہ جس شخص کو ان چیزوں سے محبت ہوتی ہے وہ ان چیزوں کو بھی بہت اہمیت دیتا ہے اور ان چیزوں کی نسبت اس کے دل میں زیادہ اہمیت پیدا ہوتی ہے۔ ان میں سے کسی کی راہ میں اگر اس کیلئے رکاوٹ پیدا ہو جائے یا مزاحمت کا امکان بھی پیدا ہو جائے تو وہ بے موقع غصے میں آ جاتا ہے اور جوش و خروش کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے اور پھر اسپنے اوپر قابو نہیں رکھ پاتا اور حرص و طمع اور دیگر وہ برائیاں جو نفسانی خواہشات اور حب جاہ و منزلت کی بنا پر دل میں پیدا ہوتی ہیں اس کے ہاتھ سے لگام چھین لیتی ہیں اور نفس کے تمام کاموں کو عقل و شرع کے راستے سے منحرف کر دیتی ہیں۔ البتہ اگر ان چیزوں سے اس کی محبت شدید نہ ہو تو پھر وہ ان امور کو کم اہمیت دیتا ہے ورترک حب جاہ و منزلت اور اس طرح کی دوسری چیزوں سے دور رہنے پر حاصل ہونے والے دلی سکون وراس سے پیدا شدہ اطمینان کو فوقیت دیتا ہے، ور پھر وہ عدل و تصاف کے خلاف قدم نہیں اٹھاتا اور بغیر کسی تکلیف و زحمت کے سختیوں اور زندگی کے نشیب و فراز کو بردباری سے برداشت کرتا ہے اور صبر کی لگام بھی اس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پاتی اور نہ وہ بے موقع و بے اندازہ غصہ کرتا ہے، ور اگر حب دنیا اس کے دل سے نکل جائے اور یہ بری صفت بالکل ختم ہو جائے تو دل کی تمام برائیاں رخصت ہو جائیں گی اور ان کی جگہ مملکت روح میں اخلاقی خوبیاں لے لیں گی۔

دوسرا سبب غصے کے بھڑکنے کا یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی جہالت و نادانی کی وجہ سے غصہ اور اس سے حاصل ہونے والی برائیوں کو کمال سمجھتا ہے اور ان کا شمار محاسن میں کرتا ہے، جبکہ یہ چیزیں عظیم ترین نقائص اور بدترین رذائل ہوتی ہیں چنانچہ بعض جاہل و نادان انہی برائیوں کو شجاعت و شہامت اور عظمت خیال کرتے ،ور اس کی تعریف و توصیف کرتے ہیں کہ میں نے ایسا کر دیا ویسا کر دیا۔ ایسے لوگ شجاعت کو جو مؤمنین کے عظیم ترین صفات اور صفات حسنہ میں سے ہے بدترین صفت اور ہلاک کرنے والی صفت غضبیہ میں فرق نہ کرنے کی غلطی کا مرتکب ہوتے ہیں۔ اس لئے پہلے آپ یہ سمجھ لیں شجاعت غصے کے علاوہ دوسری چیز ہے۔ شجاعت کے اسباب و مبادی آثار و خواص غصے کے اسباب و مبادی، آثار و خواص سے بالکل الگ ہوتے ہیں۔ (مثلاً) شجاعت کا مبدا قوت نفس اور اس کا اطمینان، اعتدال، ایمان، نیز زیبائش دنیا اور اس کی پستی و بلندی کی طرف سے لاپرواہی ہوا کرتی ہے۔ لیکن غصہ نفس کی کمزوری اور اس کے تزلزل، ایمان کی

سستی، مزاج روح کے عدم اعتدال، محبت دنیا اور دنیا کو اہمیت دینے اور نفسانی لذتوں کے ہاتھ سے نکل جانے کے خوف سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے غصہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں میں، تندرست لوگوں کے مقابلے میں بیماروں میں، بڑوں کے مقابلے میں بچوں میں اور جوانوں کے مقابلے میں بوڑھوں میں زیادہ ہوتا ہے، اور شجاعت اس کے بالکل برعکس ہے۔ جن لوگوں میں اخلاقی کمزوریاں زیادہ ہوتی ہیں ان کو بہ نسبت ان لوگوں کے جن میں اخلاقی خوبیاں ہوتی ہیں زیادہ غصہ آتا ہے۔ چنانچہ آپ خود دیکھئے کہ کوئی بخیل کے مال ومتاع سے متعرض ہو تو دوسروں کے بہ نسبت اس کو غصہ بہت زیادہ آتا ہے۔

یہ چیزیں تو شجاعت وغضب کے اسباب ومبادی کے لحاظ سے تھیں، مگر یہ دونوں (شجاعت وغضب) اثرات کے اعتبار سے بھی مختلف ہیں۔ (مثلاً) غصیلا آدمی شدت غیظ وغضب کی حالت میں دیوانوں کی طرح بے عقل و بے لگام ہو جاتا ہے اور پھاڑ کھانے والے حیوانوں کی طرح انجام کو سوچے بغیر، غور وفکر کیے بغیر، حکم عقل کے خلاف اقدام کرتا ہے۔ برے و قبیح افعال و کردار اس سے سرزد ہونے لگتے ہیں۔ اس کو اپنی زبان، ہاتھ پیر اور دیگر اعضا پر قابو نہیں رہتا۔ آنکھوں، ہونٹوں اور منہ کو اس بری طرح استعمال کرتا ہے کہ اگر اسی غصے کی حالت میں اس کے ہاتھ میں آئینہ دیدیں تو وہ خود اپنی بدصورتی پر نادم وشرمندہ ہو جائے گا۔

بعض غصیلے لوگ تو بے شعور جانوروں، بلکہ جمادات پر بھی غصہ کرتے ہیں۔ ہوا، زمین، برف، آندھی، بارش اور دیگر قسم کے طبیعی حادثات کو اگر ان کے مرضی کے مطابق نہ ہوں تو گالی دینے لگتے ہیں! کبھی قلم وکتاب کٹورے اور صراحی پر اپنا غصہ اتارنے لگتے ہیں۔ (مثلاً) ان کو توڑنے لگتے ہیں، پھاڑنے لگتے ہیں! لیکن بہادر آدمی ان تمام امور میں اس کے برخلاف ہوتا ہے۔ اس کے تمام افعال غور وفکر کے ساتھ، میزان عقل کے مطابق اور اطمینان نفس کے ساتھ ہوا کرتے ہیں۔ غصے کی جگہ پر غصہ کرتا ہے، بردباری کی جگہ پر بردباری کرتا ہے۔ ہر چیز اس کو غصہ میں مبتلا نہیں کر سکتی۔ غصے کے موقع پر بھی بقدر ضرورت غصہ کرتا ہے اور بڑی سمجھ بوجھ اور عقل سے انتقام لیتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کس سے انتقام لے، کتنا انتقام لے اور کس طرح انتقام لے؟ کس کو معاف کر دے، کس سے صرف نظر کرے؟ غصے کے وقت بھی عقل کی لگام اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے، وہ غصے میں بھی بری بات نہ منہ سے نکالتا ہے نہ برے افعال کی طرف بڑھتا ہے۔ اس کے تمام کام عقل وشرع کے مطابق اور عدل وانصاف پر مبنی ہوتے ہیں، وہ اگر اقدام بھی کرتا ہے تو اس طرح کہ آخر میں پشیمان نہ ہو۔

لہذا سمجھدار انسان کو ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ شجاعت جو انبیاء ، اولیاء اور مومنین کے صفات اور نفس کے فضائل وکمالات میں سے ہے اور غصے کے درمیان جو شیطانی صفت ، خنّاس کا وسوسہ اور نفسانی برائیوں وقلبی نقائص میں سے ہے ، کوئی فرق ہی نہ کرے اور اشتباہ میں مبتلا رہے۔ مگر جہل ونادانی اور حب نفس ودنیا کا حجاب انسان کے چشم وگوش بند کردیتا ہے اور اس کو بے چارہ بنا کر ہلاک کردیتا ہے۔

(علمائے کرام نے) غصے کے دیگر اسباب بھی ذکر کئے ہیں ، مثلاً عجب ، فخر ومباہات ، تکبر ، ریا کاری ، چڑچڑاپن ، مذاق وغیرہ ، لیکن ہر ایک کی تفصیل اس مقام اور کتاب کے اعتبار سے طوالت اور رنج وملال کا باعث ہوگی اور شاید بالواسطہ یا بلاواسطہ یہ تمام کے تمام یا زیادہ تر کی بازگشت انہیں دو بنیادوں کی طرف ہو جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔

والحمد للّٰہ

توضیحات (۷)

۱۔ اصول کافی، ج۲، ص۳۰۳، کتاب ایمان وکفر، باب الغضب، حدیث۳۔

۲۔ احمد بن محمد بن یعقوب مسکویہ (۳۳۰۔۴۲۱ھ ق) مشہور ایرانی طبیب وفلسفی تھے۔ علمی عملی، لغت، ادب، فنونِ شعر وکتابت، منطق وریاضیات خصوصاً علمِ اخلاق میں بہت مشہور تھے۔ آپ کے آثار میں ترتیب السعادۃ، تہذیب الاخلاق وتطہیر الاعراق، جاویدان خرد، آداب الفرس والہند، تجارب الامم وتعاقب الہمم مشہور ہیں۔

۳۔ بقراط (۴۶۰۔۳۷۷ ق م) یونان کے جزیرہ کوس میں پیدا ہوئے، مشہور ترین طبیب ہونے کے ساتھ قدیم فلاسفہ میں بہت مشہور ہیں۔ بقراط امراض کیلئے صرف روغنشاء، 'غذا وہوا' کے قائل تھے۔

۴۔ تہذیب الاخلاق وتطہیر الاعراق، مطبوعہ مصر، ص۱۹۲۔

۵۔ (مومنین) کافروں پر سخت اور آپس میں ایک دوسرے پر مہربان ہیں۔ سورۂ فتح، آیت/۲۹۔

۶۔ یہ اس حدیث کی طرف اشارہ ہے ﴿اعدی عدوک نفسک التی بین جنبیک﴾ تمہارا سب سے بڑا دشمن تو تمہارا نفس ہے جو تمہارے دونوں پہلوؤں کے درمیان ہے۔

عوالی اللئالی، ج۴، ص۱۱۸

بحار الانوار، ج۶۷، ص۶۴، کتاب ایمان وکفر، باب۴۵، حدیث۱۔

۷۔ تہذیب الاخلاق وتطہیر الاعراق، مطبوعہ مصر، ص۱۷۲۔

۸۔ اصول کافی، ج۲، ص۳۰۲، کتاب ایمان وکفر، باب غضب، حدیث۱۔

۹۔ اصول کافی، ج۲، ص۳۰۴، کتاب ایمان وکفر، باب غضب، حدیث۱۲

۱۰۔ اصول کافی، ج۲، ص۳۰۳، کتاب ایمان وکفر، باب غضب، حدیث۷۔

۱۱۔ عن ابی عبد اللہ قال ﴿قال الحواریون لعیسی: ای الاشیاء اشد؟ قال: اشد الاشیاء غضب اللہ عزوجل، قالوا: بما نتقی غضب اللہ؟ قال: بان لا تغضبوا﴾

وسائل الشیعہ، ج۱۱، ص۲۸۹، ابواب جہاد نفس، باب۵۳، حدیث۱۵۔

۱۲۔ سورۂ اعراف، آیت/۹۷۔

۱۳۔ سورۂ بقرہ، آیت/۷۔

۱۴۔ اصول کافی، ج۲، ص۳۰۳، کتاب ایمان وکفر، باب غضب، حدیث۴

۱۵۔ یہ سورۂ احزاب کی ۷۲ویں آیت کی طرف اشارہ ہے، ارشاد ہوتا ہے: ﴿انّا عرضنا الامانۃ علی السموات والارض والجبال فابین ان یحملنھا واشفقن منھا وحملھا الانسان انہ کان ظلوما جھولا﴾ بے شک ہم نے (روز ازل) اپنی امانت کو سارے آسمان اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور آدمی نے اس کو اٹھا لیا۔ یقیناً انسان (اپنے حق میں) بڑا ظالم اور نادان ہے۔

۱۶۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۰۳، کتاب ایمان و کفر، باب غضب، حدیث ۳۔

۱۷۔ شیخ حر عاملیؒ نے اپنی کتاب وسائل الشیعہ میں غصے کی حالت میں ذکر خدا کو واجب جانا ہے۔

وسائل الشیعہ، ج ۱۱، ص ۲۹۱، کتاب الجہاد، ابواب جہاد نفس، باب ۵۳۔

۱۸۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۰۲، ۳۰۵، کتاب ایمان و کفر، باب غضب، حدیث ۲

۱۹۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۰۲، کتاب ایمان و کفر، باب غضب، حدیث ۲

۲۰۔ عن ابی عبد اللہ، عن ابیہ (علیھما السلام)، انّہ ذکر عندہ الغضب، فقال: ﴿انّ الرجل لیغضب حتی ما یرضی ابداً ویدخل بذلک النار، وایّما رجل غضب وھو قائم فلیجلس، فانّہ سیذھب عنہ رجز الشیطان، وان کان جالساً فلیقم﴾ امام جعفر صادقؑ نے اپنے والد گرامیؑ سے روایت کی ہے کہ ان کے سامنے غصے کا ذکر کیا گیا تو حضرت باقرؑ نے فرمایا بہت سے لوگ اس طرح غصے میں آجاتے ہیں کہ کسی طرح راضی ہی نہیں ہوتے اور اس کے سبب ہی جہنم میں جاتے ہیں اگر کوئی حالت قیام میں غصے میں مبتلا ہو جائے تو اس کو بیٹھ جانا چاہئے اور اگر بیٹھا ہوا ہے اور غصہ آجائے تو کھڑا ہو جانا چاہئے کہ اس طرح شیطان کی پلیدی اس سے دور ہو جائے گی۔

مرآۃ العقول، ج ۱۰، ص ۱۳۶، کتاب ایمان و کفر، باب غضب، شرح حدیث ۲۔

۲۱۔ عن ابی ھریرۃ قال: ﴿کان رسول اللہ اذا غضب وھو قائم جلس واذا غضب وھو جالس اضطجع فیذھب غیظہ﴾۔

مرآۃ العقول، ج ۱۰، ص ۱۳۶، باب الغضب۔

مسند احمد بن حنبل، ج ۵، ص ۱۵۲، ابوہریرہ سے نقل کرتے ہیں رسول خداؐ نے غصے کی صورت میں ہم کو یہ دستور دیا ہے

آٹھویں حدیث

بسندي المتصل الى محمد بن يعقوب، عن علي بن ابراهيم، عن أبيه، عن النوفلي، عن السكوني، عن أبي عبدالله عليه السلام قال

قال رسولُ اللهِ صلى الله عليه وآله وسلم ﴿مَنْ كانَ في قَلْبِه حبّةٌ مِنْ خردَلٍ مِنْ عصبيّةٍ، بعثَهُ اللّهُ يَوْمَ القِيامَةِ مَعَ أعْرابِ الجاهلِيَّةِ﴾

ترجمہ: سکونی امام جعفر صادقؑ کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا ''رسول خداؐ کا ارشاد ہے جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر عصبیت ہوگی، خدا اس کو روز قیامت جاہلی عربوں کے ساتھ اٹھائے گا''

شرح: قدیم فارسی میں ''خردل (رائی)'' کو ''اسپندان'' کہتے تھے، لیکن آج کل ''خردل'' ہی کہتے ہیں۔ خردل ایک مشہور دوا ہے جس کے بہت سے خواص ہیں۔ اسی سے ''مشمع'' بنایا جاتا ہے۔ ''عصبی'' اس شخص کو کہتے ہیں کہ جو اپنے رشتہ داروں کے ظلم کی حمایت کرے اور ''عصبہ'' پدری رشتہ داروں کو کہتے ہیں، کیونکہ رشتہ دار باپ کے اردگرد جمع ہوتے ہیں اور باپ ان کی وجہ سے مضبوط ہو جاتا ہے۔ ''عصبیت'' اور ''تعصب'' کے معنی ''حمایت کرنے'' اور دفاع کرنے کے ہیں۔ یہ تو اہل لغت کے (تعریفی) کلمات تھے جن کا ذکر کیا گیا۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے: عصبیت ایک نفسانی و باطنی صفت ہے جس کے اثرات میں سے اپنے

رشتہ داروں اور عام متعلقین کی حمایت ودفاع کرنا ہے۔ متعلقین میں چاہے وہ لوگ ہوں جو دینی، مذہبی یا مسلکی تعلق رکھتے ہوں یا وطنی وعلاقائی رشتے رکھتے ہوں یا کسی اور قسم کا تعلق رکھتے ہوں، سب ہی مراد ہیں۔ مثلاً ہم پیشہ ہوں یا استادی شاگردی کا تعلق یا اور کوئی رشتہ۔ عصبیت اخلاقی برائیوں اور صفات رذیلہ میں سے ہے اور اس سے بہت سی اخلاقی وعملی برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ عصبیت بذات خود مذموم ہے چاہے وہ حق کیلئے ہو یا کسی دینی امر کیلئے، بشرطیکہ اس کا مقصد اظہار حق نہ ہو، بلکہ اس کا مقصد اپنا یا اپنے ہم مسلک یا اپنے سے وابستہ کسی شخص کا غلبہ ہو۔ لیکن اظہار حق، حقیقت کی ترویج، مطلب حقہ کا اثبات اور اس کی حمایت کرنا یہ سب چیزیں یا تو عصبیت نہیں ہیں اور اگر عصبیت ہیں تو قابل مذمت نہیں ہیں۔

فرق کا معیار عصبیت کے اغراض ومقاصد، نیز نفس اور شیطان یا حق اور خدا کی پیروی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے انسان اپنے سے وابستہ لوگوں اور تعلق رکھنے والوں کی جو حمایت اور ان کا دفاع کرتا ہے اگر اس کا مقصد صرف اظہار حق اور باطل کو فنا کرنا ہے تو یہ عصبیت ممدوح اور حق وحقیقت کی حمایت ہے اور یہ صفت، کمالات انسانی میں بہترین ہے اور سیرت انبیاءؑ واولیاء کے مطابق بھی۔ اس کی پہچان یہ ہے کہ جدھر حق ہو (وہ) اس کی حمایت کرتا ہو چاہے حق والا آدمی اس سے وابستہ ہو یا نہ ہو، خواہ اس دشمن کا ہی کیوں نہ ہو۔ ایسا شخص حقیقت کی حمایت کرنے والا اور فضیلت کے طرفداروں میں سے اور صالح معاشرے کی حمایت کرنے والوں میں ہے اور معاشرہ کا ایک اچھا رکن اور معاشرے کی برائیوں کا اصلاح کرنے والا ہے۔ لیکن اگر اس کی نفسانیت اور قومیت اس کو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ اپنے رشتے داروں اور متعلقین کا ساتھ دے اور ان کی حمایت کرے چاہے ان میں کوئی باطل پہلو نظر آئے تو اس شخص کے اندر بری صفت اور جاہلی تعصب ہے اور وہ معاشرے کے برے افراد میں سے ہے جو معاشرے کے نیک افراد کو فاسد بنا دیتا ہے اور اس کا شمار زمانہ جاہلیت کے عربوں میں ہوتا ہے۔ جاہلی عرب سے مراد وہ بادیہ نشین عرب ہیں جو اسلام سے پہلے تھے، جب تاریکی وجہالت ونادانی کا دور دورہ تھا ان لوگوں میں عصبیت بہت زیادہ تھی، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ عام طور پر عربوں میں دوسرے لوگوں کے بہ نسبت تعصب کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ بس اس بری صفت سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جنہوں نے نور ہدایت سے ہدایت حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ حدیث شریف میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ہے کہ خداوند عالم چھ گروہوں کو چھ چیزوں کی وجہ سے عذاب کرے گا۔

عربوں کو عصبیت، زمین داروں کو تکبر، امیروں کو ظلم و ستم، فقہا کو حسد، تاجروں کو خیانت، اور دیہاتیوں کو نادانی کی وجہ سے عذاب کرے گا۔[۳]

پہلی فصل: عصبیت کی برائیاں

اہل بیت ؑ کی حدیثوں سے پتہ چلتا ہے کہ عصبیت، مہلک اور برے انجام کا باعث ہوتا ہے۔ وہ ایمان کے دائرے سے خارج ہونے کا سبب اور شیطانی اخلاق میں سے ہے۔ کافی میں صحیح سند کے ساتھ امام جعفر صادق ؑ سے روایت کی گئی ہے کہ آپ ؑ نے فرمایا ﴿مَن تعصّب أو تُعصِّبَ لهُ فقدْ خلع ربقَ الايمانِ مِن عُنقه﴾ [۴] ''جو شخص تعصب کرتا ہے یا اس کیلئے تعصب کیا جاتا ہے اس کے گلے سے ایمان کی رسی کھول دی جاتی ہے''۔ یعنی وہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے اور جس کیلئے تعصب کیا جاتا ہے وہ بھی تعصب کرنے والے کے عمل پر چونکہ راضی رہتا ہے، لہذا اس کی جزا میں بھی شریک ہوتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے ''جو شخص کسی قوم کے فعل پر راضی رہتا ہے وہ بھی اسی قوم میں شمار کیا جاتا ہے''۔[۵] لیکن اگر راضی نہ ہو، بلکہ ان کے طور و حالات سے متنفر ہو تو پھر اس قوم کے ساتھ شریک ہونے میں حدیث کا مفہوم شامل نہیں ہے۔

وعن أبي عبدالله الصادق علیہ السلام، قال ﴿مَن تعصّب عصّبهُ اللّٰهُ بعصابةٍ من النّار﴾ [۶] ''جو تعصب برتے گا خدا اس کے سر پر آگ لپیٹ دے گا''۔

وعن عليّ بن الحُسين (عليهما السلام)، قال ﴿لم يَدخُلِ الجنّةَ حميّةٌ غيرُ حميّةِ حمزةَ بن عبد المطّلب، وذلك حين أسلمَ غضباً للنبيّ﴾ [۷] امام زین العابدین ؑ سے روایت ہے کہ آپ ؑ نے فرمایا ''بہشت میں جناب حمزہ بن عبدالمطلب کے علاوہ، جب آپ نے رسول خدا ؐ کیلئے عصبیت برتی تھی، کوئی عصبیت داخل نہیں ہوتی''۔

جناب حمزہ ؑ کے اسلام لانے کا واقعہ کئی طریقوں سے منقول ہے جو ہمارے مقصد سے خارج ہے۔[۸] خلاصہ یہ ہے کہ ایمان، جو نور الٰہی، اور خدا وند عالم کی وہ غیبی خلعت ہے جو اس نے اپنے خاص بندوں، مخصصین بارگاہ، مخصوصان محفل انس کو مرحمت فرمایا ہے، یہی خصلت کے منافی ہے جو حق و حقیقت کو پامال کرتی ہو اور حق کو جہل و نادانی کے قدموں تلے رگڑتی ہو۔

(یاد رکھیے) اگر دل کے آئینے میں خود خواہی، اقربا پرستی اور جاہلیت کی بے جا عصبیت کا زنگ لگ جائے تو اس میں نور ایمان کا جلوہ نہیں دکھائی دے گا اور وہ دل پروردگار کی خلوت گاہ خاص نہیں بن سکے گا۔ صرف اسی شخص کا دل جلوہ گاہ ایمان و معرفت ہو سکتا ہے اور اسی شخص کی گردن میں حبل متین اور ایمان کی مضبوط رسی ہو سکتی ہے اور وہی شخص حقائق و معارف کا گرد ہو سکتا ہے جو قواعد دینی کا پابند، قوانین عقلی کا اسیر اور عقل و شرع کے ساتھ حرکت کرنے والا ہو اور کسی قسم کا اخلاقی عادات و اطوار اور زندگی کے مسائل اس کو ڈرا نہ سکیں اور صراط مستقیم سے بھٹکا نہ سکیں۔ اسی شخص کو اسلام و ایمان کا دعوی کرنا زیب دیتا ہے جو حقیقتوں کو تسلیم کرتا ہو، حقیقتوں کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہو، اپنے مقاصد کو چاہے وہ کتنے ہی بلند و برتر کیوں نہ ہوں اپنے ولی نعمت کے مقاصد میں فنا کر دیتا ہو، اپنے اور اپنے ارادے کو مولائے حقیقی کے ارادے پر فدا کر دیتا ہو۔ ایسا شخص جاہلی عصبیت سے بھی بری ہو سکتا ہے اور قلبی طور سے حقائق کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے اور جہالت و عصبیت کے دبیز پردے اس کی آنکھوں کے حجاب نہیں بن سکتے۔ وہ اظہار حقیقت اور اعلائے کلمہ حق کیلئے اپنے تمام تعلقات و روابط کو زیر پا رکھ سکتا ہو اور اپنے ولی نعمت کی بارگاہ میں تمام عادتوں اور قرابتوں کو قربان کر سکتا ہو اور اگر اسلامی و جاہلی عصبیت میں ٹکراؤ ہو جائے تو اسلامی عصبیت و حق خواہی کو مقدم کرنے کی جرأت رکھتا ہو۔

حقائق کی معرفت رکھنے والا انسان اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ تمام تعصبات و روابط اور تعلقات ایک عارضی اور زائل ہونے والی چیز ہے۔ صرف خالق و مخلوق کے درمیان کا رابطہ اور اس سلسلے میں تعصب ایک حقیقی، اصلی اور غیر قابل زوال امر ہے اور یہ تعلق دیگر تعلقات سے مضبوط تر اور تمام حسب و نسب سے بالاتر ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ رسول خدا ؐ نے فرمایا میرے حسب و نسب کے علاوہ قیامت میں سارے حسب و نسب منقطع ہو جائیں گے۔ متن حدیث اس طرح ہے: ﴿كُلُّ حَسَبٍ وَنَسَبٍ مُنْقَطِعٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِلَّا حَسَبِي وَنَسَبِي﴾ یہ بات مخفی نہیں ہے کہ آنحضرت ؐ کا حسب و نسب روحانی اور باقی رہنے والا اور تمام جاہلی عصبیتوں سے دور ہے۔ حضور ؐ کے روحانی حسب و نسب کا ظہور عالم آخرت میں بیشتر اور اس کا کمال بہت زیادہ واضح ہوگا۔ مگر یہ دنیاوی جسمانی روابط جو انسانی عادتوں کی بنا پر ہوتے ہیں وہ ذرا سی چیز پر منقطع ہو جایا کرتے ہیں اور دوسری دنیا میں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ ہاں! اگر کوئی رابطہ نظام ملکوتی الٰہی

کے تحت ہو اور شرعی و عقلی قواعد کے زیر سایہ ہو تو پھر اس کیلئے انقطاع و زوال کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا

دوسری فصل عصبیت کی ملکوتی صورت

بعض گزشتہ حدیثوں کی شرح کرتے ہوئے یہ بات گزر چکی کہ برزخی، قیامتی وملکوتی صورتوں کا معیار ان کے ملکات اور ان کی قوت (وضعف) کے مطابق ہوگا اور عالم قیامت حکومت نفس کے ظہور کی جگہ ہوگی اور ملک بدن (وہاں پر) نفس کی نافرمانی نہیں کر سکے گا ور ہو سکتا ہے اس عالم میں انسان کسی حیوان یا شیطان کی صورت میں محشور ہو اور اس حدیث میں بھی جس کی ہم نے تشریح کی، رشاد ہوا ہے کہ جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی عصبیت ہوگی خدا اس کو اعراب جاہلیت کی صورت میں اٹھائے گا، یہاں بھی مذکورہ مطلب کی طرف اشارہ ہو سکتا۔

جو شخص اس بری صفت (تعصب) کے ساتھ دنیا سے جائے گا، شاید وہ اپنے کو ایسے عرب جاہلیت کی صورت میں دیکھے کہ جن کا نہ وحدانیت خدا پر عقیدہ ہو اور نہ ہی وہ رسالت و نبوت کے معتقد ہوں، (بلکہ) ان لوگوں کی جو بھی صورت ہو اپنے کو اسی صورت پر محشور پائے گا اور اس کو یہ بھی احساس نہ ہوگا کہ دنیا میں وہ عقائد حقہ کا اظہار کرتا تھا اور امت محمدؐ میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ جیسا کہ حدیث میں ہے ''اہل جہنم رسول خداؐ کا نام بھی بھول جائیں گے، ور اپنا تعارف بھی نہ کرا سکیں گے سوائے اس کے کہ خداوند عالم کا رادہ یہ ہو کہ ان کو نجات دلائے'' ؎ ور چونکہ یہ خلق (عصبیت) بعض احادیث کی بنا پر شیطان کے خواص میں سے ہے شاید اسی لئے جاہل دور کے عرب ور جاہل عصبیت رکھنے والے لوگ (دونوں) شیطان کی صورت پر محشور ہوں گے۔ کافی کی صحیح حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے

عن أبي عبدالله الصادق علیہ السلام قال: «إنّ الملائكة كانوا يحسبون أنّ إبليس منهم، وكان في علم الله أنّه ليس منهم، فاستخرج ما في نفسه بالحميّة والغضب فقال: خلقتني من نار وخلقته من طين» ؎ ''ملائکہ کو گمان تھا کہ شیطان ابلیس ان میں سے ہے اور خدا جانتا تھا کہ شیطان ملائکہ میں سے نہیں ہے۔ لہذا شیطان کے دل میں جو بات تھی اس نے اپنے تعصب وعصبیت کے ذریعہ اس کا اظہار کیا، پھر کہا مجھ کو تو نے آتش سے پیدا کیا ہے اور آدم کو مٹی سے''۔

پس میرے عزیز! یہ بات سمجھ لو کہ تعصب شیطان کی صفت ہے اور اس کا مغالطہ ور غلطی کا باطل قیاس

اسی حجاب (تعصب) کی بنا پر تھا۔ یہ ایسا حجاب ہے جو تمام حقائق کو ختم کر دیتا ہے، بلکہ تمام برائیوں کو خوبیوں کی صورت میں پیش کرتا ہے اور دوسروں کے تمام محاسن کو عیب بنا کر ظاہر کرتا ہے اور یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ انسان جب تمام چیزوں کو غیر واقعی صورت میں پیش کرے تو اس کا انجام کیا ہوتا ہے؟ علاوہ اس کے کہ یہ بری صفت انسان کو ہلاک کر دیتی ہے، لیکن خود اس کی وجہ سے اتنی نفسانی برائیاں اور اعمالی واخلاقی مفاسد پیدا ہوتے ہیں کہ ان کا ذکر بھی موجب ملال ہے۔

اس لئے جو عقلمند انسان اس بری صفت کے مفاسد کو سمجھ لے اور صادق ومصدق رسول اکرمؐ اور ان کے اہل بیتؑ گرامی کے ان اقوال کو مانتا ہو جن کے مطابق یہ صفت انسان کو ہلاک کر دیتی اور جہنم رسید کر دیتی ہے، اس کو اپنے نفس کا علاج کرنا چاہئے اور اگر خدانخواستہ اس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تعصب ہے تو اپنے کو اس سے پاک کر لینا چاہئے تاکہ اس دنیا سے عالم آخرت کی طرف جاتے ہوئے اجل مقدر (موت) کے وقت پاک وپاکیزہ ہو اور صاف وشفاف نفس کے ساتھ جائے اور یہ بھی سمجھ لے کہ زمانہ گزر رہا ہے اور وقت بہت کم ہے، کیونکہ انسان کو معلوم نہیں کہ موت کب آجائے!

اے لکھنے والے کے نفس خبیث، ہوسکتا ہے لکھتے ہی وقت موت آجائے جو تجھ کو ان تمام اخلاقی برائیوں کے ساتھ اسی وقت اس عالم کی طرف منتقل کر دے جہاں سے واپسی ممکن نہیں ہوا کرتی۔

پس اے عزیز، اے اس مصنف کی کتاب کے مطالعہ کرنے والے، عبرت حاصل کر اس کی حالت سے جو اس وقت منوں مٹی کے نیچے دبا ہوا ہے اور دوسرے عالم میں اپنے برے اعمال اور برے اخلاق (کی پاداش) میں گرفتار ہے۔ جب فرصت کا زمانہ تھا تو اس نے ہوا و ہوس اور کاہلی میں اپنی قیمتی عمر گزاری اور اس الٰہی سرمائے کو ضائع و برباد کر دیا۔ تم بھی متوجہ رہو ایک دن ہماری طرح تم کو بھی بربادہونا ہے، مگر تم خود نہیں جانتے وہ کونسا دن ہے۔ ہوسکتا ہے وہ بھی دن ہو جب تم اس کتاب کے پڑھنے میں مشغول ہو۔ اگر تم نے لیت ولعل سے کام لیا تو فرصت گنوادو گے۔

اے برادر! ان امور میں دیر نہ کرو، یہ امور دیر کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ نہ معلوم کتنے صحیح وسالم آدمی ناگہانی موت کی وجہ سے اس دنیا سے چل بسے اور نہ جانے ان کا انجام کیا ہوا؟ اس لئے فرصت کو ہاتھ سے جانے نہ دو اور ایک ایک سانس کو غنیمت سمجھو، کیونکہ کام بہت اہم ہے اور سفر بہت خطرناک۔ اگر تمہارا ہاتھ اس عالم سے جو آخرت کی کھیتی ہے، کوتاہ ہو گیا تو پھر کچھ کام ہاتھ سے نکل گیا اور پھر تم نہ اپنے نفس کی اصلاح

کر سکو گے اور حسرت و حیرانی اور عذاب و ذلّت کے علاوہ کچھ نتیجہ تم کو نہیں ملے گا۔

اولیائے خدا کو ایک منٹ بھی سکون نہیں تھا، اس پر خطر سفر کے بارے میں ہمیشہ فکر کرتے رہتے تھے۔ امام زین العابدین علیہ السلام جو معصوم تھے، ان کے حالات حیرت انگیز ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام کے نالہ ہائے شب کتنے حیران کن تھے، حالانکہ آپ "ولی مطلق تھے! نہ معلوم ہم کو کیا ہو گیا ہے کہ ہم اس سے غافل ہیں؟ آخر شیطان کے علاوہ کون ہے جس نے ہم کو اطمینان دلا رکھا ہے جس کی وجہ سے ہم آج کا کام کل پر ٹال دیتے ہیں اور شیطان کی تو (دلی) خواہش ہے کہ اپنے اصحاب و انصار کی تعداد میں اضافہ کرے اور ہم کو اپنے اخلاق میں ڈھال کر اپنے اور اپنے ماننے والوں کے گروہ میں محشور کرے! شیطان ملعون ہمیشہ امور آخرت کو ہماری نظروں میں سہل و آسان کر کے پیش کرتا ہے اور ہم کو "رحمت خدا" اور "شفاعت شافعین" کے وعدہ کا سہارا دے کر خدا کی یاد اور اس کی اطاعت سے غافل کر دیتا ہے! لیکن افسوس یہ جھوٹی اشتہا اور اس ملعون کا دام مکر و حیلہ ہے۔ ابھی تو رحمت خدا نے تیرا احاطہ کر رکھا ہے، ابھی تو تم صحت و سلامتی، زندگی، امن و ہدایت اور عقل و فرصت اور صلاح نفس کی راہنمائی جیسی ہزاروں مختلف رحمتوں کے خدائی سمندر میں غوطہ زن ہو۔ مگر پھر بھی ان چیزوں سے استفادہ کر کے خدا کی اطاعت کے بجائے شیطان کی اطاعت کرتے ہو! اگر تم نے اس دنیا میں ان رحمتوں سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا تو آخرت میں بھی خدا کی بے پناہ رحمتوں سے بے بہرہ اور شفاعت کرنے والوں کی شفاعت سے محروم رہو گے۔ شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کا جلوہ اس دنیا میں ان کی ہدایت ہے اور عالم آخرت باطن میں شفاعت کی ہدایت ہے۔ اگر تم نے ہدایت سے فائدہ نہ اٹھایا تو شفاعت سے بھی فائدہ نہ اٹھا سکو گے۔ جتنی ہدایت حاصل کر دگے تمہی ہی شفاعت نصیب ہوگی۔ رسول خداؐ کی شفاعت رحمت حق مطلق کی طرح ہے، جس میں قبولیت کی صلاحیت ہوگی وہی فائدہ اٹھا سکے گا۔

اگر خدانخواستہ شیطان نے اپنے مکر و فریب سے تمہارے ہاتھ سے ایمان اچک لیا تو پھر تم رحمت الٰہی کے مستحق نہ رہو گے اور نہ ہی شفاعت نصیب ہو سکے گی۔ جی ہاں! رحمت حق تو دونوں عالم میں بھری ہے، اگر تم واقعی طالب رحمت ہو تو اس دنیا کی پے در پے رحمتوں سے جو دوسری دنیاؤں کیلئے رحمت کا بیج بھی ہے، کیوں استفادہ نہیں کرتے ہو؟ تمام اولیاء و انبیائے خداؑ نے تم کو خوان نعمت کی طرف بلایا، ان سب نے مہمانخانہ الٰہی کی طرف دعوت دی، مگر تم نے اس کو قبول نہ کیا! لیکن خناس کے ایک وسوسے اور شیطانی شبہے کی بنا پر تم نے سب سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ تم نے تو کتاب خدا کے محکمات، اولیاء و انبیاءؑ کی متواتر احادیث، عقول

عقد اور عقل کے قطعی دلائل کو شیطانی خطرات اور نفسانی خواہشات پر قربان کر دیا! اس غفلت اور اندھے پن، بہرے پن اور جہالت پر میرے اور تمہارے او پروائے ہو!

تیسری فصل: اہل علم کا تعصب

جاہلی عصبیت میں سے ایک عصبیت ایسے علمی مطالب پر ضد کرنا، اپنی یا اپنے استاد یا اپنے شیخ کی بات پر اڑے رہنا بھی ہے جو کسی قسم کے حق کے ثبوت یا باطل کی نفی کیلئے نہ ہو۔ ظاہر ہے اس قسم کی عصبیت بعض اعتبار سے بری، اور بعض دیگر پہلوؤں سے دوسری قسم کی عصبیتوں سے زیادہ ہی ناروا ہے۔

یہ تعصب کرنے والے کے لحاظ سے بھی بری بات ہے، کیونکہ اہل علم جو بنی نوع بشر کے مربی اور شجرۂ نبوت وولایت کی شاخ ہیں، تعصب کی برائیوں پر مطلع اور خلاق فاسدہ کے انجام سے باخبر ہیں۔ اگر خدا نخواستہ ان میں سے کوئی جاہلی عصبیت رکھتا ہو اور شیطانی صفت رذیلہ سے متصف ہو تو اس پر سب سے زیادہ حجت تمام ہوگی اور سب سے زیادہ اس سے مؤاخذہ کیا جائے گا۔

وہ شخص جو اپنے کو لوگوں کیلئے چراغ ہدایت، محفل انس کی شمع، راہ سعادت کا راہنما اور صراط آخرت کا رہبر کہلاتا ہو، اگر وہ خدا نخواستہ اپنے قول پر عامل نہ ہو، اس کا ظاہر اس کے باطن کے مخالف ہو، اہل ریا ونفاق کے زمرے میں شامل ہو، علمائے سوء اور عالم بے عمل میں اس کا شمار ہو تو اس کی سزا بہت بڑی اور اس کا عذاب سب سے زیادہ ہوگا۔ قرآن مجید نے ایسے لوگوں کی مثال بیان کی ہے ﴿بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ﴾ [1] ''جن لوگوں نے خدا کی آیتوں کو جھٹلایا ان کی بہت بری مثال ہے اور خدا ظالم لوگوں کو منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا''۔

اس لئے اہل علم کیلئے بہت ضروری ہے کہ ان مقامات کا احترام کریں اور اپنے کو ان مفاسد سے بالکل پاک کریں تاکہ وہ اپنی اصلاح کے ساتھ معاشرے کی بھی اصلاح کر سکیں اور ان کا وعظ اثر انداز ہو، ان کی نصیحت دلوں میں بیٹھ جائے۔ (یاد رکھو) عالم اگر فاسد ہو جائے تو پوری امت فاسد ہو جاتی ہے اور جو برائی دوسری برائیوں کا مادہ بنے اور جو غلطی دوسری غلطیوں کو جنم دے وہ خدا کی بارگاہ میں غیر متعدی وجزئی برائی سے کہیں زیادہ بڑی ہے۔

اہل علم کے اندر اس تعصب کی ایک قباحت خود علم کی وجہ سے بھی ہے، کیونکہ یہ تعصب علم کے ساتھ

خیانت اور علم کی حق کشی ہے، جو شخص اس عظیم امانت کے بوجھ کو اٹھائے اور اس خلعت کو پہنے اس کو تو اس کے احترام کا بہت زیادہ خیال رکھنا چاہئے اور امانت کو صحیح وسلامت اس کے مالک کے سپرد کر دینا چاہئے اور کہیں جاہلی تعصب کر بیٹھے تب تو اس نے خیانت کے ساتھ ظلم وتعدی کا بھی ارتکاب کیا اور یہ خود ایک بہت بڑی غلطی ہے۔

اس تعصب کی ایک قباحت مد مقابل کی طرف سے بھی ہوتی ہے، اس لئے کہ علمی مباحث میں اس کا مد مقابل بھی اہل علم ہی ہوا کرتا ہے اور وہ بھی ایک الٰہی امانت ہے، اس کا احترام واجب اور اس کی بے احترامی حرمات الٰہی کی بے احترامی اور بہت بڑی ہلاکت ہے اور یہی بے موقع عصبیت کبھی انسان کو اہل علم کی بے حرمتی پر آمادہ کر دیتی ہے۔ میں اس عظیم گناہ سے خداوند عالم کی پناہ مانگتا ہوں۔

عصبیت کی ایک قباحت و برائی متعصب لہ کی طرف سے بھی ہوا کرتی ہے جو انسان کا استاد اور شیخ ہوا کرتا ہے اور (ظاہر ہے کہ) استاد کی بے حرمتی اس کی نافرمانی کا سبب ہوا کرتی ہے، کیونکہ مشائخ عظام اور اکابرین کرام، خدا ان کے چہروں کو تروتازہ رکھے۔ ۱۳ حق کی طرفداری اور باطل سے گریز کی طرف مائل رہتے ہیں اور اس شخص پر بہت غصہ کرتے ہیں جو جاہلی عصبیت کی بنا پر حق کشی کرے یا باطل کی ترویج کرے۔ روحانی لحاظ سے عاق ہونا، جسمانی طور پر عاق ہونے سے کہیں زیادہ بالاتر ہے۔ جس طرح روحانی ولادت کا حق، جسمانی ولادت کے حق سے کہیں زیادہ عظیم و بالاتر ہوتا ہے۔

لہذا تمام اہل علم پر، خدا ان کی عظمت وشرف میں اضافہ کرے، واجب ولازم ہے کہ اپنے کو اخلاقی وعملی مفاسد سے بالکل مبرا رکھیں اور اعمال حسنہ واخلاق کریمہ کے لباس سے ہمیشہ اپنے کو مزین رکھیں اور اپنے کو اس عظیم منصب سے ہرگز جدا نہ کریں جو خداوند عالم نے ان کو مرحمت فرمایا ہے کیونکہ ایسا کرنے پر جو گھاٹا ہوگا، اس کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں ہو سکتا۔

والسلام

توضیحات (۸)

۱۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۰۸، کتاب ایمان وکفر، باب العصبیہ، حدیث ۳۔

۲۔ مشمع شمع یا موم ملی ہوئی چیز، روئی کا باریک کپڑ جس پر گوندلگا کر ایک دوا ملا دیتے ہیں اور تھوڑی سی گرمی پاتے ہی یہ جسم سے چپک جاتی ہے۔ یہ لفظ کثرت استعمال سے مشہ ہوگیا ہے۔ فرہنگ معین، ج ۳، ص ۴۱۵۲۔

۳۔ عن محمد بن اسلم الجبلی باسنادہ یرفعہ الی امیر المؤمنین علیہ السلام، قال: ان اللہ عزّوجلّ یعذب ستۃ بستۃ العرب بالعصبیۃ، والدھاقنۃ بالکبر، والأمراء بالجور، والفقہاء بالحسد، والتجار بالخیانۃ، واھل الرساتیق بالجھل﴾۔

خصال، ج ۱، ص ۳۲۵، باب الستۃ، حدیث ۱۴۔

۴۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۰۷، کتاب ایمان وکفر، باب العصبیہ، حدیث ۱۔

۵۔ وقال علیہ السلام ﴿الراضی بفعل قوم کالداخل فیہ معھم وعلی کلّ داخل فی باطل اثمان اثم العمل بہ، واثم الرضا بہ﴾ کسی قوم کے فعل پر راضی رہنے والا اس شخص کے مثل ہے جو ان کے ساتھ کام میں شریک ہو اور جو شخص ناجائز کام میں کسی کا ساتھ دے، اس پر دو گناہ ہیں گناہ کرنے کا اور اس پر رضا مندی کا

نہج البلاغہ، فیض الاسلام، حکمت ۱۴۶، ص ۱۱۵۳۔

۶۔ ۷۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۰۸، کتاب ایمان وکفر، باب العصبیہ، حدیث ۴ اور حدیث ۵۔

۸۔ جناب حمزہؓ کے اسلام لانے کا قصہ ان کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے:

اصول کافی، ج ۲، ص ۳۰۸، کتاب ایمان وکفر، باب العصبیہ، حدیث ۵، بحار الانوار، ج ۷، ص ۲۸۵، کتاب ایمان وکفر، باب العصبیہ، حدیث ۲، الصحیح من سیرۃ النبی الاعظمؐ، ج ۲، ص ۵۷، سیرۃ نبی، ج ۱، ص ۳۱۲، اسد الغابہ، ج ۲، ص ۴۶، الاستیعاب، ج ۱، ص ۲۷۱

۹۔ بحار الانوار، ج ۲۵، کتاب الامامۃ، باب ان الائمۃ من ذریۃ الحسینؑ، ص ۲۴، وسائل، ج ۱۴، ص ۲۱، کتاب نکاح، باب مقدمات نکاح، باب ۸، حدیث ۵ میں دوسری عبارتوں کے ساتھ بھی یہ حدیث آئی ہے۔

۱۰۔ علم الیقین، ج ۲، ص ۱۰۲۲ و ۱۰۲۳، میں فیض کاشانیؒ نے اسی مفہوم کی روایت نقل فرمائی ہے۔

۱۱۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۰۸، کتاب ایمان وکفر، باب العصبیہ، حدیث ۹۔

۱۲۔ ۱۳۔ ترجمہ اصل حدیث میں گزر چکا ہے۔

نویں حدیث

بالسند المتصل الی ثقة الاسلام محمد بن یعقوب الکلینی، عن محمد بن یحیی عن احمد بن محمد بن عیسی، عن محمد بن سنان، عن عون القلانسی، عن ابن ابی یعفور عن ابی عبداللہ الصادق علیہ السلام، قال

﴿مَنْ لَقِيَ الْمُسْلِمِينَ بِوَجْهَيْنِ وَلِسَانَيْنِ جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَهُ لِسَانَانِ مِنْ نَارٍ﴾

ترجمہ حضرت امام جعفر صادق ؑ نے فرمایا جو مسلمان سے دو منہ اور دو زبان کے ساتھ ملاقات کرے وہ قیامت میں اس طرح آئے گا کہ (اس کے منہ میں) آگ کی دو زبانیں ہوں گی۔

شرح مسلمانوں سے "دوروئی" کے ساتھ ملاقات کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی ظاہری حالت اور ظاہری صورت کو اپنی باطنی وقلبی حالت کے برخلاف پیش کرے، مثلاً ظاہر میں یہ اظہار کرے کہ میں تمہارا دوست اور چاہنے والا ہوں اور تم سے گہرا لگاؤ اور خلوص رکھتا ہوں، لیکن دل اور باطن میں اس کے بالکل برخلاف ہو اور جن لوگوں کے سامنے اظہار دوستی ومحبت کرے، انہیں لوگوں کے پیٹھ پیچھے ان کی برائی کرے۔

اسی طرح "دوزبانی" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان جس سے بھی ملاقات کرے اس کی مدح وتعریف کرے یا دوستی وچاپلوسی کا اظہار کرے، لیکن اس کے پس پشت اس کی تکذیب کرے اور اس کو جھٹلائے اور اس کی غیبت کرے۔ اس تشریح کے اعتبار سے پہلی صفت (دوروئی) عملی نفاق ہے اور دوسری صفت (دوزبانی) قولی نفاق ہے۔ ہوسکتا ہے حدیث کا مطلب نفاق کی بری صفت کی طرف اشارہ کرنا مقصود

ہو اور چونکہ یہ دونوں صفت منافقین کی بہت ہی واضح اور مخصوص صفات میں سے ہیں، اس لئے صرف انہیں دونوں صفات کا ذکر کیا گیا ہے اور نفاق جو نفسانی برائی اور خبیث صفت ہے، اس کے آثار میں سے دو چہرہ اور دو زبان ہونا ہے اور اس کے مراتب و درجات ہیں۔ ہم انشاء اللہ چند فصلوں کے ضمن میں ان مراتب و درجات کے ذکر کے ساتھ ان کے مفاسد اور طریقہ علاج کا بھی اپنے مقدور بھر ذکر کرنے کی کوشش کریں گے۔

پہلی فصل

نفاق کے مراتب

یہ بات جان لینی چاہئے کہ دیگر اوصاف اور ملکات شریفہ و خبیثہ کی طرح نفاق کے بھی شدت و ضعف کے اعتبار سے درجات و مراتب ہیں۔ ور اصولاً جس بری صفت کا انسان علاج نہ کرے، (بلکہ) اس کی پیروی کرے تو اس بری صفت میں شدت پیدا ہوتی جائے گی اور برائیوں کی شدت کے مراتب اسی طرح لامتناہی ہیں جس طرح خوبیوں کی شدت کے مراتب لامتناہی ہیں۔

انسان اگر نفس امارہ کو اس کی حالت پر چھوڑ دے تو برائیوں کی طرف اس کے ذاتی رجحان اور عجلت میں پیش آنے والے نفسانی نشیب و فراز، نیز شیطان کی مدد و خناس کے وسوسہ کی وجہ سے وہ خود بھی فساد کی طرف مائل ہو جاتا ہے پھر اس کی برائیاں روز بروز شدید اور زیادہ ہوتی جاتی ہیں اور نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ بری صفت جس کی نفس نے پیروی کی تھی، اس کی صورت جوہری اور فصل اخیر بن جاتی ہے اور پھر اس کے ظاہر و باطن دونوں کی مملکتیں اس کے زیر فرمان ہو جاتی ہیں اور اس کے بعد وہ بری صفت نفاق اور دو غلے پن کی طرح شیطانی صفت ہوتی ہے، حتیٰ اس ملعون کی مخصوص صفت ہوتی ہے، جیسا کہ قرآن نے خبر دی ہے: ﴿وقاسمهما اني لكما لمن الناصحين﴾ [1] "شیطان نے آدم و حوا کیلئے قسم کھائی کہ میں آپ دونوں کو نصیحت کرنے والوں میں ہوں" اس صورت میں نفس کی پوری مملکت شیاطین کے تابع ہو جاتی ہے اور نفس کی آخری صورت، اس کی ذات کا باطن اور اس کا جوہر (سب ہی) شیطان کی صورت اختیار کر لیتا ہے ور اس دنیا میں انسانی صورت میں زندگی بسر کرنے کے باوجود بھی ممکن ہے عالم آخرت میں اس کی ظاہری صورت شیطان کی سی ہو جائے۔

اس لئے اگر انسان نے اس صفت کی روک تھام نہ کی اور نفس کو آزاد چھوڑ دیا تو تھوڑے ہی دنوں کے

بعد وہ لگام تڑوا کر اپنی پوری ہمت اور تمام رادے کو اسی بری صفت کیلئے مخصوص کردے گا اور پھر جس سے ملے گا نفاق اور دو غلے پن سے ملے گا ور جس سے بھی روابط بڑھائے گا اس کے تعلقات نفاق اور دورنگی کی غلاظت سے آلودہ ہوں گے۔ اس کی نظر میں ذاتی مفاد، خودغرضی ور خود پرستی کے علاوہ کچھ نہ ہوگا وہ صداقت، خلوص، ہمت، مردانگی ساری ہی چیزوں کو اپنے پیروں کے نیچے روند دے گا۔ اس کی حرکات وسکنات وتمام امور میں دورنگی کا اثر ہوگا ور کسی بھی فساد، قباحت و بے شرمی سے پرہیز نہ کرے گا ور ایسا شخص بشریت وانسانیت سے دور ہو کر شیطانوں کے ساتھ محشور ہوتا ہے۔

ابھی تک جو کچھ عرض کیا گیا، یہ خود شدت وضعف کے اعتبار سے جو ہر نفاق میں شامل ہے۔ نفاق جن چیزوں سے تعلق رکھتا ہے اس کے اعتبار سے بھی اس کے درجات میں تفاوت پایا جاتا ہے، کیونکہ کبھی تو نفاق دین خدا کے بارے میں ہوتا ہے، کبھی نیک ملکات اور اخلاقی فضائل میں پایا جاتا ہے۔ کبھی اعمال صالحہ میں نفاق پایا جاتا ہے اور عبادات الٰہیہ میں بھی نفاق پایا جاتا ہے۔ کبھی عام معاملات میں، کبھی عرفی امور میں نفاق پایا جاتا ہے۔ اسی طرح کبھی انسان رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ ہدی علیہم السلام کے ساتھ ور کبھی اولیاء علما ومومنین کے ساتھ نفاق برتتا ہے، نیز کبھی مسلمانوں کے ساتھ اور کبھی دیگر اقوام سے تعلق رکھنے والے بندگان الٰہی کے ساتھ نفاق برتا جاتا ہے۔

البتہ جن بری صفات کا ذکر کیا گیا یہ سب برائی، بے حیائی اور قباحت میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، گرچہ اصل خباثت وبرائی میں سب ہی شریک ہیں اور سب ہی یک خبیث درخت کے پھول اور پتے ہیں۔

دوسری فصل

نفاق اور دوغلا پن ایک ایسی بری صفت ہے کہ کوئی بھی شریف آدمی اپنے کو اس سے متصف ہونا پسند نہیں کرتا ہے منافق زمرۂ انسانیت سے خارج ہوتا ہے، بلکہ کسی بھی حیوان کے مشابہ نہیں ہوتا ور دنیا میں رشتے داروں ور دوستوں میں رسوا وذلیل ہوتا اور آخرت میں دردناک عذاب میں گرفتار ہوتا ہے۔ جیسا کہ خود حدیث شریف میں آیا ہے کہ عالم آخرت میں منافق کی حالت یہ ہوگی کہ دو آتشیں زبانوں کے ساتھ محشور ہوگا اور مخلوق خدا کے سامنے ذلیل ور سوا ہوگا۔ نبیوں و مرسلین، ملائکہ مقربین کے سامنے شرم اور ذلت سے س کا سر جھک جائے گا اور اسی روایت سے شدت عذاب کا بھی استفادہ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ گر جسم کا

جوہر آگ کا ہو گیا تو درد و تکلیف کا احساس شدید تر ہو جائے گا۔ میں اس کی شدت سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔

ایک اور حدیث میں حضرت رسول خداؐ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ''منافق قیامت میں اس طرح آئے گا کہ اس کے پیچھے ایک زبان ہوگی اور ایک زبان اس کے آگے ہوگی اور دونوں زبانوں میں آگ لگی ہوگی وراس کے پورے جسم کو جلایا جا چکا ہوگا اور پھر یہ اعلان کیا جائے گا کہ یہ وہ شخص ہے جس کے دنیا میں دو چہرے اور دو زبانیں تھیں اور روز قیامت اسی ذریعہ سے مشہور ہوگا۳ اور اس پر ذیل کی آیت شریفہ دلالت کرتی ہے: ﴿ويقطعون ما امر الله به أن يوصل ويفسدون في الأرض أولئك لهم اللعنة ولهم سوء الدار﴾ ۴ ''اور جن چیزوں کے قائم کرنے کا خدا نے حکم دیا ہے اس کو توڑ دیتے ہیں اور زمین پر فساد پھیلاتے ہیں، انہیں کیلئے لعنت ہے اور برا گھر (جہنم) ہے''۔

نفاق بہت سی ایسی تباہ کن خرابیوں کی جڑ ہے جو انسان کی دنیا و آخرت دونوں کو تباہ و برباد کر سکتی ہے۔ جیسے فتنہ برپا کرنا جو قرآن مجید کی رو سے ''قتل نفس سے زیادہ شدید ہے''۵ یا چغلخوری جس کے بارے میں امام محمد باقرؑ نے فرمایا ﴿محرمة الجنة على القتاتين المشائين بالنميمة﴾ ۶ ''چغلخوری کیلئے بہشت حرام ہے جن کا مقصد چغلخوری کیلئے آنا جانا ہے''۔ اسی طرح غیبت جو فرمان رسولؐ کے مطابق ''زنا سے بھی بدتر ہے''۷ اور جیسے مومن کو گالی دینا، اس کی توہین اور اس کے راز کو فاش کرنا وغیرہ، ان میں سے ہر ایک انسان کی ہلاکت کا علیحدہ سبب ہے۔

یہ بات بھی ذہن نشین کر لینا چاہئے، اشاروں، کنایوں سے یا آنکھ کے اشارے اور زبان کے ذریعے لوگوں کا ایک دوسرے کو برائی اور بدنامی کی نسبت دینا بھی نفاق کے ذیل میں آتا ہے۔ جبکہ ان کے سامنے ظاہرداری کرنا (اور پس پشت برائی کرنا)۔ انسان کو اپنے حال، اعمال اور طور طریقوں سے بہت ہی چوکنا رہنا چاہئے، کیونکہ نفس کی مکاریاں اور شیطان کے مکر و فریب بہت باریک ہوتے ہیں۔ بہت کم لوگ اس سے بچ پاتے ہیں۔ ممکن ہے انسان ایک بے موقع اشارے یا ایک بے جا کنائے سے اہل نفاق میں شمار ہونے لگے اور پھر شاید عمر کے آخر تک اس برائی میں گرفتار رہے اور اس کے باوجود اپنے کو صحیح و سالم، پاک و پاکیزہ سمجھتا رہے۔ لہذا انسان کو ایک ہمدرد اور حاذق حکیم کی طرح اپنے اعمال و اطوار اور نفس کا علاج کرنا چاہئے اور ایک مہربان تیماردار کی طرح اپنی دیکھ بھال رکھنی چاہئے اور کسی وقت بھولے سے بھی اس دیکھ

بھال میں کوتاہی نہ کرے اور یہ سمجھ لے کہ باطنی امراض سے زیادہ کوئی بھی مرض تحقیق و دستور نہیں ہوتا اور نہ اس سے زیادہ ہلاک کرنے والا ہوتا ہے اور خود انسان سے زیادہ شفیق و دل سوز اپنے بارے میں کوئی بھی تیماردار نہیں ہوا کرتا۔

تیسری فصل

نفاق کا علاج

اس بڑی غلطی اور بڑے نقص کا ازالہ دو طرح سے کیا جا سکتا ہے

۱۔ نظری طریقہ: نفاق سے جو برے نتائج حاصل ہوتے ہیں ان کے بارے میں غور و فکر کی جائے، کیونکہ اس دنیا میں اگر کوئی منافق مشہور ہو گیا تو وہ لوگوں کی نظروں سے گر جاتا، عوام و خواص میں رسوا ہو جاتا اور تمام اعزہ و اقربا میں ذلیل ہو جاتا ہے۔ لوگ اس کو اپنی مجلس سے بھگا دیتے ہیں اور اپنی محفلوں سے باہر کر دیتے ہیں۔ ایسا شخص کسب کمالات اور مقامات عالیہ تک نہیں پہنچ پاتا۔ باعزت اور باضمیر انسان کیلئے ضروری ہے کہ اس کلنک کے ٹیکے سے اپنے کو پاک رکھے تاکہ اس قسم کی ذلتوں اور رسوائیوں میں گرفتار نہ ہو سکے، کیونکہ دوسرے عالم میں جو کشف اسرار کا عالم ہے، اس دنیا میں لوگوں سے جن چیزوں کو چھپا رکھا ہے انسان ان کے چھپانے پر قادر نہیں ہے اور وہ وہاں پر بدصورتی اور دو آتشی زبانوں کے ساتھ محشور ہوگا اور منافقوں و شیطانوں کے ساتھ معذب ہوگا۔

۲۔ عملی طریقہ: عقلمند انسان ان مفاسد کو دیکھتا ہے کہ نفاق سے برائی و پلیدی کے علاوہ کوئی اور نتیجہ حاصل نہیں ہوتا تو وہ اپنے لئے ضروری قرار دے لیتا ہے کہ نفاق کو کسی طرح اپنے سے دور کرے اور مرحلۂ عمل میں داخل ہو جائے جو علاج نفس کا دوسرا طریقہ ہے اور وہ اس طرح کہ ایک مدت تک انسان بڑی دقت نظر کے ساتھ اپنے تمام حرکات و سکنات کو دیکھتا رہے اور اپنے اعمال میں بہت باریک بینی سے کام لے نفس کی تمام آرزوؤں اور خواہشات کے خلاف عمل اور اس سے جہاد کرے اور اپنے تمام اقوال و افعال کو ظاہر و باطن میں درست کرے۔ ظاہرداری اور دھوکہ بازی کو عملاً بالائے طاق رکھ دے اور ان حالتوں میں اپنے خدا سے توفیق طلب کرتا رہے کہ اسے نفس امارہ اور اس کی خواہشات پر غلبہ عطا فرمائے اور اس اقدام و علاج میں اس کی مدد فرمائے۔ (کیونکہ) خداوند عالم کا فضل و کرم اپنے بندوں پر بے انتہا ہے۔ جو شخص بھی خدا کی طرف یا اپنی اصلاح کی طرف قدم اٹھاتا ہے خدا اس کی مدد کرتا ہے۔ اب اگر وہ کچھ دنوں تک اسی حال پر رہا تو امید

ہے کہ نفس میں پاکیزگی پیدا ہو جائے اور نفاق اور دو غلے پن کی کدورت اس سے زائل ہو جائے اور اس کے دل کا آئینہ اور باطن اس خبیث صفت سے پاک ہو جائے اور حقیقی ولی نعمت کی رحمت ولطف کا مستحق ہو جائے، کیونکہ دلیلوں سے بھی ثابت ہوتا ہے اور تجربہ میں بھی آیا ہے کہ نفس جب تک اس عالم میں ہے اپنے کئے ہوئے افعال واعمال سے نادم ہوتا ہے اور چاہے اچھے اعمال ہوں یا برے، ہر عمل کا ایک (مخصوص) اثر نفس پر مرتب ہوتا ہے۔ اگر عمل نیک وصالح ہے تو اس کا اثر نورانی وکمال ہوگا اور اگر اس کے برخلاف ہے تو ظلمانی اور ناقص ہوگا یہاں تک کہ دل یا تو مکمل طور پر نورانی ہو جائے گا یا بالکل ظلمانی ہو جائے گا اور انسان یا تو اشقیا کے زمرے میں شمار ہونے لگے گا یا سعادتمند لوگوں کی فہرست میں گنا جانے لگے گا۔ اس لئے جب تک اس منزل عمل اور دار زراعت میں ہے اپنے اختیار سے اپنے دل کو سعادت یا شقاوت کی طرف لے جا سکتا ہے اور ہم اپنے اعمال وافعال کے گروی ہیں ﴿فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہ ☆ ومن یعمل مثقال ذرۃ شراً یرہ﴾۸۵

چوتھی فصل: نفاق کی بعض قسموں کا بیان

اے عزیز، جان لو! نفاق ودو روئی ودو زبانی کا ایک درجہ تو خود خداوند عالم کے ساتھ ہوتا ہے۔ انسان اپنے حقیقی ولی نعمت اور مالک الملوک کے ساتھ نفاق برتا ہے اور ہم لوگ اس دنیا میں اس مرض کے اندر مبتلا ہیں، لیکن اس سے غافل ہیں اور جہالت ونادانی کے دبیز پردے، نفس پرستی حب دنیا وخود غرضی وتاریکی کے موٹے حجاب اس طرح ہم کو چھپائے ہوئے ہیں کہ کشف اسرار، رفع حجاب اور عالم طبیعت سے کوچ اور دار غرور سے رخت سفر باندھنے اور اس غفلت انگیز زندگی کے خاتمے سے پہلے اس کی طرف متوجہ ہونا بہت ہی بعید معلوم ہوتا ہے۔

ابھی تو ہم خواب غفلت میں پڑے ہیں اور طبیعت کے نشے اور ہوا وہوس کی مستی نے ہم کو اسیر کر رکھا ہے جس کی وجہ سے تمام برائیاں، برے اخلاق واعمال اور فاسد طور طریقے ہماری نظر میں خوبصورت معلوم ہوتے ہیں، لیکن جب ہم خواب سے بیدار ہوں گے اور اس مستی وغفلت سے ہوش میں آئیں گے تو موقع ہاتھ سے نکل چکا ہوگا، منافقوں اور دو چہرے اور دو زبانوں والوں کے گروہ میں شمار ہو کر دو آتشیں زبانوں اور دو بری صورتوں کے ساتھ محشور ہوں گے اور چاہے جتنی فریاد کریں ﴿رب ارجعون﴾۸۶ ''خدایا مجھے

(دنیا میں) واپس بھیج دو"۔ جواب آئے گا: ﴿کَلَّا﴾ "ہرگز نہیں"۔ یہ دورُوئی ایسی ہی ہے جیسی ہم اور آپ تمام عمر کلمہ توحید کا اظہار کرتے ہیں، اسلام و ایمان کا دعویٰ کرتے، بلکہ (اپنی اپنی خواہش کے مطابق خدا کی) محبت و محبوبیت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک اپنی خواہشات کے مطابق مختلف دعوے کرتا ہے۔

اگر عوام الناس میں سے ہیں تو اسلام و ایمان کا دعویٰ کرتے یا پھر زہد و خلوص کا یقین دلاتے ہیں۔

اور اگر اہل علم و فقہا میں سے ہیں تو اپنے کمال اخلاص کا دعویٰ کرتے ہیں اور خلافت و ولایت رسول خدا کا ادعا کرتے ہیں اور رسول خدا کے اس قول ﴿اَللّٰهُمَّ ارْحَمْ خُلَفَائِي﴾ [10] "پروردگارا میرے خلفا پر رحم فرما" اور صاحب الامر (روحی لہ الفداء) کے اس قول ﴿فَإِنَّهُمْ حُجَّتِي﴾ [11] "یہ علما تمہارے اوپر میری طرف سے حجت ہیں" نیز (دیگر) ائمہ ہدیٰ کے ان اقوال سے جو علما و فقہا کی شان میں کہے گئے ہیں تمسک کرتے ہیں۔

اور اگر علوم عقلیہ کے جاننے والوں میں ہیں تو اپنے ایمان کے حقیقی و برہانی ہونے کے مدعی ہوتے اور اپنے آپ کو علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین کا مالک سمجھتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو ناقص العلم و ناقص الایمان شمار کرتے اور آیات قرآنی و احادیث شریفہ کو اپنی شان میں نازل شدہ سمجھتے ہیں۔

اور اگر ہم اہل عرفان و تصوف سے ہیں تو عرفان، جذب، عشق، فناء فی اللہ اور بقاء باللہ کا دعویٰ کرتے اور ولایت امر کے مدعی ہوتے ہیں اور اسی قسم کے جتنے بھی دلچسپ الفاظ ہیں سب کو اپنی طرف منسوب کر لیتے ہیں۔

اسی طرح ہم میں سے ہر شخص و ہر گروہ زبان قال اور ظہور حال سے اپنے لئے کسی نہ کسی درجے کا دعویٰ کرتا اور رائج الوقت حقیقت کی نمائش کرتا ہے۔ اب اگر یہ ظاہر باطن کے موافق ہوا اور یہ عیاں حقیقت سر کے مطابق ہوا اور وہ اپنے دعویٰ میں سچ بولنے والا اور سچا ثابت ہوا تو اس کو اور تمام ارباب نعمت کو ان کی نعمتیں مبارک ہوں [12] ورنہ اگر وہ مصنف (و مترجم) کی طرح روسیاہ اور بدصورت ہو، تو اس کو جاننا چاہئے کہ وہ منافقوں کے زمرے میں اور دو چہروں اور دو زبانوں کے گروہ میں ہے۔ اس کو اپنا علاج کرنا چاہئے اور جب تک وقت ہاتھ سے نہیں گیا ہے اپنی بدبختی اور اپنی ذلت و رسوائی کے دن کے بارے میں غور کرنا چاہئے۔

اے میرے عزیز اور اسلام کے دعویدار دوست! کافی کی حدیث شریف میں حضرت رسول خداؐ سے مروی ہے ﴿اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ يَدِهِ وَلِسَانِه﴾ ١٣؎ ''وہ شخص مسلمان ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے (دوسرے) مسلمان محفوظ رہیں''۔ (اب سوچئے) ہم کو اور آپ کو کیا ہو گیا ہے کہ جتنی ہم میں طاقت ہے اور جتنا ہم سے ہو سکتا ہے اپنے ماتحتوں پر ظلم کرنا جائز سمجھتے ہیں اور ان کو ایذا دینے اور ان پر ظلم کرنے سے کوئی دریغ نہیں کرتے! اگر اپنے ہاتھوں سے اذیت نہیں پہنچا سکتے تو ان کی موجودگی میں، تیغ زبان سے ورنہ ان کی غیر موجودگی میں ان کے رازوں کو فاش کرتے اور ان کے عیوب پر پڑے ہوئے پردوں کو چاک کرتے ہیں! ان پر تہمت لگاتے ہیں، ان کی غیبت کرتے ہیں۔ پس جب ہمارے ہاتھوں اور زبانوں سے مسلمان محفوظ نہیں ہیں تو ہمارا اسلام کا دعوی حقیقت کے خلاف ہے اور ہمارا دل ہمارے ظاہر کے مخالف ہے۔ اس لئے ہم منافقوں کے زمرے میں ہیں۔

اے ایمان وخضوع قلب کے دعوے دار! اگر تم بارگاہ ذوالجلال میں کلمۂ توحید پر ایمان رکھتے ہو اور تمہارا دل یکتا پرست اور ایک ہی (خدا) کا طالب ہے اور خدائے تبارک وتعالی کے علاوہ کسی کیلئے الوہیت کا قائل نہیں ہے، اگر تمہارا ظاہر باطن کے موافق اور باطن تمہارے دعوے کے مطابق ہے تو پھر اہل دنیا کیلئے تمہارے دل میں اتنا خضوع (وخشوع) کیوں ہے؟ تم اہل دنیا کی پوجا کیوں کرتے ہو؟ اس کا مطلب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ تم ان کو اس عالم میں اثر انداز سمجھتے ہو اور ان کے ارادے کو نافذ جانتے ہو، زر وزور کو مؤثر خیال کرتے ہیں؟ اس کائنات میں جس چیز کو تم مؤثر وکارگر نہیں سمجھتے وہ صرف ارادہ باری تعالی ہے! تم تمام اسباب ظاہری کے سامنے سرنگوں ہو، مگر مؤثر حقیقی اور تمام اسباب کے مسبب سے غافل ہو۔ ان تمام باتوں کے باوجود کلمۂ توحید کے ساتھ ایمان کا دعوی کرتے ہو! یقیناً تم بھی مومنین کی فہرست سے خارج اور منافقین اور دو زبان والوں کے ساتھ محشور ہو گے۔

اے زہد واخلاص کے دعوے دار! اگر تم واقعی مخلص ہو اور خدا اور اس کے دار کرامت کیلئے تم دنیا کی لذتوں سے پرہیز کرتے ہو تو پھر تم کو کیا ہو گیا ہے کہ جب لوگ تمہاری مدح وثنا کرتے ہیں اور کہتے ہیں آپ بڑے نیک اور پارسا ہیں تو تم خوش ہوتے، اپنے دل میں ناز ونخرے کرتے ہو، اہل دنیا کی ہم نشینی اور اس کی رنگینیوں پر جان دیتے ہو، غربا ومساکین سے فرار کرتے ہو؟ ایسی صورت میں تم سمجھ لو کہ تمہارا زہد واخلاص حقیقی نہیں ہے۔ دنیا سے زہد صرف دنیا کیلئے کرتے ہو، تمہارا دل حق کیلئے خالص نہیں ہے، تم اپنے

دعویٰ میں جھوٹے ہو اور تم منافق ہو۔

اے ولی اللہ کی طرف سے ولایت اور رسول خدا کی طرف سے خلافت کے دعوے دار! اگر تم (کتاب) احتجاج میں نقل شدہ حدیث کے مطابق ہو کہ ﴿صائناً لنفسہ، حافظاً لدینہ، مخالفاً لھواہ، مطیعاً لامر مولاہ﴾ "فقیہ کو اپنے نفس کی حفاظت کرنے والا، اپنے دین کی حفاظت کرنے والا، خواہشات نفس کا مخالف اور اپنے مولیٰ کے حکم کی اطاعت کرنے والا ہونا چاہئے" اور اگر تم اپنے کو شجر ولایت و رسالت کا پھل سمجھتے ہو اور دنیا کی طرف مائل نہیں ہو اور بادشاہوں و امیروں سے تقرب کے خواہاں نہیں ہو، غریبوں کی ہم نشینی کو عیب نہیں سمجھتے ہو، تب تو تم اسم بامسمّیٰ ہو اور لوگوں کے درمیان خدا کی حجت ہو۔ ورنہ تم علمائے سوء میں سے ہو، گروہ منافقین میں سے ہو اور دیگر وہ گروہ جن کا ذکر ہو چکا ان سے بھی بدتر ہو اور تمہارا عمل خراب تر اور تمہاری دنیا تباہ تر ہے۔ اس لئے کہ علماء پر خدا کی حجت زیادہ مکمل ہوتی ہے۔

اے حکمت الٰہی اور حقیقتوں اور مبدأ و معاد کا علم رکھنے کے دعوے دار! اگر تم حقائق کا علم رکھتے ہو، اسباب و مسببات کے ارتباط کا علم رکھتے ہو، اگر واقعی برزخی صورتوں اور بہشت و دوزخ کے حالات سے باخبر ہو تو تم کو ایک سیکنڈ کیلئے بھی آرام نہیں کرنا چاہئے۔ ہر وقت عالم باقی کی تعمیر میں مشغول رہنا چاہئے اور اس دنیا اور اس کی لذتوں سے فرار کرنا چاہئے۔ تم تو جانتے ہو کہ کتنی مصیبتیں در پیش ہیں، کتنی تاریکیاں اور ناقابل برداشت عذاب سامنے ہیں۔ پھر تم الفاظ و مفاہیم کے حجاب سے باہر قدم کیوں نہیں نکالتے ہو اور دلائل و براہین حکمت نے تمہارے دل میں مکھی کے پر کے برابر بھی اثر کیوں نہیں کیا؟ ایسی صورت میں جان لو کہ تم مومنین کے زمرے سے خارج اور حکما کی فہرست سے باہر ہو اور منافقین کی صفوں میں محشور ہو۔ وائے ہو اس شخص پر کہ جس نے اپنی پوری عمر اور ساری ہمت علوم مابعد الطبیعیات کے حصول میں صرف کر دی ہو، لیکن طبیعی زندگی کے نشے نے کم از کم ایک حقیقت کو بھی اس کے دل میں داخل ہونے نہیں دیا۔

اے عشق و فنا، جذب و سلوک اور معرفت کے دعوے دار! اگر تو واقعی اللہ والوں اور اصحاب قلوب اور نیک کام کرنے والوں میں سے ہے تو ﴿ھنیئاً لک﴾ "تم کو مبارک ہو"۔ مگر تیری بے ہوشی کے عالم میں کی ہوئی ہاتیں، تیری رنگ آمیزیاں اور تیرے بڑے بلند بانگ دعوے یہ سب چیزیں حب نفس اور وسوسہ شیطان کی نشانیاں ہیں اور خدا سے محبت و جذبہ عشق کے دعوے کے خلاف ہیں۔ ﴿اِنَّ اَوْلِیائي تحت قبائي لا یعرفھم غیري﴾ سے! "تم اگر (واقعی) اولیائے حق اور محبین و مجذوبین میں سے ہو خدا اس کو جانتا ہے"

لوگوں سے اس قدر اظہار مقام و مرتبہ نہ کر۔ بندگان خدا کے کمزور دلوں کو ان کے خالق کی طرف سے ہٹا کر اس کو مخلوق کی طرف متوجہ نہ کر۔ (بندگان الٰہی کے دل) خدا کا گھر ہیں ان کو ان سے غصب کرنے کی کوشش نہ کر۔ یہ جان لے کہ یہ بندے خدا کو عزیز ہیں، ان کے دلوں کی بڑی قیمت ہے، ان کو محبت خدا میں صرف ہونا چاہئے۔ خانہ خدا سے مت کھیلو، اس کے ناموس پر دست درازی نہ کرو ﴿فَاِنَّ لِلْبَیْتِ رَبًّا﴾ ۱۸؎ "بے شک گھر کا ایک مالک ہے" اگر تو اپنے دعوے میں سچا نہیں ہے تو تیرا شمار منافقین میں ہے۔ خیر چھوڑیئے! اس سے زیادہ طول کلام مجھ جیسے عاصی کیلئے مناسب نہیں ہے۔

اے راقم الحروف کے نفس لئیم! تو کہتا ہے کہ روز سیہ کیلئے کوئی فکر کرنی چاہئے اور اس بدبختی سے اپنے کو نجات دلانا چاہئے۔ اگر تو سچ کہتا ہے اور تیرا دل تیری زبان کے ساتھ ہے اور تیرا ظاہر و باطن ایک ہے تو پھر تو اتنا کیوں غافل ہے، اور تیرا دل اتنا سیاہ کیوں ہے، نفسانی خواہشات تیرے اوپر غالب کیوں ہیں؟ موت کے سفر پر خطر سے تو کیوں بالکل بے فکر ہے۔ تیری عمر گزر گئی مگر ہوا و ہوس سے تو دستبردار ہونے پر تیار نہیں ہے، پوری عمر شہوات و غفلت و بدبختی میں گزار دی، عنقریب موت آجائے گی اور تجھ کو تیرے برے اعمال و اخلاق میں گرفتار کرلے گی۔ تو تو ایک واعظ غیر متعظ ہے اور منافقین کے زمرے میں شامل ہے۔ خطرہ تو اس بات کا ہے کہ اگر تو اسی حال میں مرجائے تو آگ کی دو زبانوں اور آگ کے دو چہروں کے ساتھ محشور ہوگا۔

پروردگارا! ہم کو اس طویل خواب سے بیدار کردے۔ مستی اور بے خودی سے ہوشیار کردے۔ ہمارے دلوں کو نور ایمان سے منوّر کردے۔ ہماری حالت پر رحم فرما۔ ہم اس میدان کے مرد نہیں ہیں، تو خود ہی ہماری دستگیری فرما۔ شیطان کے چنگل اور ہوائے نفس کے پنجے سے نجات دے۔

بحقّ اولیائک و آلہ الطاھرین

صلوات اللہ علیھم اجمعین

توضیحات (۹)

۱۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۴۳، کتاب ایمان وکفر، باب ذی اللسانین، حدیث ۱

۲۔ سورۂ اعراف، آیت ۲۰

۳۔ عن زید بن علي، عن آبائه، عن علي (عليهم السلام)، قال: قال رسول الله ﷺ «يجيء يوم القيامة ذو الوجهين، دالعاً لسانه في قفاه وآخر من قدامه يتلهبان ناراً حتى يلهبا جسده ثم يقال له: هذا الذي كان في الدنيا ذا وجهين وذا لسانين يعرف بذلك يوم القيامة»

ثواب الاعمال وعقاب الاعمال، ص ۳۱۲، عقاب من کان ذا وجہین

۴۔ سورۂ رعد، آیت ۲۵۔

۵۔ سورۂ بقرہ، آیت ۹۱۔

۶۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۶۹، کتاب ایمان وکفر، باب النمیمہ، حدیث ۲۔

۷۔ «إياك والغيبة فإن الغيبة أشد من الزنا، قلت: يا رسول الله ولم ذاك بأبي أنت وأمي؟ قال: لأن الرجل يزني فيتوب إلى الله فيتوب الله عليه، والغيبة لا تغفر حتى يغفرها صاحبها»

غیبت سے بچو، غیبت کرنا اس لئے کہ غیبت کا (گناہ) زنا سے زیادہ شدید ہے۔ میں (ابوذرؓ) نے کہا: اے رسول خدا آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوں، آخر ایسا کیوں ہے؟ رسولؐ نے فرمایا اس لئے کہ انسان زنا کرکے اکثر اوقات توبہ کر لیتا ہے اور خدا اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے لیکن غیبت کو اس وقت تک بخشا نہیں جاتا جب تک وہ شخص نہ بخش دے جس کی غیبت کی گئی ہے۔

بحار الانوار، ج ۷۷، ص ۸۹، کتاب الروضہ، باب مواعظ النبیؐ

۸۔ جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا اس کی جزا پائے گا اور جو ذرہ برابر بدی کرے گا اس کی سزا پائے گا۔ سورۂ زلزال، آیت ۸

۹۔ خداوندا! مجھے (دنیا میں) واپس بھیج دے۔ سورۂ مومنون، آیت ۹۹

۱۰۔ رسول خداؐ کی دعا میں ہے: خداوندا! میرے جانشینوں پر رحمت نازل کر

وسائل الشیعہ، ج ۱۸، ص ۱۰۰، کتاب القضاء، باب ۱

۱۱۔ حضرت صاحب الامر (عج) کی توقیع مبارک میں ہے

«وأما الحوادث الواقعة فارجعوا فيها إلى رواة حديثنا، فإنهم حجتي عليكم وأنا حجة الله عليهم»

لیکن پیش آنے والے واقعات میں تم لوگ ہماری حدیث کے راویوں کی طرف رجوع کرو اس لئے کہ وہ لوگ ہماری طرف سے تمہارے اوپر حجت ہیں اور میں خدا کی طرف سے ان کے اوپر حجت ہوں۔

وسائل الشیعہ، ج ۱۸، ص ۱۰۱، کتاب القضاء، ابواب صفات قاضی، باب ۱۱، حدیث ۹۔

۱۲۔ اس کو اور تمام ارباب نعمت کو ان کی نعمتیں مبارک ہوں۔

۱۳ اصول کافی، ج ۲، ص ۲۳۵، کتاب ایمان وکفر، باب المؤمن وعلاماتہ وصفاتہ، حدیث ۱۹۔

۱۴۔ احتجاج، ج ۲، ص ۴۵۸، باب احتجاجات امام حسن عسکریؑ۔

۱۵۔ مصنف تاج العروس تحریر کرتے ہیں لفظ "شطحیات" صوفیوں کے یہاں مشہور ہے۔ ان کی اصطلاح میں اس کا مطلب ہے حالت بے خودی اور غلبۂ شہود حق کے وقت ان کے منہ سے نکلی ہوئی باتیں کہ اس وقت یہ لوگ حق کے علاوہ کچھ نہیں دیکھتے۔ تاج العروس، مطبوعہ مصر، ج ۲، ص ۱۷۱۔

اور مصنف دستور العلماء فرماتے ہیں "شطح" اس بات کو کہتے ہیں جو مستی اور معانی حقیقت کے غلبہ کے وقت کہی جاتی ہے اور یہ وہ الفاظ ہوتے ہیں جن سے ہیجان اور بیہودہ گوئی کی بو آتی ہے اور اس کا ظاہر علم کا مخالف اور حد معروف سے خارج ہوتا ہے۔ دستور العلماء، ج ۲، ص ۲۱۳۔

حضرت امام خمینیؒ نے کتاب مصباح الہدایہ میں منشاء شطح کے بارے میں ایک سنجیدہ رائے کا اظہار فرمایا ہے، آپؒ فرماتے ہیں ﴿والشطحيات كلها من نقص السالك والسلوك﴾ یعنی شطحیات سب کی سب سالک وسلوک کی کوتاہی ہے

مصباح الہدایہ، ص ۳۰۔

۱۶۔ تلوین یعنی بندے کا اپنے حالات کو بدلنا۔ ایک حال سے دوسرے حال کی طرف پلٹ جانا۔

ابوالقاسم قشیری کہتے ہیں تلوین ارباب حوال کی صفت ہے اور تمکین اہل حقائق کی صفت ہے۔ انسان جب تک "طریق" میں رہتا ہے صاحب تلوین ہوتا ہے۔ فرہنگ اصطلاحات وتعبیرات عرفانی، ص ۲۵۷۔

عبدالرزاق کاشانی اصطلاحات میں کہتے ہیں تلوین بندے کے حالات میں دگرگونی کا نام ہے۔ بہت سے افراد کی نظر میں یہ "مقام ناقص" ہے۔ لیکن ہماری نظر میں کامل ترین مقام ہے۔ اس منزل پر بندے کی حالت خداوند کے کلام کی شان کے مثل ہو جاتی ہے۔ ﴿كل يوم هو في شأن﴾۔

شیخ محی الدین نے بھی اصطلاحات صوفیہ میں یہی بات کہی ہے۔ لیکن امام خمینیؒ نے تلوین کو نقص شمار کیا ہے کمال نہیں۔

۱۷ میرے دوست میرے گنبدوں کے نیچے ہیں۔ میرے علاوہ ان کو کوئی نہیں پہچانتا۔

اسرار الشریعہ واطوار الطریقہ وانوار الحقیقہ، ص ۱۹۷؛

مصباح الہدایہ ومفتاح الولایہ، ص ۳۸۰؛ مرصاد العباد، ص ۱۲۷۔

۱۸۔ "اس گھر کا بھی ایک مالک ہے" ابرہہ کے جواب میں حضرت عبدالمطلب" کا قول ہے، جب وہ خانہ کعبہ کو برباد کرنے کیلئے آیا تھا۔ جناب عبدالمطلب" نے اس سے جا کر اپنے اور دوسروں کے ان اونٹوں کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا جن کو ابرہہ کے لشکر نے پکڑ لیا تھا تو ابرہہ نے کہا مجھے تعجب ہے تم سید قریش ہو کر اونٹوں کے مطالبہ کیلئے آ گئے مگر خانہ کعبہ کے بچانے کی مجھ سے خواہش نہ کی! تو جناب عبدالمطلب" نے فرمایا میں اونٹوں کا مالک ہوں۔ اس لئے اس کا مطالبہ کرتا ہوں، رہا کعبے کا مسئلہ تو ﴿ان للبیت ربّ﴾ خانہ کعبہ کا بھی ایک مالک ہے جو اس کی حفاظت کرے گا۔

بحار الانوار، ج۱۵، ص۱۳۱، ۱۳۶؛ تاریخ یمینی، باب۱، حدیث ۷۰ و ۷۱؛ سیرہ ابن ہشام، ج۱، ص۶۵۔

دسویں حدیث

بالاسناد المتصلة الی رئیس المحدثین محمد بن یعقوب رضوان الله علیه، عن الحسین بن محمد، عن معلی بن محمد، عن الوشاء، عن عاصم بن حمید، عن ابی حمزة، عن یحیی بن عقیل، قال

قال امیر المؤمنین علیہ السلام

﴿انما اخاف علیکم اثنتین اتباع الهوی وطول الامل، اما اتباع الهوی فانه یصد عن الحق واما طول الامل فانه ینسی الآخرة﴾

ترجمہ: یحیی بن عقیل کہتے ہیں کہ حضرت علیؑ نے فرمایا "میں تم سے دو باتوں کے بارے میں ڈرتا ہوں: خواہشات کی پیروی اور لمبی امیدیں۔ خواہشات کی پیروی، حق سے روک دیتی ہے اور لمبی امید آخرت کو بھلا دیتی ہے"۔

شرح: "ہویٰ" کے معنی لغت میں "دوست رکھنے" اور خواہش کے ہیں۔ البتہ اس اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے کہ خواہ اچھی وممدوح چیز کی خواہش ہو یا بری اور مذموم چیز کی۔ لیکن زیادہ تر اس کا استعمال مذموم چیزوں کی خواہش میں ہوتا ہے یا اس لئے کہ نفس غالباً ہوا وہوس اور بری خواہشات کی طرف مائل ہو کرتا ہے یا اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر عقل وشرع مہار نہ ہو تو فطرتاً نفس باطل شہوتوں اور نفسانی خواہشوں کی طرف مائل ہوا کرتا ہے۔ البتہ بعض محققین نے جو اس میں حقیقت شرعیہ کا احتمال دیا ہے وہ بعید ہے۔

"صد" کے معنی کسی چیز کو روکنے، روگردانی کرنے یا موڑنے کے ہیں اور سب ہی مناسب ہیں لیکن

یہاں پر روکنے اور منع کرنے کے معنی میں ہے، کیونکہ صد جو روگردانی کے معنی میں ہوتا ہے وہ لازم ہے (جو یہاں نامناسب ہے) ہم انشاء اللہ دو مقام کے ضمن میں ان دونوں خصلتوں کی برائیوں کا ذکر کریں گے اور یہ بیان کریں گے کہ خواہشات کی پیروی کس طرح حق سے روکتی ہے اور لمبی امید کس طرح آخرت کو بھلا دیتی ہے اور ہم خداوند عالم سے توفیق کے طلب گار ہیں۔

پهلا مقام

خواهش نفس کی پیروی کی مذمت

اس میں چند فصلیں ہیں:

پهلی فصل

انسان ابتدائی امر میں حیوان بالفعل هے

یہ جان لو کہ نفس انسانی ایک اعتبار سے جس کا ذکر ابھی ہمارے مقصد سے خارج ہے، توحید، بلکہ تمام عقائد حقہ پر پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ اس زندگی میں اس کی ولادت کی ابتدا اور اس عالم میں قدم رکھتے ہی وہ نفسانی رجحانات اور حیوانی خواہشات کے درمیان نشوونما پاتا ہے اس لئے ہم نوع انسان کے حالات سے بحث کریں گے۔ جن لوگوں کو خدا کی تائید حاصل ہوتی ہے اور وہ حافظ قدسی کی حمایت میں ہوتے ہیں، چونکہ وہ لوگ نوادر وجود میں سے ہیں، اس لئے وہ ہمارے حساب میں نہیں ہیں اور نہ ہم ان کا ذکر یہاں کریں گے۔

یہ بات اپنی جگہ پر دلیلوں سے ثابت ہے کہ اول پیدائش میں انسان متعدد مراحل طے کرنے کے بعد ایک کمزور حیوان (میں تبدیل ہوتا) ہے جس میں انسانیت کی صلاحیت کے علاوہ دیگر حیوانات سے کسی قسم کا فرق نہیں ہوتا اور وہ صلاحیت بھی بالفعل معیار انسانیت نہیں ہے۔

پس انسان اس دنیا میں وارد ہونے کے ابتدائی مرحلوں میں کسی بھی معیار سے ایک حیوان بالفعل ہے اور جانوروں کے اصول وضوابط پر عمل پیرا ہوتا ہے جو غیظ وغضب اور شہوانی خواہشات سے عبارت ہے، اس کے علاوہ، وہ کسی قسم کے دیگر معیارات پر نہیں اترتا اور چونکہ اس عجوبہ دہر کی ذات تمام چیزوں کی جامع یا قابل ہے اس لئے ان دونوں قوتوں کی تشفی کیلئے جو شیطانی صفات ہیں، دیگر شیطانی صفات، مثلاً جھوٹ،

دھوکہ بازی و منافقت اور چغلخوری وغیرہ کو کام میں لاتا ہے اور انہیں تینوں قوتوں کے ذریعہ جو برائیوں اور وہلکات کی جڑ ہیں، ترقی کرتا ہے اور یہ قوتیں بھی انسان کے اندر روز بروز ترقی کرتی ہیں۔ ب گر اس انسان کی یک مربی و معلم کے زیر اثر تربیت نہ کی جائے تو وہ بلوغ و رشد کی حد پر پہنچنے کے بعد ایک عجیب وغریب حیوان بن جاتا ہے جو مذکورہ بالا صفات میں تمام حیوانوں اور شیطانوں پر گوئے سبقت لے جاتا ہے ور حیوانیت و شیطانیت میں سب سے طاقتور اور سب سے کامل ہو جاتا ہے۔ اب اگر اسی حالت میں ایک زمانہ گزر جائے اور وہ ان تینوں چیزوں میں خواہش نفس کی پیروی کے علاوہ اور کچھ نہ کرے تو پھر الٰہی معارف، اخلاق حسنہ اور نیک اعمال میں سے کسی ایک کا بھی اس میں ظہور نہ ہوگا، بلکہ اس کے تمام فطری نور بھی خاموش ہو جاتے ہیں۔

پس حق کے تمام مراتب ان تین صفات سے یعنی الٰہی معارف، اخلاق و ملکات حسنہ اور نیک اعمال کہ جن کا ذکر ہو چکا ہے، خارج نہیں ہیں۔ (یہ سب) خواہشات نفسانی کے پیروں تلے روند دیئے جاتے ہیں اور نفسانی میلانات و حیوانی خواہشات اس کو اس قابل نہیں رہنے دیتے کہ اس میں حق کا کوئی بھی مرتبہ جلوہ گر ہو سکے خواہشات نفس کی گندگی و تاریکی عقل و ایمان کی روشنیوں کو بجھا دیتی ہے اور دوسری ولادت جو نسانی ولادت ہے اس کو حاصل نہیں ہو پاتی۔ وہ اسی حال میں باقی رہتا ہے اور حق و حقیقت تک نہیں پہنچ پاتا ہے یہاں تک کہ اس دنیا سے اسی حال میں کوچ کر جاتا ہے اور دوسری دنیا میں اس پر حقیقت منکشف ہوتی ہے۔ (اس وقت تک) وہ اپنے کو حیوان یا شیطان کے علاوہ کچھ نہیں پاتا اور انسان و انسانیت کو نہیں پاتا اور اسی حال میں آخر تک تاریکیوں اور عذابوں میں مبتلا رہتا ہے یہاں تک کہ خداوند اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرے۔

پس خواہشات نفس کی مکمل پیروی کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ پیروی حق سے مکمل طور سے روک دیتی ہے ور یہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ حق سے رک جانا خواہش نفس کے متابعت کا نتیجہ ہے ور آدمی جتنی پیروی نفس کرے گا اسی قدر حق سے دور رہے گا۔ مثلاً ایسا انسان اگر انبیاءؑ کی تعلیم اور علماء و مربیین کی تربیت کے واسطے سے اول ولادت میں اس کی مملکت انسانیت ان تین قوتوں سے ہم آغوش ہوگئی اور ان کی ترقی و تکامل کے ساتھ اس کی بھی ترقی ہوگئی ور س پر تربیت کا اثر ہوا ور رفتہ رفتہ وہ انبیاءؑ واولیا کی قوت مربیہ کے تابع ہوگئی تو ممکن ہے اس پر سوائے اس کے کچھ نہ گزرے کہ انسان کی قوت کاملہ جو اس میں بطور

استعداد و قابلیت ودیعت کی گئی ہے، منزل فعلیت میں آ کر ظاہر ہو جائے اور مملکت کی تمام قوتیں شان انسانیت کی طرف پلٹ آئیں اور شیطان اس کے ہاتھ پر ایمان لے آئے۔ جیسا کہ حضور اکرمؐ کے ہاتھ پر ایمان لایا تھا کہ حضورؐ نے فرمایا ﴿اِنَّ شَیطانِی آمَنَ بِیَدِی﴾ ۱؎ ''میرا شیطان میرے ہاتھ پر ایمان لایا'' اور اس کی حیوانیت اس کی انسانیت کے اس طرح تابع ہو جائے کہ عالم کمال و ترقی کی آرام دہ اور تربیت یافتہ سواری بن جائے اور سفر آخرت کیلئے آسمان کو طے کرنے والا براق بن جائے جو کبھی سرکشی اور نافرمانی نہ کرے اور جب شہوت و غضب کی جگہ عدالت و شرع لے لیتی ہے تو مملکت کے اندر عدل و انصاف کا اظہار ہوتا ہے، اور عدل پر مبنی حق کی حکومت کی تشکیل ہوتی ہے جس میں قوانین حقہ کی بالادستی اور حکمفرمائی ہوگی۔ اس حکومت میں حق کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا جاتا اور وہ باطل اور ظلم سے بالکل خالی ہوتی ہے۔

پس جس طرح حق کے روکنے کا معیار نفسانی خواہشات کی پیروی ہے اسی طرح کی دعوت حق کا معیار عقل و شرع کی متابعت و پیروی ہے اور ان دونوں منزلوں، خواہشات نفس کی مکمل پیروی اور عقل و شرع کی مکمل پیروی کے درمیان غیر متناہی منازل ہیں بایں عنوان کے خواہش نفس کی پیروی میں جتنے بھی قدم اٹھائے جائیں گے اسی اندازے سے حق سے دوری ہوگی، حقیقت پردے میں چھپ جائے گی اور کمال انسانیت کے انوار اور آدمیت کے اسرار وجود محجوب ہوتے جائیں گے اور اس کے برعکس جو قدم خواہش نفس کے خلاف اٹھے گا اسی قدر حجاب دور ہوگا اور نور حق ظاہر ہوگا۔

دوسری فصل: خواہش نفس کی پیروی کی مذمت

خداوند عالم، ہوا و ہوس اور خواہشات نفس کی مذمت میں فرماتا ہے ﴿وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ﴾ ۲؎ ''اور نفسانی خواہشات کی پیروی نہ کرو ورنہ یہ تمہیں خدا کی راہ سے بہکا دے گی''۔ دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔ ﴿وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِنَ اللَّهِ﴾ ۳؎ ''اور جو شخص خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی ہوا و ہوس کی پیروی کرے اس سے زیادہ گمراہ کون ہوگا؟''۔

کافی شریف میں سند کے ساتھ حضرت امام محمد باقرؑ سے مروی ہے، آپؑ نے فرمایا

قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يَقُولُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿وَعِزَّتِي وَجَلَالِي وَعَظَمَتِي وَكِبْرِيَائِي وَنُورِي وَعُلُوِّي وَارْتِفَاعِ مَكَانِي لَا يُؤْثِرُ عَبْدٌ هَوَاهُ عَلَى هَوَايَ اِلَّا شَتَّتُّ عَلَيْهِ اَمْرَهُ وَلَبَّسْتُ عَلَيْهِ دُنْيَاهُ

وشغلت قلبه بها ولم اوته منها الا ما قدرت له، وعزتي وجلالي وعظمتي ونوري وعلوي وارتفاع مكاني، لا يؤثر عبد هواي على هواه الا استحفظته ملائكتي وكفلت السموات والارضين رزقه وكنت له من وراء تجارة كل تاجر واتته الدنيا وهي راغمة﴾[7]

رسول خدا کا ارشاد ہے خداوند عالم فرماتا ہے ''اپنے عزت وجلال، عظمت وکبریا اور میری منزلت کی بلندی کی قسم کھاتا ہوں جو بندہ اپنی خواہش کو میری خواہش پر مقدم کرے گا میں اس کے امور کو پراگندہ اور اس کی دنیا کو درہم برہم کردوں گا۔ اس کے دل کو دنیا میں مشغول بنادوں گا اور اسے دنیا سے صرف اتنا ہی دوں گا جو اس کیلئے مقدر کر چکا ہوں اور (اپنی) عزت وجلال، عظمت، نور اور میری منزلت کی بلندی کی قسم کھا رہا ہوں کہ جو بندہ میری خواہش کو اپنی خواہش پر مقدم کرے گا میرے ملائکہ اس کی حفاظت کریں گے، آسمان وزمین اس کی روزی کے متکفل ہوں گے اور میں اس کیلئے ہر تاجر کی تجارت کے پیچھے ہوں گا''۔ یعنی، میں اس کیلئے تجارت کروں گا اور اس کو روزی پہنچاؤں گا اور دنیا اس کے پاس ذلیل ومطیع ہوکر آئے گی یعنی باوجودیکہ اس شخص کا دل دنیا کی طرف مائل نہ ہوگا پھر بھی دنیا ذلیل وخوار ہوکر اس کے پاس آئے گی۔

یہ حدیث شریف محکمات میں سے ہے اور اس کا مضمون خود شاہد ہے کہ یہ علم پروردگار عالم کے شیریں چشمے سے ہے اگرچہ سند کے اعتبار سے کمزور ہے۔ ویسے میں فی الحال اس کی شرح کرنے کے درپے نہیں ہوں۔ اس حدیث کے علاوہ جس کی ہم شرح کر چکے، امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے ﴿ان اخوف ما اخاف علیکم، اثنان اتباع الهوی، وطول الامل﴾[8] ''آپ نے فرمایا سب سے زیادہ دو چیز جس کے بارے میں، میں تم لوگوں سے خوف رکھتا ہوں وہ دو ہیں خواہشات کی پیروی اور لمبی امیدیں''۔

کافی شریف میں امام جعفر صادق سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا ﴿احذروا اهواءكم كما تحذرون اعداءكم، فليس شيء اعدى للرجال من اتباع اهوائهم وحصائد السنتهم﴾[9] ''اپنی خواہشات سے اسی طرح ڈرو جس طرح اپنے دشمنوں سے ڈرتے ہو۔ لوگوں کیلئے خواہش نفس کی پیروی اور ان کی زبانوں سے نکلے ہوئے جملوں سے زیادہ کوئی دشمن نہیں ہے''۔

میرے عزیز! یہ جان لو کہ خواہش نفس اور اس کی آرزوؤں کی کوئی انتہا نہیں اور اس کی لذتوں کی کوئی حد نہیں ہے۔ اگر کسی نے اس کیلئے ایک قدم اٹھایا تو وہ چند مزید قدم اٹھانے پر مجبور ہے۔ اگر اس نے ایک

خواہش نفس کی پیروی کرلی تو چند اور کی پیروی کرنے پر مجبور ہوگا۔ اگر خواہش نفس کے سامنے ایک دروازہ کھول دیا تو پھر بہت سے دروازے اس کے سامنے کھولنے پڑیں گے اور کبھی تم نفس کی ایک پیروی کی وجہ سے کئی برائیوں ،وران سے ہزاروں ہلاکتوں میں مبتلا ہوسکتے ہو، یہاں تک کہ خدانخواستہ آخر وقت میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حق کے تمام راستے تمہارے لئے بند ہوجائیں۔ جیسا کہ خداوند عالم نے قرآن مجید میں اس کی خبر دی ہے۔۱۰ البتہ خود امیر المومنینؑ ،ولی امر، مولا مشکل کشا مرشد کامل، سرکار ہدایت، راہنمائے انسانیت حضرت علیؑ نے اس سے اظہار خوف فرمایا ہے، بلکہ روح مکرم رسول اکرمؐ وائمہ ہدیٰؑ نے بھی اضطراب ووحشت کا ظہار فرمایا کہ کہیں درخت نبوت وولایت کے پتے خزاں رسیدہ ہوکر گرنے نہ لگیں۔

رسول گرامیؐ نے فرمایا ہے۔﴿تناكحوا تناسلوا فانّي اُباهي بكُمُ الأُمم ولو بالسّقط﴾۱۱ ''شادی کرو تاکہ بچے پیدا کرسکو، بے شک میں تم لوگوں کے ذریعے دوسری امتوں پر فخر کروں گا، چاہے سقط شدہ بچے ہی کیوں نہ ہو''۔

اور یہ معلوم ہے کہ اگر انسان کسی ایسے خوفناک رستے میں پڑجائے جہاں یہ خطرہ ہو کہ انسان ہلاک ہوجائے گا اور اس کے والد حقیقی (یعنی رسول خداؐ) کے نافرماں ہونے کے اسباب پیدا ہوجائیں گے اور ﴿رحمة للعالمين﴾ؐ اس سے ناراض ہوجائیں گے تو (سوچو) وہ کتنا بدبخت شخص ہے اور ہیں پردہ کتنی مصیبتیں اور المیے ہیں۔ پس اگر رسول اللہؐ کی معرفت رکھتے ہو اور مولا علیؑ سے محبت رکھتے اور ان کی اور اطہرینؑ کو دوست رکھتے ہو تو ان کے مبارک قلوب کو خوف واضطراب سے باہر لاؤ۔

قرآن مجید کے سورہ ''ہودؑ'' میں ہے ﴿فاستقم كما أُمرتَ ومن تاب معك﴾۱۲ ''پس (اے رسول!) جیسے کہ آپؐ کو حکم دیا گیا ہے اور آپؐ کے ساتھ وہ لوگ بھی جنہوں نے (کفر سے) توبہ کی ہے ثابت قدم رہئے''۔

حدیث میں آیا ہے کہ رسول خداؐ نے فرمایا: ﴿شيّبتني سورة هود، لمكان هذه الآية﴾۱۳ ''مجھے سورہ ہود کی اس آیت نے بوڑھا کردیا''۔ ''شیخ عارف کامل شاہ آبادی'' (روحی فداہ)۱۴ نے فرمایا کہ یہ آیہ مبارکہ سورہ شوریٰ۱۵ میں بھی آئی ہے لیکن وہاں پر ﴿ومن تاب معك﴾ نہیں آیا ہے، اسی لئے حضرت رسولؐ نے سورہ ہود کے ذکر کو مخصوص فرمایا، کیونکہ سورہ ہود میں خدا نے استقامت امت کا حکم بھی آپؐ ہی کو دیا ہے اور آنحضرتؐ کو یہ خوف تھا کہ ہوسکتا ہے یہ کام نہ ہوسکے، ورنہ خود آنحضرتؐ استقامت رکھتے

تھے، بلکہ حضور اسم الٰہی (عدل) کے مظہر تھے۔

لہٰذا اے میرے بھائی! اگر آپ اپنے کو آنحضرت ؐ کے پیروکاروں میں سمجھتے ہیں اور اس ذات مقدس کا اپنے کو محکوم مانتے ہیں تو اپنے برے اور ناشائستہ اعمال کی وجہ سے ان کو شرمندہ وشرمسار نہ کیجئے۔ آپ خود دیکھئے اگر آپ کی اولاد یا دیگر رشتہ دار برے اور نامناسب کام کریں جو آپ کی شان کے خلاف ہوں، تو آپ، لوگوں کے سامنے کتنے شرمندہ وسرافکندہ ہوں گے؟ یہ جان لیں کہ رسول خدا ؐ اور حضرت علیؑ اس امت کے حقیقی باپ ہیں، اس کیلئے خود آنحضرت ؐ نے فرمایا: ﴿انا و علی ابوا هذه الامة﴾ [۱] ''میں اور علیؑ اس امت کے باپ ہیں'' اس لئے جب ہم کو دربار الٰہی میں پیش کیا جائے گا اور ان حضرات ؑ کی موجودگی میں ہمارا حساب لیا جائے گا اور ہمارے نامۂ عمل میں بدی وبرائی کے علاوہ کچھ نہ ہوگا تو ان حضرات ؑ کو کتنا گراں گزرے گا اور خدا وملائکہ وانبیاء ؑ کے سامنے یہ حضرات ؑ کس قدر شرمندہ ہوں گے! ہم نے ان حضرات ؑ پر کتنا بڑا ظلم کیا ہے اور ہم کس مصیبت میں مبتلا ہو گئے ہیں اور خدا معلوم، خدا ہمارے ساتھ کیا معاملہ کرے گا؟

پس اے ظالم وجاہل انسان! تو خود اپنے اوپر تو ظلم کرتا ہی ہے اور تیرے اوپر لعنت جنہوں نے تیری ہدایت کیلئے اپنی جان ومال وراحت کو قربان کر دیا اور بڑی مصیبتوں کو برداشت کیا اور بڑی بے دردی سے جن کو قتل کیا گیا، جن کے زن وفرزند کو اسیر کیا گیا، ان کی زحمتوں کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے ان پر اس طرح کا بڑا ظلم کرتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ تو نے صرف اپنے اوپر ظلم کیا! ذرا خواب غفلت سے بیدار ہو اور اپنی جگہ شرم کر اور ان بزرگوں کو چھوڑ دے۔ ان کیلئے وہی مظالم بہت کافی ہیں جو دشمنان دین کے ہاتھوں ان کو پہنچ چکے ہیں۔ تم تو دوستی کا دعویٰ کرتے ہو! تم ان پر ظلم نہ کرو، کیونکہ دوست اور دوستی کے دعوے دار کی طرف سے ظلم ناگوارتر اور بہت ہی برا ہے۔

تیسری فصل: نفسانی خواہشات کی تعداد

یہ جان لینا چاہئے کہ مراتب ومتعلقات کے اعتبار سے نفسانی خواہشات مختلف وگوناگوں ہیں اور کبھی تو اتنی دقیق ہوتی ہیں کہ خود انسان اس بات سے غافل ہوتا ہے کہ یہ شیطانی مکر اور نفسانی خواہش ہے۔ ہاں! اگر اس کو متوجہ کر دیا جائے اور اس غفلت سے ہوشیار کر دیا جائے تو متوجہ ہو جاتا ہے، مگر ان تمام اختلافات

کے باوجود راہ حق کے روکنے اور خدا کے راستے سے منع کرنے میں یہ سب کے سب شریک ہیں۔ البتہ ان کے مرتبوں میں تفاوت ہے۔ چنانچہ باطل خواہشات والے، سونے وغیرہ کو خدا بنانے والے، جیسا کہ خدا نے ان کے بارے میں فرمایا ہے ﴿أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوَاهُ﴾ بھلا "بھلا تم نے اس شخص کو بھی دیکھا جس نے نفسانی خواہشات کو خدا بنا رکھا ہے"۔ اس کے علاوہ دیگر آیات میں بھی ارشاد ہے۔ دوسری طرح سے خدا سے دور رہتے ہیں اور نفسانی خواہشات اور باطل شیطانی امور کی پیروی کرنے والے اپنے باطل عقائد میں یا فاسد اخلاق میں دوسری طرح حق سے محجوب رہتے ہیں۔ گناہان صغیرہ و کبیرہ کرنے والے اور ہلاکت و نابودی کے باعث ہونے والے اعمال انجام دینے اپنے درجات کے اعتبار سے دوسری طرح حق سے ہٹے رہتے ہیں۔ مباح چیزوں میں نفسانی خواہشات کی پیروی کرنے والے اور اس میں زیادہ مشغول رہنے والے، دوسری طرح راہ حق و حقیقت سے محجوب ہوتے ہیں اور اہل عبادت و ظاہری اطاعت کرنے والے (جو کچھ بھی) عالم آخرت کی آبادی اور نفسانی خواہشات پر کنٹرول حاصل کرنے اور درجات (عالیہ) تک پہنچنے کیلئے یا عذاب و درکات (جہنم) سے بچنے کیلئے کرتے ہیں، وہ بھی ایک طرح حق و راہ حق سے دور رہتے ہیں۔ طاقت نفس کے ظہور و رصفات کی بہشت تک پہنچنے کیلئے جو لوگ ریاضت اور تہذیب نفس کرتے ہیں وہ کسی اور طرح سے حق اور اس کے لقا سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اہل معارف و سلوک، اہل جذب و اکابر عرفا کہ جن کا مقصد لقائے حق اور وصول بمقام قرب کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہوتا، وہ بھی کسی دوسرے طریقہ سے حق و تجلیات خاص سے محروم رہتے ہیں، کیونکہ خود ان کے اندر بھی تلوین اور خود نمائی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر مراتب بھی ہیں جن کا ذکر یہاں پر مناسب نہیں ہے۔

لہذا مذکورہ مراتب کے جو اہل ہیں ان میں سے ہر ایک کو اپنی حالت کا جائزہ لینا چاہئے اور اپنے کو خواہشات نفسانی سے پاک و پاکیزہ رکھنا چاہئے تاکہ راہ حق سے باز نہ رہ سکے اور راہ سلوک حقیقت سے گمراہ نہ ہو سکے اور جہاں بھی ہو رحمت و مہربانی کے دروازے اس کیلئے کھل سکیں۔

وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْهِدَايَة

دوسرا مقام
لمبی امیدوں کا بیان

اس میں دو فصلیں ہیں:

پہلی فصل
لمبی امیدیں، آخرت بھولنے کا سبب

انسانیت کی منزلوں میں سب سے پہلی منزل بیداری ہے۔ چنانچہ بزرگان اہل سلوک نے سالکین کی منزلوں کے سلسلہ میں بیان کیا ہے۔ اور اس منزل کیلئے شیخ عظیم الشان شاہ آبادیؒ نے فرمایا ہے کہ وہ دس بیت ہیں کہ بہر حال ہم ان کو شمار نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن جس چیز کا بیان ضروری ہے وہ یہ ہے کہ انسان جب تک اس بات پر متنبہ نہ ہوگا کہ وہ ایک مسافر ہے، اور مسافر کیلئے سفر اور مقصد کا ہونا ضروری ہے اور اس مقصد کی طرف وہ حرکت کرنے پر مجبور ہے اور حصول مقصد ممکن ہے اس کے اندر عزم پیدا نہ ہوگا اور نہ وہ صاحب ارادہ ہوگا۔ ان تمام امور کیلئے بیان و شرح کی ضرورت ہے اگر ہم ان کا ذکر کریں تو کلام طویل ہو جائے گا۔

یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ اس بیداری کی سب سے بڑی رکاوٹ جو مقصد اور سفر کی تیاری سے روکنے کا سبب بنتی ہے اور جو انسان کے عزم و ارادہ کو مار ڈالتی ہے وہ انسان کا یہ گمان ہے کہ ابھی سفر کیلئے بہت وقت پڑا ہے اگر آج مقصد کی طرف روانہ نہ ہو سکا تو کل روانہ ہو جاؤں گا اور اگر اس ماہ سفر نہ کر سکا تو آئندہ کر لوں گا۔

یہ لمبی امیدیں، طولانی خواہشات اور توقعات، بقا کا خیال، زندگی کی امنگ اور آرزو، نیز وقت کی وسعت کی امیدیں انسان کو اصل مقصد، یعنی آخرت اور آخرت کی طرف سفر کرنے اور زاد راہ اکٹھا کرنے سے روک دیتی ہیں اور انسان مکمل طور پر آخرت کو فراموش کر دیتا ہے اور مقصد انسان کی یاد سے نکل جاتا ہے اور خدا نہ کرے کہ کسی کو دور دراز کا پر خطر سفر درپیش ہو اور وقت تنگ ہو، جبکہ اس کو ساز و سامان و ہمراہی کی ضرورت ہو، مگر اس کے پاس کچھ نہ ہو اور ان تمام چیزوں کے باوجود اصل مقصد سے باہر چلا جائے تو ظاہر ہے کہ اگر یہ بھول جائے تو نہ زاد و راحلہ یاد آئے گا نہ اس کی فکر ہوگی نہ اس کا کوئی انتظام کرے گا اور مجبوراً جب سفر درپیش ہوگا تو یہ لاچار ہو جائے گا اور اس سفر میں گر جائے گا اور منزل مقصد تک پہنچنے سے پہلے راستے

میں ہی ہلاک ہو جائے گا۔

دوسری فصل

پس اے عزیز! یہ جان لو کہ ایک پر خطر لازمی سفر درپیش ہے جس کا ساز و سامان وافراد و جماعت اور زادراہ علم ور نفع بخش عمل ہے، مگر وقت سفر معلوم نہیں ہے کہ کیا ہے؟ ہو سکتا ہے بہت تنگ ہو اور فرصت کا وقت نکل چکا ہو انسان کو معلوم نہیں کہ کس وقت کوچ کا نقارہ بج جائے گا اور اسے مجبوراً سفر کرنا پڑے گا۔ یہ لمبی لمبی امیدیں جو ہم اور آپ رکھتے ہیں یہ حب نفس، شیطانی جال اور اس معلون کا شاہکار ہے کہ جس نے ہم کو عالم آخرت سے اس طرح روک رکھا ہے کہ ہم کو کسی چیز کی کوئی فکر ہی نہیں ہے۔ اگر ہم کو سفر کے خطرات اور راستے کی رکاوٹیں درپیش ہوں تو توبہ وانابت کے ذریعے اس کی اصلاح کر کے حق کی طرف رجوع نہ کر سکیں اور کسی بھی قسم کے سامان سفر کے اکٹھا کرنے کی فکر نہ کریں اور اچانک موت آجائے اور ہم کو بغیر زاد راہ کے اور بغیر تیاری کے سفر پر مجبور کر دے۔ ہم نہ عمل صالح رکھتے ہیں اور نہ علم نافع، حالانکہ عالم آخرت کی گاڑی کا دارمدار انہیں دونوں پہیوں پر ہے اور ہم نے کسی ایک کا انتظام نہیں کیا اور اگر عمل بھی کیا ہے تو خالص اور بغیر ملاوٹ کے نہیں ہے، بلکہ ہم نے ہزاروں خرابیوں کے ساتھ اس کو بجالائے ہیں اور اگر علم بھی حاصل کیا ہے تو، حاصل و بے فائدہ ہے جو یا تو لغو و باطل ہے یا پھر راہ آخرت کیلئے بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ اگر ہمارا یہ علم و عمل سودمند ہوتا وت سالہا سال سے جس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اس کا ہمارے اندر کچھ واضح اثر تو ہوتا، ہمارے اطوار و اخلاق میں کچھ تفاوت تو پیدا ہوا ہوتا! آخر کیا بات ہے کہ ہمارے چالیس پچاس سالہ علم و عمل نے ہمارے دلوں میں اس کے برخلاف اثر کیا اور ہمارے دلوں کو پتھر سے بھی زیادہ سخت تر کر دیا؟ نماز جو مؤمن کی معراج ہے، ہم کو اس سے کیا فائدہ حاصل ہوا؟ وہ خدا کا ڈر اور خوف جو علم کا لازمہ ہے وہ کہاں ہے؟ اگر ہم خدانخواستہ اسی حال میں مر گئے تو بہت بڑا خسارہ اور بہت بڑی حسرت ہمارے سامنے ہوگی جو زائل ہونے والی نہیں ہوگی۔

پس آخرت کو بھولنا ان چیزوں میں سے ہے کہ اگر حضرت ولی اللہ اعظم، امیر المومنین ؑ اس سے اور اس کے سبب، یعنی لمبی امیدوں سے ہمارے بارے میں ڈرتے تھے تو حق بجانب تھے، کیونکہ ان کو معلوم تھا یہ سفر کتنا پر خطر ہے اور انسان جس کو چاہئے کہ ایک لمحہ سکون حاصل نہ کرے ہر وقت سامان سفر جمع کرنے میں لگا رہے اور ایک سیکنڈ بھی نہ بیٹھے۔ مگر اس عالم کو بھول گیا اور سو گیا اور یہ نہ سمجھ سکا کہ ایسا بھی ایک عالم ہے اور

یہ بھی ایک سفر در پیش ہے تو اس پر کیا گزرے گی، وہ کن بدبختیوں میں مبتلا ہوگا۔

بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر تھوڑے سے حضرت رسول اکرم ؐ اور حضرت علی ؑ کے بارے میں سوچیں جو افضل مخلوقات ہیں اور ہر قسم کی خطا، نسیان، لغزش اور سرکشی سے پاک ہیں، پھر یہ سوچیں کہ ہم کس حال میں ہیں اور وہ حضرات ؑ کس حالت میں تھے؟ سفر اور اس کے خطرات سے وہ آگاہ تھے، اسی لئے ان کو آرام اور چین نہیں تھا جبکہ ہماری جہالت نے ہمارے اندر نسیان پیدا کر دیا ہے۔ حضرت ختمی مرتبت ؐ نے اتنی ریاضت کی تھی، وہ عبادتوں میں راتوں کو اتنے کھڑے رہا کرتے تھے کہ پاہائے مبارک ورم کر گئے اور قرآن نے فرمایا ﴿طٰـہٰ ☆ ما انزلنا علیک القرآن لتشقی﴾ ۲۰:۱۹ ''اے طہٰ (اے رسولؐ) ہم نے تم پر قرآن اس لئے نہیں نازل کیا کہ تم اس قدر مشقت اٹھاؤ''۔

حضرت علی ؑ اور آپ ؑ کا خوف خدا اور عبادت تو سب ہی کو معلوم ہے۔ لہذا یہ جان لو کہ سفر بہت ہی پر خطر ہے اور ہمارے اندر جو نسیان و فراموشی ہے وہ شیطان و نفس کی مکاریاں ہیں اور یہ آرزوئیں اور یہی امیدیں ابلیس کے لمبے جال اور نفس کی چال ہے۔ لہذا اس خواب سے بیدار اور ہوشیار ہو جاؤ۔ یہ جان لو کہ تم مسافر ہو اور تمہارا ایک مقصد ہے اور وہ مقصد دوسرا عالم ہے۔ تم چاہو یا نہ چاہو، تم کو بہر حال اس عالم سے لے جائیں گے۔ اگر زادِ راہ اور سامان سفر کا انتظام کر لیا ہے تو اس سفر میں ناکام اور بے چارہ نہ ہوگے۔ ورنہ غریب، لاچار اور نادار ہوگے اور ایسی شقاوت میں مبتلا ہوگے جس میں سعادت نہ ہوگی، ایسی ذلت میں گرفتار ہوگے جس میں عزت نہ ہوگی، ایسی غربت کی طرف جاؤ گے جس کے بعد کوئی امیری نہیں ہوگی۔ ایسے عذاب میں پھنسو گے جس میں کبھی راحت نہ ہوگی، ایسی آگ (میں جلو گے) جو نہیں بجھے گی، یہ افشار ہوگا جو کبھی دور نہ ہوگا، ایسا حزن واندوہ ہوگا جس کے پیچھے کبھی خوشی نہ ہوگی، ایسی حسرت وندامت ہوگی جس کی انتہا نہ ہوگی۔

اے میرے عزیز! ذرا دیکھو تو خدا سے مناجات کرتے ہوئے دعائے کمیل میں مولا علی ؑ کیا عرض کرتے ہیں ﴿وانت تعلم ضعفي عن قليلٍ مِن بلاء الدُّنيا وعقوباتها﴾ ''معبود! تو جانتا ہے کہ میں دنیا کی تھوڑی سی بلا اور عذاب (برداشت کرنے) سے عاجز ہوں'' پھر آگے چل کر مولا ؑ فرماتے ہیں ﴿وهذا ما لا تقوم له السمٰوات والأرض﴾ الخ ''اور یہ تو وہ چیز ہے کہ اس کا اٹھانا آسمانوں اور زمین کے بس میں نہیں ہے''۔ (سوچو) یہ کونسا عذاب ہے، تیرے لئے مہیا کیا گیا ہے؟ لیکن تو پھر بھی نہیں جاگتا،

یک روز بروز فراموشی وخوابِ غفلت میں پڑا رہتا ہے، بلکہ یہ خواب زیادہ ہوتا جاتا ہے۔

ہاں اے غافل دل! خوابِ غفلت سے اٹھ، سفرِ آخرت کیلئے آمادہ ہوجا ﴿فَقَدْ نُودِيَ فِيكُمْ بِالرَّحِيلِ﴾ ۲۲ "رحلت کیلئے صدا دی جاچکی ہے" کوچ کرنے کی آواز بلند ہوچکی ہے۔ حضرت ملک الموت ؑ کے کارندے اپنے کاموں میں مشغول ہوچکے ہیں اور تجھ کو ہر سکنڈ عالم آخرت کی طرف ہنکا رہے ہیں، اس کے باوجود تم غافل و نادان ہو!

اللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ التَّجَافِيَ عَنْ دَارِ الْغُرُورِ،
وَالْإِنَابَةَ إِلَى دَارِ السُّرُورِ وَالْاِسْتِعْدَادَ لِلْمَوْتِ قَبْلَ حُلُولِ الْفَوْتِ ۲۳

"پالنے والے! میں تجھ سے دھوکے والے گھر (دنیا) سے دوری کا سوال کرتا ہوں اور دارِ سرور (جنت) میں آنے کی اور وقت گزرنے سے پہلے موت کیلئے آمادگی کی دعا کرتا ہوں"

توضیحات (۱۰)

۱۔ اصول کافی ج ۲، ص ۳۳۵ و ۳۳۶، کتاب ایمان و کفر، باب اتباع الہوی حدیث ۳۔

۲ "حقیقت شرعیہ" ایک عنوان لفظی ہے کہ شارع نے اس کو لغوی معنی کے علاوہ کسی نئے معنی میں بغیر قرینہ کے استعمال کیا ہو۔ دوسرے لفظوں میں اس کو اصلی اور پہلے معنی سے الگ کر دیا ہو۔

۳۔ مرآۃ العقول، ج ۱۰، ص ۳۱۲، کتاب ایمان و کفر، باب اتباع الہوی، حدیث ۱

۴ اس حدیث کا مضمون بحار الانوار ج ۲، ص ۹۷، اور علم الیقین، ج ۱، ص ۲۸۲ میں آیا ہے

۵۔ سورۂ ص، آیت ۲۶/

۶۔ سورۂ قصص، آیت ۵۰/۔

۷۔ اصول کافی ج ۲، ص ۳۳۵، کتاب ایمان و کفر، باب اتباع الہوی حدیث ۴

۸۔ نہج البلاغہ فیض الاسلام، خطبہ ۲۸، ص ۸۹

۹۔ اصول کافی ج ۲، ص ۳۳۵، کتاب ایمان و کفر باب اتباع الہوی، حدیث ۱

۱۰ سورۂ جاثیہ، آیت ۲۳/، سورۂ قصص، آیت ۵۰/ اور سورۂ روم آیت ۱۰ کی طرف رجوع فرمایئے

۱۱ بحار الانوار، ج ۱۰۳، ص ۲۲۰، باب ۱، ابواب النکاح، حدیث ۲۲ میں اس طرح ہے: ﴿تناکحوا تکثروا فانی اباهي بکم الامم یوم القیامة ولو بالسقط﴾

اور مستدرک الوسائل، ج ۳، ص ۱۵۳، ابواب مقدمات نکاح، باب ۱، حدیث ۱۰ میں ہے: ﴿تناکحوا تناسلوا اباهي بکم الامم یوم القیامة﴾۔

۲۔ سورۂ ہود آیت ۱۲/

۳ علم الیقین، ج ۲، ص ۹۷ اور مجمع البیان میں، اور پہلی آیت کے ذیل میں، اور (کشاف، ج ۲، ص ۴۳۲) پر بھی اس کے مشابہ آیا ہے

۱۴۔ حدیث حاشیہ ۵۔

۱۵۔ سورۂ شوریٰ، آیت ۱۵/۔

۱۶۔ بحار الانوار، ج ۳۶، ص ۱۱، تاریخ امیر المؤمنین، باب ۲۶، حدیث ۱۲۔

۱۷۔ سورۂ جاثیہ، آیت ۲۳/ (ترجمہ گزر چکا ہے)۔

۱۸۔ منازل السائرین، ص۸، قسم البدایات، باب یقظہ۔

۱۹۔ صادقین (امام محمد باقرؑ اور امام جعفر الصادقؑ) سے مروی ہے

«كان رسولُ الله ﷺ إذا صلّى قامَ على أصابعِ رجليهِ حتى تورّمتْ، فأنزلَ اللهُ تباركَ وتعالى ﴿طه﴾»۔

تفسیر علی بن ابراہیم قمیؒ، ج۲، ص۵۸۔

۲۰۔ سورۂ طہ، آیت ۱و۲۔

۲۱۔ دعائے کمیل، مصباح المتہجد، ص۵۸۷۔

۲۲۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۵۔

۲۳۔ اعمال ماہ رمضان کے سلسلے میں ۲۷ویں شب کی یہی دعا تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ حضرت امام سجاد علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے۔

اقبال، ص۲۲۸،

المراقبات فی اعمال السنۃ، ص۱۵۵،

مفاتیح الجنان، اعمال شب ۲۷ ماہ رمضان۔

گیارھویں حدیث

بالسند المتّصل الی مُحمّد بن یعقوب، عن مُحمّد بن یحیی عن أحمد بن مُحمّد، عن ابن محبوب عن علیّ بن رئاب، عن زُرارة، قال

سألتُ ابا عبد اللهِ علیه السلام، عن قولِ اللهِ عزّوجلّ ﴿فطرتَ اللهِ الّتی فطر النّاس علیها﴾ قال فطرهُم جمیعاً علی التّوحید۔

ترجمہ زرارہ کہتے ہیں میں نے امام جعفر صادقؑ سے خدا کے اس قول ﴿فطرت الله التی فطر النّاس علیها﴾ کے بارے میں سوال کیا تو حضرتؑ نے فرمایا "تمام (لوگوں) کو توحید پر خلق فرمایا"۔

شرح اہل لغت و تفسیر کہتے ہیں "فطرت" کے معنی "خلقت" کے ہیں (چنانچہ) الصحاح میں ہے "الفطرة، الخلقة" "ف" کے زیر کے ساتھ فطرة کے معنی ہیں، خلقت۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "فطرت" "فطر" سے ماخوذ ہو جس کے معنی پھوڑنے اور پارہ کرنے کے ہیں، کیونکہ (خلقت) پردۂ عدم اور حجاب غیب کو پارہ کرنے کو کہا جاتا ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے روزہ دار کے کھانے کو "افطار" کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ بھی امساک کی ارتباطی حالت کو پارہ کرتا ہے۔ بہرحال لغوی معنی سے بحث ہمارے مقصد سے خارج ہے۔

خلاصہ (کلام) یہ ہے کہ حدیث شریف سورۂ روم کی اس آیۂ شریفہ کی طرف اشارہ ہے

﴿فاقم وجهک للدّین حنیفاً فطرت الله الّتی فطر النّاس علیها لا تبدیل لخلق الله ذلک الدّینُ القیّمُ ولکنّ أکثر النّاس لا یعلمون﴾ ۲

ہم انشاءاللہ چند فصلوں اور مقامات کے ضمن میں فطرت اور اس کی کیفیت کے ذکر کے علاوہ اس بات کو بھی بیان کریں گے کہ کس طرح لوگ فطرت توحید پر خلق ہوتے ہیں؟

پہلی فصل: فطرت کے معنی

اس فطرت سے مراد جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا ہے وہ حالت وہیئت ہے کہ جس پر خدا نے مخلوق کو قرار دیا ہے اور یہ ان چیزوں کے وجود کا لازمہ ہے اور ان چیزوں میں سے ہے کہ جن سے اصل خلقت کا خمیر تیار کیا گیا ہے اور بعد میں معلوم ہوگا کہ الٰہی فطرتیں انہی الطاف میں سے ہیں جن کو خدا نے دیگر مخلوقات میں سے صرف بنی نوع انسان کیلئے مخصوص کیا ہے۔ دیگر مخلوقات میں یا تو اس قسم کی فطرتیں موجود ہی نہیں ہیں یا اگر ہیں تو ناقص ہیں، ان موجودات کا ان میں حصہ بہت ہی کم ہے۔

یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اگرچہ اس حدیث میں اور دوسری [۳] حدیثوں میں بھی فطرت کی تفسیر توحید سے کی گئی ہے، مگر یہ (درحقیقت) بیان مصداق کیلئے ہے یا پھر کسی چیز کی تفسیر اس کے اعلیٰ واشرف ترین جزو سے کی گئی ہے اور عموماً اہل بیت سلام اللہ علیہم کی تفسیریں اسی طرح کی ہیں اور اگر کسی جگہ پر مقامی مصداق کی مناسبت وجہ سے، مثلاً ذکر ہوا ہے تو جاہل لوگ خیال کرتے ہیں، امامؑ کے کلام میں (معاذ اللہ) تعارض ہے۔ اب رہی یہ بات کہ یہاں پر بھی ایسا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ آیہ شریفہ میں (دین) کو فطرت اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے اور دین، توحید کے علاوہ دیگر معارف کو بھی شامل ہے۔ عبداللہ بن سنان [۴] کی صحیحہ میں "اسلام" سے تفسیر کی گئی ہے۔ حسنہ زرارہ [۵] میں اس کی تفسیر "معرفت" سے کی گئی ہے اور مشہور حدیث ﴿کُلُّ مولُودٍ یُولَدُ علی الفطرة﴾ میں، یہودیت، نصرانیت اور مجوسیت کے مقابلے میں (فطرت کا) ذکر کیا گیا ہے۔ [۶] نیز اسی حسنہ زرارہ میں حضرت امام محمد باقرؑ نے فطرت کی تفسیر "معرفت" سے فرمائی ہے۔

پس ان سب سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فطرت (کا لفظ) صرف توحید سے مخصوص نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق ان تمام معارف حقہ سے ہے جن پر خداوند عالم نے اپنے بندوں کو خلق فرمایا ہے۔

دوسری فصل: احکام فطرت کی تشخیص

یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ جو چیزیں احکام فطرت میں سے ہیں چونکہ وہ لوازم وجود اور اصل طینت

وخلقت کے خمیر میں سے ہیں اس لئے اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے، بلکہ عالم وجاہل مہذب اور غیر مہذب، شہری ودیہاتی، سب ہی اس میں متفق ہیں۔ کوئی عادت یا مذہب یا طریقہ کسی بھی قسم کا ہو، نہ (اپنے لئے کوئی) راستہ بنا سکتا ہے، نہ اس میں کوئی خلل اندازی کرسکتا ہے، نہ رخنہ پیدا کرسکتا ہے۔ تعلقات، خواہشات، مانوس چیزوں، آراء اور عادتوں، حتیٰ کہ احکام عقلیہ میں بھی اختلاف پیدا ہو جاتا ہے، مگر یہ چیزیں فطریات میں اثر انداز نہیں ہوپاتیں۔ سمجھ میں اختلاف، قوت اور ادراک کی کمی وزیادتی فطریات کو متاثر نہیں کرپاتی اور اگر کوئی چیز ایسی نہیں ہے تو وہ فطری نہیں ہے اس کو فطریت سے خارج جاننا چاہئے۔ اس لئے آیۂ شریفہ ﴿فطر النّاس علیہا﴾ یعنی فطرت کسی خاص طبقے سے متعلق نہیں ہے۔ اسی طرح ارشاد خداوندمتعال ہے ﴿لا تبدیل لخلق اللّٰہ﴾ ''خدا کی خلقت میں کوئی تغیر وتبدل پیدا نہیں ہوسکتا'' کوئی چیز اس کو تبدیل نہیں کرسکتی، جبکہ دوسری چیزیں عادتوں وغیرہ سے بدل جاتی ہیں۔ لیکن تعجب خیز امر یہ ہے کہ ابتدائے آفرینش سے لے کر آخر دنیا تک فطریت میں کسی کو اختلاف نہیں ہے، لیکن عموماً لوگ اس بات سے غافل ہیں اگرچہ باہم متفق ہیں، بلکہ گمان کرتے ہیں کہ اختلاف رکھتے ہیں۔ ہاں! اگر متنبہ کردیا جائے تب سمجھتے ہیں کہ ہم تو مخالفت کی صورت میں بھی موافق تھے! چنانچہ بعد میں ان شاء اللہ اس کی وضاحت ہوگی اور اس آیت کے ذیل میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ﴿ولکنّ اکثر النّاس لا یعلمون﴾۔

ہم نے اوپر جو ذکر کیا اس سے واضح ہوگیا کہ احکام فطرت تمام بدیہی احکام سے زیادہ بدیہی تر ہیں، کیونکہ تمام احکام عقلیہ میں ہمارے پاس کوئی ایسا حکم نہیں ہے کہ جس میں کوئی اختلاف نہ کرے یا کسی نے اس میں اختلاف نہ کیا ہو۔ ظاہر ہے کہ جو چیز ایسی ہو وہ ضروریات میں سے واضح اور بدیہیات میں سب سے نمایاں ہوگی اور جو چیز اس کا لازمہ ہوگی وہ بھی ایسی ہی واضح اور ضروری ہوگی۔ لہٰذا اگر توحید یا دیگر معارف، احکام فطرت یا اس کے لوازم میں سے ہوں تو ان کو سب سے زیادہ بدیہی ہونا چاہئے اور سب سے واضح وضروری ہونا چاہئے ﴿ولکنّ اکثر النّاس لا یعلمون﴾۔

تیسری فصل فطری احکام کی طرف اشارہ

یہ جان لو کہ شیعہ، سنی تمام مفسرین نے اپنے اپنے طریقے سے دین یا توحید کے فطری ہونے کی کیفیت

کو بیان کیا ہے۔ ہم یہاں پر ان کی رائے کے مطابق گفتگو نہیں کریں گے، بلکہ شیخ عارف کامل شاہ آبادی (دام ظلہ) سے جو اس میدان میں منفرد ہیں، کے محضر مبارک سے جو کچھ میں نے استفادہ کیا ہے اس کو بیان کروں گا۔ اگر چہ ان میں سے بعض چیزیں بطور اشارہ بعض محققین اہل معارف کی کتابوں میں موجود ہیں اور ان میں سے بعض خود قاصر کی نظر سے گزری ہیں۔

پس یہ جان لینا چاہئے کہ الٰہی فطرتوں میں ایک فطرت خود اصل وجود باری تعالیٰ ہے جو مبدأ ہستی ہے اور ایک فطرت توحید ہے، ایک فطرت یہ ہے کہ خداوند عالم کی ذات مقدس میں تمام کمالات جمع ہیں، ایک فطرت یوم معاد اور قیامت کا دن ہے، ایک نبوت ہے، ایک فطرت وجود ملائکہ وروحانیین وانزال کتب اور طرق ہدایت کا اعلان کرنا ہے۔ البتہ ان مذکورہ چیزوں میں بعض تو احکام فطرت سے ہیں اور بعض لوازم فطرت سے ہیں۔ خدا، ملائکہ، (آسمانی) کتابوں، رسولوں، روز قیامت، دین قیم ومحکم ومستقیم پر ایمان لانا سلسلہ بشر کی پوری زندگی میں برحق ہے۔ ان میں سے بعض وہ چیزیں جو حدیث شریف سے مناسبت رکھتی ہیں ہم ان کا ذکر کریں گے اور (اس سلسلہ میں) خدا سے توفیق کے خواہاں ہیں۔

پہلا مقام

وجود خدا فطری ہے

ہمارا مقصد ایک مقدمہ کی وضاحت کے بعد معلوم ہو جائے گا۔

ایک فطری بات جو تمام بنی نوع انسان کے خمیر میں شامل ہے اور دنیا کا کوئی بھی فرد بشر اس کی مخالفت نہیں کرسکتا اور عادتوں، مذہبوں، مسلکوں، اخلاق وغیرہ کے اختلاف سے اس میں کوئی تغیر اور خلل پیدا نہیں ہوسکتا ہے، وہ "کمال سے محبت" کی فطرت ہے۔ آپ انسانی زندگی کے جس دور کا بھی جائزہ لینا چاہیں اور جس گروہ وملت کے افراد سے سوال کریں، کمال سے عشق ومحبت، اس کی خمیر میں پائیں گے اور دیکھیں گے کہ اس کا دل کمال کی طرف متوجہ ہے، بلکہ نوع انسان کی ہر فرد چاہے وہ جس چیز میں بھی مشغول ہو اس کے تمام حرکات، سکنات، زحمتیں، انتھک کوششیں اس چیز کیلئے صرف اس وجہ سے تھیں اور ہیں کہ اس کو اس چیز کے کمال سے عشق تھا۔ ہاں! تشخیص کمال اور یہ کہ کس چیز میں کمال ہے اور محبوب ومعشوق کہاں ہے؟ اس میں البتہ لوگوں میں اختلاف ہے۔ ہر شخص نے اپنے محبوب کو ایک الگ چیز میں پایا ہے، اسی کو امیدوں کا مرکز بتایا

ہے اور دل و جان سے اس کو چاہو ہے۔ (مثلاً) اہل دنیا، دنیا اور زیبائش دنیا کو کمال سمجھتے ہیں اور اپنے محبوب کو دنیا میں پاتے ہیں، لہذا اس کے حاصل کرنے کیلئے جان و دل سے والہانہ خدمت کرتے ہیں اور جو شخص بھی جس شعبے میں ہے، چونکہ اسی کو کمال سمجھتا ہے لہذا اسی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اسی طرح صنعت والے اور اہل علوم اپنے دماغ کی وسعت کے اعتبار سے جس چیز کو کمال سمجھتے ہیں اس کی طرف متوجہ ہوتے اور اسی کو اپنا محبوب سمجھتے ہیں۔ اہل آخرت و ذکر و فکر دوسری چیز کو اپنا محبوب سمجھتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ سب کمال کی طرف مائل ہیں اور جب اس کمال کو کسی خیالی شئے میں دیکھتے ہیں تو اسی سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن یہ بھی جان لینا چاہئے کہ ان تمام چیزوں کے باوجود ان میں سے کسی سے محبت و عشق جن کے بارے میں گمان ہے کہ ان سے محبت کرتا ہے، وہ (حقیقی) نہیں ہے اور جس کے بارے میں (محبت کا) خیال ہے وہ اس کا محبوب اور مرکز امید نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جو شخص بھی اپنی فطرت کی طرف رجوع کرے گا تو اس کا دل گواہی دے گا کہ وہ شخص جس چیز کی بھی طرف متوجہ ہے اگر اس کو اس سے اعلیٰ شئے مل گئی تو اس کا دل اس کی طرف سے پلٹ جائے گا اور دوسری کسی زیادہ کامل چیز کی طرف متوجہ ہو جائے گا اور جب اس کامل تر شئے تک رسائی ہوگی اور اس کے بعد اس سے بھی اکمل شئے کی طرف توجہ کرے گا، پھر اس کو بھی چھوڑ کر اس سے زیادہ کامل شئے کی طرف متوجہ ہو جائے گا، بلکہ آتش عشق و سوز و اشتیاق روز بروز بڑھتی ہی جائے گی اور آپ کا دل کسی بھی منزل پر نہیں رکے گا اور کسی قسم کی حدود و قیود کا پابند نہیں رہے گا۔

مثلاً آپ ایک جمال دل فریب و رخسار زیبا کی طرف مائل تھے اور آپ نے اس کو کسی معشوق میں دیکھا لہذا دل کو اس کے کوچہ کی طرف روانہ کر دیا۔ اب اگر اس سے بھی زیادہ حسین چہرہ آپ کی نظروں میں آ گیا تو یقیناً اس کی طرف متوجہ ہو جائیں گے یا کم از کم دونوں کو چاہیں گے، مگر اس سے بھی آتش شوق خاموش نہیں ہوگی، بلکہ زبان حال و لسان فطرت سے آپ یہی کہیں گے "ہرچہ بینم بیشت زرہ خریدار هسو ششم" بلکہ آپ ہر حسین کے خریدار ہوں گے، صرف (خوبصورتی کے) امکان کی بنا پر شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر آپ یہ خیال کریں گے کہ آپ کے پاس جو خوبصورت و دلفریب محبوبائیں ہیں یا جن کو آپ نے دیکھا ہے ان سے بھی زیادہ خوبصورت حسینہ ایک دوسری جگہ ہے تو آپ کا دل وہاں کے سفر کیلئے آمادہ ہو جائے گا "من درمیان جمع و دلم جائی دیگر است" (میں تو محفل میں ہوں مگر میرا دل دوسری

جگہ ہے)، بلکہ صرف آرزو پر اشتیاق پیدا ہو جاتا ہے۔ بہشت کے اوصاف اگر آپ سنیں اور (حوروں کے) دلکش رخسار کا ذکر سنیں تو چاہے خدانخواستہ اس کا عقیدہ نہ بھی رکھتے ہوں پھر بھی آپ کی فطرت کہے گی کاش ایسی بہشت اور ایسی دربا محبوبہ ہمارے نصیب میں ہوتی' اسی طرح جو لوگ حکومت، غلبہ و اقتدار اور توسیع پسندی کو کمال سمجھتے اور اس کے دلدادہ ہوتے ہیں، جب کسی ملک کی حکومت ان کے قبضہ میں آجاتی ہے تو دوسری حکومت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اب اگر وہ بھی ان کے قبضہ میں آجائے تو اس سے بھی بلندو بالا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، (بلکہ) گر ایک ملک پر قبضہ کرلیں تو دوسرے ممالک کی طرف مائل ہوتے ہیں، بلکہ آتش شوق روز افزوں بڑھتی ہی رہتی ہے اور اگر اتفاق سے تمام روئے زمین پر حکومت حاصل کرلیں تو دوسرے کروں پر (اگر) مکان پایا جائے کہ وہاں بھی بسط اقتدار ہے تو ان کا دل اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ اے کاش' ان دنیاؤں کی طرف بھی پرواز ممکن ہوتی اور ہم ان کو بھی اپنے زیر نگیں لے آتے۔ یہی صورت تمام اہل صناعات و علوم کی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ تمام افراد بشر چاہے جس شعبہ اور پیشے سے تعلق رکھتے ہوں وہ جس درجہ تک پہنچیں گے ان کا شوق اس سے کامل تر کی طرف بڑھتا جائے گا اور ان کی خواہش کی آگ بجھے گی نہیں، بلکہ روز بروز شعلہ ور ہوتی جائے گی۔ پس اسی نور فطرت نے ہم کو بتایا کہ تمام سلسلہ بشر کے قلوب، براعظم افریقہ کے دور ترین ممالک میں بسنے والوں سے لے کر دنیا کے متمدن ترین ممالک تک اور طبیعی اور مادی مکاتب فکر کے ماننے والوں سے لے کر اہل ملل و نحل تک سب ہی فطرتاً ایک ایسے کمال کے متمنی ہیں جس میں کوئی نقص نہ ہو اور ایسے حسن کے عاشق ہیں جس میں کوئی عیب نہ ہو اور ایسے علم کے خواہشمند ہیں جس میں جہل نہ ہو، ایسے اقتدار و حکومت کے طالب ہیں جس کے ہمراہ عاجزی نہ ہو، ایسی زندگی کے دلدادہ ہیں جس کیلئے موت نہ ہو، یعنی ہر ایک کا محبوب "کمال مطلق" ہے۔ تمام مخلوقات اور انسانی معاشرے کے افراد یک دل و یک زباں ہو کر کھل کر کہہ رہے ہیں کہ ہم کمال مطلق کے عاشق ہیں۔ ہم جلال و جمال مطلق سے محبت رکھتے ہیں۔ ہم مطلق اقتدار اور علم مطلق کے طالب ہیں۔ کیا ذات مقدس مبدأ عالم جلت عظمتہ کے علاوہ عالم تصور و خیال میں بھی اس پورے سلسلۂ کائنات اور تجویزات عقلیہ و اعتباریہ میں کوئی ایسا موجود ہے جو کمال مطلق اور جمال مطلق رکھتا ہے؟ اور کیا بے نقص جمیل علی الاطلاق اس محبوب مطلق کے علاوہ کوئی اور ہے؟

اے وادی حیرت کے سرگشتہ لوگو! اے گمراہی کے صحراؤں میں بھٹکنے والو! نہیں (نہیں) بلکہ اے شمع جمال جمیل مطلق کے پروانو! بے عیب و بلا زوال محبوب کے عاشقو! ذرا کتاب فطرت کی طرف رجوع کرو، اپنی کتاب ذات کی ورق گردانی کرو تو دیکھو گے کہ فطرت الٰہی کے قلم قدرت سے اس میں لکھا ہوا ہے ﴿انی وجهت وجهي للذي فطر السموات والأرض﴾ ؎۱ ﴿فطرت الله التي فطر الناس عليها﴾ کیا (یہاں پر) فطرت، محبوب مطلق کی طرف توجہ کی فطرت ہے؟ کیا یہ نہ بدلنے والی فطرت ﴿لا تبديل لخلق الله﴾ فطرت معرفت ہے؟ اس فطری عشق خداداد اور اس امانت الٰہی کو کب تک باطل خیالات میں ادھر ادھر صرف کرتے رہو گے؟ اگر تمہارا محبوب یہی ناقص جمال اور محدود کمال ہوتا تو پھر اس کے حصول کے بعد تمہاری آتش شوق بجھی کیوں نہیں؟ اور شعلہ شوق زیادہ کیوں ہوا؟

ہاں! (ذرا) خواب غفلت سے اٹھو، خوشخبری دو، خوشی مناؤ کہ تمہارا محبوب ایسا ہے جس کو زوال نہیں، یہ ایسا معشوق ہے جس میں نقص نہیں، ایسا مطلوب ہے جس میں عیب نہیں اور ایسا منظور ہے جس کا نور طلعت ﴿الله نور السموات والأرض﴾ ؎۲ ہے، ایسا محبوب ہے کہ جس کے احاطہ کی وسعت ﴿لو دليتم بحبل الى الأرضين السفلى لهبطتم على الله﴾ ؎۳ ہے۔ ”اگر تمہیں کسی رسی کے ذریعے زمین کی نچلی منزلوں کی طرف سے جایا جائے تو خدا کے پاس پہنچو گے“ پس تمہارا یہ فعلی عشق معشوق فعلی کو چاہتا ہے۔ یہ خیالی اور وہمی نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ ہر موہوم ناقص ہوتا ہے اور فطرت، کامل کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ لہذا عاشق فعلی اور عشق فعلی بغیر معشوق کے نہیں ہوسکتا اور ذات کامل (خدا) کے علاوہ کوئی ایسا معشوق نہیں ہے جس کی طرف فطرت کا لگاؤ ہو۔ اس لئے کامل مطلق کے عشق کا لازمہ کامل مطلق کا وجود ہے اور یہ بات پہلے واضح کی جا چکی ہے کہ فطرت اور اس کے لوازم کے احکام سب کے سب تمام بدیہیات سے واضح و روشن تر ہیں۔ ﴿افي الله شك فاطر السموات والأرض﴾ ؎۴

دوسرا مقام

توحید اور خدا کی دوسری صفات کا فطری ہونا

پروردگار عالم کی توحید، اور اس کی ذات کی تمام صفات کمال کا مستجمع ہونا بھی فطریات سے ہے۔ مقام اول میں جو کچھ ذکر کیا گیا ہے اس کی طرف توجہ کرنے سے یہ بات معلوم ہو جائے گی، لیکن ہم یہاں پر ایک

دوسری دلیل سے اسی مطلب کو ثابت کریں گے۔

یہ جان لو کہ ان فطرتوں میں کہ جن پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا ہے ایک فطرت، نقص سے نفرت بھی ہے۔ انسان جب کسی میں عیب یا نقص پاتا ہے تو اس سے متنفر ہوتا ہے۔ پس عیب و نقص فطرت کیلئے اسی طرح باعث نفرت ہے جس طرح کمال مطلق سے محبت فطری ہے۔ اس لئے فطرت ہمیشہ "واحد" اور "احد" کی طرف متوجہ ہوگی، کیونکہ کثرت و مرکب ناقص ہوا کرتا ہے اور کثرت غیر محدود نہیں ہوتی اور جو ناقص ہوگا وہ فطرت کیلئے قابل نفرت ہوگا نہ کہ قابل توجہ۔ پس ان دونوں فطرتوں، سے یعنی کمال سے لگاؤ اور نقص سے نفرت کی فطرت سے توحید بھی ثابت ہوتی ہے، بلکہ یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ خداوند جل وعلا تمام کمالات کا مستجمع اور تمام نقائص سے مبرا و منزہ ہے اور سورۂ توحید جو خدا کی نسبت کو بیان کرتا ہے وہ (ہمارے شیخ بزرگوار ؒ کے بقول) ہویت مطلقہ ہے جس کی طرف فطرت متوجہ ہوا کرتی ہے اور سورۂ مبارکہ توحید کے شروع میں کلمہ مبارکہ ﴿ھُو﴾ کہہ کر چھ صفت پر دلیل کی طرف اشارہ ہے جو ﴿ھُو﴾ کے بعد مذکور ہے۔ چونکہ ذات پروردگار ہویت مطلقہ ہے اور ہویت مطلقہ کو کامل مطلق ہونا چاہئے ورنہ پھر ہویت محدودہ ہو جائیں گی اور جب کامل مطلق ہے تو مستجمع جمیع کمالات بھی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ تمام کمالات کے جامع ہونے کے ساتھ بسیط بھی ہے، ورنہ ہویت مطلقہ نہ ہوگی۔ اس کے بعد ﴿اَحَد﴾ ہے اور احدیت کا لازمہ واحدیت ہے، چونکہ ہویت مطلقہ جامع جمیع کمالات ہے (اس لئے) تمام نقائص سے مبرا ہوگی، کیونکہ تمام نقائص کی بازگشت ماہیت کی طرف ہوا کرتی ہے۔ اس کے بعد ذات خدا ﴿صَمَد﴾ ہے اور صمد و ھُو کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے اور چونکہ ہویت مطلقہ ہے اس لئے نہ کوئی اس سے پیدا اور جدا ہوسکتا ہے اور نہ وہ کسی سے پیدا یا جدا ہوسکتا ہے، بلکہ وہ تمام چیزوں کا مبدا اور تمام مخلوقات کا مرجع ہے۔ مگر (ہاں!) جدائی نام کی کوئی چیز نہیں ہے جس کا لازمہ نقص ہے، نیز ہویت مطلقہ کا کوئی ہمسر اور شریک بھی نہیں ہے، کیونکہ کمال صرف میں تکرار کا تصور نہیں ہوسکتا۔ پس سورۂ مبارکہ توحید فطرت کے احکام سے ہے اور اس میں خدا کی نسبت ہے۔

تیسرا مقام

معاد کا فطریات سے ہونا

معاد اور روز قیامت کا وجود بھی ان فطری امور میں سے ہے جو انسانی خمیر میں شامل ہے اور یہ بھی دو

مقامات کی طرح مختلف طریقوں اور متعدد فطرتوں سے ثابت ہے، مگر ہم یہاں پر صرف بعض کی طرف اشارہ کریں گے۔

الٰہی فطرتوں میں سے تمام افراد بشر کو جن پر پیدا کیا گیا ہے ان میں سے ایک راحت و آرام سے لگاؤ کی فطرت ہے کہ اگر آپ تمام تمدن و توحش، دینداری و بے دینی کے ادوار کا مطالعہ کریں گے اور تمام افراد عالم کی طرف مراجعہ کریں گے، خواہ وہ عالم ہوں یا جاہل، طبقۂ اشرف سے ہوں یا نچلے طبقے سے، دیہاتی ہوں یا شہری اور ان سے سوال کریں گے کہ یہ مختلف تعلقات کیسے ہیں، یہ مختلف خواہشیں کیسی ہیں، زندگی کے اندر یہ زحمتیں یہ مشقتیں کیوں لوگ برداشت کرتے ہیں؟ تو سب ہی فطری زبان سے یک صدا ہو کر واضح طور پر جواب دیں گے کہ ہم لوگ یہ سب اپنی راحت کیلئے کرتے ہیں، ہمارا آخری مقصد اور انتہائے آرزو یہ مطلق آرام و راحت ہے جس کے حصول کیلئے کسی قسم کی محنت و مشقت نہ کرنا پڑے اور چونکہ ہر شخص چاہتا ہے کہ ایسی راحت ملے جو مخلوط بہ زحمت نہ ہو اور ایسی استراحت ملے جو مخلوط بہ رنج و عذاب نہ ہو، ہر شخص کو ہر چیز میں اپنے اسی گمشدہ محبوب کی تلاش ہے۔ اسی لئے جس کے بارے میں گمان کرتا ہے وہی اس کا محبوب ہے اور اسی سے لگاؤ پیدا کرتا ہے، حالانکہ تمام عالم ملک اور پوری دنیا میں ایسی راحت مطلقہ نہیں پائی جاتی اور نہ ہی ایسی غیر مخلوط استراحت ممکن ہے۔ اس دنیا کی تمام نعمتیں زحمتوں سے بھرپور اور روح فرسا مشقت سے معمور ہیں، دنیا کی تمام لذتیں مگر تو آلام و مصائب سے گھری ہیں، درد و غم، تھکن اور حزن و اندوہ و ملال پورے عالم کو اپنے پیٹ میں لیتے ہوئے ہے۔ انسانی زندگی میں ایک فرد بھی ایسا نہیں ملے گا جس کی مشقت اس کی راحت کے برابر ہو اور اس کی نعمت اس کی مشقت اور عذاب کے مساوی ہو، چہ جائیکہ اسے خالص راحت اور مطلق آرام مل جائے' پس ثابت ہوا کہ بنی نوع انسان کا محبوب اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔ (اسی طرح) عشق فطری اور جبلی عمل محبت بھی تمام سلسلہ بشر میں بغیر معشوق فعلی کے ممکن نہیں ہے۔

لہذا (اس) دار تحقق اور عالم وجود میں ایک ایسا عالم ہونا چاہئے جس کی راحت میں رنج و الم شامل نہ ہو، اس میں آرام مطلق بغیر کسی درد و زحمت کے ہو، اس کی خوشی خالص ہو، حزن و اندوہ کا شائبہ بھی اس میں نہ ہو اور وہ خدا کی نعمتوں کا گھر اور اس ذات مقدس کا عالم کرامت ہے۔

اس عالم آخرت کو آزاد فطرت اور ارادے کے اختیار سے بھی ثابت کیا جا سکتا ہے، کیونکہ یہ دونوں چیزیں بھی ہر فطرت بشر میں پائی جاتی ہیں، چونکہ اس عالم کے مواد، اس دنیا کے حالات، اس کی زحمتیں اور

اس کی تنگی انسانی حریت اور اس کے ارادے کے دائرۂ اختیار کو برداشت نہیں کر سکتیں۔ اس لئے دارِ وجود میں ایک ایسے عالم کا وجود ضروری ہے جہاں ارادے کو اختیار حاصل ہو اور اس عالم کے مواد ارادے کے دائرۂ اختیار سے سرکشی نہ کر سکتے ہوں اور انسان اس عالم میں جو چاہے کر سکے اور جس چیز کا وہ ارادہ کرے ہو جائے جو فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہے۔

پس آرام و راحت سے محبت اور آزادی و حریت کی چاہت، دو ایسے پروں کی طرح ہیں جو نہ بدلنے والی فطرۃ اللہ کے مطابق انسان کے اندر ودیعت کئے گئے ہیں، جن کے ذریعے سے انسان ملکوت اعلیٰ اور عالم قرب الٰہی تک پرواز کرتا ہے۔

یہاں پر کچھ دیگر مطالب بھی ہیں (مگر وہ) اس کتاب سے مناسبت نہیں رکھتے اور نبوت کے اثبات، بعثت رسل، ارسال کتب وغیرہ جیسے کے معارف حقہ کے اثبات کیلئے دوسری فطرتیں بھی ہیں، بلکہ ان تمام فطرتوں سے جن کا ذکر گزر چکا، تمام معارف کو ثابت کیا جا سکتا ہے، لیکن ہم اسی پر اکتفاء کرتے ہیں تاکہ اپنے مقصود سے خارج نہ ہو جائیں اور حدیث شریف کی نامناسب شرح نہ ہو جائے۔

یہاں تک (کی تحریر) سے معلوم ہو گیا کہ علم مبدأ و کمالات، اس کی وحدانیت، یوم معاد کا علم اور عالم آخرت کا علم (یہ سب) فطریات سے ہے۔

والحمد للہ

توضیحات (۱۱)

اصول کافی، ج ۲ ص ۱۲، کتاب ایمان وکفر، باب فطرت خلق برتوحید، حدیث ۴

۲۔ پس تم ہر طرف سے کٹ کر اپنا رخ دین (اسلام) کی طرف کیے رہو۔ یہی خدا کی فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ خدا کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں ہے لیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے۔ سورۂ روم، آیت ۳۰۔

۳۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۱۲، ۱۳، کتاب ایمان وکفر، باب فطرۃ الخلق علی التوحید، حدیث ۱۔۵

توحید، ص ۳۲۸، ۳۳۱، باب ۵۳، ۱۰، احادیث ۱، ۲، ۴، ۸۔

تفسیر برہان، ج ۳، ص ۲۶۱۔۲۶۳، ذیل آیہ ۳۰ سورۂ روم۔

۴۔ عن عبد اللہ بن سنان، عن ابی عبد اللہ قال سألتہ عن قول اللہ عزوجل ﴿فطرت اللہ التی فطر الناس علیھا﴾ ما تلک الفطرۃ؟ قال ھی الاسلام فطرھم اللہ حین اخذ میثاقھم علی التوحید قال ﴿الست بربکم﴾ وفیہ المؤمن والکافر

عبداللہ بن سنان نے امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں میں نے خداوند عالم کے اس ارشاد کے بارے میں پوچھا ﴿فطرت اللہ التی فطر الناس علیھا﴾ اس سے کون سی فطرت مراد ہے؟ امامؑ نے فرمایا اس سے اسلام مراد ہے۔ خداوند عالم نے جب توحید پر ان سے عہد وپیمان لیا اور کہا: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ حالانکہ اس میں مومن وکافر سب ہی موجود تھے

اصول کافی، ج ۲، ص ۱۲، کتاب ایمان وکفر، باب فطرت خلق بر توحید، حدیث ۲۔

۵۔ عن زرارہ عن ابی جعفر قال سألتہ عن قول اللہ عزوجل ﴿حنفاء للہ غیر مشرکین بہ﴾ قال الحنیفیۃ من الفطرۃ التی فطر اللہ الناس علیھا، لا تبدیل لخلق اللہ قال فطرھم علی المعرفۃ بہ، قال زرارۃ: وسألتہ عن قول اللہ عزوجل ﴿واذ اخذ ربک من بنی آدم﴾ ... وقال قال رسول اللہ کل مولود یولد علی الفطرۃ، یعنی المعرفۃ بان اللہ عزوجل خالقہ کذلک قولہ ﴿ولئن سألتھم من خلق السموات والارض لیقولن اللہ﴾

زرارہ نے امام محمد باقرؑ سے روایت کی ہے، وہ کہتے ہیں میں نے امام باقرؑ سے ﴿حنفاء للہ غیر مشرکین بہ﴾ آیت کے بارے میں پوچھا تو فرمایا: اسلام اسی فطرت پر ہے جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اس کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں ہے (معصومؑ) نے فرمایا معرفت خدا پر لوگوں کو پیدا کیا۔ اور فرمایا رسول خداؐ کا ارشاد ہے ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے یعنی اس معرفت پر کہ اس کا خالق خدا ہے۔ اسی طرح خدا کا قول ہے اگر تم ان سے پوچھو گے کہ آسمان وزمین کو کس نے

پیدا کیا؟ تو وہ (فوراً) کہہ دیں گے خدا نے پیدا کیا ہے

اصول کافی، ج ۲، ص ۱۲ و ۱۳، کتاب ایمان و کفر، باب فطرت خلق بر توحید، حدیث ۴۔

۶۔ وقال ﷺ: «کل مولود یولد علی الفطرة حتی یکون ابواہ یہوّدانه وینصّرانه ویمجّسانه»۔

ہر بچہ فطرت توحید پر پیدا ہوتا ہے، پس اس کے والدین اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

عوالی اللئالی، ج ۱، ص ۳۵، فصل ۴، حدیث ۱۸۔

۷۔ حدیث ۱، حاشیہ ۵۔

۸۔ رشحات البحار، ص ۲۸ - ۳۱، کتاب انسان و فطرت۔

۹۔ یہ حافظ کا شعر ہے پورا شعر اس طرح ہے

شہریست پر کرشمہ و خوباں ز شش جہت   چیزیم نیست ورنہ خریدار ہر ششم

۱۰۔ یہ سعدی کا شعر ہے۔ پورا شعر اس طرح ہے

ہرگز وجود حاضر و غائب شنیدہ ای   من در میان جمع و دلم جای دیگر است

۱۱۔ میں نے اپنا چہرہ اس کی طرف کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے سورۂ انعام، آیت ۸۰

۱۲۔ خدا آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ سورۂ نور، آیت/۳۵۔

۱۳۔ اگر تم کو رسی میں باندھ کر زمین کی گہرائی میں بھیج دیا جائے تو تم خدا ہی تک پہنچو گے۔

علم الیقین، ج ۱، ص ۵۴، مقصد ۱، باب ۴، فصل ۵۔

۱۴۔ کیا آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے خدا کے بارے میں کوئی شک ہے؟ سورۂ ابراہیمؑ، آیت/۱۰۔

۱۵۔ اس سے مراد مرحوم شاہ آبادی ہیں۔ حدیث ۱، حاشیہ ۱۵ کی طرف رجوع کیجئے۔

بارھویں حدیث

بِسَنَدي المتّصل إلى مُحمّد بن يعقوب (رضوان الله عليه)، عن عليّ بن إبراهيم، عن أبيه، عن النّوفلي، عن السّكوني، عن أبي عبدالله عليه السلام قال:

كانَ أميرُ المُؤمِنينَ عليه السلام يَقُولُ:

﴿نَبِّهْ بالتّفكُّرِ قلبَك وَجافِ عنِ اللّيلِ جنبَك واتّقِ اللهَ ربَّك﴾.

ترجمہ: امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ حضرت علیؑ فرمایا کرتے تھے ''اپنے دل کو تفکر کے ذریعے آگاہ کرو، اپنے پہلو کو رات (بستر) سے دور کرو اور اپنے خدا سے ڈرو''۔

شرح: ''کان یقول'' کا مفہوم ''قال'' اور ''یقول'' کے علاوہ ہے۔ کان یقول سے استمرار و دوام سمجھ میں آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے حضرت علیؑ مکرر یہ فرمایا کرتے تھے۔

''تنبیہ'' کا مطلب غفلت سے آگاہ کرنا اور خواب سے بیدار کرنا ہے۔ اس حدیث میں دونوں معنی مناسب ہیں۔ اس لئے کہ دل تفکر سے پہلے غفلت سے بھرے اور خواب میں ہوتے ہیں، لیکن تفکر کے ذریعے غفلت سے ہوشیار اور خواب سے بیدار ہو جاتے ہیں۔ در ملک بدن کے خواب و بیداری اور غفلت و ہوشیاری اور ملکوت نفس کے حالات مختلف ہوتے ہیں۔ بسا اوقات چشم ظاہر بیدار اور ملک ظاہر کا پہلو ہوشیار ہوتا ہے اور چشم بصیرت و باطن، خواب گراں میں اور ملکوت نفس کا پہلو غفلت و بے ہوشی میں ہوتا ہے۔

''تفکر'' کے معنی فکر کو کام میں لانا ہے۔ یعنی امور معلومہ کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ مر مجہول، معلوم ہو جائے اور یہ تفکر عام طور پر مقامات سالکین کو بھی شامل ہے۔ اس لئے کہ خواجہ انصاریؒ نے اس

کی تعریف اس طرح کی ہے ﴿اِعْلَمْ اَنَّ الفِکْرَ تَلَمُّسُ البَصِیرَةِ لِاسْتِدْرَاکِ البُغْیَةِ﴾ ۳ (جان لو کہ تفکر کا مطلب ہے: بصیرت قلب اور چشم ملکوت کا اپنے مطلوب کے ادراک کیلئے جستجو کرنا) اور (سب ہی کو) معلوم ہے کہ قلوب کا مقصود معارف ہوا کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے اس حدیث میں بھی ''تفکر'' سے مراد ایک خاص معنی ہے جو دنوں اور ان کی زندگی سے متعلق ہے۔

''قلب'' کے مفاہیم اور اصطلاحات بے شمار ہیں۔ (مثلاً) اطباء اور عام لوگوں کے نزدیک اس کا اطلاق گوشت کے اس ٹکڑے پر ہوتا ہے جو صنوبری شکل کا ہوتا ہے اور جس کے سکڑنے اور کھلنے سے رگوں میں خون دوڑتا ہے اور ان کے اندر روح حیوانی ایک بخار لطیف پیدا کرتا ہے۔ حکما کے نزدیک نفس کے بعض مقامات کو دل کہا جاتا ہے۔ اصحاب عرفان وطریقت اس کیلئے مراتب ومقامات کے قائل ہیں۔ ان کی اصطلاحات میں غور کرنا (ہمارے) مقصد سے خارج ہے۔ قرآن واحادیث میں مختلف مقامات پر ان متداول معانی میں استعمال ہوا ہے جو عوام وخواص کے درمیان رائج ہیں۔ چنانچہ ﴿اِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ﴾ ۴ میں اطباء والے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ﴿لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا﴾ ۵ میں حکما کے یہاں جو معنی مشہور ہیں اس میں استعمال ہوا ہے۔ ﴿اِنَّ فِي ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ﴾ ۶ میں اصطلاح عرفا کے لحاظ سے استعمال ہوا ہے اور اس حدیث شریف میں تفکر کی مناسبت سے وہ معنی مقصود ہے جو حکما کے درمیان متداول ہیں، لیکن قلب، عرفاء کی اصطلاح کے اعتبار سے تفکر کے معنی میں مناسبت نہیں رکھتا خصوصاً بعض مراتب کے اعتبار سے تو بالکل ہی نامناسب ہے، جیسا کہ اہل اصطلاح جانتے ہیں۔

قول معصومؑ ﴿جَافِ عَنِ اللَّيْلِ جَنْبَكَ﴾ جفا کے معنی بُعد (دور ہوا) کے ہیں اور ''وَجَافَاهُ عَنْهُ فَتَجَافَى جَنْبُهُ عَنِ الْفِرَاشِ'' کے معنی اچٹ جانے کے ہیں۔ جیسا کہ صحاح (جوہری) میں ہے اور ''مجافاة'' کے معنی رات کی طرف نسبت دینے کے ہیں اور اس حدیث میں ''مجاز در ذات'' ہے یا پھر رات کو ''ذعـــــہ'' ''بستر قرار دیا ہے یا پھر ''حقیقت در کلمہ اور ذات'' ہے اور فرق صرف ارادہ جدی واستعمالی میں ہے۔ جیسا کہ (خود) مطلق مجازات میں (علما نے) احتمال دیا ہے۔ شیخ فقیہ واصولی وادیب آقا شیخ محمد رضا اصفہانیؒ نے ''جنیۃ الحال'' میں اس بارے میں کافی تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔ ۸

خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ رات کو عبادت کیلئے بستر سے اٹھنے کیلئے کنایہ ہے۔ اس کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ

اور اس کے مراتب کا بیان ہوگا اور ہم ان شاء اللہ چند فصلوں کے ضمن میں اس حدیث شریف کے مناسبات کا ذکر کریں گے۔

پہلی فصل

فضیلت تفکر کا بیان

یہ جان لو کہ تفکر کی بہت فضیلت ہے۔ تفکر ابواب معارف کی کنجی ہے اور کمالات وعلوم کے خزانوں کی کلید ہے۔ سلوک انسانیت کی یقینی اور لازمی تمہید ہے۔ قرآن مجید اور احادیث شریف میں اس کی بھرپور تمجید وتعریف کی گئی ہے۔ غور وفکر نہ کرنے والوں کو جھنجوڑا گیا ہے اور ان پر طعنہ زنی کی گئی ہے۔ کافی شریف میں اسناد کے ساتھ حضرت امام جعفر صادقؑ کا قول منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا ﴿افضلُ العبادةِ اِدمانُ التفكّرِ في اللهِ وفي قُدرتهِ﴾۹ اس کے بعد اس حدیث کا ذکر کیا جائے گا۔ ایک دوسری حدیث میں ایک ساعت کے تفکر کو ایک شب کی عبادت سے بہتر کہا گیا ہے۔۱۰ حدیث نبویؐ میں ہے کہ ایک ساعت کا تفکر ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے۔۱۱ اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ایک گھنٹے کا تفکر ساٹھ سالوں کی عبادت سے بہتر ہے۔۱۲ ایک اور میں ۷۰ سال کی عبادت سے بہتر کہا گیا ہے۔۱۳ اور بعض علمائے فقہ وحدیث نے ہزار سال کی حدیث بھی نقل کی ہے۔ بہر صورت تفکر کے مراتب ودرجات ہیں اور ہر مرتبے کیلئے نتیجہ یا نتائج ہیں، ہم ان میں سے بعض کا ذکر کریں گے۔

اول خدا کے اسماء وصفات وکمالات کے بارے میں غور وفکر؟ اور اس کے نتیجہ حق تعالیٰ کے وجود اور اس کی تجلیات کا علم ہے جس سے اعیان ومظاہر کا علم حاصل ہوتا ہے جو فکر کا سب سے افضل اور علوم کا سب سے اعلیٰ مرتبہ اور برہان کا سب سے مضبوط درجہ ہے، کیونکہ ذات علت اور سبب مطلق میں غور کرنے سے خدا کا علم اور مسببات ومعلولات کا علم حاصل ہوتا ہے اور یہ قلوب صدیقین کا نقشۂ تجلیات ہے۔ اس لئے اس کو ”برہان صدیقین“ کہا جاتا ہے، کیونکہ صدیقین مشاہدہ ذات سے اسماء وصفات کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اسماء کے آئینے میں اعیان ومظاہر کا مشاہدہ کرتے ہیں اور برہان کی اس قسم کو ”برہان صدیقین“ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی صدیق اپنے مشاہدات کو بصورت برہان لانا چاہے اور اپنے ذوق وشہود میں جو پایا ہے اس کو الفاظ کے قالب میں ڈھالنا چاہے تو اسی طرح ہوگا یہ مطلب (ہرگز) نہیں ہے کہ جو بھی اس برہان سے ذات اور اس کی تجلیات کا علم حاصل کرلے وہ صدیقین میں سے ہے یا یہ کہ صدیقین کے معارف براہین کی قسم کے

ہیں۔ (ہاں اگر براہین کو فرض بھی کیا جائے تو وہ) مخصوص قسم کے براہین ہیں۔ افسوس ان کے علوم از قسم تفکر نہیں ہیں اور نہ ہی ان کے مشاہدات کو برہان و مقدمات برہان سے کوئی مشابہت ہے۔ جب تک قلب برہان کے حجاب میں رہتا ہے اور اس کا قدم قدم تفکر ہوتا ہے (اس وقت تک تو وہ) صدیقین کے اول درجہ تک نہیں پہنچا ہوتا مگر جب وہ علم و برہان کے دبیز پردے سے نکل آتا ہے اور تفکر سے کوئی سروکار نہیں رکھتا تو کسی برہان کے واسطے کے بغیر بلکہ کسی مخلوق کے واسطہ کے بغیر انجام کار اور انتہائے سلوک میں جمیل مطلق کے جمال کا مشاہدہ کرنے لگے گا اور دائمی و سرمدی لذت تک پہنچ جائے گا۔ دنیا و مافیہا سے قطع تعلق کرے گا اور قبہ کبریائی کے نیچے فنائے کلی کے ساتھ باقی رہ جائے گا اس کا کوئی نام ونشان باقی نہیں رہے گا اور وہ مجہول مطلق ہو جائے گا۔ مگر یہ کہ حق کا لطف و کرم اس کے شامل حال ہو جائے اور (خدا) اس کو اس کی اپنی مملکت اور مملکت وجود میں وجود ذات اور وسعت کی مقدار کے اعتبار سے ثابت کر دے اور اس رجوع میں جلال و جمال کے سبحات اس کیلئے ظاہر ہو جائیں، اور وہ آئینہ ذات میں اسماء و صفات کا مشاہدہ کرنے لگے جس کے بعد اپنی ثابت (شکل) اور اپنے سایہ حمایت میں پائی جانے والی چیزوں کا مشاہدہ بھی کیا جا سکتا ہے، نیز مظاہر کی کیفیت سلوک اور ظاہر کی طرف رجوع اس کے دل پر کشف ہونے لگے، تب وہ لباس نبوت سے نوازا جاتا ہے اور اسی جگہ انبیاء و رسول کے درجات کا تفاوت ظاہر ہو جاتا ہے اور دائرہ رسالت کی وسعت و تنگی اور (پیغمبری پر) مبعوث کرنے والی ذات (خدا) کی حقیقت اور جن کی طرف (پیغمبر) مبعوث ہوتے ہیں (مخلوق) ان کی حقیقت ان کیلئے اس مقام پر منکشف ہو جاتی ہے۔

اس مقام پر مزید تفصیل اس کتاب کے مناسب نہیں ہے اس لئے اس کے بعد برہان صدیقین سے بھی صرف نظر کرتا ہوں، اس لئے کہ اس کی کچھ تمہیدات ہیں جن کی تشریح طوالت کے باعث بنے گی۔

تتمیم

خدا کے بارے میں جائز و ناجائز تفکر

یہ (بات) سمجھ لیجئے کہ ہم نے جو کہا ہے کہ ذات، اسماء و صفات کے بارے میں تفکر کرنا چاہیے، ہو سکتا ہے جاہل گمان کرے کہ حسب روایت ذات میں (تو) تفکر ممنوع ہے! ''دراصل'' وہ یہ نہیں جانتا کہ جو تفکر ممنوع ہے وہ کنہ ذات اور اس کی کیفیت کے بارے میں ہے جیسا کہ روایات واحادیث شریفہ سے بھی یہی

معلوم ہوتا ہے، ور کبھی تو (ائمہ نے) نااہل کو بھی بعض معارف میں غور وفکر سے روک دیا ہے، کیونکہ اس کی تمہیدات بہت گہری ہوتی ہیں۔ چنانچہ حکما بھی ان دونوں مقامات کے بارے میں :ی رائے کے حق میں ہیں۔ کنہ ذات کے بارے میں استحالہ ن کی کتابوں میں دلائل وبراہین سے ثابت ہے۔ ۱۲ اور اس میں غور وفکر کی ممانعت سب ہی کے نزدیک مسلّم ہے، لیکن ان علوم کی طرف رغبت کی شرائط اور نااہل کو ان کی تعلیم سے ممانعت بھی ان کی کتابوں میں مذکور ہے اور اس کی وصیت ان کی کتابوں کے اوائل یا اواخر میں تحریر ہے۔ جیسا کہ اسلام کے دو عظیم فلسفی اور دو امام فن جناب شیخ ابوعلی سینا ۱۵ اور صدر المتألہین ۱۶ نے اشارات ۱۷ کے آخر اور اسفار ۱۸ کے شروع میں اس سلسلے میں جو وصیت بلیغ فرمائی ہے ان کی طرف رجوع کریں۔

لیکن اثبات وجود باری و(اثبات) توحید وتقدیس وتنزیہ باری تعالیٰ کیلئے ذات الٰہی میں غور وفکر کرنا (بلکہ) بعثت انبیاء کا مقصد اور عرفا کی امیدوں کا مرکز ہے۔ قرآن مجید اور احادیث بھری پڑی ہیں کہ ذات وکمالات واسماء وصفات ذات مقدس خدا کا علم حاصل کیا جائے اور ملحدین اسماء کی تو خدا بھی مذمت کرتا ہے۔ حکما کی کتابیں ہوں یا متکلمین کی کسی نے بھی اثبات ذات واسماء وصفات کے بارے میں غور کرنے کیلئے اس قدر تاکید نہیں کی جتنی قرآن مجید اور حدیثوں کی معتبر کتابوں، مثلاً ''اصول کافی، توحید شیخ صدوق'' وغیرہ نے کی ہے۔ انبیاء کے منقولات اور حکما کی کتابوں میں صرف اصطلاحات اور اجمال وتفصیل کا فرق ہے۔ جیسے کہ فقہا اور ان احادیث کے اندر جو مسائل فقہ کو بیان کرتی ہیں صرف اصطلاحات اور اجمال وتفصیل کا فرق ہے اصل معنی میں کوئی فرق نہیں ہے۔

لیکن مصیبت یہ ہے کہ گزشتہ چند صدیوں کے دوران اہل علم کے لباس میں کچھ جاہل پیدا ہوگئے ہیں جو تھوڑا بہت کچھ دیکھتے ہیں منہ پر رکھتے اور کتاب وسنت سے جاہل ہیں، صرف اپنے بازار کو چمکانے کیلئے اپنے جہالت کی بنا پر مبدا ومعاد کے علم کو باطل قرار دیتے ہیں، معارف (الٰہی) میں غور وفکر جو انبیاء واولیا کا انتہائی مقصد ہے اور کتاب وسنت اس سے بھری پڑی ہیں، حرام سمجھتے ہیں، اور وہ اہل معرفت پر ہر قسم کی تہمت اور ان کو ناسزا کہنے میں کوئی باک نہیں سمجھتے اور بندگان الٰہی کے دلوں کو مبدا ومعاد سے موڑ کر مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ پیدا کرتے ہیں اور اگر ان لوگوں سے پوچھا جائے کہ یہ سب لوگوں کو کافر قرار دینے اور فاسق قرار دینے سے کیا فائدہ! تو وہ لوگ ﴿لا تتفكّروا في ذات الله﴾ ۱۹ ''خدا کی ذات میں غور وفکر مت کرو'' والی حدیث کا سہارا لیتے ہیں، یہ بے چارے حد وجہت سے غلطی وجہالت میں مبتلا ہیں

ایک یہ ہے کہ ان کو گمان ہے کہ حکما کنہ ذات میں غور وفکر کرتے ہیں! حالانکہ وہ لوگ کنہ ذات میں تفکر کو محال (وناجائز) جانتے ہیں اور یہ چیز حکما کے یہاں دلیل وبرہان سے ثابت ہے۔

دوسری یہ کہ حدیث کا مطلب نہ سمجھ کر یہ گمان کر لیتے ہیں کہ ذات مقدس کے بارے میں مطلقاً کوئی گفتگو وغور وفکر نہ کی جائے! میں اب چند روایتوں کو ذکر کر کے، نظر قاصر کے مطابق ان کا مجموعی موازنہ کروں گا پھر انصاف سے فیصلہ کروں گا۔ اگر چہ یہ بات شرح حدیث اور ہمارے مقصد سے قدرے خارج ہے، لیکن ابطال باطل اور رفع شبہہ کیلئے یہ ضروری ہے۔

الكافي باسناده عن أبي بصير قال أبو جعفر عليه السلام ﴿تَكَلَّمُوا في خلق الله ولا تتكلّموا في الله، فإنّ الكلام في الله لا يزداد صاحبه إلّا تحيّراً﴾ ۲۰ کافی میں ابوبصیر کے اسناد سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ امام محمد باقرؑ نے فرمایا: ”مخلوقات خدا کے بارے میں بات کرو، لیکن خدا کے بارے میں بات نہ کرو، کیونکہ خدا کے بارے میں کلام کرنے والے کو حیرانی کے علاوہ کچھ نہیں ملتا“۔

اس حدیث کی ورت خود ہی اس بات پر ہوتی ہے کہ تکلم سے مراد کنہ ذات اور اس کی کیفیت کے بارے میں گفتگو کرنا ہے، کیونکہ جو علت بیان کی گئی ہے اسی سے پتہ چل جاتا ہے۔ ورنہ اثبات ذات وکمالات و توحید و تنزیہ سے بحث کرنا تحیر کا سبب نہیں ہوا کرتا اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ممانعت ان لوگوں کیلئے ہو جن کیلئے ان مقامات میں بحث کرنا سبب تحیر ہوتا ہو۔ مرحوم علامہ مجلسیؒ ۲۱ نے بھی ان دونوں امکانات کا ذکر ہماری ترتیب و ستدر س کے بغیر کیا ہے اور پہلے والے امکان کو تقویت بخشی ہے۔ ۲۲

وفي رواية أخرى عن حريز ﴿تكلّموا في كلّ شيء ولا تتكلّموا في ذات الله﴾ ۲۳ دوسری روایت جو حریز سے مروی ہے اس میں ہے ”ہر چیز کے بارے میں بات کرو (مگر) ذات خدا کے بارے میں بات نہ کرو“ اسی مضمون کی اور اسی سے ملتی جلتی دیگر روایات بھی آئی ہیں، لیکن سب کا ذکر کرنا ضروری نہیں ہے۔

وفي الكافي عن أبي جعفر (محمد الباقر عليه السلام) قال ﴿إيّاكم والتفكّر في الله ولكن إذا أردتم أن تنظروا الى عظمته فانظروا الى عظيم خلقه﴾ ۲۴ ”خبردار! خدا کے بارے میں غور وفکر نہ کرنا، لیکن اگر تم اس کی عظمت کو دیکھنا چاہو تو اس کی عظیم مخلوق کی طرف دیکھو (اور غور وفکر کرو)“۔ اس حدیث سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں فکر سے مراد کنہ ذات خدا کے بارے میں غور وفکر ہے، کیونکہ حدیث

کے ذیل میں ہے "اگر تم عظمت حق کو دیکھنا چاہو تو عظمت مخلوق سے عظمت خالق پر استدلال کرو" اور یہ بطور مثال ہے اور یہ ان لوگوں کیلئے ہے جن کی معرفت کا طریقہ اسی یہی ہے کہ مخلوق میں غور وفکر کرتے ہیں۔

یہ اور اسی قسم کی دوسری حدیثیں جو اسی مطلب کے قریب ہیں اور تکلم وفکر کی ممانعت پر دلالت کرتی ہیں ان کے بارے میں معلوم ہو گیا کہ یہ بذات خود ہمارے مقصد اور مدعا پر دلالت نہیں کرتیں کافی کی ایک حدیث جو باب تفکر کے سلسلے میں آئی ہے وہ ہمارے مقصد کو اچھی طرح واضح کرتی ہے

عن أبي عبدالله (جعفر الصادق) علیہ السلام قال ﴿أفضلُ العبادة إدمانُ التفكرِ في الله وفي قدرته﴾ ۲۵ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا "سب سے افضل عبادت خدا وراس کی قدرت میں غور وفکر کرتے رہنا ہے"۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ اور اس کی ذات اور قدرت کے اثبات کیلئے نیز اس کے دیگر صفات و اسماء کے بارے میں غور وفکر سے نہ صرف منع نہیں کیا گیا ہے، بلکہ یہ تمام عبادتوں میں افضل ہے۔

سُئل علي بن الحسين (علیهما السلام) عن التوحيد، فقال ﴿إنّ الله عزّوجلّ علم أنّه يكونُ في آخر الزمان أقوامٌ متعمّقون، فأنزل الله تعالى ﴿قُلْ هُوَ اللهُ أحد﴾، و الآيات من سورة الحديد الى قوله ﴿وهُو عليمٌ بذات الصُّدُور﴾ فمن رام وراء ذلك فقد هلك﴾ ۲۶ کافی شریف میں نقل ہوا ہے کہ حضرت امام زین العابدینؑ سے توحید کے بارے میں پوچھا گیا تو حضرتؑ نے فرمایا "خداوند عالم جانتا تھا کہ آخری زمانے میں گہری نظر رکھنے والے لوگ ہوں گے اس لئے اس نے ﴿قُلْ هُوَ اللهُ أحد﴾ اور سورۂ حدید کی وہ آیات جو ﴿وهُوَ عليمٌ بذات الصُّدُور﴾ کی عبارت پر ختم ہوتی ہیں نازل کیں، اب جو اس کے ماوراء کا خواہشمند ہے وہ ہلاک ہوا"۔ اس حدیث سے پتہ چلا کہ یہ آیات شریفہ جو توحید وتنزیہ حق و بحث اور مخلوقات کے (خدا کی طرف) رجوع کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں وہ گہری نظر رکھنے والوں اور سنجیدگی سے سوچنے والوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ کیا اس کے بعد بھی کہا جا سکتا ہے کہ خدا کے بارے میں غور وفکر حرام ہے؟ کیا کوئی عارف یا حکیم ان معارف سے زیادہ جو سورۂ حدید کی ابتدا میں بیان کئے گئے ہیں جا سکتا ہے؟ ان کی معرفت کی انتہا یہ ہے کہ ﴿سبّح لله ما في السّموات والأرض﴾ ۲۷ تک پہنچ سکیں۔ کیا آیت ﴿هُوَ الأوّلُ والآخِرُ والظّاهِرُ والباطِنُ وهُوَ بكلِّ شيءٍ عليم﴾ ۲۸ سے بہتر عبارت میں خدا کی صفت وراس کی ذات کے جلووں کو بیان کیا

جا سکتا ہے؟

ذات مقدس کی قسم! اگر اس آیت کے علاوہ حقانیت قرآن پر کوئی اور آیت نہ بھی ہوتی تب بھی اہل دل کیلئے یہی کافی تھی۔ آپ ذرا قرآن مجید، رسول اکرمؐ اور ان کے معصوم جانشینوں (سلام اللہ علیہم) کے خطبوں اور آثار و اخبار کو ملاحظہ فرمائیے۔ جس قسم کے معارف کا تصور ہو سکتا ہے، ہر موضوع پر ان کے ایسے بیانات موجود ہیں کہ کوئی حکیم و عارف اس سے بہتر بیان نہیں کر سکتا۔ ان حضرات کے کلمات توصیف حق اور ذات و صفات مقدس خدا پر استدلالات سے بھرے ہیں اور وہ اس طرح ہیں کہ ہر گروہ اپنے فہم کے اعتبار سے ان سے استفادہ کر سکتا ہے۔

پس ان روایات کے مجموعے سے معلوم ہوا کہ ذات باری کے سلسلے میں صرف ایک تفکر ممنوع ہے یعنی کنہ ذات اور اس کی کیفیت میں تفکر کرنا۔ جیسا کہ کافی کی حدیث شریف میں ہے ﴿مَن نَظَرَ فِي اللّٰهِ كَيفَ هُوَ، هَلَكَ﴾ ۲۹ "جس نے خدا کی طرف دیکھا کہ وہ کیسا ہے، وہ ہلاک ہوا" یا پھر دونوں قسموں کی حدیثوں میں جو غور و فکر سے روکتی ہیں اور جو اجازت دیتی ہیں، اس طرح جمع کیا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں کے دل برہان سننے کی طاقت نہیں رکھتے اور اس قسم کے مباحث میں داخل ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے ان کو روکا گیا ہے اور خود روایات میں اس جمع پر دلالت موجود ہے۔ لیکن جو لوگ اہل ہیں ان کیلئے ترجیح دی گئی ہے، بلکہ ان مباحث میں داخل ہونا افضل ترین عبادت ہے۔

بہر حال ہم اپنے مقصد سے خارج ہو گئے، لیکن اس غلط مطلب اور ناحق و غیر پسندیدہ تہمت کا ذکر کئے بغیر چارہ بھی نہیں تھا، کیونکہ یہ چیزیں موجودہ دور میں زبانوں پر آنے لگی ہیں اور شاید کسی کا دل اس سے متاثر ہو جائے۔ اگر ایک شخص بھی اس کو قبول کرے تو میرے لئے کافی ہے۔ ﴿والحمد للّٰه والیه المشتکی﴾ ۳۰

دوسری فصل

مصنوعات میں تفکر

تفکر کے درجات میں سے ایک خدا کی عمدہ صنعتوں اور ان کی مضبوطی نیز تخلیق کی باریکیوں کے بارے میں جتنا غور و فکر کرنا ہے جس قدر بشری طاقت کے بس میں ہے۔ اس کا نتیجہ صانع حکیم اور مبدأ کامل (خدا) کے بارے میں علم (کی صورت میں ظاہر) ہوتا ہے۔ یہ طریقہ صدیقین کے برہان کے برعکس ہوتا ہے،

کیونکہ وہاں پر مبدأ برہان حق تعالیٰ ہوتا ہے۔اس کے علم سے تجلیات ومظاہر وآیات (خدا) کا علم حاصل ہوتا ہے اور یہاں پر مبدأ برہان مخلوقات ہوتی ہیں، ان کے واسطہ سے مبدأ وصانع کا علم حاصل ہوتا ہے اور یہ برہان عوام کیلئے ہے، ان کا برہان صدیقین سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اس لئے ہوسکتا ہے بہت سے لوگ اس بات کا انکار کردیں کہ حق مبدأ کے بارے میں علم خود خدا کی ذات کے بارے میں علم حاصل کرنے کا سبب ہوتا اور مبدأ کے بارے میں علم سے مخلوقات کا علم حاصل ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدا کی صنعتوں کی باریکیوں اور خوبیوں کے بارے میں تفکر اور نظام تخلیق کی مضبوطی کے بارے میں سوچنا نفع بخش علوم اور اعمال قلبی کے فضائل میں سے ہے اور یہ تمام عبادتوں سے افضل ہے، کیونکہ ان کا نتیجہ اشرف نتائج ہے۔اگرچہ تمام عبادتوں کا اصلی راز اور اصلی نتیجہ معرفت کا حصول ہے لیکن رازوں کا کشف اور اس کا نتیجہ ہم کو حاصل نہیں ہوسکتا، بلکہ اس کے کچھ اہل ہیں کہ ہر عبادت ان کیلئے مشاہدہ یا مشاہدات کا بنیاد بن جاتی ہے۔بہرحال صنعت (خدا) کی باریکیوں وراسرار خلقت کی آگہی درحقیقت ابھی تک کسی کیلئے میسر نہیں ہوئی ہے۔اس کی بنیاد اتنی مضبوط اور مستحکم ہے اور اس کا نظام اتنا خوبصورت اور از روئے اسلوب اتنا مکمل ہے کہ ہر مخلوق کے بارے میں چاہے وہ کتنا ہی حقیر معلوم ہوتا ہو، اگر بشر اپنے ان تمام علمی کمالات کے ساتھ جو اس نے صدیوں میں حاصل کئے ہیں سنجیدگی سے غور کرے، تب بھی اس کے ہزار حصوں میں سے ایک حصہ پر اطلاع نہیں حاصل کرسکتا، چہ جائیکہ اس پورے خوبصورت نظام کلی کا اپنی فکر کے ذریعے جائزہ لے اور اپنے ناقص وجزئی افکار سے ان (حقائق) کی باریکیوں اور پیچیدہ رازوں کو سمجھ سکے۔میں اس وقت آپ لوگوں کی توجہ تخلیق کی بعض ان باریکیوں کی طرف موڑنا چاہتا ہوں جو نسبتاً عقلوں سے نزدیک اور محسوسات میں شمار ہوتی ہیں۔اس اجمال کی تفصیل آپ خود حاصل کریں

میرے عزیز! سورج اور زمین کے درمیان جو معین فاصلہ ہے اور زمین کی جو مخصوص حرکت ہے اپنے گرد اور سورج کے گرد، اس نسبت کو دیکھو اور اس میں غور کرو کہ ایک خاص مدار میں زمین کی گردش سے جو شب وروز اور مختلف موسم پیدا ہوتے ہیں کتنی مضبوط صنعت اور کتنی مکمل حکمت پر مشتمل ہے! اگر یہ اس ترتیب سے نہ ہوتی یعنی سورج (زمین سے) نزدیک ہوتا یا دور ہوتا تو پہلی صورت میں (شدت) حرارت سے اور دوسری صورت میں سردی کی (شدت) سے زمین کے اندر نہ معدنیات پیدا ہوتیں، ورنہ زمین پر نباتات اور پودوں کی زندگی ممکن ہوتی، اور اگر اسی نسبت سے زمین ساکن ہوتی تو نہ مختلف موسم ہوتے نہ دن

رات اور زمین کا تمام حصہ یا زیادہ حصہ قابل سکونت نہ ہوتا۔ اسی پر اکتفا نہیں کی گئی۔ اوج، یعنی زمین کی سورج سے سب سے زیادہ دوری شمال کی طرف واقع ہے تا کہ حرارت زیادہ نہ ہو جائے اور مخلوقات کو نقصان نہ پہنچے اور حضیض (زمین کی سورج سے سب سے زیادہ نزدیکی) جنوب کی طرف واقع ہے تا کہ سردی کی شدت سے زمین پر بسنے والوں کو ضرر نہ پہنچے۔ پھر اس پر بھی اکتفا نہیں کیا گیا (بلکہ) چاند (کی گردش) جو زمینی مخلوقات کی تربیت میں بہت اثر رکھتا ہے، زمین کی گردش کے مخالف رکھی گئی ہے۔ اس طرح کہ سورج جب زمین کے شمالی حصے میں ہے تو چاند جنوبی حصے میں ہوگا یا اس کے برعکس جب وہ (سورج) جنوبی حصے میں ہوگا تو یہ (چاند) زمین کے شمالی حصوں کی طرف واقع ہوگا اور یہ اس لئے ہے کہ زمین پر بسنے والے ان دونوں سے استفادہ کر سکیں اور یہ محسوس ہونے والے ضروری امور میں سے ہے۔ لیکن اس نظام کی باریکیوں اور اسرار و رموز کو خالق حقیقی کے علاوہ کوئی نہیں جان سکتا، کیونکہ خدا ہی کا علم سب پر محیط ہے۔

اتنی دور جانے کی ضرورت نہیں ہے اگر کوئی اپنی (ہی) تخلیق میں اپنے علم و طاقت کے مطابق سوچے پہلے تو خود اپنے ظاہری قوائے مدرکہ کے بارے میں غور کرے جن کو محسوسات و مدرکات کے مطابق بنایا گیا ہے تو معلوم ہوگا کہ اس کائنات کے اندر ہر قسم کے مدرکات کیلئے ان کو درک کرنے والی ایک قوت بھی بنائی گئی ہے، جس کی کیفیت و ترتیب عقل کو حیرت میں ڈالنے والی ہے اور معنوی امور کے ادراک کیلئے جو ظاہری حواس سے ان کا ادراک کرنا ممکن نہیں ہے باطنی حواس قرار دیے گئے ہیں۔ علم روح اور نفس کی روحانی قوتوں کو چھوڑ دیجئے ان پر انسان کو اطلاع ہی نہیں ہو سکتی۔ آپ جسم اور تشریح الابدان کے علم، جسم کی طبیعی ساخت اور ہر ظاہری و باطنی عضو کے خواص کو پیش نظر رکھتے ہوئے غور کیجئے، دیکھئے کتنا منظم نظام اور عجیب و غریب ترتیب ہے، حالانکہ سینکڑوں صدیوں سے علم انسانی اس نظام کے ہزار حصوں میں سے ایک حصے تک بھی رسائی حاصل نہ کر سکا اور تمام دانشور کھل کر اپنی عاجزی کا اظہار کرتے ہیں، حالانکہ یہ انسانی بدن دیگر زمینی مخلوقات کے مقابلے میں ایک ذرہ بے مقدار ہے اور زمین اپنے تمام موجودات سمیت نظام شمسی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے اور ہمارا پورا نظام شمسی دیگر شمسی نظاموں کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور تمام کلی و جزئی نظامات اتنے مرتب و منظم بنائے گئے ہیں کہ ان کے بارے کوئی ذرہ بھر اعتراض نہیں کر سکتا اور تمام انسانی عقول اس نظام کے اوقات میں سے ایک منٹ کو بھی سمجھنے سے قاصر ہے۔

(اب آپ سوچئے) کیا اس غور و فکر کے بعد آپ کی عقل اس بات پر یقین نہیں کرتی کہ "اس کائنات

کے اندر یک ایسا قادر، حکیم و عالم موجود ہے جس کا کوئی مثل و نظیر نہیں ہے اور اسی نے اس حکمت و نظام و ترتیب محکم کے ساتھ موجودات کو پیدا کیا" ﴿افی اللہ شکٌ فاطرِ السّموات والأرض﴾ ۳۱۲ یہ تمام منظم خلقت جس کے سمجھنے سے انسانی عقلیں عاجز ہیں، بے ربط اور خود بخود پیدا نہیں ہوئی ہیں؟ اندھی ہو جائیں وہ دل کی آنکھیں جو حق کو نہ دیکھ سکیں اور جمیل کے جمال کو ان موجودات میں مشاہدہ نہ کر سکیں۔ فنا ہو جائے وہ شخص جو ان تمام آثار و نشانیوں کو دیکھنے کے بعد بھی شک و تردید میں مبتلا رہے۔ لیکن بے چارہ انسان کیا کرے جو جہالت میں گرفتار ہے' اگر آپ اپنی تسبیح لوگوں کو دکھا کر کہیں کہ یہ خود بخود یک لڑی میں پروئی گئی ہے تو لوگ آپ کی عقل پر خندہ زن ہوں گے اسی طرح جیبی گھڑی کو نکال کر یہی دعویٰ اس کے بارے میں کیجئے (تو بتائیے) کیا لوگ آپ کو عاقلوں کی فہرست سے خارج کریں گے کہ نہیں؟ اور آپ کو پاگل کہیں گے کہ نہیں؟ جس نے اس سادہ جزئی نظام کو علل و اسباب کے سلسلے سے خارج جانا ہے لوگوں نے اسے مجنون مانا اور عقلا کے زمرے سے محروم جانا ہے۔ بس اس شخص کے ساتھ کیا (برتاؤ) کرنا چاہئے جو اس نظام کائنات کو نہیں، بلکہ اس انسان اور اس کے روح و بدن کے نظام کے بارے میں یہ دعوے کرتا ہے کہ یہ تو خود بخود پیدا ہو گیا ہے" کیا اس کے بعد بھی اس کو عاقلوں کے زمرے میں شمار کیا جا سکتا ہے؟ کون بے وقوف اس سے زیادہ احمق ہے؟ ﴿فتل الانسانُ ما أکفره﴾ ۳۲ مردہ باد وہ انسان جو علم سے رندہ نہ ہو اور اپنے بحر ضلالت میں غوطہ زن رہے۔

تیسری فصل احوال نفس میں تفکر

تفکر کا ایک درجہ احوال نفس میں غور و فکر کرنا ہے۔ جس سے بے شمار نتیجے اور بہت سے معارف حاصل ہوتے ہیں۔ اس وقت ہماری نظر دو نتیجوں کی طرف ہے

پہلا: یوم معاد (قیامت) کا علم۔

دوسرا: بعثت رسل و انزال کتب، یعنی نبوت عامہ اور شرائع حقہ۔

نفس کی ایک حالت "تجرد" ہے۔ بڑے بڑے حکما نے جتنی توجہ نفس کے مجرد ہونے پر کی ہے، بہت کم کسی حکمت کے مسئلے پر اتنی اہمیت دی ہے اور نہ اس طرح کسی مسئلے کو براہین سے واضح کیا ہے۔ میں اس وقت اس کو تفصیلی طور پر ثابت کرنے کے درپے نہیں ہوں، (صرف) بعض ان دلیلوں پر اکتفا کروں گا جن

کے مبادی بہت زیادہ مشکل نہ ہوں اور اس کے بعد اپنے مقصد کا ذکر کروں گا۔

تو آیئے عرض کروں اطباء اور علم اعضاء کی معرفت رکھنے والے دانشوروں کا اتفاق ہے اور تجربہ (بھی شاہد) ہے کہ تمام اعضائے بدن مغز سے لے کر جو ادراک کا مرکز اور نفس کی قوتوں کے ظہور کی جگہ ہے جسم کے آخری گندے اعضا (اور صلب کی ہڈی تک) ۳۰ یا ۳۵ سال کے بعد سے کمزور ہونے لگتے ہیں اور زوال وضعف کے افق سے نزدیک ہونے لگتے ہیں۔ خود ہمارا تجربہ ہے کہ پورے بدن میں ضعف وسستی کا غلبہ ہو جاتا ہے، لیکن اسی وقت سے یعنی ۳۰، ۴۰ سال کے بعد سے روحانی قوتیں اور عقلی ادراک کامل ہونے کے ساتھ رشد اور پختگی حاصل کرنے لگتا ہے! لہذا اس سے ثابت ہوا کہ عقل کے قوائے ادراکیہ جسمانی نہیں ہیں (بلکہ مجرد ہیں) اس لئے کہ اگر یہ قوی جسمانی ہوتے تو دیگر جسمانی اعضا کی طرح یہ بھی کمزور ہونے لگتے۔ خیال نہ کرنا چاہئے کہ بکثرت فکری قوتوں کے استعمال کرنے اور عقلی قوتوں کے تجربات کی وجہ سے عقلی قوتیں قوی ہو جاتی ہیں، کیونکہ تمام جسمانی قوتیں کثرت استعمال اور زیادہ سرگرم ہونے کی وجہ سے کمزور وضعیف ہو جاتی ہیں، نہ کہ قوی وطاقتور۔ یہ خود دلیل ہے کہ عقلی قوتیں نہ جسم ہیں اور نہ جسمانی ہیں اور یہ اعتراض کرنا کہ بڑھاپے میں فکری قوتیں بھی ناقص ہو جاتی ہیں غلط ہے۔ اس لئے کہ پہلی بات تو یہی ہے کہ کوئی بھی جسمانی قوت بڑھاپے تک رشد ونمو حاصل نہیں کرتی کہ ہم یہ کہہ سکیں جسم کا فلاں حصہ ادراکات عقلیہ کا محل ہے اور بڑھاپے تک ترقی حاصل کر رہا ہے، لیکن اب چونکہ وہ حصہ کمزور ہو گیا اس لئے قوت فکر بھی کمزور ہو گئی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ بڑھاپے میں فکر بھی کمزور ہو جائے گی جو جسم میں حلول کرنے والی قوتوں میں سے ہے یہ وہ جسمانی قوتوں کی محتاج ہے، لیکن خالص ادراکات اور ملکات فاضلہ یا خبیثہ بھی اس وقت پہلے سے قوی ہو جاتے ہیں، اگرچہ ان کا اظہار یا ظہور کم ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے دعوی کو ثابت کرنے کیلئے ۴۰، ۵۰ سال کی وہی قوت ادراک ہی کافی ہے۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ نفس جب ملک بدن سے اپنا بوریا بستر باندھنے لگتا ہے اور اس کی قوتیں اس کے باطن ذات کی طرف رجوع کرتی ہیں تو تمام وہ قوتیں جو عالم جسم وجسمانی سے نزدیک ہیں وہ تھکن اور سستی کی طرف مائل ہو جاتی ہیں اور جو دور ہیں وہ دیر میں کمزور ہوتی ہیں، اس کے برخلاف عالم ملکوت وتجرد کی قوتیں قوی تر اور مضبوط تر ہو جاتی ہیں اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نفس نہ جسم ہے اور نہ جسمانی۔

نیز، نفس کے افعال، آثار اور خواص مطلق اجسام کے افعال و آثار و خواص کے برخلاف ہوتے ہیں اور یہ اس امر کی دلیل ہے کہ نفس جسم نہیں ہے۔ مثلاً ہم کو معلوم ہے کہ یک جسم ایک صورت سے، زیادہ قبول نہیں کرتا، اگر دوسری صورت قبول کرنا چاہے تو پہلی صورت کے ختم ہونے کے بعد ہی ممکن ہے۔ مثلاً اگر ایک کاغذ کے اوپر ایک تصویر بنی ہے تو جس جگہ تصویر بنی ہے بالکل اسی جگہ دوسری تصویر نہیں بن سکتی جب تک پہلی تصویر مٹا نہ دی جائے اور یہ حکم تمام اجسام میں عقلی طور سے جاری ہے لیکن نفس کے اندر ایک وقت میں متعدد و متضاد صورتیں منقش ہو سکتی ہیں بغیر پہلی صورت کے زائل ہوئے۔

نیز، ہر جسم میں متناہی و محدود صورتوں کو نقش کیا جا سکتا ہے، لیکن نفس کے اندر غیر متناہی و غیر محدود صورتیں نقش ہو سکتی ہیں اس اعتبار سے نفس غیر متناہی امور پر حکم کر سکتا ہے۔

نیز، جسم کی صورت زائل ہونے کے بعد جب تک اس صورت کیلئے از سر نو سبب پیدا نہ ہو دوبارہ وہ صورت پیدا نہیں ہوگی، لیکن نفس سے جو صورتیں غائب ہو جاتی ہیں وہ کسی بیرونی سبب کے بغیر پیش آتی ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ نفس اپنے خواص و آثار و افعال میں تمام اجسام کے برخلاف ہے، لہذا نفس مجرد ہے اور جسم و جسمانیات کے قسم سے نہیں ہے اور مجردات فاسد نہیں ہوتے جیسا کہ اپنی جگہ پر براہین سے ثابت ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب تک مادۂ قابلہ نہ ہو اس میں فساد نہیں ہوتا اور مجرد میں مادۂ قابلہ ہوتا ہی نہیں، کیونکہ مادۂ قابلہ جسم کے لوازم سے ہے، پس مجرد فاسد نہیں ہو سکتا۔

پس اسی سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بدن کے خراب ہو جانے اور نفس کے بدن سے جدا ہو جانے کے بعد بھی نفس خراب نہیں ہوتا، بلکہ دوسرے عالم میں باقی رہتا ہے اس کیلئے فنا نہیں ہے۔ نفس و روح کیلئے قیامت سے پہلے یہ معاد روحانی ہے جو ان کیلئے اس وقت حاصل رہتا ہے جب تک ارادۂ الٰہی ایک بار پھر ان کے جسموں سے تعلق پیدا نہ کرے۔ ہم اس وقت ان لوگوں کی رد کر رہے ہیں جو مطلق معاد کے منکر ہیں اسی لئے ہم نے مطلق معاد کو ثابت کیا ہے اور سابقہ بیانات سے یہ بات واضح ہو گئی۔

یہ جان لینا چاہئے کہ نفوس کیلئے بھی صحت و بیماری، صلاح و فساد اور سعادت و شقاوت ہے، لیکن ان کے راستوں کا جان لینا اور ان کے مفاسد و مصالح کی باریکیوں کو سمجھ لینا خدا کے علاوہ کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ ضروری طور پر ایسے نظام میں جو سب سے مکمل اور مستحسن نظام ہے، نیز اس سے پہلے معلوم

ہو چکا ہے کہ اس کا منتظم علیم علی الاطلاق اور تمام باتوں سے واقف ہے، سعادت وشقاوت، ہدایت (وضلالت) راہ صلاح وفساد،نفوس کے علاج کے طریقوں کا تعلیم نہ دینا یا مہمل چھوڑ دینا محال ہے، کیونکہ مہمل چھوڑ دینے کی صورت میں یا تو علم میں یا پھر قدرت میں نقص لازم آئے گا اور یا بدوجہ کے بخل وظلم لازم آئیں گے اور یہ معلوم ہے کہ خدا ان تمام باتوں سے مبرا ہے اور وہ کامل علی الاطلاق اور مطلق فیض پہنچانے والا ہے۔ سعادت وشقاوت کے راستوں کو بتانے میں سستی سے تو حکمت میں خلل عظیم اور نظام ومملکت میں خرابی اور بہت بڑی رکاوٹ پیش آئے گی، اس لئے کامل نظام کے اندر ضروری ہے کہ سعادت وشقاوت اور ہدایت کے راستوں کو بتایا جائے۔

اس بیان سے دو واضح نتیجے نکلتے ہیں

پہلا نتیجہ شریعت ہے جو نفسانی امراض کے علاج کا نسخہ ہے اور یہ خدا کے علاوہ کسی کے پاس نہیں ہے اور دوسرا یہ کہ خدا وند عالم اس کے اعلان کا پابند ہے اور معلوم ہے کہ اتنے بڑے مقصد اور باریکیوں پر مشتمل علم کامل کی تعلیم یقیناً وحی والہام کے ذریعے ہونی چاہئے، جس کے اور اک سے عقلا کے عقول عاجز ہیں اور ملک وملکوت کا رابطہ اور باطن نفس کے اندر صور ملکیہ کی تاثیر کو کوئی نہیں جانتا، یعنی اس کی تعلیم خدا کی طرف سے ہونی چاہئے اور یہ (بھی) واضح ہے کہ تمام فرد بشر اس خلعت کے قابل نہیں ہیں ورنہ اس مقام کی استعداد رکھتے ہیں اور نہ اس فریضے کو انجام دے سکتے ہیں۔ کئی صدیوں میں کہیں ایک ایسا شخص پیدا ہوتا ہے جو تنہا بھاری ذمہ داری نبھانے کا لائق وسزاوار ہوتا ہے اور ایسے عظیم مقصد کو پورا کر سکتا ہے۔ (ایسے شخص کو) خدا بشر کو سعادت وشقاوت کے راستے سمجھانے کیلئے بھیجتا ہے (تاکہ) لوگوں کو ان کے مقدرات سے آگاہ کرے اسی کو "نبوت عامہ" کہا جاتا ہے۔

جب گفتگو یہاں تک پہنچی ہے تو ضمناً میں ایک ایسا مطلب بیان کرنا چاہتا ہوں جو میری نظر میں بدیہیات میں شمار کئے جانے کے لائق ہے اور وہ یہ ہے کہ: ہم کو بدیہی طور سے معلوم ہے کہ انسان کے درمیان خدا کی طرف سے ایک شریعت ہونی چاہئے اور جب ہم ان شریعتوں کی طرف نظر ڈالتے ہیں جو نوع بشر کے درمیان رائج ہیں تو ان میں تین شریعتیں دیگر شریعتوں سے عمدہ اور اہم نظر آتی ہیں۔

۱۔ شریعت یہود ۲۔ شریعت نصاریٰ ۳۔ شریعت اسلام "مگر تین مقامات پر شریعت اسلام بدیہی طور پر دوسری شریعتوں سے کامل تر ہے اور انہیں مقامات پر شریعتوں کی بنیاد اور تشریع کا مدار ہے"۔

(اور وہ تینوں چیزیں یہ ہیں:)

پہلی بات: عقائد حقہ و معارف الٰہیہ، توصیف و تنزیہ خدا، معاد و اس کی کیفیت، ملائکہ کا علم، توصیف و تنزیہ انبیاء (علیہم السلام) سے متعلق ہے اور یہ بات شرائع میں بنیادی اور اہم حیثیت کی حامل ہے۔

دوسری بات: خصائل حمیدہ و اصلاح نفس و اخلاق فاضلہ ہے۔

اور تیسری بات کا تعلق انفرادی اور اجتماعی اعمال کے ڈھانچے سے ہے جس میں سیاسی اور معاشرتی امور شامل ہیں، بلکہ انصاف پسند اگر بے غرض ہو کر دیکھے تو پتہ چلے گا کہ یہود و نصاریٰ کی شریعتوں کی اسلام سے کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔ انسان کی پوری زندگی میں اتنا مضبوط قانون اور (ترقی جامع) شریعت کا وجود نہیں تھا اور یہ خود ہی اسلام کے حقانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ "نبوت عامہ" اور یہ کہ خدا نے انسان کیلئے ایک شریعت معین فرمائی اور لوگوں کو ہدایت کے راستے سمجھائے اور ان سب کو ایک منظم نظام کے تحت قرار دیا، ان تمام باتوں کو ثابت کرنے کے بعد دین اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کیلئے کسی تمہید کی ضرورت نہیں ہے، ہونے خود اسلام پر نظر ڈالنے اور ان تمام مراحل میں اسلام اور دوسرے ادیان و شرائع کے درمیان موازنہ کرنے کے جو انسانی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے متصور ہوتے ہیں، ان میں (دین) حق کی تعلیمات اور نفسانی اقدار کے علاوہ معاشرتی اور ذاتی فرائض اور انفرادی و اجتماعی ذمہ داریاں بھی شامل ہیں اور یہ اس حدیث شریف کے مفاہیم میں سے ایک مفہوم ہے جس میں فرمایا گیا ہے ﴿الاسلام یعلو ولا یعلیٰ علیہ﴾ ۴۳۔ اس لئے کہ انسانی عقل چاہے جتنی ترقی کرے اور عقلوں کے ادراکات چاہے جتنے زیادہ ہو جائیں جب وہ اسلام کے دلائل و براہین پر نظر کریں گے تو وہ (اسلام کے) نور ہدایت کے سامنے سرنگوں ہو جائیں گے اور دنیا کی کوئی دلیل اسلام پر غالب نہیں آسکے گی۔

خاتم المرسلین ؐ کی نبوت کے اثبات کیلئے ہمارے دلائل کا نچوڑ یہ ہے کہ جس طرح تخلیق کائنات کی مضبوطی اور اس کی حسن ترتیب و بہترین نظم ہم کو یہ بتاتا ہے کہ ایک ہستی موجود ہے جو اس کی تنظیم کرتا ہے، جس کا علم تمام باریکیوں، خوبیوں اور کمالات پر محیط ہے۔ اسی طرح ایک شریعت کے احکام کا اتقان، حسن نظام، ترتیب کامل، تمام مادی و معنوی، دنیوی و اخروی، اجتماعی و فردی ضروریات کا مکمل طور سے متکفل ہونا بھی ہم کو یہ بتاتا ہے کہ اس کے منتظم اور چلانے والے کا علم بھی لامحدود ہوگا اور وہ افراد بشر کی ضرورتوں سے واقف

ہوگا اور چونکہ یہ بات بدیہی ہے کہ یہ سارا کام ایک ایسے انسان کے عقلی قوتوں کا ہرگز مرہون نہیں ہوسکتا، جس نے کسی کے سامنے زانوئے ادب تہہ نہ کیا ہو، جس کی تاریخ حیات ہر قوم وملت کے مورخین نے لکھی ہو، جو یک ایسے ماحول میں تربیت پائی ہو جو کمالات ومعارف سے عاری ہو، ایسا شخص اتنا کامل نظام نہیں بنا سکتا۔ اس لئے یقیناً غیب اور ماوراء الطبیعہ سے اس شریعت کی تشریح ہوئی ہے اور وحی والہام کے ذریعے آنحضرت ؐ کو پہنچایا گیا ہے۔ ﴿والحَمدُللّٰه عَلىٰ وُضُوحِ الحُجّة﴾۔

میرا ارادہ تھا کہ تفکر کے دوسرے مقام کا ذکر کروں، یعنی عالم ملک کی فکر کے بارے میں بحث کروں جس کا نتیجہ "زہد" ہے، لیکن چونکہ سابق مقامات میں عنان قلم کو چھوٹ دے دی تھی اور مطلب طولانی (بلکہ) موضوع سے خارج ہوگیا تھا، لہذا اس سے صرف نظر کرتا ہوں۔

چوتھی فصل، شب بیداری کی فضیلت

اب حدیث شریف کے دو فقروں کا بیان ہمارے ذمہ رہ گیا ہے جس میں فرمایا گیا ہے۔ ﴿وَاجْفِ عَنِ اللَّيْلِ جَنْبَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ رَبَّكَ﴾۔ مولا امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اس حدیث شریف میں قلبی اعمال ورہنمائی کرنے والے تفکرات اور تقوائے الٰہی کے پہلو بہ پہلو شب بیداری اور بستر سے دوری کو بھی عبادات کیلئے (ضروری) قرار دیا ہے اور یہ (نماز شب) کی فضیلت واہمیت پر دلیل ہے۔ چنانچہ احادیث میں اس عمل کی بہت اہمیت بیان کی گئی ہے اور ائمہ ہدیٰ ومشائخ عظام وعلمائے کرام ؒ کی یہ سیرت رہی ہے کہ ہمیشہ اس (نماز شب) کے پابند رہے ہیں، بلکہ رات کے آخرت حصے میں بیداری کو عبادت سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی بہت اہمیت دیتے تھے۔ کتاب وسائل الشیعہ جو مذہب امامیہ کی ایک عظیم ترین کتاب ہے اور جس پر مذہب کا دارومدار ہے اور جو فقہاء وعلماء کی مرجع ہے اس میں نماز شب کی فضیلت میں ۳۱ حدیثیں وراس کے ترک کے مکروہ ہونے پر چند حدیثوں کو ذکر کیا گیا ہے اور پھر سابق ولاحق (مستحب ومکروہ) کیلئے حوالے بھی نقل کئے گئے ہیں[۱] اور دعاؤں وغیرہ کی کتابوں میں بے حد وبے حساب حدیثیں ذکر کی گئی ہیں، لیکن ہم حصول برکت کیلئے چند حدیثوں کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں

عَنِ الكافي بإسنادِهِ عَنْ مُعٰوِيَةَ بْنِ عَمّارٍ قالَ: سَمِعْتُ أبا عَبْدِاللّٰه علیہ السلام يَقُولُ

﴿كانَ في وَصِيَّةِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لِعَلِيٍّ قولُه يا عَلِيُّ أُوصِيكَ في نَفْسِكَ بِخِصالٍ فاحْفَظْها

ثُمَّ قَالَ اللَّهُمَّ أَعِنْهُ ... إِلَى أَنْ قَالَ وَعَلَيْكَ بِصَلَاةِ اللَّيْلِ وَعَلَيْكَ بِصَلَاةِ اللَّيْلِ وَعَلَيْكَ بِصَلَاةِ اللَّيْلِ ﴿۳۵﴾

کافی میں معاویہ بن عمار سے روایت ہے کہ میں نے امام جعفر صادقؑ کو فرماتے ہوئے سنا کہ رسول خداؐ نے حضرت علیؑ کو جو وصیت فرمائی تھی اس میں فرمایا تھا "اے علی! میں تم کو تمہاری ذات کے بارے میں چند باتوں کی وصیت کرتا ہوں ان کو محفوظ کرلو۔ (اس کے بعد فرمایا) پروردگارا! علیؑ کی مدد کر (یہاں تک کہ فرمایا) نماز شب کی پابندی کرو، نماز شب کی پابندی کرو، نماز شب کی پابندی کرو"۔ حدیث کی ابتداو انتہا سے (نماز شب کی) حد سے زیادہ اہمیت سمجھ میں آتی ہے۔

وعن الخصال باسناده عن أبي عبدالله عليه السلام قال

قال النبي صلى الله عليه وآله لجبرئيل ﴿عظني، فقال يا محمد عش ما شئت فإنك ميت، وأحبب ما شئت فإنك مفارقه، واعمل ما شئت فإنك ملاقيه، واعلم أن شرف المؤمن قيامه بالليل وعزه كفه عن أعراض الناس﴾ ۳۶

بحوالہ خصال، حضرت امام جعفر صادقؑ سے (مروی) ہے کہ آپؑ نے فرمایا "رسول خداؐ نے جبرئیلؑ سے کہا مجھے وعظ و نصیحت کرو، جبرئیلؑ نے کہا اے محمدؐ! جتنا جی چاہے زندہ رہو مگر مرنا ہے، جس سے جی چاہے محبت کرو مگر اس سے جدا ہونا ہے، جو عمل چاہے کرو اسی سے پالا پڑنا ہے۔ یہ جان لیجئے کہ مومن کا شرف شب بیداری (نماز شب) میں ہے اور اس کی عزت لوگوں سے اپنی آبرو کی حفاظت میں ہے"۔

وفي المجالس باسناده عن ابن عباس قال

قال رسول الله صلى الله عليه وآله في حديث ﴿فمن رزق صلاة الليل من عبد أو أمة قام لله مخلصا فتوضأ وضوءاً سابغاً وصلى لله عزوجل بنية صادقة وقلب سليم [وبدن خاشع] وعين دامعة جعل الله تعالى خلفه سبعة صفوف من الملائكة في كل صف ما لا يحصي عددهم الا الله أحد طرفي كل صف بالمشرق والآخر بالمغرب فاذا فرغ كتب الله عزوجل له بعددهم درجات﴾ ۳۷

مجالس، ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ رسول خداؐ نے ایک حدیث میں فرمایا "جس بندے یا کنیز کو نماز شب کی توفیق ہو اور وہ خلوص کے ساتھ (بستر سے) اٹھے، کامل وضو کرے اور قلب سلیم و سچی نیت (اور

خشوع بدن) اور آنکھوں سے آنسو بہاتے ہوئے خدا کیلئے نماز (شب) پڑھے تو خدا اس کے پیچھے ملائکہ کی سات صفوں کو قرار دیتا ہے اور ہر صف میں اتنے ملک ہوتے ہیں جن کی تعداد خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، ہر صف کا ایک سرا مشرق میں اور ایک مغرب میں ہوتا ہے اور جب وہ نماز سے فارغ ہوتا ہے تو خدا ان ملائکہ کی تعداد کے مطابق اس شخص کیلئے درجات لکھ دیتا ہے"۔

وعن العلل باسناده الیٰ انس قال سمعتُ رسولَ الله ﷺ يقولُ: ﴿الرَّكعتانِ في جوفِ الليلِ أحبُّ اليَّ منَ الدُّنيا وما فيها﴾ ۳۸ علل، انسؓ سے روایت کی ہے کہ میں نے رسول خداؐ کو فرماتے ہوئے سنا "آدھی رات کو دو رکعت نماز مجھے دنیا و مافیہا سے محبوب ہے"۔

اور بہت سی حدیث میں ہے کہ نماز شب مؤمن کا شرف ہے اور جس طرح مال و اولاد دنیا کی زینت ہیں، نماز شب آخرت کی زینت ہے۔ ۳۹

وعن العلل باسناده الی جابر بن عبدالله الانصاري قال سمعتُ رسولَ الله ﷺ يقولُ: ﴿ما اتَّخذ اللهُ ابراهيمَ خليلاً الّا لإطعامِ الطَّعامِ والصَّلاة باللّيلِ وَالنّاسُ نيام﴾ ۴۰ علل، جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے روایت کی ہے کہ میں نے رسول خداؐ کو فرماتے ہوئے سنا کہ آپؐ فرما رہے تھے "خداوند عالم نے جناب ابراہیمؑ کو کھانا کھلانے اور جب لوگ سوتے تھے اس وقت نماز شب پڑھنے کی وجہ سے خلیل بنایا"۔

اگر نماز شب کیلئے صرف یہی ایک حدیث ہوتی تب بھی اس کی اہمیت کیلئے کافی تھی، لیکن اس کی اہلیت رکھنے والوں کیلئے، مجھ جیسے نااہلوں کیلئے نہیں۔ ہم لوگوں کو نہیں معلوم کہ "خلت" کونسی خلعت ہے، اور خدا کسی بندے کو دوست بنائے تو اس کا کیا مرتبہ ہے؟ عقل انسانی اس کے تصور سے عاجز ہے۔ اگر خلیل خدا کو تمام بہشت دے دیئے جائیں تو وہ ان کی طرف نظر بھی نہ کریں گے۔ تم بھی اگر کوئی عزیز محبوب یا محبوب دوست رکھتے ہو اور وہ تمہارے پاس آجائے تو تم بھی ہر قسم کی ناز و نعمت کو ٹھکرا کر جمال محبوب و لقائے دوست کی وجہ سے تمام چیزوں سے بے پرواہ ہو جاؤ گے، حالانکہ یہ مثال نامناسب ہے اور دونوں میں بعد مشرقین کا فرق ہے۔

وعن عليّ بن ابراهيم باسناده عن ابي عبدالله عليه السلام قال:

﴿ما من عملٍ حسنٍ يعملُهُ العبدُ الّا ولهُ ثوابٌ في القرآن الّا صلاة الليل، فانّ الله لم

يُبَيِّنْ ثوابها لعظيم خطرها عنده فقال ﴿تتجافى جُنُوبُهُمْ عن المضاجع يدعون ربَّهُمْ خوفاً وطمعاً ومما رزقناهم يُنفقون﴾ فلا تعلمُ نفسٌ ما أُخفِي لهم من قُرَّة أعْيُنٍ جزاءً بما كانوا يعملون﴾ ۱۲

علی بن ابراہیمؒ نے اپنی تفسیر میں امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے کہ حضرتؑ نے فرمایا "بندہ جو کچھ بھی نیک عمل کرتا ہے قرآن میں اس کا ثواب ہے سوائے نماز شب کے! اس کی عظمت کی بنا پر خدا نے اس کا ثواب نہیں بیان کیا' چنانچہ ارشاد ہے ﴿تتجافى جُنُوبُهُمْ عن المضاجع يدعون ربَّهُمْ خوفاً وطمعاً ومما رزقناهم يُنفقون﴾ ۱۳ "رات کے وقت ان کے پہلو بستروں سے آشنا نہیں ہوتے اور (عذاب کے) خوف اور (رحمت کی) امید پر اپنے پروردگار کی عبادت کرتے ہیں اور ہم نے جو کچھ عطا کیا ان میں سے وہ خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں" ان لوگوں کی کارگزاریوں کے بدلے میں کیسی کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک ان کیلئے ڈھکی چھپی رکھی ہے، اس کو تو کوئی جانتا ہی نہیں ہے"۔

اب خداوندعالم نے جو قرۃ العین (آنکھوں کی ٹھنڈک) ذخیرہ فرمایا ہے اور چھپا رکھا ہے، جس پر کوئی شخص مطلع نہیں ہے آخر وہ کیا ہے اور کیا ہوسکتا ہے؟ اگر وہ بہشتی نہروں، اونچے محلات اور دیگر بہشتی نعمتوں جیسی کوئی نعمت ہوتی تو دیگر اعمال کی طرح اس کو بھی بیان کر دیتا اور ملائکہ اس پر مطلع ہوتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ اور ہے اس کی عظمت اس سے زیادہ ہے کہ کسی کے گوش زد کی جائے، خصوصاً اس دنیا کے رہنے والوں کیلئے اس عالم (آخرت) کی نعمتوں کا قیاس اس دنیا کی نعمتوں پر نہ کرو۔ یہ سوچو بھی نہیں کہ وہاں کی بہشت و باغات یہاں کی بہشت و باغات ہی کی طرح ہیں یا ذرا وہ زیادہ وسیع وعریض ہیں۔ وہاں دارکرامت حق اور مہمان خانہ الٰہی ہے۔ یہاں کی پوری دنیا وہاں کی بہشتی حورالعین کے ایک بال کے بھی برابر نہیں ہے، بلکہ اہل جنت کیلئے بنائے گئے بہشتی زیوروں کے کسی ایک تار سے بھی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا اس کے باوجود خداوندعالم نے نماز شب پڑھنے والے کی جزا میں ان چیزوں کو قرار نہیں دیا ہے بلکہ مقام تعظیم میں ان کا ذکر کیا ہے۔ لیکن افسوس ہمارا ایمان کمزور ہے اور ہم اہل یقین نہیں ہیں ورنہ ناممکن تھا کہ ہم اس طرح غافل رہتے اور صبح تک خواب خرگوش میں پڑے رہتے اور اگر شب بیداری انسان کو حقیقت و سر نماز سے آگاہ کر دے اور انسان حق کے ذکر وفکر سے مانوس ہو جائے اور راتوں کو نماز اس کی عادت بن جائے، یعنی راتیں اس کے معراج کی سواری بن کر قرب خدا کا ذریعہ بن جائیں ۱۴ تو خدا کے جمال جمیل کے علاوہ اس

کی کوئی دوسری جزا ممکن نہیں ہو سکتی۔

ہم اہل غفلت کی حالت پروائے ہو کہ آخر عمر تک خواب غفلت سے بیدار نہیں ہوتے اور طبیعت کی مستی پر باقی رہتے ہیں، بلکہ ہر (آنے والا) دن ہماری مستی و غفلت کو بڑھاتا ہی رہتا ہے۔ ہم حیوانی چیزوں، کھانے پینے اور جنسی عمل کے علاوہ کچھ سمجھتے ہی نہیں اور جو بھی کرتے ہیں، چاہے وہ عبادت ہی ہو وہ پیٹ بھرنے اور جنسی خواہشات کی تسکین کیلئے کرتے ہیں۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ خلیل الرحمنؑ کی نماز ہماری نماز کی طرح تھی؟ خلیلؑ نے اپنی حاجت جبرئیلؑ سے طلب نہیں کی ۴۳ اور ہم اپنی حاجتوں کو اگر گمان کریں کہ حاجت روا ہے شیطان سے بھی طلب کرتے ہیں!

(ان سب باتوں کے باوجود) مایوس نہیں ہونا چاہیے ہو سکتا ہے ایک مدت تک شب بیداری کرنے اس سے مانوس ہونے اور اس کے عادی ہونے کے بعد رفتہ رفتہ خدا تمہاری دستگیری کرے اور ایک لطف خفی کے ساتھ خلعت رحمت سے نواز دے، لیکن اجمالاً سرّ عبادت سے غافل نہ رہو اور صرف تجوید قرائت اور ظاہری تصحیح سے پڑھنے کی طرف متوجہ نہ رہو اور اگر مخلص نہیں بن سکتے تو کم از کم اس قرۃ العین کی تلاش کرو جس کو خدا نے چھپا رکھا ہے اور فقیر عاصی، حیوان سیرت جو تمام درجات کو چھوڑ کر حیوانیت پر قناعت کر بیٹھا ہے، اگر ممکن ہو تو اس کیلئے دعا کرو اور پوری توجہ و خلوص نیت سے کہو

﴿اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِي التَّجَافِي عَنْ دَارِ الْغُرُورِ، وَالْاِنَابَةَ اِلٰى دَارِ الْخُلُودِ، وَالْاِسْتِعْدَادَ لِلْمَوْتِ قَبْلَ حُلُولِ الْفَوْتِ﴾ ۴۴ "پالنے والے ہم کو دار غرور سے دور رکھ اور دار الخلود (زندۂ جاوید دنیا) کیلئے توبہ کی توفیق عطا کر اور فوت سے پہلے موت کی استعداد عطا کر۔"

پانچویں فصل: تقویٰ کے بارے میں

"تقویٰ" وقایہ سے (مشتق) ہے جس کے معنی حفاظت و نگہداری کے ہیں اور عرف اور روایات کی زبان میں "خدا کے اوامر و نواہی کی مخالفت سے اپنے نفس کو بچانے اور رضائے الٰہی کی پیروی کرنے" کے ہیں۔ ویسے زیادہ تر اس لفظ کا استعمال محرمات میں پڑ جانے کے ڈر سے مشتبہ چیزوں سے بھی نفس کو مکمل طریقے سے محفوظ رکھنے کے معنی میں ہوتے ہیں۔ ﴿وَمَنْ اَخَذَ بِالشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِي الْمُحَرَّمَاتِ وَهَلَكَ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُ﴾ ۴۵ "اور جو شخص شبہات میں پڑ جاتا ہے وہ محرمات میں مبتلا ہو جاتا ہے اور نامعلوم جگہ

سے ہلاک ہوتا ہے" ﴿ فَمَنْ رَتَعَ حَوْلَ الْحِمیٰ اَوْشَکَ اَنْ یَقَعَ فِیْهِ ﴾۶؎

یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تقویٰ اگرچہ مدارج کمال اور اعلیٰ مقامات میں سے نہیں ہے، لیکن تقویٰ کے بغیر کسی منزل تک پہنچنا بھی ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ جب تک نفس محرمات کی گندگی سے آلودہ رہتا ہے نہ باب انسانیت میں داخل ہوتا ہے اور نہ اس راہ کا سالک ہوسکتا ہے، اور جب تک لذتوں کا عادی اور نفسانی خواہشات اور لذتوں کی مٹھاس اس کے کام (دوہن) میں ہے، وہ انسانی کمالات کا پہلا مقام حاصل نہیں کرسکتا اور جب تک دنیا سے محبت اور لگاؤ اس کے دل میں باقی ہیں وہ متوسطین اور زاہدین کے درجے تک نہیں پہنچ سکتا اور جب تک حبِ نفس اس کی ذات میں پوشیدہ ہے مخلصین و محبین کے درجے تک نہیں پہنچ سکتا اور جب تک ملک و ملکوت کی کثرت اس کے قلب میں ظاہر ہے، مجذوبین کے درجات تک نہیں پہنچ سکتا اور جب تک کثرات اسماء اس کے باطن ذات میں متجلی ہے فنائے کلی نہیں پاسکتا اور جب تک قلب مقامات کی طرف التفات رکھتا ہے مقام فنا تک نہیں پہنچ سکتا اور جب تک تلوین درکار ہے مقام تمکین تک نہیں پہنچ سکتا اور ذات اسم ذاتی کے مقام کے لحاظ سے اس کے سر میں ذاتی و ابدی تجلی حاصل نہیں کرتی۔ پس تقوائے عامہ محرمات سے بچنا ہے اور تقوائے خاصہ لذتوں سے بچنا اور دنیا کے لگاؤ سے قطع تعلق زہد اور حبِ نفس سے پرہیز مخلصوں کا کام ہے، کثرات ظہور افعالی سے اجتناب مجذوبوں کا کام ہے اور کثرات اسماء سے قطع تعلق کرکے فنا حاصل ہوتا ہے اور فنا کی طرف توجہ کرنا واصلوں کا عمل ہے اور تلوینات سے بچ کر تمکین حاصل ہوتا ہے ﴿فَاسْتَقِمْ كَمَا اُمِرْتَ﴾۷؎

ان میں سے ہر مرتبے کیلئے ایک شرح ہے اور ان سب کا ذکر اصطلاحات میں حیران ہونے اور مفاہیم کے حجاب میں پوشیدہ ہو جانے کے علاوہ ہم جیسے لوگوں کیلئے اور کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوتا ہے ہر میدان کیلئے کچھ اہل ہوتے ہیں۔ اب ہم آپ کی توجہ تقوے کی طرف منعطف کرانا چاہتے ہیں جو عام لوگوں کیلئے اہم ہے۔

چھٹی فصل

عام تقویٰ کا بیان

اے عزیز! جان لو کہ جس طرح بدن کی صحت و مرض ہوتی ہے اور ان کے علاج (کیلئے) طبیب (ضروری) ہے، اسی طرح نفس انسانی اور روح آدمی کیلئے بھی صحت و مرض، علاج و معالجہ اور معالج ضروری

ہے۔ صحت نفس کا مطلب یہ ہے کہ طریق انسانیت میں اعتدال اور مرض وسقم کا مطلب ہے راستے سے بھٹکنا اور جادہ انسانیت سے انحراف۔ نفسانی امراض کی اہمیت جسمانی امراض کے مقابلے میں ہزاروں درجہ زیادہ ہے، اس لئے کہ جسمانی امراض کا نتیجہ موت ہوا کرتا ہے، موت کے آتے ہی نفس کی توجہ جسم سے ختم ہو جاتی ہے۔ تمام جسمانی امراض اور مادی خرابیاں اس سے دور ہو جاتی ہیں اور کوئی جسمانی مرض اور نفسانی بیماری باقی نہیں رہتی۔ لیکن اگر خدانخواستہ روحانی امراض اور نفسانی بیماری ہو تو نفس کی توجہ پہلے بدن سے ہٹ کر اپنے ملکوت کی طرف ہوگی اور یہی امراض واسقام کی پیدائش کی پہلی منزل ہے۔ دنیا کی طرف توجہ اور اس سے تعلق کی مثال ان نشہ آور چیزوں کی طرح ہے جو انسان کو بے خود بنا دیتی ہیں اور تعلق روح کا دنیائے بدن سے سلب ہونا اس کے ہوش میں آنے کا باعث ہوتا ہے اور ہوش میں آتے ہی باطن ذات میں موجود تمام امراض اور آرام واسقام (دفعتاً) اس پر حملہ کر بیٹھتے ہیں اور تمام وہ امراض جواب تک چھپے ہوئے تھے خاکستر میں چھپی ہوئی آگ کی طرح ظاہر ہو جاتے ہیں اور وہ امراض وآرام یا تو زائل ہی نہیں ہوتے اور اس کے ساتھ رہتے ہیں اور اگر زائل بھی ہوتے ہیں تو ہزاروں سال کے فشار و زحمت، آگ اور حرارتوں کے بعد زائل ہوتے ہیں ﴿آخِرُ الدَّوَاءِ الكَيُّ﴾ ۴۸ ''آخری علاج داغ دینا ہے'' ارشاد خدا ہے ﴿يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ﴾ ۴۹ ''جس دن وہ (سونا چاندی) جہنم کی آگ میں گرم کیا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور پہلو اور ان کے پشت داغے جائیں گے''۔

انبیاء کرامؑ شفیق طبیب کی طرح ہیں جو مریضوں کے حالات کے مطابق بڑی شفقت ومہربانی اور ہمدردی سے ان کی صحت کیلئے مختلف قسم کے نسخے لاتے ہیں اور ہدایت کے راستوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ (ہم لوگ طبیب ہیں اور حق کے شاگرد) ۵۰ روحی قلبی اور بدنی وظاہری اعمال کی حیثیت امراض کے دواؤں کی سی ہے۔ چنانچہ تقویٰ کی حیثیت اپنے تمام مراتب کے ساتھ ایسی ہی ہے جیسے بیماری میں ضرر رساں چیزوں سے پرہیز کی حیثیت ہوتی ہے۔ جب تک مریض پرہیز نہیں کرے گا نہ اچھا ہوگا نہ حکیم کے نسخے کا کوئی اثر ہوگا۔ جسمانی امراض میں تو کبھی یہ (بھی) ممکن ہو جاتا ہے کہ معمولی سی بدپرہیزی کیجئے اور دوا کھاتے رہئے تو طبیعت اور دوا کا غلبہ ہونے کی وجہ سے صحت حاصل ہو سکتی ہے اس لئے کہ طبیعت خود بھی تو صحت کی حافظ ہے اور دوا اس کی مددگار ہے۔

لیکن روحانی امراض کا مسئلہ بہت مشکل ہے وہاں تو طبیعت شروع ہی سے نفس پر غالب ہوتی ہے اور نفس الٹا اثر کرتا ہے اور خرابی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ﴾ ۵۱ اس لئے تھوڑی سی بد پرہیزی سے نفس پر مرض غالب آجاتا ہے اور چاروں طرف سے خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں یہاں تک کہ اس کی صحت بالکل ہی ختم ہو جاتی ہے۔

پس جو شخص صحت نفس کی طرف مائل ہو اور اپنے حال پر مہربان ہو اور اپنی صحت سے دلچسپی رکھتا ہو، اس کو یہ معلوم کر لینے کے بعد کہ عذاب الیم سے چھٹکارے کا انحصار انبیاءؑ کے حکم پر عمل کرنے پر ہے اور انبیاءؑ کے تمام فرامین و احکام کا انحصار دو چیزوں پر ہے۔

اوّل نفس کی اصلاح کرنے والی اور اس کو صحیح و سلامت رکھنے والی چیزوں کا استعمال کرنا۔

دوئم ضرر اور تکلیف پہنچانے والی چیزوں سے پرہیز کرنا۔

یہ تو معلوم ہی ہے کہ نفسانی برائیوں میں حرام چیزوں کا ضرر سب سے زیادہ ہے، اسی لئے ان کو حرام کیا گیا ہے اور صلاح کرنے والی چیزوں میں واجبات کی اہمیت سب سے زیادہ ہے، اسی لئے انہیں واجب کیا گیا ہے اور یہی دونوں مرحلے ہر چیز سے افضل اور ہر مقصد سے مقدم، ترقی و پیشرفت کی تمہید، ور مدارج ومقامات انسانی کی ترقی کے منحصر راستے ہیں۔ پس اگر کسی نے ان چیزوں کی پابندی کی تو وہی اہل سعادت ونجات ہے اور ان دونوں میں بھی اہم حرام باتوں سے اجتناب وتقوی ہے۔ اہل سلوک بھی اسی مقام کو مقام اول پر مقدم شمار کرتے ہیں۔ روایت و خبر اور نہج البلاغہ کے خطبوں کو دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ حضرات معصومینؑ بھی اسی مرحلہ کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔

لہذا میرے عزیز! اس پہلے مرحلے کو بہت اہم سمجھو اور اس کی زیادہ پابندی اور مراقبت کرو، کیونکہ اگر پہلا قدم تم نے صحیح اٹھایا اور اس بنیاد کو مستحکم کر لیا تو دیگر مقامات تک پہنچنے کی امید ہے، ورنہ دوسرے مقامات تک پہنچنا ناممکن ہے اور نجات بہت ہی مشکل و دشوار ہے۔

جناب عارف بزرگوار اور ہمارے عالی مرتبہ شیخ ؒ ۵۲ فرمایا کرتے تھے ''سورہ حشر کی آخری آیتوں کو ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ لِغَدٍ﴾ ۵۳ سے لے کر آخر سورہ تک نمازوں کے بعد تعقیبات میں، معنی میں غور وفکر کرتے ہوئے پڑھنا، خصوصاً رات کے آخری حصہ میں جب دل فارغ ہوتا ہے اصلاح نفس کیلئے بہت ہی مؤثر ہے، نیز شیطان اور نفس کے شر سے بچنے کیلئے''۔

موصوف ہمیشہ باوضو رہنے کا حکم دیتے اور فرماتے تھے: "وضو، بمنزلہ فوجی لباس ہے" ہر حال میں خدائے ذو الجلال سے تضرع وزاری کے ساتھ دعا کرو کہ تم کو اس مرحلے میں توفیق عطا کرے اور صفت تقویٰ کے حصول میں تمہاری مدد کرے۔

اور جان لو کہ شروع میں یہ بات ذرا سخت اور مشکل معلوم ہوگی، لیکن کچھ دنوں کی پابندی کے بعد زحمت، راحت سے بدل جائے گی اور مشقت، آسانی سے، بلکہ ایک خالص روحانی لذت سے بدل جائے گی، کہ اس کے اہل تمام لذتوں کے مقابلے میں اس کو ترجیح دیں گے اور (پھر یہ بھی) ممکن ہے کہ تم، انشاء اللہ، سخت پابندی اور مکمل تقویٰ کے بعد اس مقام سے ترقی کر کے تقوائے خاص کے مقام تک پہنچ جاؤ اور یہ تقویٰ نفسانی لذات میں سے ہوگا۔ اس لئے کہ جب روحانی لذت کا مزہ چکھ لو گے تو رفتہ رفتہ جسمانی لذتوں سے منصرف ہو جاؤ گے اور ان سے پرہیز کرنے لگو گے اور اس وقت راہ سہل و آسان ہو جائے گی اور پھر نتیجہ یہ ہوگا کہ فانی اور نفسانی لذتوں کو ہیچ سمجھنے لگو گے، بلکہ ان سے متنفر ہو جاؤ گے اور دنیا کی زیب و زینت تمہاری نظروں میں بری اور بے ہودہ نظر آنے لگے گی اور تم محسوس کرنے لگو گے کہ اس دنیا کی ہر لذت نفس پر اثر انداز ہوتی ہے اور دل پر ایک سیاہ دھبہ ڈال دیتی ہے جو اس دنیا سے شدید انس و محبت کا سبب بن جاتا ہے اور یہ خود زمین میں ہمیشہ رہنے (کی امید) کا سبب بنتا ہے اور موت کے وقت ذلت و سختی و زحمت و فشار سے بدل جاتا ہے، کیونکہ سکرات موت اور نزع روح کی سختی انہیں دنیاوی لذتوں اور حب دنیا کی بنا پر ہوتی ہے۔ چنانچہ اس سے پہلے بھی اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اور جب انسان اس مطلب کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو اس دنیا کی لذتیں اس کی نظروں سے بالکل ختم ہو جاتی ہیں اور وہ پوری دنیا و زیبائش دنیا سے بیزار ہو جاتا اور بھاگنے لگتا ہے اور یہ خود تقویٰ کے مقام دوم سے اس کے تیسرے مقام کی طرف ارتقا کے مترادف ہے۔ اس کے بعد سلوک الی اللہ کا راستہ سہل و ہموار ہو جاتا ہے اور انسانیت کا راستہ اس کیلئے وسیع اور روشن ہو جاتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ اس کا ہر قدم حق کا قدم اور اس کی ریاضت، ریاضت حق ہو جاتی ہے اور وہ نفس اور اس کے اطوار و آثار سے بھاگنے لگتا ہے اور اپنے اندر حق سے محبت کا مشاہدہ کرتا ہے اور بہشت و حور و قصور کے وعدوں پر قناعت نہیں کرتا، بلکہ اس کا منظور نظر اور مقصد کوئی دوسرا ہوتا ہے۔ خود بینی و خود غرضی سے وہ نفرت کرتا، محبت نفس سے بچتا اور اپنی طرف توجہ کرنے سے پرہیز کرتا ہے۔ وہ خود غرضی کے قریب نہیں پھٹکتا اور یہ بہت اعلیٰ و بلند مرتبہ اور خوشبوئے ولایت کے

حصوں کا پہلا درجہ ہے۔ خداوند عالم اپنے پہلو کے لطف میں س کو جگہ دیتا ور اس کی دستگیری کرتا ہے ور اس پر خصوصی لطف وکرم نازل کرتا ہے پھر اس کے بعد سالک کیلئے جو چیزیں پیش آتی ہیں وہ تو گنجائش تحریر سے بھی باہر ہیں۔

والحمد للّٰہ

اولاً وآخراً وظاهراً وباطناً

والصلاة على محمد وآله الطاهرين

توضیحات (۱۲)

۱۔ اصول کافی، ج۲، ص۵۴، کتاب ایمان وکفر، باب تفکر، حدیث۱۔

۲۔ خواجہ عبداللہ بن محمد انصاری ہروی (۳۹۶۔۴۸۱) اکابر محدثین اور عرفا میں سے ہیں جو شیخ ابوالحسن خرقانی کے مرید تھے اور آپ کے جانشین بنے، ان کی کتابوں میں منازل السائرین، زاد العارفین اور رسالہ دل وجان معروف ہیں

۳۔ منازل السائرین، ج۱۲، قسم البدایات، باب تفکر

۴ سورۂ مؤمن آیت/۱۸۔

۵۔ ان کے دل تو ہیں مگر (کچھ) سمجھتے نہیں ہیں سورۂ اعراف، آیت/۱۷۹۔

۶ اس میں شک نہیں کہ جو شخص (آگاہ) دل رکھتا ہے یا کان لگا کر حضور قلب سے سنتا ہے اس کیلئے اس میں کافی نصیحت ہے جبکہ وہ شاہد اور آگاہ ہے سورۂ ق، آیت/۳۷۔

۷۔ حدیث ، حاشیہ۲

۸۔ مزید اطلاع کیلئے تہذیب الاصول (تقریرات امام خمینیؒ)، ج۱، ص۳۰ بحث حقیقت ومجاز کی طرف رجوع کیجئے

۹۔ خداوند عالم و اس کی قدرت کے بارے میں برابر سوچتے رہنا بہترین عبادت ہے۔

اصول کافی، ج۲، ص۵۵، کتاب ایمان وکفر، باب تفکر، حدیث۳۔

۱۰۔ عن الحسن الصیقل، قال قُلْتُ لابي عبد اللّٰہؑ تفکّرُ ساعةٍ خیرٌ مِنْ قیام لیلةٍ؟ قال ﴿نعم قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وآلہ تفکّر ساعةٍ خیرٌ من قیام لیلة﴾ حسن صیقل کہتے ہیں میں نے امام صادقؑ سے عرض کیا کیا ایک ساعت غور وفکر ایک رات کی عبادت سے بہتر ہے؟ فرمایا ہاں رسول خداؐ کا ارشاد ہے، ایک گھنٹہ سوچنا ایک رات کی عبادت سے بہتر ہے۔

بحار الانوار، ج۶۸، ص۳۲۵، کتاب ایمان وکفر، باب تفکر، حدیث ۱۹ اور اصول کافی، ج۲، ص۵۴، کتاب ایمان وکفر حدیث۲ میں بھی یہی بات کہی گئی ہے۔

۱۱۔ قال النبیؐ ﴿فکرُ ساعةٍ خیرٌ مِنْ عبادة سنة﴾۔

عوالی اللئالی، ج۲، ص۵۷، المسلک الرابع، حدیث۱۵۴۔

در شرح مصباح الشریعہ ومفتاح الحقیقہ، ص۷۱، باب ۲۶ تفکر کی شرح میں بھی یہی مطلب بیان ہوا ہے۔

۱۲۔ طریحی نے مجمع البحرین میں لفظ فکر کے بارے میں تحریر کیا ہے حدیث میں ہے ایک گھنٹہ تفکر ساٹھ سال کی عبادت

سے بہتر ہے

۱۳۔ رسول خداؐ نے فرمایا ایک ساعت کا تفکر ستر سال کی عبادت سے بہتر ہے۔

سر الشریعہ واطوار الطریقہ وانوار الحقیقہ، ص ۲۰۷۔

۱۴۔ شرح اصول کافی صدر المتالہین، ج، ص ۲۵۱، کتاب التوحید، باب النہی عن الکلام فی الکیفیۃ؛ اور نقد النصوص فی شرح نقش الفصوص، جامی، ص ۲۷ و ۲۸۔

۱۵۔ حدیث ۱، حاشیہ ۳۶۔

۱۶۔ محمد بن ابراہیم شیرازی (۹۷۹۔ ۱۰۵۰) ملقب بہ صدر الدین وصدر المتالہین، معروف بہ "صدرا" اور "ملا صدرا" کا شمار عظیم مسلمان فلسفہ میں ہوتا ہے۔ آپ حکمت متعالیہ کے بانی ہیں۔ فلسفہ میں بہت ہی بے مثال آراء کے مالک ہیں۔ آپ کا فلسفی مکتب فکر آپ کے بعد دوسروں کے مکاتب فلسفہ پر غالب آ گیا۔ آپ کے بعد کے اکثر فلاسفہ اسلام آپ ہی کے مکتب کے پیروکار شمار کئے جاتے ہیں۔ آپ کی سب سے اہم تصنیف اسفار اربعہ ہے جس میں وسیع پیمانے پر آپ کے نظریات موجود ہیں۔ دیگر تصانیف میں تفسیر قرآن، شرح اصول کافی، مبدأ و معاد، مفاتیح الغیب، شواہد الربوبیہ، اسرار الآیات، حاشیہ بر شفا وغیرہ مشہور ہیں۔ آپ کے اساتذہ میں محقق میر باقر داماد، میر فندرسکی اور شیخ بہائی قابل ذکر ہیں اور آپ کے شاگردوں میں ملا محسن فیض، عبدالرزاق لاہیجی (فیاض) وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

۱۷۔ شذرات، ج ۲، ص ۳۱۹، (خاتمہ و وصیہ)۔

۱۸۔ اسفار، ج ۱، مقدمہ، ص ۱۔

۱۹۔ تفسیر القرآن الکریم، ج ۲، ص ۲۲۱، اسی طرح یہ مفہوم مختلف عبارتوں کے ساتھ نقل ہوا ہے

اصول کافی، ج ۱، ص ۹۳، کتاب التوحید، باب النہی عن الکلام فی الکیفیہ، حدیث ۷؛ توحید صدوق، ص ۴۵۴۔ ۴۵۷، باب ۶۷، حدیث ۱، ۲، ۹؛ علم الیقین، ج ۱، ص ۹۵؛ محجۃ البیضاء، ج ۸، ص ۱۹۳ و ۲۱۰

۲۰۔ کافی میں اپنی سند کے ساتھ ابو بصیر سے روایت کی گئی ہے کہ ابو بصیر نے کہا امام باقرؑ نے فرمایا مخلوقات خدا کے بارے میں گفتگو کرو، خود (ذات) خدا کے بارے میں بات چیت نہ کرو کیونکہ ذات الٰہی کے بارے میں گفتگو متکلم کی حیرانی و پریشانی کا سبب بنتی ہے۔

اصول کافی، ج ۱، ص ۹۲، کتاب توحید، باب النہی عن الکلام فی الکیفیہ، حدیث ۱۔

۲۱۔ حدیث ۱، حاشیہ ۱۴ ملاحظہ کریں

۲۲۔ مرآۃ العقول، ج ۱، ص ۳۲۲، کتاب توحید، باب النہی عن الکلام فی الکیفیہ، حدیث ۱

۲۳۔ ہر چیز کے بارے میں گفتگو کرو لیکن ذات خدا کے بارے میں گفتگو نہ کرو۔

اصول کافی، ج ۱، ص ۹۲، کتاب توحید، باب النہی عن الکلام فی الکیفیہ، پہلی حدیث کا آخری حصہ۔

۲۴۔ اصول کافی، ج۱، ص۹۳، کتاب توحید، باب النہی عن الکلام فی الکیفیہ، حدیث ۷

۲۵ حدیث ۲، حاشیہ ۹۔

۲۶۔ حضرت سجادؑ سے لوگوں نے توحید کے بارے میں پوچھا تو فرمایا خدا کو معلوم تھا کہ آخری زمانے میں کچھ گہری فکر والے آئیں گے اس لئے ﴿قل هو الله﴾ اور سورۂ حدید کی چند آیتوں کو ﴿علیم بذات الصدور﴾ تک نازل فرمایا۔ لہذا جو اس سے زیادہ کا ارادہ کرے گا وہ ہلاک ہوگا۔

اصول کافی، ج۱، ص۹۱، کتاب توحید، باب النسبہ، حدیث ۳۔

۲۷ جو چیز بھی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ خدا کی تسبیح کرتی ہے۔ سورہ حدید، آیت ۱

۲۸ وہی سب سے پہلے اور سب سے آخر ہے (اور اپنی قدرتوں سے) سب پر ظاہر اور (نگاہوں سے) پوشیدہ ہے اور سب چیزوں کو جانتا ہے۔ سورۂ حدید، آیت ۳۔

۲۹۔ جو کوئی خدا کی کیفیت کے بارے میں سوچے گا ہلاک ہوگا۔

اصول کافی، ج۱، ص۹۳، کتاب توحید، باب النہی عن الکلام فی الکیفیہ، حدیث ۵۔

۳۰۔ تمام تعریفیں خدا کیلئے مخصوص ہیں اور اسی سے شکایت ہے۔

۳۱۔ سورہ ابراہیمؑ آیت ۱۲ حدیث حاشیہ ۱۲۔

۳۲۔ سورۂ عبس، آیت ۱۷۔

۳۳۔ اسلام سب سے برتر ہے اور اس پر کوئی چیز برتر نہیں ہو سکتی۔

وسائل الشیعہ، ج۱۷، ص۳۷۶، کتاب الفرائض والمواریث، ابواب موانع الارث، باب ۱، حدیث ۱۔

۳۴۔ وسائل الشیعہ، ج۵، ص۲۶۸۔۲۸، کتاب الصلاۃ، ابواب بقیۃ الصلوات المندوبہ، باب ۳۹ و۴۰۔

۳۵ روضہ کافی، ج۸، ص۹۷، حدیث ۳۳۔

۳۶ خصال، باب ۱، حدیث ۱۱۹

وسائل ج۵ ص۲۶۹، کتاب الصلاۃ، ابواب بقیۃ الصلوات المندوبہ، باب ۳۹ ح ۳۔

۳۷ وسائل الشیعہ ج۵، ص۲۷۵، کتاب الصلاۃ، ابواب بقیۃ الصلوات المندوبہ، باب ۳۹، حدیث ۲۹۔

۳۸۔ علل الشرائع، باب ۳۲، حدیث ۳ وسائل الشیعہ، ج۵، ص۲۷۵، کتاب الصلاۃ، ابواب بقیۃ الصلوات المندوبہ، باب ۳۹، حدیث ۳۰۔

۳۹۔ وسائل الشیعہ، ج۵، کتاب الصلاۃ، ابواب بقیۃ الصلوات المندوبہ، باب ۳۹، حدیث ۲، ۲۸، و۳۳۔

۴۰۔ علل الشرائع، باب ۳۲، حدیث ۴، وسائل الشیعہ، ج۵، ص۲۷۵، ۲۷۶، کتاب الصلاۃ، ابواب بقیۃ الصلوات المندوبہ، باب ۳۹، حدیث ۳۰۔

۴۱۔ وسائل الشیعہ، ج ۵، ص ۲۸۰، کتاب الصلاۃ، ابواب بقیۃ الصلوات المندوبۃ، باب ۳۹، حدیث ۳۔

۴۲۔ خداوند عالم نماز شب اور شب بیداری کے سلسلے میں فرماتا ہے ﴿إن ناشئة الليل هي أشد وطأ وأقوم قيلا ۝ إن لك في النهار سبحا طويلا﴾ یقیناً رات کو اٹھنا نفس کو شدید روندتا ہے اور ذکر کیلئے مناسب ہے۔ یقیناً آپ کیلئے دن میں بڑی تلاش و کوشش ہے۔ سورۂ مزمل، آیت ۶/۷۔

امام حسن عسکری علیہ السلام فرماتے ہیں ﴿الوصول الى الله سفر لا يدرك الا بامتطاء الليل﴾ خدا تک رسائی ایک سفر ہے جو مرکب شب پر سوار ہوئے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔ مقدمہ سر الصلاۃ ص ۱۲۔

۴۳۔ طبری نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے جب جناب ابراہیمؑ کو منجنیق میں رکھ کر آگ میں پھینکنا چاہا تو جبرئیلؑ حضرت ابراہیمؑ کے پاس آئے اور بولے کیا کوئی حاجت ہے؟ ابراہیمؑ نے کہا ہے مگر آپ سے نہیں۔

مجمع البیان، سورۂ انبیاء کی ۶۹ویں آیت کی تفسیر کے ضمن میں

۴۴۔ حدیث ۰، حاشیہ ۲۳ کی طرف رجوع کیجئے۔

۴۵۔ اصول کافی، ج ۱، ص ۶۶-۶۸، کتاب فضل العلم، باب اختلاف الحدیث، حدیث ۱۰ اور کافی میں "[illegible]" کی جگہ "ارتکب المحرمات" آیا ہے۔

۴۶۔ وسائل الشیعہ، ج ۸، ص ۱۲۲، کتاب القضاء، ابواب صفات قاضی، باب ۱۲، حدیث ۳۹ وسائل میں "یوشک" کی جگہ "اوشک" آیا ہے۔

۴۷۔ اے رسول آپ کو جیسا کہ حکم دیا گیا ہے ثابت قدم رہئے۔ سورۂ ہود، آیت ۱۲

۴۸۔ ''آخری علاج داغنا اور جلانا ہے'' یہ ایک مشہور مثل ہے جو نہج البلاغہ کے خطبہ ۱۶۸ میں آئی ہے۔ 'کَیّ' کے معنی گرم لوہے سے داغ دینا ہے جو بعض زخموں کیلئے آخری علاج ہے۔

اس سے مراد یہ ہے کہ جب تمام طریقے ناکام ہو جائیں تو سخت طریقے کو استعمال کرنا چاہئے۔ مترجم۔

۴۹۔ جس دن اس سونا چاندی کو جہنم کی آگ میں گرم کیا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور پہلو اور ان کی پشت داغے جائیں گے۔ سورۂ توبہ آیت ۳۵/۔

۵۰۔ من طبیبم شاگرداں حق بحر قلزم دیدہ ما را فانفلق

مثنوی دفتر ۳ بیت ۲۷۴۲۔

۵۱۔ یقیناً نفس برائی کا حکم دیتا ہے۔ سورۂ یوسف، آیت ۵۳

۵۲۔ حدیث ۱، حاشیہ ۵۱ ملاحظہ کریں۔

۵۳۔ اے ایمان لانے والو تقویٰ اختیار کرو اور ہر شخص کو دیکھنا چاہئے کہ اس نے کل کیلئے کیا بھیجا ہے۔ سورۂ حشر ۱۸۔

تیرھویں حدیث

بالسّند المُتّصل الی الشّیخ الجلیل ثقة الاسلام مُحمّد بن یعقُوب عنْ عدّةٍ منْ اصحابنا، عنْ أحْمد بْن مُحمّد بْن خالد، عنْ غیْر واحدٍ، عنْ عليّ بْن اسْباط، عنْ أحْمد بْن عُمر الحلاّل، عن عليّ بن سُوید، عنْ أبي الحسن الأوّل علیه السلام

قال سالْتُهُ عنْ قول اللّه عزّوجلّ ﴿ومن یتوکّل علی اللّه فهُو حسْبُهُ﴾؟

فقال ﴿التّوکُّلُ علَی اللّهِ درجاتٌ، منها، أنْ تتوکّل علَی اللّهِ في اُمُورک کُلّها، فما فعل بک کُنْتَ عنْهُ راضیاً، تعلمُ أنّهُ لا یألُوک خیْراً وفضْلاً، وتعْلمُ أنّ الحُکْم في ذلک لهُ، فتوکّلْ علی اللّه بتفْویض ذلک الیْه وثقْ به فیها وفي غیْرها﴾.

ترجمہ: علی بن سوید کہتے ہیں، میں نے حضرت امام موسیٰ کاظمؑ سے پوچھا ''خداوند عالم کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے ﴿ومن یتوکّل علی اللّه فهو حسبُهُ﴾ '' فرمایا خدا پر بھروسہ کرنے کے درجات ہیں ایک تو یہ ہے کہ اپنے تمام کاموں میں خدا پر بھروسہ کرو، اس نے تمہارے ساتھ جو کچھ بھی کیا اس پر خوش رہو اور یہ جان لو کہ تم سے وہ اپنے فضل و نیکی کو نہیں روکے گا اور یہ جان لو کہ اس میں اسی کا فرمان ہے (تمام امور کو) اس کے سپرد کر کے اس پر بھروسہ کرو، اس امر اور دیگر امور میں خدا پر اعتماد رکھو''۔

شرح ''حلال'' (حلّ) تل کے تیل بیچنے والے کو کہتے ہیں۔

''ابوالحسن (یا) ابوالحسن اوّل سے امام موسیٰ کاظمؑ'' اور ''ابوالحسن ثانی سے امام رضاؑ'' اور ''ابوالحسن ثالث سے امام علی نقیؑ'' مراد لئے جاتے ہیں۔

''توکل'' کے معنی از روئے لغت، اظہار عاجزی واعتماد بر غیر کے ہیں۔ ''واتّکلتُ علی فلانٍ فی امری'' کا مطلب، ''اعتمدتہ'' ہے یعنی میں نے اس پر اعتماد کیا۔ اس کی اصل'' أوتکلت'' بھی۔

''حسبہ'' کا مطلب، ''محسبہ وکافیہ''۳؎ ہے (اس کیلئے یہی کافی ہے)۔ ''یالوک، الا'' سے ہے ''یالو، الوا'' جس کے معنی تقصیر کے ہیں۔ البتہ بعض علماء نے کہا ہے ''جب دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے تو منع کے معنی لئے ہوئے ہوتا ہے''۴؎ یہ مطلب بھی اچھا ہے اس سے معنی سلیس ہوجاتے ہیں، لیکن یہ لازمی نہیں ہے، بلکہ تقصیر کے معنی بھی درست ہیں۔ جیسا کہ صحاح سے بھی اس کے خلاف کا استفادہ ہوتا ہے۔ صاحب صحاح کہتے ہیں ''الا، یالو۔ ای قصّر وفلان لا یالوک نصحاً''۵؎ اس سے پتہ چلتا ہے کہ دو مفعولوں کی طرف متعدی بھی اس معنی میں آتا ہے۔

''توکل'' کا مطلب تفویض کے علاوہ ہے اور توکل وتفویض دونوں رضا ور وثوق کے متضاد ہیں۔ ہم بعد میں انشاء اللہ اس کو بیان کریں گے۔ حدیث کی ضروری چیزوں کو ہم چند فصلوں میں بیان کریں گے

پہلی فصل توکل اور اس کے درجات کا بیان

مختلف مسلکوں کے اعتبار سے توکل کی مختلف تعبیریں کی گئی ہیں جو معانی کے اعتبار سے ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ چنانچہ صاحب ''منازل السائرین'' فرماتے ہیں ﴿التّوکّلُ کِلةُ الأمرِ کُلّه الی مالکه والتّعویلُ علی وکالته﴾۶؎ ''توکل کا مطلب تمام امور کو ان کے مالک کے حوالہ کردینا اور اس کی وکالت پر بھروسہ کرنا ہے''۔

بعض عرفا نے کہا ہے: ﴿التّوکّلُ طرحُ البدنِ فی العُبودیّة وتعلُّقُ القلبِ بالرُّبوبیّة﴾۷؎ ''توکل کا مطلب بدن کو بندگی میں ڈال دینا اور قلب کا ربوبیت سے تعلق پیدا کرلینا ہے''۔

بعض لوگوں نے کہا ہے ﴿التّوکّلُ علی اللّه انقطاعُ العَبْدِ فی جمیعِ ما یاملُهُ من المخلُوقین﴾ ''یعنی توکل بر خدا کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنی تمام امیدوں کو مخلوق خدا سے قطع کرلے''۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ تمام معانی آپس میں ایک دوسرے سے قریب ہیں اور کسی مفہوم کے بارے میں بحث کرنا ضروری نہیں اور جو بات کہنے کی ہے وہ یہ ہے کہ بندوں کے اختلاف مقام کی وجہ سے ان کے درجے بھی مختلف ہوں گے اور چونکہ توکل کے درجات کا علم بندوں کی معرفت پروردگار جلّ جلالہ کے

درجات علم پر موقوف ہے، اس لئے ہم اس کے ذکر کرنے پر مجبور ہیں۔ لہذا آپ کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اصول معارف میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ ربوبیت اور مالکیت کا علم حق ہے اور کیفیت تصرف تمام امور کے اندر یہ بھی ذات مقدس کا حق ہے۔ اس بات کو تسلیم کئے بغیر سالکین کے مقامات حاصل نہیں ہو سکتے اور ہم اس بحث میں علمی انداز سے داخل نہیں ہوں گے، کیونکہ علمی انداز سے اس بحث کا چھیڑنا جبر و تفویض کی تحقیق پر موقوف ہے اور یہ بات اس کتاب کے مناسب نہیں ہے۔ لہذا صرف لوگوں کے درجات معرفت کیا ہیں؟ اس کو بیان کریں گے۔

ذات مقدس پروردگار عالم کے بارے میں لوگوں کی معرفت بہت ہی مختلف اور متفاوت ہے۔ عام موحد خدا کو مبادی امور اور کلیات جواہر و عناصر اشیاء کا خالق جانتے اور اس کے تصرف کو محدود سمجھتے ہیں اور احاطۂ ربوبیت کے قائل نہیں ہیں۔ یہ لوگ زبان سے کبھی تو کہتے ہیں "مقدرات الٰہی حق ہے اور ہر چیز اس کے تحت تصرف ہے، کوئی بھی موجود اس کے مقدس ارادے کے بغیر موجود نہیں ہو سکتا" لیکن وہ لوگ اس مقام کے اہل نہیں ہیں نہ از روئے علم و ایمان اور نہ ہی شہود و وجدان!

اس قسم کے لوگ جس میں ہم بھی شامل ہیں حق تعالیٰ کی ربوبیت کا علم نہیں رکھتے، ان کی توحید ناقص ہے، وہ ظاہری اسباب و علل کی بنا پر ربوبیت اور سلطنت حق سے محجوب ہیں اور مقام توکل پر فائز نہیں ہیں جس کے بارے میں اس وقت بات ہو رہی ہے صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہے اسی لئے دنیاوی امور میں کسی بھی اعتبار سے حق پر بھروسہ نہیں کرتے اور سوائے اسباب ظاہری اور موثرات دنیاوی کے علاوہ کسی چیز سے ارتباط پیدا نہیں کرتے اور اگر کسی طرح بھی خدا کی طرف توجہ کر بھی لیتے اور اس سے کوئی مقصد طلب کرتے ہیں تو یہ یا از روئے تقلید ہوتی ہے یا از روئے احتیاط، کیونکہ اس میں ان کو کوئی ضرر نہیں دکھائی دیتا اور نفع کا احتمال رہتا ہے۔ ایسی صورت میں ان میں توکل کی بو ہوتی ہے، لیکن اگر اسباب ظاہرہ کو اپنے موافق دیکھیں تو پھر خدا اور اس کے اختیارات سے بالکل غافل ہو جاتے ہیں اور یہ جو کہتے ہیں کہ توکل کسب و عمل کے منافی نہیں ہے تو یہ بات اپنی جگہ پر صحیح ہے، بلکہ دلیل کے مطابق اور نقل کے موافق ہے، لیکن ربوبیت اور اس کے اختیارات سے محجوب اور اسباب کو مستقل شمار کرنا توکل کے منافی ہے۔ اس قسم کے لوگ جو اپنے دنیاوی کاموں میں کسی قسم کا توکل اور بھروسہ نہیں رکھتے آخرت کے معاملے میں توکل کے بارے میں بڑی ڈینگ مارتے ہیں۔ ہر علم و معرفت یا تہذیب نفس اور عبادت و اطاعت کے بارے میں اگر تحقیر، کاہلی اور سستی

کرتے ہیں تو فوراً خدا کے فضل وکرم پر اعتماد اور توکّل کا اظہار کرنے لگتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ بغیر کسی زحمت وعمل کے صرف "خدا بہت بڑا ہے اور ہم خدا کے فضل پر بھروسہ کرتے ہیں"! جیسے جملے کہہ دینے سے آخرت کے درجات حاصل کرلیں، دنیاوی امور کے بارے میں کہتے ہیں: "سعی وعمل کرنا توکل اور خدا پر اعتماد کرنے کے منافی نہیں ہے" اور آخرت کے امور کے بارے میں کہتے ہیں کہ: "سعی وعمل کرنا، اعتماد اور فضل وتوکل بر خدا کے منافی ہے"! یہ سب نفس وشیطان کی مکاری ہے، کیونکہ یہ سب نہ دنیاوی اور نہ اخروی امور میں توکل کرتے ہیں اور نہ ان میں سے کسی چیز کے بارے میں خدا پر بھروسہ کرتے ہیں۔ بس چونکہ دنیاوی امور کو اہمیت دیتے ہیں اس لئے اسباب کا سہارا لیتے ہیں اور حق تعالیٰ اور اس کے اختیارات پر اعتماد نہیں کرتے اس کے برعکس آخرت کے کاموں کو چونکہ اہمیت نہیں دیتے اور یوم معاد اور اس کی تفصیل پر حقیقی ایمان نہیں رکھتے، اس لئے بہانے بناتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں "خدا بڑا ہے اور اس پر بھروسہ کرتے ہیں" کبھی شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کا سہارا لیتے ہیں، حالانکہ یہ تمام چیزیں سوائے زبانی جمع خرچ اور بے مفہوم باتوں کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو دلیل یا نقل کے ذریعے سے عقیدہ رکھتے ہیں اور تصدیق کرتے ہیں کہ خدا مقدّر امور اور مسبب اسباب ہے اور دنیائے وجود پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس کی قدرت اور اس کا تصرّف غیر محدود ہے، یہ لوگ عقلی اعتبار سے خدا پر توکل رکھتے ہیں۔ یعنی عقلاً ونقلاً توکل کے ارکان ان کے یہاں مکمل ہیں، اسی لئے یہ لوگ اپنے کو متوکل سمجھتے ہیں اور توکل کے لازم ہونے پر دلیل بھی قائم کرتے ہیں، اس لئے کہ انہوں نے توکل کے ارکان کو ثابت کیا ہے۔ ارکان توکل یہ ہیں۔

۱۔ خداوند تعالیٰ بندوں کی ضرورتوں کو جانتا ہے۔

۲۔ خدا ان کی ضروریات کو پورا کرنے پر قادر ہے۔

۳۔ اس کی ذات مقدس میں بخل نہیں ہے۔

۴۔ وہ اپنے بندوں پر رحمت وشفقت رکھتا ہے۔

لہٰذا، اس کا لازمہ ہے کہ ایسے خدا پر جو عالم وقادر اور غیر بخیل ہے، بندوں پر رحیم ہے، اس پر بھروسہ کیا جائے، کیونکہ وہ ان کے مفادات پر نگاہ رکھتا ہے اور کسی بھی مفاد کو نقصان پہنچنے نہیں دیتا اگرچہ خود بندے مصلحت اور مفسدہ میں تمیز نہیں کرسکتے۔ یہ گروہ اگرچہ از روئے علم متوکل ہے لیکن ایمان کے مرتبے پر اس

کے افراد نہیں پہنچے ہیں، اسی لحاظ سے امور میں متزلزل ہیں اور ان کی عقل اور دل میں کش مکش ہے اور عقل مغلوب ہے، کیونکہ اس گروہ کے دل تو اسباب سے متعلق ہوتے ہیں اور تصرّف حق سے محجوب ہوتے ہیں۔

تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو تصرّف حق کو مخلوقات کے اندر دلوں تک پہنچاتے ہیں اور ان کے دل اس بات پر ایمان لاتے ہیں کہ مؤثر امور حق تعالیٰ ہے اور وہی مالک اشیاء اور بادشاہ، ان لوگوں نے قلم عقل سے اپنے دلوں کی تختیوں پر ارکان توکّل کو لکھ لیا ہے، یہ گروہ مقام توکّل کا مالک ہے، لیکن مراتب اور درجات ایمان کے سلسلے میں اس گروہ کے اندر بھی بہت اختلاف ہے یہاں تک کہ یہ اطمینان و کمال کے درجے تک پہنچ جائے اور جب ایسا ہو جائے تبھی دلوں میں توکّل کا کامل درجہ ظاہر ہوتا ہے اور اسباب کے ساتھ تعلق و دل بستگی نہیں پیدا ہوتی ہے اور ان لوگوں کے دل مقام ربوبیت تک دست انداز ہو جاتے ہیں اور اس پر اطمینان و اعتماد پیدا کر لیتے ہیں، جیسا کہ اس عارف نے توکّل کی تعریف میں کہا ہے "بدن کو راہ عبودیت میں ڈال دینا اور قلب کا ربوبیت سے متعلق کر دینا توکّل ہے" یہ تمام چیزیں جو ذکر کی گئیں یہ اس صورت میں ہیں کہ قلب کثرت افعالی کے مقام میں واقع ہو ورنہ وہ مقام توکّل سے گزر جائے گا اور مقصود سے خارج ہو جائے گا۔

پس معلوم ہو کہ توکّل کے درجات ہیں اور شاید حدیث میں جس درجے کا ذکر کیا گیا ہے، اس سے مراد دوسرے گروہ کا توکّل ہے، کیونکہ علم کو اس کی بنیاد قرار دیا گیا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوسرے درجات کی طرف اشارہ ہو جو دوسرے اعتبار سے ہے، کیونکہ دوسری تقسیم کی بنا پر توکّل کے دوسرے درجات بھی ہیں اور وہ اس طرح کے ہیں کہ جس طرح اصحاب عرفان و ریاضت کے درجات ہوتے ہیں اور وہ کثرت سے وحدت کی طرف تھوڑا تھوڑا کر کے پہنچتے ہیں، فنائے افعالی دفعتاً نہیں ہوا کرتی تدریجاً ہوا کرتی ہے، پہلے تو اپنے مقام پر ہوتی ہے اس کے بعد دیگر مخلوقات میں مشاہدہ کی جاتی ہے۔ توکّل، رضا و تسلیم اور دیگر مقامات بھی آہستہ آہستہ حاصل ہوتے ہیں۔ (مثلاً) ممکن ہے پہلے تو تھوڑے سے امور میں اور غائب و مخفی اسباب میں توکّل کرے اس کے بعد تھوڑا تھوڑا کر کے مقام مطلق تک پہنچ جائے چاہے اسباب ظاہر و جلی ہوں یا باطنی و خفی اور چاہے اپنے کاموں میں ہو یا اعزا و اقربا اور دوست احباب کے کاموں میں ہو، اسی لئے حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ "تم اپنے تمام امور میں توکّل کرو"۔

دوسری فصل: توکّل اور رضا کا فرق

یہ جان لو کہ مقام رضا توکّل کے علاوہ ہے، بلکہ رضا کا مرتبہ ارفع و اعلیٰ ہے، کیونکہ متوکّل صرف اپنے مفاد اور بھلائی کا طالب ہوتا ہے اور خداوند عالم کو فاعل خیر سمجھتے ہوئے اپنے فلاح و بہبود کے حصول کیلئے وکیل بناتا ہے، لیکن جو شخص مقام رضا پر فائز ہوتا ہے وہ اپنے ارادہ کو ارادۂ حق میں فنا کر دیتا ہے اپنا کوئی ارادہ نہیں رکھتا جیسا کہ بعض اہل سلوک سے لوگوں نے پوچھا کہ ﴿ما تُرِيدُ؟ فقال أُرِيدُ أنْ لا أُرِيدَ﴾۔۵ ''کیا چاہتے ہو؟ تو کہا میں چاہتا ہوں کہ خود کچھ نہ چاہوں'' اس کا مطلب مقام رضا تھا۔

اور یہ جو حدیث شریف میں آیا ہے ﴿فما فعل بك كُنْتَ عَنْهُ راضِياً﴾ ''جو کچھ تمہارے ساتھ خدا کرے تم اس پر راضی رہو'' اس کا مقصد مقام رضا نہیں ہے۔ اسی لئے کہ آخر میں فرمایا ہے ''یہ جان لو کہ خدا جو کچھ بھی کرتا ہے اسی میں تمہارے لیے خیر و فضل ہے'' گویا کہ معصومؑ نے چاہا ہے کہ سامع کے ذہن میں مقام توکّل کو ایجاد فرمائیں، اسی لئے آپ نے اس کیلئے چند تمہیدات ترتیب دی ہیں فرمایا ﴿وتعلم أنّه لا يألوك خيراً وفضلاً﴾ ''تم جانتے ہو کہ خدا تمہارے بارے میں کسی خیر و فضل کے سلسلے میں کمی نہیں کرے گا'' اس کے بعد فرمایا ﴿وتعلم أنّ الحكم في ذلك له﴾ ''اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ اس سلسلے میں جو کچھ بھی ہے اسی کا حکم ہے''۔ البتہ جو شخص یہ جانتا ہے کہ خداوند عالم ہر چیز پر قادر ہے اور اس سے کسی خیر و فضل کو کم نہیں کرے گا اس کیلئے مقام توکّل حاصل ہوتا ہے، کیونکہ توکّل کے دو بڑے رکن وہی ہیں جن کو معصومؑ نے ذکر فرما دیا، اب رہے دو یا تین دوسرے ارکان تو ان کے واضح ہونے کی بنا پر ان کا ذکر نہیں کیا۔ پس ان مذکورہ تمہیدات اور غیر مذکورہ، تمہیدات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خدا جو کچھ بھی کرتا ہے وہ موجب خوشنودی و رضا ہے، اس لئے کہ خیر و صلاح اسی میں ہے۔ پس اس طرح مقام توکّل حاصل ہوتا ہے اور اسی لیے معصومؑ نے اس پر وضاحت کی ہے ﴿فتوكّل على الله﴾۔

تیسری فصل: تفویض و توکل اور ثقہ کا فرق

تمہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ تفویض اور توکّل میں فرق ہے، جیسے کہ ثقہ، تفویض و توکّل کے علاوہ ہے، اسی لیے سالکین کے مقامات میں ان کو جداگانہ شمار کیا جاتا ہے۔

خواجہ" فرماتے ہیں ﴿التفویض الطف اشارۃ واوسع معنی من التوکل ثم قال التوکل شعبۃ منہ﴾۔ "تفویض توکل سے زیادہ لطیف و باریک ہے۔ پھر فرمایا توکل اس کا ایک شعبہ ہے" کیونکہ تفویض کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنے اندر کسی توانائی و قوت کو نہ دیکھے، بلکہ تمام امور میں اپنے کو بے اختیار اور حق تعالیٰ کو با اختیار سمجھے، لیکن توکل ایسا نہیں ہے، کیونکہ متوکل اختیارات، بھلائی اور مفادات حاصل کرنے کیلئے خداوند عالم کو اپنا قائم مقام کرتا ہے اور تفویض زیادہ وسیع ہے اور توکل اسی کا ایک شعبہ ہے، کیونکہ توکل کا تعلق صرف مفادات میں ہوتا ہے اور تفویض کا تعلق مطلق امور میں ہوتا ہے، نیز توکل، توکل کے باعث سبب کے وقوع ہونے کے بعد ہوا کرتا ہے۔ یعنی وہ امر کہ جس میں بندہ خدا پر بھروسہ کرتا ہے۔ مثلاً پیغمبر اور اصحاب پیغمبر کا خدا پر بھروسہ کرنا مشرکین سے حفاظت کے وقت اس وقت کہ جب ان سے یہ بات کہی گئی کہ ﴿ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوھم فزادھم ایماناً وقالوا حسبنا اللہ ونعم الوکیل﴾۔ "تحقیق بعض لوگوں نے تمہارے لئے عظیم لشکر جمع کر لیا ہے لہذا ان سے ڈرو تو ان کے ایمان میں اور اضافہ ہو اور انہوں نے کہا کہ ہمارے لئے خدا ہی کافی ہے وہی ہمارا ذمہ دار ہے"۔ لیکن تفویض وقوع سبب سے پہلے ہوا کرتی ہے، جیسے کہ رسول خدا سے مروی دعا ہے ﴿اللھم انی اسلمت نفسی الیک، والجات ظھری الیک وفوضت امری الیک﴾[۱۱] "خدایا میں نے اپنے نفس کو تیرے حوالے کیا اور تجھ پر اعتماد کیا اور اپنے معاملے کو تیرے سپرد کر دیا"۔ البتہ کبھی وقوع سبب کے بعد بھی تفویض ہوتی ہے، جیسے مومن آل فرعون کی تفویض!

میں نے جو کچھ بھی ذکر کیا یہ مشہور عارف عبدالرزاق کاشانی"[۱۲] کی شرح کا ماحصل ہے جو جناب عارف کامل خواجہ عبداللہ"[۱۳] کے کلام سے تھوڑا سا تفاوت رکھتا اور اس سے ذرا مختصر ہے۔[۱۴] ویسے خواجہ کا کلام بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔

لیکن توکل کا تفویض کا ایک حصہ ہونا ذرا قابل غور ہے اور تفویض کو توکل سے عام شمار کرنا واضح قسم کا مسامحہ ہے، نیز اس پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ توکل صرف وقوع سبب کے بعد ہوا کرتا ہے، بلکہ دونوں جگہوں پر توکل ہوتا ہے، در حدیث میں جو آیا ہے ﴿فتوکل علی اللہ بتفویض ذلک الیہ﴾ تو ہو سکتا ہے کہ اپنے دائرۂ اختیار کو دیکھے بغیر توکل نہیں ہو سکتا، لہذا جو چیز اپنے سے متعلق ہو اس میں دوسرے کو وکیل بنا دینا اور اس کے سپرد کر دینا ہو۔ پس حضرت یہ چاہتے ہیں کہ اس کو مقام توکل سے ترقی دے کر مقام تفویض تک

پہنچادیں اور اس کو یہ سمجھا دیں کہ خدا تصرّف میں تیرا قائم مقام نہیں ہے، بلکہ وہ خود اپنے ملک پر متصرّف اور اپنی مملکت کا مالک ہے۔ خود خواجہ نے بھی منازل السائرین میں توکّل کے تیسرے درجے میں اس مطلب کی طرف متوجہ کیا ہے۔ ۱۵

اور "ثقہ" توکّل وتفویض دونوں کے علاوہ ہے جیسا کہ خواجہ نے فرمایا ہے ﴿اَلثِّـــقَةُ سَوادُ عَيْنِ التَّوَكُّلِ، وَنُقْطَةُ دائِـرَةِ التَّفْويضِ، وَسُوَيْداءُ قَلْبِ التَّسْلِيمِ﴾ ۱۲ "ثقہ چشم توکّل کی سیاہی، دائرہ تفویض کا نقطہ اور قلب تسلیم کا سویدا ہے" یعنی اس کے بغیر مقامات ثلاثہ حاصل نہیں ہوسکتے، بلکہ ان مقامات کی روح خدا پر اعتماد اور ثقہ ہے اور جب تک بندہ خدا پر وثوق نہ رکھے گا ان مقامات کو حاصل نہیں کر سکتا۔

اب پتہ چلا کہ حضرتؑ نے توکّل وتفویض کے بعد کیوں فرمایا۔

﴿ثِقْ بِهِ فيها وَفي غَيْرِها﴾

توضیحات (۱۳)

۱۔ سورۂ طلاق، آیت ۳۔

۲۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۶۵، کتاب ایمان و کفر، باب التفویض الی اللہ والتوکل علیہ، حدیث ۵

۳۔ ﴿اتکلت علی فلان فی امری﴾ یعنی اپنے کام میں اس پر بھروسہ کیا۔ اس کی اصل "وکل" اور "تکلان" ہے۔ حسب یعنی اس کیلئے کافی ہے۔

۴۔ مرآۃ العقول، ج ۸، ص ۲۳، کتاب ایمان و کفر، باب التفویض، حدیث ۵۔

۵۔ "لا الو" کوتاہی کی ... "لا یالو جہدا" کے بعد مطلب ہوگا: اس شخص نے جد و جہد میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔

۶۔ منازل السائرین، ص ۳۳، قسم معاملات، باب ۲۷۔

۷۔ یہ کلام ابوتراب نخشبی سے نقل ہوا ہے۔ رسالہ قشیریہ، ج، ص ۲۶۸

۸۔ یہ کلام ہرویہ سے منقول ہے۔ شرح منازل السائرین، ص ۹، قسم چہارم، اخلاق، باب رضا۔

۹۔ منازل السائرین، ج ۳۴، قسم بدایات، باب التفویض۔

۱۰۔ لوگوں نے تمہارے (مقابلہ کے واسطے) (بڑا لشکر) جمع کیا ہے۔ پس ان سے ڈرتے رہو (تو بجائے خوف کے) ان کا ایمان اور زیادہ ہو گیا اور کہنے لگے، خدا ہمارے واسطے کافی ہے، اور کیا اچھا کارساز ہے۔ سورۂ آل عمران ۳/۱۷۳۔

۱۱۔ خدایا میں نے اپنی ذات کو تیرے حوالے کیا اور تیرے اوپر بھروسہ کیا اور اپنے امور کو تیرے حوالے کیا۔

۱۲۔ ملا عبدالرزاق بن جمال (جلال) الدین اسحاق کاشانی سمرقندی جن کی کنیت "ابوالغنائم" اور لقب "کمال الدین" ہے آٹھویں صدی ہجری کے مشہور عارفوں اور فصوص الحکم کے بڑے شارحین میں سے ہیں (۷۳۰ یا ۷۳۵) میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی اہم تصانیف یہ ہیں: اصطلاحات صوفیہ، تاویل الآیات یا تاویلات القرآن، شرح فصوص الحکم، شرح منازل السائرین

۱۳۔ حدیث ۱۲، حاشیہ ۱۔

۱۴۔ شرح منازل السائرین، ص ۸۷، باب معاملات، باب تفویض۔

۱۵۔ منازل السائرین، ص ۳۴، قسم سوم، باب معاملات، باب توکل۔

۱۶۔ "ثقہ" آنکھ کی پتلی توکل اور مرکز دائرہ تفویض، اور دل کا مرکز تسلیم ہے۔
منازل السائرین، ص ۳۵، قسم البدایات، باب ثقہ۔

چودھویں حدیث

بالسند المتصل إلى محمد بن يعقوب، ثقة الإسلام وعماد المسلمين، عن عدة من أصحابنا، عن أحمد بن محمد، عن علي بن حديد، عن منصور بن يونس، عن الحارث بن المغيرة أو أبيه، عن أبي عبدالله عليه السلام قال:

قلت له: ﴿ما كان في وصيّة لقمان؟ قال عليه السلام: كان فيها الأعاجيبُ، وكان أعجب ما كان فيها أن قال لابنه: خف الله عزّوجلّ خيفةً لو جئته ببرّ الثقلين لعذّبك، وارجُ الله رجاءً لو جئته بذنوب الثقلين لرحمك﴾.

ثمّ قال أبو عبدالله عليه السلام: كان أبي يقول: ﴿إنّه ليس من عبدٍ مؤمنٍ إلّا وفي قلبه نوران: نورُ خيفةٍ ونورُ رجاءٍ، لو وُزن هذا لم يزد على هذا، ولو وُزن هذا لم يزد على هذا﴾.

ترجمہ: راوی کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر صادقؑ سے کہا کہ لقمان کی وصیت کیا تھی؟ حضرتؑ نے فرمایا ''اس میں دلچسپ باتیں تھیں اور اس میں سب سے عجیب بات یہ تھی کہ لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا خدا سے اس طرح ڈرو کہ اگر تم جن وانس کے برابر اطاعت کرے تو تب بھی تم پر عذاب کرے گا، اور خدا سے ایسی امید رکھو کہ اگر جن وانس کے برابر گناہ کرکے آؤ تب بھی تم کو بخش دے گا''۔

اس کے بعد حضرت امام صادقؑ نے فرمایا ''میرے والد ماجد کہا کرتے تھے ہر بندۂ مومن کے دل میں دو نور ہوتے ہیں، خوف کا نور اور امید کا نور، گر اس (میں سے ایک) کو اس کے مقابل میں تولا جائے تو اس کا وزن اس سے زیادہ نہیں ہوگا اور اگر اس (دوسرے نور) کو اس (پہلے والے نور) کے مقابل میں تولا

جائے تو اس کا وزن بھی اس سے زیادہ نہیں ہوگا''۔

شرح جوہری۲ نے اپنی صحاح میں لکھا ہے کہ گویا ''اعاجیب، اعجوبہ'' کی جمع ہے، جیسے ''احادیث، احدوثہ'' کی جمع ہے اور بعض کہتے ہیں ''اعجوبہ'' ہر اس اچھی یا بری چیز کو کہتے ہیں جو تعجب آور ہو۔ اس حدیث میں پہلی (اچھی) چیز مراد ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ ایسی چیز سے مخصوص ہے جس کا حسن تعجب آور ہو، اگرچہ استعمال میں لطافت کے طور پر عام مستعمل ہے۔

اور ''بر'' ''عقوق کے برخلاف ہے۔ ''فلانٌ یبرُّ خالقه'' کا مطلب ہے ''وہ اس (خالق) کی اطاعت کرتا ہے'' جیسا کہ جوہری نے تصریح کردی ہے۔ ''ثقلان'' سے مراد جن وانس ہیں۔

یہ حدیث شریف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ خوف ورجاء دونوں کو درجہ کمال پر ہونا چاہئے اور رحمت الٰہی سے مایوسی اور مکر سے اطمینان یہ دونوں مکمل طور پر ممنوع ہیں۔ چنانچہ بہت سی احادیث کی اس مطلب پر دلالت بھی ہے۳ اور قرآن مجید نے نص بھی موجود ہے۔۴

دوسری چیز یہ ہے کہ ان میں سے کسی کو دوسرے پر فوقیت نہیں ہے۔ خدا نے چاہا تو چند فصلوں کے ضمن میں ہم اس کو اور حدیث کے دیگر مفاہیم کو ذکر کریں گے۔ انشاءاللہ۔

پہلی فصل: عارف انسان کی دو نظریں ہوتی ہیں

جان لو کہ حقائق کے جاننے والے اور ممکن وواجب کے درمیان نسبت سے مطلع انسان کی دو نظریں ہوا کرتی ہیں:

پہلی نظر: اپنے اور تمام ممکنات کے ذاتی نقص اور کائنات کی سیہ روئی پر نظر جو اس کو علماً یا عیناً حاصل ہو جاتی ہے کہ وجود ممکن سر سے پیر تک نقص کی ذلت اور ازل سے ابد تک فقر واحتیاج وامکان کے تاریک سمندر میں ڈوبا ہوا ہے اور خود کسی چیز کا مالک نہیں ہے، ناچیز محض اور بے آبروئے محض ہے، ناقص علی الاطلاق ہے، بلکہ یہ تعبیر بھی اس کیلئے درست نہیں ہے؛ یہ تو تنگی تعبیر وضیق ومجال سخن کی وجہ سے ہے، ورنہ نقص وفقر واحتیاج تو شئے کی فرع ہے۔ اس لیے کہ تمام ممکنات ومخلوقات کے پاس اپنی کوئی چیز نہیں ہے۔ اس نظریے سے اگر تمام عبادات وطاعات، اور عوارف ومعارف کو خداوند قدوس کے سامنے پیش کیا جائے تو پریشانی، شرمندگی اور ذلت وخوف کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ کیسی اطاعت وکیسی عبادت؟ کس کی اور کس

کیلئے؟ تمام حمد وثنا تو خدا کیلئے ہیں۔ ممکن کا اس میں کوئی دخل ہی نہیں ہے، بلکہ ممکن کی دخالت، اظہارِ حمد وثنائے حق میں، نقص عارض کرنے والا ہے۔ اب میں عنانِ قلم کو یہاں سے موڑتا ہوں۔

ارشادِ خداوندی ہے: ﴿ما أصابک من حسنةٍ فمن اللّٰه وما أصابک من سیئةٍ فمن نفسک﴾۵ چنانچہ مقامِ اول میں فرماتا ہے ﴿قل کلٌّ من عند اللّٰه﴾۶

اور شاعر یہاں پر کہتا ہے

پیر ما گفت خطا بر قلم صنع نرفت آفرین بر نظر پاک خطا پوش باد ۷

پیر کا قول تو مقامِ دوم سے متعلق ہے، مگر خود شاعر کا قول مقامِ اول کی طرف اشارہ ہے۔ پس اس نظر میں انسان کو خوف، حزن، شرم اور پریشانی گھیر لیتی ہے۔

دوسری نظر: کمالِ واجب اور بساطِ رحمت اور اس کے لطف و بے انتہا عنایت کی وسعت پر نظر کرنا ہے کہ یہ گوناگوں رحمتوں اور نعمتوں کی بساط جس کا احاطہ ناممکن ومحال ہے، یہ سب اس نے کسی استعداد وقابلیت کا لحاظ کئے بغیر عطا کئے ہیں، بندوں پر ان کے کسی استحقاق کے بغیر اپنے لطف وکرم کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اس کی نعمتیں ابتداء سے ہیں اور بغیر کسی سوال کے ہیں۔ چنانچہ حضرت سید الساجدین زین العابدینؑ نے صحیفہ کاملہ اور دیگر دعاؤں میں باربار اس مطلب کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔۸ یہاں انسان کی امید قوی ہو جاتی اور وہ امید وار رحمتِ حق تک پہنچ جائے گا۔ (وہ تو یہ) کریم ہے جس کا کرم عنایت ورحمت ہے۔ یہ مالک الملوک ہے کہ ہمارے سوال اور ہماری استعداد کے بغیر ہم پر اتنی عنایتیں کی ہیں کہ تمام عقول اس کے تھوڑے سے حصے کا علم نہیں حاصل کر سکتے۔ اہلِ معصیت کا عصیان اس کی وسیع مملکت میں کوئی خلل نہیں ڈال سکتا اور اہلِ طاعت کی اطاعت اس میں کوئی اضافہ نہیں کرسکتی، بلکہ اس ذاتِ مقدس کا ہدایت کے رستوں کا بتانا اور عصیان سے روکنا اس کی کرم نوازی اور رحمت ونعمت کی بخشش ہے اور مقاماتِ کمال ومدارج کمالیہ تک پہنچنے اور نقص، برائی سے بچنے کا وسیلہ ہے۔

لہذا اگر ہم اس کی بارگاہِ عزت وجلال اور بارگاہِ رحمت وکمال میں جا کر عرض کریں

بارالہا! تو نے ہم کو لباسِ ہستی پہنایا، اور ہمارے لئے تصور کرنے والوں کے تصور سے زیادہ حیات ورحمت کے اسباب ووسائل پیدا کئے، تمام ہدایت کے راستے ہمیں دکھائے اور یہ تمام عنایتیں ہمارے مفاد میں اور نعمت ورحمت کو پھیلانے کیلئے تھیں، اب ہم تیرے دارِ کرامت میں، تیری بارگاہِ عظمت وسلطنت میں،

دونوں جہاں کے گناہ لیے ہوئے آئے ہیں اور (ہم جانتے ہیں) گناہ گاروں کے گناہ نہ تیری عظمت کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ تیری حکومت میں خلل پیدا کر سکتے ہیں، یہ مٹھی بھر مٹی تیری عظمت وجلالت کے مقابلے میں کسی شمار کے قابل نہیں ہے اس کے ساتھ تو رحمت وعنایت کے سوا کیا کرے گا؟ کیا تیری بارگاہ سے رحمت کے علاوہ کسی اور چیز کی توقع کی جا سکتی ہے؟

پس انسان کو ہمیشہ ان دونوں نظروں میں مقید رہنا چاہیے، نہ اپنے نقص اور نہ ہی بندگی میں کوتاہی اور قصور کی طرف سے چشم پوشی کرنی چاہیے اور نہ ہی وسعت رحمت اور لطف الٰہی ونعمت وعنایات الٰہی کے شامل ہونے سے مایوس ہونا چاہیے۔

دوسری فصل، عبادت خدا سے ممکن کی عاجزی

اے عزیز! یہ جان لو کہ "خوف" و "رجاء" کے مراتب ودرجات ہیں اور یہ مراتب بندوں کی معرفت وحالات کے مراتب کے اعتبار سے ہیں۔ چنانچہ عوام کا خوف عذاب سے ہے اور خواص کا خوف عتاب سے ہے اور اخص خواص کا خوف احتجاب (حجاب) سے ہوتا ہے۔ اس وقت تو میں اس کی شرح کے درپے نہیں ہوں۔ سابقہ مطلب کے سلسلے میں جو کچھ بھی ہے اس کو دوسرے بیان کے ساتھ ذکر کروں گا۔

پس جان لو کہ دنیا کی کوئی مخلوق خدا کی عبادت، جیسی کی جانی چاہیے ویسی نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ عبادت کا مطلب اس ذات مقدس کے مقام کی حمد وثنا ہے اور ہر شخص کی ثنا اس کی معرفت کے اعتبار ہی سے ہوتی ہے اور چونکہ بندوں کے دست آرزو اس کی معرفت ذات کی عزت وجلال سے درحقیقت کوتاہ ہیں لہذا اس کے جمال وجلال کی ثنا بھی نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اشرف مخلوقات و عرف موجودات مقام ربوبیت کے سلسلے میں اعتراف عجز وقصور کرتے ہوئے فرماتے ہیں ﴿ما عبدناک حق عبادتک وما عرفناک حق معرفتک﴾ ۹ "ہم نے تیری عبادت ایسی نہیں کی جو اس کا حق بنتا ہے اور نہ ہی تجھے ایسا پہچانا جس کا حق ہونا چاہیے"۔ اس حدیث میں دوسرا جملہ پہلے جملے کی علت ہے، نیز فرمایا ﴿أنت کما اثنیت علیٰ نفسک﴾ ۱۰!

پس یہ ذاتی قصور ممکن الوجود کا حق ہے اور ذاتی برتری مخصوص ہے، ذات کبریہ جل جلالہ کیلئے اور چونکہ بندے ذات مقدس کی عبادت وثنا سے عاجز ہیں اور معرفت وبندگی حق کے بغیر کوئی بھی بندہ مقامات عالیہ

اور مدارج اخرویہ تک نہیں پہنچ سکتا اور یہ بات اپنی جگہ پر علمائے آخرت کے نزدیک دلیلوں سے ثابت ہے۔ (البتہ) عوام اس سے غافل ہیں اور اخروی مدارج کو افواہ یا فواہ کی، منہ کوئی بات سمجھتے ہیں ﴿تعالی اللہ عن ذلک علواً کبیراً﴾۔ اس لئے خداوند عالم نے اپنے عام فضل و کرم اور رحمت وسعہ کی بنا پر ملائکہ و انبیاء کی غیبی تعلیمات اور وحی و الہام کے ذریعے ان کے سامنے اپنی رحمت کا دروازہ اور عنایتوں کا دریچہ کھول دیا اور وہ عبادت و معرفت کا دروازہ ہے۔ خدا نے اپنے بندوں کو اپنی عبادت کا طریقہ سکھایا اور معرفت کا راستہ دکھایا تا کہ لوگ حتی الامکان اپنا نقصان دور کر سکیں اور تحصیل کمال کر سکیں اور نور بندگی کے پرتو سے عالم کرامت حق اور روح و ریحان و جنت نعیم تک ہدایت حاصل کر سکیں، بلکہ رضائے الٰہی عظیم تک پہنچ سکیں

پس عبادت و عبودیت کے دروازے کو کھولنا بہت بڑی نعمت ہے کہ تمام مخلوقات جس کے مرہون منت ہیں اور اس نعمت کا شکریہ نہیں ادا کر سکتے، بلکہ ہر شکر ایک ایسے باب کرامت کے کھولنے کے مترادف ہے جس کے شکر سے انسان عاجز ہے۔ اب اگر انسان کو اس روش کا علم ہو گیا اور اس کا دل اس پر مطلع ہو گیا تو وہ خود ہی اپنی کوتاہی کا اعتراف کر لے گا اور اگر جن و انس ملائکہ مقربین کی (عبادت کے برابر) عبادت (بھی) بارگاہ خداوندی میں لے جائے تب بھی خائف و مقصر رہے گا، نیز حق کے عارف بندے اور اس کے اولیائے خاص کہ جن کے سامنے (قضا و) قدر کا ایک راز بھی منکشف ہو گیا اور ان کا دل نور معرفت سے روشن ہو گیا تو ان کا دل خوف سے اس طرح لرزتا اور ان کا قلب اس طرح مضطرب رہتا ہے کہ اگر تمام عبادات ان کے پاس جمع ہو جائیں اور تمام معارف کی کنجی ان کے ہاتھوں میں دیدی جائے اور ان کے دل تجلیات سے مالا مال ہو جائیں پھر بھی نہ ذرہ برابر ان کا خوف کم ہوگا اور نہ تزلزل میں کمی آئے گی چنانچہ انہی عرفا میں سے ایک کہتا ہے "سب لوگ انجام سے ڈرتے ہیں اور میں ابتدا سے ڈرتا ہوں"۔!! ﴿سبحان اللہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ﴾ خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ خدا جانتا ہے کہ اس کلام سے انسان کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا چاہئے اور اس کا دل پگھل جانا چاہئے اور اسے صحرا کی طرف بھاگ جانا چاہئے "افسوس" انسان کتنا غافل ہے

دوسرے یہ کہ میں نے اس سے پہلے بھی ایک حدیث۲ کی شرح کرتے ہوئے عرض کیا ہے کہ ہماری ساری عبادتیں و طاعتیں صرف اپنی غرض کے حصول کیلئے ہوتی ہیں اور ہمارا محرک "حب نفس" ہوتا ہے اور

درحقیقت دنیا کا زہد آخرت کیلئے ہوتا ہے اور یہ آزاد لوگوں کے نزدیک ایسا ہی ہے کہ جیسے دنیا کا زہد صرف دنیا کیلئے کیا جائے۔ پس اگر دونوں جہان کی عبادتوں کو بھی خداوند قدوس کے سامنے لے جائیں تو اس سے پروردگار عالم سے دوری کے علاوہ کسی اور چیز کا استحقاق ہم کو حاصل نہ ہوگا۔ خداوند عالم نے ہم کو اپنے بارگاہ انس کے قریب بلایا ہے اور ﴿خلقتک لأجلي﴾[۱۳] کہہ کر ہماری غرض تخلیق کو اپنی معرفت قرار دیا ہے۔ معارف کے راستوں اور عبودیت کی راہوں کی نشاندہی کی ہے، لیکن اس کے باوجود ہم اپنے پیٹ بھرنے اور جنسی خواہشات کی تکمیل کے علاوہ کسی چیز کے بارے میں سوچتے ہی نہیں اور خودغرضی وخود پسندی کے علاوہ ہمارا کوئی مقصد ہی نہیں ہے!

لہذا اے بے چارے انسان تیری عبادت ومناسک تجھ کو ساحت مقدس سے دور کر کے مستحق عتاب وعقاب بنا دیتی ہیں۔ (آخر) تو کس پر اعتماد کرتا ہے؟ شدت خوف خدا نے تجھ کو بے آرام کیوں نہیں کیا، تیرا دل خون کیوں نہیں ہوگیا، کیا کوئی بھروسے کی چیز رکھتا ہے، کیا تو اپنے اعمال پر وثوق واطمینان رکھتا ہے؟ اگر یہ ہے تو تیرے حال پر وائے ہو اور تیری اپنی ذات اور مالک الملوک کی معرفت کی حالت پر وائے ہو! (ہاں!) اگر خدا کے فضل وکرم اور اس کے مقدس ذات کی وسیع رحمتوں اور عام عنایتوں پر امید رکھتا ہے تب تو بالکل صحیح فیصلہ کیا ہے اور قابل اطمینان مقام پر بھروسہ کیا ہے اور مستحکم اور مضبوط جائے پناہ حاصل کی ہے۔

اے پروردگار! ہمارے ہاتھ ہر چیز سے کوتاہ ہیں۔ ہم خود جانتے ہیں کہ ہم ناقص وناچیز اور تیری بارگاہ کے لائق نہیں ہیں، اور نہ تیری بارگاہ قدس کے لائق کچھ رکھتے ہیں، سر سے پیر تک نقص اور خامیوں سے پر ہیں، ہمارا ظاہر وباطن گناہوں، ہلاک اور تباہ وبرباد کرنے والی چیزوں سے بھرا ہے۔ ہم کیا ہیں جو تیرے لئے اظہار ثنا کریں جہاں پر تیرے اولیا کہتے ہیں ﴿أبلساني الكالّ هذا أشكرك﴾[۱۴] ''کیا اس زبان قاصر سے تیرا شکریہ ادا کروں'' اور جہاں پر تیرے اولیا اپنے ضعف وقصور کا اعتراف کریں وہاں ہم گنہگاروں اور ساحت کبریا سے محجوب کیا کہہ سکتے ہیں؟ صرف لقلقۂ زبان سے یہی تو عرض کر سکتے ہیں ہم تیرے رحم وکرم کے امیدوار ہیں، ہماری امید اور ہمارا بھروسہ تیرے فضل وکرم اور تیری عفو وبخشش اور جود وکرم پر ہے، جیسا کہ تیرے اولیا کے زبانوں پر جاری ہے۔

في الكافي، بإسناده عن أبي جعفر الباقر عليه السلام قال:

قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم: قال الله تبارك وتعالى: ﴿لا يتكل العاملون لي على أعمالهم التي

يعملونها لثوابي، فإنهم لو اجتهدوا وأتعبوا أنفسهم۔ أعمارهم۔ في عبادتي كانوا مقصرين غير بالغين في عبادتهم كنه عبادتي فيما يطلبون عندي من كرامتي والنعيم في جناتي ورفيع الدرجات العلى في جواري، ولكن برحمتي فليثقوا، وبفضلي فليفرحوا، وإلى حسن الظن بي فليطمئنوا، فإن رحمتي عند ذلك تدركهم، ومني يبلغهم رضواني، ومغفرتي تلبسهم عفوي فإني أنا الله الرحمن الرحيم، وبذلك تسميت﴾[۱۵]

کافی میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ رسول خداؐ نے فرمایا خداوند تعالیٰ کا ارشاد ہے "میرے لئے عمل کرنے والے جو عمل مجھ سے ثواب حاصل کرنے کیلئے کرتے ہیں اس (عمل) پر بھروسہ نہ کریں۔ اس لئے کہ اگر وہ ساری عمر میری عبادت کریں اور اپنے نفسوں کو تکلیف میں ڈالیں اور (بھرپور) کوشش کریں تب بھی وہ میری عبادت کا حق ادا نہیں کر سکتے اور نہ ہی وہ اپنی عبادت کے ذریعے میری حقیقی عبادت تک پہنچ سکتے، کیونکہ وہ (ان عبادتوں کے ذریعے) میرے فضل و کرم، میری جنت کی نعمتوں اور میرے جوار میں اعلیٰ درجات کے طالب ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کو چاہئے میری رحمت پر بھروسہ کریں، میرے فضل کی امید کریں اور مجھ سے حسن ظن رکھ کر مطمئن ہوں، کیونکہ اس طرح میری رحمت ان کو پالے گی اور میرا احسان ان کو میری رضا تک پہنچا دے گا اور میری مغفرت ان کو میرا (لباس) عفو پہنا دے گی۔ میں وہ اللہ ہوں جو رحمان و رحیم ہے اور اسی سے میرا نام لیا جاتا ہے"۔

اسی طرح اسباب خوف میں سے خدا سے ڈر کی شدت راہ آخرت پر سلوک کی سختی، زندگی کے دوران اور موت کے وقت پیش آنے والے خطرات، برزخ و قیامت کی سختیوں اور حساب و میزان کے وقت تخت حساب و کتاب پر غور و خوض کرنا ہے۔ اگر ان آیات و احادیث کو دیکھا جائے جو حمد کے وعدوں پر مشتمل ہیں تو پھر پوری امید ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حدیث بیان کرنے والوں نے بیان کیا ہے کہ قیامت کے دن خدا اپنی بساط رحمت کو اس طرح پھیلائے گا کہ شیطان کو بھی مغفرت کی طمع ہونے لگے گی۔[۱۶]

بحسب روایت خداوند عالم نے اس عالم کو جب سے خلق فرمایا ہے اس پر نظر رحم نہیں ڈالی اور نہ اس میں رحمت نازل کی، بس دوسرے عوالم کے مقابلے میں ایک ذرے کے برابر نظر فرمائی ہے اور یہ تمام نعمت و رحمت الٰہی، فضل و بخشش حضرت باری سر سے پیر تک سب کو گھیرے ہوئے ہے اور تمام وہ چیزیں جو پیدا ہیں یا ناپیدا، سب عطا و نعمت الٰہی کا ایسا دسترخوان ہے کہ اگر تمام دنیا والے اس کی نعمت و رحمت کے ایک ذرے کا

احاطہ کرنا چاہیں تو ناممکن ہے، تو پھر اس عالم کا کیا حال ہوگا جو عالم کرامت ہے اور الٰہی مہمانخانہ ہے اور جائے رحمت اور رحیمیت و رحمانیت کا مقام ہے! یہاں اگر شیطان رحمت کی طمع، و رعطا کی امید کرے تو اس کو حق حاصل ہے۔ لہذا تم بھی اپنے حسن ظن کو خدا کے سلسلہ میں کامل کرو اور اس کے فضل پر بھروسہ کرو ﴿إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا﴾ ۸۔ "خدا تمام گناہوں کو بخش دیتا ہے" اور سب کو اپنے بحر عطا و رحمت میں غرق کر دیتا ہے اور خدا کے وعدے میں خلاف نہیں ہے۔ ہاں! وعید میں تخلف ممکن ہے، بلکہ بہت واقع ہوا ہے۔ لہذا اس کی رحمت کاملہ پر اطمینان کرکے دل کو خوش کرو۔ اگر خدا کی رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتی تو تم پیدا نہ ہوتے، ہر مخلوق پر خدا کا رحم و کرم ہے۔ ﴿وَسِعَتْ رَحْمَتُهُ كُلَّ شَيْءٍ﴾ ۔۹

تیسری فصل: رجا و غرور کا فرق

لیکن میرے عزیز رجا اور غرور کے فرق کی طرف متوجہ رہو! ممکن ہے تم اہل غرور (دھوکہ) سے ہو اور گمان کرتے رہو کہ اہل رجا سے ہو اس کی تمیز اس کی بنیادوں کے اعتبار سے آسان ہے۔ تم یہ دیکھو کہ جو حالت تمہارے یہاں پیدا ہوئی ہے اور جس کی وجہ سے تم اپنے کو امیدوار رحمت سمجھتے ہو یہ حالت حق تعالیٰ کے احکام میں سستی کرنے کی وجہ سے اور حق تعالیٰ اور اس کے اوامر کو حقیر سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے یا ذات پروردگار عالم کی وسیع رحمت و عظمت پر عقیدہ رکھنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے؟ اب اگر اس کی بھی تمیز مشکل ہے تو آثار کے ذریعے فرق معلوم کرنا ممکن ہے۔ اگر خدا کی عظمت دل میں ہو اور اس ذات مقدس کی رحمت اور عطا اس کے دل پر محیط ہو تو وہ اطاعت و عبودیت کیلئے آمادہ ہو سکتا ہے، کیونکہ منعم و عظیم کی عبادت و تعظیم ناقابل انکار فطری امر ہے۔

لہذا اگر تم بندگی کے وظائف کی انجام دہی اور طاعت و عبادت میں جد و جہد باقاعدہ کرو، اپنے اعمال پر بالکل بھروسہ نہ کرو، و اعمال کو ہیچ سمجھتے ہوئے رحمت حق اور فضل و عطائے پروردگار پر (بھرپور) بھروسہ رکھو، اپنے اعمال کی وجہ سے اپنے کو ہر ملامت و مذمت کا مستحق سمجھو، غضب و ناراضگی (خدا) کا مستحق مانو، جو دطلق خلاق کی رحمت اور جود پر تکیہ کرو تب مقام "رجا" کے مالک ہو گے پھر خدا کا شکر کرو اور اس کی ذات مقدس سے دعا کرو کہ اس امید رحمت کو تمہارے دل میں محکم و مضبوط کر دے، و اس سے بلند مقام تجھ کو عنایت کرے۔

اور اگر تم نے خدانخواستہ اوامر الٰہی کے بارے میں سستی برتی اور اس کو ناچیز و بے اہمیت سمجھا تو یہ "غرور" اور دھوکہ ہے جو تمہارے دل میں پیدا ہوا ہے اور یہ تمہارے نفس امارہ اور شیطان کی مکاریوں میں سے ہے۔ اگر خدا کی رحمت و عظمت کی وسعت پر تمہارا ایمان ہوتا تو تمہارے اندر اس کا کچھ تو اثر نمایاں ہوتا۔ جس شخص کا عمل اس کے دعویٰ کے خلاف ہے وہ خود ہی اپنے کو جھٹلانے والا ہے۔ احادیث معتبر میں اس کلام کے شواہد بہت ہیں۔

فَفِي الْكَافِي بِاسْنَادِهِ عَنِ ابْنِ أَبِي نَجْرَانَ عَمَّنْ ذَكَرَهُ عَنْ أَبِي عَبْدِاللهِ عليه السلام قَالَ: قُلْتُ لَهُ: قَوْمٌ يَعْمَلُونَ بِالْمَعَاصِي وَيَقُولُونَ نَرْجُو، فَلَا يَزَالُونَ كَذَلِكَ حَتَّى يَأْتِيَهُمُ الْمَوْتُ. فَقَالَ: هَؤُلَاءِ قَوْمٌ يَتَرَجَّحُونَ فِي الْأَمَانِيِّ، كَذَبُوا لَيْسُوا بِرَاجِينَ، إِنَّ مَنْ رَجَا شَيْئاً طَلَبَهُ وَمَنْ خَافَ مِنْ شَيْءٍ هَرَبَ مِنْهُ ﴿۲۰﴾

راوی کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا "کچھ لوگ گناہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں ہم (رحمت حق) پر امید رکھتے ہیں اور مرتے وقت تک ایسا ہی کرتے اور کہتے رہتے ہیں۔ حضرتؑ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو اعتدال سے بے جا آرزوؤں کی طرف مائل ہو گئے ہیں، یہ جھوٹے ہیں، امید نہیں رکھتے۔ اگر کوئی کسی چیز کی امید رکھتا ہے تو اس کا طالب (بھی) ہوتا ہے اور جو کسی سے ڈرتا ہے اس سے بھاگتا ہے"۔

اسی روایت کے قریب المضمون، کافی شریف کی ایک دوسری روایت بھی ہے

وَبِاسْنَادِهِ عَنِ الْحَسَنِ بْنِ أَبِي سَارَةَ قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا عَبْدِ اللهِ عليه السلام يَقُولُ: لَا يَكُونُ الْمُؤْمِنُ مُؤْمِناً حَتَّى يَكُونَ خَائِفاً رَاجِياً، وَلَا يَكُونُ خَائِفاً رَاجِياً حَتَّى يَكُونَ عَامِلاً لِمَا يَخَافُ وَيَرْجُو ﴿۲۱﴾

راوی کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر صادقؑ کو فرماتے ہوئے سنا "مومن اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک خوفزدہ و پر امید نہ ہو اور خوفزدہ و پر امید اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس چیز کو بجا نہ لائے جس سے خوف کھاتا ہے اور جس کی امید رکھتا ہے"۔

بعض نے فرمایا ہے "جو شخص عمل نہیں کرتا اور رحمت رب کی امید اور رجا کرتا ہے اس کی مثال اس شخص کی ہے جو اسباب مہیا کئے بغیر مسبب کے انتظار میں بیٹھا ہو"[۲۲] جیسے وہ کسان جو بیج بوئے بغیر یا زمین کی دیکھ بھال اور آبپاشی کئے بغیر اور رکاوٹوں کو دور کئے بغیر فصل کٹنے کے انتظار میں بیٹھا رہے، اس کو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ امید رکھتا ہے، بلکہ اس کو کہا جاتا ہے کہ وہ احمق اور بے وقوف ہے۔ اسی طرح جو شخص اخلاق کو

درست نہ کرے یا گناہوں سے نہ بچے اور عمل کرے اس کی مثال اس شخص کی ہے جو شمکوار زمین میں زراعت کرے بظاہر ہے ایسی زراعت مطلوبہ نتیجہ نہیں دے گی۔

پس محبوب و مستحسن رجا یہ ہے کہ انسان اپنے تمام ان اسباب کو جو اس کے قبضہ میں ہیں اور خدا نے اپنی قدرت کاملہ سے اس کو عطا فرمائے ہیں اور اصلاح و فساد کے تمام طریقوں کی جو اس کو ہدایت فرمائی ہے اور ان کے مہیا کرنے کا حکم دیا ہے، ان سب کو استعمال کرے اس کے بعد یاس و امید لگائے کہ جو اسباب اس کی طاقت سے باہر ہیں خدا اپنی سابقہ عنایتوں کی طرح ان کو فراہم کرے گا اور تمام رکاوٹوں اور خرابیوں کو دور کرے گا۔

بس (اسی طرح) اگر بندہ اپنے دل کو برے اخلاق کے کانٹوں اور گناہوں کی کنکریوں اور سیم وتھور سے پاک کرکے اس میں اعمال کے بیج بوئے گا اور علم نافع وایمان خالص کے صاف شفاف پانی سے آبپاشی کرے گا اور عجب وریا وغیرہ جیسی گھاس کے مانند ہیں جو زراعت کی رشد ونما میں رکاوٹ بنتی ہے ان جیسے مفسدات وموانع سے عمل کو خالص رکھے گا اور اس کے بعد فضل خدا کے انتظار میں بیٹھے گا تب خدا اس کو ثابت (محفوظ) رکھے گا اور اس کا خاتمہ بالخیر کرے گا اور یہ رجا مستحسن ہے، جیسا کہ قرآن نے کہا ہے ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَةَ اللّٰهِ﴾ ۲۳ "جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور خدا کی راہ میں جہاد کیا وہی رحمت الٰہی کی امید رکھنے (کا حق) رکھتے ہیں"۔

چوتھی فصل۔ خوف ورجا کے موازنہ کی علت

اس حدیث شریف کے ذیل میں مذکور ہے، خوف ورجا کو ایک دوسرے پر ترجیح نہیں دینا چاہئے۔ جیسا کہ یہی مضمون ابن ابی عمیر کے اس خبر میں بھی پایا جاتا ہے جو امام صادقؑ ہی سے مروی ہے۔ ۲۴

انسان جب اپنے کمال نقص اور فرائض عبودیت کی کوتاہی کو دیکھتا ہے اور راہ آخرت کی سختی وتنگی میں غور کرتا ہے تو اس کے اندر اعلیٰ درجے کا خوف پیدا ہو جاتا ہے اور جب اپنے گناہوں کو دیکھتا ہے اور لوگوں کے حالات میں غور وفکر کرتا ہے کہ ان کی حالت ابتدا میں اچھی تھی لیکن انجام میں بے ایمان اور بے عمل ہو کر گئے اور برائیوں اور بدیوں میں مبتلا ہوئے تو اس کے اندر خوف شدید پیدا ہو جاتا ہے۔

کافی شریف میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے

﴿الْمُؤمِنُ بَيْنَ مَخَافَتَيْنِ ذَنْبٍ قَدْ مَضىٰ لا يَدْرِي مَا صَنَعَ اللّٰهُ فِيهِ، وَعُمْرٍ قَدْ بَقِيَ لا يَدْرِي مَا يَكْتَسِبُ فِيهِ مِنَ الْمَهَالِكِ فَهُوَ لا يُصْبِحُ الَّا خَائِفاً وَلا يُصْلِحُهُ الَّا الْخَوْفُ﴾ ۲۵؎ ''مومن دو خوف کے درمیان ہے۔ (ایک تو) ان گناہوں کا خوف جو ماضی میں کیئے تھے جن کے بارے میں معلوم نہیں ہے کہ خدا نے اس کے بارے میں کیا کیا؟ (دوسرے) اس عمر کے بارے میں جو باقی ہے ور معلوم نہیں اس میں کتنی ہلاکت خیز چیزوں کا ارتکاب کرے گا؟ پس اس کی ہر صبح خوف کے ساتھ ہوتی ہے اور خوف کے علاوہ کوئی دوسری چیز اس کی اصلاح نہیں کر سکتی''۔ کافی میں حضرت رسول خدا ؐ کا جو خطبہ حضرت امام صادق سے منقول ہے وہ بھی اسی مضمون کا ہے۔ ۲۶؎

مختصر یہ کہ انسان انتہائے نقص و تقصیر کے درجے پر ہے اور خدا انتہائے کمال وعظمت اور جلالت و وسعت وعطا کے درجے پر ہے۔ اور بندہ ان دونوں نظروں کے درمیان خوف ورجا کے نقطۂ اعتدال پر ہے اور چونکہ اسمائے جلالیہ و جمالیہ یکساں قلب سالک پر جلوہ گر ہوتے ہیں اس لئے خوف ورجا ایک دوسرے پر ترجیح پیدا نہیں کر پاتے۔

بعض نے فرمایا ہے کہ ''بعض اوقات انسان کیلئے خوف نفع بخش ہے، جیسے صحت وسلامتی کی حالت میں انسان کسب کمال اور عمل صالح کی کوشش کرے مگر بعض حالات میں رجا بہتر ہے، جیسے موت کی علامتیں ظاہر ہونے کے بعد تاکہ انسان خدا سے ایسی حالت میں ملاقات کرے جو خدا کے نزدیک محبوب تر ہے'' ۲۷؎ مگر یہ قول سابق گفتگو اور حدیثوں کے مطابق نہیں ہے۔ اس لئے کہ پسندیدہ رجا بھی عمل و کسب آخرت پر ابھارنے والا ہے اور خوف خدا ہمیشہ پسندیدہ ہے اور رجا و شوق کے منافی نہیں ہوا کرتا۔

بعض حضرات نے کہا ہے ''خوف عالم آخرت میں نفسانی فضائل اور عقلی کمالات میں سے نہیں ہے اور صرف دنیا میں جو مقام عمل ہے عبادات کی انجام دہی اور گناہوں سے بچنے کیلئے یہ فائدہ مند امور میں سے ہے، اور دنیا سے نکل جانے کے بعد اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے، اس کے برعکس رجا کبھی منقطع ہونے والی چیز نہیں ہے یہ آخرت میں بھی باقی ہے، کیونکہ بندہ رحمت حق سے جتنا زیادہ مستفید ہوگا فضل حق کیلئے اس کی طمع بڑھتی ہی رہے گی، کیونکہ رحمت الٰہی کا خزانہ کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔ پس (نتیجہ یہ نکلا کہ) خوف ختم ہونے والی اور رجا باقی رہنے والی چیز ہے'' ۲۸؎

محدث محقق مجلسی ؒ ۲۹؎ فرماتے ہیں ''حق یہ ہے کہ بندہ جب تک دنیا میں رہتا ہے اس کیلئے خوف

ورجا ضروری ہے لیکن امور آخرت کے مشاہدے کے بعد کسی ایک کا دوسرے پر رجحان بہر حال پیدا ہو جاتا ہے"۔[۳۰]

راقم الحروف عرض کرتا ہے: "عالم آخرت میں خوف ورجا کے غلبے کے بارے میں علما نے جو کچھ فرمایا وہ رجا کے ذکر کردہ معنی کے مطابق نہیں ہے اور اگر بالفرض صحیح مان بھی لیا جائے تو اس کا تعلق متوسطین سے ہے جن کا خوف ورجا ثواب وعقاب کی بنا پر ہوتا ہے۔ لیکن خواص اور اولیا کا حال اس کے ماسوا ہے، جس کا علما نے ذکر کیا ہے، کیونکہ عظمت وجلال اور تجلی اسمائے سے اور لطف وجمال کے مشاہدے سے قلب میں جو خوف ورجا پیدا ہوتا ہے وہ امور آخرت کو دیکھنے کے بعد بھی زائل نہیں ہوتا اور نہ ایک دوسرے پر ترجیح پیدا کرتا ہے، بلکہ آثار جلال وعظمت وتجلیات جمال ولطف، عالم آخرت میں زیادہ ہوتا ہے اور عظمت حق سے جو خوف لاحق ہوتا ہے وہ ایک روحانی لذت ہے جو آیہ کریمہ ﴿ألا انّ أولياء اللّٰه لا خوف عليهم ولا هم يحزنون﴾[۳۱] "آگاہ ہو جاؤ! اولیائے خدا کو حزن وخوف نہیں ہوتا" کے منافی نہیں ہے۔ چنانچہ اگر آپ غور کریں تو معلوم ہو جائے گا اور قائل سے جو یہ نقل کیا گیا ہے کہ خوف فضائل نفسیہ میں سے نہیں ہے، اس کا مطلب جلال وعظمت الٰہی کا خوف نہیں ہے، کیونکہ اس قسم کا خوف کمال ہوتا ہے اور کامل ومکمل لوگوں میں یہ دوسروں سے زیادہ پایا جاتا ہے۔

والحمد لله على جماله وجلاله

والصلاة على محمد وآله

توضیحات (۱۴)

۱۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۶۷، کتاب ایمان و کفر، باب خوف و رجاء، حدیث ۱۔

۲۔ اسماعیل بن حماد جوہری (۳۳۲۔۳۹۳ یا ۳۹۸) اہل لغت اور ادیبوں کے پیشوا ہیں۔ علم اصول میں بھی متبحر تھے۔ بو علی فارسی اور ابو سعید سیرافی سے شاگردی حاصل کی تھی۔ الصحاح ان کی مشہور کتاب لغت ہے۔

۳۔ بحار الانوار، ج ۷۰، کتاب ایمان و کفر، باب ۵۹، حدیث ۲۸، ۳۹، ۴۶، ۷۱، ۲ وغیرہ

۴۔ سورۂ اعراف/۱۹۹، سورۂ یوسف/۸۷۔ سورۂ زمر/۵۳، سورۂ حجر/۵۶

۵۔ جو بھی تم کو پہنچتا ہے وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو بدی پہنچتی ہے وہ تمہاری طرف سے ہوتی ہے۔ سورۂ نساء/۷۹۔

۶۔ (اے رسولؐ) کہہ دیجیے سب خدا کی طرف سے ہے۔ سورۂ نساء/۷۸۔

۷۔ یہ بیت حافظ شیرازی کا ہے۔

۸۔ صحیفۂ سجادیہ کے بارہویں دعا میں ہے: "اس لئے کہ تیرے تمام احسان تیری طرف سے تیرا فضل و کرم ہیں کیونکہ تیری تمام نعمتیں بغیر کسی استحقاق کے ہیں"۔ دعائے صحیفۂ سجادیہ ۳۲ میں عبارت ہے: "چون حمد تیرے ہی لئے ہے اس لئے کہ بڑی نعمتوں کا آغاز تو نے فرمایا"۔

مفاتیح کی دعائے ابوحمزہ اور دوسری دعاؤں مثلاً دعائے عرفات وغیرہ میں اس مضمون کی نظیر موجود ہے۔

۹۔ مرآۃ العقول، ج ۸، ص ۱۳۹، کتاب ایمان و کفر، باب شکر۔

۱۰۔ "تو اسی طرح ہے جس طرح تو نے اپنی تعریف کی ہے"۔ رسول خداؐ کی وہ دعا جو سجدے میں پڑھا کرتے تھے۔ فروع کافی، ج ۳، ص ۳۲۴، کتاب الصلوٰۃ، باب السجود، حدیث ۱۲، مصباح الشریعہ، باب ۵، مرآۃ العقول، ج ۸، ص ۱۳۹، کتاب ایمان و کفر، باب شکر

۱۱۔ یہ کلام خواجہ عبداللہ انصاری کی مناجات میں سے ہے کہ فرمایا سب خاتمہ (و نبی م) سے ڈرتے ہیں اور عبداللہ ابتدا سے۔

۱۲۔ حدیث ۲، فصل ۵۔

۱۳۔ حدیث قدسی میں ہے: فرزند آدم میں نے تمام چیزوں کو تیرے لئے پیدا کیا ہے مگر تجھ کو اپنے لئے۔ علم الیقین، ج ۱، ص ۳۸۱، باب ۵، فصل ۳

۱۴۔ کیا اس قاصر زبان سے تیری تعریف کر سکتا ہوں؟

دعاء ابو حمزہ ثمالی، مصباح کفعمی، فصل ۴۵، ص ۵۹۶، مصباح المتہجد، ص ۵۳۴۔

۱۵۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۷۲، کتاب ایمان و کفر، باب حسن الظن باللہ، حدیث

۱۶۔ امام صادق ؑ نے فرمایا جب قیامت کا دن ہوگا خداوند تبارک وتعالیٰ اپنی رحمت کو نشر کرے گا یہاں تک کہ ابلیس بھی اس کی رحمت کی طمع کرنے لگے گا۔ بحار الانوار، ج ۷، ص ۲۸۷، کتاب عدل ومعاد، باب ۱۴، حدیث ۱۔

۱۷ جیسا کہ روایت میں آیا ہے ﴿فما لها عند الله عزّوجلّ قدرٌ ولا وزنٌ، ولا خلق فيما بلغنا خلقاً أبغض إليه منها، ولا نظر إليها مذ خلقها﴾ خداوند عالم کے نزدیک دنیا کی نہ کوئی قدر ہے، اور نہ اس کا کوئی وزن ہے۔ پروردگار عالم نے جن مخلوقات کو پیدا کیا ہے ان میں سے جیسا کہ ہم کو اطلاع ملی ہے دنیا سے زیادہ خدا کے نزدیک کوئی شی مبغوض نہیں ہے اور خدا نے جب سے دنیا کو پیدا کیا ہے اس کی طرف نظر (رحمت) نہیں کی۔

بحار الانوار، ج ۷۰، ص ۱۱۰، کتاب ایمان و کفر، باب ۱۲۲، حدیث ۱۰۹۔

۱۸۔ سورۂ زمر، آیت/۵۳۔

۱۹ یہاں آیۂ شریفہ سے اقتباس کیا گیا ہے ﴿واكتب لنا في هذه الدنيا حسنة وفي الآخرة إنا هدنا إليك قال عذابي أصيب به من أشاء ورحمتي وسعت كلّ شيء﴾ ہمارے لئے اس دنیا میں حسنہ مقدر فرما اور آخرت میں (بھی) ہم نے تیری طرف ہدایت حاصل کی ہے فرمایا میرا عذاب جس کو میں چاہوں گا اسی کو پہنچے گا (مگر) ہماری رحمت ہر چیز پر وسیع ہے۔ سورۂ اعراف، آیت/۱۵۶۔

۲۰۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۶۸، کتاب ایمان و کفر، باب خوف و رجاء، حدیث ۵۔

۲۱۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۷۱، کتاب ایمان و کفر، باب خوف و رجاء، حدیث ۱۱۔

۲۲۔ احیاء علوم الدین، ج ۴، ص ۳۹، کتاب ایمان و کفر، باب خوف و رجاء، بحث حقیقت رجاء۔

۲۳ سورۂ بقرہ، آیت/۲۰۸

۲۴ ۲۵ اصول کافی ج ۲، ص ۷۱، کتاب ایمان و کفر، باب خوف و رجاء، حدیث ۱۳ و ۲۔

۲۶ اصول کافی ج ۲ ص ۷۰، کتاب ایمان و کفر باب خوف و رجاء، حدیث ۹۔

۲۷ احیاء علوم الدین، ج ۴، ص ۱۹۳، کتاب خوف و رجاء اسرار الصلوۃ (مکی تبریزی) ص ۱۹۳، ۱۹۴۔

۲۸۔ مرآۃ العقول، ج ۸، ص ۳۴، کتاب ایمان و کفر، باب خوف و رجاء، حدیث ۱۔ علامہ مجلسی ؒ نے اس کلام کو بعض راویوں سے نقل کیا ہے

۲۹۔ حدیث ۱، حاشیہ ۱۴۔

۳۰ مرآۃ العقول، ج ۸، ص ۳۲، کتاب ایمان و کفر، باب خوف و رجاء، حدیث ۱۔

۳۱ بیشک اولیاء اللہ (دوستان خدا) کیلئے نہ کوئی خوف ہے نہ غم ہے۔ سورۂ یونس، آیت ۶۲

پندرہویں حدیث

بِسَنَدِنا المُتَّصِلِ إلى سُلطانِ المُحَدِّثين مُحَمَّدِ بنِ يَعقُوبَ الكُلَيني رِضوانُ اللهِ عليه عَن عليِّ بنِ إبراهيم، عَن أبيه، عن ابنِ محبوب، عن سماعة، عن أبي عبدِ الله عليه السلام قال:

﴿إنَّ في كِتابِ عَليٍّ عليه السلام إنَّ أشَدَّ النّاسِ بَلاءً النَّبِيُّونَ ثُمَّ الوَصِيُّونَ ثُمَّ الأمثَلُ فالأمثَلُ، وإنَّما يُبتَلَى المُؤمِنُ عَلى قَدرِ أعمالِهِ الحَسَنَةِ، فَمَن صَحَّ دينُهُ وحَسُنَ عَمَلُهُ اشتَدَّ بَلاؤُهُ، وَذلِكَ أنَّ اللّهَ تَعالى لَم يَجعَلِ الدُّنيا ثَواباً لِمُؤمِنٍ وَلا عُقُوبَةً لِكافِرٍ، وَمَن سَخُفَ دينُهُ وضَعُفَ عَقلُهُ، قَلَّ بَلاؤُهُ، وإنَّ البَلاءَ أسرَعُ إلَى المُؤمِنِ التَّقِيِّ مِنَ المَطَرِ إلى قَرارِ الأرضِ﴾

ترجمہ: سماعہ نے حضرت امام صادق علیہ السلام سے نقل کیا ہے کہ آپؑ نے فرمایا

"کتاب حضرت علیؑ میں ہے۔ لوگوں میں سب سے زیادہ سخت امتحان انبیاء کا لیا جاتا ہے، اس کے بعد اوصیا کا، اس کے بعد جو نیک لوگ ہوں پھر جو ان کے بعد نیک ہوں۔ مؤمن اپنے اچھے اعمال کے مطابق مبتلائے امتحان ہوتا ہے۔ پس جس کا دین صحیح اور عمل اچھا ہو اس پر سخت بلا نازل ہوگی، (امتحان سخت ہوگا)، کیونکہ خدا نے مؤمن کیلئے دنیا کو ثواب اور کافر کیلئے عقوبت نہیں قرار دیا ہے اور جس کا دین اچھا نہ ہوگا اور اس کی عقل کم ہوگی اس پر بلا بھی کم نازل ہوگی۔ پرہیزگار مؤمن پر بلا اتنی تیزی سے آتی ہے جتنی تیزی سے بارش (کا پانی) نشیبی زمین تک نہیں پہنچتا"۔

شرح: بعض نے فرمایا ہے کہ اس حدیث میں "ناس" سے مراد کامل حضرت ہیں، جیسے انبیاء و وصی

واوصیا ؑ درحقیقت یہی حضرات ناس ہیں اور ان کے علاوہ تمام لوگ ''نسناس'' ہیں، جیسا کہ حدیثوں میں ہے۔[۱] مگر اس کی کوئی وجہ نہیں ہے، لہذا یہاں پر مناسب یہی ہے کہ تمام لوگوں کو مراد لیا جائے اور اس کی وجہ بھی واضح ہے۔ کافی میں اس باب کے اندر جو حدیثیں ہیں ان سے بھی یہی استفادہ ہوتا ہے اور اگر کسی حدیث میں آیا ہو کہ ناس سے کاملین مراد ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جہاں بھی یہ لفظ آئے وہاں کاملین مراد ہوں۔

''بلا'' کے معنی امتحان وخبردار کرنے کے ہیں اور یہ نیک وبد دونوں کیلئے ہوتی ہے، جیسا کہ اہل لغت نے تصریح کی ہے۔ چنانچہ جوہری[۲] نے صحاح میں کہا ہے ﴿والبلاء، الاختبارُ یکونُ بالخیرِ والشّرِّ یُقالُ أبلاهُ اللهُ بلاءً حسناً وابتلاهُ معرُوفاً﴾ بلا کے معنی اختبار کے ہیں جو خیر وشر دونوں کے ساتھ ہوتا ہے''پھر مثال بیان کی ہے۔ خداوند عالم کا بھی ارشاد ہے ﴿بلاءً حسناً﴾[۳] ''مستحسن امتحان''۔ مختصر یہ ہے کہ جس چیز سے خدا اپنے بندے کا امتحان لے اس کو بلا اور ابتلا کہتے ہیں، چاہے وہ از قسم بیماری ہو یا فقر وفاقہ یا ذلت ورسوائی ہو یا دنیا کا منہ موڑ لینا ہو یا ان کے مقابل کی چیزیں ہوں۔ اس لیے کہ بسا اوقات انسان کا امتحان کثرت جاہ، اقتدار، کثرت مال ومنال، ریاست وعزت وعظمت سے بھی ہوتا ہے، لیکن جب بھی ''بلا یا مبیہ یا بتلا'' یا اس قسم کے الفاظ کا مطلق ذکر ہو تو اس سے قسم اول مراد ہوا کرتی ہے۔

''امثل'' کے معنی اشرف وافضل کے ہیں۔ کہا جاتا ہے ﴿هذا اَمثَلُ من هذا، أي أفضلُ وأدنى الى الخیرِ﴾ ''یہ اس سے افضل ہے اور خیر سے قریب ہے''۔ ''اماثل الناس'' یعنی لوگوں میں افضل وبرتر وہی ہے جو ان میں سے اچھا ہوں۔ لہذا ﴿ثُمّ الأمثلُ فالأمثلُ﴾ کا مطلب ہے ہر وہ شخص جو اوصیا کے بعد افضل ونیک ہے اور اس کی بلا بھی دوسروں سے زیادہ سخت ہے اور جو شخص ان کے بعد افضل ہے اس کا امتحان دوسروں سے زیادہ سخت ہے اور کثرت ابتلا فضل وبرتری کے درجات کے حساب سے ہیں اور اس قسم کی تعبیر فارسی میں نہیں ہے۔

اور ''سخف'' عقل کی کمی اور خفت کے معنی میں ہے، جیسا کہ صحاح وغیرہ میں ہے۔

''قرار'' کے معنی مستقر یا جگہ کے ہیں، جیسا کہ لغت سے پتہ چلتا ہے۔ (چنانچہ) قاموس میں ہے ﴿القرارُ والقرارةُ ما قُرَّ فیه، وَالمُطمئنُّ من الارضِ﴾[۴] اس میں وجہ مناسبت تشبیہ یہ ہے کہ جس طرح بارش کیلئے زمین مستقر یا ٹھہرنے کی جگہ ہے، وہ بارش اس پر برستی اور اس میں سرایت کرتی ہے، اسی طرح

مومن بھی مصائب کی آماجگاہ ہے، مصیبتیں اس پر حملہ آور ہوتیں اور اس کی ذات میں ٹھہر جاتیں اور اس سے جدا نہیں ہوتیں۔ انشاء اللہ اس حدیث شریف میں جن چیزوں کا ذکر ضروری ہے، اس کو چند فصلوں میں بیان کروں گا۔

پہلی فصل

امتحان اور اسکے نتیجے کی خدا کیطرف نسبت کی وجہ

یہ بات جان لینی چاہیے کہ انسانی نفوس کے تمام ادراکات وافعال شروع میں اور جب اس کا تعلق بدنوں سے ہوتا ہے اور عالم ملک کی طرف بلند ہوتے ہیں تو ان میں تمام علوم ومعارف اور اچھے برے ملکہ بالقوۃ موجود ہوتے ہیں، پھر رفتہ رفتہ پروردگار عالم کی عنایت سے فعلیت کی طرف آنے لگتے ہیں اور شروع میں اس کے اندر بہت ہی کمزور اور جزئی ادراکات پیدا ہوتے ہیں، جیسے احساس لمس اور دوسرے ظاہری حواس۔ لیکن پہلے پست پھر اس سے بھی پست قسم کے حواس سے ابتدا ہوتی ہے، اس کے بعد باطنی ادراکات بھی بالترتیب اس میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن یہ سب ملکات بالقوۃ ہی ہوتے ہیں اور اگر یہ کسی (معقول چیز) کے زیر اثر نہ ہوئے تو اپنی نوع کے اعتبار سے ملکات خبیثہ اس کے اندر غالب ہو جاتے ہیں اور یہ برائی اور بے ہودگی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں، کیونکہ داخلی اسباب، مثلاً شہوت، غضب وغیرہ فطری طور سے اس کو فسق وفجور اور ظلم وزیادتی کی دعوت دیتے ہیں اور پھر انسان تھوڑے ہی دنوں میں ان خواہشات کی پیروی کرنے کے بعد عجیب قسم کا حیوان اور بدترین قسم کا شیطان بن جاتا ہے۔

مگر چونکہ عنایت ورحمت خداوند عالم بنی آدم کیلئے روز اول سے ہی تھی اس لیے اس نے دو قسم کے مربی اور تہذیب سکھانے والے انسان کیلئے عطا فرمائے اور یہ دونوں چیزیں انسان کیلئے تقدیر کامل کے ساتھ بمنزلہ دو بال وپر کے ہیں کہ اگر انسان چاہے تو ان کے ذریعے جہالت ونقص اور برائی وشقاوت کی پستی سے نکل کر علم ومعرفت اور کمال وجمال وسعادت کی بلندی تک پہنچ جائے اور اپنے کو فطرت کی تنگ وادی سے نکال کر ملکوت کے اعلیٰ اور وسیع فضا تک پہنچا دے اور ان دونوں مربیوں میں سے ایک مربی باطنی ہے جس کو قوت عقل وتمیز کہا جاتا ہے اور دوسرا مربی خارجی ہے جس کو نبی ورسول کہا جاتا ہے جو سعادت وشقاوت کے راستوں کی رہنمائی کرتے ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر اس مقصد کو انجام نہیں دے سکتے، کیونکہ انسانی عقل خود سعادت وشقاوت کے راستوں کو تلاش نہیں کر سکتی اور عالم غیب وآخرت کا راستہ نہیں پیدا

کر سکتی (اسی طرح) قوت تمیز اور عقل و ادراک کے بغیر انبیاءؑ کی ہدایت و رہنمائی مؤثر نہیں ہوا کرتی۔ لہٰذا خداوند عالم نے دونوں قسم کے (خارجی اور داخلی) مربی مرحمت فرما کر نفوس کے اندر چھپی ہوئی محفوظ قوتوں اور صلاحیتوں کو تربیت بخشی اور ان عظیم نعمتوں کو حق تعالیٰ نے انسان کے امتحان و آزمائش کیلئے عطا فرمایا، اس لیے کہ نوع بشر کے افراد انہیں دونوں قوتوں سے ایک دوسرے سے ممتاز ہوتے اور شقی و سعید، مطیع و عاصی، کامل و ناقص ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔ جیسے کہ مولائے کائناتؑ فرماتے ہیں ﴿وَالَّذِي بعثهُ بِالحقِّ لَتُبلبلُنَّ بلبلةً ولتُغربلُنَّ غربلةً﴾ ۷ ''اس خدا کی قسم جس نے رسولؐ کو برحق مبعوث کیا تم لوگ یقیناً آپس میں ملادیئے جاؤ گے اور ایک دوسرے سے جدا کیے جاؤ گے''۔

اور کافی شریف میں باب تمحیص و امتحان کے اندر ابن ابی یعفورؒ کی حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے۔ ﴿لابُدَّ لِلنَّاسِ مِنْ أَنْ يُمَحَّصُوا وَيُمَيَّزُوا وَيُغَرْبَلُوا وَيُسْتَخْرَجُ فِي الغِرْبالِ خَلْقٌ كَثِيرٌ﴾ ۸ حضرت نے فرمایا ''لوگوں کا خالص ہونا اور ان کا امتحان لیا جانا اور بہت سے لوگوں کا چھلنی سے چھان کر صاف کیا جانا اور تمیز دیا جانا ضروری ہے''۔

وباسناده عن منصور قال قال لي أبو عبدالله عليه السلام ﴿يا منصورُ إنَّ هذا الأمرَ لا يأتيكم إلّا بعد إياسٍ ولا والله حتّى تُميَّزوا، ولا والله حتّى تُمحَّصوا، ولا والله حتّى يشقى من يَشقى ويسعد من يسعدُ﴾ ۹

منصورؒ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا کہ مجھ سے امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: ''اے منصور! یہ امر بہت مایوسی کے بعد عمل میں آئے گا، نہیں خدا کی قسم یہاں تک کہ تم لوگوں کو ایک دوسرے سے تمیز دیدی جائے، نہیں خدا کی قسم یہاں تک کہ تم لوگ خالص ہو جاؤ، نہیں خدا کی قسم یہاں تک کہ شقی ہونے والا شقی اور سعید ہونے والا سعید (ثابت) ہو جائے''۔

ایک دوسری حدیث میں حضرت ابوالحسن، امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے منقول ہے کہ حضرتؑ نے فرمایا ﴿يُخلَّصُون كما يُخلَّصُ الذَّهبُ﴾ ۱۰ ''یہاں تک کہ لوگ اسی طرح خالص ہو جائیں، جیسے سونا خالص ہو جاتا ہے''۔

اور کافی شریف کے ''باب ابتلا و اختبار'' میں حضرت امام صادقؑ تک سند روایت پہنچی ہے، اس میں ہے ﴿ما من قبضٍ ولا بسطٍ إلّا ولله مشيئةٌ وقضاءٌ وابتلاءٌ﴾ ۱۱ ''کوئی بھی قبض و بسط (وجود

میں) نہیں" تا جب تک اس کے بارے میں قضا و ابتلا و مشیت الٰہی (محقق) نہ ہو جائے"۔

حضرتؑ سے ایک دوسری حدیث میں منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا ﴿اِنَّهُ لَيْسَ شَيْءٌ فِيهِ قَبْضٌ اَوْ بَسْطٌ مِمَّا اَمَرَ اللّٰهُ اَوْ نَهَى عَنْهُ اِلَّا وَفِيهِ لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ ابْتِلَاءٌ وَقَضَاءٌ﴾ [۱۲] "خدا کی طرف سے منع کیے جانے والی یا حکم دیے جانے والی اشیا میں کوئی چیز ایسی نہیں جس میں کسی قسم کی ممانعت یا عطا ہو مگر یہ کہ اس میں قضا و امتحان الٰہی شامل نہ ہو"۔

"قبض" کے معنی لغت میں روکنے، منع کرنے اور سمیٹنے کے ہیں اور "بسط" کے معنی پھیلانے اور عطا کے ہیں۔ ہر عطا و وسعت، ہر ممانعت اور ہر قسم کا امر و نہی اور ذمہ داری یہ سب امتحان کیلئے ہوتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بعثت انبیاءؑ اور آسمانی کتابوں کا بھیجنا انسانوں کے درمیان فرق کے ظہور، نیز شقی و سعید، نافرمان و فرمان بردار کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کیلئے ہے اور خدا کے امتحان و آزمائش کا مطلب یہی ہے کہ انسان میں ایک دوسرے کے اندر تمیز پیدا ہو جائے، ان کے درمیان فرق کا علم نہیں، اس لیے کہ خدا کا علم تو تمام اشیا پر محیط ہے اور ازلی ہے اور چیزوں کے ایجاد سے پہلے سے ہے۔ البتہ حکما نے ابتلا و امتحان کے سلسلے میں کافی بسط و تفصیل سے بحث کی ہے جس کا ذکر مبحث (اعتدال) سے خارج ہے۔

پس مطلقاً امتحان کے یہی دو بڑے نتیجے ہیں، (الف) شقی و سعید میں امتیاز اس امتحان و آزمائش سے بھی خدا کی حجت تمام مخلوق پر تمام ہو جاتی ہے اور ہر شخص کی ہلاکت و شقاوت، سعادت و حیات حجت و دلیل کے ماتحت ہوتی ہے اور پھر اعتراض کا راستہ ختم ہو جاتا ہے۔ (ب) جو شخص سعادت ابدی اور حیات جاوید حاصل کر لے وہ ہدایت پر ہے اور توفیق الٰہی اس کے شامل حال ہے، کیونکہ تمام اسباب تحصیل (سعادت) اس کو مرحمت فرما دیے گئے ہیں اور جو شخص تمام ہدایت کے راستوں کے فراہم اور اسباب سعادت کے اکٹھا ہونے کے بعد شقاوت و (اسباب) ہلاکت حاصل کرے اور نفس و شیطان کی پیروی کرے وہ اپنی مرضی سے ہلاک ہوا اور شقاوت و بدبختی میں ڈوب گیا، خدا کی حجت ہر طرح اس پر تمام ہے ﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾ [۱۳]

دوسری فصل

انبیاءؑ، اوصیا اور مومنین کے شدید ابتلا کی وجہ

اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے [۱۴] کہ انسان جو کام کرتا ہے، بلکہ ملک بدن میں جو بھی ہوتا ہے اور وہ

نفس کے ادراک سے متعلق ہو خواہ وہ اچھا کام ہو یا برا اس کا نفس پر ایک اثر مرتب ہوتا ہے جس کی تعبیر روایت میں "سفید نقطہ" اور "سیاہ نقطہ" سے کی گئی ہے۔ لہٰذا چاہے وہ چیز لذت والی ہو یا درد و الم والی ہو، مثلاً کھانے، پینے، نکاح وغیرہ سے انسان کو جو لذت حاصل ہوتی ہے اس سے نفس کے اندر ایک اثر پیدا ہوتا ہے، اور باطن روح میں اس چیز کیلئے لگاؤ اور محبت پیدا ہو جاتی اور نفس کی توجہ اس کی طرف زیادہ ہوتی ہے۔ اب انسان لذتوں اور خواہشوں میں جتنا غوطہ زن ہوگا نفس کی محبت اس دنیا سے زیادہ ہوگی اور اعتماد و بھروسہ بڑھے گا اور نفس کی تربیت تعلق دنیا سے بہت زیادہ ہو جائے گی اور وہ اس لگاؤ کا عادی بن جائے گا۔ اب جتنی زیادہ اس کے ذائقہ کی لذت ہوگی اتنی ہی محبت کی جڑیں اور مضبوط ہوں گی۔ اسباب عیش و عشرت اور آرام جتنے زیادہ فراہم ہوں گے دنیا سے لگاؤ کا درخت اتنا ہی تنومند ہوگا اور نفس کی توجہ جتنی دنیا کی طرف ہوگی اسی مقدار سے وہ حق تعالیٰ اور عالم آخرت سے غافل ہوگا۔ چنانچہ اگر نفس کی پوری توجہ دنیا کی طرف ہوگی اور اس کا مقصد مادی اور دنیوی ہو جائے گا تو حق تعالیٰ اور اس کے دار کرامت سے بالکل اس کی توجہ ہٹ جائے گی ﴿أخلد الى الأرض واتبع هواه﴾[۱] "زمین کی طرف جھکے گا (پستی میں گرے گا) اور خواہش نفس کا پیرو ہو جائے گا"۔

یہ لذتوں اور خواہشوں کے سمندر میں ڈوبنا فطری طور سے محبت دنیا پیدا کرتا ہے اور دنیا کی محبت دوسری چیزوں سے نفرت کا باعث بن جاتی ہے اور ملک کی طرف توجہ ملکوت سے غفلت پیدا کر دیتی ہے۔ چنانچہ اس کے برعکس انسان کسی چیز سے برائی دیکھتا اور ناپسندیدگی کا احساس کرتا ہے تو اس درک کی صورت نفس کے اندر ایک نفرت پیدا کر دیتی ہے۔ اب وہ صورت جتنی قوی ہوگی باطنی نفرت بھی اس قدر شدید ہوگی، مثلاً اگر کوئی ایسے شہر میں چلا جائے جہاں وہ بیماروں اور مصیبتوں میں مبتلا ہو جائے اور اندرونی اور بیرونی ناموزوں حرارت سے دچار ہو جائے تو وہ فطری طور سے اس جگہ سے نفرت کرے گا اور وہاں مزید قیام کرنے کا ارادہ ترک کر دے گا۔ اب مصائب جتنے زیادہ پڑے ہوں گے نفرت و بیزاری اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ اب اگر اس کو کسی اچھے شہر کا پتہ ہوگا تو وہاں کوچ کر جائے گا اور اگر وہاں نہ جا سکتا ہو تو (کم سے کم) اس جگہ سے دل لگاؤ صرور ہوگا اور اس کا دل وہیں لگا رہے گا۔

اس طرح اگر انسان نے اس دنیا میں مصیبت و تکلیف، بیماری اور مشکلات برداشت کی ہے، فتنوں، مشقتوں سے برابر پالا پڑتا رہا تو فطرتاً اس دنیا سے متنفر ہو جائے گا اور اس سے محبت بھی کم ہو جائے گی اور پ

بھروسہ کم رکھے گا۔ (اسی کے ساتھ) اگر دوسرے عالم کا عقیدہ رکھتا ہوگا اور کسی وسیع فضا کا سراغ رکھتا ہوگا جو ہر تکلیف والم سے خالی ہو تو فطری طور سے وہاں کا سفر کرے گا اور اگر جسمانی سفر نہ کر سکا تو روحانی سفر کرے گا اور وہاں سے دل لگا بیٹھے گا اور یہ بات بہت ہی واضح ہے کہ تمام عملی، اخلاقی اور روحانی خرابیاں دنیا کی محبت اور آخرت و خدا سے غفلت کی بنا پر پیدا ہوتی ہیں اور دنیا کی محبت ہر خطا کی بنیاد ہے بجا (اس لیے) تمام روحانی، اخلاقی و عمالی اصلاح، خدا اور دار کرامت کی طرف توجہ اور دنیا سے بے تعلقی اور اس کی زیبائش پر بھروسہ نہ کرنے پر (موقوف) ہے۔

اس تمہید سے یہ معلوم ہو گیا کہ خدا کا فضل و کرم و اس کی عنایت جس پر زیادہ ہوتی ہے اس ذات مقدس کا رحم جس کے شامل حال ہوتا ہے وہی اس دنیا و اس کی زیبائش سے پرہیز کرتا ہے اور فتنے اور بلائیں بھی اسی شخص پر زیادہ نازل ہوتی ہیں تاکہ اس کی روح اس دنیا و اس کی زیبائش سے نفرت کرنے لگے اور اپنے ایمان کے مطابق آخرت کی طرف متوجہ ہو اور اس کا دل بھی ادھر ہی متوجہ ہو جائے۔ حضرت کیلئے اگر اس کے علاوہ کوئی اور وجہ نہ ہوتی تب بھی یہ کافی تھی۔ حدیث شریف میں بھی اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔ چنانچہ (کافی میں) امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا ﴿إنّ اللّه تعالی ليتعاهد المؤمن بالبلاء كما يتعاهد الرّجلُ أهلهُ بالهديّة من الغيبة، ويحميه الدّنيا كما يحمي الطّبيبُ المريض﴾ ۱۸ ”خدا اپنے بندہ مومن کو بلاؤں کا تحفہ اس طرح پیش کرتا ہے جس طرح سفر سے پلٹ کر آنے والا اپنے (اہل) وعیال کیلئے سوغات لاتا ہے اور دنیا سے اس کو اس طرح پرہیز کراتا ہے جس طرح طبیب اپنے مریض کو پرہیز کراتا ہے۔“

دوسری حدیث میں بھی یہی مضمون آیا ہے ۱۹ کسی کو یہ گمان نہ کرنا چاہئے کہ خدا کی اپنے بعض بندوں سے محبت و بھرپور عنایت، نعوذ باللہ، خواہ مخواہ اور بلا وجہ ہوا کرتی ہے، بلکہ مومن و بندۂ خدا جو قدم بھی خدا کیلئے اٹھاتا ہے خدا کی عنایت اس کی طرف ہوتی ہے اور خدا اس سے ایک بالشت قریب ہو جاتا ہے۔ ۲۰

ایمان کے مراتب اور اسباب توفیق کے مہیا ہونے کی مثال اس انسان کی طرح ہے جو تاریک راستے میں چراغ لے کر چلتا ہو، وہ جو قدم بھی اٹھائے گا اس کا اگلا حصہ روشن ہو جائے گا اور وہ دوسرے قدم کیلئے رہنما ہوگا (اسی طرح) انسان آخرت کیلئے جو قدم اٹھائے گا اس کا راستہ روشن ہو جائے گا، پروردگار کی عنایت اس کیلئے زیادہ ہوگی، عالم قرب کے اسباب اور عالم بعد سے نفرت پیدا ہوتی جائے گی، چونکہ

ذمہ داریاں نبھانے کے دوران انبیاءؑ واولیا کی طرف سے اطاعت کا علم خدا کو ازل سے ہی تھا اس لیے ان حضرات کے ساتھ خدا کی ازل سے عنایتیں بھی تھیں۔ جیسے اگر آپ کے دو بچے ہوں اور آپ کو ان کے بچپنے ہی میں معلوم ہو جائے کہ ایک ہمیشہ ایسا کام کرے گا جو آپ کی خوشنودگی کا سبب ہوگا اور دوسرا ہمیشہ ایسے امور انجام دے گا جو آپ کی ناراضگی کا سبب ہوں گے تو فطری طور سے آپ کی عنایت (وتوجہ) مطیع لڑکے کی طرف زیادہ رہے گی۔

خدا کے خاص بندوں کے مبتلائے مصیبت ہونے کی ایک دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ جب یہ لوگ پریشانیوں اور مشکلات میں ہوتے ہیں تو بارگاہ قدس الٰہی میں تضرع وزاری اور مناجات کرتے ہیں، اس طرح ذکر وفکر سے مانوس ہو جاتے ہیں اور انسانی فطرت کے اندر یہ بات ہے کہ مصیبتوں کے وقت ہر اس چیز کا سہارا لینے کی کوشش کرتا ہے جس سے نجات کا احتمال ہو، (حالانکہ) سلامتی اور راحت کے وقت اس سے غافل رہتا ہے اور چونکہ خاصان خدا پروردگار کے علاوہ کسی اور کو سہارا نہیں مانتے لہٰذا اسی کی طرف متوجہ ہوتے اور دنیا سے قطع تعلق کر کے صرف اسی سے وابستگی پیدا کرتے ہیں اور خدا بھی ان لوگوں پر عنایت کرتا ہے اور خلق سے لاتعلقی کے اسباب پیدا کر دیتا ہے۔ اگرچہ یہ وجہ اور اس سے پہلے والی وجہ (دونوں) انبیاءؑ اور کامل اولیا کے سلسلہ میں درست نہیں ہے، کیونکہ ان حضرات کا مرتبہ اس سے کہیں بلند ہے اور ان کے قلوب ایسے نہیں ہیں کہ ان امور کے ذریعے دنیا سے لگاؤ اور تعلق پیدا کریں یا ان امور کی وجہ سے ان کی توجہ یا لاتعلقی میں کوئی فرق پڑ سکتا ہو۔

یہ بھی ممکن ہے کہ انبیاءؑ اور کامل اولیا اپنے باطنی نور اور روحانی مکاشفات کی بنا پر جانتے ہیں کہ خدا دنیا و زیبائش دنیا کی طرف نظر لطف نہیں رکھتا اور دنیا و مافیہا خدا کی مقدس نظر میں پست و ذلیل ہے۔ اس بنا پر ان حضرات نے فقر کو غنا پر، ابتلا کو راحت پر اور بلیات کو دوسری چیزوں پر مقدم کیا ہے اور احادیث شریفہ میں اس کا ثبوت بھی ہے۔[۲۱] چنانچہ حدیث میں ہے، جبرئیلؑ زمین کے خزانوں کی کنجیاں لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر بولے گر آپؐ ان کو قبول کریں تو آپؐ کے اخروی درجات میں کوئی کمی نہیں ہوگی، مگر رسول اکرمؐ نے خدا کے سامنے فروتنی کا اظہار کرتے ہوئے قبول نہ فرمایا اور فقر کو اختیار فرمایا۔[۲۲]

کافی شریف میں حدیث کی سند امام جعفر صادق علیہ السلام تک پہنچائی گئی ہے کہ جس میں آپؑ سے منقول

ہے کہ ﴿إنّ الكافر ليهُونُ على الله حتى لوْ سألهُ الدُّنيا بما فيها أعطاهُ ذلك﴾ ۲۳ "کافر خدا کی نظر میں ناچیز ہے، یہاں تک کہ اگر وہ دنیا و مافیہا کا سوال کرے تو خود اس کو دیدے گا" اور یہ صرف خدا کی نظر میں دنیا کی بے وقعتی کی وجہ سے ہے۔ ایک حدیث میں ہے "خدا نے جب سے عالم اجسام کو پیدا کیا ہے اس کی طرف کبھی نظر کرم سے نہیں دیکھا ہے"۔ ۲۴

مؤمنین کے شدت ابتلا کی وجہ یہ بھی ہے جس کا ذکر روایت میں ہے کہ "مؤمنین کیلئے درجات ہیں اور جب تک وہ بلاؤں اور آلام و امراض میں مبتلا نہ ہوں گے ان درجات کو حاصل نہ کر سکیں گے"۔ ۲۵ اب ہوسکتا ہے کہ یہ درجات دنیا سے روگردانی اور خدا کی طرف توجہ کی صورت میں حاصل ہوں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان بلاؤں کی ایک ملکوتی صورت ہو کہ جب تک عالم ملک میں اس کا ظہور نہ ہو اور مؤمن اس میں مبتلا نہ ہو اس کو حاصل نہ کرسکتا ہو۔ جیسا کہ کافی میں حدیث شریف کی سند حضرت امام صادق تک پہنچائی گئی ہے کہ جس میں امام سے منقول ہے ﴿إنّهُ ليكُونُ للعبد منزلةٌ عند الله فما ينالُها إلّا باحدى الخصلتين، إمّا بذهاب ماله أو ببليّة في جسده﴾ ۲۶ آپ نے فرمایا "تحقیق خدا کے پاس بندے کی منزلت ہوتی ہے جس کو وہ دو صورتوں میں سے کسی ایک صورت سے حاصل کرسکتا ہے یا اس کا مال چلا جائے یا اس کے جسم پر کوئی مصیبت نازل ہو جائے"۔

امام حسین علیہ السلام کی خبر شہادت کے سلسلے میں آیا ہے کہ آپ نے رسول خدا کو خواب میں دیکھا کہ رسول خدا نے مظلوم امام سے فرمایا "تمہارے لیے بہشت میں ایک درجہ ہے جس تک رسائی صرف شہادت ہی کے ذریعہ ہوسکتی ہے"۔ ۲۷

البتہ راہ خدا میں شہادت کی ملکوتی صورت اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک وہ ملک میں واقع نہ ہو جائے۔ جیسا کہ علوم عالیہ میں ثابت ہے اور احادیث متواترہ میں ہے کہ ہر عمل کی دوسرے عالم میں ایک صورت ہے۔ ۲۸

کافی میں حضرت امام صادق سے منقول ہے ﴿إنّ عظيم الأجر لمع عظيم البلاء وما أحبّ الله قوماً إلّا ابتلاهم﴾ ۲۹ آپ نے فرمایا "عظیم اجر عظیم بلا سے وابستہ ہے، خدا کسی قوم کو اس وقت تک دوست نہیں رکھتا جب تک اس کو مبتلا نہ کردے"۔ اس مضمون کی حدیثیں بہت ہیں۔

تیسری فصل

عظیم محدث علامہ مجلسی ؒ فرماتے ہیں: ''ان حدیثوں میں (یعنی سنی و شیعہ طریقے سے وارد ہونے والی وہ حدیثیں جن میں انبیاءؑ کے ابتلا کا ذکر ہے) جو بات بیان کی گئی ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جسمانی امراض اور جسمانی بیماریوں میں انبیاءؑ و اوصیاؑ بھی دوسرے لوگوں کی طرح ہیں، بلکہ یہ حضرات اجر عظیم اور تفاوت درجات کی وجہ سے دوسروں پر فوقیت رکھتے ہیں، مگر ان کا بیماریوں یا بلاؤں میں مبتلا ہونا ان کے عظمت مقام کے منافی نہیں ہے، بلکہ یہ تو ان کے استحکام امر کا سبب بنتا ہے، بلکہ ان سے صادر ہونے والے معجزات اور خارق عادت امور کے ظہور کی وجہ سے اگر ان کو بلاؤں میں مبتلا نہ کیا جائے تو لوگ ان کے بارے میں وہی سب کچھ کہنے لگیں گے جو عیسائی اپنے پیغمبرؑ کے بارے میں کہتے ہیں اور یہ علت خود روایات میں آئی ہے''۔ انتہی[۳۱]

محقق، مدقق اور حکیم عظیم قدوسی (خواجہ نصیر الدین) طوسی (عطّر اللہ مرقدہ) اس بات کے ضمن میں کہ انبیاءؑ کو جن چیزوں سے مبرا ہونا چاہیے اس بارے میں اپنی کتاب ''تجرید'' میں فرماتے ہیں: ''جن چیزوں سے لوگوں کو نفرت ہو (انبیاءؑ کو اس سے بری ہونا چاہیے)''۔ علمائے اسلام کے علامہ (جن کو علامہ حلیؒ کہا جاتا ہے) اس کی شرح میں فرماتے ہیں: ''(انبیاءؑ کو) نفرت آمیز امراض، مثلاً سلسِ بول و غائط، جذام اور برص سے، اس لیے منزہ ہونا چاہیے کہ ان امراض سے لوگوں کو نفرت ہوتی ہے جو غرض بعثت کے مخالف ہے''۔[۳۲]

راقم الحروف کے نزدیک اگرچہ مقام نبوت روحانی مدارج اور نفسانی کمالات کے تابع ہوتا ہے جسم و جسمانیت سے اس کا کوئی ربط نہیں ہوتا اور جسمانی امراض اور جسمانی نقص سے ان کے روحانی کمالات میں کوئی کمی نہیں پیدا ہوتی اور نفرت آمیز بیماریاں انبیاءؑ کے مرتبہ و عظمت کو گھٹا نہیں سکتیں۔ اگر ان چیزوں کو ان کے کمالات کی تاکید نہ بھی تسلیم کیا جائے اور ان کے مؤید درجات نہ بھی مانا جائے تب بھی ان کے مرتبے میں کوئی کمی نہیں ہوتی، جیسا کہ اس سے پہلے اشارہ کیا گیا۔ مگر دونوں محقق نے جو بات کہی ہے وہ بھی خالی از وجہ نہیں ہے، اس لیے کہ عوام الناس ان مقامات کے درمیان تمیز نہیں کر پاتے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جسمانی نقص روحانی نقص کی وجہ سے ہوتا ہے یا (کم از کم) جسمانی نقص روحانی نقص کے ساتھ ہوتا ہے، بلکہ بعض نقائص

کو ان کے علو مرتبہ اور رفعت شان کے منافی سمجھتے ہیں، اس لیے پروردگار عالم کی عنایت کا تقاضا ہے کہ جو انبیاءؑ صاحب شریعت اور مبعوث برسالت ہوں ان کا مبتلا نہ ہونا اس وجہ سے نہیں ہے کہ اس سے مقام نبوت میں نقص پیدا ہو جاتا ہے، بلکہ یہ فائدہ تبلیغ کو مکمل کرنے کیلئے ہے، لہذا اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ بعض ایسے انبیاءؑ جو صاحب شریعت نہ ہوں وہ ان امراض میں مبتلا ہو جائیں اور بڑے بڑے اولیاء و مومنین بھی اس قسم کی بلاؤں میں گرفتار ہوئے ہیں۔ چنانچہ حضرت ایوبؑ، جناب حبیب نجارؒ (وغیرہ) مبتلا ہوئے۔

حضرت ایوبؑ کے سلسلے میں تو بہت سی روایات ہیں کہ وہ مبتلا ہوئے تھے۔ مثلاً تفسیر علی بن ابراہیم میں ابوبصیرؒ کے حوالے سے امام جعفر صادقؑ کا ایک بہی حدیث کے سلسلے میں فرمان ہے ﴿فسلطه على بدنه ما خلا عقلهُ وعينيه فنفخ فيه ابليسُ فصار قرحةً واحدةً من قرنه الى قدمه فبقي في ذلك دهراً طويلاً يحمدُ الله ويشكرُهُ حتى وقع في بدنه الدُّودُ وكانت تخرُجُ من بدنه فيردُّها ويقولُ لها ارجعي الى موضعك الّذي خلقك الله منه ونتن حتى اخرجهُ اهلُ القرية من القرية والقوهُ في المزبلة خارج القرية﴾ ۳۵ ''خداوند عالم نے ابلیس کو جناب ایوبؑ کے پورے جسم پر عقل و آنکھوں کو چھوڑ کر مسلط کر دیا۔ ابلیس نے ان کے جسم میں ایک پھونک ماری جس سے سر سے لے کر پیر تک پھوڑا ہو گیا اور جناب ایوبؑ ایک طویل مدت تک اسی طرح رہے اور حمد و شکر الٰہی بجا لاتے رہے یہاں تک کہ ان کے بدن میں کیڑے پڑ گئے اجب وہ کیڑے بدن سے گر پڑتے تھے تو حضرت ایوبؑ اسے اٹھا کر اسی جگہ جسم میں رکھ کر فرماتے تھے اسی جگہ واپس جاؤ جہاں سے خدا نے تم کو پیدا کیا ہے (یہاں تک کہ) ان کے جسم سے (ایسی) بدبو پیدا ہو گئی کہ ان کے گاؤں والوں نے وہاں سے نکال کر ان کو گاؤں کے باہر کوڑے پھینکنے کی جگہ پر پھینک دیا''۔

وفي الكافي باسناده عن ابي بصير، عن ابي عبدالله عليه السلام قال قلت له ﴿فاذا قرأت القرآن فاستعذ بالله من الشّيطان الرّجيم ☆ انّهُ ليس لهُ سُلطانٌ على الّذين آمنوا وعلى ربّهم يتوكّلون﴾ ۳۶ کافی میں ابوبصیرؒ کے حوالے سے امام صادقؑ کی روایت ہے، ابوبصیر کہتے ہیں کہ میں نے امامؑ سے عرض کیا ''(قول خدا ہے) جب قرآن پڑھو تو شیطان رجیم سے خدا کی پناہ مانگ لو، تحقیق شیطان کو مومنین اور خدا پر بھروسہ کرنے والوں پر کوئی اختیار نہیں ہے'' فقال ''﴿يا ابا محمّد يُسلّط

واللهِ مَا المُؤمِنِ عَلىٰ بَدَنِهِ وَلا يُسَلَّطُ عَلىٰ دِينِهِ، قَدْ سُلِّطَ عَلىٰ أَيُّوبَ فَشَوَّهَ خَلْقَهُ وَلَمْ يُسَلَّطْ عَلىٰ دِينِهِ، وَقَدْ يُسَلَّطُ مِنَ المُؤمِنِينَ عَلىٰ أَبْدانِهِمْ وَلا يُسَلَّطُ عَلىٰ دِينِهِمْ﴾[۳۷] امامؑ نے فرمایا "اے ابو محمد! خدا کی قسم شیطان مؤمن کے جسم پر مسلط ہوسکتا ہے مگر اس کے دین پر مسلط نہیں ہوسکتا۔ شیطان کو حضرت ایوبؑ کے جسم پر مسلط کیا گیا تھا اس نے ان کے جسم کو بدصورت بنا دیا تھا لیکن ان کے دین پر مسلط نہیں کیا گیا۔ (اسی طرح) کبھی مؤمنین کے جسموں پر مسلط کر دیا جاتا ہے مگر ان کے دین پر مسلط نہیں کیا جا سکتا"۔

وبإسناده عن ناجية، قال: قُلْتُ لأبِي جَعْفَرٍ علیہ السلام ﴿إنَّ المُغِيرَةَ يَقُولُ إنَّ المُؤمِنَ لا يُبْتَلىٰ بِالجُذامِ وَلا بِالبَرَصِ وَلا بِكَذا وَلا بِكَذا، فَقالَ: إنْ كانَ لَغافِلاً عَنْ صاحِبِ ياسِينَ إنَّهُ كانَ مُكَنَّعاً، ثُمَّ رَدَّ أَصابِعَهُ، فَقالَ: كَأَنِّي أَنْظُرُ إلىٰ تَكْنِيعِهِ، أَتاهُمْ فَأَنْذَرَهُمْ ثُمَّ عادَ إلَيْهِمْ مِنَ الغَدِ، فَقَتَلُوهُ، ثُمَّ قالَ: إنَّ المُؤمِنَ يُبْتَلىٰ بِكُلِّ بَلِيَّةٍ وَيَمُوتُ بِكُلِّ مِيتَةٍ إلاّ أَنَّهُ لا يَقْتُلُ نَفْسَهُ﴾[۳۸] ناجیہؓ سے روایت ہے کہ میں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے عرض کیا۔ "مغیرہ کہتا ہے مؤمن کبھی جذام، برص اور فلاں فلاں بیماری میں مبتلا نہیں ہوسکتا۔ حضرتؑ نے فرمایا یقیناً وہ حبیب نجار کے حوالے سے غافل ہے صاحب یاسین (حبیب نجار) کو تکنیع (جذام) تھا پھر ان کی انگلیاں ٹھیک ہوئیں، حضرتؑ نے کہا گویا میں ان کی انگلیوں کے تشنج کو دیکھ رہا ہوں۔ حبیب نجار (اپنی قوم کے پاس) آئے اور ان کو خدا سے ڈرایا، دوسرے دن پھر آ کر ڈرایا تو ان لوگوں نے ان کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد آپؑ نے فرمایا مؤمن ہر بلا میں مبتلا ہوسکتا ہے اور ہر قسم کی موت مر سکتا ہے مگر وہ خود اپنے کو قتل نہیں کر سکتا"۔

"صاحب یاسین" حبیب نجار ہیں اور "تکنیع" جو "نون" کے ساتھ اکثر نسخوں میں آیا ہے اس کا مطلب بنا بر قول علامہ مجلسیؒ "تشنج و شلل" ہونے کے ہیں۔ علامہ مجلسیؒ فرماتے ہیں "گویا جذام کی وجہ سے ان کی انگلیوں میں تشنج پیدا ہو گیا تھا"۔[۳۹] اس قول میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔

ان احادیث اور ان کے علاوہ دوسری حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤمنین و انبیاءؑ کبھی کسی مصلحت کی بنا پر نفرت آمیز امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ ان روایت کے مقابلے میں دوسری روایتیں بھی ہیں جن میں حضرت ایوبؑ کی شکل بگڑنے اور ان کے بدن شریف میں بدبو پیدا ہونے کی بھی نفی کی گئی ہے۔[۴۰] ان روایت کو ذکر کرنے اور دونوں میں جمع کرنے کی کوشش کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہے سوائے

بحث کو طول دیتے ہے۔ مختصر یہ کہ اس قسم کی امراض نہ مؤمنین کیلئے مضر ہیں اور نہ ان سے انبیاءؑ میں کوئی نقص پیدا ہوتا ہے، بلکہ یہ بلندی مقام اور علو مرتبہ کا سبب بنتے ہیں، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

چوتھی فصل۔ دنیا دار ثواب وعقاب نہیں ہے

یہ بات معلوم ہونا چاہئے کہ اس دنیا کے اندر جو نقص وقصور، ضعف (وکمی) ہے اس کی وجہ سے نہ یہ خداوند عالم کا دار کرامت وجائے ثواب بن سکتی ہے اور نہ ہی یہ محل عذاب وعقاب بننے کی صلاحیت رکھتی ہے، کیونکہ خدا کا دار کرامت وہ عالم ہے جس میں صرف نعمت ہی نعمت ہوگی اور اس میں عذاب کا تصور تک نہ ہوگا۔ جس میں صرف راحت ہی راحت ہوگی رنج وتعب کا شائبہ بھی نہ ہوگا اور اس دنیا کے اندر ایسی نعمت کا امکان نہیں ہے، کیونکہ یہ تو دار زحمت ہے، اس کی ہر نعمت کے ساتھ رنج وزحمت اور عذاب مخلوط ہے، بلکہ حکماء نے تو یہ کہا ہے کہ اس دنیا کی لذات (لذت ہی نہیں ہے) صرف دفع الم ہے۔ الخ بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہاں کی لذتیں موجب الم وتکلیف ہیں، کیونکہ یہاں کی ہر لذت میں رنج والم اور مشقت ہے، بلکہ اس دنیا کا مادہ ہی ایسا ہے جس میں خالص رحمت اور خالص نعمت ناممکن ہے۔ اسی طرح اس دنیا کا عذاب اور زحمت ورنج ومشقت بھی خالص نہیں ہے، بلکہ ہر رنج ومشقت کے ساتھ کوئی نعمت یا کئی نعمتیں لپٹی ہوئی ہیں، کوئی بھی الم وبیماری اور رنج ومحنت اس دنیا کے اندر خالص نہیں ہے۔ خود اس دنیا کے مواد میں خالص اور مطلق عذاب قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہے اور خدا کے دار عذاب وعقاب کا مطلب یہ ہے کہ اس میں خالص عقاب اور صرف عذاب ہو۔ اس عالم کے سقام وآلام کا طریقہ دنیا کے آلام کی طرح نہیں ہے کہ یک عضو سے متعلق ہو دوسرے سے نہ ہو اور ایک عضو صحیح وسالم اور آرام ہو جب کہ دوسرا عضو درد والم اور مشقت میں مبتلا ہو اور جن باتوں کا ذکر کیا گیا حدیث شریف میں ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور میں نے بھی ان کی تشریح کی اور جہاں فرمایا گیا ہے ﴿انّ اللہ لم یجعل الدّنیا ثواباً لمؤمن ولا عقوبۃ لکافر﴾ "یعنی اس کی وجہ کہ مومن اس دنیا میں بلاؤں میں مبتلا ہوتا ہے یہ ہے کہ خدا نے دنیا کو نہ تو مومن کے ثواب کی جگہ اور نہ ہی کافر کے عقاب کی جگہ قرار دیا ہے، یہ تو دار تکلیف ہے آخرت کی کھیتی اور عالم کسب ہے اور آخرت دار جزا وسزا اور (دار) ثواب وعقاب ہے"۔ (لہٰذا) اس دنیا میں، اگر کوئی کسی گناہ یا فحاشی کا ارتکاب کرے یا کسی پر ظلم وتعدی کرے تو جو لوگ یہ توقع رکھتے ہیں کہ خدا کو چاہئے فوراً اس کا تدارک

کردے، ظالم کا ہاتھ کاٹ دے، ور اس کو نابود کردے وہ اس بات سے غافل ہیں کہ یہ بات خلاف مصلحت ورخدا کی سنت جاریہ کے مخالف ہے۔ یہاں تو دار امتحان اور شقی وسعید اور مطیع وعاصی میں امتیاز کرنے کی جگہ ہے، یہ عمل کے ظہور کا عالم ہے۔ ملکات واعمال کے نتائج کے ظہور کی جگہ نہیں ہے اور اگر اتفاق سے خدا کسی ظالم کو مبتلائے بلا کردے تو کہا جاسکتا ہے کہ یہ ظالم کے حق میں خدا کی عنایت ہے۔ اگر خدا ظالم وگنہگاروں کو ان کی حالت پر چھوڑ دے تو یہ ''استدراج'' (خدا کی طرف سے درجہ بہ درجہ لوگوں کے ساتھ برتاؤ) ہے۔ جیسے کہ ارشاد ہے ﴿سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ ☆ وَأُمْلِي لَهُمْ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ﴾ ۲ ''ہم ان کو آہستہ آہستہ اس طرح پکڑ لیں گے کہ ان کو خبر بھی نہ ہوگی اور میں ان کو مہلت دیے جاتا ہوں بے شک میری تدابیر مضبوط ہیں''۔ (ایک اور جگہ) ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِأَنْفُسِهِمْ إِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوا إِثْمًا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ﴾ ۳ ''اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا وہ ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ جو ان کو ہم نے مہلت (وفارغ البالی) دے رکھی ہے وہ ان کے حق میں بہتر ہے (حالانکہ) ہم نے مہلت صرف اس وجہ سے دی ہے تاکہ وہ خوب گناہ کریں اور (آخرتو) ان کیلئے رسوا کرنے والا عذاب ہے''۔

مجمع البیان میں امام صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ حضرت نے فرمایا ﴿إِذَا أَحْدَثَ الْعَبْدُ ذَنْباً جُدِّدَ لَهُ بِنِعْمَةٍ فَيَدَعُ الِاسْتِغْفَارَ فَهُوَ الِاسْتِدْرَاجُ﴾ ۴ ''جب بندہ کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کو ایک نئی نعمت دے دی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ استغفار چھوڑ دیتا ہے اور یہی استدراج ہے''۔

پانچویں فصل: شدید روحانی بلا شدید ادراک کے تابع ہے

حدیث شریف کے ذیل میں جہاں فرمایا گیا ہے: ﴿وَمَنْ سَخُفَ دِينُهُ وَضَعُفَ عَقْلُهُ قَلَّ بَلاؤُهُ﴾ ''جس کا دین کمزور ہو اور عقل ضعیف ہو اس کی بلا بھی کم ہوتی ہے''۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بلیات جسمانی اور روحانی دونوں طرح کی ہوسکتی ہے، اس لیے کمزور عقل اور ادراک والے اپنی عقل وادراک کے مطابق روحانی بلاؤں اور عقلی برائیوں سے محفوظ ہیں۔ اس کے برعکس جن کی عقل کامل اور جن کا ادراک شدید ہوتا ہے، بمقدار کمال عقل وشدت ادراک، روحانی بلاؤں سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ اب ان کا ادراک جتنا کامل اور روحانیت جتنی قوی ہوگی اتنی ہی زیادہ شدت کے ساتھ بلیات اور برائیوں کا نزول بھی شدید ہوگا

اور ہو سکتا ہے کہ رسول اکرمؐ کے اس جملے ﴿ما اوذي نبيٌّ مثل ما اوذيت﴾ یعنی ''جتنی اذیت مجھے دی گئی کسی بھی نبی کو نہیں دی گئی'' کی بازگشت اسی مطلب کی طرف ہو۔ اس لیے کہ جو شخص عظمت وجلالت ربوبیت کو زیادہ سمجھتا اور خداوند عالم کے مرتبے کو زیادہ پہچانتا ہوگا بندوں کی نافرمانی اور احترام کے قائل نہ ہونے کی وجہ سے وہ زیادہ متاثر ومتالم ہوگا۔ اسی طرح جس کا رحم وکرم، لطف وعنایت خدا کے بندوں پر زیادہ ہوگی اس کو بندوں کی نافرمانی، گمراہی اور بدبختی سے اذیت بھی بہت زیادہ ہوگی اور چونکہ حضرت خاتم الانبیاء ﷺ ان مقامات میں اور دیگر مدارج میں بھی تمام انبیاءؑ و اولیا اور تمام بنی آدم سے زیادہ کامل ومکمل تھے، اس لئے آپؐ کی اذیت واثر پذیری بھی سب سے زیادہ تھی۔

اس کے علاوہ بھی دوسری توجیہ ہے مگر اس کا ذکر یہاں پر مناسب نہیں ہے۔

واللہ العالم ولہ الحمد

توضیحات (۱۵)

۱۔ اصول کافی، ج۲، ص۲۵۹، کتاب ایمان و کفر، باب شدۃ ابتلاء المؤمن، حدیث ۲۹

۲۔ مرآۃ العقول، ج۹، ص۳۲۱، کتاب ایمان و کفر، باب شدۃ ابتلاء المؤمن، حدیث ۱۔

۳۔ حدیث ۱۳، حاشیہ ۲۔

۴۔ سورۂ اعراف، آیت ۷۔

۵۔ کہا جاتا ہے وہ ایک دوسرے سے افضل ہے یعنی ان سے برتر اور خوبی سے نزدیک تر ہے" امثل الناس" لوگوں میں برگزیدہ اور اچھے اشخاص

۶۔ القرار والقرارۃ، وہ جس میں کوئی چیز ٹھہر جائے۔ پر سکون زمین۔

۷۔ نہج البلاغہ فیض الاسلام، خطبہ ۹، ص۵۷۔

۸۔ ۹۔ اصول کافی، ج۱، ص۳۷۰، کتاب الحجہ، باب التمحیص والامتحان، حدیث ۲ و ۳۔

۱۰۔ اصول کافی، ج۱، ص۳۷۰، کتاب الحجہ، باب التمحیص والامتحان، حدیث ۴ امام ابوالحسنؑ نے فرمایا جس طرح سونا خالص کیا جاتا ہے اسی طرح یہ لوگ خالص کئے جائیں گے

۱۱۔ امام صادقؑ نے فرمایا کوئی تنگی یا وسعت نہیں مگر یہ کہ اس میں خدا کی مشیت و حکم اور امتحان ہوتا ہے۔

اصول کافی، ج۱، ص۱۵۲، کتاب توحید، باب الابتلاء والاختبار، حدیث ۱۔

۱۲۔ اصول کافی، ج۱، ص۱۵۲، کتاب توحید، باب ابتلاء والاختبار، حدیث ۲۔

۱۳۔ سورہ بقرہ آیت ۲۸۶۔

۱۴۔ حدیث ۹، فصل ۲

۱۵۔ زرارہ نے حضرت امام باقرؑ سے روایت کی ہے کہ حضرتؑ نے فرمایا: "ما من عبد الا وفي قلبه نكتة بيضاء، فاذا اذنب ذنباً خرج في النكتة نكتة سوداء، فإن تاب ذهب ذلك السواد، وإن تمادى في الذنوب زاد ذلك السواد حتى يغطي البياض، فاذا تغطى البياض لم يرجع صاحبه الى خير ابداً" ہر بندے کے دل میں ایک سفید نقطہ ہوتا ہے جب وہ گناہ کرتا ہے تو اس نقطے میں سیاہی پیدا ہو جاتی ہے اگر اس نے توبہ کر لی تو سیاہی ختم ہو جاتی ہے اور اگر وہ گناہ کرتا رہا تو وہ سیاہی بڑھتے بڑھتے سفیدی کو چھپا دیتی ہے اور جب سفیدی چھپ جاتی ہے تو وہ شخص نیکی اور اچھائی کی طرف نہیں پلٹ سکتا۔ اصول کافی، ج۲، ص۲۷۳، کتاب ایمان و کفر، باب الذنوب، حدیث ۲۰۔

۱۶۔ پستی کی طرف مائل ہو اور اپنی خواہش نفس کی پیروی کی۔ سورۂ اعراف، آیت ۱۷۶۔

۱۷۔ یہ امام سجادؑ کی اس حدیث کی طرف اشارہ ہے جس میں فرمایا گیا ہے ﴿حُبُّ الدُّنیا رأسُ کُلِّ خطیئۃ﴾ دنیا کی محبت ہر غلطی کی بنیاد ہے۔ اصول کافی، ج۲، ص۳۱، کتاب ایمان وکفر، باب ذم دنیا اور اس میں زہد، حدیث ۱۱۔

۱۸۔ اصول کافی، ج۲، ص۲۵۵، کتاب ایمان وکفر، باب شدت ابتلاء مومن، حدیث ۱۷۔

۱۹۔ اصول کافی، ج۲، ص۲۵۹، کتاب ایمان وکفر، باب شدت ابتلاء مومن، حدیث ۲۸۔

۲۰۔ حدیث قدسی میں ہے ﴿مَن تقرّبَ الیَّ شبراً تقرّبتُ الیه ذراعاً﴾ جو مجھ سے ایک بالشت قریب ہوتا ہے اس سے میں ایک ہاتھ قریب ہوتا ہوں۔

بحار الانوار، ج۳، ص۳۱۳، کتاب التوحید، باب ۱۴۔ کنز العمال، ج۱، ص۲۲۵، حدیث ۳۵

۲۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۵۹ و خطبہ ۲۳۴ (خطبۂ قاصعہ)۔

۲۲۔ ﴿وهبط مع جبرئیل ملکٌ لم یطأ الأرض قطُّ معه مفاتیحُ خزائنِ الأرض فقال یا محمّد إنّ ربّکَ یقرئکَ السّلام ویقولُ هذه مفاتیحُ خزائنِ الأرض، فإن شئتَ فکُن نبیّاً عبداً، وإن شئتَ فکُن نبیّاً ملکاً فأشار إلیه جبرئیلُ أن تواضع یا محمّدُ فقال بل أکونُ نبیّاً عبداً ثمّ صعد الی السّماء﴾ جبرئیلؑ کے ساتھ ایک ایسا ملک جو کبھی زمین پر نہیں آیا تھا، زمین کے خزانوں کی چابیوں کو لے کر رسولؐ کے پاس آ کر کہا، اے محمدؐ! آپ کا رب سلام کے بعد کہتا ہے تمہاری مرضی ہو تو بندہ نبی بنو، اگر چاہو تو نبی بادشاہ بنو۔ جبرئیلؑ نے اشارہ کیا کہ آپ تواضع سے کام لیجئے تو رسولؐ نے کہا میں بندہ اور رسول ہونا پسند کرتا ہوں (یہ سن کر) فرشتہ آسمان کی طرف چلا گیا۔

امالی صدوق، مجلس ۶۹، حدیث ۲۔

۲۳۔ اصول کافی، ج۲، ص کتاب ایمان وکفر، باب شدت ابتلاء مومن، حدیث ۲۸۔

۲۴۔ حدیث ۱۳ حاشیہ۔

۲۵۔ بحار الانوار، ج۸، ص ، کتاب الطہارۃ، باب ۴۲، حدیث ۱۰۔ اسی طرح اصول کافی، ج۲، ص۵۵، کتاب ایمان وکفر، باب شدت ابتلاء المومن، حدیث ۱۴۔

۲۶۔ اصول کافی، ج۲، ص۲۵۷، کتاب ایمان وکفر، باب شدت ابتلاء مومن، حدیث ۲۳۔

۲۷۔ بحار میں ہے کہ ﴿فجاءه النبیُّ وهو فی منامه فأخذ الحسین وضمّه الی صدره وجعل یقبّل بین عینیه ویقول بأبی أنت کأنّی أراک مرمّلاً بدمک بین عصابةٍ من هذه الأمّة یرجون شفاعتی، ما لهم عند الله من خلاق یا بنیّ انّک قادمٌ علی أبیک وأمّک وأخیک وهم مشتاقون الیک، وانّ لک فی الجنّة درجاتٍ لا تنالها الّا بالشّهادة﴾

پس پیغمبرؐ (آپؐ کے) نزدیک آئے، امام حسینؑ سو رہے تھے اور آپؐ نے خواب میں رسولؐ کو دیکھا کہ آپ کو اپنے سینے سے لگا کر پیشانی کو بوسہ دے کر فرمایا میرا باپ تجھ پر فدا ہو جائے، میں تم کو اپنی امت کے ایک ایسے گروہ کے

درمیان پے خون میں ڈوبا ہوا پاؤ گے جو میری شفاعت کے متمنی ہوں گے جن کا خدا کے یہاں خیر کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ میرے لال تم (بہت جلد) اپنے باپ بھائی اور ماں کے پاس آنے والے ہو وہ لوگ تمہارے مشتاق ہیں۔ جنت میں تمہارے بلند درجات ہیں جن کو تم شہادت ہی کے ذریعے حاصل کر سکو گے امام حسینؑ نے مدینہ سے نکلتے وقت حدیث سے مرقد مطہر کے پاس یہ خواب دیکھا تھا۔ بحار الانوار ج ۴۴ ص ۳۱۳ باب ۳۷، حدیث۔

۲۸۔ معراج کی طویل حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ رسولخداؐ نے فرمایا:

«فرأيت اقواماً بين ايديهم موائد من لحم طيب ولحم خبيث، وهم يأكلون الخبيث ويدعون الطّيّب فسألت جبرئيل من هؤلاء؟ فقال: الّذين يأكلون الحرام ويدعون الحلال من امّتك يا محمد، قال: ثُمّ مررتُ باقوام لهم مشافر كمشافر الابل يقرض اللّحم من اجسامهم ويلقى في افواههم فقلتُ من هؤلاء يا جبرئيل؟ فقال: هم الهمّازون اللمّازون. ثم مررتُ باقوام ترضخ وجوههم ورؤوسهم بالصّخر فقلتُ من هؤلاء يا جبرئيل؟ فقال: الّذين يتركون صلاة العشاء»

شب معراج میں نے ایک گروہ کو دیکھا جن کے سامنے پاکیزہ اور گندے گوشت کا خوان لگا ہوا تھا مگر وہ لوگ گندے گوشت کھا رہے تھے اور اچھا گوشت چھوڑے ہوئے تھے تو میں نے جبرئیلؑ سے پوچھا یہ کون لوگ ہیں؟ جبرئیلؑ نے کہا یہ آپؐ کی امت کے وہ لوگ ہیں جو حلال چھوڑ کر حرام کھاتے ہیں۔ رسولؐ فرماتے ہیں پھر میرا گزر ایک ایسی جماعت کے پاس سے ہوا جن کے ہونٹ اونٹ کی طرح کے تھے، ان کے جسم سے گوشت کاٹ کر ان کے منہ میں ڈالا جا رہا تھا میں نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں؟ جبرئیلؑ نے کہا یہ چغلخور ہیں۔ اس کے بعد میرا گزر ایک ایسی جماعت کی طرف سے ہوا جن کے چہرے اور سروں کو پتھروں سے کچلا جا رہا تھا میں نے جبرئیلؑ سے پوچھا یہ کون لوگ ہیں؟ جبرئیلؑ نے کہا یہ وہ لوگ ہیں جو نماز عشاء کو چھوڑ دیتے تھے

بحار الانوار ج ۶ ص ۲۳۹ کتاب العدل والمعاد باب احوال برزخ والقبر وعذابہ، اسی طرح علم الیقین، ج ۲، ص ۸۸۷ مقصد ۳ فصل ۲

۲۹ اصول کافی، ج ۲، ص ۲۵۲ کتاب الایمان والکفر باب شدت ابتلاء المومن حدیث ۳

۳۰ حدیث ۱، حاشیہ

۳۱ بحار الانوار ج ۶۸ ص ۲۵۰ کتاب الایمان والکفر باب شدت ابتلاء المومن۔

۳۲ محمد بن حسن طوسی "خواجہ نصیر" اور "محقق طوسی" کے لقب سے مشہور ہیں۔ (۵۹۷۔۶۷۲ھ) اسلام کے معروف ترین دانشمندوں میں سے تھے فلسفہ، کلام، ریاضیات اور ہیئت میں تبحر رکھتے تھے۔ آپ کے شاگردوں میں علامہ حلیؒ، قطب الدین شیرازی، سید عبدالکریم بن طاؤس وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ آپ کی تصانیف میں شرح اشارات، تجرید، تحریر اقلیدس، تحریر مجسطی، اخلاق ناصری وغیرہ مشہور کتابیں ہیں۔

۳۳ حدیث ۱، حاشیہ ۳۳۔

۳۴۔ کشف المراد فی شرح تجرید الاعتقاد ص ۲۰۸ مقصد چہارم فی وجوب العصمۃ

۳۵۔ بحار الانوار ج ۱۲ ص ۳۴۴ کتاب النبوۃ باب قصص ایوب حدیث ۳

۳۶۔ سورہ نحل آیت ۹۸، ۹۹

۳۷۔ روضۂ کافی ج ۸ ص ۲۸۸ حدیث ۴۳۳۔

۳۸۔ اصول کافی ج ۲ ص ۲۵۴ کتاب الایمان والکفر باب شدۃ ابتلاء المؤمن حدیث ۴

۳۹۔ مرآۃ العقول ج ۹ ص ۳۳۰ کتاب الایمان والکفر باب شدت ابتلاء المؤمن حدیث ۱۲۔

۴۰۔ حضرت امام جعفر صادقؑ اپنے والد بزرگوار جناب امام محمد باقرؑ سے روایت فرماتے ہیں

«إنّ أيّوب ابتلي سبع سنين من غير ذنب وإنّ الأنبياء لا يذنبون لأنّهم معصومون مطهّرون لا يذنبون ولا يزيغون ولا يرتكبون ذنباً صغيراً ولا كبيراً وقال: إنّ أيّوب من جميع ما ابتلي به لم تنتن له رائحة ولا قبحت له صورة ولا خرجت منه مدّة من دم ولا قيح ولا استقذره أحد رآه ولا استوحش منه أحد شاهده ولا تدوّد شيء من جسده وهكذا يصنع الله عزّ وجلّ بجميع من يبتليه من أنبيائه وأوليائه المكرمين عليه وإنّما اجتنبه الناس لفقره وضعفه في ظاهر أمره لجهلهم بما له عند ربّه تعالى ذكره من التأييد والفرج»

جناب ایوبؑ بغیر کسی گناہ کے سات سال تک مبتلا رہے اور انبیاءؑ گناہ نہیں کرتے کیونکہ وہ معصوم ہوتے ہیں اور پاک ہوتے ہیں نہ گناہ کرتے ہیں اور نہ ہی کج روی میں مبتلا ہوتے اور نہ گناہ صغیرہ و کبیرہ کرتے ہیں اور معصومؑ نے فرمایا: اس تمام مدت میں نہ تو جناب ایوبؑ کے بدن سے بدبو پیدا ہوئی نہ ان کی صورت قبیح ہوئی اور نہ پوری مدت میں (پھوڑے سے) خون یا پیپ نکلی اور نہ کوئی دیکھنے والا ان سے متنفر ہوا اور نہ مشاہدہ کرنے والا ان سے وحشت زدہ ہوا اور نہ ان کے جسم میں کیڑے پڑے۔ خدا اسی طرح اپنے ان تمام انبیاء و اولیاء کے ساتھ کرتا ہے جو اس کے نزدیک محترم ہوتے ہیں (ہاں) جناب ایوبؑ سے لوگ ان کی غربت و فاقہ اور بظاہر کمزوری کی وجہ سے اجتناب کرتے تھے کیونکہ وہ لوگ نہیں جانتے تھے کہ ایوبؑ خدا کی حمایت اور وسیع فضل و کرم سے بہرہ ور ہیں۔

بحار الانوار ج ۱۲ ص ۳۴۸ کتاب النبوۃ باب قصص ایوبؑ حدیث ۱۳۔

۴۱۔ مسند و مستدرک (مصدر المجالسین)۔

۴۲۔ سورہ قلم آیت ۴۵ و ۴۶۔

۴۳۔ سورہ آل عمران آیت ۱۷۰۔

۴۴۔ مجمع البیان تفسیر سورۂ قلم۔

۴۵۔ الجامع الصغیر ج ۲ ص ۱۴۴ پر لفظ شک کے بغیر ہے

سولھویں حدیث

بأسانيدنا المتّصلة إلى ثقة الإسلام والمسلمين فخر الطّائفة المحقّة ومقدّمهم محمّد بن يعقوب الكُليني رضوان الله عليه، عن عدّة من أصحابنا، عن أحمد بن محمّد بن خالد، عن أبيه، عن عليّ بن النّعمان، عن عبدالله بن مسكان، عن أبي بصير قال:

﴿سمعت أبا عبدالله علیہ السلام يقول: إنّ الحرّ حرّ على جميع أحواله، إن نابته نائبة صبر لها، وإن تداكّت عليه المصائب لم تكسره، وإن أسر وقهر، واستبدل باليسر عسراً، كما كان يوسف الصّدّيق الأمين لم يضرر حرّيّته أن استعبد وقهر، وأسر ولم تضرره ظلمة الجبّ ووحشته وما ناله أن منّ الله عليه فجعل الجبّار العاتي له عبداً بعد إذ كان له مالكاً، فأرسله ورحم به أمّة وكذلك الصّبر يعقب خيراً فاصبروا ووطّنوا أنفسكم على الصّبر تؤجروا﴾۔

ترجمہ: ابوبصیر کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادقؑ کو فرماتے ہوئے سنا: ''آزاد ہر حال میں آزاد ہے اگر اس پر مصیبت آجاتی ہے تو صبر کرتا ہے اور اگر (چاروں طرف سے) مصائب ٹوٹ پڑیں اور چاہے وہ اسیر و مقہور کر دیا جائے پھر بھی شکستہ (خاطر) نہیں ہوتا۔ وہ سختیوں کو آسانیوں سے بدل لیتا ہے جیسے کہ جناب یوسف صدیق و امینؑ کو ان کی غلامی، اسیری اور شکست نے ان کی آزادی کو کوئی ضرر نہیں پہنچایا اور نہ کنویں کی تاریکی و وحشت اور بلائیں ان کا کچھ بگاڑ سکیں، یہاں تک کہ خدا نے ان پر احسان فرمایا کہ ظالم و سرکش کو ان کا غلام بنا دیا جبکہ وہ (پہلے) آقا تھا۔ پس خدا نے ان کو رسول بنایا اور ان کے ذریعے سے ایک

امت پر رحم فرمایا۔ (اسی طرح) صبر اپنے بعد اچھائی لاتا ہے۔ لہذا آپ لوگ صبر کیجئے اور اپنے کو صبر پر آمادہ کیجئے تاکہ آپ کو اس کا اجر مل سکے"۔

شرح "نـــائبة" مفرد ہے اس کی جمع نوائب ہے۔ نازل ہونے والے حوادث و واقعات کو کہتے ہیں، لیکن صحاح میں اس کے معنی "مصیبت" لکھے ہیں۔[1]

"دک" کے معنی "دق" کے ہیں، یعنی کسی چیز کو کوٹنے (پیسنے) کے ہیں۔ صحاح میں ہے ﴿وقـــد دککتُ لشيء، أدُکُّهُ دکّاً: إذا ضربتُهُ و کسرتُهُ حتی سوّیتُهُ بالأرض﴾ [2] "یعنی میں نے اس چیز کو کوٹا، میں اس کو کوٹ کر اور مار پیٹ کر اور توڑ پھوڑ کر زمین کے برابر کر دیا"۔ اسی طرح اجتماع و ازدحام کے معنی میں بھی آیا ہے۔ چنانچہ نہایہ میں منقول ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا ہے ﴿ثُمّ تداککتُم عليّ تدکُّک الإبل الهيم علی حياضها﴾ [3] اس میں "تداککتم" کے معنی "زدحمتم" کے ہیں، یعنی "تم لوگوں نے اجتماع کیا"۔

نہایہ سے یہ بھی منقول ہے کہ "دک" بمعنی "کســـــــر" ہے [4] البتہ اس حدیث شریف میں "تـداکـت" کے معنی "لـم تـکسـره" کی مناسبت سے معنی اول (کوٹنا) سے زیادہ مناسبت رکھتے ہیں ویسے دوسرا مطلب (اجتماع) بھی مناسب ہے۔

"ان اسـر" میں لفظ "ان" وصلیہ ہے اور "قهر" و "استبـدل" اسی پر عطف ہیں۔ علامہ مجلسیؒ [5] نے فرمایا ہے "بعض نسخوں میں" استبـدل بـالعسر یسـراً" آیا ہے۔[6] اگر یہ ایسا ہے تو پھر یہ "لـم تکسره" پر عطف ہے اور صبر کی غایت ہے۔

اور جملہ "ان اسعد" مفعول پر مبنی ہے اور "لم یصرر" کا فاعل ہے۔ مرآة العقول کے نسخہ میں "اسـعد" آیا ہے۔[7] لیکن وسائل میں "استعبد" آیا ہے۔[8] گمان یہ ہے کہ مرآة العقول کے نسخے میں کاتب کی غلطی ہو، اگر چہ معنی کے اعتبار سے وہ بھی غلط نہیں ہے، لیکن حدیث شریف اور مقام کی مناسبت کا تقاضا یہ ہے کہ وسائل والا نسخہ صحیح ہو۔

اور "ما له" "ظلمة الجب" پر عطف ہے، یعنی بھائیوں کی طرف سے جو ظلم مصائب و حزن پڑے اور کنویں کی تاریکی نے یوسفؑ کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔

"ان من الله" میں اظہر یہ ہے کہ پہلے پر "الی" مقدر ہے، یعنی "الی ان الله" ہے اور "لم یضرره ولم

تصور" کے دو مقامات پر تنازع ہے۔ علامہ مجلسی" نے اس میں بہت سے احتمالات بیان کئے ہیں۔ وہ مگر ان کے ذکر سے طوالت کے علاوہ کوئی فائدہ نہیں ہے۔

اور جناب یوسف" کا مالک ان کا غلام ہو گیا یعنی وہ جناب یوسف" کا تابع ہو گیا۔

پہلی فصل، شہوت تمام گرفتاریوں کی جڑ ہے

یہ جان لو کہ اگر انسان نفسانی خواہشوں اور شہوانی طاقتوں کا اسیر ہو گیا تو ان چیزوں کا تسلط جتنا زیادہ ہو گا اس کی غلامی، قید و بند اور عبودیت بھی اسی قدر زیادہ ہو گی اور کسی کی عبودیت و غلامی کا مقصد اس کی اطاعت اور اس کے سامنے سرنگوں ہونا ہے۔ شہوتوں کا مطیع اور نفس امارہ کا مقہور بندہ ان کا فرمانبردار ہوا کرتا ہے۔ یہ چیزیں اس کو جو بھی حکم دیتی ہیں، بڑی خندہ پیشانی سے ان کو بجا لاتا ہے اور ان کے سامنے اس کی حیثیت ایک حلقہ بگوش خادم اور فرمانبردار بندے کی ہوتی ہے اور پھر نوبت یہ آ جاتی ہے کہ انسان ان چیزوں کی اطاعت کو زمین و آسمان کے مالک خدا کی طاعت پر مقدم کر دیتا ہے اور ان کی بندگی کو حقیقی مالک الملوک کی بندگی پر ترجیح دیتا ہے اور پھر اس وقت اس کی عزت، آزادی، اور حریت پسندی اس کے قلب سے اپنا بوریا بستر باندھ لیتی ہے اور اس کے چہرۂ قلب پر بندگی و غربت اور ذلت کا غبار چھا جاتا ہے اور وہ اہل دنیا کا تابع ہو جاتا ہے، اس کا دل اہل دنیا اور صاحبان جاہ و حشم کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے، اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کیلئے اپنے جیسے فرد کی ذلت و منت برداشت کرتا ہے، پیٹ اور جنسی خواہش کی تکمیل کیلئے ذلت و رسوائی برداشت کرتا ہے اور جب تک شہوت و نفس کا غلام رہتا ہے کسی بھی قسم کی عزت و جوانمردی اور حریت کی خلاف ورزی سے ہچکچاتا نہیں اور ہر کس و ناکس کی اطاعت کرتا ہے۔ محض حصول مطلب کے امکان کی بنا پر چاہے وہ امکان خیالی ہی کیوں نہ ہو، ہر بے قیمت و پست شخص کا احسان اٹھانے کیلئے تیار رہتا ہے، جیسا کہ کہا گیا ہے باب طمع میں واہم و خیال تحت ہے۔

جو لوگ بندۂ دنیا اور خواہشوں کے غلام ہیں اور انہوں نے نفس کی غلامی کا طوق اپنی گردن میں ڈال رکھا ہے جس کے پاس بھی دنیا پاتے ہیں یا دنیا پانے کا امکان ہے اسی کی غلامی پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور اگر یہ لوگ بظاہر عفت نفس و (عدم) احسان کا ذکر کریں تو یہ محض فریب و دھوکہ ہے، خود ان کے اعمال و قول ان کے کلام کی تکذیب کریں گے اور یہ بندگی و غلامی ان امور میں سے ہے جو انسان کو ہمیشہ ذلت و رنج اور

مشقت میں مبتلا رکھتی ہے۔ شرافت اور عزت نفس کے مالک انسان کو چاہیے جس طرح بھی ممکن ہو اپنے آپ کو اس سے الگ رکھے۔ اس غلاظت سے پاکیزگی اور اس ذلت وخواری سے رہائی نفس کے معالجے پر موقوف ہے اور یہ معالجہ علم وعمل نافع ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

عمل کی صورت یہ ہے کہ شرعی ریاضتوں پر عمل اور نفس کی مخالفت اتنی مدت تک کرے کہ نفس دنیا کی شدید محبت اور شہوت ونفسانی خواہشات کی پیروی سے منصرف ہو جائے اور خیرات وکمالات کا عادی ہو جائے۔

علم کی صورت یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو سمجھائے اور اپنے دل کو باور کرائے کہ دوسری مخلوقات بھی اسی کی طرح ضعیف ومحتاج اور غریب ونادار ہیں اور میری طرح وہ خود بھی اپنے تمام کلی وجزئی امور میں غنی مطلق اور قادر وتوانا (خدا) کی محتاج ہیں۔ ان کے اندر یہ صلاحیت نہیں ہے کہ کسی کی حاجت روائی کر سکیں اور وہ ایسی نہیں ہیں کہ نفس ان کی طرف متوجہ اور دل مائل ہو سکے۔ جس قادر وتوانا نے ان کو عزت وشرف اور مال ومنال دیا ہے وہی ہر شخص کو دینے پر قادر ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اپنی شکم سیری یا خواہش نفس کی تکمیل کیلئے انسان تنی ذلت ورسوائی برداشت کرے اور ایک ایسی مخلوق کا جو غریب ونا چیز اور بے دست وپا ہے، بے دانش وبینش ہے احسان مند ہو تو اس کیلئے باعث شرم ہے اگر احسان لینا ہی ہے تو غنی مطلق اور خالق ارض وسما کا احسان لے، کیونکہ اگر تم نے اس ذات مقدس کی طرف توجہ پیدا کر لی اور تمہارا دل اس کے حضور میں خاضع ہو گیا تو دونوں عالم سے چھٹکارا پا جاؤ گے اور مخلوق کا طوق عبودیت اپنی گردن سے اتار پھینکو گے ﴿اَلْعُبُودِيَّةُ جَوْهَرَةٌ كُنْهُهَا الرُّبُوبِيَّةُ﴾۔ "خدا کی بندگی وہ گوہر گراں بہا ہے جس کا باطن آزادی وربوبیت ہے"

خدا کی بندگی اور مرکزی نقطۂ وحدہ کی طرف توجہ اور خدا کی سلطنت مطلقہ میں اپنی تمام قوتوں اور سطحوں کے فنا کر دینے سے دل کے اندر ایک ایسی حالت پیدا ہو جاتی ہے جو تمام عوالم پر حکومت کرتی ہے اور روح میں بھی ایسی عظمت وبلندی پیدا ہو جاتی ہے کہ پھر وہ خدا اور وہ ہستیاں جن کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے ان کے علاوہ کسی کی اطاعت نہیں کرتی اور اگر انقلاب زمانہ سے کسی کی قدرت وسلطنت کے ماتحت ہو بھی جائے تو اس کا دل اسیر رہتا نہیں ہے، بلکہ نفس کی حریت اور خود مختاری باقی رہتی ہے، جیسا کہ حضرت یوسفؑ اور حضرت لقمانؑ کی ظاہری غلامی نے ان کی قلبی آزادی وحریت کو سلب نہیں کیا۔ مگر (وائے ہو

ان) بہت سے طاقتور اور ظاہری سلطنت کے مالک لوگوں پر جو ایسے بھی ہیں جنہوں نے حریت و آزادی نفس اور بڑائی اور عظمت کی بو بھی نہیں سونگھی، بلکہ نفس کے بندۂ ذلیل اور حلقہ بگوش غلام بنے رہتے ہیں اور جس کی بنا پر وہ ناچیز مخلوق کی تملق و خوشامد کرتے ہیں۔

حضرت سید الساجدین علیہ السلام فرماتے ہیں ﴿إني لآنف أن أطلب الدنيا من خالقها فكيف من مخلوق مثلي؟﴾ !! "مجھے خالق جہاں سے دنیا کا سوال کرتے ہوئے شرم آتی ہے چہ جائیکہ میں اپنی جیسی مخلوق سے سوال کروں؟"۔

اے میرے عزیز! اگر تم کو طلب دنیا سے شرم نہیں محسوس ہوتی تو کم از کم اپنی جیسی کمزور مخلوق سے تو سوال نہ کرو۔ یہ جان لے کہ مخلوق تیری دنیا کو آباد کرنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ میں مان لیتا ہوں کہ یہ جبر اور ذلت و رسوائی تم نے کسی مخلوق کے ارادے کو حاصل کر لیا (لیکن) اس کا ارادہ ملک خدا میں کارفرما نہیں ہے۔ کسی کا بھی حقیر مالک الملوک کی ملکیت میں نہیں ہے، اس لئے چند روزہ دنیا اور محدود اور عارضی خواہشوں کیلئے ہر وقت ناچیز مخلوق کی چاپلوسی نہ کرو۔ اپنے خدا سے غافل نہ ہو اپنی حریت و آزادی کی حفاظت کرو، غلامی کے طوق کو اپنی گردن سے اتار دو، ہر حال میں آزاد رہو۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے ﴿إن الحر حر على جميع أحواله﴾ "آزاد ہر حالت میں آزاد ہوتا ہے"

یہ بات بھی جان لو کہ بے نیازی کا تعلق دل سے ہے، اگر دل بے نیاز ہے تو انسان غنی و بے نیاز ہے اور بے نیازی کا دارومدار روح کے حالات پر ہے۔ اس کا تعلق ان خارجی امور سے ہے جو انسان سے غیر مربوط ہیں نہیں ہے۔ میں نے خود اہل دولت و ثروت اور مال و منال میں ایسے لوگوں کو دیکھا ہے کہ ان جیسے ظاہرات کوئی باعزت غریب بھی نہیں کر سکتا، ان کی باتیں شرم آور تھیں، ذلت و پستی کا غبار ان بے چاروں کے دلوں پر چھایا تھا۔ یہودی باوجودیکہ پوری دنیا میں آبادی کے تناسب سے امیر ترین قوم ہیں، لیکن ان کے باوجود ان کے چہرے سے ذلت و پستی، اور غربت و فاقہ نمایاں رہتا ہے اور پوری عمر ذلت و خواری، عاجزی اور ناداری سے بسر کرتے ہیں۔ یہ صرف ان کی روحانی ذلت اور قلبی غربت کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ (اسی طرح) اہل زہد و درویش صفت لوگوں میں بعض ایسے اشخاص کو بھی میں نے دیکھا ہے کہ ان کے دل اتنے مستغنی اور بے نیاز ہیں کہ پوری دنیا کو وہ حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور خدا کے علاوہ کسی کو عرض حال کے لائق نہیں سمجھتے۔ تم خود اہل دنیا اور طالبان اقتدار کو دیکھو اور گہری نظر سے مطالعہ کرو تو پتہ چل جائے گا کہ

کی ذلت اور چاپلوسی دوسروں سے کہیں زیادہ اور لوگوں کے سامنے ان کا خضوع بہت ہی زیادہ ہے۔ پیر ومرشد قسم کے لوگ ذلت ورسوائی برداشت کرتے اور خیر خواہی کا اظہار کرتے ہیں تاکہ کچھ دنوں کیلئے پیٹ پوجا کریں اور جنسی خواہش کی تسکین ہو۔ پیر کا دل اپنے مرید کے سامنے اس سے زیادہ خاشع ہوتا ہے جتنا مرید کا دل پیر کے سامنے خاضع ہوا کرتا ہے، حالانکہ دونوں کی اصل عقیدت میں بھی فرق ہوتا ہے۔ مرید کی عقیدت روحانی و الٰہی ہے چاہے وہ غلط ہو اور پیر کی ارادت دنیوی وشیطانی ہے۔ یہ سب تو دنیاوی ذلتیں اور مفسدے ہیں اور اگر کہیں پردہ اٹھ جائے تو پتہ چلے کہ خواہشات نفسانی اور شہوتوں کی اسارت کی زنجیروں کی قید وبند کے نیچے کیا صورت ہے؟ ہوسکتا ہے کہ وہ زنجیر جس کا طول ستر ہاتھ کا ہے، اور جس کی خدا نے خبر دی ہے اور وہ قید وزنجیر جو ہمارے لئے ہے وہ اس دنیا میں یہی شہوت وغضب کے زیر فرمان ہوتا ہے۔ ارشاد پروردگار ہے، ﴿ووجدوا ما عملوا حاضرا﴾[12] "جو کچھ انہوں نے کیا تھا اس کو حاضر پایا"، نیز ارشاد ہے ﴿لها ما کسبت وعلیها ما اکتسبت﴾[13] اس عالم میں ہم کو جو بھی ملے گا وہ ہمارے عمل کی صورت میں ہوگا۔

خواہشوں اور شہوتوں کی پیچ در پیچ زنجیروں کو توڑ دو، کمندوں کو توڑ کر اور قید سے باہر آ کر اس دنیا میں آزادانہ زندگی بسر کرو تاکہ اس عالم میں آزاد رہو، ورنہ اس قید کی صورت وہاں دیکھنا ہوگی اور یہ سمجھو کہ وہ بہت ہی طاقت فرسا ہے۔ اولیائے خدا باوجودیکہ اس کی غلامی سے بالکل آزاد ہو چکے تھے اور مکمل طور پر آزاد تھے مگر ان کے ننھے دل لرزاں تھے اور انجام کار سے تا گریاں رہتے اور نالہ کرتے تھے کہ عقلیں متحیر ہیں!

دوسری فصل

اگرچہ ان اوراق میں جو مطالب بیان کئے گئے ہیں وہ شائع ومشہور ومعروف ہیں اور تکرارات سے شمار کرنا چاہئے لیکن اس تکرار میں کوئی حرج نہیں ہے۔ نفس کو یاد دہانی اور حق بات کی تکرار اچھی بات ہے، اسی لئے وظائف واوراد، عبادات ومناسک میں تکرار پسندیدہ امر ہے اور اس تکرار کا اصلی مقصد نفس کو عادی اور ریاضت کا پابند بنانا ہے۔ لہذا میرے عزیز تکرار سے رنجیدہ نہ ہو اور یہ جان لو کہ جب تک انسان نفس اور اس کی شہوتوں کا اسیر ہے اور شہوت وغضب کی لمبی زنجیریں اس کی گردن میں ہیں وہ کسی بھی معنوی وروحانی مقام تک نہیں پہنچ سکتا اور نہ نفس کی باطنی سلطنت اور اس کا نافذ ارادہ ظاہر ہوسکتا ہے اور نہ عزت نفس ومقام

استقلال جو کمال روحانی کا عظیم ترین مقام ہے، انسان کے اندر پیدا ہو سکتا ہے، بلکہ اس اسیری کی وجہ سے انسان کبھی بھی اور کسی بھی حال میں نفس کی اطاعت سے سر مو گردنی نہیں کر سکتا اور جب نفس امارہ اور شیطان کی حکومت باطنی طور سے طاقتور ہو جاتی ہے اور تمام قوتیں اس کی غلامی اور اطاعت کرنے لگتی، اس کے سامنے جھک جاتی اور سر تسلیم خم کر دیتی ہیں تو پھر نفس امارہ وشیطان صرف گناہوں پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ رفتہ رفتہ انسان کو گناہان صغیرہ سے گناہان کبیرہ کی طرف، اس کے بعد عقیدے میں کمزوری، پھر تاریکی وانکار، پھر انکار خدا اور انبیاء و اولیاء سے دشمنی اور بغض پر آمادہ کر دیتے ہیں اور نفس چونکہ ان کا غلام بن چکا ہے اس لیے ان کی مخالفت نہیں کر سکتا۔ پس اس اطاعت و اسیری کا نتیجہ بہت ہی خراب ہوتا ہے، اور ممکن ہے انسان کو بہت ہی ہولناک جگہوں تک پہنچا دے۔

اس لئے عقلمند اور اپنے اوپر مہربان انسان کو چاہیے کہ جس طرح بھی ممکن ہو اپنے کو اس اسیری سے نکالے اور جب تک فرصت ہو قوتیں سالم ہوں اور زندگی کے ساتھ صحت وجوانی برقرار رہو اور جب تک قوتیں مکمل طور پر شیطان کی مسخر نہ ہوئی ہوں اس کا مقابلہ کرے اور ایک مدت تک اپنے اوقات کی پابندی کرے، حالات نفس کا مطالعہ کرے، گزشتہ لوگوں کے حالات اور ان کے برے انجام پر غور وخوض کرے اور گزرے ہوئے چند دنوں کے بارے میں اپنے باطن قلب کو سمجھائے اور دل کو بیدار کرے، اور ہمارے رسول خدا سے منقول حقیقت ﴿الدنیا مزرعة الاخرة﴾ [۱۴] "دنیا آخرت کی کھیتی ہے" سے دل کو آگاہ کرے۔ اگر ان چند دنوں میں زراعت نہیں کی، عمل صالح انجام نہیں دیا تو وقت ہاتھ سے نکل جائے گا، دوسرا عالم قریب آجائے گا، موت آدبوچے گی تو سارے اعمال منقطع ہو جائیں گے، تمام امیدیں خاک میں مل جائیں گی اور اگر خدا نخواستہ شہوتوں کی اسی غلامی اور مختلف خواہشات نفس کی اسارت کے زمانہ میں ملک موت آگئے، تو ممکن ہے شیطان اپنے مقصد، یعنی ایمان خراب کرنے میں کامیاب ہو جائے اور ہمارے ساتھ ایسا برتاؤ کرے اور ہمارے دل کو ایسا لبھائے کہ خدا و انبیاء و اولیاء کی دشمنی پر ہمارا خاتمہ ہو اور پھر خدا جانے اس کے بعد ہمارے ساتھ کیسی بدبختیاں، تاریکیاں اور وحشتیں ہوں!

لہذا اے ذلیل نفس، وائے غافل دل! اب تو خواب غفلت سے بیدار ہو جا اور اس دشمن کے مقابلے کیلئے تیار ہو جا، جس نے سالہائے سال سے تمہارے گلے میں رسی ڈال رکھی ہے اور تم کو قیدی بنا رکھا ہے، جدھر چاہتا ہے تم کو لے جاتا ہے اور جس برائی اور پست عادت کی طرف چاہتا ہے تم کو گھسیٹ لے جاتا ہے،

تجھے چاہیے اٹھ کھڑے ہو کر اس قید کو توڑ دے، زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے، آزاد ہو جا، ذلت و رسوائی کو دور کر دے، خدا کی بندگی میں گردن جھکا دے تاکہ ہر قسم کی غلامی و بندگی سے نجات مل جائے اور دونوں عالم میں سلطنت مطلقہ الہیہ حاصل کر سکے۔

اے عزیز! اگر چہ یہ دنیا دار جزا نہیں اور سلطنت حق کے ظہور کی جگہ نہیں ہے، مومن کیلئے قید خانہ ہے۵۔ (پھر بھی) مگر تو نفس کی قید سے آزاد ہو جا، خدا کی بندگی میں سر تسلیم خم کر دے، دل کو توحید پرست بنا دے، دوئی سے زنگ کو آئینہ روح سے دھو ڈال، دل کو کمال مطلق کے مرکزی نقطے کی طرف متوجہ کر دے تو اسی عالم میں اس کے اثرات اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا اور تیرے دل میں ایسی وسعت پیدا ہو جائے گی جو سلطنت تامہ الہیہ کے ظہور کی جگہ بن سکے اور تمام عوالم سے اس کی وسعت زیادہ ہوگی۔ (ارشاد ہے) ﴿لا یسعني أرضي ولا سمائي ولكن يسعني قلب عبدي المؤمن﴾ ۱۶ ”میں آسمان و زمین میں تو نہیں سما سکتا لیکن بندۂ مومن کے دل میں سما سکتا ہوں“ اور اس (دل) کے اندر یہ غنا پیدا ہو جائے گا کہ تمام ممالک ظاہر و باطن اس کے مقابلہ میں ہیچ ہوں گے اور وہ اتنا قوی ہو جائے گا کہ ملک و ملکوت سے بھی مستغنی ہوگا اور وہ دونوں عالم کو اپنے لائق نہ سمجھے گا۔

طیران مرغ دیدی تو ز پای بند شهوت   بدر آی تا ببینی طیران آدمیت

(تو نے نفسانی خواہشات کے غلام سے طائر کی پرواز کو دیکھا! اب ذرا (تقیدات سے) باہر آ کر آدمیت کی پرواز دیکھو)۔

تیسری فصل

صبر قید نفس سے آزادی کا نتیجہ ہوتا ہے

نفس کی غلامی سے آزادی کا سب سے بڑا نتیجہ اور عظیم ثمرہ، مصیبتوں اور بلیات میں صبر ہے اور یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ صبر کے معنی کو اجمالاً بیان کریں اور اس کے اقسام و ثمرات اور حریت سے ارتباط کا ذکر کریں۔

صبر کی تعریف، طائفۂ حقہ کے محقق، فرقۂ محقہ کے مدقق، علم و عمل میں کامل (خواجہ) نصیر الدین طوسی (قدس اللہ نفسہ القدوسی) نے اس طرح فرمائی ہے ”ناپسندیدہ حالات میں نفس کو بے تابی سے محفوظ رکھنا“۔ ۱۹ اور عارف و محقق مشہور نے منازل السائرین میں اس طرح فرمایا ہے ”چھپے ہوئے غم و اندوہ پر

نفس کو شکایت سے محفوظ رکھنا صبر ہے"۔۴۰ الخ

آپ کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ صبر متوسطین کے مقامات میں شمار کیا گیا ہے، اس لیے کہ نفس جب تک مصائب و آلام کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور ان چیزوں سے اس کو باطنی غم حاصل ہوگا اس کی معرفت ناقص ہے، جیسے رضا بہ قضا اور بلاؤں کے نزول پر خوش ہونا ایک بلند مقام ضرور ہے، اگر ہم اس کو بھی متوسطین کے مقامات میں سے شمار کرتے ہیں۔ اسی طرح گناہوں اور اطاعتوں پر صبر کو بھی امر عبادت اور معاصی و طاعات کی صورتوں کی معرفت میں نقص شمار کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اگر کوئی عبادت کی حقیقت کو سمجھتا ہو اور اس کی خوبصورت برزخی شکل سے آشنا ہو اور اس پر ایمان رکھتا ہو اور معصیت کی وحشت ناک برزخی صورت پر ایمان رکھتا ہو تو ان مقامات پر اس کیلئے صبر ایک بے معنی شئے ہے، بلکہ مطلب اس کے برعکس ہے، کیونکہ یہاں پر یہ ہے کہ اگر اس کو خوشی یا راحت نصیب ہو یا اس کا کام نتیجتاً ترک عبادت یا فعل معصیت ہو تو یہ چیزیں اس کیلئے ناپسندیدہ ہوتی ہیں اور اس کی باطنی تکلیف بلا اور مصیبت پر اہل صبر کے غم و اندوہ سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔

جناب عبد صالح، فریضہ عبودیت کے عارف، صاحب مقامات و کرامات جناب علی بن طاؤس (قدس اللہ نفسہ) الخ سے منقول ہے کہ وہ اپنے روز تکلیف (اول بلوغ) کے دن جشن مناتے تھے، خوشی کرتے اور کھانا کھلاتے تھے اور اس دن کو روز عید شمار کرتے تھے، اس لیے کہ خدا نے ان کو اس دن یہ فخر عطا کیا کہ ان کو اطاعت کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔۴۲

کیا اس روح لطیف کیلئے اطاعتوں کے بجا لانے کو ایسے ناپسندیدہ حالات پر صبر کرنا کہا جا سکتا ہے جو باطن میں چھپے ہوں؟ کہاں ہم اور کہاں یہ حق کے فرمانبردار بندے! ہم یہ گمان کرتے ہیں کہ خداوند عالم نے ہم پر بوجھ ڈالا ہے اور (شرعی) ذمہ داریوں کو زحمت و پریشانی کا سبب سمجھتے ہیں۔ ہم میں سے اگر کوئی زحمت اٹھا کر اول وقت نماز پڑھ لیتا ہے تو کہتا ہے انسان کو یہ کام جلد کر لینا چاہئے تاکہ راحت و آرام نصیب ہو! ہماری ساری بدبختی جہالت و نادانی سے ہے اور ہمارا سارا نقصان فقدان ایمان کی وجہ سے ہے

بہرحال حقیقت صبر، چھپے ہوئے غم و اندوہ پر شکایت کرنے سے نفس کو روکنا ہے۔ مگر ائمہ ہدیٰ اور انبیاء کرام کیلئے جو تعریف کی جاتی ہے کہ وہ صبر کرتے تھے ہو سکتا ہے اس سے مراد جسمانی تکلیفوں پر صبر کرنا ہو، کیونکہ بشری طبیعت کا مقتضی ان پر متاثر ہونا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محبوب کے فراق پر صبر کرنا مقصود ہو،

کیونکہ یہ بھی محبین کے بزرگ مقامات میں سے ہے، اس کے بعد اس کا (بھی) ذکر کیا جائے گا۔ ورنہ طاعتوں، مصیبتوں، معصیتوں وغیرہ پر صبر کرنا ان حضرات کے بارے میں کیا بلکہ ان کے شیعوں کے بارے میں بھی بے معنی چیز ہے۔

مشہور عارف کمال الدین عبدالرزاق کاشانی ؒ ۲۳ شرح منازل میں فرماتے ہیں "شیخ نے جو فرمایا ہے کہ صبر کے معنی شکایت سے احتراز کرنا ہے تو یہاں شکایت سے مراد مخلوق سے شکایت ہے ورنہ خدا سے شکایت اور اس کی بارگاہ میں جزع و فزع کرنا صبر کے منافی نہیں ہے، جیسے جناب ایوبؑ نے خدا سے شکوہ کیا ﴿انّي مسّني الشّيطان بنُصب و عذاب﴾ ۲۴ "مجھ کو شیطان نے بہت اذیت و تکلیف پہنچا رکھی ہے" حالانکہ خدا نے ان کی تعریف کی ہے ﴿انّا وجدناه صابراً نعم العبد انّه أوّاب﴾ ۲۵ "ہم نے ان کو صابر پایا، اور وہ کیا اچھے بندے تھے"۔ حضرت یعقوبؑ نے عرض کیا ﴿انّما أشكوا بثّي وحُزني الى الله﴾ ۲۶ "میں تو اپنی بے قراری اور رنج کی شکایت خدا ہی سے کرتا ہوں" حالانکہ جناب یعقوبؑ صابروں میں سے تھے، بلکہ خدا سے شکایت نہ کرنا اچھی بات نہیں ہے۔ ۲۷

انبیاء کرام اور ائمہ معصومین (صلوات اللہ علیہم اجمعین) کی سیرت سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان حضرات کے مقامات اگرچہ صبر و رضا و تسلیم سے بلند تھے مگر پھر بھی بارگاہ حدیث میں عجز و تضرع، دعا و مناجات کرتے رہتے اور اپنی حاجتوں کو خدا سے طلب کرتے تھے اور یہ بات روحانی مقامات کے مخالف نہیں ہے، بلکہ ذکر خدا، محبوب سے انس و خلوت، کامل مطلق کی بارگاہ میں اظہار عبودیت و ذلت عارفین کی سب سے بڑی آرزو اور سالکین کے سلوک کا نتیجہ ہے۔

چوتھی فصل: صبر کے نتائج

یہ معلوم ہونا چاہئے کہ صبر کے بہت سے نتائج ہیں، ان میں سے ریاضت اور نفس کی تربیت (بھی) ہے۔ اگر انسان ناخوشگوار واقعات، زمانے کے مصائب و آلام، مشقت عبادات، زحمت مناسک اور نفسانی لذات کے ترک کرنے کی تلخیوں پر ایک مدت تک بمطابق فرمان خداوند عالم صبر کرے اور مشقتوں کو خواہ وہ سخت و ناگوار ہوں برداشت کرے تو رفتہ رفتہ نفس کو اس کی عادت ہو جائے گی اور وہ عادی ہو جائے گا اور سرکشی سے باہر آ جائے گا۔ مشقتوں کی سختیوں کو برداشت کرنا اس کیلئے آسان ہو جائے گا اور اس کے اندر

ایک نورانی اور رسخ ملکہ پیدا ہو جائے گا جس کی وجہ سے وہ مقام صبر سے ترقی کرکے دیگر بلند مقامات تک پہنچ سکتا ہے، بلکہ معاصی پر صبر کرنا تقوائے نفس کا منشأ ہوتا ہے اور طاعتوں پر صبر کرنے کا مقصد انس بخدا ہوتا ہے، بلاؤں پر صبر کرنا مقتضائے الٰہی پر خوشنودی و رضا کا باعث ہوتا ہے اور یہ سب اہل ایمان، بلکہ اہل عرفان کے بلند مقامات میں سے ہیں۔ اہل بیت عصمتؑ کی حدیثوں میں صبر کی بہت تعریف کی گئی ہے۔ چنانچہ کافی شریف میں حضرت امام صادقؑ تک سند پہنچ کر آپؑ سے منقول ہے: ﴿الصَّبْرُ من الايمان بمنزلة الرَّأسِ من الجسد، فاذا ذهب الرَّأسُ ذهب الجَسَدُ، وكذلك إذا ذهب الصَّبْرُ ذهب الايمان﴾ [۲۸] "آپؑ نے فرمایا ایمان کیلئے صبر کی وہی حیثیت ہے جو جسم میں سر کی ہوتی ہے، اگر سر نہ ہو تو جسم ختم ہو جاتا ہے، اسی طرح اگر صبر نہ ہو تو ایمان ختم ہو جاتا ہے"

دوسری حدیث میں حضرت امام سجادؑ تک سند پہنچا کر آپؑ سے منقول ہے: ﴿الصَّبرُ من الايمان بمنزلة الرَّأس من الجسد، ولا ايمان لمنْ لا صبر له﴾ [۲۹] "ایمان کیلئے صبر کی وہی حیثیت ہے جو جسم کیلئے سر کی ہوتی ہے، جس کے پاس صبر نہیں ہے اس کے پاس ایمان (بھی) نہیں ہے"

اس سلسلے میں احادیث بہت ہیں، ہم اس کے بعد مناسب مقام پر ان میں سے بعض کا ذکر کریں گے۔

صبر سعادت کے دروازوں کی کنجی اور ہلاکتوں سے نجات کا ذریعہ ہے، بلکہ صبر ہی تو انسان پر آسان اور مشکلات کو سہل کر دیتا، عزم و ارادے کو تقویت دیتا اور مملکت روح کو مستقل کرتا ہے۔ (اس کے مقابلہ میں) بے صبری باعث شرم ہے، ضعف نفس کی دلیل ہے، انسان کو بے ثبات، ارادے کو کمزور اور عقل کو سست کر دیتی ہے۔

جناب محقق خبیر خواجہ نصیر الدین طوسی (قدس سرہ) فرماتے ہیں: ﴿وهُوَ - اي الصَّبرُ - يمنع الباطن عن الاضطراب، واللسان عن الشكاية، والاعضاء عن الحركات الغير المعتادة﴾ [۳۰] "صبر باطن کو اضطراب سے، زبان کو شکایت سے، اور اعضاء کو غیر عادی حرکتوں سے روک دیتا ہے"

اس کے برخلاف انسان غیر صابر کا باطن و دل مضطرب و وحشت ناک، قلب لرزاں و متزلزل ہوتا ہے اور یہ خود بہت بڑی مصیبت اور بہت بڑی بلا ہے جو انسان کے سر پر نازل ہوتی ہے اور انسان سے آرام و راحت کو سلب کر لیتی ہے۔ لیکن صبر مصیبت کو ہلکا کرتا، دوں کو بیداؤں پر غلبہ دیتا اور ارادے کو مصیبتوں پر قاہر بناتا ہے اور بے صبر انسان کی زبان شکایت کیلئے ہر کس و ناکس کے سامنے کھل جاتی ہے اور یہ چیز لوگوں کے

سامنے رسوائی، کم ثباتی، خفت نفس اور لوگوں کی نظروں سے گر جانے کے علاوہ ملائکہ اور بارگاہ قدس الٰہی میں بے قدری کا سبب بھی ہے۔

جو شخص خدا اور محبوب مطلق کی طرف سے آئی ہوئی یک مصیبت کو برداشت نہیں کر سکتا اور جو شخص اپنے ولی نعمت کی ہزاروں نعمتوں کو دیکھنے اور ہمیشہ اس میں ڈوبے رہنے کے باوجود ایک مصیبت کو دیکھ کر مخلوق خدا کے سامنے زبان شکایت کھول دے، بھلا اس کا ایمان کیا ہے اور وہ مقام مقدس خدا کے سامنے کیسی تسلیم و رضا کا حامل ہے؟ لہذا یہ بات صحیح ہے کہ جس کے پاس صبر نہیں، اس کے پاس ایمان نہیں ہے۔ اے خدا کے بندے اگر خدا پر تیرا ایمان ہوتا تو درپیش معاملات کو قدرت کاملہ کا کرشمہ سمجھتا، تو کسی اور کو ان امور میں با اختیار نہ سمجھتا اور زمانے کی مصیبتوں کی شکایت غیر خدا سے نہ کرتا، بلکہ ان کو دل و جان سے قبول کر کے خدا کا شکر ادا کرتا۔

پس یہ باطنی اضطراب، زبانی شکایتیں، اعضا (و جوارح) کا غیر عادی بری حرکتیں سب گواہ ہیں کہ ہم اہل ایمان نہیں ہیں۔ جب تک نعمت مل رہی ہے صورتاً شکر کرتے ہیں، مگر وہ بھی بے مغز، بلکہ (یہ شکر بھی) زیادہ ہونے کے لالچ میں کرتے ہیں۔ جب کوئی مصیبت پیش آتی ہے یا کسی درد و بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو خدا کی شکایتیں اس کی مخلوق سے کرنے لگتے ہیں اور ہر کس و ناکس کے سامنے کنایتاً شکوہ اور اعتراض کرنے لگتے ہیں، رفتہ رفتہ یہ شکایتیں اور جزع و فزع خدا اور قضائے الٰہی کے بارے میں نفس کے اندر بغض و عناد کے بیج بونے لگتی ہیں اور آہستہ آہستہ درخت بن کر طاقتور ہوتا رہتا ہے، پھر ملکہ بن جاتا ہے، بلکہ (اگر) خدانخواستہ باطن ذات کی صورت، قضائے حق اور دشمنی حق کی صورت بغض اختیار کر لے تو پھر ہاتھوں سے لگام چھوٹ جاتی اور اختیار کی مہار ہاتھ سے نکل جاتی ہے اور پھر انسان کسی بھی طرح حال و خیال کے ضبط و نضباط پر قادر نہیں ہوتا اور وہ ظاہری و باطنی طور سے خدا کا دشمن ہو جاتا ہے۔ ور بالآخر خدا کی دشمنی لئے ہوئے اس دنیا سے کوچ کرتا او شقاوت، بدی و ظلمت دائمی سے دو چار ہو جاتا ہے۔ میں برے انجام اور بیمات عارضی سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ پس یہ بالکل درست ہے کہ جب صبر چلا جاتا ہے تو ایمان بھی چلا جاتا ہے۔

میرے عزیز! مطلب بہت اہم اور راہ بہت خطرناک ہے۔ دل و جان سے کوشش کر کے حوادث دنیا پر صبر و بردباری کو اپنا پیشہ بناؤ، مصیبتوں اور بلاؤں کا مردانہ وار مقابلہ کرو، نفس کو سمجھاؤ کہ جزع و فزع اپنی جگہ

پر خود ایک ننگ و عار ہے، اس سے مصیبتوں اور بلاؤں کے دور کرنے میں کوئی فائدہ بھی نہیں ہوگا۔ قضائے الٰہی اور خدا کی حتمی ارادے کی کمزور و ضعیف اور ناتواں مخلوق کے سامنے شکایت کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ جیسا کہ کافی کی حدیث شریف میں اس کی طرف اشارہ ہے

مُحَمَّدُ بْنُ يَعْقُوبَ بِإِسْنَادِهِ عَنْ سَمَاعَةَ بْنِ مِهْرَانَ، عَنْ أَبِي الْحَسَنِ عليه السلام قَالَ: قَالَ لِي ﴿مَا حَبَسَكَ عَنِ الْحَجِّ؟ قَالَ: قُلْتُ: جُعِلْتُ فِدَاكَ! وَقَعَ عَلَيَّ دَيْنٌ كَثِيرٌ وَذَهَبَ مَالِي، وَدَيْنِيَ الَّذِي قَدْ لَزِمَنِي هُوَ أَعْظَمُ مِنْ ذَهَابِ مَالِي، فَلَوْلَا أَنَّ رَجُلاً مِنْ أَصْحَابِنَا أَخْرَجَنِي مَا قَدَرْتُ أَنْ أَخْرُجَ. فَقَالَ لِي: إِنْ تَصْبِرْ تُغْتَبَطْ وَإِلَّا تَصْبِرْ يُنْفِذِ اللهُ مَقَادِيرَهُ رَاضِياً كُنْتَ أَمْ كَارِهاً﴾ ۳۱

''امام ابوالحسن کاظمؑ نے مجھ سے فرمایا تم کو کس چیز نے حج سے روکا؟ میں نے عرض کیا میری جان آپؑ پر فدا ہو جائے! میں بہت مقروض ہوں اور میرا مال چلا گیا، مال کے چلے جانے سے زیادہ اہمیت قرض کی ہے۔ اگر میرے ایک دوست نے میری مدد نہ کی ہوتی تو میں اس بار سے سبکدوش نہیں ہوسکتا تھا۔ پھر حضرتؑ نے مجھ سے فرمایا اگر صبر کرو گے تو قابل رشک ہوگے اور اگر صبر نہ کرو گے تو چاہے خوش ہو یا ناخوش خدا اپنی تقدیرات جاری کر کے رہے گا''۔

اس سے پتہ چلا کہ جزع و فزع سے کوئی فائدہ نہیں ہے، بلکہ اس سے ہولناک قسم کے ضرر وابستہ ہیں اور اس کے پیچھے ایمان سوز بلائیں ہیں اور خود صبر و بردباری کے اندر ثواب جزیل و اجر جمیل، خوبصورت صورتیں اور شریف برزخی تصویریں ملتی ہیں، چنانچہ اس حدیث شریف کی ذیل میں ہے کہ جس کی شرح ہم کر رہے ہیں ﴿وَكَذٰلِكَ الصَّبْرُ يُعَقِّبُ خَيْراً، فَاصْبِرُوا وَوَطِّنُوا أَنْفُسَكُمْ عَلَى الصَّبْرِ تُؤْجَرُوا﴾ ''اسی طرح صبر اپنے پیچھے اچھے کام رکھتا ہے لہٰذا صبر کرو اور اپنے نفوس کو صبر پر آمادہ کرو اس کا اجر ملے گا''۔ پس اس دنیا میں بھی صبر کا انجام اچھا ہے، جیسا کہ حضرت یوسفؑ کی مثال سے معلوم ہوتا ہے، اور یہ آخرت میں بھی موجب اجر ہے۔

کافی میں ابوحمزہ ثمالی (رحمۃ اللہ علیہ) سے منقول ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ﴿مَنِ ابْتُلِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ بِبَلَاءٍ فَصَبَرَ عَلَيْهِ، كَانَ لَهُ أَجْرُ أَلْفِ شَهِيدٍ﴾ ۳۲ ''جو مؤمن کسی بلا میں گرفتار ہو اور وہ اس پر صبر کرے تو اس کو ہزار شہید کا اجر ملے گا''۔

اس باب میں بہت سی احادیث نقل ہوئی ہیں، بعض کو میں اس کے بعد والی فصل میں ذکر کروں گا۔ اب

رہی یہ بات کہ صبر کی برزخی صورت بہت ہی اچھی وخوبصورت ہے۔ یہ بات مطابق برہان ہونے کے علاوہ حدیث شریف میں بھی اس کا ذکر ہے۔ چنانچہ کافی شریف میں ہے کہ امام صادقؑ نے فرمایا ﴿إِذَا دَخَلَ الْمُؤْمِنُ فِي قَبْرِهِ كَانَتِ الصَّلَاةُ عَنْ يَمِينِهِ وَالزَّكَاةُ عَنْ يَسَارِهِ وَالْبِرُّ مُطِلٌّ عَلَيْهِ، وَيَتَنَحَّى الصَّبْرُ نَاحِيَةً، فَإِذَا دَخَلَ عَلَيْهِ الْمَلَكَانِ اللَّذَانِ يَلِيَانِ مُسَاءَلَتَهُ، قَالَ الصَّبْرُ لِلصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ وَالْبِرِّ: دُونَكُمْ صَاحِبَكُمْ! فَإِنْ عَجَزْتُمْ عَنْهُ فَأَنَا دُونَهُ﴾ ۳۳ ''جب مومن اپنی قبر میں داخل ہوتا ہے تو نماز داہنی طرف زکات بائیں طرف اور نیکیاں سر پر سایہ فگن ہوتی ہیں اور صبر ایک کنارے رہتا ہے۔ جب نکیر ومنکر سوال کیلئے آتے ہیں تو صبر، نماز، زکات اور نیکیوں سے کہتا ہے اپنے دوست کا ساتھ دو! اگر تم اس سے عاجز آ گئے تو میں اس کی مدد کروں گا''۔

پانچویں فصل: صبر کے درجات

احادیث شریفہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صبر کے چند درجات ہیں اور انہیں درجات کے اعتبار سے اس کا اجر وثواب مختلف ہوتا ہے۔ چنانچہ کافی شریف میں حضرت علیؑ سے روایت ہے کہ رسول خداؐ نے فرمایا

﴿الصَّبْرُ ثَلَاثَةٌ: صَبْرٌ عِنْدَ الْمُصِيبَةِ وَصَبْرٌ عَلَى الطَّاعَةِ وَصَبْرٌ عَنِ الْمَعْصِيَةِ. فَمَنْ صَبَرَ عَلَى الْمُصِيبَةِ حَتَّى يَرُدَّهَا بِحُسْنِ عَزَائِهَا، كَتَبَ اللَّهُ لَهُ ثَلَاثَمِائَةِ دَرَجَةٍ مَا بَيْنَ الدَّرَجَةِ إِلَى الدَّرَجَةِ كَمَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ؛ وَمَنْ صَبَرَ عَلَى الطَّاعَةِ، كَتَبَ اللَّهُ لَهُ سِتَّمِائَةِ دَرَجَةٍ مَا بَيْنَ الدَّرَجَةِ إِلَى الدَّرَجَةِ كَمَا بَيْنَ تُخُومِ الْأَرْضِ إِلَى الْعَرْشِ؛ وَمَنْ صَبَرَ عَنِ الْمَعْصِيَةِ، كَتَبَ اللَّهُ لَهُ تِسْعَمِائَةِ دَرَجَةٍ مَا بَيْنَ الدَّرَجَةِ إِلَى الدَّرَجَةِ كَمَا بَيْنَ تُخُومِ الْأَرْضِ إِلَى مُنْتَهَى الْعَرْشِ﴾ ۳۴

''صبر تین قسم کا ہے: مصیبت پر صبر، اطاعت پر صبر اور معصیت پر صبر۔ پس جو مصیبت پر صبر کرکے اس کے غم کو اچھی طرح واپس کر دے (یعنی صبر جمیل کے ذریعے مصیبت کی شدت کو لوٹا دے) خدا اس کیلئے تین سو درجے لکھتا ہے، ایک درجے کا فاصلہ دوسرے درجے سے اتنا ہوتا ہے جتنا زمین وآسمان میں فاصلہ ہے اور جو طاعت پر صبر کرتا خدا اس کیلئے چھ سو درجے لکھتا ہے، ایک درجے کا فاصلہ دوسرے درجے سے اتنا ہوتا ہے جتنا زمین کی گہرائی سے عرش کا فاصلہ ہے اور جو معصیت پر صبر کرتا ہے اس کیلئے نو سو درجے لکھتا ہے، ایک درجے سے دوسرے درجے تک کا فاصلہ زمین کی جڑ سے عرش کی انتہا تک کے برابر ہوتا ہے''۔

اس حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ معصیت سے صبر کا درجہ صبر کے باقی تمام مراتب سے افضل ہوتا ہے، اس لیے کہ اس کے درجات بھی زیادہ ہیں اور درجات کے درمیان وسعت بھی زیادہ ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بہشت کی وسعت اس سے کہیں زیادہ ہے جو ہم محجوبین ومقیدین کے ذہن میں ہے اور جو بہشت کی حد بندی میں کہا گیا ہے کہ ﴿عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ﴾ ۳۵ ''اس کا عرض آسمانوں اور زمین کے عرض کے برابر ہے''۔ یہ شاید بہشت اعمال کی حد بندی ہے اور حدیث شریف میں بہشت خلاق (کا ذکر) آیا ہے اور بہشت خلاق کی میزان ارادے کی قوت اور کمال ہے تو اس کی کوئی حد بندی نہیں کی جاسکتی۔

بعض (علماء) نے فرمایا ہے کہ یہاں ''بلندی'' مراد ہے اور آیت شریفہ میں ''عرض'' مراد ہے۔ ۳۶ اس میں کوئی منافات نہیں ہے، کیونکہ ہوسکتا ہے عرض میں (دونوں) برابر ہوں اور بلندی میں مختلف ہوں (مگر) یہ بعید ہے، اس لیے کہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے، عرض سے وسعت مقصود ہے نہ وہ عرض جو طول کے مقابل بولا جاتا ہے، جیسے سماوات وارض میں بھی عرض بمقابل اس طول کے نہیں ہے جو عرفاً وعقلاً مفہوم ہیں اگرچہ طبیعی علوم کے ماہرین کی اصطلاح میں عرض دوسرے پہلو کے معنی میں آیا ہے، مگر قرآن اصطلاحوں کے مطابق رفتار نہیں کرتا۔

کافی شریف میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ رسول خدا ؐ نے فرمایا

﴿سَيَأْتِي عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يُنَالُ فِيهِ الْمُلْكُ إِلَّا بِالْقَتْلِ وَالتَّجَبُّرِ، وَلَا الْغِنَى إِلَّا بِالْغَصْبِ وَالْبُخْلِ، وَلَا الْمَحَبَّةُ إِلَّا بِاسْتِخْرَاجِ الدِّينِ وَاتِّبَاعِ الْهَوَى، فَمَنْ أَدْرَكَ ذٰلِكَ الزَّمَانَ فَصَبَرَ عَلَى الْفَقْرِ وَهُوَ يَقْدِرُ عَلَى الْغِنَى وَصَبَرَ عَلَى الْبِغْضَةِ وَهُوَ يَقْدِرُ عَلَى الْمَحَبَّةِ وَصَبَرَ عَلَى الذُّلِّ وَهُوَ يَقْدِرُ عَلَى الْعِزِّ، آتَاهُ اللّٰهُ ثَوَابَ خَمْسِينَ صِدِّيقًا مِمَّنْ صَدَّقَ بِي﴾ ۳۷

''عنقریب میری امت پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جس میں حکومت قتل وجبر سے حاصل ہوگی، بے نیازی غصب اور بخل سے حاصل ہوگی، محبت، دین کو مسخر کرکے نہیں بلکہ دین سے نکلنے اور خواہش نفس کی پیروی سے حاصل ہوگی۔ جو شخص اس زمانہ کو پالے مالداری پر قدرت کے باوجود ناداری پر صبر کرے اور محبت پر قدرت کے باوجود بغض پر صبر کرے، عزت حاصل کرسکنے کے باوجود ذلت پر صبر کرے، خدا اس کو ایسے پچاس صدیقوں کا ثواب عطا کرے گا جنہوں نے میری تصدیق کی ہو''۔

اسی مضمون کے قریب حضرت علیؑ سے بھی حدیث منقول ہے۔ ۳۸ خلاصہ یہ کہ اس سلسلے میں بہت سی حدیثیں نقل ہوئی ہیں مگر ہم نے صرف انہیں چند احادیث شریفہ پر اکتفا کیا ہے۔

چھٹی فصل اہل معرفت کے درجات صبر

جان لو یہاں تک جو ذکر ہوا وہ عوام و متوسطین کے حالات سے متعلق تھا، جیسا کہ اس حدیث کے شروع کی فصلوں میں ہم نے اشارہ کیا کہ صبر کو متوسطین کے مقامات میں شمار کیا گیا ہے، لیکن صبر کے دوسرے درجات بھی ہیں جو اہل سلوک، کاملین اور اولیا سے متعلق ہیں۔ چنانچہ ان میں سے ایک "صبر فی اللہ" ہے یعنی میدان جہاد میں ثابت قدمی اور پسندیدہ و محبوب چیزوں کو، بلکہ خود اپنے کو راہ محبوب میں ترک کر دینا ہے اور یہ اہل سلوک سے متعلق ہے۔

دوسرا مرتبہ "صبر مع اللہ" ہے۔ یہ ان اہل حضور مشاہدین جمال سے متعلق ہے جب وہ زیور بشریت سے خارج ہوں، افعال و صفات کے لباس سے مجرد ہوں اور ان کے قلوب اسما و صفات کی تجلیات سے روشن ہوں، واردات انس و ہیبت ان پر وارد ہوں، تلونات سے نفس محفوظ اور مقام انس و شہود سے تمکین ہو۔

تیسرا مرتبہ "صبر عن اللہ" ہے۔ یہ ان عشاق و مشتاقین کا درجہ ہے جو اہل شہود و عیان ہوں اور یہ اس صورت میں ہے جب وہ لوگ اپنے عالم کی طرف رجوع کریں اور عالم کثرت و ہوشیاری کی طرف پلٹ آئیں، یہ سب سے دشوار تر اور مشکل تر مرتبہ ہے۔ مولائے سالکان پیشوائے کاملان امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے دعائے کمیل میں اس جملہ سے اسی مطلب کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ﴿فَهَبْنِي يا إلهِي وسيِّدِي ومولايَ صبرتُ على عذابِكَ فكيفَ أصبِرُ على فراقِكَ﴾ ۳۹ "معبودا! فرض کر لے کہ میں تیرے عذاب پر صبر کر لوں، مگر تیرے فراق پر کیونکر صبر کر سکتا ہوں"۔

﴿ورُوِيَ أنَّ شابّاً من المُحِبِّينَ سأَلَ الشِّبْلِيَّ عنِ الصَّبْرِ فقالَ: أيُّ الصَّبْرِ أشدُّ؟ فقالَ الصَّبْرُ للهِ فقالَ لا فقالَ الصَّبْرُ باللهِ فقالَ: لا فقالَ الصَّبْرُ على اللهِ فقالَ: لا فقالَ الصَّبْرُ في اللهِ فقالَ لا فقالَ الصَّبْرُ مَعَ اللهِ فقالَ لا فقالَ وَيْحَكَ فأيُّ؟ فقالَ الصَّبْرُ عنِ اللهِ فشهقَ الشِّبْلِيُّ وخرَّ مغشِيّاً عليهِ﴾ ۴۰ روایت کی گئی ہے کہ محبین میں سے ایک جوان نے شبلی

سے صبر کے بارے میں پوچھا کہ کونسا صبر زیادہ شدید ہے؟ شبلی نے کہا: الصبر للہ، اس نے کہا نہیں۔ پھر شبلی نے کہا الصبر باللہ، اس نے کہا نہیں۔ پھر شبلی نے کہا: الصبر علی للہ، جوان نے کہا نہیں۔ شبلی نے کہا الصبر فی اللہ، جوان نے کہا نہیں۔ شبلی نے پھر کہا الصبر مع اللہ، جوان نے کہا نہیں۔ اس پر شبلی بولے تجھ پر روئے ہو! پھر کونسا صبر ہے؟ اس نے کہا الصبر عن اللہ: یہ سن کر شبلی نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر گر پڑے''۔

چوتھا مرتبہ ''الصبر باللہ'' ہے اور یہ اہل تمکین واستقامت کیلئے ہے جو ہوشیاری اور بقا باللہ اور خدائی اخلاق سے متصف ہونے کے بعد ان لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ یہ اکمل ترین لوگوں کے علاوہ کسی کو نصیب نہیں ہوتا اور چونکہ ان مراتب تک ہماری رسائی نہیں ہوتی اس لئے اس کتاب میں اس کے ذکر کا فائدہ نہیں ہے۔

والحمد للہ اولاً وآخراً

وصلی اللہ علی محمد وآلہ الطاہرین

توضیحات (۱۲)

۱۔ اصول کافی، ج۲، ص۸۹، کتاب ایمان وکفر، باب صبر، حدیث۶۔

۲۔ میں نے اس کی بڑی پٹائی کی اور اس طرح توڑ کر وہ دشمن کے ساتھ ہموار ہو گیا۔

۳۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۲۲۰؛ اور نہایہ ابن اثیر، ج۲، ص۱۲۸

۴۔ نہایۃ اللغۃ، باب الدال مع الکاف۔

۵۔ حدیث ، حاشیہ۲۔

۶۔ مرآۃ العقول، ج۹، ص۳۰، کتاب ایمان وکفر، باب صبر، حدیث۲۔

۸۔ وسائل الشیعہ، ج۲، ص۹۰۳، کتاب الطہارۃ، ابواب الدفن، باب ۷۶، حدیث ۷

۹۔ مرآۃ العقول، ج۸، ص۱۳، کتاب ایمان وکفر، باب صبر، حدیث۲۔

۱۰۔ مصباح الشریعہ، ص۵۳۶، باب صدم ۱۰، حقیقت عبودیت

۱۱۔ علل الشرائع، ج۱، ص۱۲۵، حدیث۳ میں امام سجادؑ کی روایت کے ضمن میں یہ مضمون تھوڑے سے اختلاف عبارت سے نقل ہوا ہے

۱۲۔ سورۂ ص، آیت ۲۹/

۱۳۔ سورۂ قمر، آیت ۴۸

۱۴۔ علم الیقین، ج۲، ص۷۳۲، مقصد سوم، باب دوم، فصل ۸؛ احیاء العلوم، ج۴، ص۱۹، کتاب توبہ۔

۱۵۔ یہ حضرت ابی عبداللہؑ کی حدیث شریف الدنیا سجن المؤمن (دنیا مومن کیلئے قید خانہ ہے) کی طرف اشارہ ہے۔
اصول کافی، ج۲، ص۲۵۰، کتاب ایمان وکفر

۱۶۔ حدیث۲، حاشیہ۱۵

۱۷۔ یہ شعر سعدی شیرازی کا ہے

۱۸۔ حدیث۱۵، حاشیہ۳۲۔

۱۹۔ وصایائے قرآنی، ص۸۰، فصل ۵، ۱۰، ۳

۲۰۔ منازل السائرین، ص۳۸، باب الصبر۔

۲۱۔ رضی الدین علی بن موسیٰ بن جعفر (۵۸۹-۶۶۴) جو ابن طاؤس کے نام سے مشہور تھے، کامل ترین علمائے شیعہ میں شمار

ہوتے تھے۔ عالم، عابد، زاہد اور صاحب مقامات و کرامات تھے۔ حضرت معروف کرخی، امام رضا سے بہت قریب تھے اور معروف ہیں خصوصاً خدمت خلق و عبادت میں آپ کی کارنامے بہت مشہور ہیں ... سوانح کشف المحجوب، تحقیق، مقامات اعمال وغیرہ ہیں۔

۲۲۔ کشف المحجوب، ص ۳۱، فصل ۳۸۔

۲۳۔ حدیث ۳، حاشیہ ۱۳

۲۴۔ سورۂ ص، آیت ۴۱۔

۲۵۔ سورۂ ص، آیت ۴۴ و ۴۵

۲۶۔ سورۂ یوسف، آیت ۸۶

۲۷۔ شرح منازل السائرین، ص ۸۵، باب صبر۔

۲۸۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۸۷، کتاب ایمان و کفر، باب صبر، حدیث ۲

۲۹۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۸۹، کتاب ایمان و کفر، باب صبر، حدیث ۳۔

۳۰۔ اوصاف الاشراف، ص ۳۰، فصل ۵، باب ۳۔

۳۱۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۹۰، کتاب ایمان و کفر، باب الصبر، حدیث ۸۔

۳۲۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۹۲، کتاب ایمان و کفر، باب الصبر، حدیث ۱۸

۳۳۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۹۰، کتاب ایمان و کفر، باب الصبر، حدیث ۹

۳۴۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۹۱، کتاب ایمان و کفر، باب الصبر، حدیث ۵

۳۵۔ یہ آیت مبارکہ وسارعوا الی مغفرۃ من ربکم وجنۃ عرضھا السموات والارض اعدت للمتقین کی طرف اشارہ ہے۔ سورۂ آل عمران، آیت ۱۳۳

۳۶۔ مرآۃ العقول، ج ۸، ص ۱۲۸، کتاب ایمان و کفر، باب صبر، حدیث ۵۔

۳۷۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۹۱، کتاب ایمان و کفر، باب صبر، حدیث ۴

۳۸۔ بحار الانوار، ج ۶۸، ص ۷۶، کتاب ایمان و کفر، باب ۶۲، حدیث ۹

۳۹۔ ملاحظہ کیجیے مصباح المتہجد و سلاح المتعبد، ص ۵۸۲، ماہ شعبان کے اعمال میں۔

۴۰۔ شرح منازل السائرین، ص ۸۸، باب الصبر

سترھویں حدیث

بالسَّند المتّصل الى الامام الأقدم حجة الفرقة ورئيس الأمّة، مُحمّد بن يعقوب الكُلَيني (رضي الله عنه)، عن مُحمّد بن يحيى، عن أحمد بن مُحمّد بن عيسى، عن الحسن بن محبوب، عن مُعاوية بن وهب قال:

سمعتُ أبا عبدالله عليه السلام يقولُ: ﴿إذا تابَ العبدُ توبةً نصوحاً أحبّه اللهُ فستر عليه في الدُّنيا وَالآخرة

فقلتُ: وكيف يَستُرُ عليه؟

قال: يُنسي ملكيه ما كتبا عليه من الذُّنوب، ثمّ يُوحي الى جوارحه: اكتُمي عليه ذنوبَه، ويُوحي الى بقاع الأرض: اكتُمي عليه ما كان يعملُ عليكِ من الذُّنوب. فيلقى اللهَ حين يلقاهُ وليس شيءٌ يشهدُ عليه بشيءٍ من الذُّنوب﴾۔

ترجمہ: معاویہ بن وہب کا بیان ہے کہ میں نے امام جعفر صادقؑ کو فرماتے ہوئے سنا ''جب کوئی بندہ توبۂ خالص کرتا ہے تو خدا اس کو چاہنے لگتا ہے اور دنیا و آخرت میں اس کی پردہ پوشی فرماتا ہے۔ میں نے عرض کیا: کیونکر پردہ پوشی فرماتا ہے؟ فرمایا اس کے دونوں ملک نے جو گناہ لکھے ہوتے ہیں ان کو فراموش کرا دیتا ہے اور پھر اس کے (اعضاء) جوارح کو حکم دیتا ہے اس کے گناہوں کو چھپ دو، اور زمین کے ٹکڑوں کو حکم دیتا ہے تمہارے اوپر جو گناہ اس نے کئے ہیں ان کو چھپ دو، پھر جب وہ خدا سے ملاقات کرتا ہے اور ملاقات کے وقت کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی جو اس کے خلاف اس کے گناہوں کی گواہی دے''۔

حقیقت توبہ

شرح: یہ جان لو کہ اہم اور مشکل ترین منازل میں سے (ایک) توبہ ہے۔ توبہ کا مطلب ہے گناہوں اور نافرمانی کی کدورت کی وجہ سے روحانیت اور فطرت کا نور جو طبیعت کی تاریکی میں چھپ چکا تھا پھر طبیعت کی جانب سے روحانیت کی طرف پلٹ آئے۔

اس اجمال کی بالجملہ تفصیل یہ ہے کہ ابتدائے فطرت میں نفس ہر قسم کے کمال و جمال اور نور و بہجت سے خالی ہوتا ہے اور ان کے مقابل کی چیزوں سے بھی خالی ہوتا ہے یعنی بالکل ایک کورا کاغذ ہوتا ہے نہ اس میں روحانی کمالات ہوتے اور نہ اس کے مخالف صفات ہوتے ہیں۔ البتہ اس میں استعداد کی روشنی اور ہر مقام کے حصول کی لیاقت و صلاحیت، ودیعت رہتی ہے۔ اس کی فطرت، استقامت پر اور اس کا خمیر انوار روحیہ سے گویا خمیر کیا ہوتا ہے، پھر جب وہ گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں تاریکی پیدا ہونے لگتی ہے گناہ جتنا زیادہ ہوگا تاریکی اتنی زیادہ ہوگی، یہاں تک کہ گناہ کرتے کرتے قلب بالکل تاریک و سیاہ ہو جائے گا اور نور فطرت بجھ جائے گا اور وہ شقی ابدی ہو جائے گا، لیکن اگر ان حالات کے درمیان پورے دل کے سیاہ ہونے سے پہلے وہ خواب غفلت سے بیدار ہو گیا اور بیداری کے منزل کے بعد توبہ کی منزل پر بھی پہنچ گیا اور اس منزل کی شرائط، جن کا بعد لاذکر کیا جائے گا، کو بھی اس نے پورا کر لیا تو تاریکی اور فطری کدورت سے نکل کر دوبارہ فطرت اصلی کی روشنی اور اپنی ذاتی روحانیت کی طرف پلٹ آئے گا اور لوح دل پھر کمالات اور ان کے ضد سے خالی ہو جائے گی۔ جیسا کہ حدیث شریف میں مشہور ہے ﴿التائب من الذنب کمن لا ذنب له﴾۲ "گناہوں سے توبہ کرنے والا اس شخص کے مانند ہے جس نے گناہ ہی نہ کئے ہوں"۔

پس معلوم ہوا کہ توبہ کی حقیقت طبیعت کے احکام و انجام سے پلٹ کر روحانیت و فطرت کے احکام کی طرف آجانا ہے اور انابت (لوٹنے) کی حقیقت فطرت و روحانی سے پلٹ کر خدا کی طرف آنا اور شہوت نفس سے منزل مقصود کی طرف ہجرت کرنا ہے۔ پس توبہ کی منزل انابت کی منزل سے مقدم ہے، مگر اس کی تفصیل اس کتاب کے مناسب نہیں ہے۔

پہلی فصل: اہم نکتہ

نجات وہدایت کے راستے پر چلنے والے کیلئے ایک اہم نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے اور وہ یہ کہ صحیح ومکمل توبہ ذکر کیے جانے والی شرائط کے ساتھ بہت ہی مشکل چیز ہے۔ بہت کم لوگ اس مقصد کو حاصل کر پاتے ہیں، بلکہ گناہاں کبیرہ اور مہلکات کے ارتکاب کے بعد زیادہ تر انسان توبہ سے غافل ہو جاتا ہے۔ اگر دل کی کھیتی میں گناہوں کا درخت ثمر آور اور طاقتور ہو جائے اور اس کی جڑیں مضبوط ہو جائیں تو پھر اس کے نتائج بہت ہی خراب ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ انسان مکمل طور پر توبہ سے منصرف ہو جاتا ہے اور اگر کبھی توبہ کی یاد آ جاتی ہے تو وہ کاہلی اور آج کل، اس ماہ و آئندہ ماہ کر کے ٹالتا رہتا ہے اور اپنی جگہ کہتا ہے "آخری عمر اور بڑھاپے میں صحیح توبہ کریں گے"، حالانکہ یہ خدا سے مکاری ہے جس سے وہ غافل ہے ﴿واللہ خیر الماکرین﴾ [1] "خدا سب سے بہتر مکاری کی توڑ کرتا ہے"۔ یہ گمان نہ کرو کہ گناہوں کی جڑوں کے مضبوط ہو جانے کے بعد انسان توبہ کر سکتا ہے یا توبہ کی شرائط پوری کر سکتا ہے، بہر حال توبہ تو جوانی ہی میں ہے جب گناہوں کا بار کم، دل کی کدورت قلیل، ظلمت باطن ناقص اور شرائط توبہ سہل و آسان ہوا کرتی ہیں۔ بڑھاپے میں انسان کی حرص وطمع، حب جاہ و مال اور امیدیں بڑی ہی ہو جاتی ہیں اور یہ بات مجرب ہے اور حدیث شریف رسول شاہد ہے۔[2]

میں فرض کیے لیتا ہوں کہ انسان بڑھاپے میں توبہ کرے گا (مگر یہ کہاں سے معلوم ہے کہ) بڑھاپے تک پہنچ جائے گا یا جوانی میں اور نافرمانی کی حالت میں اس کو موت نہیں آئے گی اور اس کو مہلت مل جائے گی؟ بوڑھوں کا کم پایا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ موت جوانوں سے زیادہ قریب ہے۔ ایک پچاس فرد آبادی والے شہر میں پچاس ساٹھ سالہ بوڑھے نہیں دکھائی دیتے

لہذا (میرے) عزیز! شیطان کی مکاری سے ڈرو اور ہوشیار رہو اور اپنے خدا سے حیلہ و مکاری نہ کرو کہ پچاس سال یا اس سے زیادہ شہوت پرستی کر کے مرتے دم توبہ و استغفار کریں گے یہ خیال خام ہے۔ اگر تم نے حدیث میں (خود) دیکھا ہے یا سنا ہے کہ خداوند عالم نے اس امت پر یہ فضل و کرم کیا ہے کہ آثار مرگ دیکھنے سے پہلے یا مرنے سے پہلے تک لوگوں کی توبہ قبول کرے گا۔[3] تو یہ بالکل صحیح ہے، مگر افسوس تو یہی ہے کہ کیا اس وقت وہ توبہ کر لے گا، کیا توبہ صرف لفظ ہے؟ توبہ کا پورا کرنا بہت دشوار ہے، برائیوں سے رکنا اور

گناہ نہ کرنے کا عزم (بالجزم) کرنا سعی وعملی ریاضتوں کا محتاج ہے، ورنہ شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ انسان خود بخود توبہ کی فکر کرے یا اس کو توبہ کرنے کی توفیق نصیب ہو جائے یا اگر توفیق بھی ہو تو شرائط صحت اور قبولیت کے ساتھ یا شرائط کمال کے ساتھ توفیق نصیب ہو (یہ بہت مشکل ہے)، کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ توبہ کی فکر کرنے سے پہلے یا توبہ کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے موت آ دبوچتی ہے اور انسان اپنے سنگین گناہوں اور بے انتہا معصیتوں کے ساتھ اس دنیا سے منتقل ہو جاتا ہے پھر خدا جانے وہ کن بدبختیوں سے دوچار ہو۔ بالفرض انسان اہل نجات سے ہے اور اس کا انجام بخیر ہے پھر بھی اس دوسری دنیا میں گناہوں کی تلافی آسان نہیں ہے۔ کتنی زحمت اور فشار برداشت کرنا ہوگا اور کتنا جلنا ہوگا جس کے بعد انسان شفاعت کے لائق ہوگا اور ارحم الراحمین کی رحمت کا مستحق ہوگا؟ لہذا میرے عزیز! جتنی جلدی ہو سکے کمر ہمت کس لو، عزم محکم کرلو ارادہ قوی کرلو اور جب تک جوانی ہے یا دنیا میں زندگی ہے گناہوں سے توبہ کرلو، خدا کی دی ہوئی فرصت کو ہاتھ سے نہ جانے دو، شیطان کی گمراہی اور نفس امارہ کی مکاریوں کی پرواہ نہ کرو۔

اہم نکتہ

ایک اور نکتے کی طرف بھی توجہ رکھنی چاہیے اور وہ یہ ہے کہ توبہ کرنے والے کے یہاں توبہ کے بعد پہلے والی روحانی و باطنی پاکیزگی اور خالص فطری نور باقی نہیں رہتا، جیسے آپ ایک کاغذ کو سیاہ بنانے کے بعد دوبارہ اس کو سفید بنانا چاہیں تو پہلے والی سفیدی اس میں پیدا نہیں ہوتی یا ٹوٹے ہوئے برتن کی اصلاح کریں تو وہ پہلے والی صورت ہرگز اختیار نہیں کر سکتا۔ جو دوست انسان کے ساتھ تمام عمر صفا و خلوص کے ساتھ رفتار کرے اس میں اور اس دوست میں جو خیانت کے بعد دوبارہ عذر خواہی کرے، بہت فرق ہے۔ اس کے علاوہ بہت کم ایسے لوگ ملیں گے جو صحیح طور پر توبہ کے وظائف پر عمل کر سکتے ہوں۔ لہذا انسان کو چاہیے کہ حتی الامکان معصیت و نافرمانی میں داخل ہی نہ ہو اس لئے کہ فاسد ہونے کے بعد نفس کی اصلاح بہت مشکل کام ہے اور اگر خدانخواستہ کوئی نافرمانی و معصیت میں مبتلا ہو جائے تو جتنی جلدی ممکن ہو علاج کرلے، کیونکہ کم فاسد ہونے والی چیز کی اصلاح جلد ہو سکتی ہے اور اصلاح بھی اچھی طرح ہو سکتی ہے۔

اے عزیز! بے اعتنائی اور سرسری طور سے اس مقام سے مت گزر جاؤ۔ اپنی حالت اور اپنے انجام میں کافی غور و فکر کرو۔ کتاب خدا، احادیث خاتم انبیاء و ائمہ ہدیٰ (سلام اللہ علیہم اجمعین)، علمائے امت کے

کلمات اور عقل وجدانی کے حکم کی طرف رجوع کرو اور اس دروازے کو جو تمام دروازوں کی چابی ہے اپنے لئے کھول لو اور اس منزل میں جو ہمارے اعتبار سے انسانیت کی سب سے عمدہ منازل میں سے ہے، داخل ہو جاؤ اور اس کی اہمیت سمجھو اور اس کی پابندی کرو، خداوند عالم سے حصول مقصد کی توفیق کا سوال کرو۔ رسول خدا اور ائمہ ہدیٰ (سلام اللہ علیہم) کی روحانیت سے مدد مانگو۔ ولی امر، ناموس دہر حضرت امام عصر (ع) کی پناہ مانگو، یقیناً وہ جناب کمزوروں کی دستگیری اور تھکے ماندے لوگوں کی مدد فرماتے ہیں اور بے چاروں کی دادرسی کرتے ہیں۔

دوسری فصل

ارکـــان توبہ

یہ سمجھ لو کہ مکمل توبہ کیلئے کچھ شرائط وارکان ہیں جب تک وہ پورے نہ ہوں گے صحیح توبہ حاصل نہ ہوگی ہم ان میں سے اہم اور لازمی شرائط کا ذکر کریں گے۔

ان میں سے ایک، گزشتہ گناہوں اور غلطیوں پر ندامت و پشیمانی ہے جو سب سے بڑا رکن ہے۔

دوسرا دوبارہ پھر کبھی گناہ نہ کرنے کا عزم بالجزم کرنا ہے۔ یہ دونوں درحقیقت، حقیقت توبہ کو ثابت کرنے والے اور توبہ کے ذاتی ارکان میں سے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے عمدہ اس مقام کا حاصل کرنا اور اس حقیقت کا متحقق ہونا ہے اور وہ اسی طرح ہے کہ انسان اس بات کو یاد رکھے کہ گناہوں کا اثر روح پر ہوتا ہے اور اس کا برا نتیجہ عالم برزخ اور قیامت میں (ظاہر) ہوتا ہے، یہ عقلاً بھی ثابت ہے اور نقلاً بھی۔ اصحاب معرفت کے یہاں اس پر برہان و دلیل قائم ہے اور اہل بیت عصمت کی روایت میں وارد ہے کہ عالم برزخ وقیامت میں گناہوں کی مناسبت سے ان کی صورتیں ہوں گی جو اس عالم میں زندگی و ارادے کی مالک ہوں گی اور انسان کو شعور وارادے سے عذاب واذیت پہنچائیں گی۔ خود آتش جہنم انسان کو اپنے شعور وارادے سے جلائے گی، کیونکہ وہ نشاۃ، نشاۃ حیات ہے۔ پس اس عالم میں ہمارے اچھے یا برے اعمال کے نتیجے اپنی اپنی صورتوں میں ہمارے ساتھ محشور ہوں گے۔ قرآن مجید اور احادیث شریف میں اس بات کو صراحتاً اور اشارتاً بہت سی جگہوں پر بیان کیا گیا ہے اور یہ بات حکمائے مشرق کے مسلک اور اہل سلوک وعرفان کے ذوق ومشاہدات کے مطابق (بھی) ہے۔ اسی طرح ہر گناہ کا اثر روح میں حاصل ہوتا ہے جس کو احادیث شریفہ میں ''سیاہ نقطہ''[1] سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہ سیاہی قلب وروح میں پیدا ہوتی ہے، پھر تھوڑی

تھوڑی بڑھتی رہتی ہے اور انسان کو کافر وزندیق بنا کر شقاوت ابدی کی منزل تک پہنچا دیتی ہے۔ چنانچہ اس سے پہلے بھی اس جملے کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے۔

پس اگر عقلمند انسان اس مطلب پر متوجہ ہو جائے اور انبیاء واولیا (علیہم السلام) اور عرفا وحکما اور علما (رضوان اللہ علیہم) کے قول پر ایک معالج طبیب کے قول کے برابر اعتنا کرے تو یقیناً گناہوں سے پرہیز کرنے لگے گا، اور ان کے قریب بھی نہ پھٹکے گا اور اگر خدانخواستہ کسی گناہ میں مبتلا ہو گیا تو فوراً الگ ہو جائے گا اور پشیمان ہوگا اور ندامت کا اظہار اس کے دل میں ہو جائے گا اور اس ندامت و پشیمانی کا نتیجہ بہت بڑا ہے اور اس کے اثرات بہت اچھے ہیں اور ندامت کی وجہ سے معصیت ومخالفت چھوڑ دینے کا عزم پختہ ہو جائے گا توبہ کے ان دونوں ارکان کے حاصل ہوتے ہی راہ آخرت کے سالک کا کام آسان ہو جائے گا اور الٰہی توفیقات اس کے شامل حال ہو جائیں گی اور بحکم آیت ﴿انّ اللہ یحبّ التّوّابین ویحبّ المتطهّرین﴾ ''خدا توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے'' اور اس حدیث شریف کے مطابق وہ خدا کا محبوب ہو جائے گا، بشرطیکہ اس کی توبہ خالص ہو۔ انسان کو چاہئے کہ علمی وعملی ریاضت اور ضروری تدبر وتفکر کے ساتھ کوشش کرے کہ اس کی توبہ خالص ہو اور یہ جان لے کہ خدا کی محبوبیت کو کسی میزان میں تولا نہیں جا سکتا۔ خدا جانتا ہے کہ ان دنیاؤں میں محبت حق کی صورت کتنے معنوی انوار اور کتنے تجلیات کا حامل رکھتی ہے اور خدا اپنے محبوب کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔

اے انسان! تو کتنا ظالم وجاہل ہے تو اپنے ولی نعمت (خدا) کی نعمتوں کی قدر نہیں کرتا! تو سالہا سال سے ایسے ولی نعمت کی مخالفت کرتا ہے جس نے تمام راحت وآسائش کے اسباب نعوذ باللہ اپنے کسی فائدے کے بغیر تیرے لئے مہیا کئے، تو نے اپنی بے حیائی وسرکشی کی انتہا کر دی، اب جبکہ تو نادم ہو گیا اور لوٹ آیا ہے، اور تو نے توبہ کر لی تو اس نے پھر تجھے اپنا محبوب بنا لیا، یہ کتنی بڑی رحمت اور کتنی عظیم نعمت ہے؟

خداوندا! ہم تیری نعمتوں کے شکر سے عاجز ہیں، ہماری اور ساری کائنات کی زبان تیری حمد وثنا سے گنگ ہے۔ سوائے اس کے کہ شرم سے سر جھکا دیں اور اپنی بے حیائیوں کی معذرت کریں اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ ہماری حیثیت ہی کیا ہے کہ تیری رحمتوں کے لائق بنیں، لیکن تیری رحمت کی وسعت اور تیری عام نعمت اس سے کہیں زیادہ ہے کہ بیان (وتحریر) میں آسکے ﴿انت کما اثنیت علی نفسک﴾ ''بے شک تو ویسا ہی ہے جیسا کہ تو نے خود اپنی ثنا بیان فرمائی ہے''۔

انسان کو اس کی بھی کوشش کرنی چاہئے کہ ندامت کی صورت دل میں قوی ہوجائے تا کہ وہ انشاءاللہ ''بیت احتراق'' میں وارد ہو جائے اور وہ یہ ہے کہ وحشت ناک معصیتوں کے آثار وانجام میں غور وفکر کرنے کی وجہ سے دل میں ندامت کو طاقت عطا کرے اور ﴿نار الله الموقدة﴾ کے نمونے کو خود ہی اپنے دل میں روشن کرے اور قلب کو آتش ندامت سے جلادے تا کہ اس آگ میں تمام گناہ جل جائیں اور دل کی کدورتیں اور زنگ ختم ہو جائیں (اور یہ) جان لے کہ اگر اس آگ کو اس دنیا میں اپنے لئے روشن کرے گا اور اس جہنم کے دروازے کو جو بہشت کا باب الابواب ہے، اپنے لئے کھولے گا اور اس دنیا سے منتقل ہو جائے گا تو مجبوراً اس عالم میں اس کیلئے آتش سوزاں کا انتظام کیا جائے گا اور جہنم کے دروازے اس کیلئے کھول دیئے جائیں گے اور رحمت وبہشت کے دروازے اس پر بند کر دیئے جائیں گے

پروردگارا! ہم کو دردمند دل دے اور آتش ندامت سے ندامت کی چنگاری ہمارے دل میں بھڑکا دے اور اس کو اسی آتش دنیا سے جلادے ہمارے دل کی کدورتوں کو دور کردے اور ہم کو اس دنیا سے گناہوں کے نتائج کے بغیر لے جا ﴿انک ولي النعم وعلى كل شيء قدير﴾۔

تیسری فصل، شرائط توبہ

اس سے پہلے والی فصل میں جو بیان کیا گیا وہ توبہ کے ارکان تھے۔ توبہ کیلئے کچھ شرائط قبول اور (کچھ) شرائط کمال بھی ہیں جن کو ہم ترتیب سے بیان کریں گے۔ (قبولی) توبہ کیلئے دو شرطیں ہیں جو بہت عمدہ ہیں اور کمال کیلئے بھی ضروری ہیں۔ ہم باب میں مولیٰ الموحدین حضرت علیؑ کے کلام کا ذکر کریں گے، کیونکہ حضرتؑ کا کلام جوامع الکلم ہے اور کلام ملوک، ملوک کلام ہوا کرتا ہے۔

روي في نهج البلاغة ان قائلاً قال بحضرته عليه السلام استغفر الله

فقال له ﴿ثكلتك امك، اتدري ما الاستغفار؟ ان الاستغفار درجة العليين وهو اسم واقع على ستة معان: اولها، الندم على ما مضى. والثاني، العزم على ترك العود اليه ابداً. والثالث: ان تؤدي الى المخلوقين حقوقهم حتى تلقى الله سبحانه املس ليس عليك تبعة. والرابع: ان تعمد الى كل فريضة عليك ضيعتها فتؤدي حقها. والخامس: ان تعمد الى اللحم الذي نبت على السحت فتذيبه بالاحزان حتى تلصق الجلد بالعظم وينشأ بينهما لحم جديد. والسادس

اَنْ تُذِیقَ الجِسْمَ اَلَمَ الطَّاعَةِ کَمَا اَذَقْتَهُ حَلَاوَةَ المَعْصِیَةِ، فَعِنْدَ ذٰلِکَ تَقُولُ: اَسْتَغْفِرُ اللّٰه ﴾[۱۲]

جناب سید جلیل القدر علامہ سید رضی (رضی اللہ عنہ)[۱۱] نہج البلاغہ میں روایت فرماتے ہیں کہ

''ایک شخص نے حضرت علیؑ کے سامنے ﴿اَسْتَغْفِرُ اللّٰه﴾ کہا۔ حضرتؑ نے فرمایا: تیری ماں تیرے ماتم میں بیٹھے! کیا تو جانتا ہے کہ استغفار کیا ہے؟ (سن لے) استغفار علیین کا درجہ ہے اور یہ ایک ایسا اسم ہے جو چھ معنی پر بولا جاتا ہے:

اول۔ گزشتہ افعال پر ندامت ہے۔

دوئم: ہمیشہ کیلئے اس کے نہ کرنے کا محکم ارادہ ہے۔

سوئم مخلوق کے حقوق کو (مرتے دم تک) ادا کرنا تاکہ جب تم خدا سے ملو تو تم پاک پاکیزہ ہو اور تمہارے پیچھے کوئی چیز نہ ہو (تمہارے ذمے کسی کا حق نہ ہو)۔

چہارم ہر اس فریضہ کی طرف متوجہ ہو جانا جس کو تم ضائع کر چکے ہو، پس اس کے حق کو ادا کرو۔

پنجم اس گوشت کی طرف متوجہ ہونا جو حرام سے اگا ہے، رنج و غم سے اس کو پگھلا کر کھال کو ہڈی سے ملا دو پھر (دوبارہ) کھال اور ہڈی کے درمیان گوشت پیدا ہو۔

ششم جسم کو طاعت کی تکلیف کا مزہ اسی طرح چکھاؤ جس طرح اس کو معصیت کی حلاوت کا مزہ چکھا چکے ہو)۔

یہ حدیث شریف پہلے تو توبہ کے دو رکن پشیمانی اور دوبارہ نہ کرنے کے عزم پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد اس میں دو اہم شرائط قبولیت کا ذکر کیا گیا ہے (یعنی) حقوق مخلوق کی واپسی اور حقوق خدا کی ادائیگی۔ انسان کے محض ''توبہ کرتا ہوں'' کہہ دینے سے توبہ قبول نہیں ہو جاتی۔ توبہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کی کوئی چیز ناحق لی ہے تو اس کو واپس کر دے اور اگر کسی دوسرے شخص کا حق اس کے اوپر ہے اور اس کا ادا کرنا ممکن ہے یا اس کے مالک کو راضی کرنا ممکن ہے تو وہ کرے۔ جو بھی فرائض الٰہی ترک ہو گئے ہوں ان کی قضا کرے یا ان کو پورا کرے، اگر سب نہ کر سکتا ہو تو جتنا کر سکتا ہو اتنا کرے۔ یہ جان لینا چاہئے کہ یہ سب وہ حقوق ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کا مطالبہ کیا جائے گا۔ (اگر یہاں ادا نہ کئے گئے تو) آخرت میں بڑی سختی سے مطالبہ کیا جائے گا اور وہاں ادائیگی کی کوئی ضرورت نہیں ہے سوائے اس کے دوسروں کے گناہوں کا بار خود اٹھائے اور اپنے اعمال حسنہ دوسروں کو دیدے اور ایسا کرنے سے خود بے چارہ و بدبخت ہو جائے گا اور نہ نجات کی کوئی راہ

ہوگی اور نہ بچ نکلنے کا کوئی چارہ ہوگا۔

اے عزیز! کہیں ایسا نہ ہو کہ شیطان و نفس امارہ تجھ پر قابو پالیں اور تجھے وسوسے میں مبتلا کر کے مطلب کو بہت بڑا کر کے دکھائیں اور تم کو توبہ سے روک دیں اور تمہارے کام کو یکبارگی (خراب) کر دیں۔ ان امور میں جتنا بھی ہو سکے چاہے تھوڑا ہی سہی اقدام کرنا بہتر ہے۔ اگر قضا نمازیں، روزے، کفارے اور (دیگر) حقوق خدا بہت ہیں اور اسی کے ساتھ لوگوں کے بھی بے شمار حقوق ہیں۔ تمہارے گناہ اور بے انتہا خطا ہے تب بھی فضل خدا سے مایوس نہ ہو، رحمت حق سے ناامید نہ ہو۔ اس لئے کہ اگر تم نے مقدور بھر توبہ کی کوشش کی تو خدا تمہارے لئے راستہ آسان کر دے گا اور راہ نجات کی نشاندہی کر دے گا۔ یاد رکھو رحمت حق سے مایوسی اتنا بڑا گناہ ہے کہ میں گمان نہیں کرتا نفس میں اس سے بڑا اور اس سے بدتر کوئی اور گناہ اثر کرتا ہوگا جو شخص رحمت حق سے مایوس ہو جائے اس کے دل کو تاریکی اس طرح گھیر لیتی ہے اور اس کی لگام اس طرح ٹوٹ جاتی ہے کہ پھر کسی چیز سے اس کی اصلاح ممکن نہیں ہوتی۔ (لہذا) کہیں ایسا نہ ہو کہ تم رحمت حق سے غافل ہو جاؤ اور گناہ اور اس کے نتائج تمہاری نظر میں بڑے معلوم ہوں (اور تم توبہ نہ کرو) رحمت خدا ہر چیز سے بڑی اور ہر شے کو شامل ہے۔ "خدا کی بخشش وعطا کیلئے قابلیت شرط نہیں ہے"[۱۳] تم پہلے کیا تھے؟ ظلمت عدم میں قابلیت واستعداد نہیں ہوا کرتی۔ خداوند عالم نے بے استحقاق واستعداد، بغیر سوال اور بغیر کسی دعا کے تم کو نعمت وجود اور کمالات وجود سے نوازا۔ بے شمار نعمتوں اور غیر محدود رحمتوں کی بساط بچھائی، تمام موجودات کو تیرے لئے مسخر کر دیا۔ اب بھی محض عدم اور نابودی محض سے تو حالت بدتر نہیں ہوئی ہے۔ خدا نے رحمت ومغفرت کا وعدہ کیا ہے تم ایک قدم آگے بڑھو اور اس کے درگاہ قدس کی طرف آؤ وہ خود ہی کسی نہ کسی صورت میں تمہاری دستگیری کرے گا، اگر اس کے حقوق کی ادائگی تم سے ناممکن ہو گئی تو اپنے حقوق معاف کر دے گا اور اگر دوسروں کے حقوق کی ادائگی تم سے ناممکن ہو گئی ہے تو اس کا جبران کرے گا۔ رسول خدا کے زمانے میں قبر کھود کر کفن نکال لے جانے والے نوجوان کا قصہ تو تم نے سنا ہی ہوگا۔[۱۴]

اے عزیز! حق کا راستہ سہل وآسان ہے لیکن تھوڑی سی توجہ کی ضرورت ہے اس کیلئے اقدام کرنا چاہئے۔ لیت ولعل کرنے اور معاملے میں تاخیر کرنے اور روزانہ گناہ کو زیادہ کرنے سے کام دشوار ہو جاتا ہے، لیکن اقدام کرنے نیز معاملات اور نفس کی اصلاح کا عزم کرنے سے راستے نزدیک اور کام آسان ہو جاتا ہے۔ تم تجربہ کر لو اور تھوڑا سا اقدام کرو اگر نتیجہ ملتا ہے تو بات کی صحت تم پر ثابت ہو جائے گی، ورنہ

برائی کا راستہ کھلا ہے اور تیرا گنہگار ہاتھ دراز ہے۔ لیکن حضرت علیؑ نے جن دو امور کیلئے فرمایا ہے وہ کمال توبہ اور توبہ کاملہ کی شرائط میں سے ہیں نہ صرف ان دونوں کے بغیر توبہ حاصل یا قبول نہیں ہوتی، بلکہ ان کے بغیر توبہ کامل نہیں ہوتی۔

یہ بات بھی جان لو کہ سالکوں کی منزلوں میں سے ہر ایک کیلئے مراتب و (درجات) ہیں جو ان کے دلوں کے حالات کے اعتبار سے فرق کرتے ہیں۔ اگر توبہ کرنے والا اس کے درجہ کمال تک پہنچنا چاہتا ہے تو تدارک کا تدارک کرے، یعنی جن چیزوں کو چھوڑ دیا تھا ان کا ازالہ کرے۔ (اسی طرح) حظوظ کا بھی تدارک کرے، یعنی گناہوں کے دوران جو نفسانی لذتیں اس کو حاصل ہوئی ہیں ان کا ازالہ کرے اور اس کی صورت یہ ہے کہ اس کی مملکت میں گناہوں سے جو جسمانی و روحانی آثار پیدا ہو چکے ہیں ان کو بالکل ختم کر دے تاکہ نفس پھر اپنی پہلی صفائی اور فطری روحانیت کی طرف پلٹ سکے اور اس کی مکمل تطہیر ہو جائے، جیسا کہ تم پہلے سمجھ چکے ہو کہ ہر گناہ اور ہر لذت سے روح کے اندر ایک اثر پیدا ہو جاتا ہے اور بعض سے جسم میں بھی ایک قوت پیدا ہو جاتی ہے، پس توبہ کرنے والے کو چاہئے کہ مردانہ وار مقابلہ کرے تاکہ اس کے آثار مکمل طور پر ختم ہو جائیں اور اس کو چاہئے کہ جسمانی اور روحانی ریاضت کرے تاکہ اس کے لوازم و اثرات بھی مکمل طور پر ختم ہو جائیں جس طرح مولائے کائناتؑ نے فرمایا ہے۔

پس جسمانی ریاضت کے ذریعے اور مقویات و مفرحات کو ترک کر کے، اگر اس کے ذمہ واجبی روزے ہوں تو ان کو رکھ کر ورنہ مستحب روزے رکھ کر، گناہوں سے یا معصیت کے زمانے میں جو گوشت پیدا ہوا ہے اس کو پگھلا دے، اور روحانی ریاضتوں اور مناسک و عبادتوں کے ذریعہ لذات گناہ کا ازالہ کرے، کیونکہ روح کے آئینے میں طبعی لذتوں کی صورت موجود ہے اور جب تک وہ صورتیں رہیں گی نفس ان کی طرف مائل اور دل ان کا دلدادہ رہے گا۔ (مگر پھر بھی) یہ خطرہ لگا رہے گا کہ خدانخواستہ نفس دوبارہ سرکشی پیدا کرے اور لگام ہاتھ سے چھوٹ جائے لہذا راہ آخرت کے سالک اور گناہوں سے تائب کیلئے ضروری ہے کہ عبادت و ریاضت کی تلخی کا مزہ روح کو چکھائے اور اگر کسی رات کو گناہ اور عیش و عشرت میں گزارا ہے تو اس کا ازالہ اس طرح کرے کہ ایک رات عبادت خدا میں بسر کرے۔ اگر کسی دن کو نفس کی طبعی لذتوں میں گزارا ہے تو پھر روزہ و مناسک سے اس کا جبران کرے تاکہ نفس بالکل اس کے اثرات و لوازم سے جو حصول تعلقات اور دنیا سے زبردست محبت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، پاک و پاکیزہ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح توبہ کامل تر

ہو جائے گی اور نفس کی فطری نورانیت بھی عود کر آئے گی اور پھر ان امور میں مصروفیت کے دوران مسلسل ان میں غور و فکر کرتا رہے، یعنی گناہوں کے نتائج، خدا کی شدت گرفت، میزان اعمال کی سختی، عالم برزخ و قیامت کے عذاب کی شدت (میں غور کرتا رہے) اور خود بھی سمجھے اور اپنے نفس کو بھی سمجھاتا رہے کہ یہ سب اعمال قبیحہ اور مالک الملوک کی مخالفت کی صورتیں اور ان کے نتائج ہیں۔ (تو) امید ہے کہ اس علم و تفکر کے بعد نفس معصیتوں سے متنفر ہو جائے اور مکمل طور پر اس سے جدا ہو جائے اور توبہ کے سلسلے میں اپنے مقصد تک پہنچ جائے اور اس کی توبہ کامل اور تمام ہو جائے۔

لہذا یہ دو مقامات توبہ کی منزل کی ترمیم و تکمیل کے عناصر میں سے ہیں۔ ہاں! جو انسان پہلے مرحلے میں منزل توبہ میں داخل ہونا چاہے اس کو یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ اس سے توبہ کی آخری منزل چاہی گئی ہے اور یہ چیز اس کی نظر میں دشوار اور منزل پر صعب نظر آئے اور وہ یکبارگی اس کو چھوڑ بیٹھے (بلکہ) راہ آخرت کے سالک کیلئے جتنا ممکن ہو اور اس کے حالات اجازت دیں بس اسی مقدار میں توبہ مطلوب و مرغوب ہے پھر جب وہ اس راستے پر لگ جائے گا تو خدا اس کیلئے آسانی فراہم کرے گا اس لئے راہ کی سختی انسان کو اصل مقصد سے نہ روک دے، کیونکہ مقصد بہت ہی اہم اور بڑا ہے۔ اگر ہم مقصد کی عظمت کو سمجھ لیں تو اس راستے میں ہر زحمت آسان ہو جائے گی بھلا نجات ابدی اور ہمیشہ راحت و سکون سے بڑھ کر کونسا مقصد ہو سکتا ہے اور شقاوت سرمدی اور ہلاکت دائمی سے بڑھ کر کونسا خطرہ عظیم ہوگا؟! توبہ نہ کرنے اور اس میں لیت و لعل کرنے اور تاخیر کرنے سے ممکن ہے انسان ابدی شقاوت اور ہمیشہ کے عذاب اور دائمی ہلاکت تک پہنچ جائے اور توبہ کرنے سے ممکن ہے انسان سعید مطلق اور محبوب حق ہو جائے۔ پس جب مقصد اتنا عظیم ہے تو چند دنوں کی زحمت میں کیا حرج ہے؟!

یہ سمجھ لو کہ اپنے امکان بھر اقدام چاہے وہ کم ہو فائدہ مند ہے۔ تم آخرت کے امور کا قیاس دنیا کے امور پر کرو۔ عقلمند حضرات اگر اپنے اعلیٰ مقصد تک نہیں پہنچ پاتے تو چھوٹے مقصد سے دست بردار نہیں ہوتے، اسی طرح اگر مطلوب کامل کو نہیں حاصل کرتے تو ناقص مطلوب سے بھی صرف نظر نہیں کرتے۔ تم بھی اگر اس کے کمال تک نہیں پہنچ سکتے تو اصل مقصد اور اصل حقیقت تک پہنچنے سے نہ رکو جتنا بھی ممکن ہو اس کے حاصل کرنے میں کوشش کرو۔

چوتھی فصل: استغفار کا نتیجہ

توبہ کرنے والے پر جو باتیں ضروری ہیں کہ ان پر عمل کرے ان میں سے ایک غفاریت حق تعالیٰ کی پناہ اور پروردگار عالم سے حالت استغفار حاصل کرنا ہے۔ اس ذات مقدس جل جلالہ کی غفاریت یہ ہے کہ زبان حال وقال سے تنہائیوں میں ظاہری وباطنی طور سے عاجزی وناله وتضرع وزاری سے دعا کرے (خدایا) میرے گناہوں اور ان کے نتائج کو مخفی کردے۔ البتہ مقام غفاریت وستاریت کا تقاضا ہے کہ عیوب وذنوب اور ان کے نتائج کو مخفی کردے، کیونکہ اعمال کی ملکوتی صورتیں بمنزلہ ان کی اولاد کے ہیں، بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہیں اور توبہ وصیغہ استغفار کی حقیقت بمنزلہ معان ہے۔ خداوند عالم اپنی غفاریت وستاریت کی بنا پر ان اولادوں (گناہوں) کو استغفار کرنے والے کے استغفار کی وجہ سے اس سے منقطع کردیتا ہے اور تمام ان موجودات کو خواہ ملائکہ ہوں یا نامۂ عمل لکھنے والے ہوں یا وقت اور مقام ہو یا خود اس گنہگار کے عضو وجوارح ہوں جو اس کی حالت پر مطلع ہوتے ہیں حکم دے دیتا ہے کہ اس بندے کے گناہوں کو چھپا دو اور خدا سب کو بھول جانے کا حکم دے دیتا ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ خدا دونوں فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ اس کے جو کچھ گناہ تم نے لکھے ہوں ان کو بھول جاؤ اور یہ بھی ممکن ہے کہ خدا اعضا وجوارح اور زمین (وزمان) کو وحی کرتا ہو کہ بھول جاؤ اور ہوسکتا ہے کہ حدیث شریف میں اسی سے یہی مراد ہو۔ جیسے کہ یہ بھی امکان ہے کہ ان چیزوں کو حکم دیدے کہ گواہی نہ دینا اور ہوسکتا ہے کہ اعضا سے رفع آثار معاصی مراد ہوں کہ جس کے واسطے سے شہادت تکوینی حاصل ہوتی ہے کہ اگر وہ توبہ نہ کرتا تو ممکن تھا کہ اس کے اعضا بہ لسان قال یا حال، بہر حال اس کے کئے ہوئے گناہوں پر گواہی دیتے، مگر خدا کی غفاریت وستاریت کا تقاضا یہ ہوا کہ اس عالم میں ہمارے اعضا ہمارے عمل کی گواہی نہ دیں اور زمان ومکان ہمارے افعال کو چھپا دیں۔ یہی صورت دوسری دنیاؤں میں بھی ہوگی، بشرطیکہ ہم صحیح توبہ اور خالص استغفار کے ساتھ اس دنیا سے چلے جائیں۔ (اور یہ بھی ممکن ہے کہ) ہمارے اعمال مکمل طور پر مخفی ہو جائیں، مگر شاید کرامت حق تعالیٰ جل جلالہ کا تقاضا دوسرے مطلب کیلئے ہوتا کہ توبہ کرنے والا کسی کے سامنے سرنگوں اور شرمندہ نہ ہو۔

واللہ العالم

پانچویں فصل: توبۂ نصوح کی تفسیر

جان لو کہ توبۂ نصوح کی تفسیر میں کچھ اختلاف ہے جس کا بتدی ذکر یہاں مناسب ہے۔ ہم یہاں پر محقق جلیل شیخ بہائی (قدس اللہ سرہ) کے ترجمۂ کلام پر اکتفا کرتے ہیں۔

محدث خبیر مجلسی" نقل فرماتے ہیں کہ شیخ بہائی ۵! نے فرمایا ہے

مفسرین نے توبہ ''نصوح'' کے معنی میں چند وجوہات کو ذکر کیا ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اس سے ایسی توبہ مراد ہے جو لوگوں کو نصیحت کرے، یعنی لوگوں کو دعوت دے کہ وہ بھی اسی طرح کریں جس سے اس کے مالک میں آثار جمیدہ پیدا ہوں یا یہ کہ وہ توبہ کرنے والوں کو یہ نصیحت کرے کہ وہ گناہوں کو بالکل ختم کر دیں اور پھر دوبارہ اس کا اعادہ نہ کرے۔

دوسرا اس کو توبہ نصوح کہتے ہیں جو خالص خدا کیلئے ہو، جیسے موم سے خالص شہد کو ''نصوح'' کہا جاتا ہے، اور (یہاں) خلوص یہ ہے کہ گناہوں کی برائی کی وجہ سے اس پر پشیمان ہو یا اس لئے پشیمان ہو کہ وہ گناہ رضائے الٰہی کے خلاف ہیں اور یہ پشیمانی جہنم کے خوف سے نہ ہو

جناب محقق طوسی" نے تجرید میں حکم فرمایا ہے

''آتش جہنم سے ڈرنے کی وجہ سے گناہوں سے پشیمانی توبہ نہیں ہے''۔۲

دیگر یہ کہ ''نصوح'' نصاحت سے ہے جس کے معنی سینے کے ہیں، کیونکہ جس طرح سینا لباس کے مختلف ٹکڑوں کو جمع کر دیتی ہے اسی طرح توبہ بھی گناہوں سے ٹکڑے ٹکڑے ہونے والے دین کو جوڑ دیتی ہے یا پھر توبہ تائب اور اولیائے خدا اور اس کے دوستوں کو جمع کر دیتا ہے۔

نیز ''نصوح'' خود تائب کی صفت ہے اور توبہ کی طرف نصوح کی اسناد، مجازی ہیں، یعنی توبہ نصوح وہ توبہ ہے جو توبہ کرنے والوں کو نصیحت کرتی ہے کہ توبہ کو اچھی طرح سے بجا لانا چاہئے، یعنی اس طرح بجا لائیں کہ گناہوں کے آثار دل سے بالکل مٹ جائیں اور وہ اس طرح کہ حسرت و افسوس کے ذریعے نفوس کو پگھلا دیں اور برائیوں کی تاریکی کو خوبیوں کے نور سے مٹا دیں

تکمیل۔ تمام موجودات علم و حیات رکھتے ہیں

یہ جان لو کہ توبہ کیلئے (کچھ) حقائق و لطائف اور (کچھ) اسرار ہیں اور ہر سالک الی اللہ کیلئے مخصوص قسم کی توبہ ہے جو انہیں کیلئے مخصوص ہے اور چونکہ ان مقامات میں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے اس لئے اس کا تفصیل کے ساتھ ذکر کرنا چنداں اس کتاب سے مناسبت نہیں رکھتا۔ اس لئے بہتر ہے کہ اس مقام کو ایک ایسے نکتے کے ذکر کرنے کے بعد ختم کریں جو حدیث شریف سے مستفاد ہے اور جو ظاہر کتاب کریمہ الٰہی کے مطابق اور متفرق ابواب میں مذکور احادیث کثیرہ کے بھی مطابق ہے اور وہ یہ ہے کہ دنیا کے ہر موجود میں علم، حیات اور شعور پایا جاتا ہے، نہ صرف یہ بلکہ تمام موجودات خداوند عالم کی معرفت بھی رکھتی ہیں۔ چنانچہ تمام اعضا و جوارح اور زمین کے ٹکڑوں کو خدا کے فرمان کو چھپانے یا اطاعت کرنے کی وحی ہو چکی ہے اور تمام موجودات کا بنص قرآن تسبیح کرنا جس کے ذکر سے احادیث شریفہ بھی بھری پڑی ہیں یہ باتیں خود ان چیزوں کے علم و ادراک و حیات کی دلیل ہیں، بلکہ خالق و مخلوق کے درمیان ایک ایسے مخصوص رابطے کی دلیل ہیں جس پر خدا اور ﴿ومن ارتضی من عبادہ﴾[۱۸] "اور اس کی رضایت حاصل ہونے والے بندوں" کے علاوہ کوئی مطلع نہیں ہے اور یہ خود ان معارف میں سے ہے جنہیں قرآن کریم اور احادیث ائمہ معصومین نے تمام لوگوں تک پہنچایا ہے اور حکمائے اشراق کے برہان و اصحاب عرفان کے ذوق اور ارباب سلوک و ریاضت کے مشاہدات کے (بھی) موافق ہیں۔

علوم عالیہ ماوراء الطبیعہ میں ثابت ہو چکا ہے کہ وجود عین کمالات و اسماء و صفات ہے اور جس مرحلے میں بھی ظاہر ہو اور جس آئینے میں متجلی ہو تمام شئون و کمالات (یعنی) علم و حیات و باقی امہات سبعہ کے ساتھ ظاہر و متجلی ہوتا ہے اور حقیقت وجود کے تجلی کا ہر مرحلہ اور معبود کے جمال کامل کے تنزلات نور کا ہر مرتبہ مقام احدیت سے ربط خاص رکھتا اور مقام ربوبیت کی چھپی ہوئی معرفت کا حامل ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کہتا ہے ﴿ما من دابۃ الا ھو آخذ بناصیتھا﴾[۱۹] "کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی پیشانی اللہ کی گرفت میں نہ ہو" اس میں کہا جاتا ہے ﴿ھو﴾ مقام غیب ہویت کی طرف اشارہ ہے اور ﴿اخذ بالناصیۃ﴾ وہی اصل غیبی سری وجودی ربط ہے جس کی معرفت کسی موجود کیلئے ممکن نہیں ہے۔

توضیحات (۱۷)

۱۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۳۰، کتاب ایمان و کفر، باب التوبہ، حدیث

۲۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۳۵، کتاب ایمان و کفر، باب التوبہ، حدیث ۱۰

۳۔ سورۂ آل عمران آیت ۱۳۵۔

۴۔ رسولِ خداؐ کا ارشاد ہے ﴿یهرم ابن آدم ویبقی معه اثنتان الحرص والامل﴾ انسان بوڑھا ہو جاتا ہے لیکن دو چیزیں اس کے ساتھ باقی رہتی ہیں حرص و آرزو

خصال، ج ۱، ص ۷۳، باب الاثنین، حدیث ۱۱۲، بحار الانوار، ج ۷۳، ص ۱۳۸، کتاب الموت، باب ...

۵۔ حضرت امام صادقؑ پیغمبر اکرمؐ سے نقل فرماتے ہیں کہ رسولؐ نے فرمایا

﴿من تاب قبل موته بسنة قبل الله توبته ثم قال ان السنة لكثيرة، من تاب قبل موته بشهر قبل الله توبته ثم قال ان الشهر لكثير، من تاب قبل موته بجمعة قبل الله توبته ثم قال ان الجمعة لكثير، من تاب قبل موته بيوم قبل الله توبته ثم قال ان يوماً لكثير، من تاب قبل ان يعاين قبل الله توبته﴾ جو مرنے سے ایک سال پہلے توبہ کرے خدا اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے پھر فرمایا سال تو زیادہ ہے، جو مرنے سے ایک ماہ پہلے توبہ کرے خدا اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے پھر فرمایا ایک ماہ تو بہت زیادہ ہے، جو مرنے سے ایک جمعہ پہلے توبہ کرے خدا اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے پھر فرمایا ایک جمعہ تو بہت زیادہ ہے، جو مرنے سے ایک دن پہلے توبہ کرے خدا اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے پھر فرمایا ایک دن تو بہت زیادہ ہے جو موت کے مشاہدے سے پہلے توبہ کرے خدا اس کی بھی توبہ قبول کر لیتا ہے

اصول کافی، ج ۲، ص ۴۴۰، کتاب ایمان و کفر، باب فیما اعطی اللہ عزوجل آدم وقت التوبہ، حدیث ۲ (اس باب میں دیگر احادیث۔)

۶۔ حدیث ۱۵، حاشیہ ۱۔

۷۔ حدیث ۱۵ فصل ۲۔

۸۔ سورۂ بقرہ آیت ۲۲۲۔

۹۔ حدیث ۳، حاشیہ ۱۰۔

۱۰۔ سورۂ تحریم آیت ۸۔

۱۱۔ نہج البلاغہ ص ۱۲۷۱، حکمت ۴۰۹۔

۱۲ ابوالحسن محمد بن حسین بن موسیٰ مشہور بہ "شریف رضی" (۳۵۹-۴۰۶) کا بر شیعہ علماء میں سے اور شیخ مفید" کے شاگرد تھے۔ شیخ طوسی" وغیرہ نے ان سے روایت کی ہے۔ فنون ادب و لغت میں سرآمد روزگار تھے اور دیگر اسلامی علوم میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ آپ کا زہد و تقویٰ زبان زد عام تھا۔ اپنے والد کے بعد سادات کی نقابت آپ کے حوالے ہوئی تھی۔ آپ کی تصانیف میں الشرح الصدر، خصائص الائمہ" تلخیص البیان عن مجازات القرآن، مجازات الآثار النبویہ" قابل ذکر ہیں، جن میں سب سے مشہور "نہج البلاغہ" ہے۔

۱۳ چاره آن دل عطائے مبدلیست داد او را قابلیت شرط نیست (مثنوی، دفتر ۵، بیت ۱۵۳۷)۔

۱۴۔ اس چور لڑکے اور اس کی توبہ کا قصہ تفسیر و حدیث کی کتابوں میں ذکر ہوا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے ایک دن معاذ بن جبل نے رسول خدا" کے پاس آکر عرض کیا دروازے پر ایک نوجوان بہت بے چینی سے رو رہا ہے اور بارگاہ کی زیارت چاہتا ہے۔ رسول خدا" نے اجازت دی جب وہ آیا تو آنحضرت" نے گریے کا سبب پوچھا۔ اس نے کہا میں نے بہت سے بڑے گناہ کئے ہیں اور اس سے اور خدا کے قہر سے ڈرتا ہوں۔ رسول خدا" نے اس کو رحمت خدا اور بخشش کی امید دلائی اور فرمایا خدا بڑے بڑے گناہوں کو بھی معاف کر دیتا ہے پھر اس کے گناہ کے بارے میں پوچھا۔ جوان نے کہا سات سال پہلے میں قبروں کو کھود کر کفن نکال لیا کرتا تھا۔ ایک رات انصار کی ایک نوجوان لڑکی کی قبر کو کھودا اور میت کے ساتھ بد فعلی کی جب وہاں سے واپس ہوا تو ایک آواز سنی جو مجھے عذاب خدا سے ڈرا رہی تھی۔ رسول کریم" نے تو جواب کی حکایت سن کر اسے پاس سے بھگا دیا۔ تو جوان ایک پہاڑ پر جا کر چالیس دن اور چالیس راتیں خدا کی بارگاہ میں گریہ وزاری کرتا رہا یہاں تک کہ آیہ ﴿والذین اذا فعلوا فاحشة﴾ نازل ہوئی تو رسول خدا" نے اس کے پاس جا کر خوشخبری دی کہ خدا نے تیرے گناہ معاف کر دیئے۔

بحار الانوار، ج ۶، ص ۲۳، کتاب العدل والمعاد، باب التوبہ وانواعہا وشرائطہا، حدیث ۲۶، تفسیر صافی ذیل آیہ ۱۳۵ سورہ آل عمران۔

۵۔ اربعین شیخ بہائی"، ص ۳۳۲، حدیث ۳۸، مرآۃ العقول، ج ۱، ص ۲۹۵، کتاب الایمان والکفر، باب التوبہ، حدیث ۱۔

۶ کشف المراد فی شرح تجرید الاعتقاد، ص ۴۶۳، مقصد ششم، فی وجوب توبہ۔

۱۷۔ ﴿وان من شیء الا یسبح بحمده ولکن لا تفقهون تسبیحهم﴾ یعنی ہر شئے خدا کی حمد و تسبیح کرتی ہے مگر تم لوگ اس کی تسبیح کو سمجھ نہیں پاتے (سورہ اسراء، آیت ۴۴) تفسیر میں اس آیت کے ذیل میں مخلوقات کی تسبیح سے متعلق آٹھ روایات کا ذکر ہے۔

۱۸ یہاں آیہ مبارکہ کی طرف اشارہ ہے ﴿عالم الغیب فلا یظهر علی غیبه احداً الا من ارتضی من رسول﴾ وہ عالم غیب ہے اور اپنے پسندیدہ رسول کے علاوہ کسی کو بھی اپنے غیب پر مطلع نہیں کرتا۔ سورہ جن، آیت ۲۶/۲۷۔

۹۔ کوئی بھی چلنے والا ایسا نہیں جس کی پیشانی اس (خدا) کی گرفت میں نہ ہو۔ سورہ ہود، آیت ۵۶۔

اٹھارھویں حدیث

بِالسَّنَدِ المُتَّصِلِ الی فخرِ الطائفۃ و ذُخرِها، مُحمَّد بن یعقوب الکُلَیْنِيّ (رضوان الله علیه)
عن مُحمَّد بن یحییٰ، عَنْ أَحْمد بْن مُحمَّد بن عیسیٰ عن ابن محبوب، عَنْ عبد الله بن سنان
عَنْ ابی حَمْزَةَ الثُّمالِيّ، عَنْ ابي جعفر علیه السلام قال
﴿مکْتُوبٌ في التَّوراة الَّتي لَمْ تُغَیَّرْ، أنَّ مُوسی علیه السلام سأل ربَّهُ فقال یارَبِّ!
اَقریبٌ أنْتَ منّي فأُناجِیَک أمْ بعیدٌ فأُنادِیَک؟ فأوْحی اللهُ عزَّوجلَّ الیه یا مُوسی أنا
جَلِیسُ مَنْ ذَکَرَني.
فقال مُوسی فمنْ في سِتْرِک یوْم لا سِتْر الاّ سِتْرُک؟ فقال الَّذین یذْکُرُونَني
فأذْکُرُهُمْ ویَتَحابُّون فيَّ فاُحِبُّهُمْ فاولئک الَّذین اذا أرَدْتُ أنْ اُصیب أهْل الأرْض بسُوء
ذَکَرْتُهُمْ فَدَفَعْتُ عَنْهُمْ بِهِمْ﴾

ترجمہ: ابوحمزہ ثمالی، امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت نے فرمایا ''غیر محرف توریت میں لکھا ہے موسیٰ نے اپنے خدا سے سوال کرتے ہوئے کہا معبود! تو مجھ سے قریب ہے کہ تجھ سے مناجات (آہستہ بات) کروں یا دور ہے کہ تجھ کو پکار کر کہوں؟ خدا کی طرف سے موسیٰ کو وحی ہوئی اے موسیٰ! جو میرا ذکر کرے میں اس کا ہمنشیں ہوں۔ پھر موسیٰ نے پوچھا جس دن تیرے علاوہ کسی کی پناہ نہیں ہوگی اس دن کون لوگ تیری پناہ میں ہوں گے؟ تو جواب آیا جو لوگ مجھے یاد کرتے ہیں اور میں ان کو یاد کرتا ہوں وہ جو لوگ صرف میری خاطر محبت کرتے ہیں اور میں بھی ان سے محبت کرتا ہوں، پس یہ وہ لوگ ہیں کہ جب

میں اہل زمین کے ساتھ کوئی برائی کرنا چاہتا ہوں اور ان کی یاد آجاتی ہے تو ان کی خاطر اہل زمین سے عذاب دور کر دیتا ہوں"۔

شرح: اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ یہودیوں میں جو توریت رائج ہے وہ تحریف شدہ ہے اور اس میں تغیرات پیدا کئے گئے ہیں اور یہ بھی کہ توریت کا صحیح علم اہل بیت" کے پاس ہے اور رائج توریت وانجیل سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تو یک متعارف آدمی کا بھی کلام نہیں ہے، بلکہ بعض اہل خواہش وخیلات اور ہوائے نفس کے ساتھ اس کو گھڑا گیا ہے۔

محدث محقق مرحوم مجلسی" فرماتے ہیں: بظاہر اس سول سے حضرت موسیٰ" کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ آداب دعا کے بارے میں سوال کرنا چاہتے ہیں ورنہ ان کو یہ علم تھا کہ خدا ہماری رگ گردن سے زیادہ قریب ہے اور احاطہ علمی وقدرت وعلّیت رکھتا ہے، یعنی (جناب موسیٰ" کا مقصد یہ تھا کہ) تجھے یہ بات پسند ہے کہ تجھ سے اس طرح مناجات کروں جیسے قریب والے کرتے ہیں یا تجھ کو زور سے آواز دوں جیسے دور والے پکار کرتے ہیں؟ اس کو دوسرے لفظوں میں اس طرح سمجھئے کہ جب تیری طرف نظر کرتا ہوں تو تو ہر نزدیک سے نزدیک تر ہے اور جب اپنی طرف دیکھتا ہوں تو اپنے کو بہت دور پاتا ہوں۔ پس مجھے نہیں معلوم کہ دعا میں تیری حالت کا لحاظ کروں یا اپنی حالات کا لحاظ کروں اور ہو سکتا ہے رؤیت کے سوال کی طرح یہ سول غیر کا ہو یا غیر کی طرف سے کیا گیا ہو۔ انتہیٰ کلامہ۔

خدا کی عمومی کا احاطہ

احتمال یہ ہے کہ جناب موسیٰ" نے کیفیت دعا سے اپنی عاجزی کو بیان کیا ہو اور عرض کیا ہو اے پروردگار! تو قرب وبعد کی صفت سے بعید ہے، (اگر ایسا ہوتا تو) قریب والوں یا دور والوں کی طرح تجھ کو پکارتا، میں اس معاملہ میں متحیر ہوں کسی بھی قسم کی دعا کو تیری شان جلال کے لائق نہیں سمجھتا تو خود ہی مجھے دعا اور کیفیت دعا میں داخل ہونے کی اجازت مرحمت فرما اور جو تیرے مقام قدس کے مناسب ہے وہ مجھے تعلیم فرما۔ اس وقت خداوند عالم سے جواب صادر ہوا: میں تمام کائنات میں حضور قیومی رکھتا ہوں، تمام دنیا میرے سامنے ہیں۔ جو مجھے یاد کرتے ہیں میں ان کا ساتھی ہوں، جو میرا ذکر کرتے ہیں میں ان کا ہمنشین ہوں۔ البتہ وہ ذات احدیت قرب وبعد سے متصف نہیں ہو سکتی جو تمام دائرہ وجود اور پوری کائنات پر احاطہ

قیومی اور شمول وجودی رکھتی ہے۔

آیات قرآنی میں جو خدا کی توصیف قرب سے کی گئی ہے، مثلاً ﴿وإذا سألك عبادي عني فإني قريب﴾ ۳ (اے رسول!) "جب میرے بندے تم سے میرے بارے میں پوچھیں (تو کہہ دو کہ) میں ان کے پاس ہی ہوں" یا جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿ونحن أقرب إليه من حبل الوريد﴾ ۴ "اور ہم تو اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں"۔ اس کے علاوہ دیگر آیات، تو یہ سب ایک قسم کے مجاز و استعارہ پر مبنی ہیں، ورنہ ذات خدا حسی و معنوی قرب و بعد سے مقدس و منزہ ہے، کیونکہ قرب و بعد ایک قسم کی تشبیہ اور حد بندی ہے جس سے حق تعالیٰ منزہ ہے، بلکہ تمام موجودات کا حاضر ہونا اس کی بارگاہ میں حضور تعلقی ہے اور کائنات کے ذروں اور موجودات کے سلسلے کا جو اس ذات مقدس نے احاطہ کر رکھا ہے وہ احاطہ قیومی ہے اور وہ حضور حسی و معنوی اور احاطہ ظاہری و باطنی کی حقیقت کے علاوہ ہے۔

اس حدیث شریف اور بعض دیگر احادیث سے آہستہ ذکر کرنے کی رغبت اور قلبی و خفیہ ذکر مستحب ہونا ثابت ہوتا ہے جیسا کہ خود آیہ شریفہ میں ہے ﴿واذكر ربك في نفسك تضرعاً وخيفة﴾ ۵ "اور اپنے پروردگار کو اپنے دل ہی دل میں گڑگڑا کے اور ڈر (ڈر) کے یاد کیا کرو" اور حدیث شریف میں ہے کہ اس ذکر کی عظمت کی وجہ سے خدا کے علاوہ کوئی اس کا ثواب نہیں جانتا۔ ۶ (ہاں!) بعض حالات اور (بعض) مقامات اور بعض کیفیات کے پیش آجانے کی وجہ سے کبھی ذکر کے اعلان میں رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً اہل غفلت کے سامنے ان کی یاددہانی کیلئے علانیہ ذکر کرنا چاہئے، جیسے کہ کافی کی حدیث شریف میں ہے "غافلوں کے درمیان ذکر خدا کرنے والا جنگ کرنے والوں کے درمیان قتال کرنے والے کے مانند ہے۔" ۷

علامہ ابن فہد ۸ کی "عدۃ الداعی" میں منقول ہے: قال النبي ﷺ ﴿من ذكر الله في السوق مخلصاً عند غفلة الناس وشغلهم بما فيه، كتب الله له ألف حسنة وغفر الله له يوم القيامة مغفرة لم يخطر على قلب بشر﴾ ۹ "رسول خدا نے فرمایا جو شخص لوگوں کی غفلت اور ان کی مشغولیت کے وقت خلوص سے بازار میں ذکر خدا کرے خدا اس کے (نامہ اعمال میں) ہزار حسنہ لکھ دیتا ہے اور قیامت کے دن اس طرح بخش دے گا کہ کسی بشر کے دل میں خیال بھی پیدا نہ ہوا ہوگا"

اسی طرح اذان اور خطبہ وغیرہ میں ذکر کا بلند آواز سے کرنا مستحب ہے۔

پهلی فصل

اس حدیث شریف سے استفادہ ہوتا ہے کہ ذکر خدا اور خدا کیلئے ایک دوسرے سے دوستی کرنے کے چند خصائل ہیں۔

ان میں سے ایک جو سب سے عظیم ہے یہ ہے کہ بندے کا اپنے خدا کو یاد کرنا سبب ہوتا ہے کہ خدا اپنے اس بندے کو یاد کرے۔ دوسری حدیثیں بھی اسی مضمون کی وارد ہوئی ہیں۔[۱] اور یہ ذکر اس نسیان کے مقابلے میں ہے جس کو خدا آیتوں کے بھولنے والوں کے سلسلے میں ذکر فرماتا ہے ﴿کذلک اتتک ایاتنا فنسیتها وکذلک الیوم تنسی﴾[۱] "اسی طرح ہماری آیتیں (بھی) تو تیرے پاس آئی تھیں تو انہیں بھلا بیٹھا، اور اسی طرح آج تو بھی بھلا دیا جائے گا"۔

جس طرح خدا کے مظاہر جلال و جمال سے باطنی اندھاپن اور آیات کا بھلا دینا دوسرے عالم میں اندھا ہو جانے کا سبب ہوتا ہے، اسی طرح آیات و اسماء و صفات کا یاد کرنا اور خدا اور اس کے جمال و جلال کی یاد آوری بصیرت کو تقویت بخشتی ہے اور بقدر قوت ذکر و نورانیت ذکر حجابوں کو دور کرتی ہے۔ چنانچہ آیات حق کا ذکر اور ان کا عادی بن جانا باطنی بصیرت کو اتنی تقویت پہنچاتا ہے کہ جمال حق کا جلوہ نشانیوں میں دکھائی دیتا ہے اور اسماء و صفات کا یاد کرنا اس بات کا سبب بنتا ہے کہ حق اسمائی و صفاتی تجلیات میں ظاہر ہو جائے اور بے حجاب آیات و اسماء و صفات کا اگر تذکر ذات کیا جائے تو تمام پردے اٹھ جاتے ہیں اور محبوب بے پردہ ہو کر ظاہر ہو جاتا ہے۔ فتوحات ثلاثہ جو عرفا و اولیاء کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے (یعنی) "فتح قریب" "فتح مبین" اور "فتح مطلق" جو "فتح الفتوح" بھی ہے ان کی توجیہات و تاویلات میں سے یہ ایک تاویل و توجیہ ہے۔

جس طرح تینوں ذکر حجاب ثلاثہ کو اٹھا دیتے ہیں، اسی طرح خدا کی راہ میں ایک دوسرے سے محبت بھی محبت خدا کا سبب ہوا کرتی ہے اور اس محبت کا بھی نتیجہ رفع حجب ہوتا ہے، جیسا کہ اعلیٰ مرتبہ عرفا نے کہا ہے۔ البتہ اس محبوبیت کے کئی مرتبے ہیں جیسے حب فی اللہ ملاوث و خلوص کے اعتبار سے بھی کئی مرتبے پر مشتمل ہے۔ خلوص تام کا مطلب یہ ہے کہ اس میں کثرت اسمائی و صفاتی کا بھی شائبہ نہ ہو اور یہی چیز کامل محبت کی موجب ہے اور شریعت عشق میں محبوب مطلق وصال سے محجوب نہیں ہوا کرتا اور نہ اس کے اور اس

کے محبوب کے درمیان کوئی حجاب ہوتا ہے۔

اسی بیان سے جناب موسیٰؑ کے دونوں سوالوں میں ربط پیدا کیا جا سکتا ہے اس لئے کہ جب جناب موسیٰؑ نے سنا کہ خدا فرماتا ہے "جو میرا ذکر کرے میں اس کا ہمنشین ہوں" یعنی وعدۂ وصال و وصول بہ جمال، جب اپنے محبوب سے، اپنے دل کی بات سنی تو ارباب وصال کا استقصا کرنا چاہا تا کہ تمام امور میں بنا فرض دکریں، عرض کیا ﴿فمن في سترك يوم لا ستر الا سترك لي؟ ومن يكون في سترك بعد ان تخلص من التعلق بغيرك، وحطم قيود الحجب، ووصل الى جمالك الجميل؟﴾ "وہ کون لوگ ہیں جو تیری پناہ میں ہیں جو ہر قسم کے تعلق سے آزاد ہیں اور حجابوں کے پابند نہیں اور انہیں تیرے جمال جمیل کا وصال ہوگا؟" آواز قدرت آئی صرف دو گروہ' ایک تو جو بندے میرا ذکر کرتے چلے آتے ہیں' دوسرے وہ جو میری راہ میں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں کہ وہ بھی میرا ذکر ہے، لیکن میرے مظہر جمال تام، یعنی انسان کی صورت میں، یہی (دونوں) میری پناہ میں ہوں گے اور میرے ہمنشین ہوں گے اور میں ان کا ہمنشین ہوں گا۔

پس معلوم ہوا کہ ان دونوں گروہوں کیلئے ایک بہت بڑی خصلت ہے، اور اس عظیم خصلت کا نتیجہ ایک دوسری عظیم خصلت ہے، کیونکہ خدا ان کو یاد کرتا ہے، اور وہ خدا کے محبوب ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس دن کسی کی پناہ نہ ہوگی وہ خدا کی پناہ میں ہوں گے اور خلوت گاہ مطلق میں خدا ان کا ہمنشین ہوگا۔

دوسری خصلت یہ ہے کہ ان کے احترام میں خدا اپنے بندوں سے عذاب اٹھا لے گا، یعنی جب تک وہ لوگ (دنیا میں) بندوں کے ساتھ ہیں، اپنے بندوں پر عذاب و بلائیں نازل نہیں کرے گا۔

دوسری فصل، تفکر وتذکر کی منزل کا فرق

چونکہ خدا کی یاد تفکر کے نتائج میں سے ہے، اس لئے علماء نے منزل تفکر کو منزل تذکر سے مقدم جانا ہے۔ جناب خواجہ عبداللہؒ فرماتے ہیں ﴿التذكر فوق التفكر، فان التفكر طلب والتذكر وجود﴾[۱۲] "تذکر تفکر سے مافوق ہے، اس لئے کہ تفکر طلب محبوب کا نام ہے اور تذکر مطلوب کا نام ہے"۔ انسان جب تک راہ طلب و جستجو کے پیچھے ہے، مطلوب اس سے چھپا ہوا ہے اور جب محبوب حاصل ہو جاتا ہے تو تلاش و جستجو کی تعب و زحمت سے فارغ ہو جاتا ہے۔

قوت وکمال تذکر کا دارومدار قوت وکمال تفکر پر ہے اور جس تفکر کا نتیجہ معبود کا تذکر تام ہوتا ہے وہ دیگر اعمال کے کسی ترازو میں نہیں تولا جا سکتا، اس تفکر کی فضیلت کا قیاس اعمال سے کیا ہی نہیں جا سکتا۔ جیسے کہ روایت شریف میں ہے "ایک سال، ساٹھ سال اور ستر سال کی عبادت سے ایک ساعت کا تفکر بہتر ہے"۱۳۱ اور اس کی وجہ (بھی) معلوم ہے، اس لئے کہ عبادات کا اہم ترین ثمرہ حصول معارف و یاد معبود ہے اور یہ خاصیت (صرف) صحیح تفکر ہی سے بہتر طریقے پر حاصل ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک ساعت کا تفکر انسان کیلئے ایسے معارف کے دروازے کھول دے جو ستر سال کی عبادت سے بھی نہ کھلتے ہوں یا انسان کو محبوب کی یاد دوبارہ کرا دے جو سالوں کی زحمتوں اور مشقتوں سے بھی اس مقصد کو حاصل نہ کر سکتا ہو۔

میرے عزیز! جان لو کہ ذکر محبوب اور معبود کی یاد میں مشغول رہنے کے عام لوگوں کیلئے بہت (اچھے) نتائج ہیں اور رہے اولیاء و عرفاء کاملین تو ان کی آرزوؤں کی آخری انتہا ہی یہ ہے۔ اسی کے ذریعے سے یہ وہ اپنے محبوب کے وصال جمال تک پہنچتے ہیں، ان کیلئے تو یہی بہترین چیز ہے۔ البتہ عوام و متوسط حضرات کیلئے یہ بہترین ظاہری و باطنی، اخلاقی و اعمالی اصلاح کرنے والی چیزوں میں سے ہے۔ اگر انسان اپنے تمام حالات اور پیش آنے والے اوقات میں یاد خدا میں مشغول رہے اور اپنے کو ذات اقدس الٰہی کے سامنے حاضر سمجھے تو یقیناً بہت سے ایسے امور سے جو مرضی الٰہی کے خلاف ہیں، اپنے کو بچا سکتا اور نفس کو سرکشی سے روک سکتا ہے۔

یہ ساری مصیبتیں اور مشکلات نفس امارہ و شیطان رجیم کے ہاتھوں اس لئے نصیب ہوتی ہیں کہ ہم یاد حق اور اس کے عذاب و عقاب سے غافل ہوتے ہیں۔ حق سے غفلت دل کی کدورتوں کو زیادہ کرتی ہے، نفس اور شیطان کو انسان پر غالب بنا دیتی ہے اور مفاسد میں روز افزوں اضافہ کرتی ہے۔

(اس کے برخلاف) خدا کی یاد دل کو جلا دیتی ہے، قلب کو صیقل کرتی اور اس کو جلوہ گاہ محبوب بنا دیتی ہے۔ روح کی تطہیر اور اس کو خالص کر دیتی ہے۔ نفس کے قید سے انسان کو آزاد کرا دیتی ہے حب دنیا کو جو تمام غلطیوں کا منشأ اور برائیوں کا سرچشمہ ہے، دل سے باہر نکال دیتی ہے۔ غم کو ایک کا غم بنا دیتی ہے اور دل کو صاحب منزل (خدا) کے داخل ہونے کیلئے پاک و پاکیزہ بنا دیتی ہے۔

اس لئے اے عزیز! یاد محبوب اور اس کے ذکر کے سلسلے میں چاہے جتنی مشقتیں برداشت کرو وہ سب کم ہیں۔ دل میں یاد محبوب کی عادت ڈالو، بلکہ خدا چاہے تو قلب کی صورت ذکر حق کی صورت ہو جائے اور کلمۂ

طیبہ ﴿لا الٰہ الا اللہ﴾ آخری صورت اور نفس کا تتمہ کامل ہو جائے، کیونکہ سلوک الی اللہ کیلئے اس سے بہتر زاد راہ اور نفس کی برائیوں کیلئے اس سے بہتر مصلح اور معارف الٰہیہ کیلئے اس سے اچھا رہبر نہیں پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لئے اگر تم صوری و معنوی کمالات کے طالب ہو، آخرت کے راستے کے سالک اور مہاجر و مسافر الی اللہ ہو تو اپنے قلب کو ذکر محبوب کا عادی بناؤ اور روح کو یاد حق تعالیٰ (کے پانی) سے دھو لو۔

تیسری فصل: ذکر تمام مملکت وجود میں سرایت کرتا ہے

اگر چہ ذکر حق و تذکر ذات باری، قلب کے صفات میں سے ہے، اور اگر قلب مشغول ذکر ہو تو ذکر کے جتنے بھی فوائد ہیں وہ سب اس پر مرتب ہوں گے، لیکن بہتر یہ ہے کہ پہلے ذکر لسانی کرے اس کے بعد ذکر قلبی میں مشغول ہو۔ ذکر کے تمام مراتب میں سب سے افضل و اکمل وہ ذکر ہے جو انسانی مراتب کے تمام درجات میں پایا جائے اور اس کا حکم ظاہر و باطن میں سراً و جہراً جاری ہو اور سر وجود حق جل و علا میں مشہود ہو اور قلب و روح کی باطنی صورت، یاد محبوب کی صورت ہو اور قلبی و قالبی تمام اعمال یاد خدا بن جائیں۔ ساتوں اقلیم ظاہری اور ممالک باطنی ذکر حق سے مفتوح اور جمیل مطلق کے ذکر سے مسخر ہو جائیں۔ بلکہ اگر ذکر کی حقیقت قلب کی باطنی صورت ہو جائے اور اس کے ہاتھوں مملکت قلب فتح ہو جائے تو اس کا حکم باقی ممالک اور تمام اقالیم میں نافذ ہوتا ہے۔ آنکھوں، زبان اور ہاتھ پاؤں کی حرکات و سکنات اور تمام قوتوں اور اعضاء و جوارح کے اعمال، ذکر حق کے ساتھ ہی انجام پاتے ہیں، اپنے فرائض کے خلاف کسی امر کو انجام نہیں دیتے۔ پس ان کی حرکات و سکنات ذکر حق سے شروع اور اسی پر ختم ہوتے ہیں ﴿بسم اللہ مجریہا و مرسیہا﴾ یہ تمام ممالک میں نفوذ کر جاتے ہیں، نتیجتاً حقیقت، اسماء و صفات کی صورت میں متحقق ہوتے ہیں، بلکہ اسم اللہ اعظم کی صورت اور اس کا مظہر ہو جاتے ہیں اور یہ کمال انسانی کی انتہا اور اہل اللہ کی امیدوں کی آخری حد ہے۔ اس مقام میں جتنا نقص ہوگا اتنا ہی ذکر کا اثر کم ہوگا۔ کمال انسانی میں اتنا ہی نقص پیدا ہو جائے گا اور ظاہر و باطن کا نقصان ایک دوسرے میں سرایت کرے گا، کیونکہ وجود انسانی کے درجات باہم مرتبط اور ایک دوسرے سے متاثر ہیں۔ اسی سے پتہ چلتا ہے کہ زبانی ذکر جو تمام مراتب میں سب سے پست ہے وہ بھی مفید اور فائدہ مند ہے۔ اس لئے کہ پہلی بات تو یہی ہے کہ زبان نے یاد کر کے اپنے فریضے کو پورا کیا ہے اگر چہ قالب بے روح کی صورت میں ہے، دوسرے ممکن ہے کہ یہی تذکر اس کے تسلسل اور شرائط پوری

ہونے کی صورت میں دل کی زبان کھلنے کا سبب بن جائے۔

ہمارے شیخ عارف کامل جناب شاہ آبادی (روحی فداہ) فرمایا کرتے تھے: "ذاکر کو ذکر میں اس شخص کی طرح ہونا چاہئے جو اس چھوٹے بچے کو الفاظ یاد کرانا چاہتا ہو جس کی ابھی زبان کھلی نہ ہو کہ ایسا شخص بار بار لفظ کی تکرار کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ بچہ یاد کرنے لگے۔ پھر جب بچہ لفظ کو ادا کرنے لگتا ہے تو معلم بچے کی پیروی کرتا ہے (کہ اس سے بار بار کہلاتا ہے اور خود بھی دہراتا ہے) اس طرح اس کی ساری تھکن دور ہو جاتی ہے اور گویا بچے سے اس کو مدد ملتی ہے۔ اسی طرح جو شخص ذکر کرتا ہے اس کو چاہئے اپنے قلب کو جس نے زبان ذکر نہیں کھولی ہے ذکر کی تعلیم دے اور اذکار کے تکرار کرنے کا نکتہ یہ ہے کہ زبان قلب کھل جائے اور زبان قلب کے کھلنے کی پہچان یہ ہے کہ زبان، دل کی پیروی کرنے لگے اور تکرار کی زحمت و مشقت ختم ہو جائے۔ پہلے تو (صرف) زبان ذاکر تھی اب قلب (بھی) اس کی تعلیم و مدد سے ذاکر ہو گیا اور زبان قلب کے کھل جانے کے بعد زبان اس کی پیروی کر کے اس کی مدد یا غیبی مدد سے ذکر کرنے لگتی ہے"۔

یہ بھی جان لینا چاہئے کہ ظاہری صوری اعمال ملکوت میں مقام غیب و حشر کے اس وقت تک راتق نہیں ہوتے جب تک باطن روحانیت اور دل کی گہرائیوں سے ان کی مدد نہ ہو اور ان کو حیات ملکوتی نہ بخش دیں اور وہ روحانی تھے جس کی صورت خلوص نیت اور نیت خالص ہے، بمنزلہ روح و باطن ہے جس کے ضمن میں جسد بھی ملکوت میں محشور اور لائق قبول درگاہ ہو جاتا ہے۔ اسی لئے روایات شریفہ میں آیا ہے کہ اعمال کی قبولیت دل کے اقبال کے مطابق ہوا کرتی ہے۔[۱۵] اور تمام اوصاف کے ساتھ ذکر لسانی بھی محبوب اور پسندیدہ ہوتا ہے اور انجام کار انسان کو حقیقت تک پہنچا دیتا ہے۔ اسی لئے اخبار و آثار میں ذکر لسانی کی بڑی تعریفیں کی گئی ہیں اور باب ذکر سے زیادہ کثرت احادیث والا باب کم ہی ہے۔[۱۶] قرآن مجید کی آیات شریفہ میں بھی اس کی بہت مدح کی گئی ہے۔[۱۷] اگرچہ ان میں سے اکثر کو ذکر قلبی یا روح کے ساتھ ذکر پر حمل کیا گیا ہے، مگر ذکر حق ہر مرتبے میں پسندیدہ ہے۔ ہم حصول برکت کیلئے چند حدیثوں کا یہاں ذکر کر کے اپنے کلام کو ختم کرتے ہیں۔

چوتھی فصل

ذکر خدا کی فضیلت میں چند احادیث

فِي الْكَافِي بِسَنَدٍ صَحِيحٍ عَنِ الْفُضَيْلِ بْنِ يَسَارٍ، قَالَ. قَالَ أَبُو عَبْدِاللهِ عليه السلام: «مَا مِنْ

مجلسٍ يجتمعُ فيه أبرارٌ وفُجّارٌ فيقولون على غيرِ ذكرِ الله عزّوجلّ إلّا كان حسرةً عليهم يوم القيامة ﴾ ۱۸؎ ''جس نشست میں بھی اچھے برے لوگ جمع ہوں اور بغیر ذکر خدا وہاں سے اٹھ جائیں تو وہ انسان کیلئے روز قیامت حسرت کا سبب ہوگا''۔

ظاہری بات ہے کہ جب قیامت میں انسان پر ذکر خدا کے بڑے (بڑے) نتائج ظاہر ہوں گے اور وہ اپنے کو ان نعمتوں سے محروم دیکھے گا کہ کتنی عظیم نعمتیں اور خوشیاں اس کے ہاتھ سے نکل گئیں اور اب (کسی بھی طرح) اس کمی کا پورا کرنا ممکن نہیں ہے تو حسرت وندامت اس پر چھا جائے گی۔ لہذا انسان کو چاہئے جتنی بھی فرصت ملے اس کو غنیمت سمجھے اور اپنی محافل ومجالس کو ذکر خدا سے خالی نہ چھوڑے۔

الكافي بسندٍ مُوثّقٍ، عَنْ أبي جعفرٍ علیہ السلام ﴿من أراد أن يكتال بالمكيال الأوفى فليقُلْ إذا أراد أن يقُوم من مجلسه ''کافی میں امام محمد باقرؑ سے نقل کی گئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا جو شخص پورا تول چاہتا ہے (یعنی خدا سے ایسا کامل ثواب چاہتا ہے جس میں کوئی کمی نہ ہو) سے چاہئے جب کسی مجلس سے اٹھے تو ان آیتوں کی تلاوت کرے'' سُبْحانَ ربِّكَ ربِّ العزّةِ عمّا يصفُونَ ☆ وسلامٌ على المُرسلين ☆ والحمدُ للهِ ربِّ العالمين﴾ ۱۹؎

امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ''جو شخص روز قیامت پورا ثواب لینا چاہتا ہے وہ ہر نماز کے بعد انہیں آیات کی تلاوت کرے'' ۲۰؎

امام جعفر صادق علیہ السلام سے مرسلاً منقول ہے کہ ''مجلس سے اٹھتے وقت ان آیات کی تلاوت، گناہوں کا کفارہ ہے'' ۲۱؎

الكافي بإسناده عن ابن فضّال، رفعهُ، قال ﴿قال اللهُ عزّوجلّ لعيسى علیہ السلام يا عيسى اذكُرني في نفسِكَ أذكُرْكَ في نفسي، واذكُرني في ملئِكَ أذكُرْكَ في ملإٍ خيرٍ من ملإِ الآدميّين. يا عيسى ألِنْ لي قلبَكَ وأكثِرْ ذكري في الخلوات واعلم أنّ سُروري أن تُبصبص إليّ وكُنْ في ذلكَ حيّاً ولا تكُنْ ميّتاً﴾ ۲۲؎ ''کافی میں ابن فضال سے نقل کیا گیا ہے کہ خداوند عالم نے حضرت عیسیٰؑ سے کہا اے عیسیٰ! تم مجھے اپنے پاس یاد کرو، میں تم کو اپنے یہاں یاد کروں گا۔ تم مجھ کو اپنے مجمع میں یاد کرو، میں تم کا آدمیوں سے بہتر مجمع میں یاد کروں گا۔ اے عیسیٰ! میرے لئے اپنے دل کو نرم کرو اور تنہائیوں میں بکثرت میرا ذکر کرو اور یہ جان لو کہ میری خوشی اس میں ہے کہ تم میرے لئے چاپلوسی کرو (انتہائی

عاجزی سے تڑپتے رہو) اور حضور قلب کے ساتھ زندہ رہو مردہ دل نہ بنو"۔

"تضرّع" کے معنی خوف یا طمع سے کتے کا دم ہلانے کے ہیں اور یہ شدت التماس و عاجزی کی طرف اشارہ ہے اور "حیّ"، حیات سے مراد توجہ اور حضور قلب ہے۔

الکافی باسنادہ عن ابی عبداللہ علیہ السلام، قال ﴿إنّ اللہ عزّوجلّ یقول: من شُغل بذکری عن مسألتی أعطیتہ أفضل ما أعطی من سألنی﴾ ۲۳ "امام صادقؑ نے فرمایا خداوند عالم کا ارشاد ہے، اگر کوئی میرے ذکر کی وجہ سے مجھ سے سوال کرنے سے رہ جائے تو میں اس کو جو سوال کرنے والے کو دیتا ہوں، اس سے افضل چیز عطا کروں گا"۔

عن احمد بن فہد فی عُدّۃ الداعی، عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ، قال: ﴿... واعلموا أنّ خیر أعمالکم عند ملیککم وأزکاہا وأرفعہا فی درجاتکم وخیر ما طلعت علیہ الشمس، ذکر اللہ سبحانہ وتعالی، فإنّہ أخبر عن نفسہ، فقال: أنا جلیس من ذکرنی﴾ ۲۴ "رسول خداؐ نے فرمایا (خدا کے نزدیک تمہارا) سب سے اچھا، پاک اور تمہارے درجات کو سب سے زیادہ بلند کرنے والا عمل اور جن چیزوں پر سورج چمکتا ہے ان میں سب سے بہتر ذکر خدا ہے' اس لئے کہ اس نے اپنے بارے میں خود بتایا ہے جو میرا ذکر کرے میں اس کا ہمنشین ہوں"۔

ذکر کی فضیلت اور اس کی کیفیت اور آداب و شرائط کی روایات و احادیث اتنی زیادہ ہیں کہ اس کتاب کے احاطے سے باہر ہیں۔

والحمد للہ أولاً وآخراً وظاہراً وباطناً

توضیحات (۱۸)

۱۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۴۹۶، کتاب الدعاء، باب ما یجب من ذکر اللہ فی کل مجلس، حدیث ۴

۲۔ مرآۃ العقول، ج ۱۲، ص ۲۲۔

۳۔ سورۂ بقرہ آیت ۱۸۶

۴۔ سورۂ ق آیت ۱۶۔

۵۔ سورۂ اعراف، آیت ۲۰۵۔

۶۔ علی ابن ابراہیم، عن ابیہ، عن ... قال: لا یکتب الملک الا ما سمع وقال اللہ عزوجل ﴿واذکر ربک فی نفسک تضرعاً وخیفۃ﴾ فلا یعلم ثواب ذلک الذکر فی نفس الرجل غیر اللہ عزوجل لعظمتہ۔ علی ابن ابراہیم نے ... سے نقل کیا ہے ... فرشتہ جو چیز سنتا ہے وہی لکھتا ہے اور خدا نے فرمایا ہے اپنے خدا کو تضرع کے ساتھ مخفی طور پر یاد کرو۔ خدا کے علاوہ ایسے ذکر کا جو ثواب ہے اس کو کوئی نہیں جانتا

اصول کافی، ج ۲، ص ۵۰۲، کتاب الدعاء، باب ذکر اللہ عزوجل فی السر، حدیث ۴

۷۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۵۰۲، کتاب الدعاء، باب ذکر اللہ عزوجل فی الغافلین، حدیث ۱۔

۸۔ احمد بن محمد بن فہد اسدی حلی (۷۵۶-۸۴۱ھ) نویں صدی ہجری کے فقیہ، محدث، عابد اور عارف کامل۔ آپ کے شاگردوں میں محقق کرکی، ابن ابی جمہور احسائی، شیخ علی بن ہلال شامل ہیں۔ آپ کی تصانیف میں عدۃ الداعی، آداب الداعی، اسرار الصلاۃ، التحریر، المقتصر فی شرح الارشاد، شرح الفیہ شہید اور المہذب البارع فی شرح المختصر النافع قابل ذکر ہیں۔

۹۔ عدۃ الداعی، ص ۱۸۹۔

۱۰۔ وسائل الشیعہ، ج ۴، ص ۱۱۸۵، کتاب الصلاۃ، باب ... اس مضمون کی چار حدیثیں نقل ہوئی ہیں۔

۱۱۔ سورۂ طہٰ، آیت ۴۶

۱۲۔ منازل السائرین، ص ۱۵، قسم بدایات، باب تذکر

۱۳۔ حدیث ۱۲، حاشیہ ۱۲، ۱۳۔

۱۴۔ (اور نوح نے) کہا اس کشتی میں ﴿بسم اللہ مجریہا ومرساہا﴾ کہہ کر سوار ہو جاؤ۔ (یعنی خدا ہی کے نام سے

اس کا بہاؤ اور ٹھہراؤ ہے)۔ سورۂ ہود، آیت ۴۱/

۱۵۔ رسول خدا نے فرمایا ﴿إنَّ اللهَ لا يَنظُرُ إلى صُوَرِكُمْ وأعمالِكُمْ، وإنَّما يَنظُرُ إلى قُلوبِكُمْ﴾ خدا تمہاری صورتوں اور اعمال کو نہیں دیکھتا وہ تو تمہارے دلوں کو دیکھتا ہے۔

بحار الانوار، ج ۷۰، ص ۲۴۸، کتاب ایمان و کفر، باب ۵۴، حدیث ۲۱۔

۱۶۔ اصول کافی ج ۲، ص ۴۹۶۔ ۵۰۲، کتاب الدعاء، باب من تحبّ من ذکر اللہ کل مجلس، باب ذکر اللہ عزوجل کثیراً، وسائل الشیعہ، ج ۴، ص ۱۱۷۷۔ ۱۲۳۰، کتاب الصلوٰۃ، ابواب الذکر؛ المحجۃ البیضاء، ج ۲، ص ۲۶۵۔ ۲۷۷، کتاب الاذکار والدعوات، ص ۳۳۲۔ ۳۸۷، کتاب ترتیب الاوراد و تفصیل احیاء اللیل۔

۱۷۔ سورۂ رعد، آیت ۲۸/؛ سورۂ عنکبوت آیت ۴۵/؛ سورۂ حدید آیت ۱۶/؛ سورۂ بقرہ، آیت ۲۰۰/؛ سورۂ احزاب، آیت ۴۱

۱۸۔ اصول کافی ج ۲، ص ۴۹۶، کتاب الدعاء، باب ما یجب من ذکر اللہ فی کل مجلس، حدیث ۱۔

۱۹۔ اصول کافی ج ۲، ص ۴۹۶ کتاب الدعاء، باب ما یجب من ذکر اللہ فی کل مجلس، حدیث ۳۔

(یہ لوگ جو باتیں خدا کے بارے میں بنایا کرتے ہیں ان سے تمہارا پروردگار عزت کا مالک پاک صاف ہے اور رسولوں پر (درود) سلام ہو اور کل تعریفیں خدا ہی کیلئے سزاوار ہیں جو سارے جہان کا پالنے والا ہے) صافات، آیت ۱۸۰/ ۱۸۲۔

۲۰۔ حضرت علیؑ نے فرمایا ﴿من اراد ان يكتال بالمكيال الاوفى، فليكن آخر قوله ﴿سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ فإنّ له من كل مسلم حسنة﴾

جو پورے پیمانے کی توقع چاہتا ہو اس کا آخری قول ﴿سبحان ربک رب العزۃ ﴾ ہونا چاہئے اس کے لئے کہ اس عمل پر مسلمان کیلئے حسنہ ہے۔

من لا یحضرہ الفقیہ، ج ۱، ص ۲۱۲، باب ۴۶، حدیث ۷

۲۱۔ وسائل الشیعہ، ج ۵، ص ۵۸۵، کتاب الایلاء والکفارات، ابواب الکفارات، باب ۳۷، حدیث ۔

۲۲۔ اصول کافی ج ۲، ص ۵۰۲، کتاب الدعاء، باب ذکر اللہ فی السر، حدیث ۴

۲۳۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۵۰۱، کتاب الدعاء، باب الاشتغال بذکر اللہ، حدیث ۱۔

۲۴۔ عدۃ الداعی، ص ۱۸۷۔

انیسویں حدیث

بِسَنَدِي الْمُتَّصِلِ إِلَى ثِقَةِ الإِسْلامِ وَالْمُسْلِمِينَ مُحَمَّدِ بْنِ يَعْقُوبَ الْكُلَيْنِيِّ رِضْوَانُ اللهِ تَعَالَى عَلَيْهِ، عَنْ عَلِيِّ بْنِ إِبْرَاهِيمَ، عَنْ أَبِيهِ، عَنِ النَّوْفَلِيِّ، عَنِ السَّكُونِيِّ، عَنْ أَبِي عَبْدِ اللهِ عليه السلام، قَالَ:

قَالَ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وآله وسلم ﴿الْغِيبَةُ أَسْرَعُ فِي دِينِ الرَّجُلِ الْمُسْلِمِ مِنَ الأَكِلَةِ فِي جَوْفِهِ﴾

قَالَ: وَقَالَ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وآله وسلم ﴿الْجُلُوسُ فِي الْمَسْجِدِ انْتِظَارَ الصَّلاةِ عِبَادَةٌ مَا لَمْ يُحْدِثْ. قِيلَ: يَا رَسُولَ اللهِ وَمَا يُحْدِثُ؟ قَالَ: الاغْتِيَابُ﴾

ترجمہ: سکونی کا بیان ہے کہ حضرت امام صادقؑ نے فرمایا: "رسول خداؐ کا ارشاد ہے: مسلمان کے دین میں غیبت اس کے جسم میں مرض "اکلہ" سے زیادہ سریع ہے"۔

اور فرمایا رسول خداؐ نے یہ بھی فرمایا: "نماز کے انتظار میں مسجد میں بیٹھنا عبادت ہے جب تک کوئی حدث واقع نہ ہو۔ پوچھا گیا اے رسول خداؐ! کس چیز کی حدث واقع نہ ہو؟ فرمایا: غیبت کی"۔

شرح: "غیبۃ" "غاب" کا مصدر اور "غیب" کا اسم مصدر ہے، جیسا کہ جوہری نے کہا: ﴿اِغْتَابَهُ اغْتِيَاباً، إِذَا وَقَعَ فِيهِ، وَالاسْمُ الْغِيبَةُ، وَهُوَ أَنْ يَتَكَلَّمَ خَلْفَ إِنْسَانٍ مَسْتُورٍ بِمَا يَغُمُّهُ لَوْ سَمِعَهُ، فَإِنْ كَانَ صِدْقاً سُمِّيَ غِيبَةً، وَإِنْ كَانَ كَذِباً سُمِّيَ بُهْتَاناً﴾ انتہیٰ۔[1] "جب کوئی کسی کی برائی کرے تو "اغتابہ اغتیاباً" بولا جاتا ہے اور اس کا اسم مصدر "الغیبۃ" آتا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی کے پیٹھ پیچھے ایسی بات کرنا کہ اگر وہ سن لے تو اس کو دکھ ہو۔ اگر وہ کہی گئی بات سچ ہو تو اس کو

''غیبت'' اور اگر جھوٹ ہو تو ''بہتان'' کہا جاتا ہے''۔

محقق محدث مجلسی'' فرماتے ہیں کہ یہ لغوی معنی ہیں، انتہی ۳ مگر بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جوہری نے اصطلاحی معنی بیان کئے ہیں نہ کہ لغوی اس لئے کہ ''غاب'' اور ''اغتاب'' اور اس کی تمام گردانوں کے لغوی معنی یہ نہیں ہیں، بلکہ اس سے عام معنی مقصود ہوتے ہیں اور کبھی خود اہل لغت شرعی یا اصطلاحی معنی کو اپنی کتابوں میں ذکر کر دیا کرتے ہیں۔

قاموس کے مصنف سے منقول ہے کہ ''غاب'' کو ''عاب'' کے معنی میں لیا گیا ہے اور مصباح منیر میں ہے ﴿اغتابہ اذا ذکرہ بما یکرھہ من العیوب، وھو حق﴾۔ ۴ ''جب کسی کے ناپسندیدہ عیوب کا ذکر کیا جائے تو ''اغتابہ'' بولا جاتا ہے اور یہی حق ہے''۔

راقم کے نزدیک متن میں ذکر شدہ تمام چیزوں میں سے کوئی بھی معنی لغوی معنی نہیں ہیں، بلکہ ہر ایک میں ایک قید کا اضافہ کر دیا گیا ہے جس سے اصطلاحی معنی سے خلط پیدا ہو گیا ہے۔ بہر حال لغوی معنی کے طرف میں بحث زیادہ فائدہ مند نہیں ہے، اصل بات شرعی موضوع کا حاصل کرنا ہے جو ذمہ داریوں سے متعلق ہے اور بظاہر یہ مقام کچھ ایسے شرعی قیود کا حامل ہے جو فہم عرفی اور لغوی معنی سے الگ ہے۔ اس کے بعد موضوع کے ذیلی پہلوؤں پر کچھ بات ہوگی۔

''والاکلۃ'' کفرحۃ داء فی العضو یأتکل منہ۔ ''الأکلۃ'' بروزن ''فرحۃ'' اعضا میں پیدا ہونے والی ایک تکلیف ہے جو ان کو کھاتی رہتی ہے، چنانچہ قاموس وغیرہ میں اس کا ذکر کیا گیا ہے اور کبھی ہمزہ کو مد دے کر ''آکلۃ'' فاعلہ کے وزن پر بھی پڑھا گیا ہے، اس کا مطلب ہوگا ''وہ بیماری جو گوشت کھاتی ہے'' مگر پہلا مطلب لغت سے زیادہ مناسب ہے جیسا کہ مجلسی نے بھی ذکر کیا ہے ۵

بہر حال مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہ مرض جب کسی عضو میں خصوصاً عضو لطیف، جیسے باطن میں پیدا ہو جاتا ہے تو اس کو جلدی کھا لیتا اور فنا کر دیتا ہے۔ (اسی طرح) غیبت انسان کے دین کو اس سے بھی جلدی کھاتی اور فاسد و فنا کر دیتی ہے۔

''ما لم یحدث'' باب افعال سے ہے اور اس میں ضمیر مستتر ''جالس'' کی طرف راجع ہے جو مذکورہ جلوس'' سے مستفاد ہے اور ''الغیبۃ'' منصوب ہے اور فعل مقدر کا مفعول ہے جو کلام سائل سے مفہوم ہے۔ بعض نسخوں میں ''وما یحدث'' کے بجائے ''وما الحدث'' آیا ہے، اس لئے ''الغیبۃ'' بنا بر

خبر بہت مرفوع ہے۔

پہلی فصل

غیبت کی تعریف

فقہا (رضوان اللہ علیہم اجمعین) نے غیبت کی بہت سی تعریفیں کی ہیں، جن کا بیان اور ان میں سے ہر ایک کے جامع و مانع ہونے میں مناقشہ کا بیان اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے، ہاں اجمالاً بیان کیا جا سکتا ہے۔

محقق سعید شیخ شہیدؒ نے کشف الریبہ میں اس کی دو تعریفیں بیان کی ہیں، پہلی تعریف جو فقہا میں مشہور ہے ﴿هو ذكر الانسان حال غيبته بما يكره نسبته اليه مما يعد نقصاناً في العرف بقصد الانتقاص والذم﴾ والثاني ﴿التنبيه على ما يكره نسبته اليه﴾ ۷ ”غیبت کسی کی مذمت و عیب جوئی کی نیت سے اس کی غیر موجودگی میں اور اس کی طرف ناخوش آیند ایسی چیز کی نسبت دینا جو عرف عام میں باعث نقص و توہین ہے“۔

اور دوسری تعریف کی تشریح یہ ہے ”کسی کی چیز پر مطلع کرنا جو اسے ناپسند ہو“۔ اگر ذکر کو بمعنی قول تسلیم کیا جائے جیسا کہ عرفاً یہی سمجھ میں آتا ہے، کیونکہ تنبیہ قول، تحریر، حکایت اور دیگر تمام طریقوں سے تفہیم سے عام ہے تو پھر دوسری تعریف عام ہے (اور پہلی تعریف خاص) اور اگر ذکر کو قول سے عام مانا جائے جیسا کہ مطابق لغت یہی بات ہے تو پھر دونوں تعریفوں کی بازگشت ایک ہی چیز کی طرف ہے اور احادیث کی دلالت بھی انہیں دونوں تعریفوں پر ہوتی ہے۔

مثلاً مجالس شیخؒ میں ابوذر (رضوان اللہ علیہ) سے جو وصیت حضرت رسول اکرمؐ کی ابوذرؓ سے منقول ہے ﴿قلت يا رسول الله وما الغيبة؟ قال ذكرك أخاك بما هو فيه فقد اغتبته واذا ذكرته بما ليس فيه فقد بهته﴾ ہے ”ابوذرؓ نے کہا میں نے عرض کیا اے خدا کے رسول غیبت کیا ہے؟ فرمایا تم اپنے برادر (مومن) کا ذکر ان چیزوں کے ساتھ کرو جو اسے ناپسند ہوں اگر اس کے اندر موجود ہوں تب تو غیبت ہے اور اگر وہ باتیں اس میں موجود نہ ہوں تو تہمت و بہتان ہے“

مشہور حدیث نبوی میں ہے ﴿هل تدرون ما الغيبة؟ فقالوا الله ورسوله أعلم، قال ذكرك أخاك بما يكره الخ﴾ ۸ ”کیا تم جانتے ہو غیبت کیا ہے؟ سب نے کہا خدا اور اس کا

رسول زیادہ جانتے ہیں۔ فرمایا اپنے بھائی کا اس طرح ذکر کرنا جو اسے ناپسند ہو الخ"۔

ذکر کے معنی، گروہی لئے جائیں جو فہم عرفی ہے تو اس حدیث کی برگشت معنی اول کی طرف ہوگی اور اگر ذکر کو قول سے عام مانا جائے تو اس کی برگشت دوسری معنی کی طرف ہوگی۔

حضرتؑ نے اس حدیث میں اپنے بھائی کے غائب ہونے کی شرط اس لئے نہیں لگائی کہ لفظ غیبت سے وہ بات خود ہی سمجھ میں آجاتی ہے، اس کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی اور برادر سے مراد بھی معلوم ہے کہ برادر مومن ہے نہ کہ رشتے کا بھائی اور "ما یکرہ" سے مراد وہ چیزیں ہیں جو عرفاً سبب نقص سمجھی جاتی ہیں۔ البتہ قصد نقص و مذمت کا ذکر اگرچہ ابوذرؓ کی حدیث میں نہیں ہے اور مشہور حدیث نبویؐ میں بھی نہیں ہے، لیکن قول کے مفہوم سے سمجھ میں آجاتا ہے، بلکہ ابوذرؓ کی روایت کا پہلا حصہ اس پر دلالت کرتا ہے، اس لئے اس کے بھی ذکر کی ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ صدر روایت میں ہے

﴿الغِيبَةُ أَشَدُّ مِنَ الزِّنا قُلْتُ ولِمَ ذاكَ يا رَسُولَ اللهِ؟ قالَ. لأَنَّ الرَّجُلَ يَزْني فَيَتُوبُ إلَى اللهِ فَيَتُوبُ اللهُ عَلَيْهِ، والغِيبَةُ لا تُغْفَرُ حَتَّى يَغْفِرَها صاحِبُها ثُمَّ قالَ. وأَكْلُ لَحْمِهِ مِنْ مَعاصِي اللهِ﴾ "غیبت زنا سے زیادہ شدید ہے' میں نے عرض کیا کیوں یا رسول اللہ؟ فرمایا اس لئے کہ انسان جب زنا کرتا ہے اور (صدق دل سے) توبہ کر لیتا ہے تو خدا معاف کر دیتا ہے، لیکن غیبت کو خدا اس وقت تک معاف نہیں کرتا جب تک وہ شخص معاف نہ کر دے جس کی غیبت کی گئی ہے اس کے بعد فرمایا اور مومن کا گوشت کھانا خدا کی معصیتوں میں سے ایک معصیت ہے"۔

ان دو جملوں سے پتہ چلتا ہے کہ نقص کا بیان مقصود ہے، ورنہ اگر حسن نیت اور رحم دلی کی بنا پر کسی غیر کا ذکر ہو تو معصیت نہیں ہے کہ بخشش کی ضرورت ہو، اور نہ ہی اس کے گوشت کھانے کے مترادف ہے۔

اور حضرت عائشہ کی روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ غیبت، ذکر قول سے عام ہے۔ چنانچہ وہ کہتی ہیں

﴿دخلت علينا امرأة، فلما ولّت أومأت بيدي أنها قصيرة فقال صلى الله عليه وآله اغتبتيها﴾ "ہمارے پاس ایک عورت آئی جب وہ واپس ہوئی تو میں نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ یہ پست قد ہے۔ اس پر رسول خداؐ نے فرمایا تم نے اس کی غیبت کی' بلکہ خود غیبت والی روایات سے عام طور پر تلفظ کی خصوصیت کو نہیں سمجھا جا سکتا، بلکہ اس کو افہام نوعی کے اعتبار سے حرام سمجھا جاتا ہے، یعنی تلفظ کو ذکر کے ساتھ مختص سمجھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زیادہ تر غیبت قولاً ہوتی ہے اور قول کی خصوصیت کو اس میں کوئی

مدخلیت حاصل نہیں ہے۔

ب ایک مطلب یہ رہ جاتا ہے کہ بہت سی روایات کے اطلاق سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤمنین کے راز کا فاش کرنا حرام ہے، یعنی مؤمنین کے جو عیوب مخفی ہوں چاہے وہ تخلیقی ہوں یا اخلاقی یا عملی ان کا اظہار وافشا خواہ وہ متصف شخص اس پر راضی ہو یا ناراض اور خواہ مقصد مذمت ہو یا نہ ہو بہر حال حرام ہے، لیکن تمام روایت کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قصد مذمت ونقص کو حرمت میں مدخلیت حاصل ہے البتہ اگر عمل بذات خود ہی ان امور میں سے ہو جن کا ذکر اور جن کی اشاعت شرعاً حرام ہے (تو اس میں قصد مذمت کو کوئی دخل نہیں ہے)، جیسے گناہان کبیرہ کہ خود صاحب گناہ ان کا اظہار نہیں کر سکتا، کیونکہ یہ فحاشی اور برائی کی اشاعت ہے (جو خود گناہ ہے) اور اس کا تعلق حرمت غیبت سے بھی نہیں ہے اور بعید نہیں کہ مؤمنین کی چھپی ہوئی چیزوں کو ان کی مرضی کے بغیر ظاہر کرنا حرام ہو، چاہے قصد نقص نہ بھی ہو۔ بہر حال اس سے زیادہ تفصیل اس سلسلے میں ہمارے مقصد سے خارج ہے۔

دوسری فصل

یہ جان لو کہ غیبت کی حرمت فی الجملہ متفق علیہ اور فقہی اعتبار سے ہلاک کر دینے والے کبائر میں سے ہے۔ غیبت کے مستثنیات اور اس کے بارے میں بحث کرنا اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے یہاں تو صرف اس ہلاک کرنے والی برائی کے فساد اور اس کے نتائج کے بارے میں آگاہ کرنا ہے تاکہ اگر خدا نے چاہا تو غور وفکر کے بعد ہم اس میں مبتلا نہ ہوں یا اگر خدانخواستہ اس میں مبتلا ہو چکے ہیں تو بہت جلد اس سے پلٹ جائیں، توبہ کریں اور اس مادۂ فساد کو اکھاڑے بغیر نہ چھوڑیں۔ (کہیں) اس ایمان کش گناہ کبیرہ میں مبتلا ہو کر اس آلودگی کے ساتھ اس دنیا سے منتقل نہ ہو جائیں، کیونکہ عالم غیب میں اور پس پردۂ ملکوت اس ہلاک کرنے والے گناہ کبیرہ کی ایک بہت ہی بدنما صورت ہے اور اس بدی کے علاوہ ملائے اعلیٰ میں انبیاء ومرسلین و ملائکۂ مقربین کے سامنے رسوائی کا بھی سبب ہے اس کی ملکوتی صورت وہی ہے جس کی طرف خدا نے اپنی کتاب شریف میں اشارہ فرمایا ہے اور حدیث شریف میں بھی اسے صراحتاً واشارتاً بیان کیا گیا ہے: قال اللّٰہ تعالی ﴿ولا یغتب بعضکم بعضاً أیحب احدکم ان یاکل لحم أخیه میتاً فکرهتموه﴾[1] ''اور تم میں سے ایک دوسرے کی غیبت نہ کرے، کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند

کرے گا کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟ یقیناً تم پسند نہ کرو گے"۔

ہم اس بات سے غافل ہیں کہ ہمارے اعمال دوسرے عالم میں بالکل ان سے موزون ومناسب صورتوں کے ساتھ ہماری طرف رجوع کریں گے۔ ہم کو نہیں معلوم کہ یہ عمل مردار کھانے کے مترادف ہے، اس کو انجام دینے والا ان جنگلی کتوں کی طرح ہے جو لوگوں کے کپڑوں کو پھاڑ کر ان کا گوشت کھاتے ہیں اور جہنم میں بھی اس عمل کی ملکوتی صورت اس کی طرف پلٹ آئے گی۔

روایت میں ہے کہ رسول خدا ؐ نے جب ایک شخص کو زنا کے جرم میں سنگسار کیا تو ایک شخص نے اپنے ساتھی سے کہا ﴿هذا اُقْعِصَ كَما يُقْعَصُ الكَلْبُ، فَمَرَّ النَّبِيُّ معهُما بجيفةٍ، فقال انهشا منها! فقالا يا رسُولَ الله ننهشُ جيفةً؟ فقال ما أصبتُما من أخيكُما أنْتَنُ مِنْ هٰذِهِ﴾ ۱۲؎ "یہ شخص اپنی جگہ پر کتے کی طرح قتل کیا گیا۔ اس کے بعد رسول خدا ؐ ان دونوں اشخاص کے ساتھ ایک مردار کی طرف سے گزرے تو دونوں سے فرمایا اپنے دانتوں سے اس (مردار) کا بھی گوشت نوچو ان دونوں نے کہا یا رسول اللہ، کیا ہم مردار کھائیں؟ حضور ؐ نے فرمایا تم دونوں نے اپنے بھائی کیلیے جو کچھ کہا اس کی بدبو اس سے کہیں زیادہ ہے"۔

جی ہاں! رسول خدا ؐ اپنے قوی نور بصیرت اور مشاہدے سے دیکھ رہے تھے کہ ان کے عمل کی بدبو مردار کی بدبو سے زیادہ ہے اور زیادہ رسوا کن وغلیظ ہے۔

ایک دوسری روایت میں ہے "غیبت کرنے والا قیامت کے دن اپنا ہی گوشت کھائے گا"۔

وفي الوسائل عن نوف البكالي قال اتيت أمير المؤمنين علیہ السلام — الى ان قال — قُلْتُ زِدني؛ قال ﴿اجتنب الغيبة فانها ادامُ كلاب النار ثُمَّ قال يا نوفُ كذب مَنْ زَعم أنّهُ وُلِد من حلالٍ وهو يأكُلُ لُحُومَ النّاسِ بالغيبة﴾ ۱۳؎ "وسائل الشیعہ نے نوف البکالی سے نقل کیا ہے کہ حضرت علی ؑ سے عرض کیا مجھے زیادہ "وعظ" فرمائیے؟ فرمایا غیبت سے بچو کیونکہ یہ جہنم کے کتوں کی غذا ہے۔ پھر فرمایا: اے نوف! جو شخص غیبت کے ذریعے لوگوں کا گوشت کھاتا ہو وہ اپنے اس دعویٰ میں جھوٹا ہے کہ وہ حلال زادہ ہے"۔

ان روایات شریفہ میں کوئی منافات نہیں ہے ان سب کا وقوع ہونا ممکن ہے، مثلاً ممکن ہے کہ گوشت مردہ بھی کھائے، اپنا گوشت بھی کھائے، کتے کی صورت کا بھی ہو اور اس کی خوراک مردار ہو اور مردار کی صورت ہو اور جہنمی کتوں کی غذا بھی ہو۔ وہاں صورتیں عمل فاعل کے تابع ہوتی ہیں اور ممکن ہے ایک موجود

کے متعدد و مختلف اشکال و صور ہوں، جیسا کہ اپنی جگہ پر ثابت کیا جا چکا ہے۔

وعن عقاب الاعمال باسناده عن رسول الله صلی الله علیه وآله في حديث ﴿ ومن مشى في غيبة اخيه وكشف عورته كانت اوّل خُطوة خطاها وضعها في جهنّم وكشف الله عورتهٗ على رُؤوس الخلائق﴾ ۱۴ رسول اللہؐ نے فرمایا ''جو شخص اپنے برادر مومن کی غیبت اور اس کی چھپی ہوئی چیز کو ظاہر کرنے کیلئے چلے تو اس کا پہلا قدم جو اٹھتا ہے وہ جہنم میں پڑتا ہے اور خدا اس کو مجمع عام میں رسوا کر دیتا ہے''۔

وسائل الشیعہ، حضرت امام صادق علیہ السلام سے نقل کیا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان کرتے ہوئے فرمایا ﴿من اغتاب امرءً مسلماً بطل صومهٗ ونقض وضوءهٗ وجاء يوم القيامة يفوح من فيه رائحة انتن من الجيفة، يتاذّى به اهلُ الموقف، وان مات قبل ان يتوب مات مستحلاً لما حرّم الله عزّ وجلّ﴾ ۱۵ ''اگر کوئی شخص مسلمان کی غیبت کرے تو اس کا روزہ باطل ہو جاتا اور وضو ٹوٹ جاتا ہے اور قیامت کے دن وہ اس طرح آئے گا کہ اس کے منہ سے ایسی بدبو نکل رہی ہوگی جو مردار کی بدبو سے بھی زیادہ بری ہوگی اور جس سے تمام اہل محشر کو اذیت ہوگی اور اگر وہ توبہ سے پہلے مر گیا تو اس طرح مرے گا کہ محرمات خدا کو حلال سمجھتا ہو اور یہ حال جہنم میں جانے سے پہلے ہوگا کہ اہل محشر کے نزدیک رسوا ہو اور اس حدیث کی بنا پر اس کا شمار کفار میں ہوگا، کیونکہ حرام الٰہی کو حلال سمجھنے والا کافر ہے اور غیبت کرنے والا اسی کے مانند ہے۔

اس کے برزخ کی حالت کے بارے میں بھی رسول خداؐ سے مروی ہے ﴿مررت ليلة اُسري بي على قوم يخمشون وجوههم باظافيرهم، فقلت يا جبرئيل! من هؤلاء؟ قال هؤلاء الذين يغتابون الناس ويقعون في اعراضهم﴾ ۱۶ ''انس کہتے ہیں کہ رسول خداؐ نے فرمایا شب معراج میں گزر ایسے افراد کی طرف سے ہوا جو اپنے ناخنوں سے اپنے چہروں کو نوچ رہے تھے میں نے جبرئیل سے پوچھا یہ کون لوگ ہیں؟ جبرئیل نے کہا یہ وہ لوگ ہیں جو غیبت کیا کرتے تھے اور لوگوں کی آبروریزی کیا کرتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ غیبت کرنے والا برزخ میں بھی رسوا ہے اور محشر میں اہل محشر کے سامنے شرمندہ ہے اور جہنم میں بھی رسوائی اور بے عزتی کے ساتھ بسر کرے گا۔ بلکہ اس کے بعض مراتب اس عالم میں بھی

باعث رسوائی ہیں، جیسا کہ کافی شریف کی حدیث میں ہے ﴿قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: یَا مَعْشَرَ مَنْ اَسْلَمَ بِلِسَانِهِ وَلَمْ یَخْلُصِ الْاِیْمَانُ اِلٰی قَلْبِهِ لَا تَذُمُّوا الْمُسْلِمِیْنَ وَلَا تَتَبَّعُوا عَوْرَاتِهِمْ، فَاِنَّ مَنْ تَتَبَّعَ عَوْرَاتِهِمْ تَتَبَّعَ اللّٰهُ عَوْرَتَهُ وَمَنْ تَتَبَّعَ اللّٰهُ عَوْرَتَهُ یَفْضَحْهُ وَلَوْ فِیْ بَیْتِهِ﴾ ۱۷؎ "اسحاق بن عمار کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادقؑ کو فرماتے ہوئے سنا کہ رسول خداؐ نے فرمایا اے وہ گروہ جو زبان سے اسلام لایا ہے، لیکن ایمان اس کے دل میں داخل نہیں ہوا ہے: (خبردار!) تم لوگ مسلمانوں کی مذمت نہ کیا کرو اور نہ ہی ان کے مخفی عیوب کی جستجو کیا کرو، کیونکہ جو مسلمانوں کے عیوب کو تلاش کرے گا خدا اس کے عیوب کو تلاش کرے گا اور خدا جس کے عیوب کو تلاش کرے گا اس کو ذلیل و رسوا کر دے گا چاہے وہ اپنے گھر ہی میں کیوں نہ ہو"۔

خداوند عالم غیور ہے۔ مؤمنین کے چھپے اور پوشیدہ چیزوں کو ظاہر کرنا ناموس الٰہی کا ہتک کرنا ہے۔ اگر انسان بے حیائی کی حدوں کو پار کر دیتا اور حرمات الٰہی کی ہتک کرتا ہے تو خدائے غیور اس کے چھپے ہوئے ان عیوب کو جن کو اس نے اپنی ستاریت کی وجہ سے چھپا رکھا تھا ظاہر کر دیتا ہے اور اس کے رازوں کو عیاں کر دیتا اور اس عالم میں لوگوں کے سامنے اور اس عالم (آخرت) میں ملائکہ و انبیاءؑ و اولیاء کے درمیان رسوا کر دیتا ہے۔

کافی شریف کی حدیث میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے ﴿لَمَّا اُسْرِیَ بِالنَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ یَا رَبِّ مَا حَالُ الْمُؤْمِنِ عِنْدَکَ؟ قَالَ: یَا مُحَمَّدُ مَنْ اَهَانَ لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ بَارَزَنِیْ بِالْمُحَارَبَةِ وَاَنَا اَسْرَعُ شَیْءٍ اِلٰی نُصْرَةِ اَوْلِیَائِیْ﴾ ۱۸؎ "جب رسول خداؐ کو معراج پر لے جایا گیا تو آپؐ نے فرمایا پالنے والے تیرے نزدیک مؤمن کی کیا حالت ہے؟ آواز آئی۔ میرے حبیب جس نے میرے کسی ولی کی توہین کی، اس نے مجھ سے اعلان جنگ کر دیا اور میں اپنے اولیا کی سب سے جلدی مدد کرتا ہوں)۔ اس سلسلے میں اور بھی احادیث ہیں۔

شیخ صدوقؒ نے امام صادقؑ سے روایت کی ہے ﴿وَمَنِ اغْتَابَهُ بِمَا فِیْهِ فَهُوَ خَارِجٌ مِنْ وِلَایَةِ اللّٰهِ تَعَالٰی دَاخِلٌ وِلَایَةَ الشَّیْطَانِ﴾ ۱۹؎ "اگر کوئی کسی کی غیبت اس عیب سے کرے جو اس میں ہو (جبکہ وہ شخص ظاہر میں عدل و انصاف کا مالک اور اہل ستر میں سے ہو، مگر اس کے نزدیک گنہگار ہو) وہ خدا کی ولایت سے خارج ہو کر شیطان کی ولایت میں داخل ہو جاتا ہے"۔

یہ بات معلوم ہے کہ جو حق کی ولایت (حکومت) سے خارج ہو کر شیطان کی ولایت میں داخل ہو جائے وہ اہل نجات وایمان سے نہ ہوگا، جیسا کہ اسحاق بن عمار کی گزشتہ حدیث سے بھی ظاہر ہو کہ غیبت کرنے والے کا اسلام صرف زبانی ہے، اس کے دل میں ایمان داخل نہیں ہوا اور ظاہر ہے کہ جو شخص خدا پر ایمان رکھتا ہے، روز جزا کی تصدیق کرتا اور صور اعمال وحقائق سیئات کا عقیدہ رکھتا ہے وہ ایسے مہلک گناہ کبیرہ کا مرتکب نہیں ہو سکتا جو عالم غیب وشہادت میں، دنیا وعقبیٰ و برزخ میں اس کو ذلیل ورسوا کردے اور بری طرح اس کو جہنم میں داخل کردے اور ولایت حق سے خارج کر کے ولایت شیطان میں داخل کردے۔

اب اگر ہم نے ایسے کوئی بڑی غلطی کی تو سمجھ لینا چاہئے کہ اس کا کوئی برا سرچشمہ ہے اور حقیقت ایمان ہمارے دل میں داخل نہیں ہوئی۔ اگر ایمان ہمارے دل میں داخل ہو جائے تو تمام کاموں کی اصلاح ہو سکتی ہے اور اس کے آثار ظاہر و باطن اور سر و آشکار میں واضح ہو جاتے۔ اس لئے اپنے باطن اور مرض قلب کا علاج کرنا چاہئے۔

احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ایمان کی کمزوری اور اس کا عدم خلوص اعمالی واخلاقی خرابیوں کا سبب ہوتا ہے اسی طرح یہ مفاسد بھی نقصان ایمان، بلکہ ایمان کے زائل ہونے کا سبب ہوتے ہیں اور یہ برہان کی ایک قسم کے مطابق ہے جس کا ذکر اپنی جگہ پر موجود ہے۔

یہ بھی جان لو کہ غیبت دوسرے اعتبار سے بھی دیگر گناہوں سے شدید تر اور اس کے نتائج قبیح تر ہیں اور وہ یہ ہے کہ اس میں حق اللہ کے علاوہ حق الناس کا پہلو بھی پایا جاتا ہے جسے خدا اس وقت تک نہیں بخشتا جب تک وہ شخص نہ بخش دے جس کی غیبت کی گئی ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں چند طریقوں سے یہی مضمون وارد ہوا ہے۔ في المجالس والاخبار باسناده، عن ابي ذر، عن النبيّ ﷺ في وصيّة له قال ﴿يا ابـــا ذر ايّاكَ والغيبة فإنَّ الغيبة أشدُّ من الزّنا قُلْتُ ولِمَ ذاكَ يا رسُولَ الله؟ قال لأنّ الرّجُل يزني فيتُوبُ إلى الله فيتُوبُ اللهُ عليه، والغيبةُ لا تُغفرُ حتّى يغفرها صاحبُها﴾ ؎۲۰ حضور سرور کائنات "ابوذر" کو چند وصیتیں کرتے ہوئے فرماتے ہیں "اے ابوذر خبردار غیبت سے بچنا اس لئے کہ غیبت زنا سے بدتر ہے ابوذر نے عرض کیا یہ کیونکر یا رسول اللہ؟ آپ نے فرمایا اس لئے کہ زنا کرنے والا (کبھی) توبہ کرتا ہے تو خدا اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے، لیکن جب تک وہ شخص جس کی غیبت کی گئی ہے وہ نہ بخش دے خدا بھی اس کو نہیں بخشتا"۔

علل الشرائع، خصال، مجمع البیان اور کتاب اخوان صفا میں یہی مضمون یا اس سے ملتا جلتا روایت کیا گیا ہے۔[۲۱]

اگر کوئی شخص خدانخواستہ لوگوں کا حق لے کر مراجت تو اس کا کام اور مشکل ہو جاتا ہے۔ حقوق الٰہی میں تو معاملہ رحیم و کریم خدا کا ہے جہاں بغض، کینہ اور عداوت کا مسئلہ ہی نہیں ہے، لیکن بندوں کے معاملے میں امکان ہے اس صفت کے لوگ ہوں یا لوگوں کی برائیوں کو جلدی سے معاف نہ کرتے ہوں یا کبھی معاف ہی نہ کرتے ہوں۔ اس لئے (ہر) انسان کیلئے ضروری ہے کہ اپنے حالات کا بہت خیال رکھے اور ان چیزوں کا خیال رکھے، کیونکہ معاملہ بہت خطرناک اور امر بہت ہی مشکل ہے۔ غیبت کی شدت کے سلسلے میں اتنی حدیث وارد ہوئی ہیں کہ ان کے ذکر کی گنجائش اس کتاب میں نہیں ہے۔ اس لئے ہم چند حدیثوں کے ذکر پر اکتفا کریں گے رُوِيَ عنِ النَّبِيِّ ﷺ أنَّهُ خَطَبَ يوماً فذكرَ الرِّبا وَعظَّمَ شأنَهُ فقالَ ﴿إنَّ الدِّرهمَ يُصيبُهُ الرَّجُلُ مِنَ الرِّبا أعظمُ مِنْ ستٍّ وثلاثينَ زَنْيَةً وإنَّ أرْبى الرِّبا عِرْضُ الرَّجُلِ المُسْلِمِ﴾ [۲۲] "رسول خدا ﷺ نے ایک خطبے میں سود (ربا) کا ذکر کیا اور اس کی بہت برائی بیان کی، یہاں تک کہ فرمایا سود کے ایک درہم کا گناہ ۳۶ زنا سے بڑا ہے اور مسلمان کی آبرو سود سے بہت زیادہ بڑا ہے"۔

وَرُوِيَ عنهُ ﷺ أنَّهُ قالَ ﴿مَا النَّارُ فِي اليَبَسِ بِأسْرَعَ مِنَ الغِيبَةِ فِي حَسَناتِ العَبْدِ﴾ [۲۳] "خشک چیز میں آگ اتنی تیزی سے نہیں دوڑتی جتنی تیزی سے غیبت بندے کی اچھائیوں کو فنا کر دیتی ہے"۔

وعنهُ ﷺ ﴿يُؤتى يومَ القِيامةِ يُوقَفُ بَيْنَ يدَيِ الرَّبِّ عزَّ وجلَّ وَيُدْفَعُ إليهِ كِتابُهُ فلا يَرى حَسَناتِهِ فيهِ فيقولُ إلهي! ليسَ هذا كِتابي [فإنّي] لا أرى فيهِ حَسَناتي. فَيُقالُ لَهُ إنَّ رَبَّكَ لا يَضِلُّ ولا يَنْسى، ذَهَبَ عَمَلُكَ بِاغْتِيابِ النّاسِ. ثُمَّ يُؤتى بآخَرَ وَيُدْفَعُ إليهِ كِتابُهُ فَيَرى فيهِ طاعاتٍ كَثيرةً، فيقولُ. إلهي! ما هذا كِتابي فإنّي ما عَمِلْتُ هذهِ الطّاعاتِ فَيُقالُ لَهُ إنَّ فُلاناً اغْتابَكَ فَدُفِعَ حَسَناتُهُ إلَيْكَ﴾ [۲۴] "روز قیامت ایک شخص کو خدا کی بارگاہ میں پیش کیا جائے گا اور خدا کے سامنے کھڑا کر کے اس کا نامۂ اعمال اس کے ہاتھوں میں دیا جائے گا۔ اس میں جب وہ اپنی نیکیوں کو نہ دیکھے گا تو یوں اٹھے گا پروردگارا! یہ میرا نامۂ اعمال نہیں ہے، (کیونکہ) اس میں میری نیکیاں نہیں ہیں۔ جواب دیا جائے گا تمہارا خدا نہ گمراہ ہے نہ بھولنے والا ہے: تیرا عمل لوگوں کی غیبت کرنے کی وجہ سے ختم

ہوگیا ہے۔پھر ایک دوسرے شخص کو حاضر کیا جائے گا اور اس کا نامۂ عمل اس کو دیا جائے گا اس میں بہت اطاعتیں ہوں گی وہ کہے گا خدایا! یہ میرا نامۂ اعمال نہیں ہے، کیونکہ میں نے ایسی اطاعتیں نہیں کی ہیں۔اس کو جواب دیا جائے گا فلاں نے تیری غیبت کی تھی اس لئے اس کی نیکیاں تجھے دیدی گئیں''۔

وعن النبي صلى الله عليه وآله وسلم ﴿ أدنى الكفر أن يسمع الرجل من اخيه كلمة يحفظها عليه يريد أن يفضحه بها أولئك لاخلاق لهم ﴾٢٥ ''کفر کا پست مرتبہ یہ ہے کہ اپنے برادر مؤمن سے کوئی لفظ سن کر اس کو اس لئے یاد رکھے کہ اس کے ذریعے سے اس کو رسوا کرے گا ایسے لوگوں کا (آخرت میں) کوئی حصہ اور فائدہ نہیں ہے''۔

اس باب کی یہ روایات ان صورتوں کیلئے مخصوص ہیں جب ان پر غیبت کے علاوہ دوسرا کوئی عنوان بھی منطبق ہو اور اس کے مفاسد گناہ غیبت کرنے والے کے شامل حال ہوں۔ مثلاً مؤمن کی اہانت، اس کی تحقیر، پستی اور اس پر طنز، اور اس کی لغزشوں کا شمار کرنا، اس پر طعن کرنا وغیرہ کیونکہ ان میں سے ہر ایک اس کی ہلاکت کیلئے سبب مستقل ہے اور جو روایات ان چیزوں کی مذمت میں الگ الگ وارد ہوئی ہیں وہ کثیر شکل ہیں، ہم نے اختصار کا لحاظ رکھتے ہوئے ان سے چشم پوشی کی ہے۔

تیسری فصل: غیبت کے معاشرتی نقصانات

جس طرح یہ گناہ کبیرہ اور عظیم ہلاک کرنے والی برائی ایمان و اخلاق اور ظاہر و باطن کو فاسد کرنے والی اور دنیا و آخرت میں رسوائی و بے عزتی کی طرف لے جانے والی ہے، چنانچہ اس کا تھوڑا سا حصہ گزشتہ باب میں آپ نے پڑھا۔ اسی طرح یہ معصیت معاشرتی اور انسانی برائیاں بھی رکھتی ہے، اسی لئے اس کی قباحت اور برائی بہت سے دیگر معاصی سے زیادہ ہے۔

انبیاء کرامؑ اور شریعتوں کا ایک بڑا مقصد، علاوہ اس کے کہ وہ خود بھی اپنی جگہ مستقل مقصد ہے، عظیم مقاصد کی ترقی کا ذریعہ اور ایک فلاحی معاشرے کی تشکیل میں علت تامہ کا کردار ادا کرتا تھا، (یعنی) کلمہ پڑھنے والوں کا اتحاد اور توحید عقیدہ کی تشکیل مقصود تھی، اسی طرح اہم ترین امور پر اجتماع اور ظالم و جابر لوگوں کے ظلم و ستم کو روکنا تھا، کیونکہ یہ باتیں انسانیت کی بگاڑ اور فردی معاشرے کی بربادی کے سبب ہیں اور یہ عظیم مقصد جو اجتماعی و انفرادی اصلاح کا عنصر ہے، اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا جب تک لوگوں کے

نفوس میں وحدت ان کی ہمت وارادوں میں ہماہنگی اور دلوں میں اخوت وصداقت نہ ہو اور وہ صفائے ظاہری وباطنی کے زیر سایہ زندگی بسر نہ کریں اور معاشرے کے افراد اس طرح نہ ہو جائیں کہ گویا پوری نفی نوع انسان شخص واحد ہے، یعنی پوری آبادی ایک شخص کے مانند نہ ہو جائے اور افراد بمنزلۂ اعضا واجزا نہ ہو جائیں اور ساری سعی وکوشش ایک الٰہی مقصد اور عظیم عقلی مہم، یعنی فرد ومعاشرے کی اصلاح کے گرد گھومنے نہ لگے۔ اگر ایسی محبت واخوت کسی ایک ذات یا ایک گروہ کے اندر پیدا ہو جائے تو وہ ان تمام گروہوں اور ملتوں پر غلبہ حاصل کرسکتا ہے جو اس طریقہ پر نہ ہوں۔ چنانچہ تاریخ اور بالخصوص اسلامی جنگوں اور ان کی عظیم فتوحات کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات بخوبی واضح ہو جائے گی، اس لئے کہ اس قانون الٰہی کے ابتدائے طلوع میں چونکہ مسلمانوں میں تھوڑی سی وحدت تھی اور مجموعی طور پر ان کی کوششیں خلوص نیت کے ساتھ تھیں اس لئے تھوڑی ہی مدت میں بڑے (بڑے) عظیم فتوحات کے یہ لوگ مالک ہو گئے تھے اور تھوڑے ہی زمانہ میں اس دور کی عظیم ترین سلطنتوں پر غالب ہو گئے اور تھوڑے سے لشکر کے ساتھ بے انتہا ور بھاری کثریت پر غالب آ گئے۔ رسول خداؐ نے صدر اول میں ہی مسلمانوں کے درمیان صیغہ اخوت جاری کر دیا تھا اور نص قرآن ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾ ۲۶ "مومنین تو آپس میں بھائی بھائی ہیں" کی بنا پر تمام مومنوں کے درمیان اخوت قائم کر دی۔

وفي الكافي عن العرقوفي قال سمعت أبا عبدالله علیہ السلام يقول لأصحابه ﴿اتقوا الله وكونوا إخوة بررة في الله متواصلين متراحمين، تزاوروا وتلاقوا وتذاكروا أمرنا وأحيوه﴾ ۲۷ عرقوفی کہتے ہے کہ میں نے امام جعفر صادقؑ کو اپنے اصحاب سے فرماتے ہوئے سنا، "خدا سے ڈرو اور ایک دوسرے کے ساتھ اچھے سلوک کرنے والے بھائی، خدا کی راہ میں ایک دوسرے کی مدد کرنے والے، آپس میں رشتے جوڑنے ور ایک دوسرے پر رحم کرنے والے، نیک اور اچھے بھائی بن جاؤ، ایک دوسرے سے ملنے جاؤ اور ایک دوسرے سے ملاقات کرو، ہمارے امر (امامت) کا آپس میں ذکر کرو اور اس کو زندہ کرو"۔

وعن أبي عبدالله علیہ السلام قال. ﴿يحق على المسلمين الاجتهاد في التواصل والتعاون على التعاطف والمواساة لأهل الحاجة وتعاطف بعضهم على بعض حتى تكونوا كما أمركم الله عزوجل رحماء بينهم﴾ ۲۸ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: "مسلمانوں پر حق بنتا ہے کہ ملنے جلنے،

رحم دلی و مہربانی میں تعاون کرنے اور ضرورتمندوں کی دلجوئی اور ایک دوسرے کے ساتھ مہربانی کرنے میں کوشش کریں تا کہ تم لوگ اسی طرح ہو جاؤ جیسا کہ خدا نے تمہیں حکم دیا ہے کہ وہ آپس میں بڑے رحم دل ہیں"۔

۲۹۔ وعنہ علیہ السلام ﴿تواصلوا وتباروا وتراحموا وکونوا اخوۃ بررۃ کما امرکم اللہ عزوجل﴾
نیز امام صادقؑ نے فرمایا "ایک دوسرے کے ساتھ رشتہ داری کرو، ایک دوسرے کے ساتھ نیکی اور احسان کرو، ایک دوسرے کیلئے آپس میں رحمت کی دعا کرو اور آپس میں ایسے اچھے بھائی ہو جاؤ جیسا کہ خدا نے تم کو حکم دیا ہے"۔

مسلمانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ دوستی و قربت، نیکی، محبت و مودّت اور اخوت کا حکم دیا گیا ہے اور معلوم ہے کہ جو چیز ان اسباب کی زیادتی کا سبب ہو وہ بھی اچھی اور پسندیدہ ہے اور جو چیز اس عقد قربت واخوت کو توڑ دے اور لوگوں میں تفرقہ اندازی کا سبب بن جائے وہ صاحب شرع کے نزدیک ناپسندیدہ اور ان کے عظیم مقصد کے خلاف ہے اور یہ بات تو بہت ہی واضح ہے کہ یہ ہلاک کرنے والی برائی اگر کسی معاشرے میں رائج ہو جائے تو کینہ و حسد اور بغض و عداوت پیدا کر کے معاشرے کو فاسد کر دیتی ہے۔ نفاق و دو رولی کا درخت اس میں لگا کر اس کو طاقتور بنا دیتی ہے۔ معاشرے کے اتحاد کو توڑ کر دینداری کی بنیادوں کو کمزور کر دیتی ہے۔ اس طرح اس کی برائی اور قباحت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔

لہذا ہر غیرتمند اور دیندار مسلمان کیلئے ضروری ہے کہ اپنے کو فساد سے بچانے اور مجموعی طور پر اہل دین کو نفاق سے بچانے کیلئے اور امت مسلمہ کی حفاظت، وحدت اور جمعیت کی نگہبانی اور عقد اخوت کی مضبوطی کی خاطر اس برائی سے اپنے کو بچائے اور لوگوں کو اس قبیح عمل سے روکے اور اگر خدانخواستہ ابھی تک خود اس برائی میں مبتلا تھا تو اس سے توبہ کرے اور بصورت امکان و عدم فساد جس شخص کی غیبت کی تھی اس کو راضی کرے اور معاف کر لے ورنہ اس کیلئے استغفار کرے اور اس گناہ کو چھوڑ کر صداقت و وحدت اور اتحاد کی جڑوں کو اپنے دل میں کاشت کرے تا کہ اس کا شمار معاشرے کے صالح فرد میں ہونے لگے اور اسلام کی چکی کو چلانے میں اہم کردار ادا کرنے والے میں ہونے لگے۔

وَاللّٰہُ الھادي الیٰ سَبیلِ الرَّشاد

چوتھی فصل۔ اس ہلاکت خیز برائی کا علاج

یہ سمجھ لو کہ دیگر گناہوں کی طرح اس عظیم ہلاکت خیز گناہ کا ازالہ (بھی) نفع بخش علم و عمل سے کیا جاسکتا ہے۔

علمی طریقہ یہ ہے کہ انسان اس عمل پر مرتب ہونے والے فائدے کا قیاس اس پر مرتب ہونے والے برے نتائج اور برے ثمرات سے کرے اور میزان عقل میں رکھ کر اس سے سوال کرے۔ یہ بات یقینی ہے کہ انسان اپنے سے دشمنی نہیں رکھتا۔ انسان کے تمام گناہ جہالت و نادانی اور اس کی مبادی سے غفلت اور نتائج سے بے پروائی کی بنا پر ہوا کرتے ہیں اور اس غیبت پر جو خیالی فائدہ مرتب ہوتا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ انسان چند منٹ لوگوں کی برائیوں اور ان کے چھپے ہوئے عیوب کو ظاہر کر کے بزلہ گوئی اور ہرزہ سرائی کے ذریعے جو حیوانی یا شیطانی طبیعت کے مناسب ہوتی ہے، اس میں اپنا وقت صرف کر کے مجلس آرائی کے ذریعے اپنی نفسانی خواہش پوری کر لیتا ہے اور اپنے محسود لوگوں کی توہین سے قلبی تشفی کا سامان فراہم کر لیتا ہے۔

غیبت کے برے نتائج کا تھوڑا سا ذکر تو آپ سابق فصلوں میں سن چکے۔ اب تھوڑا سا اور سن کر عبرت حاصل کیجئے اور میزان قیاس پر تولئے، یقیناً اس تفکر و موازنے کے اچھے نتائج (برآمد) ہوں گے۔ اس دنیا میں اس کا ایک نتیجہ تو یہی ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی نظروں سے گر جاتا اور لوگوں کا اس سے اطمینان اٹھ جاتا ہے، (کیونکہ) فطری طور سے لوگ کمال و نیکی و خوبی سے محبت اور نقص و پستی و برائی سے نفرت پر پیدا کئے گئے ہیں۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ لوگ کسی کے راز کے انکشاف اور اس کی بے عزتی اور چھپی ہوئی چیزوں کے اظہار کرنے والوں اور ان کے مخالفین میں فرق کرتے ہیں، انتہا یہ ہے کہ خود غیبت کرنے والا اس قسم کی برائیوں سے بچنے والے کو اپنے سے بہتر سمجھتا ہے۔ یہ بات فطری اور عقلی ہے کہ اگر کوئی (غیبت میں) حد سے گزر جائے اور لوگوں کی بے عزتی پر اتر آئے تو خدا اس کو اسی دنیا میں ذلیل کر دیتا ہے۔ جیسا کہ اسحاق بن عمار کی گزشتہ روایت ۳ میں ذکر کیا گیا اور انسان کو اس رسوائی سے ڈرنا چاہئے جو خدا کے ہاتھوں نصیب ہو، کیونکہ اس کی تلافی ممکن نہیں ہے۔ میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں حلیم کے غضب سے! بلکہ ممکن ہے کہ مومنین کی بے احترامی اور ان کے پوشیدہ رازوں کا افشا، انسان کو برے انجام تک پہنچا دے، کیونکہ اگر یہ عادت ملکہ کی صورت اختیار کر گئی تو نفس کے اندر اس کے (برے) اثرات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک اثر تو یہی

ہے کہ غیبت کرنے والے کے بارے میں لوگوں میں بغض و عداوت پیدا ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ یہ دشمنی زیادہ ہی ہوتی رہتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بغض و عداوت مرتے وقت انسان پر بعض ایسے حقائق واضح کردے اور پردۂ ملکوت کو اٹھا کر بعض ایسے عوام کا معائنہ کرادے جن کی بنا پر ان کے مقامات کی رؤیت اور خدا کی طرف سے ان لوگوں کی عزت و احترام، خود خدا سے بغض کا سبب بن جائے۔ بہرحال دشمن کے دوست کا دشمن ہوتا ہے اور دوست سے بغض رکھنے والا منفور ہوتا ہے۔ لہٰذا خدا اور اس کے ملائکہ سے دشمنی کے ساتھ اس دنیا سے انتقال کے ذریعے وہ ابدی ذلت اور دائمی شقاوت تک پہنچ سکتا ہے

میرے عزیز! خدا کے ان بندوں سے جو اس کی نعمت و رحمت سے مالامال اور خلعتِ اسلام و ایمان سے آراستہ ہیں دوستی کرو اور دلی محبت رکھو۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ محبوبِ خدا سے دشمنی کر بیٹھو، کیونکہ خدا اپنے محبوب کے دشمن کا دشمن ہے، وہ تم کو اپنی رحمت سے دور کردے گا اور خدا کے مخصوص بندے بندگانِ الٰہی میں چھپے ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے تمہاری دشمنی اور اس مؤمن کی مخفی چیزوں کا فاش کرنا اور پردہ دری کرنا سرِ خدا کی ہتک کرنے کا سبب ہو، کیونکہ مؤمنین اولیاء اللہ ہیں ان سے دوستی خدا سے دوستی اور ان سے دشمنی خدا سے دشمنی ہے۔ خدا کے غضب سے ڈرو اور روزِ جزا کے شفعاء کی دشمنی سے خوفزدہ رہو ﴿ویلٌ لمن شفعاؤہ خصماؤہ﴾[31]

اس گناہ (غیبت) کے دنیاوی اور اخروی نتائج کے بارے میں ذرا غور تو کرو! قبر، برزخ اور قیامت میں اس کی ان وحشتناک صورتوں کے بارے میں ذرا سوچو جس میں تم مبتلا ہو گے۔ علما (رضوان اللہ علیہم) کی معتبر کتابوں اور ائمہ اطہار کی منقولہ روایتوں کو دیکھو جو واقعاً کمر شکن ہیں۔ اس کے بعد چند روزہ مدت کی بیہودہ گوئی اور بذلہ سرائی اور خیالی شہوت کی تکمیل اور جزا دینے والے کے انتقام کا قیاس کرو اور یہ بھی اس وقت جب تم اہلِ نجات میں سے ہو اور باایمان اس دنیا سے جاؤ، ورنہ جہنم میں ہمیشہ رہنے اور دائمی عذابِ الیم سے اس کا موازنہ کرو۔ نعوذ باللہ منہ۔

اس کے علاوہ جس کی تم غیبت کر رہے ہو اگر اس سے دشمنی ہے تب بھی اگر حدیثوں پر ایمان ہے تو دشمنی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی غیبت نہ کرو، کیونکہ حدیث میں ہے غیبت کرنے والے کی نیکیاں اس شخص کے نامۂ اعمال میں لکھ دی جاتی ہیں جس کی غیبت کی گئی ہے اور اس کی برائیاں غیبت کرنے والے کے نامۂ اعمال میں لکھ دی جاتی ہیں۔ پس تم نے اس سے دشمنی نکالنی چاہی تھی خود اپنے ہی سے دشمنی کر بیٹھے۔ اس

لئے سمجھ لو کے خدا سے جنگ نہیں کر سکتے۔ خدا اس پر قادر ہے کہ تمہاری اسی غیبت سے اس شخص کو لوگوں کی نظروں میں عزیز ومحترم کردے اور تم کو اسی غیبت کی بنا پر لوگوں کی نظروں میں ذلیل وخوار کردے اور فرشتوں کے سامنے بھی یہی کام کرے، تمہارے نامۂ اعمال کو برائیوں سے بھر کر تم کو ذلیل ورسوا کردے اور اس کے نامۂ عمال کو نیکیوں سے بھر کر اس کو مکرم ومحترم کردے۔ پس سمجھ لو کہ کس قادر وجبار سے جنگ کر رہے ہو؟ اس کی دشمنی سے ڈرو۔

ور عملی طریقہ یہ ہے کہ کچھ دنوں تک چاہے جتنی زحمت ہو نفس کو غیبت سے روک کر مہار زبان کو اپنے ہاتھ میں لے لو ور مکمل طریقے سے اپنی نگرانی کرو اور اپنے ساتھ عہد کرو کہ کچھ دنوں تک یہ گناہ نہیں کروگے۔ اپنی حفاظت ونگرانی کرو ور اپنا حساب کرو۔ (اس طرح) امید ہے انشاء اللہ کچھ مدت کے بعد اصلاح ہو جائے گی اور غیبت کا مادہ ہی ختم ہو جائے گا، پھر رفتہ رفتہ تمہارے لئے کام آسان ہو جائے گا اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد تم محسوس کرلوگے کہ اب فطری طور سے اس سے بیزار اور متنفر ہو، پھر غیبت نہ کرنے ہی میں نفس کو لذت حاصل ہوگی۔

پانچویں فصل۔ جائز مقامات پر بھی ترک غیبت اولیٰ ہے

یہ جان لو کہ علماوفقہاء (رضوان اللہ علیہم) نے کچھ مقامات کو غیبت کی حرمت سے مستثنیٰ کیا ہے کہ بعض علما کے قوال میں ایسے دس سے زائد مقامات ہیں۔ میں ان کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا، کیونکہ اس کتاب کو فقہی مباحث کیلئے نہیں لکھا گیا ہے۔ یہاں پر جس بات کا ذکر ضروری ہے وہ یہ ہے کہ انسان کو تمام مواقع پر نفس کی مکاریوں سے بے خوف نہیں رہنا چاہئے، بلکہ پوری دقت نظر اور مکمل احتیاط کے ساتھ قدم اٹھانا چاہئے۔ عذر تراشی کے چکر میں رہ کر غیبت کے کسی مستثنیٰ مقام کو لے کر عیب جوئی اور بذلہ گوئی میں مشغول نہیں ہونا چاہئے۔

نفس کی مکاریاں بہت ہی سخت اور باریک ہیں، ممکن ہے وہ انسان کو شریعت کے رستے پر گامزن کر کے دھوکہ دے اور ہلاکت کے مقامات میں پھنسا دے۔ مثلاً کھلم کھلا فسق کے مرتکب ہونے والے کی غیبت اگرچہ جائز ہے، بلکہ اگر اس کے باز آجانے کا سبب ہو تو بعض مقامات پر واجب ہے اور نہی از منکر کے مراتب میں شمار کی جاتے والی ہے، لیکن انسان کو یہ دیکھنا چاہئے کہ کہیں اس غیبت کا محرک وداعی شیطان

اور محرک نفسانی تو نہیں ہے، بلکہ واقعی اس کا داعی شرعی اور الہی ہے؟ اگر (واقعی) محرک الہی ہے تو اس کا شمار عبادات میں ہے، بلکہ اصلاح کی نیت سے علی الاعلان (فسق) اور گناہ کرنے والے کی غیبت اس پر انعام واحسان کا واضح ترین مصداق ہے چاہے وہ (گنہگار) اس کو نہ سمجھے! لیکن اگر غیبت میں برائی اور خواہش نفس (بھی) شامل ہے تو غیبت کرنے والے کو اپنی نیت کو خالص بنانے کی کوشش کرنی چاہئے اور بغیر قصد صحیح لوگوں کی عزت وآبرو کو پامال کرنے سے پرہیز کرنا چاہئے، بلکہ جائز مواقع پر بھی نفس کو غیبت کرنے کی عادت ڈالنا خود اس کیلئے نقصان دہ ہے، اس لئے کہ نفس تو برائیوں اور شرور کی طرف مائل ہوتا ہی ہے، ممکن ہے جائز مقامات پر پرہیز نہ کرنے سے رفتہ رفتہ دوسرے مرحلے، یعنی حرام مقامات میں داخل ہو جائے، جیسے شبہات میں داخل ہونا جائز ہونے کے باوجود اچھی بات نہیں ہے، کیونکہ یہ محرمات کے قریب ہیں اور ممکن ہے کہ نفس ان میں داخل ہونے کے بعد حرام معاملات میں بھی داخل ہو جائے۔ (اس لئے) انسان کو چاہئے حتی الامکان اپنے کو ان مقامات سے بچائے اور ان (تمام) چیزوں سے بھی اجتناب کرے جہاں نفس کی سرکشی کا امکان ہو۔

ہاں اجن مقامات پر غیبت واجب ہے، جیسے پہلے والا مقام اور بعض دیگر وہ مقامات جن کا علماء نے ذکر کیا ہے وہاں پر غیبت کا اقدام کرے لیکن خواہش نفس اور شیطان کی پیروی سے نفس کو خالص رکھے۔ مگر پھر بھی جائز مقامات پر ترک غیبت اولیٰ واحسن ہے، ہر جائز امر کا ارتکاب انسان کو نہیں کرنا چاہئے خصوصاً اس طرح کے مقامات جہاں نفس وشیطان کی مکاریاں بہت کارگر ہوا کرتی ہیں۔

روایت میں ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے حواریین کے ساتھ ایک مردہ کتے کے پاس سے گزرے تو حواریوں نے کہا: "اس مردار میں کس قدر بدبو ہے؟ حضرت عیسیٰ نے فرمایا اس کے دانت کتنے سفید ہیں" ۳۲۱ یقیناً نوع بشر کے مربی کو ایسے ہی تزکیہ شدہ نفس کا مالک ہونا چاہئے۔ حضرت عیسیٰ کو یہ بات اچھی نہ لگی کہ مخلوق خدا کا ذکر برائی سے کیا جائے ساتھیوں نے اس کے نقص کو دیکھا مگر حضرت عیسیٰ نے اس کے کمال کا ذکر کیا۔ میں نے سنا ہے کہ حدیث میں ہے، حضرت عیسیٰ نے فرمایا "غلاظتوں پر بیٹھنے والی مکھیوں کی طرح نہ بنو کہ (ہمیشہ) لوگوں کے عیوب کی طرف متوجہ رہو"

حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا

﴿طوبی لمن شغله عیبُهُ عن عُیوب الناس﴾ ۳۲۲ "اس شخص کا کیا کہنا جس کے عیوب اس کو

دوسروں کے عیوب سے باز رکھیں"۔ انسان کیلئے بہتر ہے کہ جس طرح وہ دوسروں کے عیوب تلاش کرتا ہے ویسا ہی اپنے عیوب بھی تلاش کرے۔ یہ کتنی بری بات ہے کہ انسان اپنے ہزاروں عیب کو چھوڑ کر دوسروں کی برائیاں تلاش کرے اور ان کو اپنی خامیوں سے بڑھا کر پیش کرے۔ اگر انسان اپنے حالات اور اخلاق واعمال کو دیکھے اور ان کی اصلاح کی فکر کرے تو اس کے امور کی اصلاح ہو جائے گی اور اگر اپنے کو عیب سے خالی سمجھتا ہے تو یہ اس کی انتہائے جہالت و نادانی ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی عیب نہیں ہے کہ آدمی اپنا عیب نہ سمجھے اور اس سے غافل ہو، حالانکہ وہ خود خامیوں کا پتلا ہے اور پھر دوسروں کے عیوب تلاش کرتا ہے!

چھٹی فصل: غیبت سننا حرام ہے

جیسے غیبت کرنا حرام ہے اسی طرح غیبت کا سننا بھی حرام ہے، بلکہ بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ غیبت سننے والا تمام عیوب میں حتی کہ اس گناہ پر معافی مانگنے اور اس کے کبیرہ ہونے میں بھی غیبت کرنے والے کی طرح ہے۔ مثلاً حدیث نبوی ہے ﴿الْمُسْتَمِعُ أَحَدُ الْمُغْتَابِيْن﴾ ۳۴ "دو غیبت کرنے والوں میں سے ایک غیبت سننے والا بھی ہے"۔ اور حضرت علیؑ سے منقول ہے ﴿السَّامِعُ أَحَدُ الْمُغْتَابِيْن﴾ ۳۵ "دو غیبت کرنے والوں میں سے ایک غیبت سننے والا ہے"۔

بہت سی روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ غیبت کی تردید واجب ہے

عن الصدوق باسناده عن الصادق علیہ السلام في حديث مناهي النبي صلی اللہ علیہ وآلہ: ﴿أنّ رسولَ الله صلی اللہ علیہ وآلہ نهى عن الغيبة والاستماع إليها... إلى أن قال: ألا ومن تطوّل على أخيه في غيبة سمعها فيه في مجلس فردّها عنه ردّ الله عنه ألف باب من الشرّ في الدنيا والآخرة، فإن هو لم يردّها وهو قادر على ردّها كان عليه كوزر من اغتابه سبعين مرّة﴾ ۳۶ حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ "رسول خداؐ نے غیبت کرنے اور سننے سے ممانعت فرمائی ہے۔ اس کے بعد فرمایا آگاہ ہو جاؤ جو شخص اپنے برادر (مؤمن) پر احسان کرے اور کسی بھی مجلس میں سنی ہوئی اس کی غیبت کی تردید کرے تو خداوند عالم شرِ دنیا و آخرت کے ہزار باب اس سے دور کرتا ہے اور اگر تردید پر قدرت رکھنے کے باوجود اس کی تردید نہ کرے تو اس پر غیبت کرنے والے کا ستر گنا عذاب ہوگا"۔

وعنه، عن جعفر بن محمد، عليهم السلام، عن آبائه في وصية النبي لعلي عليهم السلام: ﴿يا علي! من اغتيب عنده أخوه المسلم فاستطاع نصره فلم ينصره خذله الله في الدنيا والآخرة﴾ ۳۷ ''رسول خدا نے حضرت علی سے اپنی وصیتوں کے ضمن میں فرمایا اے علی! جس کے سامنے کسی برادر مسلم کی غیبت کی جائے اور وہ (تردید کے ذریعے) اس کی مدد کرنے پر قادر ہونے کے باوجود اس کی مدد نہ کرے، خدا اس کو دنیا وآخرت میں ذلیل کرے گا''۔

وعن عقاب الأعمال بسنده عن النبي صلى الله عليه وآله: ﴿من رد عن أخيه غيبة سمعها في مجلس رد الله عنه ألف باب من الشر في الدنيا والآخرة، فإن لم يرد عنه وأعجبه كان عليه كوزر من اغتاب﴾ ۳۸ پیغمبر اکرم سے روایت کی گئی ہے ''جو اپنے برادر (مومن) سے کسی مجلس میں اس کے بارے میں سنی ہوئی غیبت کی تردید کرے خدا اس سے شر دنیا وآخرت کے ہزار باب رد کرے گا اور اگر اس نے تردید نہ کی، بلکہ اس کو پسند کیا تو اس پر غیبت کرنے والے کا عذاب ہوگا''۔

علمائے متاخرین کے علامہ، محقق جلیل، فضیلت اور علم وعمل کے جامع، شیخ انصاری فرماتے ہیں

''بظاہر اس تردید سے مراد غیبت سے منع کرنے کے علاوہ ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ غائب کی اس چیز سے مدد کی جائے جو غیبت کے مناسب ہو۔ (مثلاً) اگر عیب دنیوی ہو تو اس کی اس طرح مدد کرے کہ عیب تو (درحقیقت) وہ ہے جس کو خدا عیب کہے، مثلاً وہ گناہ جو بہت عظیم ہو، جیسے تمہاری برادر (مومن) کی ایسی چیز سے غیبت جس سے خدا نے اس کی برائی نہیں کی ہے اور اگر عیب دینی ہو تو ایسی توجیہ کرے جس سے وہ معصیت سے خارج ہو جائے اور اگر قابل توجیہ نہ ہو تو اس کی اس طرح مدد کرے کہ کبھی مومن بھی معصیت میں مبتلا ہو جاتا ہے ایسی صورت میں اس کیلئے استغفار کرنا چاہئے اس پر طنز نہیں کرنا چاہئے۔ ہو سکتا ہے خدا کے نزدیک تمہارا طنز کرنا اس کی معصیت سے زیادہ برا ہو'' ۳۹ انتہی کلامہ رفع مقامہ۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ غیبت سننے والا غیبت کی تردید کو ترک کر کے، جو اس پر واجب ہے، غیبت کرنے والے کو مزید غیبت پر ابھار دے یا اس کے ساتھ شریک وہم آواز ہو کر بے موقع اور پے در پے اظہار تعجب کرے یا اگر نیک بندوں میں شمار ہوتا ہے تو کسی ذکر یا استغفار یا کسی دوسرے ذریعے سے جو شیطانی وسائل میں سے کسی وسیلے کو استعمال کر کے غیبت کرنے والے کو غیبت پر آمادہ کر دے اور ہو سکتا ہے کہ حدیث شریف میں جن کے گناہ کو غیبت کرنے والے کے گناہ کے مترادف قرار دیا ہے ایسے ہی

شخاص کی طرف اشارہ ہو۔ نعوذ باللہ منہ۔

تتمیم

کلام شہید ثانیؒ

شیخ بزرگوار و محقق عالی مقدار، شہید سعید (رضوان اللہ علیہ) کا ایک کلام ہے اسی کے ترجمہ پر ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں، شہید فرماتے ہیں:

"غیبت کے بیہودہ ترین قسموں میں وہ غیبت ہے جس میں بعض اہل علم وفہم جو اہل ریا ہیں مبتلا ہیں، کیونکہ یہ حضرات اپنے مقصد کو اہل صلاح وتقویٰ کی صورت میں سمجھاتے ہیں۔ یہ غیبت کرتے ہیں مگر ظاہر کرتے ہیں کہ ہم غیبت سے پرہیز کرتے ہیں اور اپنی جہالت و نادانی کی وجہ سے یہ نہیں سمجھتے کہ انہوں نے دو برائیوں کو جمع کر دیا ہے، ایک ریا، دوسری غیبت اور اس کی ایک مثال یہ ہے کہ اگر کسی کے سامنے کسی کا ذکر کیا جائے تو وہ کہے: الحمدللہ ہم حب جاہ و منصب میں مبتلا نہیں ہیں، یا مثلاً ہم حب دنیا میں گرفتار نہیں ہیں، یا ہمارے، اندر فلاں صفت نہیں ہے یا کہے نعوذ باللہ بے شرمی سے خدا کی پناہ یا بے توفیقی سے خدا کی پناہ یا مثلاً یہ کہے خدا مجھے فلاں عمل سے محفوظ رکھے۔ بلکہ کبھی تو محض حمد خدا بھی غیبت ہوتی ہے، بشرطیکہ اس سے کسی کا عیب سمجھ میں آ رہا ہو۔ بس فرق اتنا ہے کہ یہ غیبت نیک لوگوں کی صورت میں واقع ہوئی ہے۔ یہ شخص یہ چاہتا ہے کہ اپنے کلام سے دوسرے کی برائی اس طرح کرے جو غیبت اور حب جاہ پر مشتمل ہو اور اپنے عیب سے خلاصی و اس سے برائت کا دعویٰ بھی ہو، حالانکہ خود اس میں مبتلا ہے، بلکہ اس سے بڑی برائی میں مبتلا ہے۔

غیبت کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جو شخص کسی کی غیبت کرنا چاہتا ہے پہلے وہ اس کی مدح کرتا ہے، مثلاً کہتا ہے فلاں کتنے اچھے حالات رکھتا ہے، عبادت میں کوئی کمی نہیں کرتا، مگر بے صبری کی وجہ سے عبادتوں میں سستی آ گئی ہے اور (وہی کیا) ہم سب لوگ اس میں مبتلا ہیں۔ (بظاہر) اپنی مذمت کرتا ہے مگر مقصد اس (دوسرے) کی مذمت کرنا ہے وہ اپنی مدح کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح کہ اپنی مذمت کر کے نیک لوگوں سے اپنی تشبیہ دینا چاہتا ہے۔ اس شخص نے تین برائیوں کو اکٹھا کر دیا: غیبت، ریاکاری، تزکیہ نفس۔ اس کو خیال ہے کہ وہ صالحین میں سے ہے اور غیبت سے بچتا ہے۔ جاہل و ناداں لوگوں کے ساتھ شیطان اسی طرح کھیل کھیلتا ہے جبکہ وہ لوگ علم وعمل میں مشغول ہوں مگر مضبوطی کے ساتھ سرگرم نہ ہوں تو شیطان ان کا پیچھا کرتا

ہے اور اپنی مکاریوں سے ان کے اعمال کو ضائع کرا کے قہقہہ لگاتا ہے۔

اس طرح ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ اگر کسی نشست میں غیبت ہو اور کچھ لوگ اس کی طرف متوجہ نہ ہوں تو ان میں سے کوئی غافلوں کو (ذکر خدا کر کے) اس غیبت کی طرف متوجہ کر دیتا ہے، مثلاً وہ کہتا ہے سبحان اللہ! یہ کتنی عجیب چیز ہے۔ اب اس شخص نے ذکر خدا کو باطل اور اپنی خباثت کا ذریعہ بنالیا اور اس کے باوجود خدا پر اس ذکر کا احسان جتانا چاہتا ہے! یہ سوائے جہالت اور غرور کے کچھ نہیں ہے۔

اسی طرح بھی یہ ہے کہ کوئی کہے فلاں شخص کے ساتھ فلاں واقعہ ہو یا وہ فلاں چیز میں مبتلا ہو گیا۔ بلکہ کبھی (اس طرح) کہتا ہے۔ میرے ساتھی یا میرے دوست کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا۔ خدا مجھے اور اس کو بخش دے۔ یہ شخص (بظاہر تو) اظہار دعا اور رنج و غم اور دوستی و رفاقت کر رہا ہے (لیکن در پردہ) ان امور کے ذریعے عمل غیبت کو انجام دے رہا ہے۔ (حالانکہ) خداوند عالم اس کے خبث باطن اور سوء نیت سے مطلع ہے اور وہ اپنی جہالت سے نہیں سمجھتا کہ خدا کا غضب ان جاہلوں سے جو علی الاعلان غیبت کا ارتکاب کرتے ہیں، کہیں زیادہ اس پر ہے۔

غیبت کی ایک مخفی قسم تعجب کے ساتھ غیبت کو سننا بھی ہے۔ کیونکہ (جب) کوئی شخص اظہار تعجب کرتا ہے تو غیبت کرنے والا اور دلچسپی سے غیبت کرنے لگتا اور اس کا تعجب اس کو مزید غیبت پر آمادہ کرتا ہے، مثلاً وہ کہتا ہے مجھے تو اس بات پر بہت تعجب ہے! میں تو ابھی تک یہ نہیں سمجھتا تھا، مجھے فلاں سے اس کام کی توقع نہیں تھی۔ وہ اس طرح غیبت کرنے والے کی تصدیق کے ساتھ بڑے اچھے انداز سے مزید غیبت کا مطالبہ کرتا ہے، حالانکہ غیبت کی تصدیق بھی غیبت ہے اور اس کو سننا بھی غیبت ہے، بلکہ سن کر خاموش رہنا بھی غیبت ہے"۔ یہاں شہید اعلی اللہ مقامہ کے ملفوظات ختم ہوئے۔

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ غیبت پر دوسرے عناوین بھی صادق آتے ہیں تو اس کی قباحت اور اس کی برائی اور عقاب میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً غیبت کرنے والا جس کی غیبت کر رہا ہے، اس کے سامنے اظہار دوستی اور اس کی تعریف و تمجید بھی کرے۔ اور یہ نفاق و دو زبانی اور دو روئی ہے جس کی روایت میں بہت ہی مذمت آئی ہے۔

فِي الكافي بإسْنادِهِ عَنْ أَبِي عَبْدِاللهِ عليه السلام قَالَ

﴿مَنْ لَقِيَ الْمُسْلِمِيْنَ بِوَجْهَيْنِ وَلِسَانَيْنِ جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَهُ لِسَانَانِ مِنْ نَارٍ﴾ (۱)

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا "جو مسلمانوں سے دو چہروں اور دو زبانوں کے ساتھ ملاقات کرے وہ روز قیامت اس طرح آئے گا کہ اس کیلئے آتش کی دو زبانیں ہوں گے"۔ اس قبیح عمل کی یہ صورت ہے اور آخرت میں نفاق کا یہ نتیجہ ہے۔ میں اپنی زبان اور نفس امارہ کے شر سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔

والحمدللہ اولا وآخرا

توضیحات (۱۹)

۱۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۵۶، کتاب ایمان وکفر، باب الغیبة والبہتان، حدیث ۱۔

۲۔ اصل کتاب میں ترجمہ کر دیا گیا ہے۔

۳۔ مرآة العقول، ج ۱۰، ص ۴۰۶، کتاب ایمان وکفر، باب الغیبة والبہتان، حدیث

۴۔ مصباح السیر، ج ۲، ص ۳۵۸، پر یہ عبارت بھی پائی جاتی ہے جس کے … ۴

۵۔ مرآة العقول، ج ۱۰، ص ۴۰۶، کتاب ایمان وکفر، باب غیبت، حدیث ۱

۶۔ کشف الریبہ، ص ۳ (فی تعریف الغیبة والترهیب منها)۔

۷۔ وسائل الشیعہ، ج ۸، ص ۵۹۸، ابواب احکام العشرة، باب ۱۵۲، حدیث ۹

۸۔ المحجة البیضاء، ج ۵، ص ۲۵۶، کتاب آفات اللسان۔

۹۔ وسائل الشیعہ، ج ۸، ص ۵۹۸، ابواب احکام العشرة، باب ۱۵۲، حدیث ۹

۱۰۔ جامع السعادات، ج ۲، ص ۲۹۳، المقام … فی الغیبة

۱۱۔ سورۂ حجرات، آیت ۱۲۔

۱۲۔ المحجة البیضاء، ج ۵، ص ۲۵۳، کتاب آفات اللسان۔

۱۳۔ وسائل الشیعہ، ج ۸، ص ۶۰۰، ابواب احکام العشرة، باب ۱۵۲، حدیث ۱۹

۱۴۔ عقاب الاعمال، ص ۳۳۰، میں ہے: من مشی فی عیب اخیه

۱۵۔ وسائل الشیعہ، ج ۸، ص ۵۹۹، حدیث، ابواب احکام العشرة، باب ۱۵۲، حدیث ۱۳

۱۶۔ المحجة البیضاء، ج ۵، ص ۲۵…، کتاب آفات اللسان۔

۱۷۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۵۳، کتاب ایمان وکفر، باب من طلب عثرات المؤمنین، حدیث ۲

۱۸۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۵۲، کتاب ایمان وکفر، باب من اذی المسلمین، حدیث ۸۔

۱۹۔ بحار الانوار، ج ۷۲، ص ۲۲۸، کتاب العشرة، باب الغیبة، حدیث ۱۲۔

۲۰۔ وسائل الشیعہ، ج ۸، ص ۵۹۸، ابواب العشرة، باب ۱۵۲، حدیث ۹۔

۲۱۔ علل الشرائع، ج ۲، ص ۵۵۷، باب ۳۴۵، العلة التی من اجلها صارت الغیبة اشد من الزنا؛ خصال، ص ۶۳، باب الثلاثة، حدیث ۹۰؛ مجمع البیان، ج ۹، ص ۲۰۶؛ مصادقة الاخوان، ص ۳۸، باب …

فی الاخوان، حدیث ۱۔

۲۲۔ المحجۃ البیضاء، ج ۵، ص ۲۵۳۔

۲۳۔ المحجۃ البیضاء، ج ۵، ص ۲۶۴، کتاب آفات اللسان۔

۲۴۔ بحار الانوار، ج ۷۲، ص ۲۵۹، باب الغیبۃ، حدیث ۵۳۔ بحار میں ذرا اختلاف عبارت کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔

۲۵۔ بحار الانوار، ج ۷۵، ص ۲۷۶، کتاب الروضۃ، باب ۲۳، حدیث ۱۱۲۔

۲۶۔ سورۂ حجرات، آیت ۱۰۔

۲۷۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۱۷۵، کتاب ایمان وکفر، باب التراحم والتعاطف، حدیث ۔

۲۸۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۱۷۵، کتاب ایمان وکفر، باب التراحم والتعاطف، حدیث ۴۔

۲۹۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۱۷۵، کتاب ایمان وکفر، باب التراحم والتعاطف، حدیث ۲

۳۰۔ حدیث ۱۵، فصل ۳

۳۱۔ اس شخص کی حاجت پوری ہونے کے لئے جس کی شفاعت کرے ویسے ہی اس کے دشمن ہوں۔

۳۲۔ بحار الانوار، ج ۱۳، ص ۳۴۷، کتاب النبوۃ، باب ۲۱، حدیث ۴۷۔

۳۳۔ اس کا ترجمہ گزر چکا ہے

۳۴۔ المحجۃ البیضاء، ج ۵، ص ۲۹۰، کتاب آفات اللسان۔

۳۵۔ بحار الانوار، ج ۷۲، ص ۲۲۴، کتاب العشرۃ، باب ۶۶، حدیث ۱

۳۶۔ وسائل الشیعہ، ج ۸، ص ۶۰۰، ابواب احکام العشرۃ، باب ۱۵۲، حدیث ۱۳۔

۳۷۔ وسائل الشیعہ، ج ۸، ابواب احکام العشرۃ، باب ۱۵۶، حدیث ۱۔

۳۸۔ وسائل الشیعہ، ج ۸، ص ۶۰۷، ابواب احکام العشرۃ، باب ۱۵۶، حدیث ۵۔

۳۹۔ کتاب مکاسب، ص ۳۶ و ۳۷، مکاسب محرمہ، شمارہ ۴

۴۰۔ کشف الریبۃ فی احکام الغیبۃ، ص ۸، ۹، رسالہ غیبت

۴۱۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۴۳، کتاب ایمان وکفر، باب ذی اللسانین، حدیث

بیسویں حدیث

بالسند المتصل الی الشیخ الثقۃ الجلیل، محمد بن یعقوب الکلینی قدس سرّہ، عن علیّ بن ابراھیم، عن ابیہ، عن القاسم بن محمد عن المنقری، عن سفیان بن عیینہ عن ابی عبداللہ علیہ السلام فی قول اللہ تعالیٰ ﴿لیبلوکم ایّکم احسن عملاً﴾

﴿قال لیس یعنی اکثرکم عملاً ولکن اصوبکم عملاً وانّما الاصابۃ خشیۃ اللہ والنیّۃ الصادقۃ والحسنۃ [الخشیۃ] ثمّ قال الابقاء علی العمل حتّی یخلص أشدّ من العمل، والعمل الخالص الّذی لا ترید ان یحمدک علیہ أحد الّا اللہ تعالیٰ، والنیّۃ أفضل من العمل، ألا وانّ النیّۃ ھی العمل ثمّ تلا قولہ عزّوجلّ ﴿قل کلٌّ یعمل علی شاکلتہ﴾ یعنی علی نیّتہ﴾۔

ترجمہ: خداوند عالم کے اس قول ﴿لیبلوکم ایّکم احسن عملاً﴾ "تاکہ آپ کا امتحان کرے کہ آپ میں سے کون عمل کے لحاظ سے بہتر ہے" کی تفسیر میں سفیانؒ نے حضرت امام جعفر صادقؑ کا قول نقل کیا ہے کہ خدا کا مقصد کثرت عمل نہیں ہے، بلکہ اس کی مراد صحیح عمل ہے اور یہ درستگی خوف خدا اور اس کے ساتھ سچی نیت سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کے بعد فرمایا برابر عمل کرتے رہنا یہاں تک کہ خلوص حاصل ہو جائے یہ عمل سے زیادہ مشکل ہے اور خلوص عمل کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے علاوہ کوئی دوسرا اس عمل پر تمہاری تعریف نہ کرے۔ (سنو!) نیت عمل سے افضل ہوا کرتی ہے۔ آگاہ ہو جاؤ (درحقیقت) نیت ہی عمل ہے۔ اس کے بعد امامؑ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی ﴿قل کلٌّ یعمل علی شاکلتہ﴾ "تم کہہ دو ہر شخص اپنے

(اپنے) طریقہ پر عمل کرتا ہے" یعنی اپنی نیت کے مطابق عمل کرتا ہے۔

شرح "بلاء" کے معنی امتحان اور تجربے کے ہیں، جیسے کہ صحاح میں آیا ہے: "بلوتہ بلوی" یعنی "خبرتہ واختبرتہ" "میں نے اس کا تجربہ کیا اور اس کی آزمائش کی ہے"۔ "وبلاہ اللہ بلاء وابلاہ ابلاء حسنا وبتلاہ ای اختبرہ"۔

علامہ مجلسیؒ نے فرمایا ہے کہ "ایکم، لیبلوکم" کا دوسرا مفعول ہے اور "لیبلوکم" علم کے معنی پر متضمن ہے، مگر یہ درست نہیں ہے، کیونکہ "ای" استفہامیہ فعل کو عمل کرنے سے معلق کر دیتا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ "ایکم احسن عملا" مبتدا وخبر سے مل کر بنا ہوا جملہ ہے اور فعل "بلوی" کے مفعول کے معنی میں آیا ہے۔ البتہ اگر "ای" کو موصولہ مان لیا جائے تو علامہ مجلسیؒ کا کلام درست ہے۔ مگر "ای" کا استفہامیہ ہونا اظہر ہے۔

"صواب" خطا کا نقیض ہے، جیسا کہ جوہری نے کہا ہے۔

"حشیہ" حدیث میں جو دوسری مرتبہ لفظ "خشیہ" آیا ہے، جیسا کہ بعض نسخوں میں ہے، اس کے بارے میں علامہ مجلسیؒ نے فرمایا ہے کہ اس کا وجود نہیں ہے۔۵ اور اگر ہو تو اس میں کئی امکانات ہیں، اظہر یہ ہے کہ "و" بمعنی "مع" ہو۔

شہید ثانیؒ کی "اسرار الصلاۃ" میں ﴿النِّیَّۃُ الصَّادِقَۃُ الحَسَنَۃُ﴾ منقول ہے۔۶

"لابقاء علی العمل" "عمل پر بقا کا مطلب اس کی رعایت و محافظت ہے، جیسے کہ جوہری نے کہا ہے جب تم کسی کی رعایت کرو یا اس کی محافظت کرو تو اس وقت بولا جاتا ہے "ابقیت علی فلان، اذا ارعیت علیہ ورحمتہ"۔

"شاکلہ" کے معنی طریقہ، شکل اور طرف کے ہیں، جیسا کہ صحاح اور قاموس میں ہے۔ قاموس میں ہے "الشاکلۃ، شکل، ناحیہ، نیت اور طریقے کو کہتے ہیں"۔

حدیث شریف میں جن چیزوں کی شرح ضروری ہوگی ان کو ہم چند فصلوں کے ضمن میں بیان کریں گے

انشاء اللہ

پہلی فصل

﴿لیبلوکم﴾ خداوند عالم کے اس ارشاد کی طرف اشارہ ہے ﴿تبارک الذي بیده الملک وهو علی کلّ شيء قدیر ☆ الّذي خلق الموت والحیوة لیبلوکم ایّکم احسن عملاً﴾ ہے "جس (خدا) کے قبضے میں (سارے جہان کی) بادشاہت ہے وہ بڑی برکت والا ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تم کو آزمائے کہ تم میں عمل میں سب سے اچھا کون ہے"۔

محقق مجلسی فرماتے ہیں اس آیت کی دلالت اس بات پر ہے کہ موت امر وجودی ہے اور اس موت سے مراد یا تو وہ موت ہے جو زندگی پر طاری ہوتی ہے اور یا پھر عدم اصلی مراد ہے۔ انتہی۔

آیہ شریفہ کا اس مطلب پر دلالت کرنا اس بات پر موقوف ہے کہ بالذات خلق کا تعلق موت سے ہو، لیکن اگر بالعرض متعلق ہے تو پھر دلالت نہیں ہوگی، جیسا کہ محققین کہتے ہیں، اور اگر دلالت کو تسلیم بھی کرلیا جائے تو موت کے عدم اصلی ہونے کا امکان بالکل ہی بے وجہ ہے، کیونکہ وجودی ہونا اور عدم اصلی ہونا دونوں جمع بین النقیضین ہے، حالانکہ موت کو ذاتا عدم اصلی جاننا صحیح نہیں ہے

خلاصہ تحقیق یہ ہے کہ موت یا تو نشۂ ظاہرہ ملکیہ سے نشۂ باطنیہ ملکوتیہ کی طرف انتقال کا نام ہے یا پھر حیات اولی ملکی کے بعد حیات ثانوی ملکوتی کا نام موت ہے اور ان دونوں صورتوں میں موت امر وجودی ہے، بلکہ وجود ملکی سے اتم ہے، کیونکہ حیات ملکی دنیوی مردہ طبیعی مواد سے مخلوط و ممزوج ہے اور ان مواد کی زندگی عرض زائل ہے۔ برخلاف حیات ذاتی ملکوتی کے، وہاں پر نفوس کو استقلال حاصل ہو جائے گا، اور وہی دار حیات اور لوازم حیات ہے اور برزخ کے مثالی اجسام کا قیام ان کے ساتھ بطور قیام صدوری بالنفوس ہے، جیسا کہ اس بات کو اس کے مناسب مقام پر تحریر کیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حیات ملکوتی ہی کو موت کہتے ہیں تاکہ سننے والوں کو باور محسوس ہو۔ جعل و خلقت سے متعلق ہوتی ہے اور یہ ذات خدا کے تحت قدرت ہے۔

خدا کی طرف ابتلا کو منسوب کرنے کی توجیہ

ابتلا اور امتحان کا مطلب اور خداوند عالم کی طرف اس کی نسبت کی کیفیت اس طرح ہے کہ ذات

مقدس پر جہالت لازم نہ آئے اور تاویلات وتکلفات کا محتاج بھی نہ ہو۔ اس کا ذکر (اگرچہ) ہم بعض احادیث کی شرح کرتے ہوئے ذکر کر چکے ہیں۹ (پھر بھی) بطور اجمال اس کی اشارتاً ذکر کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ابتدائے فطرت وخلقت میں انسانی نفوس سوائے استعداد محض اور نفس قابلیت کے کچھ نہیں ہوتے اور وہ ہر قسم کی شقاوت وسعادت کی فعلیت سے محروم ہوتے ہیں اور پھر جب وہ طبیعی جوہری اور فعلی آزمائشی حرکات کے زیر تصرف واقع ہوتے ہیں تب ان کی استعداد فعلیت میں بدل جاتی ہے اور تمیزات حاصل ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد حیات ملکی (دنیوی) میں شقی وسعید اور کھوٹے کھرے کے درمیان امتیاز پیدا ہوتا ہے اور تخلیق حیات کا مقصد بھی نفوس میں امتیاز اور ان کا امتحان ہوتا ہے۔ اسی سے پتہ چل گیا کہ خلق ہی کے اوپر امتحان کا دارومدار ہے۔ اب رہا تخلیق موت کا مسئلہ تو وہ بھی اس امتیاز میں دخیل ہوتا، بلکہ ست کا آخری جزو ہے، کیونکہ فعلیت کا میزان انسان کی وہ آخری صورتیں ہوتی ہیں جن پر نسان منتقل ہوتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ آخرت کی ملکوتی صورتیں امتیازات کا میزان ہوا کرتی ہیں اور یہ دنیوی ملکی جوہری اور اختیاری حرکات سے حاصل ہوتی ہیں. اس طرح یہ بات معلوم ہوگئی کہ موت وحیات کی تخلیق ہی پر بغیر کسی جہالت کے امتحان وآزمائش ہوا کرتے ہیں۔

البتہ اعتراض کا پوری طرح برطرف ہو جانا یہ بات ''علم ذاتی قبل الایجاد'' اور ''علم فعلی مع الایجاد'' کی تفصیل سے مربوط ہے جو اس کتاب کے مقصد سے خارج ہے اور یہ جو ﴿أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾ فرما کر امتحان کو اچھے عمل سے مربوط کیا ہے اس کی بھی بازگشت اسی معنی کی طرف ہے جس کا ذکر کیا گیا، کیونکہ حدیث شریف میں احسنیت (نیکی) کی اصوبیت (بہتری) سے تشریح کی گئی ہے اور اصوبیت کو خشیت (خوف خدا) اور سچی نیت کے تابع جانا گیا ہے اور یہ سب نفس کی باطنی صورتیں اور روح کے واقعی امتیازات میں شامل ہیں یا پھر یہ ذاتی اور غیبی امتیازات کے جلوے ہیں، بلکہ اس حقیقت کے پیش نظر کہ قلب اور باطن ظاہری اعمال سے متاثر ہوتے ہیں، جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۱۰ یہ امتیازات بھی اعمال کے واسطہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ لہٰذا اعمال کا امتحان ذاتیت کا بھی امتحان ہے۔

اور اگر ہم امام علیہ السلام کی تفسیر سے قطع نظر کرتے ہوئے آیہ شریفہ کو اس کے ظاہر پر حمل کریں تب بھی امتحان کی مذکورہ معنی کے مطابق ہوگا، کیونکہ عرصہ دنیا میں بذات خود حصول اور موت وحیات کی تخلیق ہی اعمال حسنہ وقبیحہ کے امتیاز کا موجب ہے۔ خلقت حیات والی بات تو معلوم ہے۔ اب رہا مسئلہ موت کا تو

زندگانی دنیا کے عدم ثبات کے علم کے ذریعے اور اس عرصہ فانیہ سے انتقال کی وجہ سے انسانی اعمال میں فرق پیدا ہوتا ہے اور یہاں امتیازات کے حصول کا سبب بنتے ہیں۔

دوسری فصل: خشیت و نیت صادقہ صحت عمل کے باعث ہیں

یہ سمجھ لیجئے کہ اس حدیث شریف میں اچھے اور نیک عمل کو دو مقدس بنیادوں پر مبنی قرار دیا گیا ہے اور عمل کے کامل اور مکمل ہونے کو انہیں دونوں پر موقوف کیا گیا ہے۔

پہلی بات، خدا سے خوف وخشیت ہے اور دوسری، سچی نیت اور خالص ارادہ۔ اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ان دونوں بنیادی اصولوں کے کمال عمل اور اس کی صحت و درستی سے تعلق کو بیان کریں۔

لہذا، ہم عرض کرتے ہیں خداوند عالم سے خوف و ڈر نفوس کے اندر تقوی و پرہیزگاری پیدا کرنے کا سبب ہے اور یہ باعث ہوتا ہے کہ آثار عمل کو زیادہ (سے زیادہ) قبول کیا جائے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس سے پہلے بعض احادیث کی شرح میں ہم نے ذکر کیا ہے[1] کہ ہر عمل چاہے وہ اچھا ہو یا برا، نفس کے اندر ایک اثر پیدا کرتا ہے۔ اب اگر وہ عمل عبادات و مناسک میں سے ہے تو اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ فطری قوتوں کو عقلی طاقتوں کے تابع بنا دیتا، نفس کے ملکوتی پہلو کو ملک پر قاہر و قادر بنا دیتا اور طبیعت کو روحانیت کے تابع کر دیتا ہے یہاں تک کہ پھر وہ اس منزل تک پہنچ جاتا ہے کہ روحانی جذبات اس کے قابو میں ہو جاتے ہیں، اور وہ اپنے اصل مقصد تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ اب جس عمل کے اندر یہ اثر زیادہ ہوتا ہے وہ اس خدمت کو بہتر طریقے سے انجام دیتا اور صحیح تر ہوتا ہے اور اصل مقصد بہتر طریقے سے اس سے حاصل ہوتا ہے اور جو بھی چیز اس تاثیر میں داخل ہوگی وہ صحت عمل کی ضامن ہوگی اور غالباً، فضیلت اعمال کیلئے یہی چیز میزان ہے اور حدیث معروف ﴿افضل الاعمال احمزها﴾[2] "سب سے دشوار عمل سب سے افضل ہے" کو بھی اسی نکتہ پر منطبق کیا جا سکتا ہے۔

اس تمہید کے بعد یہ جان لینا چاہئے کہ تقوی نفوس کو کدورتوں اور آلائشوں سے صاف و پاک کر دیتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جب صفحہ نفوس گناہوں اور کدورتوں کے حجاب سے صاف ہوگا تو اعمال حسنہ کا اس میں زیادہ اثر ہوگا اور مقصد کا حصول بھی بہتر طریقے سے ہوگا اور عبادتوں کے عظیم راز کا جو طبیعت کی ریاضت اور ملک پر قبضہ ملکوت اور نفس کے ارادہ قاہرہ کے اثر سے حاصل ہوتا ہے، نفوذ بہت اچھی طرح سے انجام

پائے گا۔اس لئے خوف خدا کو جو نفوس کے تقویٰ میں کامل مؤثر ہے، اصلاح نفوس کا ایک عظیم عامل اور صحت عمال اور ان کے حسن وکمال میں دخیل سمجھنا چاہئے اس لئے کہ تقویٰ علاوہ اس کے کہ خود مصلح نفس ہے، انسان کے قلبی اور قالبی (جسمانی) عمال میں مؤثر اور عمال کی قبولیت کا سبب بھی ہے، جیسے کہ خود خدا نے فرمایا ہے ﴿إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ﴾[۱۳] "خدا صرف متقین (کے اعمال) کو قبول کرتا ہے"۔

درستگی ور کمال اعمال میں دوسری اہم چیز جو درحقیقت بمنزلہ قوت فاعلہ کے ہے، وہ بھی نیت اور خالص ارادہ ہے (اس لئے کہ) عبادتوں کا کمال یا نقص فساد یا صحت بھی کے تابع ہے۔ (دیکھئے خوف وخشیت خدا ور س سے حاصل ہونے والا تقویٰ بمنزلہ شرائط تاثیر ہے اور درحقیقت یہ عمل کو صاف وخالص بناتے ہیں اور رکاوٹوں کو دور کرتے ہیں) چنانچہ عبادتیں جتنی شرک اور نیتوں کی ملاوٹ سے خالص ہوں گی تتی ہی کامل ہوں گی۔عبادتوں کے اندر نیت اور خلوص نیت سے زیدہ کوئی چیز اہم نہیں ہے، کیونکہ نیتوں کی نسبت عبادتوں سے وہی ہے جو روح کو بدن سے اور نفس کو جسم سے ہوا کرتی ہے۔اسی لئے ان کا پیکر مقام ملک نفس وبدن سے صادر ہوتا ہے اور ن کی نیت وروح باطن کے پہلو ور مقام قلب سے صادر ہوتی ہے۔کوئی بھی عبادت جس میں خلوص نیت نہ ہو وہ مقبول خدا نہیں ہوتی اور جب تک ریا اور شرک ظاہری ملکی سے خالص نہ ہوگی، ریا سے مراد وہی ہے جس کو فقہا (رضوان اللہ علیہم) نے ذکر کیا ہے تو موجب بطلان ورظاہراً ناقابل جزا ہے، نیز جب تک شرک باطنی سے خالص نہ ہوگی چاہے ظاہری شرع اور حکم فقہی کے لحاظ سے صحیح ومجزی ہو تو باطن شرع کے اعتبار سے اور عبادتوں کی حقیقت واسرار کی بنا پر صحیح نہیں ہوگی اور نہ ہی بارگاہ الٰہی میں مقبول ہوگی۔ بہذا صحت عبادت اور اس کی قبولیت میں کوئی تعلق نہیں ہے، چنانچہ روایت میں بھی یہ مطلب مذکور ہے۔[۱۴]

عبادت میں شرک کی ایک ایسی جامع تعریف جو اس کے تمام مراتب کو شامل ہو یہ ہے "غیر خدا کی مرضی کو س میں شامل کرنا" چاہے وہ پنی مرضی ہو یا دوسروں کی ہو۔بس اتنا فرق ہوگا کہ اگر دوسروں کی مرضی شامل ہے تو یہ شرک ظاہری اور فقہی ریا ہے اور اگر اپنی مرضی شامل ہو تو وہ شرک خفی وباطنی ہے اور اہل معرفت کی نظر میں باطل وناچیز ہے اور مقبول درگاہ خدا نہیں ہے۔مثلاً کوئی نماز شب وسعت رزق کیلئے پڑھتا ہو یا صدقہ بلاؤں کے دور کرنے کیلئے دیتا ہو یا زکات مال میں زیادتی کیلئے دیتا ہو، یعنی یہ سارے امور خدا کیلئے کرتا ہو اور س کی عنایتوں سے ان چیزوں کا طلبگار ہو تو یہ عبادتیں اگرچہ صحیح اور قابل جزا ہیں اور ان کے

شرعی اجزاء و شرائط کے ساتھ بجا لانے سے اس کے آثار بھی اس پر مرتب ہوں گے، لیکن (درحقیقت) یہ خدا کی عبادت نہیں ہے اور نہ اس کے اندر سچی نیت اور خالص ارادہ ہے، بلکہ یہ عبادتیں تو دنیا کو آباد کرنے اور دنیوی نفسانی خواہشات کی تکمیل کیلئے ہیں، لہٰذا اس کا عمل درستگی سے خالی ہے۔ جیسے اگر کوئی جہنم کے خوف یا جنت کی شوق میں عبادت کرے تو یہ بھی خالص خدا کیلئے نہیں ہے اور نہ اس میں نیت صادقانہ ہے، بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ عبادتیں خالص شیطان و نفس کیلئے ہیں اور ایسی عبادت کرنے والے نے کسی بھی عنوان سے رضائے الٰہی کو اس میں داخل نہیں کیا ہے تا کہ ارتکاب شرک کا شائبہ ہو، بلکہ یہ تو سب سے بڑے بت کی پرستش ہے۔ "تمام بتوں کا بت تو خود تمہارا نفس ہے"۔ [15]

خداوند عالم نے اپنی رحمت وسعہ اور ہمارے ضعف کی بنا پر ہر قسم کی عبادتوں کو بھی قبولیت کا ایک مرتبہ بخشا ہے، یعنی ان عبادتوں پر بھی کچھ آثار مرتب کئے ہیں اور ان کے مقابلے میں کچھ عنایتیں قرار دی ہیں کہ اگر انسان ظاہری شرائط اور حضور و اقبال قلب اور ان کی شرائط قبول کے ساتھ بجا لائے تو ان تمام آثار کو اس پر مرتب کرتا ہے اور اپنے تمام وعدوں کو پورا کرتا ہے۔ یہ تو مزدوروں اور غلاموں کی عبادت کا حال ہے۔

لیکن آزاد لوگوں کی عبادت جو صرف خدا کی محبت اور ذات باری کو پانے کیلئے عبادت کرتے ہیں، جس کا محرک نہ خوف جہنم نہ شوق جنت ہوتا ہے، اولیاء و احرار کا مقام ہے اور ان کیلئے جو مقامات و مدارج ہیں ان کو بیان نہیں کیا جاسکتا اور وہ اس کتاب کے موضوع سے بھی خارج ہیں۔ جب تک نفس کو عبادت و عابد و معبود کی طرف توجہ رہے گی وہ عبادت خالص نہیں ہوسکتی۔ دل اغیار سے خالی ہو اور اس میں خدا کے علاوہ کسی اور کو رستہ نہ ملے تب وہ خالص ہوگا، چنانچہ کافی کی حدیث شریف میں آیا ہے

قال سألتُهُ عن قول الله عزّوجلّ ﴿الّا من اتى الله بقلبٍ سليم﴾ قال ﴿القلبُ السّليم الّذي يلقى ربّهُ وليس فيه احدٌ سواه﴾ [ثمّ] قال وكُلُّ قلبٍ فيه شركٌ او شكٌّ فهو ساقطٌ وانّما ارادوا بالزُّهد في الدُّنيا لتفرغ قُلُوبُهُمْ للآخرة﴾ [16] سابق حدیث کے راوی سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے قیامت کے بارے میں جو قول خدا ہے ﴿يوم لا ينفعُ مالٌ ولا بنون] الّا من اتى الله بقلبٍ سليم﴾ [17] "جس دن نہ تو مال ہی کچھ کام آئے گا اور نہ اولاد مگر جو شخص خدا کے سامنے (گناہوں سے) پاک دل لئے حاضر ہوگا (وہی فائدہ میں ہوگا)" اس کے بارے میں

پوچھا۔ حضرت ؑ نے فرمایا قلب سلیم سے مراد یہ ہے کہ جو خدا سے اس حالت میں ملاقات کرے کہ اس میں خدا کے سوا کوئی نہ ہو اور فرمایا جس دل میں شک یا شرک ہو وہ ساقط ہے اور یقیناً اس سے خدا نے دنیا میں زہد مراد لیا ہے تاکہ لوگوں کے دل آخرت کیلئے فارغ ہوں) اور ظاہر ہے جس دل کے اندر غیر خدا ہو اور وہ شرک وشک سے بھرپور ہوگا، چاہے شرک خفی ہو یا جلی، وہ بارگاہ الٰہی میں درجہ اعتبار سے ساقط ہے۔ اسباب پر اعتماد کرنا اور غیر خدا کی طرف مائل ہونا (یہ سب) بھی شرک خفی ہے یہاں تک روایات میں ہے۔ ''کسی مطلب کو یاد رکھنے کیلئے انگشتری کو بدلنا بھی شرک خفی ہے''۔ ۱۸؎ غیر خدا کو دل میں راہ دینا بھی شرک خفی میں شمار ہوتا ہے، درخصوص نیت کا مطلب اس ذات مقدس کی منزل (یعنی دل) سے خدا کے علاوہ سب کو نکال باہر کرنا ہے۔ چنانچہ شک کے بھی مراتب ہیں بعض کو شک جلی اور بعض کو شک خفی جاننا چاہیے جو ضعف یقین وایمان میں نقص سے حاصل ہوتا ہے۔ غیر خدا پر مطلق اعتماد اور مخلوق کی طرف توجہ یہ ضعف یقین اور سستی ایمان کی علامت ہے، جیسے امور میں تزلزل بھی اسی قسم سے ہے اور اخفائے شک کا مرتبہ توحید میں عدم تمکین ورحالت تلوین ہے۔ پس توحید حقیقی کا مطلب کثرتوں، اضافتوں اور تعینات کا اسقاط کرنا ہے۔ حد یہ ہے کہ کثرت اسمائی وصفاتی سے بھی اس کو خالی رکھنا اور اس میں ثبات وقرار ہی شک سے پاک ہونا ہے اور قلب سلیم سے مراد وہ قلب ہے جو مطلق شرک وشک سے خالی ہو۔ اس حدیث شریف میں جو فرمایا گیا ہے۔ ﴿وانّما أراد بالزُّهد﴾ اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا کے اندر زہد کا مطلب یہ ہے کہ رفتہ رفتہ دل اس سے منصرف ومتنفر ہو کر اصل مقصد اور حقیقی مطلوب کی طرف متوجہ ہو جائے۔

صدر حدیث سے پتہ چلتا ہے آخرت سے مقصود دار الوجود کا انتہائی درجہ اور انتہائے رجوع ہے اور مطلق آخرت سے بھی وہی مراد ہے۔ بنا بریں دنیا دائرہ ظہور ہے اور اس میں زہد کا لازمہ غیر خدا سے دل کو خالی کرنا ہے۔ پس جس شخص کے دل میں غیر خدا ہوگا، اور اس کی توجہ غیر خدا کی طرف ہوگی چاہے وہ دنیوی مادی امور میں سے ہو یا امور معنوی میں سے اور چاہے صور اخروی ہوں یا کمالات ومدارج، وہ شخص اہل دنیا میں سے ہے دنیا سے پرہیز کرنے والا زاہد نہیں، وہ آخرت حقیقی اور بہشت لقا جو بہشت کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے، سے محروم ہوگا، چاہے وہ دیگر معنوی کمالات کا حامل ہو اور بہشت کے اعلیٰ درجوں پر فائز ہو۔ (یہ ایسے ہی ہے) جیسے اہل دنیا، دنیاوی امور اور مقامات میں مختلف ہوا کرتے ہیں اور وہ مقامات اہل اللہ سے بہت ہی بعید اور دور ہیں۔

تیسری فصل اخلاص کی تعریف

جان لو کہ یوں تو اخلاص کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں، لیکن اصحاب سلوک و معارف کے یہاں جو متداول ہیں، میں ان میں سے بطور اجمال بعض کا ذکر کرتا ہوں

۱۔ جناب عارف حکیم سالک خواجہ عبداللہ انصاری (قدس سرہ) فرماتے ہیں ﴿الاخلاصُ تصفیۃُ العملِ من کُلِّ شوبٍ﴾۱۹ ''اخلاص عمل کا ہر قسم کی ملاوٹ سے صاف کرنا ہے''۔ اس میں عمومیت ہے خواہ اپنی مرضی کی ملاوٹ شامل کرے یا کسی دوسری مخلوق کی مداخلت۔

۲۔ شیخ اجل بہائی'' سے منقول ہے کہ اصحاب قلوب نے اخلاص کی بہت سی تعریفیں کی ہیں، (مثلاً) ﴿تصفیۃ العمل ان یکون لغیر اللہ فیہ نصیب﴾ ''عمل کو اس بات سے پاک کرنا کہ اس میں غیر خدا کا کوئی حصہ ہو''۔ یہ تعریف پہلی تعریف جیسی ہے۔ ﴿قیل ان لا یرید عاملہ علیہ عوضاً فی الدارین﴾۲۰ ''یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا عامل دنیا و آخرت میں کسی عوض کی خواہش نہ رکھتا ہو''۔

۳۔ صاحب غرائب البیان سے منقول ہے کہ ''مخلص وہ لوگ ہیں جو خدا کی عبادت کرنے میں نہ اپنی عبودیت دیکھیں نہ عالم و اہل عالم کی عبودیت دیکھیں اور حد عبودیت سے مشاہدہ ربوبیت کی طرف تجاوز نہ کریں''۔ پس جس وقت بندے سے اس کی دلچسپیاں فرش سے عرش تک ختم ہو جائیں اس وقت وہ راہ دین کا سالک ہے اور یہ وہ طریق بندگی اور طریق عبودیت ہے جس میں شہود روح جمال پروردگار کے مشاہدے کی وجہ سے حوادث کے دیکھنے سے خالص ہوتا ہے اور یہ وہی دین ہے جس کو خدا نے اپنے لئے اختیار کیا اور غیر حق سے خالص کیا ہے اور ارشاد فرمایا ہے ﴿الا للہ الدِّینُ الخالص﴾ ۲۱ ''آگاہ ہو جاؤ کہ عبادت تو خالص خدا ہی کیلئے ہے''۔ اور دین خالص وہ نور ہے جو نور عظمت و وحدانیت کے بیابان میں حدوث کے فنا ہو جانے کے بعد بھی رہتا ہے، گویا خداوند عالم نے بطور تنبیہ و اشارتاً اپنے بندوں کو اس بات کی دعوت دی ہے کہ وہ اپنے راز کو ان اغیار سے خالص کریں جو اس کی طرف آنا چاہتے ہیں

۴۔ شیخ محقق محی الدین عربی'' ۲۲ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا ﴿الا للہ الدِّینُ الخالصُ عن شوبِ الغیریۃِ والانانیۃِ، لِانّکَ لفنائک فیہِ بالکُلّیۃ، فلا ذات لک ولا صفۃ ولا فعل ولا دِینَ، والّا لما خلص الدِّینُ بالحقیقۃ، فلا یکونُ للہ﴾ ۲۳ ''خدا ہی کیلئے وہ دین خالص ہے جس میں

غیریت وانانیت کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ تم اس میں بالکلیہ فنا ہو چکے ہو۔ نہ اس میں تمہاری کوئی ذات ہے نہ صفت ہے، نہ فعل ہے نہ دین ہے اور اگر ایسا ہوا (یعنی کسی بھی قسم کی ملاوٹ ہوئی) تو درحقیقت دین خالص نہ ہوا اور پھر وہ اللہ کیلئے نہ ہوا"۔

جب تک غیریت، انانیت اور عبودیت کی رسوم باقی ہیں اور عابد و معبود، عبادت واخلاص اور دین کا سوال ہے، انانیت وغیریت کا شائبہ ہے اور ارباب معرفت کے نزدیک یہ شرک ہے۔ اہل خلوص کی عبادت تجلیات محبوب کا نقشہ ہے۔ ان کے دلوں میں ذات وحدانیت کے علاوہ کسی کیلئے راستہ نہیں ہے، حالانکہ افق امکان وجوب سے متصل ہے اور تدلی ذاتی اور قرب مطلق حقیقی ان کیلئے ظاہر ہے، رسوم غیریت بالکلیہ مرتفع ہے اس کے باوجود وہ لوگ تمام وظائف عبودیت کو پورا کرتے ہیں، ان کی عبودیت غور و فکر پر مبنی نہیں ہے، بلکہ ان کی عبودیت تجلی سے ہے، چنانچہ اسی مطلب کی طرف اشارہ ہے، نماز شب معراج رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

چوتھی فصل عمل کے بعد کا اخلاص

جیسا حدیث شریف میں جو آیا ہے۔ ﴿الإبقاءُ على العملِ حتى يخلُص، أشدُّ من العمل﴾ "عمل کی نگہداری کرتے رہنا یہاں تک کہ وہ خالص ہو جائے، یہ خود عمل سے زیادہ سخت ہے"۔ اس کا مقصد انسان کو اس بات پر آمادہ کرنا ہے کہ انسان اپنے کیئے جانے والے عمل کی مراعات و مواظبت کرے خود عمل کے وقت اور عمل انجام دینے کے بعد بھی، کیونکہ کبھی انسان عمل کو بغیر کسی عیب ونقص کے بجالاتا ہے اور وہ عمل ریا اور عُجب سے خالی بھی ہوتا ہے، لیکن عمل کے بعد اس کا ذکر کرنے سے ریا میں مبتلا ہو جاتا ہے، جیسا کہ کافی کی حدیث شریف میں ہے۔ عن أبي جعفر علیہ السلام أنّهُ قال ﴿ الإبقاءُ على العمَلِ أشدُّ من العمل قال وما الإبقاءُ على العمل؟ قال: يصِلُ الرَّجُلُ بصلةٍ وينفقُ نفقةً لله وحدهُ لا شريك له، فكتب لهُ سرّاً ثُمّ يذكُرُها فتُمحى فتُكتبُ لهُ علانيةً، ثُمّ يذكُرُها فتُكتبُ لهُ رياءً﴾ [۴۴]

حضرت امام باقرؑ سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا "عمل کی حفاظت، عمل سے زیادہ سخت ہے۔ راوی نے پوچھا حضور حفاظت عمل کیا ہے؟ فرمایا انسان خدائے وحدہ لاشریک کی خاطر صدرحم کرتا یا انفاق کرتا ہے، یعنی عمل میں ریاکاری نہیں کرتا، پس وہ عمل اس کیلئے پوشیدہ طور سے لکھ لیا جاتا ہے، اور اس کا ثواب بھی پوشیدہ طور سے اس کو دے دیا جاتا ہے۔ پھر وہ اپنے عمل کو (آشکارا) ذکر کرتا ہے، پس اس کو محو کر دیا جاتا ہے اور

آشکارا لکھ دیا جاتا ہے۔(یعنی اس کو عبادت کا ثواب آشکارا دیتے ہیں)۔ اس کے بعد وہ پھر اس عمل کا ذکر کرتا ہے تو اس (ثواب) کو مٹا کر اس کی جگہ ریا لکھ دیا جاتا ہے"۔

انسان اپنی عمر کے آخر تک نفس اور شیطان کے شر سے کبھی محفوظ نہیں رہتا ہے۔ اس کو یہ گمان نہیں کرنا چاہئے کہ اگر کسی عمل کو رضائے خدا کیلئے بجالایا ہے، جس میں مخلوق کی رضامندی کو ذرہ برابر دخل نہیں ہے تو اب وہ نفس خبیث کے شر سے محفوظ ہو گیا، اگر وہ اس کی حفاظت اور نگرانی نہ کرے تو یہ امکان رہتا ہے کہ نفس اس کو اس کے اظہار پر آمادہ کردے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اشارتاً و کنایتاً اس کا ذکر کرتا ہے۔ مثلاً اپنی نماز شب کو لوگوں کو بتانا چاہتا ہے تو بڑی ہوشیاری اور چالبازی سے فجر کے وقت کی خوشگوار ہوا یا سحر کے لوگوں کی مناجات یا اذان (صبح) کے بارے میں باتیں کرنے لگتا اور نفس کی پوشیدہ مکاری سے اپنے عمل کو برباد اور درجہ اعتبار سے گرا دیتا ہے۔ انسان کو چاہئے کہ ایک طبیب اور مہربان تیماردار کی طرح اپنے حال کی نگرانی کرے، اور نفس سرکش کی مہار کو ہرگز ڈھیل نہ دے، کیونکہ ذرا سی غفلت پر وہ مہار تڑوا کر انسان کو خاک ذلت و ہلاکت میں ملا دیتا ہے۔ بہر حال خدا کی پناہ حاصل کرنی چاہئے نفس امارہ و شیطان کے شر سے ﴿إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي﴾ ۲۵ "یقیناً نفس برائی کی طرف ابھارتا ہی رہتا ہے مگر جس پر میرا پروردگار رحم فرمائے (اور گناہ سے بچائے)"۔

یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ نیت کو شرک کے تمام مراتب اور ریا وغیرہ سے خالص رکھنا اس کی نگرانی کرنا اور اسی پر باقی رہنا یہ بہت ہی اہم اور مشکل امور میں سے ہے، بلکہ اس کے بعض مراتب تو خاص اولیاء کے علاوہ کسی کو میسر و ممکن بھی نہیں ہیں، کیونکہ نیت اس ارادے کو کہتے ہیں جو عمل پر ابھارتا ہے اور وہ اصلی مقصد کے تابع ہوا کرتا ہے اور یہ مقاصد ملکات نفسانیہ کے تابع ہوا کرتے ہیں جو انسان کے باطن، ذات اور عادت کو تشکیل دیا کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص حب جاہ و اقتدار کا دلدادہ ہے اور یہ محبت ملکہ نفسانیہ بن چکی ہے اور اس کی روح کی عادت ہو چکی ہے تو اس کا سب سے بڑا مقصد اسی مقصود تک پہنچنا ہے اور اس سے سرزد ہونے والے تمام اعمال اسی مقصد کے تابع ہوں گے اور اس کا دلی محرک وہی مطلوب نفسانی ہوگا اور اس کے اعمال اسی مقصد تک پہنچنے کیلئے انجام پائیں گے۔ (اس لئے) جب تک یہ محبت اس کے دل میں ہے اس کا عمل خالص نہیں ہو سکتا (اسی طرح) جس کے نفس کی عادت حب نفس اور خود غرضی ہوگی اور اس کے نفس کی چاہت بن چکی ہوگی تو پھر اس کا انتہائی مقصد اور آخری مطلوب خواہشات نفسانیہ تک رسائی ہوگا اور اس

کا محرک ودواعی تمام اعمال کے اندر یہی چیز ہوگی، خواہ اس کے اعمال دنیاوی مقصد کے حصول کیلئے ہوں یا حور وقصور وجنت اور بہشتی نعمات جیسے اخروی مقاصد کے حصول کیلئے ہوں، بلکہ جب تک انانیت وخودغرضی اور خودبینی درمیان میں ہے، چاہے وہ روحانی معارف وکمالات کیلئے بھی کوئی اقدام کرے گا یا قدم بڑھائے گا تب بھی وہ اپنے اور اپنی نفسانیت ہی کیلئے ہوگا اور وہ بھی خودخواہی ہے، خدا خواہی نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ خودخواہی وخدا خواہی ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتیں، بلکہ اگر وہ خدا کو بھی چاہے گا تو اپنے لئے چاہے گا اور اس کا آخری مقصد اور آخری مطلوب اس کی اپنی ذات اور نفسانیت ہوگی۔

پس اس سے معلوم ہوگیا کہ مطلق شرک سے نیت کا خالص ہونا بہت مشکل کام ہے جو ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے اور اعمال کا کامل یا ناقص ہونا نیتوں کے کمال ونقص کے تابع ہے، اس لئے کہ نیت ہی عمل کی صورت فعلی اور ملکوتی پہلو ہے۔ جیسا کہ ہم نے اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے اور اس حدیث شریف میں جو فرمایا گیا ہے ﴿والنیّۃُ أفضلُ من العملِ الا وانّ النیّۃ ھِیَ العمل﴾ ''نیت عمل سے افضل ہے، بلکہ کمال نیت ہی حقیقت عمل ہے'' انہیں مطالب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور یہ معنی مبالغہ پر مبنی نہیں ہے جیسا کہ بعض علماء نے گمان ظاہر کیا ہے، بلکہ یہ حقیقت پر مبنی ہے، اس لئے کہ نیت ہی عمل کی صورت کاملہ اور اس کی ماحصل ہے۔ اعمال کی صحت وفساد اور کمال ونقص کا دارومدار اسی نیت پر ہے۔ چنانچہ نیت کی بناپر ایک ہی عمل کبھی تعظیم اور کبھی توہین کا سبب ہوا کرتا اور کبھی مکمل اور کبھی ناقص ہوتا ہے۔ کبھی عمل ملکوت اعلیٰ کی قسم سے ہوتا اور حسین وجمیل صورت کا حامل ہوتا ہے اور کبھی ملکوت اسفل سے ہوتا اور وحشتناک ووحشتناک صورت پر مشتمل ہوتا ہے۔ (مثلاً) حضرت علیؑ اور کسی منافق کی نماز میں اجزاء وشرائط اور عمل کی ظاہری صورت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہوتا، لیکن حضرت علیؑ کی نماز اپنے اس عمل کے ساتھ معراج الی اللہ تک پہنچتی اور اس کی صورت ملکوت اعلیٰ کی ہوتی تھی اور منافق اپنے اس عمل (نماز) کے ساتھ واصل جہنم ہوتا ہے اور اس کی صورت ملکوت اسفل کی ہوتی ہے، اور شدت ظلمت کی وجہ سے اس کی کوئی تشبیہ نہیں دی جاسکتی۔

خاندان عصمت وطہارتؑ کیلئے راہ خدا میں چند جو کی روٹیوں کو دے دینے کی وجہ سے خداوند عالم ان کی مدح میں کئی آیات نازل کرتا ہے۔ ۲۶ جاہل تو یہ گمان کرتا ہے کہ دو تین دن روزے پر روزہ رکھنا اور اپنی غذا فقیروں کو دے دینا بہت ہی اہم بات ہے، حالانکہ صورت کے اعتبار سے ایسے اعمال دوسروں سے بھی ہوسکتے ہیں، یہ کوئی اہم چیز نہیں۔ اس کی اہمیت تو دراصل قصد خالص اور سچی نیت کی وجہ سے ہے۔ روح عمل

ایسی طاقتور اور لطیف ہے اور ایسے صاف قلب سلیم سے صادر ہوتی ہے، اسی لئے یہ تنی اہمیت کی حامل ہے۔ رسول خدا ؐ اور دوسرے لوگوں کی صورت میں ظاہرا کوئی فرق نہیں تھا، اسی لئے بعض عرب مسافر آکر جب رسول ؐ مجمع میں بیٹھے ہوتے تھے، پوچھا کرتے تھے تم میں سے رسول کون ہے؟ ۷۷؎ رسول خدا ؐ کو دوسروں سے جو چیز ممتاز کرتی تھی وہ آپ ؐ کی عظیم ولطیف اور قوی روح تھی، نہ کہ آپ ؐ کا جسم مبارک و بدن شریف، اور علوم عقلیہ میں یہ بات طے شدہ ہے کہ کسی شئے کی شیئیت کا دارومدار اس کی صورت پر ہوا کرتا ہے نہ کہ اس کے مادے پر، بلکہ فصل کے ذریعے تعریف کرنا حد تام ہے اور جنس وفصل سے تعریف کرنا (حد) ناقص ہے، اس لئے کہ غیر اور اجنبی چیزوں سے مخلوط کرنا اور متحد شئے سے کسی کی تعریف کرنا حقیقت وتعریف شئے کیلئے مضر ہے اور تعریف کے تام ہونے کے بھی مخالف ہے، ور مادہ وجنس کسی بھی شئے کی حقیقت کے اعتبار سے غیر و اجنبی ہوتے ہیں، کیونکہ حقیقت شئے ہمیشہ صورت وفعلیت وفصل کو کہا جاتا ہے۔ لہذا اعمال کی تمام حقیقت بھی وہی اعمال کی صورتیں اور اس کا ملکوتی پہلو ہوگا جس کو نیت کہا جاتا ہے۔

لہذا اس بیان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حضرت امام صادق ؑ نے اس حدیث شریف میں پہلے اعمال کی صورتوں اور مادوں پر نظر ڈالی اور فرمایا "جزء صوری، جزء مادی سے افضل ہے اور نیت عمل سے افضل ہے" جیسے ہم کہا کرتے ہیں کہ روح بدن سے افضل ہے، اس کا لازمہ یہ نہیں ہے کہ بغیر نیت کے عمل صحیح ہے (یا) بے روح والا بدن، بدن ہے، بلکہ عمل سے نیت کا تعلق ہو جانے کے بعد وہ ایک عمل بن جاتا ہے، جیسے روح کا بدن سے متعلق ہونے کے بعد وہ بدن ہو جاتا ہے اور نیت وعمل کی طرح روح وبدن سے مل کر جو آمیزہ بنتا ہے اس کا جزء صوری ملکوتی، اس کے جزء مادی دنیوی سے افضل ہوتا ہے اور مشہور حدیث ﴿نِيَّةُ الْمُؤْمِنِ خَيْرٌ مِنْ عَمَلِهِ﴾ ۷۸؎ "مؤمن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے" کا بھی یہی مطلب ہے

دوبارہ حضرت امام صادق ؑ نے اس بات کی طرف نظر فرمائی کہ عمل نیت اور ملک ملکوت میں ور مظہر ظاہر میں فنا ہو جاتا ہے اور فرمایا ﴿أَلَا وَإِنَّ النِّيَّةَ هِيَ الْعَمَلُ﴾ "نیت ہی عمل ہے" ور بغیر نیت کچھ بھی نہیں ہے۔ سارے اعمال نیت میں فنا ہو جاتے ہیں اور ان میں ذاتی اعتبار سے استقلال نہیں ہے س کے بعد حضرت ؑ نے پروردگار عالم کے اس قول کی دلیل دی ﴿قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ﴾ "ہر شخص پنے اپنے طریقہ سے عمل کرتا ہے" اور اعمال شکل نفس کے تابع ہوتے ہیں، ور شکل نفس اگر چہ روح کی ہیئت باطنی اور اس کے ملکات اس میں پوشیدہ ہیں، لیکن نیتیں نفس کی صورت ظاہری ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ملکات نفس کی

بنیادی صورتیں اور نیتیں اس کی ثانوی صورتیں ہیں اور اعمال انہیں کے تابع ہیں۔ چنانچہ خود حضرت ؐ نے فرمایا "شاکلہ، نیت ہے"۔

اور اسی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اعمال کا تمام مراتب شرک وریا وغیرہ سے خالص کرنا نفس اور اس کے ملکات کے اصلاح پر منحصر ہے، کیونکہ یہ چیز تمام اصلاحات کا سرچشمہ اور تمام مدارج وکمالات کا منشأ ہے۔ چنانچہ اگر انسان علمی اور عملی ریاضتوں کے ذریعے دنیا کی محبت کو دل سے نکال دے تو پھر اس کے مقصد کی غایت دنیا نہیں ہوگی اور اس کے اعمال شرک اعظم یعنی اہل دنیا کی نظروں کو اپنی طرف جلب کرنے اور ان کی نظروں میں اہمیت حاصل کرنے سے خالص ہو جائیں گے اور اس کی خلوت وجلوت اور راز و آشکار برابر ہو جائیں گے اور اگر نفسانی ریاضتوں کے ذریعے کوئی حب نفس کو اپنے دل سے خارج کر دے تو جس قدر بھی دل خود خواہی سے خالی ہوگا، اسی قدر خدا پرست ہو جائے گا اور اس کے اعمال بھی شرک خفی سے پاک ہو جائیں گے اور جب تک حب نفس دل کے اندر ہے اور انسان نفس کے تاریک گھر میں ہے وہ اللہ کی راہ کا مسافر نہیں ہے، بلکہ زمین میں ہمیشہ رہنے کی خواہش رکھنے والوں میں سے ہے، اور خدا کی طرف سفر کا پہلا قدم حب نفس کا ترک کر دینا اور اپنی انانیت کے سر کے اوپر قدم رکھنا ہے اور سفر میں میزان یہی ہے۔

اور بعض علما کا خیال ہے کہ آیہ شریفہ ﴿وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ﴾ ۲۹ "اور جو شخص اپنے گھر سے ہجرت کر کے خدا اور اس کے رسول ؐ کی طرف نکل کھڑا ہو پھر اسے (منزل مقصود تک پہنچنے سے پہلے) موت آ جائے تو خدا پر اس کا ثواب لازم ہو گیا" کے معانی میں سے ایک معنی یہ ہے کہ جو شخص بیت نفس سے خارج ہو کر حق کی طرف معنوی سفر کرے اور اس کے بعد اس کو فنائے تام حاصل ہو جائے تو اس کا اجر خدا پر ہے۔ ۳۰ اور ظاہر ہے کہ ایسے مسافر کا اجر ذات مقدس کے مشاہدے اور اس کے حضور میں پہنچنے کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اسی مطلب کو کسی حضرت کی زبان میں اس طرح کہا گیا ہے:

در ضمیر ما نمی گنجد بہ غیر دوست کس — ہر دو عالم را بہ دشمن دہ کہ ما را دوست بس

(ہمارے دل میں دوست کے علاوہ کسی کی گنجائش نہیں ہے۔ دونوں عالم دشمن کے حوالے کر دے میرے لئے تو صرف میرا دوست ہی کافی ہے)۔

والسلام

توضیحات (۲۰)

۱۔ سورۂ ملک، آیت ۲/۔

۲۔ سورۂ اسراء، آیت ۸۴/۔

۳۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۱۹، کتاب ایمان وکفر، باب اخلاص، حدیث ۴

۴۔ "بعوضۃ بھوی" اس کا ترجمہ کیا، اس کو معترض [illegible] میں [illegible] بلاء [illegible] ابتلاء [illegible] و بتلاء" کے معنی میں اس کا امتحان [illegible]

۵۔ مرآۃ العقول، ج ۷، ص ۷۸، کتاب ایمان وکفر، باب اخلاص، حدیث ۴

۶۔ علامہ مجلسی [illegible] ج ۹ ص ۲۳۱ میں اس مطلب [illegible] شہید ثانی [illegible] العقول [illegible] مطبوعہ کتاب کے صفحہ ۸ پر صرف "النیۃ الصادقۃ" آیا ہے

۷۔ سورۂ ملک، آیت ۱۲/۲

۸۔ مرآۃ العقول، ج ۷، ص ۷۷، کتاب ایمان وکفر، باب اخلاص، حدیث ۴

۹۔ حدیث ۵ کی طرف رجوع کیجئے۔

۱۰۔ حدیث ۱، مقام ۲، فصل ۲ اور حدیث ۱، فصل ۳

۱۱۔ حدیث ۲، فصل ۱۔

۱۲۔ حدیث ۶، حاشیہ ۲۔

۱۳۔ سورۂ ہود، آیت ۷/۔

۱۴۔ وسائل الشیعہ، ج ۱، ص ۵۲، ۵۳، کتاب الطہارۃ، باب مقدمۃ العبادات، باب ۱۲، حدیث ۳ و [illegible] وسائل، ج [illegible] ص ۱۲، کتاب الطہارۃ، ابواب مقدمۃ العبادات، باب ۱۲، حدیث ۸۔

۱۵۔ [illegible]

۱۶۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۱۶، کتاب ایمان وکفر، باب اخلاص، حدیث ۵ اور اس میں "اراد یا لرجل" کے بجائے [illegible] آیا ہے۔

۱۷۔ سورۂ شعراء، آیت ۸۸ و ۸۹۔

۱۸۔ قال ابو عبد اللہ: [illegible] الشرک خفی [illegible]

وشبہ ھذ۔ ﴾ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا شرک چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ مخفی ہوتا ہے اور فرمایا انگوٹھی کو ایک (انگلی) سے دوسرے میں بدلنا تاکہ حاجت یاد آ جائے یہ بھی شرک کی ایک قسم ہے

معانی الاخبار، باب نوادر المعانی، ص ۳۷۹، حدیث ۱۱ وسائل الشیعہ، ج ۳، ص ۴۰۹، باب احکام الملابس، باب ۶۱

۱۹ منازل السائرین، ص ۳۱، قسم المعاملات، باب الاخلاص

۲۰۔ اربعین، ص ۵۹ حدیث ۳۷

۲۱۔ سورہ زمر، آیت ۳۔

۲۲۔ محمد بن علی بن محمد عربیؒ (۵۶۰ ۶۳۴ یا ۳۷ یا ۳۸) ساتویں صدی کی سب سے معروف صوفی شخصیت اور اسلامی تاریخ کے اکابر عرفا میں سے ہیں جو ابن عربی، محی الدین اور شیخ اکبر کے نام سے مشہور ہیں عرفان و تصوف میں ان کی کتابیں ان کے زمانے سے آج تک تمام عرفا اور عرفان و تصوف سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے بحث و مباحثہ اور درس و تدریس کیلئے ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں۔ ان کی کتابوں کا بالخصوص فصوص کا سمجھنا بہت مشکل ہے۔ ہر زمانے میں چند افراد ہی اس سے عہدہ برآ ہو سکے ہیں۔ تقریباً دو سو کتابیں ان کی طرف منسوب ہیں جن میں سب سے اہم فتوحات مکیہ، فصوص الحکم، التجلیات الالٰہیہ، انشاء الدوائر اور تفسیر قرآن مشہور ہیں۔ فصوص کا شمار بنیادی اور اہم ترین درسی کتابوں میں ہوتا ہے جس پر بڑے بڑے عرفا نے شرح و حواشی لکھے ہیں۔ خود امام خمینیؒ کے فصوص پر بہت ہی نفیس حواشی ہیں۔

۲۳ اس کا ترجمہ گزر چکا ہے

۲۴۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۲۹۷ کتاب الایمان والکفر، باب الریاء، حدیث ۱۶۔

۲۵۔ سورۂ یوسف، آیت ۵۳۔

۲۶ سورۂ طہ، آیت ۲۵و۲۶

۲۷۔ بحار الانوار، ج ۶، ص ۲۲۹، تاریخ جدید، باب مکارم اخلاق وغیرہ، حدیث ۳۵۔

۲۸۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۸۴، کتاب الایمان والکفر باب النیہ، حدیث ۲۔

۲۹۔ سورۂ نساء، آیت ۱۰۰۔

۳۰۔ میبدی نے تفسیر کشف الاسرار، ج ۲، ص ۶۶۳ پر اس آیت کے بارے میں اس طرح گفتگو کی ہے۔

اکیسویں حدیث

بالسند المتصل الی شیخنا ثقۃ الفرقۃ و مامهم، محمد بن یعقوب الکلینی رضوان اللہ علیہ، عن حمید بن زیاد، عن الحسن بن محمد بن سماعۃ عن وهیب بن حفص، عن ابی بصیر، عن ابی جعفر علیہ السلام قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ، عند عائشۃ لیلتها، فقالت

﴿یا رسول اللہ! لم تتعب نفسک وقد غفر اللہ لک ما تقدم من ذنبک وما تاخر؟ فقال یا عائشۃ! الا اکون عبداً شکوراً؟﴾

قال ﴿ وکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ، یقوم علی اطراف اصابع رجلیہ، فانزل اللہ سبحانہ وتعالی: ﴿طٰه ☆ ما انزلنا علیک القرآن لتشقی﴾﴾۔[1]

ترجمہ ابوبصیر نے حضرت امام محمد باقرؑ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ امام محمد باقرؑ نے فرمایا حضرت رسولخداؐ عائشہ کے پاس رات کو ان کی باری میں تھے کہ عائشہ نے کہا ''اے خدا کے رسول جب خدا نے آپ کے گزشتہ اور آئندہ سارے گناہ معاف کر دیئے ہیں تو پھر آپ اپنے کو اتنی تکلیف میں کیوں ڈالتے ہیں؟ حضرتؐ نے فرمایا کیا میں خدا کا شکرگزار بندہ نہ ہوں؟''

امام باقرؑ فرماتے ہیں ''(درحقیقت) رسولخداؐ (راتوں کو نماز پڑھتے ہوئے) اپنے پیروں کی انگلیوں کے بل کھڑے ہو جاتے تھے تو خداوندعالم نے یہ آیت نازل فرمائی ﴿طٰه ☆ ما انزلنا علیک القرآن لتشقی﴾ [2] طٰہٰ! (اے میرے حبیب و طاہر رسول) ہم نے تم پر قرآن اس لئے نہیں اتارا کہ تم اس قدر مشقت برداشت کرو''۔

شرح ﴿قد غفر اللہ لک﴾ یہ قرآن کے سورۂ فتح کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے ﴿انا فتحنا لک فتحاً مبیناً لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر﴾ [۳] ''(اے رسول یہ حدیبیہ کی فتح نہیں ہے بلکہ) ہم نے آپ کو کھلی ہوئی فتح اس لئے دی کہ خدا آپ (کی امت) کے اگلے اور پچھلے (تمام) گناہ معاف کر دے''۔

یہ جان لیجئے کہ علمائے کرام نے اس آیت شریفہ کی کئی توجیہات پیش کی ہیں جو عصمت حضرت رسولؐ سے منافات نہیں رکھتیں۔ علامہ مجلسیؒ نے جو توجیہات پیش کی ہیں ان میں سے بعض کا میں یہاں پر ذکر کرتا ہوں۔ اس کے بعد اہل معرفت نے اپنے حسب مسلک جو کچھ بیان کیا ہے اس کا بھی اجمالاً ذکر کروں گا۔

علامہ مجلسیؒ نے فرمایا اس آیت کی تاویل میں شیعوں کے کئی قول ہیں

ایک تو یہ ہے کہ اس سے مراد امت کے گناہ ہیں جو حضرت رسولؐ کی شفاعت سے بخش دیئے جائیں گے اور امت کے گناہوں کی آپؐ سے نسبت کی وجہ امت اور آنحضورؐ کے درمیان اتصال ہے۔ اس احتمال کی تائید مفضل بن عمر کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے نقل کی ہے ﴿قال سألہ رجل عن ھذہ الآیۃ، فقال واللہ ما کان لہ ذنب ولکن اللہ سبحانہ ضمن لہ أن یغفر ذنوب شیعۃ علیّ ما تقدم من ذنبھم وما تاخر﴾ [۵] ''ایک شخص نے حضرت سے اس (مذکورہ) آیت کے بارے میں پوچھا تو آپؑ نے فرمایا خدا کی قسم رسول خداؐ نے کوئی گناہ نہیں کیا، لیکن خداوند عالم نے اس بات کی ضمانت دی ہے کہ حضرت علیؑ کے شیعوں کے گناہوں کو بخش دے گا خواہ وہ ماضی کے گناہ ہوں یا مستقبل کے''۔

اور اس روایت سے بھی تائید ہوتی ہے ﴿وروی عمر بن یزید، عنہ علیہ السلام، قال ما کان لہ ذنب ولا ھم بذنب ولکن اللہ حملہ ذنوب شیعتہ ثم غفرھا لہ﴾ (نیز) ''حضرتؑ نے فرمایا رسول اکرمؐ نے نہ تو گناہ کیا تھا اور نہ کبھی گناہ کا ارادہ کیا تھا، لیکن خداوند عالم نے آپؐ کے شیعوں کے گناہوں کو آپؐ کے اوپر لاد کر ان کی وجہ سے بخش دیا''۔

راقم الحروف کے نزدیک، مسلک عرفان میں اس کی ایک اچھی توجیہ ہے جس کی طرف اجمالی اشارہ فائدے سے خالی نہیں ہے۔ یہ بات سمجھ لیجئے کہ اپنی جگہ پر یہ بات مسلّم ہے کہ انسان کامل کی ذات ثابت

اسم اعظم "اللہ" ہے جو ائمہ اسماء کا امام ہے۔ اس کے علاوہ دیگر موجودات انسان کامل کے سائے میں علم اور ظاہری عالم میں مقرر ہے اور عالم تحقق وخارج میں موجود ہے۔ اس لئے دائرہ وجود کی ظاہری اشیا ذات انسان کامل کا خارج میں مظہر ہیں اور عالم ظہور میں تمام موجودات اسی (ذات انسان) کے جلال وجمال کا مظہر ہیں۔ اس لئے عالم تحقق میں جو نقص بھی واقع ہو اور (ان) مظاہر سے جو ہے جس گناہ کا ارتکاب ہو خواہ وہ گناہ تکوینی ہو یا تشریعی بہ حکم ظاہر ومظہر یہ سب کے سب بطور حقیقت وبے شائبہ مجاز ظاہر کی طرف منسوب ہیں اگرچہ ﴿ما أصابک من سیئۃ فمن نفسک﴾۶ "اور جب تم کو کوئی تکلیف پہنچے تو (سمجھو کہ) خود تمہاری بدولت ہے" اور ﴿قل کل من عند اللہ﴾۷ "(اے رسول) آپ کہہ دیجئے سب خدا کی طرف سے ہے" یہ سب اپنی جگہ پر حقیقت ہے۔

حدیث میں بھی اس مطلب کی طرف کافی اشارہ ہے، چنانچہ ارشاد ہے ﴿نحن السابقون الآخرون﴾۸ "ہم ہی سب سے اول ہیں اور ہم ہی سب سے آخر ہیں" نیز (دوسری جگہ) ارشاد ہے ﴿آدم ومن دونہ تحت لوائی یوم القیامۃ﴾۹ "آدم اور ان کے علاوہ دیگر انبیاء قیامت کے دن (سب کے سب) میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے" اور اسی طرح ارشاد ہے ﴿اول ما خلق اللہ روحی أو نوري﴾۱۰ "سب سے پہلے خدا نے میری روح یا میرے نور کو پیدا کیا" اور (ارشاد ہے) ﴿سبحنا فسبحت الملائکۃ، قدسنا فقدست الملائکۃ﴾۱۱ "(جب) ہم نے تسبیح کی تو ملائکہ نے بھی تسبیح اور ہم نے تقدیس الٰہی کی پھر (ہم کو دیکھ کر) ملائکہ نے بھی تقدیس کی" اور (اسی طرح) فرماتے ہیں ﴿لولانا ما عرف اللہ﴾۱۲ "اگر ہم نہ ہوتے تو خدا کی معرفت نہ ہو سکتی" اور (حدیث قدسی میں) ارشاد ہے ﴿لولاک لما خلقت الأفلاک﴾۱۳ "(اے رسول) اگر تم کو پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا تو میں افلاک کو پیدا نہ کرتا اور (یہ بھی) ارشاد ہے ﴿نحن وجہ اللہ﴾۱۴ "ہم ہی وجہ اللہ ہیں"۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول خدا بمنزلہ درخت کے تنے کے ہیں اور ائمہ معصومین اس کی شاخیں اور شیعہ اس کے پتے ہیں۔۱۵ پس شجرۂ طیبہ ولایت کی زینت مظاہر سے ہے اور جن مظاہر میں نقصان ہو گا وہ شجرۂ طیبہ میں نقصان ہو گا۔

لہذا تمام موجودات کے گناہ ولی مطلق کے گناہ ہیں اور خداوند عالم نے اپنی رحمت تامہ اور اپنی اس وسیع بخشش کی بنا پر نبی اکرم پر رحمت فرمائی ہے اور ارشاد فرمایا "گذرے ہوئے لوگوں کے جتنے بھی گناہ

ہیں وہ، اور اس کے بعد واقع ہونے والے گناہوں کو اپنی مغفرت تامہ کے تحت لے لے گا اور (اے رسول) تمہاری شفاعت کی وجہ سے تمام دائرۂ تحقق اپنی سعادت کاملہ کو حاصل کر لے گا ﴿وَآخِرُ مَنْ يَشْفَعُ أَرْحَمُ الرَّاحِمِين﴾ ۱۶ ''جو سب سے آخر میں شفاعت کرے گا وہ تمام مہربانوں میں سب سے زیادہ مہربان ہے''۔

اس مسلک کی بنا پر یہ آیت ﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَى﴾ ۱۷ ''اور تمہارا پروردگار عنقریب اتنا عطا کرے گا کہ تم خوش ہو جاؤ'' کی طرح کی ہے اور اسی آیت ﴿يُعْطِيكَ رَبُّكَ﴾ کے بارے میں کہا گیا ہے ﴿أَرْجَى آيَةٍ فِي الْقُرْآنِ﴾ ۱۸ ''قرآن میں سب سے زیادہ پرامید آیت یہی ہے''۔ اب اس مسلک کی بنا پر ''گزشتہ گناہوں'' سے مراد سابق امتوں کے گناہ بھی ہو سکتے ہیں، کیونکہ ساری امتیں حضرت رسولؐ کی امت ہیں اور تمام انبیاءؑ کی دعوت ختم المرسلینؐ کی شریعت کی دعوت اور سچی ولی مطلق کے مظاہر ہیں، آدمؑ ہوں یا ان کے علاوہ یہ سب ہی شجرۂ ولایت کے پتے ہیں۔

دوسری تاویل سید مرتضیٰؒ ۱۹ نے یہ فرمائی ہے کہ ذنب مصدر ہے اور مصدر کی اضافت فاعل و مفعول کی طرف جائز ہے۔ یہاں پر ذنب مفعول کی طرف مضاف ہے اور مقصود یہ ہے کہ مشرکین نے آپؐ کو مکہ جانے سے ممانعت کر کے اور مسجد الحرام سے روک کر جو گناہ کیا ہے، خدا اس کو محو و زائل کر دے گا اور اس کو ختم کر دے گا۔ اس صورت میں مغفرت کا مطلب آنحضورؐ کے دشمنوں کے احکام کو منسوخ کر دینے اور زائل کر دینے کے ہیں، یعنی خدا ان باتوں کا ازالہ فتح و کامرانی کے ذریعے کرے گا اور جو عار تم کو لاحق ہو گیا ہے فتح مکہ کے ذریعے اس کو ختم کر دے گا اور اس کے بعد تم بہت جلد مکہ میں فاتح ہو کر داخل ہو گے۔ اسی لئے مغفرت کو جہاد کی جزا اور فتح کا فائدہ قرار دیا گیا ہے۔ ۲۰

سیدؒ فرماتے ہیں اگر مغفرت سے مراد گناہوں کی بخشش مراد ہو تو اس آیت کو کوئی معقول مطلب نہیں ہو گا، کیونکہ فتح مکہ سے گناہوں کی مغفرت کا کیا تعلق؟ اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہے جہاں تک خدا کے ارشاد میں ﴿مَا تَقَدَّمَ وَمَا تَأَخَّرَ﴾ کا تعلق ہے، اس میں کوئی مانع نہیں ہے کہ اس سے گزشتہ زمانے میں مخالفین نے جو افعال قبیح آپؐ کے اور آپؐ کی قوم کے ساتھ کئے ہیں اس کو مراد لیں۔ ۲۱

تیسری تاویل یہ ہے کہ اے رسولؐ اگر گزشتہ زمانے میں یا اس کے بعد بھی تمہارا کوئی گناہ ہوتا تو میں اس کو بخش دوں گا اور ظاہر ہے کہ شرطیہ معاملے میں دونوں فریق کی طرف سے تصدیق اور واقع ہونا لازم

نہیں ہے۔

چوتھا یہ کہ گناہ سے مراد ترک مستحب ہوگا اس لئے کہ آنحضرتؐ کے واجبات تو کبھی ترک نہیں ہوئے اور آپؐ کی علو مرتبت و رفعت شان کی بنا پر جو چیزیں دوسروں کیلئے گناہ نہ ہوں ان کو آنحضرتؐ کیلئے گناہ سمجھا جائے۔

پانچواں یہ ہے کہ یہ آیت حضرتؐ کی تعظیم کیلئے آئی ہے اور حسن خطاب کے عنوان پر ہے جیسے کہا جاتا ہے ﴿غفر اللہ لک﴾ ''خدا آپ کو معاف کرے''۔

علامہ مجلسیؒ فرماتے ہیں

وَقَدْ رَوَى الصَّدُوقُ فِي الْعُيُونِ بِإِسْنَادِهِ عَنْ عَلِيِّ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ الْجَهْمِ قَالَ حَضَرْتُ مَجْلِسَ الْمَأْمُونِ وَعِنْدَهُ الرِّضَا عليه السلام، فَقَالَ لَهُ الْمَأْمُونُ

يَا ابْنَ رَسُولِ اللّٰهِ أَلَيْسَ مِنْ قَوْلِكَ أَنَّ الْأَنْبِيَاءَ مَعْصُومُونَ؟ قَالَ بَلَى قَالَ فَمَا مَعْنَى قَوْلِ اللّٰهِ ﴿لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ وَمَا تَأَخَّرَ﴾؟

قَالَ الرِّضَا عليه السلام لَمْ يَكُنْ أَحَدٌ عِنْدَ مُشْرِكِي مَكَّةَ أَعْظَمَ ذَنْباً مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وآله لِأَنَّهُمْ كَانُوا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ ثَلَاثَمِائَةٍ وَسِتِّينَ صَنَماً فَلَمَّا جَاءَهُمْ صلى الله عليه وآله بِالدَّعْوَةِ إِلَى كَلِمَةِ الْإِخْلَاصِ كَبُرَ ذَلِكَ عَلَيْهِمْ وَعَظُمَ، وَقَالُوا ﴿أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلٰهاً وَاحِداً إِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ﴾ إِلَى قَوْلِهِ ﴿إِنْ هٰذَا إِلَّا اخْتِلَاقٌ﴾ [22] فَلَمَّا فَتَحَ اللّٰهُ تَعَالَى عَلَى نَبِيِّهِ صلى الله عليه وآله مَكَّةَ قَالَ لَهُ يَا مُحَمَّدُ ﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحاً مُبِيناً لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ﴾ عِنْدَ مُشْرِكِي أَهْلِ مَكَّةَ بِدُعَائِكَ إِلَى تَوْحِيدِ اللّٰهِ فِيمَا تَقَدَّمَ وَمَا تَأَخَّرَ لِأَنَّ مُشْرِكِي مَكَّةَ أَسْلَمَ بَعْضُهُمْ وَخَرَجَ بَعْضُهُمْ عَنْ مَكَّةَ، وَمَنْ بَقِيَ مِنْهُمْ لَمْ يَقْدِرْ عَلَى إِنْكَارِ التَّوْحِيدِ عَلَيْهِ إِذَا دَعَا النَّاسَ إِلَيْهِ فَصَارَ ذَنْبُهُ عِنْدَهُمْ فِي ذَلِكَ مَغْفُوراً بِظُهُورِهِ عَلَيْهِمْ

فَقَالَ الْمَأْمُونُ: لِلّٰهِ دَرُّكَ يَا أَبَا الْحَسَنِ﴾ [23]

''عیون میں شیخ صدوقؒ نے علی بن محمد بن الجہم سے روایت کی ہے کہ وہ کہتے ہیں میں مامون کے دربار گیا وہاں حضرت امام رضاؑ بھی تشریف فرما ہیں۔ مامون نے کہا فرزند رسولؐ! کیا آپؑ کا قول یہ نہیں ہے کہ انبیاءؑ معصوم ہوتے ہیں حضرتؑ نے فرمایا ہاں! مامون نے کہا پھر ﴿لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر﴾ کا کیا مطلب؟

حضرت امام رضاؑ نے فرمایا مشرکین مکہ کے نزدیک رسول خداؐ سے بڑا کوئی گنہگار نہیں تھا، کیونکہ وہ لوگ ۳۶۰ بتوں کو پوجتے تھے جب رسولخداؐ نے ان کو کلمہ توحید کی دعوت کی تو یہ بات ان لوگوں کو بہت ناگوار گزری اور کہنے لگے کیا سارے خداؤں کو ایک خدا کر دیا یہ تو بہت ہی عجیب بات ہے یہاں سے لے کر ﴿ان هذا الا اختلاق﴾ تک (یہ سب من گھڑت ہے) پھر جب خدا نے اپنے رسولؐ کے ہاتھوں مکہ کو فتح کیا تو کہا اے رسول اہم نے آپ کو کھلی ہوئی فتح دی تا کہ خدا، مشرکین مکہ کے نزدیک پہلے اور بعد میں توحید کی دعوت کے ذریعے جو گناہ کئے تھے، ان اگلے اور پچھلے تمام گناہوں کو معاف کر دے، کیونکہ مشرکین مکہ میں سے کچھ تو اسلام لائے، بعض مکہ سے چلے گئے اور جو رہ گئے ان میں آپؐ کے سامنے توحید کے انکار کی طاقت نہیں تھی پس ان پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد گویا رسولؐ کے سارے گناہ دھل گئے اور آپؐ ان کے نزدیک گنہگار نہیں رہ گئے۔

اس پر مامون بولا خدا آپؑ کو اچھی جزا دے اے ابوالحسن''

راقم (امام خمینیؒ) کہتا ہے یہ اچھی تاویل ہے جس کا استفادہ حدیث سے کیا گیا۔ خلاصہ یہ ہوا کہ آنحضرتؐ جو کفار کے زعم فاسد میں گنہگار تھے خدا نے ان کے گناہوں کو بخش دیا۔

پہلی فصل: آیت کی عرفانی توجیہ

یہ جان لو کہ اہل عرفان کے مسلک اور اصحاب قلوب کے مذہب کی بنا پر اس آیت کی ایک اور توجیہ ہے جس کی توضیح کیلئے ان کی زبان زد اصطلاح ''فتوحات ثلاثہ'' کا ذکر ضروری ہے۔ لہذا ہم کہتے ہیں کہ ان کے نزدیک ابواب معارف وعوارف اور علوم ومکاشفات کا خدا کی طرف سے بند ہونے کے بعد کھل جانے کا نام ''فتح'' ہے۔ جب تک انسان نفس کے تاریک گھر میں ہے اور تعلقات نفسانیہ سے وابستہ ہے معارف ومکاشفات کے تمام دروازے اس کیلئے بند ہوتے ہیں اور جیسے ہی ریاضتوں کی قوت اور ہدایتوں کے انوار کے سبب اس تاریک مکان سے خارج ہوا اور نفس کی منزلوں کو طے کر لیا باب قلب اس کے سامنے فتح ہو جاتا ہے اور اس کے قلب میں معارف کا ظہور ہونے لگتا ہے اور وہ ''مقام قلب'' کا مالک ہو جاتا ہے اور اس فتح کو ''فتح قریب'' کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ یہ فتوحات کی ابتدا اور ان میں سے زیادہ قریب ہے اور اصحاب قلوب آیت مبارکہ ﴿نصر من الله وفتح قریب﴾[۲۴] کو اسی ''فتح'' کیلئے اشارہ قرار دیتے ہیں۔ البتہ یہ

بات ضروری ہے کہ یہ سب خدا کی مدد اور نور ہدایت اور اسی کی طرف لگاؤ سے ہے یہ فتح، اور دوسری فتوحات واقع ہوتی ہیں اور جب تک سالک عالم قلب میں ہوتا ہے اور رسوم وتعینات قلبیہ اس پر اثر انداز ہوتے ہیں اس وقت تک باب اسماء وصفات اس پر بند رہتا ہے۔

پھر جب رسوم عالم قلب کے اسمائی وصفاتی تجلیات فنا ہو جاتے ہیں اور صفت قلب کے جلوے اور کمالات اس کو فنا کر دیتے ہیں تو "فتح مبین" کی باری آتی ہے اور باب اسماء وصفات اس کے سامنے کھل جاتے ہیں اور نفسانی متقدم رسوم اور قلبی متاخر رسوم (وآثار) سب زائل وفنا ہو جاتے ہیں اور اسماء ستاریت وغفاریت کے تحت مغفور ہو جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ﴿انا فتحنا لک فتحاً مبیناً لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر﴾ کی فتح کی طرف اشارہ ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے "ہم نے عالم وصفات کی کھلی ہوئی فتح تم کو اس لئے عطا کی تاکہ اسمائے الٰہی غفاریت کے تحت نفسانی ذنوب متقدمہ اور ذنوب قلبیہ متاخرہ مغفور ہو جائیں" اس کو فتح باب ولایت کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد جب تک سالک کثرت اسمائی اور تعینات صفاتی کے حجابوں میں رہتا ہے تجلیات ذاتیہ کے دروازے اس پر بند رہتے ہیں اور جب اس کیلئے تجلیات ذاتیہ احدیہ جلوہ گر ہو جاتی ہیں اور تمام رسوم صفاتیہ اس پر فنا ہو جاتے ہیں اور بندہ "عین جمع" میں مستغرق ہو جاتا ہے تب فتح مطلق ہو جاتا ہے اور ذنب مطلق مغفور ہو جاتا ہے اور تجلی احدی کی وجہ سے ذاتی گناہ جو تمام گناہوں کا منشاء ہے، مستور ہو جاتا ہے ﴿وجودک ذنب لا یقاس به ذنب﴾ ۲۵ "تیرا وجود خود ایسا گناہ ہے جس کا قیاس کسی گناہ سے نہیں کیا جاسکتا" اور یہ حضرت کہتے ہیں کہ ﴿اذا جاء نصر اللہ والفتح﴾ ۲۶ اسی فتح کی طرف اشارہ ہے۔

پس فتح قریب سے معارف قلبیہ کے دروازے کھل جاتے ہیں اور نفسانی گناہ بخش دیئے جاتے ہیں اور فتح مبین کے ساتھ ولایت وتجلیات الٰہیہ کے دروازے کھل جاتے ہیں اور گذرے ہوئے نفسانی گناہوں کے بقایا اور متاخرہ قلبی گناہ بھی بخش دیئے جاتے ہیں اور فتح مطلق کے ساتھ تجلیات ذاتیہ احدیہ فتح ہو جاتے ہیں اور مطلق ذاتی گناہ بھی بخش دیئے جاتے ہیں۔

ایک یہ بات بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ فتح قریب اور فتح مبین (یہ دونوں) اولیاء، انبیاء، اور اہل معارف سب کیلئے عام ہیں لیکن "فتح مطلق" خاتمیت کے مقامات خاصہ میں سے ہے۔ (یہ مرتبہ کسی کو حاصل نہیں) اور اگر کسی کو حاصل ہو جائے تو وہ ضمنی ہوتا اور سرور کائنات کی شفاعت سے حاصل ہوتا ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ گناہوں کے بھی مرتبے ہیں بعض تو ایسے گناہ ہیں جو نیک لوگوں کے حسنات شمار ہوتے ہیں اور بعض گناہ خاص ترین افراد کیلئے گناہ ہیں۔ کہا جاتا ہے حضور سرور کائنات ؐ نے فرمایا ﴿اِنَّهُ لَیُرَانُ (اَوْ، لَیُغَانُ) عَلیٰ قَلْبِي وَاِنّي لَاَسْتَغْفِرُ اللهَ فِي كُلِّ يَومٍ سَبْعِينَ مَرَّةً﴾ ۲۷ ''کبھی میرے دل پر ایک پردہ سا چھا جاتا ہے، اور میں (بغیر کسی گناہ کے) روزانہ ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں'' اور یہ ابر (کدورت) کثرت کی طرف توجہ سے پیدا ہوسکتا ہے، لیکن یہ خیارت کی طرح ہے جو بہت جلد زائل ہو جاتی ہے۔ حدیث میں ہے جب تک رسولخدا ؐ پچیس مرتبہ استغفار نہیں کر لیتے تھے کسی بھی نشست سے باہر تشریف نہیں لے جاتے تھے۔ ۲۸

ان حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ استغفار صرف ان گناہوں کیلئے مخصوص نہیں ہے جو عصمت کے منافی ہوتے ہیں اور مغفرت اور ذنب سے مراد عرفی اصطلاحات نہیں ہیں۔ لہذا یہ آیت شریفہ آنحضرت ؐ کے مقام معنوی کے منافی نہیں ہے، بلکہ اس کی تاکید کرتی ہے۔ اس لئے کہ سلوک معنوی اور مدارج سے عبور اور کمال انسانی کی بلندی تک پہنچنے کے لوازمات میں سے مقامات و مدارج کے لازمہ گناہوں کا بخشا جانا ہے، کیونکہ جو موجود بھی اس عالم میں ہے وہ اسی جسمانی مادے اور دنیوی زندگی کی پیداوار ہے اور اس میں تمام دنیوی حیوانی یا بشری و نسانی خصوصیات بعض میں بالقوہ اور بعض بالفعل موجود ہیں۔ پس اگر وہ اس عالم سے دوسرے عالم کی طرف اور وہاں سے قرب مطلق کا سفر کرنا چاہتا ہے تو ان مدارج کو طے کرکے منازل متوسطہ سے کوچ کرنا پڑے گا اور جس مرتبے میں بھی وہ پہنچے گا اس سے پہلے والے مرتبے کے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ یہاں تک کہ تجلیات ذاتیہ احدیہ کے تحت (اس کے) تمام گناہ بخشے جائیں گے اور ذنب وجودی جو تمام ذنوب کا مبدا و منشا ہے خدا کے سایۂ کبریا میں چھپ جائیں گے اور یہ کسی موجود کے کمال کی حد عروج ہے۔ اس جگہ پہنچ کر موت اور فنائے تام واقع ہوتی ہے۔ اسی لئے جب آیہ مبارکہ ﴿اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللهِ وَالْفَتْحُ﴾ نازل ہوئی تو رسول کرم ؐ نے فرمایا ''یہ سورہ میری موت کی اطلاع ہے'' ۲۹

واللہ العالم۔

دوسری فصل

شکر کی حقیقت

یہ جان لو کہ منعم کی نعمت کی قدردانی کا نام شکر ہے۔ اس قدردانی کے آثار دوں میں ایک طرح ظاہر

ہوتے ہیں اور زبان میں ایک طرح سے اور جسمانی اعضاء و اعمال میں ایک طرح سے قلب میں اس کے آثار خضوع، خشوع، محبت، خشیت وغیرہ کی طرح کے ہوتے ہیں اور زبان پر اس کے آثار حمد و ثنا و مدح کے جملوں سے ظاہر ہوتے اور اعضاء و جوارح میں اس کے آثار طاعت اور مرضی منعم کے مطابق اعضاء کا استعمال کرنے کی صورت میں نمایاں ہوتے ہیں۔

راغب (اصفہانی ؒ) ۳۰ سے منقول ہے "نعمت کا تصور اور اس کے اظہار کا نام شکر ہے" یہ بھی کہا گیا ہے کہ شکر "کشر" کا مقلوب ہے اور کشر کے معنی "کشف" کے ہیں اور اس کا ضد "کفر" ہے جس سے معنی نعمت کو بھلانے اور اس کے چھپانے کے ہیں (اسی لئے) دابہ شکور اس جانور کو کہا جاتا ہے جو اپنے موٹاپے کی وجہ سے اپنے مالک کی نعمت کا اظہار کرے اور کہا گیا ہے کہ اس کی اصل عین شکری ہے جس کے معنی ممتلئہ (بھری ہوئی آنکھ) کے ہیں۔ بنابریں شکر کا مطلب ذکر منعم سے پر ہونا ہیں۔

شکر کی تین قسمیں ہیں:

شکر قلب وہ تصور نعمت ہے۔ زبانی شکر وہ ثنائے منعم کا نام ہے دیگر اعضاء کا شکر وہ بقدر استحقاق نعمت کی جزا دینا ہے۔ ۳۱

عارف محقق خواجہ انصاری ؒ ۳۲ فرماتے ہیں شکر معرفت نعمت کا نام ہے کیونکہ یہی منعم کی معرفت کا طریقہ ہے۔ ۳۳ اور شارح محقق فرماتے ہیں منعم کی نعمت کا تصور اور یہ پہچاننا کہ یہ نعمت اس کی طرف سے ہے یہی عین شکر ہے۔ چنانچہ حضرت داؤد ؑ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا معبود میں تیرا شکر کیونکر ادا کروں، کیونکہ نعمت کا شکر ادا کرنا یہ خود دوسری نعمت ہے اس کا شکر ضروری ہے اس کے جواب میں خدا نے اس کی طرف وحی فرمائی (اے داؤد) جب تم نے یہ سمجھ لیا کہ جو بھی نعمت تم کو ملتی ہے وہ خدا کی طرف سے ہے تو تم نے میرا شکر ادا کر دیا۔ ۳۴

راقم (امام خمینی ؒ) کہتا ہے محققین نے جو کچھ بھی ذکر کیا ہے وہ مسامحے پر مبنی ہے کیونکہ محض قلب سے معرفت اور زبان سے اظہار اور اعضاء و جوارح سے عمل کا نام شکر نہیں ہے، بلکہ شکر ایک ایسی حالت نفسانیہ ہے کہ "منعم اور نعمت کی معرفت اور اس بات کی معرفت کہ یہ نعمت منعم کی طرف سے ہے" وہ حالت ان باتوں کے اثر سے پیدا ہوتی ہے اور اس کا ثمرہ دل اور جسم سے تعلق رکھنے والے اعمال ہیں۔ چنانچہ بعض محققین نے تقریباً یہی بات کہی ہے اگرچہ ان کا قول بھی مسامحہ سے خالی نہیں ہے۔ انہوں نے کہا ہے تو

وفعل ونیت سے نعمت کا مقابلہ کرنا شکر ہے اور اس کے تین ارکان ہیں

پہلا رکن منعم اور اس کے مناسب صفات کی معرفت، اور نعمت کی اس حیثیت سے معرفت کہ وہ نعمت ہے اور یہ معرفت اس وقت تک کامل نہیں ہوتی جب تک یہ نہ جان لے کہ تمام ظاہری ومخفی نعمتیں خدا کی طرف سے ہیں اور وہی ذات مقدس منعم حقیقی ہے اور واسطہ جو بھی ہوں وہ سب اس کے حکم کے مطیع وتابع ہیں۔

دوسرا رکن وہ حالت جو اس معرفت کا ثمرہ ہے، یعنی خضوع وخشوع اور نعمت پر اس اعتبار سے خوشی کا اظہار کہ یہ ایک تحفہ ہے جو منعم کی عنایت پر دلالت کرتا ہے اور اس کی پہچان یہ ہے کہ دنیا کی جو چیز قرب حق کی موجب ہو اس کے علاوہ کسی بھی چیز پر خوش نہ ہو۔

تیسرا رکن وہ عمل ہے جو اس حالت کا ثمرہ ہوا کرتا ہے اس لئے کہ جب یہ حالت دل میں پیدا ہوتی ہے تو اس سے نزد خدا نزدیک ہونے کا سبب بننے والے عمل کی نسبت خوشی ومسرت کی ایک حالت پیدا ہوتی ہے اور وہ عمل قلب وزبان اور تمام دیگر اعضا سے متعلق ہوتا ہے

اور عمل قلب سے مراد منعم کی تعظیم، حمد وثنا اور تمجید کا قصد اور اس کے صنائع وافعال اور مہربانی کے آثار میں غور وفکر کرنا اور اس کے تمام بندوں پر خیر واحسان کرنے کا قصد ہے، اور عمل زبان سے مراد حمد وثنا، تمجید وتسبیح اور تہلیل کے ذریعے اظہار کرنا اور امر بہ معروف ونہی از منکر کرنا وغیرہ ہے۔ جہاں تک اعضا وجوارح کے عمل کا تعلق ہے خدا کی طاعت وعبادت میں ظاہری وباطنی نعمتوں کا استعمال اور گناہ اور خدا کی مخالفت سے بچنے کیلیے ان نعمتوں سے استعانت کرنا ہے۔ مثلاً آنکھوں کو اس کی مصنوعات کے مطالعے اور قرائت قرآن میں اور انبیاء واوصیا علیہم السلام سے منقول علوم کے تذکر میں استعمال کرنا اسی طرح دیگر اعضا وجوارح۔

مذکورہ محقق کے قول کا ترجمہ یہاں پر ختم ہوا۔

تیسری فصل: کیفیت شکر

یہ جان لو کہ عبودیت وبندگی کے لازمی فرائض میں سے ایک ہر شخص کی طرف سے خدا وند عالم کی ظاہری وباطنی نعمتوں کا حتی المقدور بہترین ممکن صورت سے شکر ادا کرنا ہے۔ اگرچہ خدا کا شکر کسی بھی مخلوق سے ناممکن ہے۔ بس انتہائے شکر یہ ہے کہ انسان یہ سمجھ لے کہ ہم اس کا حق شکر ادا نہیں کر سکتے۔ جیسے کہ انتہائے عبودیت بھی یہی ہے آدمی کو یہ معرفت حاصل ہو جائے کہ ہم اس کا حق بندگی ادا نہیں کر سکتے۔ چنانچہ خود

آنحضرتؐ نے اپنی عاجزی کا اعتراف کیا ہے۳۶؎ حالانکہ کائنات کا کوئی موجود حضور سرور کائناتؐ کی طرح نہ خدا کی بندگی کرسکتا ہے نہ اس کا شکر بجا لاسکتا ہے۔ اس لئے کہ شکر کا کمال یا نقص معرفت منعم اور اس کی نعمتوں کی پہچان کے کمال ونقص کا تابع ہے۔ اس لئے کوئی بھی حق شکر ادا نہیں کرسکتا۔

انسان اسی وقت بندۂ شاکر بن سکتا اور حق شکر ادا کرسکتا ہے جب وہ خلق کے حق سے ربط کو اور رحمت حق کے پھیلاؤ کو ابتدائے ظہور سے اختتام تک نعمتوں کے باہمی ربط اور وجود کی بقا اور تبدیلی کو کما حقہ جانتا ہو اور یہ علم ومعرفت خدا کے خالص اولیا میں سب سے افضل واشرف ذات مقدس ختمی مرتبتؐ کے علاوہ کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ رہے باقی لوگ تو وہ اس کے بعض مراتب، بلکہ بیشتر واعلی مراتب سے محجوب ہیں، بلکہ جب تک بندے کے قلب کے دروازے تک مرتبۂ الوہیت کی حقیقت اپنا نقش نہ ثبت کردے اور اس بات پر ایمان نہ لائے کہ ﴿لا مؤثر فی الوجود الا اللہ﴾ "وجود میں خدا کے سوا کوئی موثر نہیں ہے" اس کے دل میں شرک وشک کی کدورت رہے گی اور وہ شکر حق کو کما حقہ انجام نہیں دے سکتا۔ جس شخص کی نظر اسباب پر ہو، جو موجودات کی تاثیر کو مستقل جانتا ہو، جو نعمتوں کو ولی نعمت اور اس کے مالک تک نہ پہنچائے وہ خدا کی نعمتوں کا کفران کرتا ہے۔ وہ تو بت پرست ہوتے ہوئے ہر ایک بت کو موثر سمجھتا ہے اور کبھی اعمال کو اپنی طرف منسوب کرتا، بلکہ اپنے کو تمام امور میں با اختیار سمجھتا ہے۔ (وہ) کبھی عالم کون کے طبایع کو موثر کہتا ہے۔ کبھی نعمتوں کو ان کے اسباب ظاہری صوری کی طرف منسوب کرتا ہے۔ (وہ) حق کو تصرف سے عاری سمجھتا اور خدا کے ہاتھ کو بندھا ہوا خیال کرتا ہے ﴿غلت ایدیھم ولعنوا بما قالوا﴾۳۷؎ "انہیں کے ہاتھ بندھے ہیں اور ان کے (اس) کہنے پر خدا کی پھٹکار" خدا کا دست تصرف کھلا ہوا ہے اور پورا دائرۂ وجود در حقیقت اسی کا ہے دوسرے کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے، بلکہ تمام عالم ظہور وقدرت ونعمت اسی سے ہے اور اس کی رحمت ہر چیز کو شامل ہے، ساری نعمتیں اسی کی ہیں، کسی کی بھی کوئی نعمت نہیں ہے کہ وہ منعم ہو، بلکہ کائنات اسی کی ہے دوسروں کی کوئی ہستی نہیں ہے کہ اس کی طرف کوئی چیز منسوب ہو، لیکن آنکھیں اندھی ہیں، کان بہرے ہیں اور دلوں پر غلاف چڑھے ہیں "دیدہ محو ہم سبب سوراخ کن"۳۸؎

آخر ہمارے مردہ قلوب کب تک اور کس حد تک پروردگار کی نعمتوں کا انکار کرتے رہیں گے، عالم اور وضع عالم اور اس کے تشخصات سے وابستہ رہیں گے؟ یہ تعلقات اور توجہات ذات مقدس کی نعمتوں کا کفران ہیں اور اس کی رحمتوں کو چھپانا ہے۔ اسی سے پتہ چل جاتا ہے کہ خدا کے شکر کا حق ادا کرنا ہر شخص کا

کامنہیں ہے جیسا کہ خود خداوند عالم کا ارشاد ہوتا ہے ﴿وَقَلِيلٌ مِنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ﴾ ۳۹ ''اور میرے بندوں میں شکر کرنے والے بندے کم ہیں'' اسی لئے حق شکر ادا کرنے والے بندے کم ہیں۔

یہ بھی جان لینا چاہئے جس طرح بندوں کی معرفتیں مختلف ہیں ان کے شکر بھی مختلف ہیں۔ دوسری طرح یوں سمجھئے ایک دوراعتبار سے شکر کے مراتب مختلف ہیں، کیونکہ شکر کا مطلب منعم کی نعمتوں کی تعریف کرنا ہے۔ ب اگر وہ نعمت از قسم نعمت ظاہری ہے تو اس کا ایک شکر ہے، ور گر باطنی نعمت ہے تو اس کا شکر دوسری طرح کا ہے ور اگر وہ نعمت علوم ومعارف میں سے ہے تو اس کا شکر دوسری طرح ہے اور، گر از قسم تجلیات سمائی ہے تو اس کا شکر دوسری طرح کا ہے اور، گر تجلیات ذاتیہ احدیہ میں سے ہے تو اس کا شکر یک اور طرح ہے اور چونکہ نعمتوں کے تمام مراتب بہت ہی کم بندوں میں یکجا ہوتے ہیں لہذا تمام مراتب کا شکر کما حقہ ادا کرنا بہت ہی کم بندوں کیلئے ممکن ہے اور وہ خدا کے خاص ترین بندے ہیں جو تمام حضرات اور برزخ برزخ کے جامع ور تمام مراتب ظاہرہ وباطنہ کے حافظ ہیں۔ سی لئے ن کا شکر تمام ظاہری وباطنی مخفی زبانوں سے ہوتا ہے۔

علما نے گرچہ شکر کیلئے کہا ہے کہ وہ مقامات عامہ میں سے ہے اس لئے کہ منعم کی جزا دینے کے دعویٰ سے ملا ہوا ہے اگرچہ یہ ایک قسم کی بے دلی ہے، لیکن یہ دعوے مقارنت غیر اولیا کیلئے ہے۔ بالخصوص ان کیلئے تو ہرگز نہیں ہے جو کامل ترین ہیں اور جامع حضرت اور مقام کثرت ووحدت کے حافظ ہیں۔ اسی لئے شیخ عارف خواجہ انصاریؒ نے باوجود اس کے کہ انہوں نے کہا ہے ''شکر مقامات عامہ میں سے ہے'' فرمایا ﴿والدرجة الثالثة أن لا يشهد العبدُ الاّ المُنعم فاذا شهد المُنعم عُبودةً، استعظم منهُ لنعمه، واذا شهدهُ حبّاً استحلى منهُ الشدّة، واذا شهدهُ تفريداً لَم يشهد منهُ نعمةً ولا شدّةً﴾ ۴۰

''شکر کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ بندہ جناب منعم کے علاوہ کسی اور چیز کا مشاہدہ نہ کرے اور اس کے شہود جمالی میں ڈوبا رہے اور اس کے تین مقام ہیں

پہلا مقام اس کا مشاہدہ اس طرح کرے جس طرح بندہ ذلیل اپنے آقا کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس مرتبے پر پہنچ کر بندہ اپنے سے غافل ہوجاتا اور دب حضوری میں ڈوب جاتا ہے اپنے لئے کسی قدر ومرتبے کا قائل نہیں ہوتا اور جب وہ اپنے کو حقیر سمجھتا ہے تو اگر کوئی نعمت اس کو مل جائے تو اس کو بہت ہی عظیم ورا پنے کو حقیر اور اس کیلئے اہل نہیں سمجھتا۔

دوسرا مقام: اس کا مشاہدہ اس طرح ہوتا ہے جیسے دوست، دوست کا مشاہدہ کرتا ہے اس مرتبے پر پہنچ کر انسان جمال محبوب میں مستغرق ہو جاتا ہے اور اس کی طرف سے جو ملے وہ اس سے جو دیکھے اس سے محبت کرتا اور اس سے لذت حاصل کرتا ہے چاہے اس میں شدت و زحمت کیوں نہ ہو۔

تیسرا مقام: اسمائی تعینات کے بغیر انفرادی حالت میں مشاہدہ کرتا ہے، بلکہ وہ مشاہدۂ نفس ذات کرتا ہے۔ اس مرتبے پر پہنچ کر انسان اپنے اور پرائے سے غافل ہو جاتا ہے اور ذات حق کے علاوہ اس کا کوئی مشہود نہیں ہوتا نہ وہ نعمت کو دیکھتا ہے نہ شدت کو۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ اوائل مقامات میں سے سالک کا ہر مقام عام لوگوں کیلئے ہوتا ہے مگر آخری مقامات صرف خاص ترین، بلکہ کامل سے کامل ترین بندوں کیلئے مخصوص ہوتا ہے۔

تکملہ

احادیث میں شکر کی فضیلت

ہم اس مقام کو شکر کی بعض حدیثوں کو ذکر کر کے مکمل کریں گے

الکافي باسناده عن أبي عبد الله علیه السلام، قال: قال رسول الله صلی الله علیه وآله: ﴿الطّاعِمُ الشّاكِرُ لَهُ مِنَ الأجرِ كَأجرِ الصّائمِ المُحتَسِبِ والمُعافي الشّاكِرُ لَهُ مِنَ الأجرِ كَأجرِ المُبتَلى الصّابرِ والمُعطى الشّاكِرُ لَهُ مِنَ الأجرِ كَأجرِ المَحرُومِ القانع﴾ [۱] ''حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت کی گئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا رسول خداؐ نے ارشاد فرمایا کھانے کے بعد شکر کرنے والے کا اجر اس روزہ دار کے اجر کی طرح ہے جو راہ خدا میں روزہ رکھے اور جو عافیت وسلامتی کی حالت میں خدا کا شکر کرے اس کا اجر اس شخص کی طرح ہے جو (کسی امتحان میں) مبتلا ہو اور (اس ابتلا پر) صبر کرے اور نعمت ملنے کے بعد اس پر شکر کرنے والے کا اجر اس شخص کی طرح ہے جو عطا سے محروم ہو (مگر) اس بات پر قانع اور راضی ہو جو اس کو خداوند عالم نے دیا ہے''۔

وباسناده عن عبد الله بن الوليد، قال: سمعتُ أبا عبد الله علیه السلام يقول: ﴿ثلاثٌ لا يضرُّ معهنّ شيءٌ: الدُّعاءُ عندَ الكَربِ والاستغفارُ عندَ الذَّنبِ والشُّكرُ عندَ النِّعمة﴾ [۲] ''راوی کہتا ہے میں نے امام جعفر صادقؑ کو فرماتے ہوئے سنا تین باتیں ایسی ہیں جن کے ساتھ کوئی چیز ضرر نہیں پہنچا سکتی کرب (ومصیبت) کے وقت دعا کرنا، گناہوں پر استغفار کرنا اور نعمت پر شکر کرنا''۔

وباسناده عن ابي بصير، قال، قال ابو عبد الله علیه السلام ﴿انّ الرّجل منكم ليشرب الشّربة من الماء فيوجب الله له بها الجنّة ثمّ قال انّه ليأخذ الاناء فيضعه على فيه فيسمّي ثمّ يشرب فينحّيه وهو يشتهيه فيحمد الله ثمّ يعود فيشرب ثمّ ينحّيه فيحمد الله ثمّ يعود فيشرب ثمّ ينحّيه فيحمد الله فيوجب الله عزّ وجلّ بها له الجنّة﴾ ۴۳ "امام جعفر صادقؑ نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص تھوڑا سا پانی پیتا ہے اور اس کی وجہ سے خدا اس پر جنت واجب کر دیتا ہے۔ اس کے بعد فرمایا وہ شخص پانی پینے کا ظرف اٹھا کر منہ سے لگاتا ہے اور بسم اللہ کہہ کر تھوڑا سا پانی پی کر ظرف کو الگ کر دیتا ہے حالانکہ ابھی اس کو پیاس لگی ہے پھر الحمد للہ کہتا ہے اور پلٹ کر پانی پیتا ہے پھر ظرف کو الگ کر کے حمد خدا کرتا ہے اور پھر دوبارہ تھوڑا سا پانی پی کر ظرف کو الگ کر دیتا ہے اور پھر پلٹ کر پانی پیتا ہے پھر حمد کرتا ہے۔ پس خدا اس (طرح پانی پینے کی) وجہ سے اس پر جنت واجب کر دیتا ہے۔"

اور حمد خدا شکر کے مساوی ہے جیسا کہ بہت سی روایات میں ہے کہ جس نے الحمد للہ کہا اس نے خدا کا شکر ادا کر دیا۔ چنانچہ کافی شریف میں عمر بن یزید سے مروی ہے قال سمعت ابا عبد الله علیه السلام يقول ﴿شكر كلّ نعمة وان عظمت ان تحمد الله عزّ وجلّ عليها﴾ ۴۴ "میں نے امام جعفر صادقؑ کو فرماتے ہوئے سنا ہر نعمت کا شکر خواہ وہ کتنی ہی عظیم ہو الحمد للہ کہنا ہے۔"

وباسناده عن ابي عبد الله علیه السلام قال ﴿شكر النّعمة اجتناب المحارم وتمام الشّكر قول الرّجل الحمد لله ربّ العالمين﴾ ۴۵ "امام ششمؑ نے فرمایا نعمت کا شکر محرمات سے پرہیز کرنا ہے اور مکمل شکر شخص کا ﴿الحمد لله ربّ العالمين﴾ کہنا ہے۔"

وباسناده عن حماد بن عثمان قال خرج ابو عبد الله علیه السلام من المسجد وقد ضاعت دابّته، فقال ﴿لئن ردّها الله عليّ لاشكرنّ الله حقّ شكره قال فما لبث ان اتي بها فقال الحمد لله فقال له قائل جعلت فداك، أليس قلت لاشكرنّ الله حقّ شكره؟ فقال ابو عبد الله علیه السلام الم تسمعني قلت الحمد لله﴾ ۴۶ "حماد بن عثمانؒ کہتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ مسجد سے باہر نکلے جب کہ حضرت کی سواری کا جانور گم ہو گیا تھا تو آپؑ نے فرمایا اگر خدا نے میرے جانور کو واپس کر دیا تو میں اس کا شکر اس طرح ادا کروں گا جو شکر کرنے کا حق ہے۔ راوی کہتا ہے تھوڑی ہی دیر میں وہ جانور لایا گیا تو حضرت نے کہا ﴿الحمد لله﴾ اس پر ایک شخص نے کہا میں آپ پر

قربان! کیا آپ نے نہیں فرمایا تھا میں اس کا شکر اس طرح ادا کروں گا جو شکر کرنے کا حق ہے؟ حضرتؐ نے فرمایا کیا تم نے نہیں سنا کہ میں نے ﴿اَلْحَمْدُلِلّٰہِ﴾ کہا تھا"۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ شکر رسانی کی افضل ترین طریقہ حمد الٰہی ہے اور شکر کے آثار میں سے نعمت میں اضافہ ہے جیسے کہ خود قرآن میں ہے ﴿لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ﴾ ہے۔ "اگر تم نے (میرا) شکر کیا تو میں اور زیادہ دوں گا"۔

کافی شریف میں حضرت صادقؑ سے منقول ہے ﴿مَنْ اُعْطِیَ الشُّکْرَ اُعْطِیَ الزِّیَادَۃَ، یَقُوْلُ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ﴾ "جو شکر کرے گا اس کو زیادہ (نعمتیں) ملیں گی (کیونکہ) خدا کا کہنا ہے: اگر تم نے شکر کیا تو میں اور زیادہ کروں گا"۔

تلمیم

چونکہ (ام المومنین) عائشہ کو یہ خیال تھا کہ عبادت کا دار عذاب کے خوف یا گناہوں کے مٹانے میں منحصر ہے نیز ان کا یہ بھی خیال تھا کہ آنحضرتؐ کی عبادت بھی دوسرے لوگوں کی طرح ہے اس لئے (رسول خداؐ کی کثرت عبادت کو دیکھ کر آنحضرتؐ پر) اعتراض کیا کہ آپؐ اپنے کو کیوں اتنی زحمت و مشقت میں ڈالتے ہیں؟ ان کا یہ اعتراض عبادت و عبودیت کی عظمت سے جہالت کی بنا پر تھا۔ عظمت نبوت و رسالت سے ناواقف ہونے کی بنا پر ان کو یہ (بھی) نہیں معلوم تھا کہ غلاموں اور مزدوروں کی عبادت اور آزادلوگوں کی عبادت یعنی آنحضرتؐ کی عبادت میں فرق ہے۔ خدا کی عظمت اور غیر متناہی نعمتوں کے شکر نے حضرتؐ سے راحت و آرام کو بہت دور کر دیا تھا، بلکہ خاص ترین اولیا کی عبادت محبوب کی بے پایاں تجلیات کا نقشہ ہے۔ چنانچہ نماز معراج ۹۳ میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ حضرات اولیا محو جمال وجلال ہوئے اور اپنے کو صفات و ذات میں فنا کر دیئے کے باوجود عبودیت کی کسی منزل و مرحلے سے غفلت نہیں برتتے ہیں۔ ان کے بدن کی حرکات ان کی عشقی و روحانی حرکتوں کی تابع ہے اور وہ تابع جمال محبوب کے ظہور کی کیفیت (کا نام) ہے لیکن عائشہ جیسے لوگوں کو صرف مطمئن کرنے کیلئے یہی جواب دیا جا سکتا تھا اس لئے رسول اکرمؐ نے پست ترین منزل کو بیان کرتے ہوئے بتایا کہ آنحضرتؐ کی عبادت ان پست قسم کے امور کیلئے نہیں ہے۔

چوتھی فصل

رَوَىٰ عَلِيُّ بْنُ اِبْرَاهِيمَ فِي تَفْسِيرِهِ، بِاِسْنَادِهِ عَنْ اَبِي جَعْفَرٍ وَاَبِي عَبْدِاللهِ، عَلَيْهِمَا السَّلَامُ، قَالَا: ﴿ كَانَ رَسُولُ اللهِ اِذَا صَلَّى قَامَ عَلَى اَصَابِعِ رِجْلَيْهِ حَتَّى تَوَرَّمَتْ، فَاَنْزَلَ اللهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَىٰ ﴿طٰـهٰ﴾ بِلُغَةِ طَيٍّ يَا مُحَمَّدُ! مَا اَنْزَلْنَا ... الآيَة﴾ ۵۰ ''علی ابن ابراہیمؒ نے اپنی تفسیر میں امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے کہ ان حضرات نے فرمایا رسولخداؐ نماز پڑھتے ہوئے اپنے دونوں پیروں کی انگلیوں پر کھڑے ہوجاتے تھے یہاں تک کہ ان میں ورم آگیا۔ پس خدا نے یہ آیت نازل فرمائی ﴿طٰـہٰ﴾ اور وہ لغت بنی طی میں بمعنی ''اے محمدؐ'' ہے۔

وَعَنِ الصَّدُوقِ فِي مَعَانِي الأَخْبَارِ بِاِسْنَادِهِ، عَنْ سُفْيَانَ الثَّوْرِيِّ، عَنِ الصَّادِقِ علیہ السلام فِي حَدِيثٍ طَوِيلٍ قَالَ فِيهِ ﴿وَاَمَّا ﴿طٰـهٰ﴾ فَاسْمٌ مِنْ اَسْمَاءِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ، وَمَعْنَاهُ: يَا طَالِبَ الْحَقِّ الْهَادِي اِلَيْهِ﴾ ۵۱ ''امام جعفر صادقؑ سے ایک طویل حدیث میں سفیان ثوریؒ نے روایت کی ہے کہ ﴿طٰـہٰ﴾ رسولخداؐ کے اسمائے گرامی میں سے ایک اسم ہے اور اس کا مطلب ہے اے حق کے طالب اور حق کی طرف ہدایت کرنے والے''۔

ابن عباسؓ ۵۲ اور بعض عامہ سے منقول ہے ﴿طٰـہٰ﴾ کے معنی ''اے مرد'' کے ہیں۔ ۵۳

بعض علمائے عامہ سے منقول ہے ''طاء'' سے اشارہ ہے کہ آنحضرتؐ کا قلب غیر خدا سے طاہر ہے اور ''ھ'' سے اشارہ ہے کہ حضورؐ کے قلب کی ہدایت خدا کی طرف ہوئی ہے۔ ۵۴

یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''طاء'' طرب اہل بہشت کی طرف اشارہ ہے اور ''ھ'' سے مراد ہوان (ذلت) اہل جہنم ہے۔ ۵۵

علامہ طبرسیؒ ۵۶ نے فرمایا حسن سے منقول ہے کہ انہوں نے ﴿طٰـہٰ﴾ قرائت کی ہے۔ اگر یہ قرائت ان سے صحیح ہے تو ''طہ'' کی اصل ''طأ'' تھی ہمزہ کو ''ھا'' سے بدل دیا گیا ہے اور اس کا مطلب ہے ''اپنے دونوں پیروں سے زمین کو روندو''۔ ۵۷

خلاصہ یہ ہے کہ جو حروف مقطعات سورتوں کے شروع میں آئے ہیں ان کی تفسیر میں شدید اختلاف ہے اور جو بات اعتبار سے زیادہ موافق ہے وہ یہ ہے کہ یہ حبیب و محبوب کے درمیان کچھ اشارے ہیں جن کو

کوئی بھی نہیں جانتا اور بعض مفسرین نے اپنے حد اور اندازہ سے جو بات کی ہے ان کا کوئی منبع وماخذ نہیں ہے۔ سفیان ثوری کی حدیث میں بھی رمز ہونے کی طرف اشارہ ہے ۵۸ اور یہ کوئی بعید بھی نہیں ہے کہ کچھ ایسی چیزیں ہوں جو فہم بشر سے خارج ہوں اور خداوند عالم نے اس سے مخصوص لوگوں کو مخاطب کیا ہو۔ جیسے کہ متشابہ کا وجود بھی سب کیلئے نہیں ہے، بلکہ صرف وہ لوگ تاویل جانتے ہیں۔

شقا اور شقاوت (یہ دونوں) سعادت کے متضاد ہیں اور اس کا مطلب رنج ومشقت ہے جوہری نے کہا ﴿الشقاءُ والشّقاوةُ، بالفتح، نقیض السّعادة﴾ "شقا اور شقاوت (شین کے فتحہ کے ساتھ) سعادت کی ضد ہے"۔

روی الطّبرسیُّ في الاحتجاج عن موسی بن جعفرٍ علیہ السلام عن آبائه علیهم السّلام قال قال امیرُ المؤمنین علیہ السلام ولقد قام رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عشر سنین علی اطراف اصابعه حتّی تورّمت قدماهُ واصفرّ وجههُ یقومُ اللّیل اجمع حتّی عوتب في ذلک، فقال اللہُ عزّ وجلّ ﴿طٰـــه ☆ ما انزلنا علیک القرآن لتشقی ☆ بل لتسعد به﴾ ۵۹ "علامہ طبرسیؒ نے احتجاج میں حضرت علیؑ سے روایت کی ہے کہ حضرتؑ نے فرمایا رسولخداؐ دس سال تک (عبادتوں میں) اپنی انگلیوں کے سرے پر کھڑے رہتے تھے یہاں تک کہ آپؐ کے قدم مبارک پر ورم آگیا اور چہرے کا رنگ زرد ہوگیا۔ تمام رات کھڑے رہتے تھے یہاں تک کہ خدا نے اس سے روکا اور فرمایا ﴿طٰـــه ☆ ما انزلنا علیک القرآن لتشقی ☆ بل لتسعد به﴾ "اے میرے حبیب وطاہر! ہم نے قرآن اس لئے نہیں نازل کیا ہے کہ آپ رنج والم میں مبتلا ہو جائیں ہم نے تو اس لئے نازل کیا ہے کہ آپ کو سعادت نصیب ہو"

امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ رسول خداؐ عبادت میں اپنے ایک پیر کو اٹھا لیتے تھے تاکہ زحمت ومشقت زیادہ ہو جائے۔ پس خداوند عالم نے اس آیۂ شریفہ کو نازل کیا۔ ۶۱

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت مشرکین کا جواب ہے جو کہا کرتے تھے ہمارا دین چھوڑ دینے کی وجہ سے رسول زحمت میں پڑ گئے تو خدا نے یہ آیت نازل فرمائی۔ ۶۲

شیخ عارف کامل شاہ آبادی (م طہ) کہا کرتے تھے کہ جب رسولخداؐ نے ایک مدت تک لوگوں کو دعوت دی اور اس کا اثر اتنا نہ ہوا جتنا حضورؐ چاہتے تھے تو حضرتؐ کو خیال ہوا کہ ہو سکتا ہے آپؐ کی دعوت میں کوئی نقص ہو لہٰذا آپؐ ریاضت میں مشغول ہو گئے اور دس سال تک ایسی ریاضت کی کہ پیروں پر

ورم آ گیا۔ اس وقت آیہ مبارک نازل ہوئی کہ اپنے کو مشقت میں مت ڈالو۔ تم طاہر و ہادی ہو۔ تمہارے اندر کوئی نقص نہیں ہے، بلکہ نقص لوگوں میں ہے ﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ﴾ [۲۳] "بے شک تم جسے چاہو منزل مقصود تک نہیں پہنچا سکتے"۔

بہر صورت آیت سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرتؐ ریاضت و زحمت و مشقت برداشت کرتے تھے۔ مفسرین کے مجموعہ کلام سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے اگرچہ اس کی کیفیت میں اختلاف ہے اور یہ امت کیلئے سبق ہے خصوصاً ان اہل علم کیلئے جو دعوت الی اللہ دینا چاہتے ہیں۔ حضور سرور کائناتؐ اپنی طہارت قلب اور کمال کے باوجود اتنی ریاضت کرتے تھے کہ آیت نازل ہوئی اور ہم اپنے ان تمام گناہوں اور خطاؤں کے باوجود کبھی بھی اپنے انجام اور قیامت کے بارے میں غور نہیں کرتے۔ معلوم ہوتا ہے جیسے ہم کو عذاب جہنم سے آزادی کا پروانہ اور عذاب سے امن نامہ مل گیا ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ حب دنیا نے ہمارے کانوں میں روئی ٹھونس دی ہے جس کی وجہ سے ہم انبیاءؑ اور اولیاء کے اقوال نہیں سنتے۔

توضیحات (۲۱)

۱۔ اصول کافی، ج۲، ص۹۵، کتاب الایمان والکفر، باب الشکر، حدیث ۹

۲۔ سورہ طہ، آیت/۲۱

۳۔ سورہ فتح، آیت/۲۷

۴۔ علامہ مجلسی نے مجمع البیان سے [illegible] سورہ فتح کی آیت کی تفسیر میں اس [illegible] ہے

بحار الانوار، ج۲۰، ص۳۶۰، تاریخ نبیؐ، باب ۱۵۔

۵۔ مفضل [illegible] مستدرک [illegible]

۶۔ سورۂ نساء، آیت/۹۷۔

۷۔ سورۂ نساء، آیت/۹۸۔

۸۔ بحار الانوار، ج۴۴، ص۴، کتاب الامامۃ، باب۲۳، حدیث ۱۱، امام صادقؑ سے منقول ہے: ﴿[illegible]

الشابعون وبعض لاحقون﴾۔

۹۔ بحار الانوار، ج۱۶، ص۳۰۴، تاریخ نبیؐ، باب ۲، حدیث

۱۰۔ غوالی اللئالی، ج۳، ص۹۹، دوسرا حصہ، حدیث ۱۳۰

بحار الانوار، ج۵، ص۲۳، تاریخ نبیؐ، باب، حدیث ۴۴

۱۱۔ عیون اخبار الرضاؑ، ج، ص۲۶۳۔

۱۲۔ بحار الانوار، ج۲۶، ص۲۴۷، کتاب الامامۃ، باب ۴، حدیث ۱۴۔

۱۳۔ علم الیقین، ج۱، ص۳۸۱، فی صفات الامام۔

۱۴۔ التوحید، ص۱۵۰، باب تفسیر قول اللہ عزوجل ﴿کُلُّ شَیءٍ هالِکٌ اِلّا وَجهَه﴾ حدیث ۴

۱۵۔ رسول اللہؐ نے فرمایا: میں درخت کی جڑ ہوں، علیؑ اس کا تنا اور ائمہؑ اس کی شاخیں ہیں، ہمارا علم اس کا پھل اور

ہمارے شیعیان اس کے پتے ہیں

بحار الانوار، ج۲۳، ص۱۳۸، کتاب الامامۃ، باب ۷، حدیث ۳۔

۱۶۔ علم الیقین، ج۲، ص۱۰۸۹، المقصد الرابع فی الخلود۔

۱۷۔ سورۂ ضحٰی، آیت/۵

۱۸۔ مجمع البیان، سورۂ ضحیٰ، ذیل آیہ ۵۔

۱۹۔ علی بن حسین بن موسیٰ معروف بہ "سید مرتضیٰ علم الہدیٰ" (۳۵۵-۴۳۶ھ ق) اکابر علمائے شیعہ و اسلام میں سے تھے۔ علوم عقلی و نقلی کے جامع اور صاحب کمالات و صاحب فضائل تھے۔ کلام، فقہ، اصول، تفسیر، حدیث، رجال اور ادبیات میں متبحر تھے۔ شیخ مفید" اور حسین بن علی بن بابویہ" اور دوسروں سے روایت کرتے تھے۔ بہت بڑے بڑے علما آپ کے شاگرد تھے جن میں سرفہرست شیخ طوسی" ہیں۔ آپ کی تصنیفات بہت ہیں، مثلاً امالی، ذریعہ الی اصول الشیعہ، الناصریات، انتصار، شافی وغیرہ۔

۲۰۔ تنزیہ الانبیاء، ص ۱۱۵ تا ۱۱۸۔

۲۱۔ وجوہ مذکورہ کو سید مرتضیٰ" نے تنزیہ الانبیاء میں، طبرسی" نے مجمع البیان میں اور مجلسی" نے بحار الانوار، ج ۱۷، ص ۷۳ و ۷۴ میں ذکر کیا ہے۔

۲۲۔ سورۂ ص، آیت ۵/۷۔

۲۳۔ بحار الانوار، ج ۷، ص ۸۹-۹۰، تاریخ نبینا، باب ۵، حدیث ۲۰۔
عیون اخبار الرضا"، ج ۱، ص ۲۰۲، باب ۱۵، حدیث ۱۔

۲۴۔ سورۂ صف، آیت ۱۲/۱۔

۲۵۔ ترجمہ گزر چکا ہے۔

۲۶۔ سورۂ نصر، آیت ۱۔

۲۷۔ حدیث ۹، حاشیہ ۱۔

۲۸۔ امام جعفر صادق" سے فرمایا ہے: آنحضرت" کی قسم تھی لا واستغفر اللہ کی۔
مکارم الاخلاق، ص ۳۱۳، الباب العاشر، الفصل الثانی، استغفار والبکاء۔

۲۹۔ مجمع البیان، سورۂ نصر کی تفسیر کے ذیل میں۔

۳۰۔ حسین بن محمد بن مفضل معروف بہ "راغب اصفہانی" (متوفی ۵۰۲ یا ۵۶۵ھ ق) آپ لغت، شعر، کلام اور علوم قرآنی میں بہت ماہر تھے۔ آپ کی تصانیف بہت ہیں جن میں المفردات، الذریعہ الی مکارم الشریعہ، مقدمہ تفسیر قرآن، تحقیق البیان فی تاویل القرآن مشہور ہیں۔

۳۱۔ مفردات فی غریب القرآن، ص ۲۶۵، شکر کے ذیل میں۔

۳۲۔ حدیث ۲، حاشیہ ۳۰۔

۳۳۔ منازل السائرین، ص ۴۱، قسم الاخلاق، باب الشکر۔

۳۴۔ شرح منازل السائرین، ص ۹۱، قسم الاخلاق، باب الشکر۔

۳۵۔ محجۃ البیضاء، ج ۷، ص ۱۴۳ بیان حد الشکر وحقیقتہ

۳۶۔ حدیث ۲، حاشیہ ۲۲

۳۷۔ سورۂ مائدہ آیت ۶۴۔

۳۸۔ دوسرا مصرعہ یہ ہے تا جب در بر کند رنج ... (مولانا روم)

۳۹۔ سورۂ سبا، آیت ۱۳

۴۰۔ منازل السائرین، ص ۱۴، قسم الاخلاق، باب الشکر

۴۱۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۹۴، کتاب ایمان و کفر، باب الشکر، حدیث

۴۲۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۹۵، کتاب ایمان و کفر، باب الشکر، حدیث ۱۰، اس کتاب میں علل الدواب کی بجائے "عمد الدواب" آیا ہے۔

۴۳۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۹۶ و ۹۷، کتاب ایمان و کفر، باب الشکر، حدیث ۱۹۔

۴۴۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۹۵ کتاب ایمان و کفر، باب الشکر، حدیث ۱۱۔

۴۵۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۹۵، کتاب ایمان و کفر، باب الشکر، حدیث ۱۰

۴۶۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۹۷، کتاب ایمان و کفر، باب الشکر، حدیث ۱۸۔

۴۷۔ سورۂ ابراہیم، آیت ۷۔

۴۸ اصول کافی، ج ۲، ص ۹۵، کتاب ایمان و کفر، باب الشکر، حدیث ۸۔

۴۹ حدیث معراج میں ہے

﴿ثم ضع يديك واجعلهما على ركبتيك فانظر الى عرشي قال رسول الله ﷺ فنظرت الى عظمة ذهبت لها نفسي وغشي علي فالهمت ان قلت ﴿سبحان ربي العظيم وبحمده﴾ لعظم ما رأيت فلما قلت ذلك تجلى الغشي عني حتى قلتها سبعا﴾ "پھر ہاتھوں کو نیچے کر کے زانو پر رکھو پھر میرے عرش کو دیکھو۔ آنحضرتؐ فرماتے ہیں میں نے ایسی عظمت دیکھی جس سے میری روح فنا ہوگئی اور میں بے ہوش ہوگیا۔ میں نے جس عظمت کو دیکھا تھا اس سے میرے دل میں آیا کہ کہوں ﴿سبحان ربي العظيم وبحمده﴾ جب میں نے یہ کہا تو ہوش آگیا یہاں تک کہ میں نے اس کو بھی زبان پر سات بار دہرایا۔

علل الشرائع ج ۲ ص ۳۱۲ باب ۱ حدیث ۱

۵۰۔ تفسیر علی بن ابراہیم قمیؒ، ص ۴۱۷ سورۂ طٰہٰ۔

۵۱۔ معانی الاخبار، ج ۲۲، باب معنی الحروف المقطعہ۔

۵۲۔ عبداللہ بن عباس بچپنے میں رسولؐ کے مصاحب تھے۔ حضرت علیؑ کے اصحاب میں تھے ان کو ترجمان القرآن، ابن القرآن، حبر الامۃ، رئیس المفسرین اور شیخ المفسرین جیسے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ مشہور مفسرین جو تابعی تھے انہیں

کے شاگرد تھے۔

۵۳ طبرسیؒ نے مجمع البیان میں اس قول کو ابن عباسؓ، سعید بن جبیر، حسن اور مجاہد سے نقل کیا ہے۔

۵۴۔ مجلسیؒ نے اس قول کو قشیری کے حوالے سے سُدّی سے نقل کیا ہے۔ بحار الانوار، ج ۶۸ ص ۲۰۔

۵۵۔ الجامع لاحکام القرآن، قرطبی ج ۱۱ ص ۶۶

۵۶۔ ابو علی فضل بن حسن بن فضل طبرسیؒ (۴۶۲ھ یا ۴۶۸ھ-۵۴۸ یا ۵۵۲ھ ق) چھٹی صدی کے بڑے مفسر و فقیہ تھے شیخ ابو علی فرزند شیخ طوسیؒ اور دوسروں سے روایت کی ہے۔ ابو نصر حسن بن فضل مصنف مکارم الاخلاق، محمد بن علی ابن شہر آشوب "شیخ منتجب الدین" مصنف فہرست، قطب راوندیؒ وغیرہ آپ کے شاگرد تھے۔ آپ کی تفسیروں میں مجمع البیان بہت مشہور ہے۔ آپ کی تصانیف میں جامع الجوامع تفسیر میں، اعلام الوریٰ اور تاج المواليد وغیرہ مشہور ہیں

۵۷۔ مجمع البیان سورۂ طہٰ کی پہلی آیت کی تفسیر۔

۵۸۔ امام صادقؑ نے سفیان ثوری کے جواب میں حروف مقطعہ کے معانی کو اشارات و رموز میں شمار کیا ہے اور فرمایا سورہ بقرہ کی ابتداء میں جو ﴿الـم﴾ ہے اس کا مطلب ﴿انا الله الملک﴾ کے ہیں اور آل عمران میں جو ہے اس کا مطلب ﴿انا الله المجید﴾ ہے

معانی الاخبار ص ۲۲ باب معنی الحروف المقطعہ۔

۵۹ احتجاج ج ۱ ص ۲۰۹ و ۲۲۰، احتجاج امیر المؤمنینؑ علی الیہود

۶۰ احمد بن علی بن ابی طالب طبرسیؒ آپ چھٹی صدی ہجری کے اواخر اور ساتویں صدی ہجری کے اوائل کے مشہور شیعہ عالم، فقیہ، محدث اور مورخ تھے۔ تقریباً ۶۲۰ھ ق میں انتقال فرمایا۔ آپ کی تصانیف میں الکافی فی الفقہ، تاریخ الائمہ، کتاب الفضل، مفاخرۃ الطالبیہ اور احتجاج مشہور ہیں۔

۶۱ مجمع البیان تفسیر آیت ۱، سورۂ طہٰ

۶۲ مجمع البیان میں سورۂ طہٰ کی پہلی آیت کی تفسیر میں حسن بصریؒ سے روایت کی گئی ہے۔

۶۳ سورۂ قصص آیت ۵۶

بائیسویں حدیث

بالسند المتصل الی رکن الاسلام وثقته، محمد بن یعقوب الکلیني، عن محمد بن یحیی، عن احمد بن محمد، عن بعض اصحابه، عن محسن بن علي بن ابي عثمان، عن واصل، عن عبدالله بن سنان، عن ابي عبد الله عليه السلام قال: جاء رجل الی ابي ذرّ فقال:

﴿یا ابا ذرّ ما لنا نکره الموت؟ فقال: لأنّکم عمّرتم الدّنیا واخربتم الآخرة فتکرهون ان تنقلوا من عمرانٍ إلی خراب.

فقال له: فکیف تری قدومنا علی الله؟ فقال: امّا المحسن منکم، فکالغائب یقدم علی اهله، وامّا المسيء منکم، فکالآبق یردّ علی مولاه.

قال: فکیف تری حالنا عند الله؟ قال: اعرضوا أعمالکم علی الکتاب، انّ الله یقول: ﴿انّ الأبرار لفي نعیم ٭ وانّ الفجّار لفي جحیم﴾.

قال: فقال الرّجل: فاین رحمة الله؟ قال: ﴿رحمة الله قریبٌ من المحسنین﴾.

قال ابو عبدالله عليه السلام:

﴿وکتب رجلٌ الی ابي ذرٍّ (رضي الله عنه): یا ابا ذرّ! اطرفني بشيءٍ من العلم. فکتب الیه: انّ العلم کثیرٌ ولکن إن قدرت أن لا تسيء إلی من تحبّه فافعل.

فقال له الرّجل: وهل رایت احداً یسيء الی من یحبّه؟ فقال له: نعم! نفسک احبّ الأنفس الیک، فاذا أنت عصیت الله فقد أسأت الیها﴾.[1]

ترجمہ۔ حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: ایک شخص جناب ابوذرؓ کے پاس آکر کہنے لگا اے ابوذر! آخر ہم موت کو کیوں ناپسند کرتے ہیں؟ ابوذر نے کہا: چونکہ تم نے دنیا کو آباد کیا ہے اور آخرت کو برباد اس لئے آبادی سے ویرانے کی طرف جانے کو ناپسند کرتے ہو۔ اس شخص نے پھر پوچھا خدا کے پاس ہمارا آنا کس طرح ہوگا؟ ابوذر نے کہا: تم میں سے جو اچھے لوگ ہیں وہ تو اس طرح آئیں گے جیسے غائب اپنے عیال کی طرف آتا ہے اور جو برے لوگ ہیں وہ اس طرح آئیں گے جیسے بھاگا ہوا غلام اپنے آقا کے پاس آتا ہے۔ اس شخص نے پھر سوال کیا: خدا کے یہاں ہماری حالت کیا ہوگی؟ ابوذر نے کہا: اپنے اعمال کو قرآن پر پیش کرو، خدا کا ارشاد ہے۔ ''بیشک نیک لوگ (جنت) نعیم میں ہوں گے اور یقیناً بدکار لوگ جہنم میں ہوں گے''۔ حضرتؑ فرماتے ہیں اس شخص نے پھر سوال کیا ایسی صورت میں خدا کی رحمت کہاں گئی؟ ابوذرؓ نے کہا: خدا کی رحمت اچھے لوگوں کے قریب ہے۔

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں ایک شخص نے حضرت ابوذرؓ کو لکھا اے ابوذر! مجھے کچھ علم کا تحفہ بھیجو! ابوذر نے اس کو لکھا علم تو بہت ہے لیکن اگر تم اپنے محبوب کے ساتھ برائی نہ کرنے پر قادر ہو تو ایسا ضرور کرو۔ اس شخص نے کہا کیا آپ نے کسی کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے محبوب کے ساتھ برائی کرتا ہو؟ ابوذرؓ نے کہا ہاں! تمہارا نفس تم کو سب سے زیادہ محبوب ہے اب اگر تم نے کوئی گناہ کیا تو اپنے محبوب (یعنی نفس) کے ساتھ برائی کی۔

شرح موت کا ناپسند کرنے اور اس سے ڈرنے کے سلسلے میں لوگ مختلف ہیں اور اس کی کراہت کے اسباب بھی مختلف ہیں۔ حضرت ابوذرؓ نے جو بات کہی ہے وہ متوسط حضرات کیلئے ہے۔ (لہذا) میں کاملین و ناقصین کے حالات کا ذکر اجمالاً کروں گا۔

یہ جان لینا چاہئے کہ ہم جیسے ناقص لوگوں کے موت کو ناپسند کرنے اور اس سے ڈرنے کی علت وہ نکتہ ہے جس کی طرف ہم نے بعض حدیثوں کی شرح کرتے ہوئے اشارہ کیا ہے[1] اور وہ یہ ہے کہ انسان اپنی خداداد فطرت اور اصلی جبلت کی بنا پر بقا و زندگی کو پسند کرتا اور فنا و موت سے نفرت کرتا ہے اور اس کا تعلق بقائے مطلق و حیات دائمی سرمدی سے ہے۔ یعنی ایسی بقا (کو چاہتا ہے) جس میں فنا نہ ہو اور ایسی زندگی (کو چاہتا ہے) جس کیلئے زوال نہ ہو۔ بعض بزرگوں[2] نے اسی فطرت کا سہارا لے کر معاد کو ثابت کیا ہے جس کا ذکر اس وقت ہمارے مقصد سے خارج ہے اور چونکہ انسانی فطرت میں یہ محبت و نفرت ہے اس لئے

جس کے بارے میں وہ تشخیص کرلیتا ہے کہ اس میں بقا ہے اور جس عالم کو عالم حیات سمجھتا ہے اس سے پیار کرنے لگتا ہے اور اس کے مقابل سے نفرت کرتا ہے اور ہم لوگ چونکہ عالم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ورنہ ہی ہمارے قلوب اس عالم کی حیات ازلی اور بقائے سرمدی پر اطمینان رکھتے ہیں اس لئے ہم سب اسی دنیا کے دلدادہ ہیں اور اس فطرت وجبلت کی بناپر موت سے گریزاں ہیں اور ہم نے اس سے پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ ادراک اور تصدیق عقلی اطمینان اور طمانیت قلب کے علاوہ ہے۔ ہم اس بات کا عقلی ادراک یا عبادی تصدیق تو رکھتے ہیں کہ موت حق ہے۔ موت یعنی پست وتاریک دنیوی زندگی سے دوسرے عالم (یعنی) حیات دائمی نورانی اور باقی رہنے والی اعلی ملکوتی زندگی کی طرف انتقال کا نام ہے۔ لیکن ہمارے قلوب کو نہ تو اس معرفت سے کوئی حظ ملتا ہے اور نہ ہی ہمارے دل اس سے باخبر ہیں، بلکہ ہمارے دل زمین میں ہمیشہ رہنے اور دنیوی زندگی کے خواہشمند ہوتے ہیں اور اسی پست حیوانی ملکی زندگی کو حیات سمجھتے ہیں اور دوسری دنیا کیلئے جو عالم آخرت اور دنیائے جاوید ہے، حیات وبقا کے قائل ہی نہیں ہیں اسی لئے اسی عالم پر اعتماد یا بھروسہ کرتے ہیں اور عالم آخرت سے خائف ومتنفر ہیں اور اس سے فرار کرتے ہیں اور ہماری یہ ساری بدبختی ہمارے نقص ایمان وعدم اطمینان کی بناپر ہے۔ ہم جتنا دنیاوی زندگی اور اس کے عیش پر مطمئن ہیں اور اس دنیا کی بقاء زندگی پر ایمان رکھتے ہیں اگر اس کا ایک دہائی حصہ بھی عالم آخرت وحیات ابدی وجاودانی پر ایمان رکھتے تو ہمارا دل اس سے کہیں زیادہ (آخرت سے) لگاؤ رکھتا اور ہم اس کی اصلاح وآبادی کی کوشش کرتے۔ مگر افسوس ہمارے سرچشمہ ایمان میں پانی نہیں ہے اور ہمارے یقین کی بنیاد ہی پر ہے۔ اس لئے مجبوراً ہم موت وفنا وزوال سے ڈرتے ہیں۔ اس کا قطعی علاج اس طرح ہوسکتا ہے کہ ذکر وفکر نافع اور علم وعمل صالح کے ذریعے ایمان کو اپنے دل میں داخل کریں۔

اب رہا متوسطین، یعنی ان لوگوں کی (موت سے) کراہت اور خوف جو عالم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے قلوب دنیا کی تعمیر کی طرف متوجہ ہیں اور عالم آخرت کی تعمیر سے غافل ہیں لہٰذا ان کا دل نہیں چاہتا کہ آبادی کو چھوڑ کر ویرانے کی طرف منتقل ہوں جیسا کہ حضرت ابوذرؓ نے فرمایا اور یہ بھی نقص ایمان اور نقصان اطمینان کی وجہ سے ہے ورنہ کامل الایمان شخص کیلئے ممکن ہی نہیں ہے کہ پست دنیوی معاملات کی طرف متوجہ ہو اور تعمیر آخرت سے غافل ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ تمام وحشت وخوف وکراہت ہمارے غلط اعمال وکج رفتاری اور مولا کی مخالفت کی

وجہ سے ہے ورنہ اگر مثلاً ہمارا حساب درست ہو اور خود ہم اپنے نفس کا محاسبہ کریں تو حساب سے وحشت کی کوئی وجہ نہیں ہے، کیونکہ آخرت میں حساب منصفانہ ہوگا اور حساب لینے والا عادل ہوگا۔ لہذا حساب سے خوف خود ہماری بدحسابی اور نفاق و چوری کی وجہ سے ہے نہ کہ ہمارا خوف محاسبہ (نفس) کی وجہ سے ہے۔

کافی شریف میں حضرت امام موسیٰ کاظمؑ سے منقول ہے ﴿لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يُحَاسِبْ نَفْسَهُ فِي كُلِّ يَوْمٍ، فَإِنْ عَمِلَ حَسَناً اسْتَزَادَ اللهَ، وَإِنْ عَمِلَ سَيِّئاً اسْتَغْفَرَ اللهَ مِنْهُ وَتَابَ إِلَيْهِ﴾ ۷ ''جو شخص روزانہ اپنے نفس کا محاسبہ نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ اگر اس نے اچھا عمل کیا تو خدا سے اس میں اضافے کی دعا کرے اور اگر اس نے برا عمل کیا تو توبہ و استغفار کرے''۔

لہذا اگر تم نے خود ہی اپنا محاسبہ کر لیا ہے تو حساب کے موقع پر کوئی پریشانی نہیں ہوگی اور نہ اس کا کوئی خوف ہوگا۔ اسی طرح آخرت کے تمام موقف اور ہولناکیوں کے مقامات اسی دنیا کے اعمال کے تابع ہیں۔ مثلاً اگر دنیا میں نبوت کے سیدھے راستہ پر اور ولایت کے صراط مستقیم پر تم گامزن رہے ہو اور جادۂ ولایت حضرت علیؑ سے بھٹکے نہ ہو گے اور تمہارے قدموں میں کوئی لغزش نہ ہوئی ہوگی تو صراط سے گزرنے کیلئے تمہیں کوئی خوف نہ ہوگا، کیونکہ صراط کی حقیقت باطنی طور سے ولایت ہے جیسا کہ روایت میں ہے کہ حضرت علیؑ صراط ہیں ۸ اور دوسری حدیث میں ہے ہم ہی صراط مستقیم ہیں ۹ اور زیارت جامعہ میں ہے ﴿وَأَنْتُمُ السَّبِيلُ الْأَعْظَمُ وَالصِّرَاطُ الْأَقْوَمُ﴾ ۱۰ ''آپ لوگ ہی عظیم راہ اور صراط مستحکم ہیں'' اور جو شخص بھی اس صراط پر استقامت سے قائم رہے اور اس کے پاؤں میں لغزش نہ ہو اس کو (قیامت میں) اس صراط پر بھی لغزش نہ ہوگی اور وہ کوندتی ہوئی بجلی کی مانند صراط سے گزر جائے گا۔ اسی طرح اگر اس کے اخلاق و ملکات منصفانہ اور نورانی ہوں گے تو وہ قبر، برزخ اور قیامت کی ظلمتوں اور وحشتوں اور ان دنیاؤں کے خطرات سے امان میں ہوگا اور اس زندگی سے اس کیلئے کوئی خوف نہ ہوگا۔ پس اس جگہ درد بھی ہماری وجہ سے ہے اور اس کا علاج بھی ہمارے ہی پاس ہے جیسا کہ حضرت علیؑ کی طرف منسوب اشعار میں اس مطلب کی طرف اشارہ ہے

دَوَاؤُكَ فِيكَ وَمَا تَشْعُرُ وَدَاؤُكَ مِنْكَ وَمَا تُبْصِرُ ۱۱

''تمہاری دوا تمہارے اندر ہے مگر تم کو اس کا شعور نہیں ہے اور تمہارا مرض بھی تم ہی سے ہے مگر تم دیکھ نہیں پاتے ہو''۔

کافی شریف میں روایت کی گئی ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے ایک شخص سے فرمایا ﴿انّہ قال لرجلٍ انّک قد جُعلت طبیب نفسک، وبیّن لک الداء وعُرّفت آیة الصّحّة ودُللت علی الدواء فانظر کیف قیامک علی نفسک﴾[۱] ''تم کو اپنے نفس کا طبیب قرار دیا گیا ہے اور تم کو مرض بتادیا گیا ہے، تجھے صحت کی نشانیاں بتائی جاچکی ہیں نیز دوا کی طرف راہنمائی کردی گئی ہے۔ لہذا تم دیکھو کہ اپنے نفس کی اصلاح کیونکر کرتے ہو''۔ تمہارے اندر برے اعمال، اخلاق، اور عقائد موجود ہیں اور صحت کی علامتیں انبیاءؑ کے نسخے اور عقل وفطرت کے دستور ہیں اور اصلاح نفوس کی دوا اس کی پاکیزگی کیلئے کوشش کرنا ہے یہ متوسطین کا حال ہے۔

اب رہا کامل اور مطمئن مومنین کا حال تو یہ لوگ موت سے کراہت نہیں کرتے اگرچہ خوف ووحشت رکھتے ہیں، اس لئے کہ ان کا خوف خداوند عالم کی عظمت وجلالت سے ہے۔ چنانچہ رسول خداؐ کا ارشاد ہے ﴿فایٍ هول لمطّلع﴾[۲] ''روز حساب کس قدر وحشت ہوگی''۔

انیسویں رمضان کی رات کو حضرت علیؑ پر عظیم دہشت ووحشت طاری تھی[۳]۔ حالانکہ حضرتؑ فرمایا کرتے تھے ''خدا کی قسم ابوطالبؑ کا بیٹا اس سے زیادہ موت سے مانوس ہے جتنا کوئی بچہ پستان مادر سے انس رکھتا ہے''[۴]۔ خلاصہ یہ کہ ان حضرات کا خوف دوسرے امور کی وجہ سے ہے۔ ان حضرات کا خوف ہم جیسے آرزوؤں اور امیدوں کے گرفتار اور دنیائے فانی کے دلدادہ لوگوں جیسا نہیں ہے۔

(اسی طرح) قلوب اولیاء میں بھی بہت اختلاف ہے جو شمار میں نہیں آسکتا اور نہ احاطۂ تحریر میں آسکتا ہے۔ ہم ان میں سے بعض کی طرف اجمالی اشارہ کرتے ہیں

پس عرض ہے کہ اولیاء کے قلوب تجلیات اسمائے قبول کرنے میں مختلف ہیں۔ بعض قلوب عشق وولولے سے لبریز ہیں۔ ان میں خدا اپنے اسمائے جمالی کے ساتھ تجلی کرتا ہے اور وہ تجلی ہیبت وشوق سے ملی جلی ہوتی ہے اور ہیبت یا خوف، عظمت کی تجلی اور اس کے ادراک سے ہوتی ہے جس طرح ملاقات کے وقت عاشق کا دل دھڑکتا ہے اور وحشت زدہ وخوف زدہ رہتا ہے لیکن یہ خوف ووحشت عام خوف سے الگ ہے۔

اور بعض دل خوف وہراس اور حزن وملال سے پر ہیں۔ ان میں خدا اپنے اسمائے جلال وعظمت کے ساتھ تجلی کرتا ہے اور وہ تجلی ایسی ہیبت پیدا کرتی ہے جس میں خوف بھی ملا ہوتا ہے اور ایسی حیرت پیدا کرتی ہے جس میں حزن بھی مخلوط ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ حضرت یحییٰؑ نے جناب عیسیٰؑ کو ہنستے ہوئے دیکھ کر

عتاب آمیز لہجے میں فرمایا: معلوم ہوتا ہے آپ خدا کے بارے میں فکر اور اس کے عذاب سے امان پا چکے ہیں! حضرت عیسیٰ نے جواب دیا: معلوم ہوتا ہے آپ خدا کے فضل و رحمت سے مایوس ہو چکے ہیں! اس پر خدا نے ان دونوں پر وحی فرمائی تم میں سے جس کسی کا حسن ظن میرے بارے میں زیادہ ہے وہ میرے نزدیک زیادہ محبوب ہے[۱۵] چونکہ حضرت یحییٰ کے دل میں خدا نے اسمائے جلال کے ساتھ تجلی کیا تھا لہذا وہ ہمیشہ خائف رہا کرتے تھے اس لئے آپ نے حضرت عیسیٰ سے اس طرح خطاب فرمایا اور حضرت عیسیٰ نے بمقتضائے تجلیات رحمت ان کو جواب دیا۔

پہلی فصل

یہ سمجھو کہ اس حدیث کے ظاہر سے ﴿عمّرتم الدّنیا واخربتم الآخرۃ﴾ ''تم نے دنیا کو آباد کیا اور آخرت کو برباد کیا'' ایسا لگتا ہے کہ دار آخرت و بہشت معمور و آباد ہے مگر ہمارے اعمال سے خراب ہو جاتا ہے۔ لیکن معلوم ہے اس کا مقصد تعبیر میں مشابہت ہے چونکہ دنیا کیلئے (لفظ) ''آباد'' استعمال کیا ہے اس کی مناسبت سے آخرت کیلئے (لفظ) ''برباد'' استعمال کیا ہے اور عالم جنت و دوزخ اگرچہ مخلوق ہیں، لیکن جنت و دوزخ اپنے مواد کی تعمیر یا تخریب کے لحاظ سے اعمال کے تابع ہیں۔ روایت میں ہے کہ بہشت کی زمین بالکل سادہ ہے اور اس کی تعمیر کرنے والی چیزیں بنی نوع انسان کے اعمال ہیں[۱۶] اور یہ بات اہل کشف ومکاشفہ کے برہان کے مطابق بھی ہے چنانچہ بعض عرفائے محققین فرماتے ہیں:

(خدا ہمیں اور تمہیں اس سے محفوظ رکھے) ''دوزخ مخلوقات میں سب سے اعظم ہے۔ آخرت میں بھی خداوند عالم کا قید خانہ ہے اور اس کی گہرائی کے زیادہ ہونے کی وجہ سے اس کو جہنم کہا جاتا ہے جیسے اس کنواں کو جس کی گہرائی زیادہ ہو ''بر جہنام'' کہا جاتا ہے۔ جہنم میں گرمی و سردی دونوں ہیں سردی ہے تو آخری ڈگری تک اور گرمی ہے تو آخری درجے تک۔ اس کی بلندی اور گہرائی کے درمیان ساڑھے سات سو سال کی راہ ہے۔ لوگوں میں اختلاف ہے کہ یہ مخلوق ہے یا غیر مخلوق ہے اور اس میں اختلاف ایک مشہور چیز ہے۔ اسی طرح بہشت میں اختلاف ہے۔ لیکن ہمارے اور ہمارے اصحاب اہل مکاشفہ و معرفت کے نزدیک یہ مخلوق ہیں اور مخلوق نہیں (بھی) ہیں۔ ہم نے جو یہ کہا کہ مخلوق ہیں اس کی مثال اس طرح ہے جیسے کوئی مکان بنانے والا ایک احاطے کے چاروں طرف کی صرف دیوار اٹھا دے تو اس کو کہا جائے گا یہ گھر ہے۔

لیکن جب اندر جا کر دیکھو تو سوائے چار دیواری کے اور کچھ نہ دکھائی دے گا جو کسی احاطے کے اردگرد کھڑی کی گئی ہے۔ اس کے بعد اس کے اندر مکانات اور عمارت بنائی جائے گی اور اس میں رہنے والوں کے مقصد کے مطابق کمرے، ہال، سٹور وغیرہ بن جائے گا"۔ ۱۷

حدیث میں ہے کہ جب رسول خدا معراج پر تشریف لے گئے تو جنت میں چند ملائکہ کو دیکھا کہ وہ کبھی عمارتیں تعمیر کرتے ہیں اور کبھی ٹھہر جاتے ہیں آنحضرت نے جبرئیل سے کہا اس کا کیا سبب ہے؟ جبرئیل نے جواب دیا اس مکان کے مواد امت کے اذکار ہیں جب لوگ ذکر کرتے ہیں سامان آتا ہے اور یہ ملائکہ تعمیر میں مشغول ہو جاتے ہیں اور جب امت کے لوگ ذکر نہیں کرتے تو یہ بھی ٹھہر جاتے ہیں ۱۸

خلاصہ یہ ہے کہ جسمانی جنت و دوزخ بنی آدم کے وہی اعمال و افعال حسنہ و سیئہ ہیں جو دوسری دنیا میں ان کی طرف پلٹ کر آتے ہیں چنانچہ آیات شریفہ میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے، جیسے ﴿ووجدوا ما عملوا حاضرا﴾ ۱۹ "اور جو کچھ ان لوگوں نے (دنیا میں) کیا تھا وہ سب کچھ موجود پائیں گے" اور اسی طرح قول معصوم ہے ﴿انما هي اعمالكم ترد اليكم﴾ ۲۰ "یہ تو تمہارے ہی اعمال ہیں جو تم کو واپس کیے جا رہے ہیں" اور ہو سکتا ہے کہ جنت و دوزخ دو علیحدہ دنیائیں یا دو مستقل گھر ہوں جن کی طرف بنی آدم اپنی جوہری حرکتوں اور سوق ملکوتی اور عملی و خلقی حرکات ارادیہ کے ذریعے سفر کر رہے ہوں۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک کا حصہ وہی ہوگا جو ان کے اعمال کی صورت ہوگی۔

مختصر یہ ہے کہ عالم ملکوت اعلیٰ جنت ہے جو خود ایک مستقل دنیا ہے، نفوس سعیدہ کو اس کی طرف بھیجا جاتا ہے اور عالم ملکوت سفلیٰ جہنم ہے جس کی طرف بدبخت و شقی نفوس کو بھیجا جاتا ہے مگر جنت یا دوزخ دونوں میں سے جس کی طرف بھی بازگشت ہو وہ خود ان کے اعمال حسنہ یا لمناک و وحشتناک اعمال سیئہ میں اس بیان سے ظواہر کتاب اور روایت کے درمیان مطابقت نظر آتی ہے جو ظاہراً مختلف لگتی ہیں اور یہ مسلک اہل عرفان اور برہان کے مطابق بھی ہے۔

دوسری فصل

یہ بات واضح ہے کہ حضرت ابوذرؓ کا کلام اس جگہ پر ایک جامع اور محکم دستور ہے جس کی ہر انسان کو پابندی کرنی چاہئے۔ جب ابوذرؓ نے کہا اپنے عمل کو قرآن پر پیش کرو اور خداوند عالم فرماتا ہے "لوگ

دو قسم کے ہیں۔ ایک ابرار جو نعیم میں ہوں گے، دوسرے فجار جو جحیم میں ہوں گے“ تو اس شخص نے رحمت کا سہارا لیا کہ اگر ایسا ہے تو خدا کی رحمت کا کیا مقصد ہے؟ ابوذرؓ نے کہا خدا کی رحمت بھی یوں ہی نہیں ہے، بلکہ وہ نیک لوگوں سے قریب ہے۔

یہ بات یاد رکھیے کہ شیطان ملعون اور خبیث نفس امارہ انسان کو بہت زیادہ طریقوں سے مغرور بنا دیتے ہیں اور اس کو دائمی بدی ہلاکت کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں اور ان دونوں کے پاس جو آخری تیر ہے وہ یہی ہے کہ رحمت حق کی امید میں مبتلا کر کے انسان کو بے عمل بنا دیتے ہیں اور اس طرح رحمت پر بھروسہ کرنا شیطانی چال ہے اور اس کا شاہد اور دلیل یہ ہے کہ امور دنیا میں ہم کسی طرح رحمت حق پر بھروسہ نہیں کرتے۔ طبعی وظاہری اسباب کو بالکلیہ مستقل اور کارگر سمجھتے ہیں وہ بھی اس طرح کہ دنیا میں گویا اسباب ظاہری کے علاوہ کوئی مؤثر ہی نہیں ہے اور امور آخرت میں بخیال خود رحمت حق پر بھروسہ کرتے اور خدا ورسولؐ کے احکام سے غفلت برتتے ہیں جیسے کہ خدا نے ہم کو نہ عمل کی طاقت دی ہے اور نہ صحیح وغلط راستہ بتایا ہے۔

مختصر یہ کہ دنیاوی امور میں ہمارا مسلک تفویضی ہوتا ہے اور اخروی امور میں ہمارا مسلک جبری ہو جاتا ہے اور ہم اس سے غافل رہتے ہیں کہ یہ دونوں راستے باطل وغلط ہیں اور احکام انبیاءؑ اور طریقہ مستمرہ ائمہ ہدیٰؑ اور اولیاء مقربین کے مخالف ہے۔ حالانکہ وہ سب رحمت حق کے معتقد تھے اور ان کا ایمان ہم سب سے قوی تھا اس کے باوجود وہ حضرات ایک لمحے کیلئے بھی اپنے فرائض کی انجام دہی سے غافل نہیں تھے اور یک لحظہ بھی اپنی سعی وکوشش سے باز نہیں آتے تھے۔

برادرم! ائمہ اطہارؑ کے صحیفہ اعمال کو دیکھو، سید سجادؑ کی مناجاتوں اور دعاؤں کو ملاحظہ کرو اور دقت نظر سے دیکھو عبودیت کے سلسلے میں ان کا طریقہ کیا تھا اور کس طرح فریضہ بندگی ادا کرتے تھے؟ لیکن ان سب چیزوں کے باوجود جب حضرت علیؑ کے صحیفۂ اعمال کو امام چہارمؑ دیکھتے ہیں تو افسوس کرتے اور اپنی عاجزی کا اعتراف کرتے ہیں۔ اب ہم یا تو معاذ اللہ ان سب کو جھٹلائیں اور یہ کہہ دیں کہ یہ حضرات بھی ہماری طرح رحمت حق پر ایمان واطمینان نہیں رکھتے تھے اور یا پھر اپنے کو جھٹلائیں اور سمجھیں کہ ہم جو باتیں کہتے ہیں وہ نفس امارہ اور شیطان کی مکاریوں میں سے ہے جو ہم کو صراط مستقیم سے منحرف کرنا چاہتے ہیں۔ میں خدا کی پناہ چاہتا ہوں ان کے شر سے۔

بہرحال میرے عزیز! جس طرح حضرت ابوذرؓ نے اس مرد کو بتایا تھا کہ علوم تو بہت ہیں مگر جو علم ہم جیسے

حدیث ۲۲ ...(۴۲۷)

لوگوں کیلئے مفید ہے وہ یہ ہے کہ اپنے ساتھ برائی نہ کریں اور یہ سمجھیں کہ ہمارے اولیاء کے دستورات ایسے کاشف حقائق ہیں جن سے ہم محجوب ہیں، وہ حضرات جانتے تھے کہ ان مذموم اخلاق اور برے اعمال کی کیا صورتیں ہیں اور ان سے کس قسم کے ثمرات حاصل ہوتے ہیں اور اعمال حسنہ اور اخلاق کریمہ کی کتنی خوبصورت ملکوتی صورتیں ہوتی ہیں؟ (اس لئے) ان حضرات نے سب کچھ بتادیا۔ (سب کا) درد و درمان، مرض اور اس کا علاج بتادیا۔ اب اگر آپ کو واقعاً اپنے سے محبت ہے تو ان قوانین سے روگردانی نہ کریں، اپنے درد کی دوا کیجئے اور اپنے مرض کا علاج کیجئے۔ خدا جانتا ہے اگر ہم اپنے ان موجودہ حالات کے ساتھ اس دنیا سے منتقل ہو گئے تو کیسی مصیبتوں، امراض اور دردوں میں گرفتار ہوں گے؟

والحمدللہ اولاً وآخراً

توضیحات (۲۲)

۱۔ سورہ انفطار، آیت ۱۳/۱۴۔

۲۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۴۵۸، کتاب ایمان وکفر، باب محاسبۃ العمل، حدیث ۲۰۔

۳۔ حدیث ۶، فصل ۲۔

۴۔ آیت اللہ محمد علی شاہ آبادی "رشحات البحار"، ص ۲۶۳ کتاب الانسان والفطرۃ۔

۵ حدیث ۲ مقام فصل ۲۔

۶ اصول کافی، ج ۲، ص ۴۵۳، کتاب ایمان وکفر، باب محاسبۃ العمل، حدیث ۲۔

۷۔ معانی الاخبار، ج ۲، ص ۳۲، باب معنی الصراط، حدیث ۴۔

اسی کتاب میں حدیث ۳ امام جعفر صادق کا قول ہے "صراط مستقیم حضرت علی ہیں"۔ تفسیر علی بن ابراہیم، ص ۲۰۶۔

۸۔ امام سجاد نے فرمایا: ﴿ليس بين الله وبين حجته حجاب، فلا لله دون حجته ستر، نحن ابواب الله، ونحن الصراط المستقيم، ونحن عيبة علمه، ونحن تراجمة وحيه، ونحن اركان توحيده، ونحن موضع سره﴾ خدا اور اس کی حجت کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہے۔ پس خدا کیلئے اس کی حجت کے علاوہ کوئی پردہ نہیں ہے، ہم ابواب اللہ ہیں اور ہم ہی صراط مستقیم ہیں اور ہم ہی اس کے علم کا خزانہ ہیں۔ ہم ہی اس کی وحی کے ترجمان، اس کی توحید کی بنیاد اور اس کے رازدار ہیں۔

معانی الاخبار، ص ۳۵، باب معنی الصراط، حدیث ۵۔

۹۔ زیارت جامعہ کبیرہ، من لا یحضرہ الفقیہ، ج ۲، ص ۳۷۲، مفاتیح الجنان، باب زیارات۔

۱۰۔ حضرت علی سے منسوب دیوان، ص ۳۳۔

۱۱۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۴۵۴، کتاب ایمان وکفر، باب محاسبۃ العمل، حدیث ۶۔

۱۲۔ تفسیر برہان، ج ۴، ص ۵۰۷، سورۂ نصر کی پہلی آیت کے ذیل میں، حدیث ۳۔

۱۳۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۵، ص ۴۸۔

۱۴ نہج البلاغہ، خطبہ ۵۔

۱۵۔ دیوان حافظ ''...'' ص ۴۸

۱۶۔ حدیث نبوی میں ہے ﴿الجنة قيعان وان غراسها سبحان الله وبحمده﴾ جنت (کی زمین) ہموار ہے اور

اس کا پھل سبحان اللہ وبحمدہ ہے"۔

علم الیقین، ج۲، ص۱۰۶۰۔

۱۷۔ فتوحات مکیہ، ج۱، فصل، باب ۹۱۔

۱۸۔ امام صادقؑ فرماتے ہیں: ﴿قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ: لما اسری بی الی السماء دخلت الجنۃ فرأیت فیہا ملائکۃ یبنون لبنۃ من ذہب ولبنۃ من فضۃ وربما امسکوا فقلت لہم: ما لکم ربما بنیتم وربما امسکتم؟ فقالوا: حتی تجیئنا النفقۃ، فقلت لہم: وما نفقتکم؟ فقالوا: قول المومن فی الدنیا ﴿سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر﴾ فاذا قال بنینا واذا امسک امسکنا﴾ "رسول خداؐ نے فرمایا جب مجھے معراج پر لے جایا گیا تو میں جنت میں داخل ہوا۔ وہاں میں نے ملائکہ کو دیکھا ایک اینٹ سونے کی اور ایک چاندی کی اٹھا کر اس سے مکان بنا رہے ہیں اور کبھی بناتے بناتے ٹھہر جاتے ہیں۔ تو میں نے پوچھا: تم کبھی بنانے لگتے ہو اور کبھی ٹھہر جاتے ہو یہ کیوں ہے؟ انہوں نے کہا جب تک ہمارا تعمیر کا سامان نہ آجائے ٹھہرے رہتے ہیں۔ میں نے کہا تمہارا تعمیر کا سامان کیا ہے؟ انہوں نے کہا: دنیا کے اندر مومن کا یہ کہنا ﴿سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر﴾ جب مومن یہ کہتا ہے ہم کام کرنے لگتے ہیں اور جب وہ چپ ہو جاتا ہے ہم بھی رک جاتے ہیں"۔

بحار الانوار، ج۹۰، ص۱۶۹ و۱۷۰، کتاب الذکر والدعاء، باب۲، حدیث ۷۔

۱۹۔ سورۂ کہف، آیت/۳۹۔

۲۰۔ علم الیقین، ج۲، ص۸۴۴، المقصد ۱۲ فی احوال البرزخ۔

۲۱۔ "کشف الغمۃ فی معرفۃ الائمۃ"، ج۲، ص۸۵۔

تینتسویں حدیث

بالسند المتّصل إلى حجّة الفرقة وثقتها، محمّد بن يعقوب الكليني رضي الله عنه، عن عليّ بن إبراهيم، رفعه إلى أبي عبد الله عليه السلام، قال:

﴿طلبة العلم ثلاثة، فاعرفهم بأعيانهم وصفاتهم: صنف يطلبه للجهل والمراء، وصنف يطلبه للاستطالة والختل، وصنف يطلبه للفقه والعقل.

فصاحب الجهل والمراء مؤذٍ ممارٍ متعرّض للمقال في أندية الرّجال بتذاكر العلم وصفة الحلم، قد تسربل بالخشوع وتخلّى من الورع، فدقّ الله من هذا خيشومه وقطع منه حيزومه.

وصاحب الاستطالة والختل ذو خبّ وملق، يستطيل على مثله من أشباهه ويتواضع للأغنياء من دونه، فهو لحلوائهم هاضم ولدينه حاطم، فأعمى الله على هذا خبره وقطع من آثار العلماء أثره.

وصاحب الفقه والعقل ذو كآبة وحزن وسهر، قد تحنّك في برنسه وقام الليل في حندسه، يعمل ويخشى وجلاً داعياً مشفقاً مقبلاً على شأنه عارفاً بأهل زمانه مستوحشاً من أوثق إخوانه، فشدّ الله من هذا أركانه وأعطاه يوم القيامة أمانه﴾.

قال الكلينيّ رحمه الله: وحدّثني به محمّد بن محمود، أبو عبد الله القزويني، عن عدّة من أصحابنا، منهم جعفر بن أحمد الصّيقل بقزوين، عن أحمد بن عيسى العلويّ، عن عبّاد بن صهيب البصريّ، عن أبي عبد الله عليه السلام۔

ترجمہ جناب، امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: "طالبان علم کی تین قسمیں ہیں، لہذا تم ان کو ان کی شخصیات وصفات کے ذریعے پہچان لو۔

ایک قسم تو وہ ہے جو صرف جہالت اور جھگڑے کیلئے علم حاصل کرتے ہیں۔

اور دوسری قسم وہ ہے جو اپنی برتری جتانے اور دھوکہ دینے کیلئے علم حاصل کرتے ہیں۔

تیسری قسم وہ ہے جو دانش وبینش کیلئے علم حاصل کرتے ہیں۔

پس (پہلی قسم) جاہل، موذی وجدل کرنے والی اور لوگوں کی محفلوں میں بیٹھ کر علم کا تذکرہ کر کے صبر وبردباری کا اظہار کر کے گفتگو کرنے والی ہے، اس نے (بظاہر) خشوع وخضوع کا لباس پہن رکھا ہے (لیکن) ورع اور تقویٰ سے بالکل خالی ہے۔ پس خدا اس کی ناک رگڑے اور اس کی کمر توڑ دے۔

اور (دوسری قسم) فریب دینے والی اور چاپلوس ہے۔ اس قسم کا آدمی اپنے جیسے لوگوں پر برتری جتاتا ہے (لیکن) دوسرے مالداروں کے سامنے دم ہلاتا ہے۔ یہ لوگ مالداروں کے حلوے کھانے والے اور اپنے دین کو توڑ (مروڑ کر پیش کرنے) والے ہیں۔ پس خدا ایسے شخص کی بینائی کو اندھا کرے اور آثار علما سے اس کا نام ونشان مٹا دے۔

اور (تیسری قسم) رنجیدہ وغمگین (عابد) شب زندہ دار ہیں اپنے عمامے پر حنک باندھنے والے، تاریکی شب میں قیام کرنے والے ہوتے ہیں۔ عمل کرنے کے باوجود خوفزدہ رہتے ہیں۔ دعا کرنے والے خوددار اور اپنی حالت کو برقرار رکھنے والے ہوتے ہیں، اپنے زمانہ کے لوگوں کو پہچاننے والے ہوتے ہیں۔ اپنے معتمد ترین دوستوں سے بھی وحشت زدہ رہتے ہیں۔ پس خدا ان کے ارکان کو مضبوط کرے اور قیامت میں ان کو اپنے امان میں رکھے"۔

علامہ کلینیؒ امام جعفر صادقؑ سے اسی روایت کو دوسرے اسناد سے بھی نقل کرتے ہیں۔

شرح "باعْیانِھِم" "اِعْرِفْھُم" کے ضمیر کی تاکید ہے، یعنی ان لوگوں کو اس طرح پہچان لو کہ وہ معین ومشخص ہو جائیں۔ دوسروں سے مشتبہ نہ رہیں جیسے کہا جاتا ہے: "رَأیْتُہ بِعَیْنِہ" میں نے اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا ہے (یا مثلاً حدیث ہے) ﴿وَکُلُّ شَیْءٍ فِیْہِ حَلالٌ وَحَرامٌ فَھُوَ لَکَ حَلالٌ حَتّٰی تَعْرِفَ الْحَرامَ بِعَیْنِہ﴾ ۲؎ "جس چیز میں بھی حلال وحرام (دونوں موجود) ہوں وہ تمہارے لئے (اس وقت تک) حلال ہے جب تک حرام کو معینہ نہ پہچان لو"۔

جناب محقق مجلسیؒ نے اس (اعیانہم) کے بارے میں کئی احتمالات ذکر کیے ہیں مگر یہ احتمال جو واضح اور معین ہے اس کا تذکرہ نہیں فرمایا ہے اور جن احتمالات کا ذکر کیا ہے وہ سب بعید ہیں، مثلاً فرمایا ہے ﴿باعْیانِهِمْ، اَیْ بِخَواصِّهِمْ وَافْعالِهِمُ الْمَخْصُوصَةِ بِهِمْ﴾ ''یعنی ان کو ان کے افعال و خواص کے ذریعے پہچانو جو ان کیلئے مخصوص ہیں'' ﴿بِالشّاهِدِ وَالْحاضِرِ مِنْ افعالِهِم﴾ ''یعنی ان کے موجودہ افعال کے ذریعے ان کو پہچانو'' اس کے بعد فرمایا ﴿وَقیلَ باعْیانِهِمْ، اَیْ اَقْسامِهِمْ وَمَفْهُوماتِ اَصْنافِهِم وَقیلَ اَلْمُرادُ باعْیانِهِمْ، مَناظِرُهُمْ مِنْ هَیْئَتِهِمْ وَاَوْضاعِهِمْ كَالتَّسَرْبُلِ بِالْخُشُوعِ﴾ [3] ''بعض علماء نے کہا ہے کہ ''باعیانہم'' کا مطلب ان کی اقسام اور مفہومات اصناف کے ذریعے ان کو پہچانو اور بعض نے کہا ہے ''اعیان'' سے مراد ان کو ان کی شکل و شمائل، ہیئت و اوضاع کے ذریعے پہچانو جیسے خشوع و خضوع کے لباس سے ان کو پہچانو''۔ اس کے علاوہ دیگر بعید احتمالات کا ذکر فرمایا ہے۔

''صفاتہم'' اوصاف سے مراد ان کی وہ حالت ہے جو ان تین قسموں کے ملکات و مقاصد کے تابع ہے جیسے اذیت دینا، ریاکاری کرنا وغیرہ۔ پس ان صفتوں سے ان کے حالات پہچانے جائیں گے اور وہ لوگ اپنے اعیان و اشخاص کے ذریعے پہچانے جائیں گے۔

''جہل'' اس سے مراد وہ چیز ہے جو علم کے خلاف ہو اور یہاں پر شاید (حق سے) چشم پوشی اور حق کو چھپانا یا تجاہل عارفانہ اور حق کو قبول نہ کرنا مقصود ہو۔ (ویسے) میں اس مطلب کو اس کے بعد اس سے زیادہ بیان کروں گا۔ علامہ مجلسیؒ نے فرمایا ﴿اَلْجَهْلُ السَّفاهَةُ وَتَرْكُ الْحِلْمِ وَقیلَ ضِدُّ الْعَقْلِ﴾ [4] ''جہل کے معنی (یہاں پر) بے وقوفی اور ترک حلم کے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جہل سے مراد ضد عقل ہے''۔

''مِراء'' اس سے مراد قول اور نظریت میں جدال کرنا ہے اور اسی مادہ سے جدل ہے جو علم منطق میں عنوان کی جانے والی ''صناعات خمس'' میں سے ایک ہے۔ چنانچہ ﴿ما رَأیْتُ الرَّجُلَ اَمارَیْهِ مِراءً، اذا جادَلْتَهُ﴾ [5] ''اس وقت بولا جاتا ہے جب تم کسی سے جدل کرو''۔ جیسا کہ صحاح جوہری میں ہے۔ یہ کلام اگرچہ مطلق ہے لیکن علی الظاہر اس سے مراد وہی ہے جو ذکر کیا گیا۔ یہاں پر ایک دوسرا احتمال بھی ہے جس کی طرف میں آئندہ فصلوں میں اشارہ کروں گا۔ [6]

''استطالہ'' اس کے معنی بلندی اور عظمت کے ہیں۔

"خنل" اس کے معنی دھوکہ و فریب کے ہیں، جیسا کہ جوہری نے کہا ہے "ختلہ وخاتلہ" کے معنی "خدعہ (اس کو دھوکہ دیا)" کے ہیں اور "التخاتل، ای التخادع" فریب کے معنی میں ہے۔

"ممار" اس کے بعد ذکر کیا جائے گا کہ صاحب مراء کی تعریف "مماری" سے، اور صاحب "استطالہ وختل" کی تعریف استطالہ سے، اور صاحب "خب" ہونے سے ہے جو خود "خدعہ" کے معنی میں ہے۔

"متعرض للمقال" یعنی مقدرت کا ظاہر کرنا۔ چنانچہ "عرضت لہ الشیء" اس وقت کہا جاتا ہے جب تم اس شے کو اس کیلئے ظاہر کرو اور جب کوئی شے اس کو در پیش ہو اور "تعرض" کا مطلب ہے ظاہر ہوا۔

"اندیۃ" نادی کی جمع ہے، اور نادی اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں لوگوں کا اجتماع ہو یہ وہ لوگ مذاکرات کیلئے بیٹھیں، جب وہاں سے چلے جائیں تو اس کو نادی نہیں کہا جاتا۔ مکہ میں جو "دار الندوۃ" تھا وہ بھی اسی معنی میں ہے، اس کو باہمی مشورہ کرنے کیلئے بنایا گیا تھا۔ "ندي" بر وزن فعیل، ندوۃ، منتدى، منتدى بھی اسی معنی میں ہیں، جیسا کہ جوہری نے کہا ہے۔

"بتذکر العلم" یہ "مقال" سے متعلق ہے اور یا پھر مقال کا بدل ہے اور صفۃ الحلم اسی پر عطف ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ علمی مذاکرات اس لئے کرتا ہے کہ اپنے کو اس کا اہل ثابت کرے، اور علم کی تعریف وتوصیف اس لئے کرتا ہے کہ اپنے کو بھی انہیں کے زمرے میں شمار کرے، حالانکہ وہ نہ اس کا اہل ہے اور نہ اصحاب میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ اس کا علم ایک جہالت ہے جو بصورت دانش ہے اور اس کا علم کامل ومعتدل اوصاف سے خارج ہے اور میں اس کے بعد اس مقولے کا ذکر کروں گا۔

"تسربل" باب تفعل سے ہے جس کے معنی قمیص پہننے کے ہیں۔ بولا جاتا ہے "سربلتہ فتسربل، ای البستہ سربالا" میں نے اس کو قمیص پہنایا پس اس نے پہن لیا اور "تسربل بالخشوع" یعنی اپنے کو خشوع کا پیراہن پہنایا اور اظہار کیا کہ ہمارے لئے لازم ہے، کیونکہ پیراہن جسم سے ملا ہوتا ہے اور بدن کیلئے لازم ہے، حالانکہ وہ اس سے خالی ہے اور اس کیلئے عاریتاً حاصل کی گئی قمیص کی طرح ہے۔

"الورع" یعنی محرمات اور مشتبہات سے مکمل احتراز ہے۔

"فدق اللہ" اس میں احتمال ہے کہ یہ جملہ اور اس کے بعد والے دو جملوں میں اس جیسے الفاظ دعا کیلئے ہوں اور یہ بھی احتمال ہے کہ ان کی حالت کے بارے میں دنیا یا آخرت میں خبر دینا ہو یا دونوں دنیاؤں کے بارے میں خبر دینا ہو اور دق کے معنی کوٹنے کے ہیں اور یا پھر یہ اسم صوت ہے۔

”من هذا“ یعنی ان خصلتوں میں سے ہر خصلت کی بنا پر۔

”خیشوم“ یعنی ناک کا اوپری حصہ اور ناک کوٹنے سے مراد ذلت اور رسوائی ہے، یعنی ان خصلتوں کی بنا پر خدا ان کو ذلیل اور رسوا کرے گا۔ آگے چل کر ہم اس معنی کی طرف اشارہ کریں گے۔ ۸

”حیزوم“ یعنی کمر، وسط سینہ اور اس ہڈی کے معنی میں بھی آتا ہے جو حلقے کی طرح گردن کو گھیرے رکھتی ہے (مگر) یہاں پر لفظ ”قطع“ کی مناسبت سے پہلا معنی مناسب ہیں

”الخب“ یہ دھوکہ، خباثت اور [illegible] کے معنی میں آتا ہے۔ چنانچہ الخب خا کے ”فتحہ اور کسرہ“ دونوں کے ساتھ، دھوکہ بازی کے معنی میں آتا ہے، جیسا کہ جوہری نے کہا ہے۔

”ملق“ کے معنی چاپلوسی کے ہیں اور جوہری نے صحاح میں جو کچھ کہا ہے یہ اس کے لئے لازم ہے۔ جوہری نے کہا ہے ”رجل ملق“ اس شخص کو کہتے ہیں جو زبان سے ایسی بات کہے جو اس کے دل کے خلاف ہو۔ انتہی۔ ۹ اور یہ تفسیر لازم اعم سے کی گئی ہے، بلکہ اس کے معنی انتہائی محبت کے اظہار کے ہیں جس میں خضوع وخشوع بھی ہو مگر دل میں بیگانہ ہو۔

”یحسو نهم“ علامہ مجلسیؒ نے فرمایا ہے کہ بعض نسخوں میں نون کے ساتھ ”لیحلونهم“ آیا ہے۱۰ اس صورت میں حائے مہملہ کے ضمہ اور سکون لام کے ساتھ، دلال و کاہن کی اجرت کے معنی میں ہوگا اور رشوت کے معنی (بھی) ہوتے ہیں۔ اس صورت میں عبارت کا مطلب یہ ہوگا امیر ان کو جو رقم کسی کام کے انجام دہی کے عوض میں دیتے ہیں اور یہ لوگ دین فروشی کرتے ہیں۔

”لیحطم“ یعنی توڑنا۔ علامہ مجلسیؒ نے فرمایا ہے حطم کے معنی ہیں ”یہ توڑنا جو فساد کے باعث ہو۔“

”خسرہ“ اس لفظ میں احتمال ہے کہ خائے معجمہ کو ضمہ اور را کو سکون ہو تو اس کا مطلب بصیرت و مہارت کے ہوں گے اور یہ بھی احتمال ہے کہ خائے معجمہ اور را دونوں کو فتحہ ہو۔ البتہ فعل کی نسبت کی وجہ سے پہلے معنی بہتر اور مناسب ہیں۔ ویسے دوسرے معنی بھی خالی از وجہ نہیں ہے۔

”الکآبة“ تحریک اور مد و تسکین کے ساتھ، شدت رنج و غم سے بدحال ہوجانا اور عجز طاری ہونا ہے۔

”تحنک فی برنسه“ یعنی اپنی برنس (ٹوپی) کے نیچے تحت الحنک قرار دیا۔ برنس وہ لمبی ٹوپی ہے

جس کو صدر اسلام میں اہل عبادت اپنے سر پر رکھا کرتے تھے' جوہری نے صحاح میں یہی کہا ہے۔ علامہ مجلسی" فرماتے ہیں اس فقرے میں اشارہ ہے کہ نماز میں تحت الحنک مستحب ہے۔ لا مگر مجھے اس تشریح میں تامل ہے۔ اس لئے کہ اہل عبادت جو اپنے لباس میں حنک باندھتے ہیں اس کی دلالت مطلق استحباب پر ہے صرف وقت نماز کا تحنک نہیں ہے۔ ہاں اگر برنس نماز کا کوئی مخصوص لباس ہوتا تو یہ تشریح صحیح تھی۔

"الحندس" یعنی بہت تاریک رات کے ہیں جیسے کہ جوہری نے کہا ہے اور لفظ حندس کا اضافہ ضمیر کی طرف بیانیہ ہے اور "في حندسه" لیل کا بدل ہے اور ایک احتمال قریب یہ بھی ہے کہ یہاں پر حندس سے تجرید کی بنا پر صرف تاریکی شب مراد ہو۔

"فشدّ الله اركانه" شدّ کے معنی قوت اور مضبوطی کے ہیں۔ چنانچہ "شدّ عضده" کے معنی اس کو تقویت دینے کے ہیں۔ رکن کے معنی اس چیز کے ہیں جس پر کسی شئے کی بنیاد ہو یا وہ شئے اس پر کھڑی ہو۔ جوہری نے کہا ہے "رُكْنُ الشيء، جانبهُ الأقوى" (کسی چیز کے طاقتور پہلو) کے ہوتے ہیں۔

جن چیزوں کا بیان مناسب ہے ہم اس کو چند فصلوں کے ضمن میں بیان کریں گے، وعلى الله التكلان۔

پهلی فصل

یہ بات اپنی جگہ پر طے ہے کہ نتائج کے اعتبار سے تمہیدات اور نتائج کے بارے میں قیاس اور مدلولات و محکم دلائل کے اعتبار سے ہر علم میں اولہ و براہین لوازمات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ (تمہیدات اور دلائل و براہین) نہ تو خود استقلال تام رکھتے ہیں اور نہ مقدمات و براہین سے بالکل بیگانہ ہوتے ہیں۔ (البتہ) اس سلسلے میں دو گروہوں "جبری و تفویضی" نے اختلاف کیا ہے اور اعتدال سے دور ہو گئے ہیں اور ان دونوں گروہوں نے اپنے اپنے مسلک کے اعتبار سے ایک ایک رخ کو اختیار کیا ہے ایک گروہ کہتا ہے تمہیدات قیاس خود مستقل ہیں اگر عالم غیب کا دروازہ بند کر دیا جائے اور عالم ملکوت کے افاضہ کو روک دیا جائے جب بھی انسان صرف تمہیدات کے سہارے نتائج کا علم حاصل کر سکتا ہے اور دوسرا گروہ کہتا ہے۔ تمہیدات کا نتائج سے کوئی رابطہ نہیں ہے یہ تو صرف خدا نے ایک سنت جاری کر دی ہے کہ تمہیدات کے بعد نتائج کا انسانی ذہن میں تصور پیدا ہوتا ہے۔ صورتاً تو تمہیدات نتائج سے مربوط ہوتی ہیں لیکن درحقیقت محض بے ربط ہیں۔

لیکن ان دونوں گروہوں کا مسلک ارباب معرفت اور علوم حقیقیہ کے نزدیک باطل ہے اور اہل حق کا بھی اتفاق ہے اور مرواقعی بھی یہی ہے کہ مقدمات ربط عدادی رکھتے ہیں اور نفس کو اپنے اندر اعلیٰ غیبی مبادی سے متعلق علوم کو جذب کرنے کیلئے آمادہ کرتے ہیں اور میں فی الحال ان دونوں مسلکوں کی تشریح یا ان کے بطلان کو نہیں پیش کرنا چاہتا، کیونکہ یہ ہمارے مقصد سے خارج ہے ان کا ذکر تو ضمناً دوسرے مطلب کی بنا پر آ گیا ہے اور وہ مطلب یہ ہے کہ جب یہ بات معلوم ہو چکی کہ عالم غیب سے علوم و معارف کا القا ہوتا ہے اور نفوس کا اس سے ارتباط رہتا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے ﴿لیس العلم بکثرة التعلیم بل هو نور یقذفه الله فی قلب من یشاء﴾ ۱۳ ’’زیادہ پڑھنے پڑھانے سے علم نہیں حاصل ہوتا، بلکہ علم ایک نور ہے جس کو خدا جس کے قلب میں چاہتا ہے ڈال دیتا ہے‘‘۔ اس لیے جن نفوس کا ملکوت اعلیٰ اور ملائکہ مقربین کے عالم سے ارتباط رہتا ہے تو ان سے جو بھی القاءات ہوتے ہیں وہ القائے ملکی ہوتے ہیں اور جن علوم کا ان کی طرف سے فیضان ہوتا ہے وہ علوم حقیقیہ ہوتے ہیں اور عالم ملائکہ سے ہوتے ہیں اور جن نفوس کا ارتباط عالم ملکوت اسفل اور عالم جن و شیطان اور نفوس خبیثہ سے ہوتا ہے ان کے القاءات شیطانی القا اور از قسم جہل مرکب و حجاب تاریک ہوتے ہیں۔ اسی لئے ارباب معارف اور صاحبان علوم حقیقی نفوس کی تطہیر، خلاص نیت اور درستگی قصد کو تحصیل علوم میں ضروری سمجھتے ہیں۔ خصوصاً معارف حقہ اور علوم شرعیہ میں اس کو سب سے پہلی شرط مانتے ہیں اور اس سلسلے میں طالب علموں کو بہت زیادہ تاکید کرتے ہیں، کیونکہ تزکیہ نفوس اور ان کو جلا بخشنا مبادی عالیہ سے ارتباط کو قوی کرتا ہے اور خداوند عالم نے اس آیہ کریمہ ﴿واتقوا الله ویعلمکم الله﴾ ۱۴ ’’خدا سے ڈرو، خدا تم کو تعلیم دیتا ہے‘‘ میں تعلیم الٰہی کو تقویٰ سے مربوط کیا ہے اس لئے کہ تقویٰ نفس کو صاف کرتا اور اس کو مقام غیب مقدس سے مرتبط کرتا ہے۔ (جب یہ ہوتا ہے) تو تعلیم الٰہی اور القائے رحمانی واقع ہوتا ہے، کیونکہ مبادی عالیہ میں بخل محال ہے وہ سب واجب الفیاضیہ ہیں جیسے کہ واجب الوجود بالذات تمام حیثیات سے واجب ہوتا ہے۔

لیکن اگر نفس اپنی آبادکاری اور اپنے کھانے پینے اور انانیت کی طرف توجہ رکھتے ہوئے (تحصیل) علوم میں مشغول ہو اور اس کا مقصد خدا نہ ہو تو اس پر جو القاءات ہوں گے وہ سب شیطانی ہوں گے اور رحمانی و شیطانی القا کے درمیان امتیازات میں سے ایک یہی فرق ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن میرے خیال میں اہل معرفت نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے کہ جس کو خود انسان بھی اکثر اوقات سمجھ لیتا ہے اور اس میر

پرہیز کرنے والے اور کدورت سے مالا مال نفس پر جو القا ہوتا ہے وہ جہل مرکب کے زمرے میں آتا ہے جو درد علاج مرض اور راستے کا کانٹا ہے اس لئے علم کا معیار مفہومات کلیہ اور اصطلاحات علمیہ کا حصول نہیں ہے، بلکہ اس کا معیار نفس کے چشم بصیرت سے حجابوں کا اٹھنا اور باب معرفت اللہ کا وا ہو جانا ہے اور علم حقیقی وہی ہے جس سے دار کرامت کیلئے ہدایت ملکوت کا چراغ اور تقرب حق کا سیدھا راستہ حاصل ہو سکے اور اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے چاہے وہ عالم ملک میں اور طبیعت کے رفع حجاب سے پہلے بصورت علوم ہوں اور اس کے جاننے والوں کو ارباب محاورات ومجادلات کے نزدیک علماء، عرفاء، فقہاء کہا جاتا ہو، لیکن چشم قلب سے حجاب اٹھ جانے، پردہ ظلمات کے برطرف ہو جانے اور ملک وطبیعت کے خواب سنگین سے بیدار ہو جانے کے بعد معلوم ہوگا کہ اس حجاب کی موٹائی تمام حجابوں سے زیادہ تھی اور یہ تمام رسمی علوم سخت قسم کے ملکوتی حجابات تھے کہ جن میں سے ہر ایک کا دوسرے سے فاصلہ فرسخوں کی مسافت تھی اور ہم اس سے غافل تھے ﴿الناس نیام فاذا ماتوا انتبہوا﴾ ۱۵ ''لوگ تو خواب میں ہیں جب مریں گے تب ہوشیار ہوں گے'' اور یہ (بھی) معلوم ہوگا کہ ہم نے کیا کیا؟ اور سب سے بڑی ذلت ورسوائی تو اس وقت ہوگی پچاس سال یا اس سے کم یا زیادہ تک تحصیل علم کرنے کے بعد معلوم ہوگا کہ ہم بھی مغالطے کا شکار تھے! شیطان ونفس کی مکاریوں سے غافل ہو کر ہم بھی یہ خیال کرتے رہے کہ ہماری تعلیم صرف خدا کیلئے ہے اور یہ غفلت اسی وجہ سے ہے کہ حب نفس ایک دبیز پردہ ہے جس نے ہمارے عیوب کو ہم سے چھپائے رکھا ہے۔ اسی لئے اولیائے اطہار وائمہ اہل بیتؑ نے خود ہمیں سمجھانے کیلئے ایسے آثار وعلائم ذکر کردیئے ہیں جس سے ہم تمیز کرسکیں اور اپنے کو پہچان سکیں اور اپنے نفس کو کسوٹی قرار دیں، نیز اپنے آپ سے بے جا حسن ظن نہ رکھیں۔

اس اشارے کے بعد اس حدیث شریف میں جن علامتوں کا ذکر کیا گیا ہے ہم اس کی طرف اشارہ کریں گے

پس (ساری گفتگو) کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنیادی اور مجموعی تقسیم کے اعتبار سے طالب علم کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس کا مقصد خدا کی رضا ہو اور دوسرا وہ جس کا مقصد نفسانی ہو اور یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس قسم کے افراد کا نہائی مقصد جہالت ہے، کیونکہ جو علوم صورۃ ان کو حاصل ہوں گے وہ حقیقت میں جہل مرکب اور حجاب ملکوتی ہیں اور یہ دونوں گروہ جن کا امام ششمؑ نے اس حدیث میں ذکر کیا ہے اور ہم اس کی شرح کر رہے ہیں، مقصد مذکور میں شریک ہیں۔ اس لئے کہ (علمی مباحث میں) جدال کرنے والے نیز برتری

جتانے والے دھوکے باز قسم کے لوگ دونوں جاہل اور گمراہ ہیں۔ اسی وجہ سے جس جہالت کو امامؑ نے پہلے گروہ کی علامتوں میں سے قرار دیا ہے اس کیلئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس معنی کے علاوہ ہے، بلکہ اس عمومیت سے مقصود معاملات سے چشم پوشی یا لوگوں کو جہالت میں مبتلا کرنا ہے یا پھر جہالت سے مراد تجاہل اور عدم قبول حق ہے جیسے کہ یہ دونوں صاحب مراء و جدل کی خصوصیت میں سے ہیں۔ یہ لوگ (اصحاب جدال) حقیقی امور اور رائج حقائق کا انکار کرتے ہیں اور اپنی بات کو بڑھاوا دینے اور باطل کو چمکانے اور اپنے کھوٹی اشیا کو بیچنے کیلئے جہالت سے کام لیتے ہیں

حضرت امام صادقؑ نے لوگوں کی تین قسمیں قرار دی ہیں، حالانکہ وہ ایک تقسیم کی بنا پر جو بنیادی اور کلی تقسیم ہے، نفی و اثبات کے درمیان دائر ہے اس کے اعتبار سے اول دو قسموں سے زیادہ نہیں ہیں اور ایک اعتبار سے تین قسموں سے زیادہ ہیں، تو اس کیلئے کہا جا سکتا ہے کہ حضرتؑ نے صرف ان دو بڑے گروہوں کا ذکر کرنا چاہا ہے کہ جس کی طرف تمام (یا زیادہ) ارباب جہالت و ضلالت رجوع کرتے ہیں۔ اسی لئے دوسری روایت میں ان کو دو ہی گروہ پر تقسیم کیا گیا ہے۔

كافي باسناده عن أبي عبد الله عليه السلام قال: ﴿من أراد الحديث لمنفعة الدنيا لم يكن له في الآخرة نصيب ومن أراد به خير الآخرة أعطاه الله خير الدنيا والآخرة﴾ (۱) "آپؑ نے فرمایا جو حدیث اس لئے حاصل کرنا چاہتا ہو کہ اس سے دنیوی فائدہ حاصل کرے اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور جو اس سے خیر آخرت چاہتا ہو خدا اس کو خیر دنیا و آخرت (دونوں) دے گا"

دوسری فصل

ہم نے ایک حدیث کے ضمن میں مراء و جدل کے بہت سے مفاسد کا ذکر کیا ہے، اور اس مقام پر بھی مناسب ہے کہ میں تھوڑے سے مزید مفاسد دوسری حدیثوں سے بھی ذکر کروں

کافی شریف میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا ﴿ایاکم والمراء والخصومة، فانهما يمرضان القلوب على الاخوان وينبت عليهما النفاق﴾ (۸) "تم مراء و جدل و خصومت سے پرہیز کرو، کیونکہ یہ دونوں (جدال و خصومت) دوستوں کے بارے میں دلوں کو مریض کر دیتے ہیں اور انہیں دونوں (کی جڑوں) پر نفاق کا پودا اگ آتا ہے"

کافی ہی میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے ﴿اِیَّاکُمْ وَالْخُصُوْمَةَ، فَاِنَّھَا تَشْغَلُ الْقَلْبَ وَتُوْرِثُ النِّفَاقَ وَتَکْسِبُ الضَّغَائِنَ﴾ ۱۹؎ ''خبردار! عناد اور دشمنی سے بچو، کیونکہ یہ دل کو مشغول بنا دیتی ہے، نفاق اور دو رویی کا سبب بنتی ہے، اور دوسروں میں کینہ پیدا کر دیتی ہے''۔

کافی ہی میں امام جعفر صادقؑ سے یہ بھی مروی ہے ﴿قَالَ جَبْرَئِیْلُ لِلنَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وآلہ اِیَّاکَ وَمُلَاحَاةَ الرِّجَالِ﴾ ۲۰؎ ''جبرئیلؑ نے رسول خداؐ سے کہا، لوگوں سے بحث اور گفتگو کرنے میں جھگڑے سے پرہیز کیجئے''

اب اس بات کی تفصیل کہ مراء وخصومت (دکھاوا اور جھگڑے کرنا) دل کو مریض کرتا ہے، انسان کو دوستوں سے بدظن کر دیتی، اور دل میں نفاق (کے بیج) بو دیتی ہے تو اس کی (کچھ تفصیل) پہلے بیان کی جا چکی ۲۱؎ (اور وہ یہ ہے کہ) ظاہری اعمال کے (بھی) دل اور باطن میں اسی کے مناسبت سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ (مگر) اب میں عرض کرتا ہوں کہ برے اعمال کے اثرات دل میں بہت جلد اور بہت شدید ہوتے ہیں اس لئے کہ انسان عالم طبیعت کی پیداوار ہے اور شہوت وغضب وشیطنت کی طاقتیں اس سے قریب ہوتی اور اس میں متصرف ہوتی ہیں جیسا کہ خود حدیث میں بھی ہے ﴿اِنَّ الشَّیْطَانَ یَجْرِیْ مَجْرَی الدَّمِ مِنْ بَنِیْ آدَمَ﴾ ۲۲؎ ''شیطان خون کی طرح بنی آدم کے اندر دوڑتا رہتا ہے''۔ اس سے قلب کی توجہ برائیوں اور ان چیزوں کی طرف رہتی ہے جو طبیعت کے موافق ہو۔ اسی لئے خارجی مدد سے خواہ وہ انسانی اعضا ہوں یا اس سے خارج مثلاً برا اور بد خلق دوست اور ساتھی دل میں شدید اثر پیدا ہو جاتا ہے اور حدیث شریف میں بھی ایسے لوگوں کی مصاحبت سے روکا گیا ہے۔

کافی میں امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا ﴿لَا یَنْبَغِیْ لِلْمَرْءِ الْمُسْلِمِ اَنْ یُوَاخِیَ الْفَاجِرَ فَاِنَّهُ یُزَیِّنُ لَهُ فِعْلَهُ وَیُحِبُّ اَنْ یَکُوْنَ مِثْلَهُ، وَلَا یُعِیْنُهُ عَلٰی اَمْرِ دُنْیَاهُ وَلَا اَمْرِ مَعَادِهِ، وَمَدْخَلُهُ اِلَیْهِ وَمَخْرَجُهُ مِنْ عِنْدِهِ شَیْنٌ عَلَیْهِ﴾ ۲۳؎ ''مرد مسلمان کو کسی فاسق وفاجر سے دوستی نہیں کرنی چاہئے اس لئے کہ وہ اس کے سامنے اپنے فعل کو خوبصورت بنا کر پیش کرے گا اور یہ چاہے گا کہ وہ بھی اسی کی طرح ہو جائے اور اس کی نہ تو دنیاوی امور میں اور نہ آخرت کے امور میں (کسی میں بھی) مدد نہیں کرے گا۔ اس کے پاس آنا جانا بھی اس کیلئے برائی کا سبب بنے گا''۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ﴿لَا یَنْبَغِیْ لِلْمَرْءِ الْمُسْلِمِ اَنْ یُوَاخِیَ الْفَاجِرَ وَلَا الْاَحْمَقَ وَلَا

الکذاب ﴾۲۴ ''مسلمان کو بدکار اور احمق اور جھوٹے سے دوستی نہیں کرنی چاہیے''۔

اہل معصیت کے ساتھ نشست و برخاست کی ممانعت یا جس جگہ معصیت خدا ہو وہاں پر بیٹھنے کی ممانعت یا دشمنان خدا کے ساتھ ربط و ضبط، پیار و محبت اور ان سے ملنے جلنے کی مخالفت کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کے اخلاق و اعمال و حالات انسان کے اندر اثر انداز ہو جائیں گے اور اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ انسان کے اپنے اعمال و افعال کا دل پر اثر ہوتا ہے، چنانچہ زر سے سے عمل کے جاری رکھنے اور اس پر توجہ دینے سے خود انسان کا دل شدید متاثر ہو جائے گا کہ اس سے قلب کا پاک ہونا اور دل کی تطہیر سب سے دشوار تک آسان و ممکن نہ ہوگی۔ اسی سے پتہ چل گیا کہ اگر انسان نے اپنے کو جدال اور خصومت میں مشغول رکھا تو تھوڑی سی مدت گزرنے کے بعد قلب کے اندر بہت ہی ہولناک کدورت و تاریکی پیدا ہو جائے گی اور زبان کی ظاہری خصومت قلب کی باطنی خصومت تک پہنچ جائے گی اور یہ خود سب سے بڑا نفاق اور دورنگی ہے۔ اس نفاق کے مفاسد کو بھی بحث و جدال میں جھگڑے کے مفاسد میں شمار کرنا چاہیے اور نفاق کے فسادی شرح پہلے کی ہم کسی حدیث کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں ﴾۲۵ اس لئے اس کے تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت امام جعفر صادقؑ نے صاحبان جہل و جدال کیلئے کچھ علائم و آثار بیان فرمائے ہیں ان میں سے ایک مردم آزاری اور بری نشست و برخاست ہے کہ یہ قابل مذمت و اس مفاسد میں ہے جو انسان کی ہلاکت کیلئے سبب مستقل ہے۔ کافی شریف میں ہے: ﴿من اذی لی ولیاً فقد بارزنی بالمحاربة﴾۲۶ ''جو میرے کسی دوست کو اذیت پہنچائے اس نے مجھ کو جنگ کی دعوت دی'' اس حدیث میں مومنین و دوستان خدا کی اذیت کو خدا سے مقابلہ اور دست پروردگار عالم سے مخاصمت قرار دی گئی ہے اس باب میں بہت زیادہ حدیثیں ہیں جو اس مختصر کتاب میں نہیں سما سکتیں۔

دوسری علامت یہ بتائی گئی ہے کہ علمی مقامات اور علمی مذاکرے کو غلبہ اور اظہار فضیلت کیلئے بحث و جدال کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے اور مراء کو جو علامت مراء سے قرار دیا ہے، ہو سکتا ہے کہ پہلے مراء صفت قلبی اور اس کے برے اثرات مراد ہوں اور جس مراء کو علامت قرار دیا ہے وہ اس کا اثر اور ظاہری علامت ہو۔

تیسری علامت یہ بتائی گئی ہے کہ حلم و بردباری کی (تعریف و) توصیف کرتا ہے، حالانکہ خود اس سے متصف نہیں ہے اور یہ خود نفاق اور ریا کاری و شرک ہے جیسے زہد و تقویٰ سے خالی ہونے کی حالت میں اظہار

خشوع کرنا بھی شرک ونفاق وریاکاری کی واضح ترین علامت ہے۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ اس صفت کے ایسے عظیم مفاسد ہیں کہ ان میں سے ہر ایک ہلاک وبرباد کرنے والا ہے (اس لئے) ضروری ہے کہ ہر قسم کی ریاضت وزحمت کے ذریعے اپنے کو اس ننگ آور خصلت اور قلبی رذیلت سے جو ایمان کش اور مخرب قلب ہے نجات دیں اور دل کو اس ظلمت وکدورت سے آزاد کرائیں اور اس کو خلوص نیت اور صدق باطن سے مزین اور صاف کریں۔

اس باب میں ایک خاص نکتہ یہ ہے کہ اگر انسان اس میں تھوڑا سا بھی غور کرے تو اس کی کمر توڑنے کیلئے کافی ہے۔ چنانچہ حضرت صادقؑ نے ان علامتوں کے ذیل میں فرمایا ہے ”خدا اس کی ناک رگڑ دے اور اس کی کمر توڑ دے“۔ اب حضرتؑ کا یہ فرمانا یا تو خبردار کرنے کیلئے ہے یا پھر بددعا ہے۔ جو بھی ہو اس کا وقوع ہونا ضروری ہے اس لئے کہ اگر یہ خبردار کرنے کیلئے ہے تو صادق ومصدق کی طرف سے ہے اور اگر بددعا ہے تو معصوم وولی اللہ کی بددعا ہے جس کا مستجاب ہونا یقینی ہے اور یہ خود ہی ذلت ورسوائی سے کنایہ ہے اور ہو سکتا ہے انسان دونوں عالم میں ذلیل ورسوا ہو جائے۔ اس عالم میں تو وہ جن لوگوں کے سامنے آبرومند ہونا چاہتا تھا اپنی خودنمائی اور اظہار فضیلت کی وجہ سے وہ ذلیل ورسوا ہو جائے گا اور اس کی قیمت گر جائے گی اور انہیں لوگوں کے سامنے ذلیل ورسوا ہو جائے گا جن پر اپنی برتری بتانا چاہتا تھا اور عالم آخرت میں ملائکہ مقربینؑ، انبیائے مرسلینؑ، اولیائے معصومینؑ اور بندگان صالحین کے سامنے ذلیل ورسوا خوار وبے مقدار ہو جائے گا۔

پس وائے ہو ہم لوگوں پر جو اصحاب مراء وجدال اور خواہشات نفسانیہ کے پیرو اور بڑی جھگڑے والے ہیں۔ ہم اس نفس خبیث وبے رحم کے ہاتھوں کس قدر مبتلا ہیں۔ ہم سے یہ نفس اپنا ہاتھ اٹھانے والا نہیں ہے جب تک تمام مشقتوں اور دنیاؤں میں ہم کو ہلاک نہ کردے۔ ہم کسی وقت بھی اصلاح نفس کی طرف متوجہ نہیں ہوں گے اس نے غفلت کی روئی ہمارے کانوں میں ٹھونس رکھی ہے (تاکہ) طبیعت کے سنگین خواب سے بیدار نہ ہو سکیں۔

پروردگارا! تو بندوں کی اصلاح کرنے والا اور دلوں کا مالک ہے، تمام موجودات کا وجود تیرے دست قدرت میں ہے اور تمام بندوں کے دل تیرے ارادۂ تامہ کے زیر اثر ہیں، ہم نہ اپنے مالک ہیں اور نہ ہی اپنے نفع ونقصان اور موت وحیات کے مالک ہیں، تو ہمارے کدورت بھرے دلوں اور تاریک قلوب کو اپنے

فیض کی روشنی سے منور کر دے اور ہمارے معاشرے کی اپنے فضل و کرم سے اصلاح فرما دے اور ہم گمراہوں اور بے چاروں کی دستگیری فرما

تیسری فصل

جس طرح حدیث کی پہلے فقرے میں ذکر ہوا کہ مراء (کے دو مرتبے ہیں ان) کا ایک مرتبہ باطنی و نفسانی ملکہ ہے اور دوسرا مرتبہ ظاہری جو کہ اس کی پیداوار ہے اور یہ ظاہری مرتبہ اس باطنی مرتبے کی علامت و نشانی ہے۔ اسی طرح امامؑ نے دوسرے فقرے کے بارے میں فرمایا ہے کہ عزت و برتری اور دھوکہ دہی کا ایک مرتبہ باطنی اور مخفی ہے جو اس امر کا ملکہ ہے اور ایک مرتبہ ظاہری ہے جو اس ملکہ کا نتیجہ ہے اور بیشتر کمال و افعال میں قلب کا بھی حصہ ہے جو کبھی تو ملکہ کے مرتبے تک پہنچ جاتا ہے اور کبھی صرف حال کے مرتبے میں ہوتا ہے اور ظاہری اعمال اس کے نتائج ہوا کرتے ہیں۔ پس جن لوگوں میں برتری جو باطنی دھوکہ اور مکر و فریب کا ملکہ ہے اس کی علامتیں اور ظاہری نشانیاں بھی ان میں موجود ہیں اور ان میں سے بعض علامتوں کو حضرت صادقؑ نے بیان بھی فرمایا ہے۔ ایک علامت دھوکہ دہی اور مکر و فریب کی یہ ہے کہ ایسے لوگ اپنے کو نیک اور صالح ظاہر کرتے ہیں، حالانکہ باطن میں ایسے نہیں ہیں، یہ لوگ بھیڑ کی صورت میں بھیڑیے اور انسانی لباس میں شیطان ہیں، یہ لوگ بدترین مخلوق ہیں ان کا ضرر لوگوں کے دین میں مخالف لشکر سے کہیں زیادہ ہے۔

ان لوگوں کی دوسری واضح صفت یہ ہے کہ جن لوگوں سے ان کے مفادات وابستہ ہوتے ہیں ان کے چاپلوس اور متواضع ہوتے ہیں۔ چاپلوسی، دھوکہ بازی اور تواضع کا جال بچھا کر بے چارے کمزور لوگوں کا شکار کرتے ہیں اور ان کے ارادت و محبت کے شیریں جلوے اور دنیاوی منفعت سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اس کے بدلے میں اپنے دین سے ہاتھ اٹھا کر اپنے ایمان کو بیچ ڈالتے اور اس کو دنیا کے عوض دے دیتے ہیں لوگوں کا یہ وہی گروہ ہے جس کے بارے میں حدیثوں میں آیا ہے کہ اہل بہشت ان کو دیکھیں گے تو کہیں گے اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم تو تمہاری تعلیمات کی وجہ سے بہشتی ہو گئے پھر تم لوگ کیسے جہنمی ہو گئے؟! تو وہ لوگ جواب دیں گے ہم اپنے قول پر عمل نہیں کرتے تھے۔ (۲۷)

ان لوگوں کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ اپنے ہم منصبوں سے اور اپنے جیسے لوگوں سے جن سے زیادہ طمع کی امید نہیں ہوتی اور جن کو اپنی ترقی کے راستے کا کانٹا خیال کرتے ہیں ان کے ساتھ تکبر سے پیش

آتے اور ان پر اظہار برتری کرتے ہیں اور حتی الامکان قول وعمل کے ذریعے ان کی تحقیر کرتے ہیں اس لئے کہ ان کو خطرہ رہتا ہے کہ اگر ان کا کوئی شریک پیدا ہوگیا تو پھر ان کا اعتبار (اور احترام) کم ہو جائے گا۔

یہ بات جان لینی چاہئے کہ اہل علم وزہد وتقویٰ کے لباس میں دینداری مشکل ترین اور سخت ترین چیز ہے اور اس سلسلے میں قلب کی حفاظت بھی (بہت مشکل ہے) اسی لئے اس طبقے میں اگر کوئی اپنے فرائض کی انجام دہی کرے اور خلوص نیت کے ساتھ اس مرحلے میں داخل ہو اور فقط اپنی نجات کی فکر میں رہے، اپنی اصلاح کے بعد دوسروں کی اصلاح کی کوشش کرے اور ایتام آل رسول کی حفاظت کرے تو اس کا شمار مقربین اور سابقین میں ہونے کے لائق ہے۔ جیسے کہ امام جعفر صادق نے حضرت امام محمد باقر کے چار صحابیوں کو مقربین اور سابقین میں شمار فرمایا ہے۔ (مثلاً) وسائل میں رجال کشی کے حوالے سے "ابو عبیدة الحذاء" تک سند پہنچائی گئی ہے کہ وہ کہتے ہیں میں نے امام جعفر صادق کو فرماتے ہوئے سنا

زُرارَةُ، ومُحَمَّدُ بْنُ مُسْلِمٍ، وأبُو بَصيرٍ، وبُرَيْـدٌ، من الَّذين قـال اللهُ تعالىٰ ﴿والسّابقُون السّـابقُون اُولـئك الْمقرَّبُون﴾ ۲۸ "زرارہ، محمد بن مسلم، ابو بصیر و بریدہ کا شمار ان لوگوں میں ہے جن کیلئے قرآن نے کہا ہے جو آگے بڑھ جانے والے ہیں (وہ کیا کہنا) وہ آگے ہی بڑھنے والے تھے، یہی لوگ خدا کے مقرب ہیں"۔

اس سلسلے میں بہت حدیثیں منقول ہیں اور اہل علم کی اتنی فضیلت ہے جو بیان میں نہیں آسکتی۔ رسول اکرم کی حدیث ان کیلئے کافی ہے، ارشاد ہوتا ہے ﴿منْ جاءَهُ الْمـوتُ وهُو يطْلُبُ الْعلْم ليُحْيِي به الاسـلام، كان بينهُ وبيْن الأنْبياء درجةٌ واحدةٌ في الْجنَّة﴾ ۲۹ "جس کی موت اس عالم میں آئے کہ وہ طلب علم اس لئے کر رہا ہو تا کہ اس سے اسلام کو زندہ کرے تو جنت میں اس کے اور انبیاء کے درمیان ایک درجے کا فاصلہ ہوگا"۔

اس کے بعد خدا نے چاہا تو کچھ ان کی فضیلت کا بھی ذکر ہوگا، لیکن اگر خدانخواستہ راہ خلوص سے ہٹ گیا اور باطل کی راہ پر لگ گیا تو اس کا شمار ان علمائے سوء میں ہوگا جو بدترین خلق خدا ہیں اور جن کے بارے میں سخت قسم کی احادیث نقل کی گئی ہیں اور (عجیب) وغریب تعبیرات کی گئی ہیں۔ اہل علم وطلاب کو اس پرخطر راستے کیلئے سب سے پہلے جو چیز پیش نظر رکھنی چاہئے وہ یہ ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں اپنی اصلاح کریں اور حتی الامکان اس بات کو تمام امور پر مقدم کریں۔ یہ تمام واجبات عقلیہ اور فرائض شرعیہ سے

واجب تر اور اہم تر ہے۔

ہاں اے کمالات و معارف و علوم کے طلبگار! خواب سے بیدار ہو جاؤ اور جان لو کہ خدا کی حجت تمہارے اوپر تمام ہو چکی ہے۔ خدا عالم دین سے زیادہ باز پرس کرے گا۔ آپ کے اعمال و علوم کا معاملہ دوسرے بندگان الٰہی کے معاملے سے بہت ہی فرق رکھتا ہے۔ آپ کا راستہ زیادہ باریک اور تنگ ہے۔ آپ کے حساب میں بحث و مباحثہ زیادہ ہوگا۔ اس طالب علم پر وائے ہو جس کے دل میں علوم سے کدورت وظلمت پیدا ہو جائے چنانچہ ہم خود اپنے کو دیکھتے ہیں کہ اگر چند ناقص مفہوم اور تھوڑے سے حاصل اصطلاحات کو سیکھ لیتے ہیں تو راہ حق سے رک جاتے ہیں نفس و شیطان کا ہمارے اوپر غلبہ ہو جاتا ہے اور نفس و شیطان ہم کو انسانیت و ہدایت کے راستے سے روک دیتے ہیں۔ سب سے بڑا حجاب ہمارے یہی بے سروپا مفاہیم ہیں، ذات پروردگار عالم کی پناہ حاصل کئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔

بارالٰہا! ہم اپنی تقصیر کے معترف اور گناہ کے مقر ہیں۔ نہ ہم نے تیری رضا کیلئے ایک قدم بڑھایا ورنہ ہی خلوص سے تیری عبادت و اطاعت کی۔ تو اپنے فضل عام اور رحمت واسعہ کے ذریعے ہمارے ساتھ برتاؤ کر اور جس طرح اس دنیا میں تو نے ہمارے عیوب کی پردہ پوشی کی ہے آخرت میں بھی پردہ پوشی فرما۔ (کیونکہ) وہاں ہم مغفرت اور پردہ پوشی کے زیادہ محتاج ہیں۔

یہاں پر بھی ضروری ہے کہ حدیث کے پہلے فقرے کے ذیل میں جو نکتہ ہے اس کو یاد دلاؤں اور وہ یہ ہے کہ اس فقرے کے ذیل میں حضرتؑ نے فرمایا ہے ''خدا اس کی بینائی و بصیرت کو اندھا کرے اور دفتر علماء سے اس کے آثار مٹا دے''۔ یہ چاہے خبر ہو یا بددعا، بہر حال واقع ہونے والی چیز ہے۔ انسان کو اس بصیرت کے اندھے پن اور کور باطنی سے بہت پرہیز کرنا چاہئے، کیونکہ یہی تمام شقاوتوں اور تاریکیوں کا منشأ ہے اور تمام بدبختیوں کا سرچشمہ یہی نابینائی قلب اور بے بصیرتی ہے۔ اسی طرح آثار علماء سے مٹ جانا اور ان کے کرامات و عطیات سے محروم ہو جانا بھی (اتنا بڑا عذاب ہے) جس کا ہم تصور نہیں کر سکتے اور یہ علاوہ اس ننگ و رسوائی کے ہے جو قیامت میں خاصان خدا کے سامنے ہوگی۔

چوتھی فصل

جو لوگ صاحب فہم و عقل ہیں یعنی جن لوگوں کا مقصد فقہ دین کا حصول اور ادراک حقائق ہے (ان کے

بھی) "شمار علامتیں ہیں جن میں سے عمدہ علامتوں کو بیان کر دیا گیا ہے، (مزید درج ذیل ہیں)

ایک تو یہ ہے کہ حصول علم کی وجہ سے ان کے دلوں میں حزن و اندوہ اور انکسار رہتا ہے اور یہ انکسار وحزن مت جانے دو کہ یہ پست دنیوی امور کیلئے نہیں ہے، بلکہ آخرت کے خوف اور فرائض عبودیت میں قصور کی وجہ سے ہے اور یہ انکسار وحزن جس طرح قلب کو روشنی بخشتا اور صاف کر دیتا ہے اسی طرح یہ اصلاح نفس کا مبدا، اور فرائض عبودیت و بندگی کے ادائیگی کا محرک بھی ہوتا ہے تو علم، عالم کے دل سے آرام وچین کو چھین لیتا ہے اور اس کو خدا اور اس کے دار کرامت سے آشنا کر دیتا ہے۔ خدا سے مناجات میں لذت پیدا کرتا اور قوتوں کو بیداری پر اور وظائف بندگی کی ادائیگی پر آمادہ کر دیتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے ﴿فـقـد تـحـنـک فـي بُـرنُـسـه وَقـام اللّيل في حندسه﴾ "اپنے عمامہ میں حنک باندھتا اور تاریکی شب میں (عبادت کیلئے) جاگتا رہتا ہے" اس میں پہلے جملے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لزوم عبادت سے کنایہ ہے۔

دوئم یہ کہ اس عالم ربانی کی ایک پہچان یہ ہے کہ مکمل طور سے فرائض بندگی کو ادا کرنے کے باوجود وہ خوفزدہ رہتا ہے، اور علم اس کو ہدایت کرتا رہتا ہے کہ تم چاہے جس قدر اپنے فریضے کو پورا کرو پھر بھی قاصر اور مقصر ہو اور شکر نعمت وحقیقت عبادت کے عہدے کو پورا نہ کر سکو گے۔ اس لئے اس کا دل خوف وخشیت الٰہی سے پر رہتا ہے، اور خدا نے انہی علماء کے بارے میں فرمایا ہے ﴿انما یخشی الله من عباده العلماء﴾ [۴۰] "خدا سے صرف اس کے وہ بندے ڈرتے ہیں جو عالم ہیں"۔ اور علم خوف وحزن لاتا ہے اور عالم اگرچہ اپنے نفس کی اصلاح کرتا رہتا ہے پھر بھی خوف آخرت سے آرام نہیں پاتا اور خدا سے اپنی اصلاح کا خواہاں رہتا اور حق کے علاوہ (کسی اور کام میں) مشغول رہنے سے خوفزدہ ہوتا ہے۔ اپنے زمانے والوں سے بھاگتا ہے اور ڈرتا رہتا ہے کہ (اہل زمانہ) اس کو خدا کے راستے اور عالم آخرت کی طرف سفر سے روک نہ دیں اور دنیا ولذائذ دنیا اس کیلئے پیش کر کے اس کو لبھا نہ لیں۔

خداوند عالم ایسے ہی شخص کی تائید کرتا ہے اور اس کے ارکان وجود کو مستحکم کرتا اور قیامت کے دن اس کو امان عطا کرتا ہے ﴿یا لیتنی کنت معهم فافوز فوزاً عظیماً﴾ "کاش ہم بھی ان کے ساتھ ہوتے تو ہم بھی عظیم کامیابی پر فائز ہوتے"

والحمد لله اولاً وآخراً وصلی الله علی محمد وآله الطاهرین

توضیحات (۲۳)

۱۔ اصول کافی، ج ۱، ص ۴۹، کتاب فضل العلم، باب النوادر، حدیث ۵۔

۲۔ وسائل الشیعہ، ج ۲، ص ۵۹، کتاب التجارۃ، باب [illegible] حدیث [illegible]

۳۔ مرآۃ العقول، ج ۱، ص ۱۵۹، کتاب فضل العلم، باب [illegible]، حدیث ۵۔

۴۔ "جہل" کا مطلب بے خودی اور زرگ [illegible] ہے [illegible] جس [illegible] چیز نے جو عقل سے [illegible]۔
مرآۃ العقول، ج [illegible] ص ۱۶۰، کتاب فضل العلم، باب النوادر، حدیث ۵

۵۔ [illegible] چکا

۶۔ حدیث ۲۳، فصل ۳

۷۔ چنانچہ عرصت بہ الشیء [illegible] وقت [illegible] [illegible] آ گیا [illegible] جائے

۸۔ حدیث ۲۳، فصل ۲ [illegible]

۹۔ [illegible] اس شخص کو کہتے ہیں جو [illegible] میں [illegible]

۱۰۔ [illegible] مرآۃ العقول، ج [illegible] ص [illegible] کتاب فضل العلم [illegible] حدیث ۵

۱۱۔ [illegible] حدیث جو [illegible] سے منقول ہے اس میں ہے [illegible] علم سیکھنے کے [illegible]
کی ہدایت کرنا چاہتا ہے اس کے دل میں ڈال دیتا ہے۔

۱۲۔ [illegible] ج [illegible] ص ۲۲۵، کتاب العلم [illegible] حدیث ۷

۱۴۔ سورۂ بقرہ آیت ۲۸۲۔

۱۵۔ شرح [illegible] جلد دوم ص ۵۲ [illegible] ج ۳ ص ۳، حدیث ۳۱ حضرت علیؑ کے [illegible]

۱۶۔ اصول کافی ج [illegible] ص ۴۴ کتاب فضل العلم، باب المستاکل بعلمہ، حدیث ۲۔

۱۷۔ حدیث [illegible] فصل ۲

۱۸۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۰۰، کتاب الایمان والکفر، باب المراء والخصومۃ، حدیث ۲۔

۱۹۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۰۱، کتاب الایمان والکفر، باب المراء والخصومۃ، حدیث ۸

۲۰۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۰۱، کتاب الایمان والکفر، باب المراء والخصومۃ حدیث ۹

۲۱۔ حدیث ۱، مقالہ ۲، فصل ۲ حدیث ۹، فصل ۳۔

۲۲۔ علم الیقین، ج ۱، ص ۲۸۳، المقصد الثانی فی المعقبات والمطیعین۔

مسند حنبل، ص ۵۶ تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

۲۳۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۶۴۰، کتاب العشرۃ، باب من تکرہ مجالستہ، حدیث ۲۔

۲۴۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۶۴۰، کتاب العشرۃ، باب من تکرہ مجالستہ، حدیث ۳۔

۲۵ حدیث ۹، فصل ۲۔

۲۶۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۵۲، کتاب ایمان و کفر، باب من اذی المسلمین، حدیث ۸۔ اس میں "آذی" کے بجائے "اہان" ہے اور بحار، ج ۲۷، ص ۴۶ کتاب العشرۃ، باب ۵۶ میں ہے ﴿من اذی ولیًّا فقد ارصدنی بالمحاربة﴾

۲۷ وسائل الشیعہ، ج ۱۱، ص ۴۲۰ کتاب الامر بالمعروف، باب ۱۰ از ابواب الامر والنہی، حدیث ۱۲

۲۸۔ وسائل الشیعہ، ج ۱۸، ص ۱۰۵، کتاب القضاء، باب ۱۲ از ابواب صفات قاضی، حدیث ۲۲۔

۲۹ سنن دارمی، ج ۱، ص ۹۰ تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ

۳۰ سورۂ فاطر، آیت ۲۸۔

چوبیسویں حدیث

بالسند المتّصل الى أفضل المحدّثين وأقدمهم، محمّد بن يعقوب الكليني رضوان الله عليه، عن مُحمّد بن الحسن وعليّ بن مُحمّد، عن سهل بن زياد، عن مُحمّد بن عيسى، عن عبيد الله بن عبد الله الدهقان، عن دُرُست الواسطي، عن ابراهيم بن عبد الحميد، عن أبي الحسن موسى عليه السلام قال:

﴿دخل رسُولُ الله صلى الله عليه وآله المسجد فإذاً جماعة قد أطافُوا برجلٍ، فقال: ما هذا؟ فقيل: علاّمةٌ. فقال: وما العلاّمة؟ فقالُوا له: أعلمُ النّاسِ بأنسابِ العرب ووقائعها وأيّام الجاهليّة والأشعارِ العربيّة.

قال: فقالَ النّبيُّ صلى الله عليه وآله: ذاكَ علمٌ لا يضُرُّ من جهلهُ ولا ينفعُ من علمهُ. ثُمّ قال النّبيُّ صلى الله عليه وآله: ﴿إنّما العلمُ ثلاثةٌ: آيةٌ مُحكمةٌ أوْ فريضةٌ عادلةٌ أوْ سُنّةٌ قائمةٌ، وما خلاهُنّ فهو فضلٌ﴾.

ترجمہ: امام موسیٰ کاظمؑ نے فرمایا: "(ایک مرتبہ) رسول خداؐ مسجد میں تشریف لے گئے تو دیکھا لوگوں نے ایک شخص کو (ہر طرف) سے گھیر رکھا ہے۔ حضرتؐ نے پوچھا یہ کیا ہے؟ لوگوں نے کہا یہ علامہ ہے! حضرتؐ نے کہا علامہ کیا ہے؟ لوگوں نے کہا یہ شخص انساب عرب، اور زمانہ جاہلیت کے واقعات اور عربی اشعار کا سب سے زیادہ جاننے والا ہے۔

امامؑ نے فرمایا: اس پر آنحضرتؐ نے فرمایا یہ علم نہ جاننے والے کیلئے نقصان دہ نہیں ہے اور جاننے

والے کیلئے فائدہ مند (بھی) نہیں ہے۔ اس کے بعد آنحضرت ؐ نے فرمایا علم صرف تین ہیں آیت محکمہ (پائدار نشانی)، فریضہ عادلہ (سچے فریضے) اور سنت قائمہ (مستحکم روایت کا علم)۔ ان کے علاوہ جو بھی ہے وہ فضل ہے۔

شرح: بعض نسخوں میں "ما ھذا" کے بجائے "من ھذا" (یہ کون ہے؟) آیا ہے۔ اس شخص کی تحقیر کیلئے شاید "ما ھذا" فرمایا ہے۔ علامہ مبالغے کا صیغہ ہے، ور آخر میں "تا" بھی مبالغے کیلئے دی گئی ہے، یعنی بہت بڑا عالم۔

یہ جان لو کہ منطق میں بیان کیا گیا ہے کہ لفظ "من" شخصیت کے سوال کیلئے آتا ہے اور لفظ "ما" حقیقت موجود کے بارے میں سوال کیلئے آتا ہے یا پھر شرح اسم (مفہوم) کیلئے آتا ہے۔ جب لوگوں نے رسول اکرم ؐ سے کہا، یہ شخص علامہ ہے تو آنحضرت ؐ نے علامہ کی حقیقت اور اس کے علم کے مغز کے بارے میں انہیں لوگوں کے خیال کے مطابق ان سے سوال کرلیا۔ اسی لئے لفظ "ما" سے سوال کیا اور اوصاف عنوانیہ کے بارے میں کبھی تو ذات سے سوال کو وسیلہ بناتے ہیں، مثلاً اگر توصیف کی حقیقت معلوم ہو اور موصوف معلوم نہ ہو تو لفظ "من" سے سوال کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے۔ "من العلامۃ؟" علامہ کون ہے؟ اور اگر شخص معلوم ہو مگر توصیف معلوم نہ ہو یا صرف توصیف مقصود ہو تو لفظ "ما" سے سوال کیا جاتا ہے، ور اس وقت سوال کا مقصد صرف وصف کو جاننا ہوتا ہے۔ موصوف کے بارے میں سوال مقصود نہیں ہوتا اور نہ موصوف کے ہوتے ہوئے اس کی توصیف کے بارے میں سوال مقصود ہوتا ہے، ور اس حدیث میں چونکہ یہ کہا گیا تھا کہ یہ شخص علامہ ہے اس لئے آنحضرت ؐ کا مقصد یہ تھا کہ ان کے زعم میں حقیقت وصف کو معلوم کریں لہذا فرمایا علامہ کیا ہے؟ یہ نہیں پوچھا کہ علامہ کون ہے؟ یا یہ کہ کیوں اور کس وجہ سے یہ علامہ ہے؟ میں نے جو بات عرض کی ہے وہ صدر المتألہین" کی اس تحقیق سے زیادہ واضح ہے جو انہوں نے اسی حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرمایا ہے[1] مگر اس کا ذکر باعث طوالت اور ہمارے مقصد سے خارج ہے۔

پہلی فصل

جان لو اس سے پہلے ذکر ہو چکا کہ اجمالی وکلی طور سے، انسان کیلئے تین نشاءت (مقامات) ہیں یعنی (انسان) تین مقام وعالم کا مالک ہے

پہلا نشئہ آخرت و عالم غیب و مقام روحانیت و عقل ہے، اور دوسرا نشئہ برزخ (یعنی) دونوں عالموں کے درمیان کا عالم اور مقام خیال، اور تیسرا نشئہ دنیا و مقام ملک و عالم شہادت اور ان میں سے ہر ایک سے ایک مخصوص کمال، مخصوص تربیت اور اپنے نشئہ و مقام کے مناسب ایک عمل ہے اور انبیاء علیہم السلام ان اعمال کو بیان کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ پس تمام فائدہ مند علوم کی تقسیم انہیں تینوں علوم کی طرف ہوتی ہے، (یعنی) ایک علم تو وہ ہے جو عقلی کمالات اور روحانی فرائض سے متعلق ہے، اور دوسرا علم قلبی اعمال و وظائف کو بیان کرتا ہے۔ تیسرا علم جسمانی اعمال اور نفس کے ظاہری فرائض کا متکفل ہوتا ہے

جو علوم عالم روحانیت و عقل مجرد کی تربیت و تقویت کرتے ہیں وہ علوم ہیں جو ذات پروردگار عالم اور اس کے صفات جلال و جمال اور عوالم غیبیہ تجردیہ (مثلاً) ملائکہ اور ان کے اصناف و جبروت اعلیٰ اور ملکوت اعلیٰ کے بلندترین مراتب سے لے کر ملکوت سفلیٰ، ملائکہ ارضیہ و جنود خداوند عالم اور انبیاءؑ و اولیاءؒ اور ان کے مدارج و مقامات (اسی طرح) آسمانی کتابوں، نزول وحی اور نزول ملائکہ و روح کی کیفیت اور نشئہ آخرت، مخلوقات کے عالم غیب کی طرف رجوع کی کیفیت، برزخ و قیامت اور ان کی تفصیلات کی حقیقت کو بیان کرنے والے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ علوم مبدأ وجود اور اس کے مراتب و حقیقت اور قبض و بسط و ظہور اور اس کے رجوع کو بیان کرتے ہیں اور ان علوم کو بیان کرنے والے انبیاءؑ و اولیاءؒ کے بعد فلاسفہ اور بڑے بڑے حکماء و اصحاب معرفت و عرفان ہوتے ہیں۔

اور جو علوم تربیت قلب اور ریاضت قلب اور اعمال قلبیہ کو بیان کرتے ہیں اس میں وہ تمام علوم شامل ہیں جو اخلاقیات کو سنوارنے اور برباد کرنے والی چیزوں کو بیان کرتے ہیں (مثلاً) محاسن اخلاق جیسے صبر، شکر، حیا، انکساری، رضا، شجاعت، سخاوت، زہد و ورع و تقویٰ اور دیگر محاسن اخلاق اور ان کے حصول کی کیفیت اور اسباب حصول اور اس کے مبادی و شرائط اور قبیح اخلاق مثلاً حسد، تکبر، ریا، کینہ، ملاوٹ، حب جاہ و منصب، حب دنیا و نفس وغیرہ اور برے اخلاق کی مبادی اور ان سے بچنے کے طریقوں کو بیان کرتے ہیں (وہ سب قسم دوم میں شمار ہوتے ہیں) اور ان چیزوں کے بیان کرنے والے انبیاءؑ و اوصیاءؑ کے بعد علمائے اخلاق اور اصحاب معارف و ریاضت ہیں۔

اور جو علوم تربیت ظاہر اور اس کی ریاضت کو بیان کرنے والے ہیں وہ علم فقہ اور اس کی مبادی،

علم آداب معاشرت، گھریلو انتظام اور شہریت کو بیان کرنے والے ہیں۔ ان کو بیان کرنے والے انبیاء واوصیا علیہم السلام کے بعد ظاہری (علوم کے) دانشور، فقہا اور محدثین ہیں۔

یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ انسانیت کے یہ تینوں مرتبے جو ذکر کئے گئے ہیں یہ آپس میں اس طرح مربوط ہیں کہ ہر ایک کے اثرات دوسرے میں سرایت کرتے ہیں خواہ جانب کمال میں ہوں یا جانب نقص میں، مثلاً اگر کسی نے فرائض بندگی اور مناسک ظاہری کو اسی طرح انجام دیا ہے جیسا انجام دینا چاہئے اور وہ انبیاءؑ کے فرمان کے مطابق بھی رہا ہو تو اس سے اس کے قلب وروح میں ایسے اثرات کا پیدا ہو جانا ضروری ہے جس سے اس کے اخلاق اچھے ہو جائیں اور عقائد کمال کی طرف مائل ہوں۔ اسی طرح اگر کوئی تہذیب اخلاق اور تزکیہ باطن کا پابند ہو جائے تو دوسرے دونشآت (مقامات) میں وہ موثر ہوگا۔ جس طرح کمال ایمان اور مضبوط عقائد دوسرے دو مقامات میں اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کی وجہ وہ شدت تعلق ہے جو ان مقامات کے درمیان ہے، بلکہ لفظ تعلق سے تعبیر کرنا بھی صحیح مفہوم نہ ملنے کی وجہ سے ہے اور یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک حقیقت ہے جس کے بہت سے ظاہری پہلو آشکار ہیں۔ اسی طرح تینوں مقامات کے کمالات بھی ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔

اور یہ گمان تو کسی کو کرنا ہی نہیں چاہئے کہ ظاہری اعمال وعبادات کے بغیر ایمان کامل ہو سکتا یا اخلاق سنور سکتے ہیں یا جس کا اخلاق ناقص وغیر مہذب ہے اس کے اعمال اور ایمان کا کامل ہونا ممکن ہو سکتا ہے یا قلبی ایمان کے بغیر اس کے ظاہری اعمال مکمل اور محاسن اخلاق کامل ہو سکتے ہیں۔ جب ظاہری اعمال ناقص ہوں اور انبیاءؑ کے فرمان کے مطابق نہ ہوں تو پھر قلب میں حجابت اور روح میں کدورت وجود میں آنا لازمی ہے جو نور ایمان ویقین کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اسی طرح اگر قلب میں برے اخلاق ہوں گے تو وہ نور ایمان کے قلب میں داخل ہونے سے مانع ہوں گے۔

اس لئے آخرت کے مسافر، صراط مستقیم اور انسانیت کے طالب کیلئے ضروری ہے کہ تینوں مراتب کی بہت زیادہ دقت وتوجہ اور پابندی ونگرانی کے ساتھ اصلاح اور ریاضت سے کام لے اور کسی بھی علمی وعملی کمزوری سے چشم پوشی نہ کرے اور نہ یہ گمان کرے کہ صرف تہذیب اخلاق یا عقائد میں رسوخ واستحکام یا (صرف) ظاہر شریعت کی پابندی اس کیلئے کافی ہے (بلکہ تینوں کے حصول کی کوشش کرے) چنانچہ بعض صاحبان علوم ثلاثہ ان تینوں عقائد میں ماہر تھے۔ جیسے کہ شیخ اشراقؒ نے حکمۃ الاشراق کے شروع میں یوں

تقسیم فرمایا ہے "علم و عمل دونوں میں کامل ہونا، صرف علم میں کامل ہونا اور صرف عمل میں کامل ہونا"۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عمل میں نقص کے ساتھ علمی کمال حاصل ہوسکتا ہے اور علم کی کمی کے ساتھ عملی کمال بھی حاصل ہوسکتا ہے اور (شیخ اشراق") علمی کمال والوں کو اہل سعادت اور عالم غیب و تجرد کے فلاح پانے والوں میں سمجھتے ہوئے اس بات کے قائل ہیں کہ آخرکار یہ لوگ متعین ور دائمین میں شامل ہوجائیں گے۔ ۵

(البتہ) بعض علمائے اخلاق اور تہذیب باطن والوں نے تمام کمالات کا منشأ (صرف) حسن خلق، تطہیر قلب اور قلبی اعمال کو قرار دیا ہے اور اس کے علاوہ وہ عقلی حقائق اور ظاہری احکام کو قابل اہمیت نہیں سمجھتے ہیں، بلکہ عقلی حقائق اور ظاہری احکام کو سلوک کے راستے کا کانٹا خیال کرتے ہیں ۶ (اسی طرح) ظاہری علوم کے بعض علما علوم عقلیہ و باطنیہ اور معارف الہیہ کو کفر و زندقہ شمار کرتے ہیں اور ان علوم کے علما اور طلبہ سے عناد و دشمنی رکھتے ہیں۔

یہ تینوں گروہ جو باطل عقائد رکھتے ہیں یہ روحانی مقامات اور انسانی نشآت سے محروم ہیں انہوں نے انبیاءؑ و اولیاءؑ کے علوم میں صحیح طریقہ سے غور و فکر نہیں کیا ہے۔ اسی لئے خود ان تینوں میں اختلاف رہتا ہے اور یک دوسرے پر طعن (و طعن) کرتے ہیں اور ہر یک دوسرے کو باطل پر سمجھتا ہے اور ان کی مراتب کے اندر حد بندی باطل ہے۔ ویسے ایک اعتبار سے یک دوسرے کو جھٹلانے میں حق پر ہیں نہ اس اعتبار سے کہ ان کا علم یا عمل مطلق باطل ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ انسانی مراتب اور علوم و کمالات کی تحدید صرف اسی حد تک کرتے ہیں جتنے کے وہ خود اس کے مالک ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ بات بالکل خلاف واقع ہے۔

رسولخداؐ نے اس حدیث کے اندر علوم کی تقسیم تین قسموں پر کی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ تینوں علوم انہیں تینوں مرتبوں کے اعتبار سے ہیں اور اس کی تائید کتب الٰہیہ و سیرت انبیاءؑ اور روایت معصومینؑ میں متداول علوم سے ہوتی ہے کہ ان کے علوم کی تقسیم بھی ان تین قسموں پر ہوئی ہے۔

ایک تو خدا و ملائکہ، آسمانی کتابوں، انبیاءؑ و رسولوںؑ اور آخرت کا علم ہے جو تمام آسمانی کتابوں اور خاص کر خدا کی جامع کتاب قرآن مجید اس سے بھرا پڑا ہے، بلکہ یہاں تک کہا جاسکتا ہے کہ قرآن میں جس چیز کا سب سے زیادہ ذکر موجود ہے وہ اسی علم کا ہے۔ اسی طرح مبدأ و معاد کی طرف صحیح برہان سے دعوت اور اس کا مکمل بیان جس کو محققین نے ذکر کیا ہے اسی کتاب میں ہے جب کہ اس میں دوسرے دونوں مراتب کا ذکر اس کے مقابلہ میں کم ہے۔ ائمہ معصومینؑ کی احادیث میں بھی یہ مقصد موجود ہے جو ان کتابوں کے

مطالعے سے معلوم ہو سکتا ہے جو تمام علما کے نزدیک مقبول (ومعتبر) ہیں۔ جیسے کافی، توحید صدوق ؒ وغیرہ۔

اسی طرح تزکیۂ باطن اور اصلاح وتعدیل اخلاق کا ذکر کتاب الٰہی اور احادیث ائمہ علیہم السلام میں توقع سے کہیں زیادہ مذکورہ ہے، لیکن ہم بیچاروں اور اسیران ہوا وہوس کے نزدیک یہ کتابیں اور یہ ابواب متروک ہیں اور قابل اعتنا نہیں ہیں۔ (یاد رکھئے) ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب خدا ہم سے مواخذہ اور جواب طلبی کرے گا اور ائمہ معصومین ؑ کی احادیث اور ان کے علوم سے برائت کی وجہ سے نعوذ باللہ وہ ہم سے کنارہ کشی کریں گے۔ میں برے انجام اور بدترین بازگشت سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ فقہ اور مناسک ظاہرہ کے بارے میں بھی احادیث موجود ہیں اور تمام کتابیں ان سے بھری پڑی ہیں اس لئے ان کے ذکر کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

اس سے پتہ چل گیا کہ انسانی ضرورتوں اور انسانی مقامات ثلاثہ کے مطابق علوم شریعت صرف انہیں تین قسموں میں منحصر ہیں اور ان علوم کے علما میں سے کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ دوسرے پر اعتراض کرے اور اگر انسان ایک علم کو نہیں جانتا تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کو جھٹلائے اور اس کے جاننے والے کی شان میں جسارت کرے۔ جس طرح عقل سلیم کے نزدیک ثابت ہے کہ بغیر تصور کی تصدیق اخلاقی قبائح میں شمار ہوتی ہے بغیر تصور کے جھٹلانا بھی اسی طرح قبیح ہے، بلکہ یہ تو اس سے بھی بدتر ہے۔ اگر خداوند عالم ہم سے سوال کرے کہ جب تم مسلک حکما کے مطابق ''وحدت وجود'' کا مطلب نہیں سمجھتے تھے اور اس علم کے عالم اور صاحب فن سے تم نے اس کو نہیں سیکھا تھا اور نہ اس علم کو اور نہ اس کے مقدمات کو جانتے تھے تو تم نے اندھی تقلید کرکے ان کی تکفیر اور توہین کیوں کی؟؟ تو ہمارے پاس خدا کے سامنے سوائے شرمندگی سے سر جھکانے کے علاوہ کوئی جواب نہ ہوگا اور یہ عذر کرنا کہ ''میں تو یہی سمجھتا تھا'' قابل قبول نہ ہوگا۔ (سن لو!) ہر علم کی کچھ مبادی اور (کچھ) مقدمات ہوتے ہیں۔ جب تک آدمی ان مقدمات کو سمجھ نہ لے نتیجے کا سمجھنا آسان نہیں ہے۔ خصوصاً ایسے باریک مسئلے میں جس میں پوری عمر گنوا کے بھی اصل حقیقت معلوم نہیں ہوتی اور حقیقی طور سے اس کے مغز تک رسائی نہیں ہوتی۔ جس مسئلے کے بارے میں ہزاروں سال سے حکماء وفلاسفہ بحث کررہے ہوں اور اس میں بال کی کھال نکال رہے ہوں تم اس کو ایک کتاب کے مطالعے سے یا مثلاً مثنوی کے ایک شعر کے ذریعے اپنی ناقص عقل سے سمجھ لوگے؟ ناممکن ہے۔ اس سے تم کچھ بھی نہ سمجھ پاؤگے۔

﴿رَحِمَ اللّٰهُ امْرَأً عَرَفَ قَدْرَهُ وَلَمْ يَتَعَدَّ طَوْرَهُ﴾ یعنی ''خدا اس بندے پر رحم کرے جو اپنی قدر سمجھے اور

بھی حد سے آگے نہ بڑھے۔

اسی طرح اگر ایک فلسفی، حکیم یا صوفی عارف سے سوال کیا جائے کہ تم نے ایک فقیہ کو طعن کیا اور ظاہری کہا اور اس پر طعن کیا، بلکہ علوم شرعیہ کے ایک حصہ پر حملہ کیا، ایسے علوم شرعیہ جن کو نفوس بشری کی تکمیل کیلئے خدا کی طرف سے انبیاء لائے تھے تم نے ان کی توہین کی تو آخر کس دینی اعتبار سے ایسا کیا؟ اور کس شرعی یا عقلی دلیل سے تم نے علماء و فقہاء کے ایک گروہ کے خلاف جسارت کو تم نے جائز سمجھا؟ تو وہ حکیم خدا کے سامنے سوائے شرمندگی سے سر جھکا لینے کے علاوہ کوئی جواب نہیں دے سکے گا۔ بہر حال ہم اس مرحلے سے گزرنا چاہتے ہیں، کیونکہ اس سے ملال و رنج ہوگا۔

دوسری فصل

جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ رسولخدا نے جن تین علوم کا ذکر فرمایا ہے وہ یہی تین علوم ہیں جن کو بیان کیا گیا، اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ تین عناوین کن علوم پر منطبق ہیں؟ گرچہ اس کی کوئی بہت زیادہ ضرورت نہیں ہے، کیونکہ اصل بات ان علوم کا سمجھنا اور اس کے بعد ان کا حاصل کرنا ہے، لیکن حدیث بالا کی تشریح کیلئے اس کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔

اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جن بڑے بڑے علماء نے اس حدیث کی شرح فرمائی ہے انہوں نے بعض اختلافات کا اظہار کیا ہے اور چونکہ ان اختلافات کو ذکر کرنا اور اس میں بحث کرنا باعث طوالت ہے اس لئے میں صرف اس نکتے کا ذکر کروں گا جو میری نظر قاصر میں ان شواہد کی بنا پر ثابت ہے جن کا ابھی ذکر نہیں ہوا ہے اس کے بعد اس اہم نکتے کا ذکر کروں گا جس کو ہمارے شیخ بزرگوار عارف کامل شاہ آبادی (رہ معظم) نے بیان کیا ہے۔

جان لو کہ "آیت محکمہ" سے مراد علوم عقلیہ و عقائد حقہ اور معارف الٰہیہ ہیں اور "فریضہ عادلہ" سے مراد علم اخلاق و تطہیر قلوب ہے اور "سنت قائمہ" سے مراد علم ظاہر اور جسمانی امور سے متعلق علوم ہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ لفظ آیت بمعنی علامت و نشانی ہے جو عقلی اور نظریاتی علوم سے مناسب ہے، کیونکہ عقلی اور نظریاتی علوم ہی ذات و اسماء و صفات، اور دیگر معارف کی نشانیاں اور علامتیں ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر علوم کو آیت و نشانی سے تعبیر کرنے کی نظیر نہیں ملتی۔ مثلاً قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر وجود پروردگار یا اسما

وصفات خداوند عالم پر دلیل یا قیامت اور اس کی کیفیات اور عالم غیب و برزخ پر برہان قائم کرنے کے بعد ارشاد ہوا ہے: "یہ آیت ہے یا آیات ہیں ان لوگوں کیلئے جو غور وفکر کرتے ہیں یا جو عاقل ہیں"۔ ان علوم ومعارف کیلئے یہ تعبیر رائج ہے۔ لیکن اگر شرعی فروع میں سے کسی ایک فرع کا ذکر کیا جائے یا کسی اخلاقی قاعدے کو بیان کیا جائے تو وہاں پر یہ کہنا کہ "یہ آیت ہے" قبیح نظر آئے گا، جیسا کہ واضح ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ آیت، علامت یا نشانی کے الفاظ علوم معارف کیلئے مناسب ہیں، (بلکہ) ان کیلئے مخصوص ہیں جیسے لفظ "محکمہ" بھی انہیں علوم سے مناسبت رکھتا ہے، کیونکہ یہ علوم میزان عقل اور مضبوط دلیل کے مطابق ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر علوم کو برہان محکم سے تعبیر نہیں کیا جاتا۔

اور "فریضہ عادلہ" سے علم اخلاق مراد ہونے کی دلیل یہ ہے کہ فریضہ کی صفت عادلہ آئی ہے اور علم اخلاق میں یہ بات طے شدہ ہے کہ افراط وتفریط کی حد سے جو خارج ہو وہی "خلق حسن" ہے اور افراط وتفریط دونوں مذموم ہیں اور "عدالت" جو ایک وسطی و درمیانی چیز ہے وہی مستحسن ہے، مثلاً "شجاعت" اخلاق حسنہ اور ملکہ حسنہ کے اصول وارکان میں سے ایک ہے اس سے مراد وہ حالت متوسطہ ہے جو افراط (تہور) اور تفریط (بزدلی) کے درمیان ہوا کرتی ہے۔ تہور کا مطلب ڈرنے کی جگہ نہ ڈرنا ہے، اور بزدلی کو جبن سے تعبیر کیا گیا ہے جس کا مطلب نہ ڈرنے کی جگہ ڈرنا ہے۔ (اسی طرح) حکمت جو ایک رکن ہے وہ بھی "سفہ" اور "بلہ" کے درمیانی چیز کا نام ہے۔ سفہ کی تعبیر "جربزہ" سے بھی کی جاتی ہے جس کا مطلب ہے جہاں پر ضرورت نہ ہو وہاں پر غور وفکر کا استعمال کرنا اور بلہ کا مطلب ہے جہاں پر فکری قوت کو استعمال کرنا چاہئے وہاں اس کو معطل وبیکار کر دینا۔ اسی طرح عفت وسخاوت کے بارے میں جو "شرہ اور خمود" کے برے صفات کے درمیان ہو وہ عفت ہے، اور جو اسراف وبخل کے صفت رذیلہ کے درمیان ہوں ہو وہ سخاوت ہے۔ پس فریضہ کا عادلہ ہونا دلالت کرتا ہے کہ یہ علم اخلاق پر منطبق ہے، بلکہ لفظ فریضہ میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔ اس لئے کہ فریضہ "سنت" کے مقابلے میں بولا جاتا ہے جو تیسری قسم کے علوم سے متعلق ہے یعنی عقل کو ادراک کرنے کیلئے یک راستے کی ضرورت ہے اور علم اخلاق اسی قسم کا ہے برخلاف سنت کے، کیونکہ سنت تو محض بندگی وعبادت سے متعلق ہے جس کا ادراک عقول کے بس سے باہر ہے۔ اسی لئے میں نے عرض کیا ہے کہ "سنت قائمہ" سے مراد عبادت وبندگی سے متعلق علوم اور آداب شرعیہ ہے جس کی تعبیر سنت سے کی گئی ہے اور عقول حسب نوع اس کے ادراک سے عاجز ہیں۔ ان کا اثبات یا ان کا سمجھنا سنت ہی پر موقوف ہے

درست کی توصیف وتعبیر "قائمہ" سے کرنا بھی واجبات شرعیہ ہی سے مناسب ہے، کیونکہ قامہ یعنی قائم کرنا، نمازوں اور زکات ہی کے ساتھ صحیح تعبیر ہے، یہ لفظ ان دوعلوم میں استعمال نہیں کیا جاتا۔ مناسبات کے لحاظ سے یہ آخری چیز ہے جس سے تطبیق ہو سکتی ہے۔ والعلم عند اللہ

تیسری فصل

اب میں اس نکتے کو بیان کرنا چاہتا ہوں جس کا وعدہ کیا تھا وہ یہ ہے کہ حدیث شریف میں علم عقائد ومعارف کی تعبیر "آیت" سے کی گئی ہے اور آیت کے معنی علامت ونشانی کے ہیں اور اس تعبیر میں یہ نکتہ ہے کہ علوم عقلیہ اور حقائق اعتقادیہ کو اگر خود ان کو سمجھنے کیلئے حاصل کیا جائے تو پھر تمام مفاہیم، اصطلاحات اور زرق برق عبارتوں اور خوبصورت ترکیبوں کو استعمال کر کے دنیوی منزلت حاصل کرنے کیلئے اگر عقول ضعیف کے حوالہ کردیا جائے تب بھی اس کو "آیات محکمات" نہیں کہا جا سکتا، بلکہ ان کو دبیز پردوں اور بیکار عقائد کا نام دیا جا سکتا ہے۔

اس لئے کہ اگر کسب علوم سے انسان کا مقصد خداوند عالم تک وصول و اسماوصفات کا حصول اور خدائی اخلاق وصفات سے متصف ہونا نہ ہو اس کے تمام ادراکات جہنمی ہو جاتے ہیں اور تاریک پردے اس کے دل کو تاریک اور چشم بصیرت کو نابینا کردیتے ہیں اور ایسا شخص قرآن مجید کی اس آیت کا مصداق ہو جاتا ہے ﴿وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَى﴾ "اور جس شخص نے میری یاد سے منہ پھیرا تو اس کی زندگی بہت تنگی میں بسر ہوگی اور ہم اس کو قیامت کے دن اندھا اٹھائیں گے"۔

پس وہ شخص اپنے کو اس عالم (آخرت) میں اندھا پائے گا (تو) خدا پر اعتراض کرے گا کہ میں تو دنیا میں بینا تھا تو نے مجھے کیوں اندھا محشور کیا؟ جواب آئے گا تو دنیا میں اندھا تھا کیونکہ تو نے میری نشانیوں کا مشاہدہ نہیں کیا اور ان کو بھلا بیٹھا تھا۔ آخرت میں بینائی کا معیار قلب وبصیرت کی بینائی ہے اور پورا بدن اور اس کی قوتیں سب کی سب قلب وعقل کے تابع ہیں اور ظلمت وہاں پر بدرجہ اتم ظاہر ہوگی اندھے، گونگے، بہرے کی ظلمت بھی اسی طرح ہوگی۔ مفاہیم واصطلاحات اور عبارتوں کے جاننے والے کتابوں اور تحریری آثار کے حافظ یہ گمان نہ کریں کہ وہ خدا اور ملائکہ اور آخرت کے بارے میں بھی علم رکھنے والے ہیں۔ اگر

ان کے علوم (واقعاً) علامت ونشانی ہیں تو پھر خود ان کے دلوں میں ان علوم نے نورانیت کا اثر کیوں نہیں بخشا اور ان کے دلوں کی تاریکیوں، مفسد اخلاق اور (برے) اعمال میں آسانی کے ساتھ کیسے اضافہ ہوگیا؟ قرآن مجید نے علماء کے پہچان کیلئے اس طرح کا معیار قرار دیا ہے ﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰؤُا﴾ "خدا کے بندوں میں خدا سے صرف علماء ڈرتے ہیں" (یعنی) خوف خدا علماء کی خصوصیت میں سے ہے۔ جس کے اندر خوف خدا نہیں ہے وہ زمرۂ علماء سے خارج ہے۔ (آپ ہی بتایئے) کیا ہمارے دلوں میں خوف خدا ہے؟ اگر ہے تو اس کا اثر کیوں نہیں ظاہر ہوتا؟

کافی شریف میں ابوبصیرؒ سے منقول ہے:

سَمِعْتُ أَبَا عَبْدِ اللهِ عليه السلام، أَوْ قَالَ أَبَا جَعْفَرٍ يَقُولُ: كَانَ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ عليه السلام يَقُولُ ﴿يَا طَالِبَ الْعِلْمِ إِنَّ الْعِلْمَ ذُو فَضَائِلَ كَثِيرَةٍ فَرَأْسُهُ التَّوَاضُعُ وَعَيْنُهُ الْبَرَاءَةُ مِنَ الْحَسَدِ وَأُذُنُهُ الْفَهْمُ وَلِسَانُهُ الصِّدْقُ وَحِفْظُهُ الْفَحْصُ وَقَلْبُهُ حُسْنُ النِّيَّةِ وَعَقْلُهُ مَعْرِفَةُ الْأَشْيَاءِ وَالْأُمُورِ وَيَدُهُ الرَّحْمَةُ وَرِجْلُهُ زِيَارَةُ الْعُلَمَاءِ وَهِمَّتُهُ السَّلَامَةُ وَحِكْمَتُهُ الْوَرَعُ وَمُسْتَقَرُّهُ النَّجَاةُ وَقَائِدُهُ الْعَافِيَةُ وَمَرْكَبُهُ الْوَفَاءُ وَسِلَاحُهُ لِينُ الْكَلِمَةِ وَسَيْفُهُ الرِّضَا وَقَوْسُهُ الْمُدَارَاةُ وَجَيْشُهُ مُحَاوَرَةُ الْعُلَمَاءِ وَمَالُهُ الْأَدَبُ وَذَخِيرَتُهُ اجْتِنَابُ الذُّنُوبِ وَزَادُهُ الْمَعْرُوفُ وَمَاؤُهُ الْمُوَادَعَةُ وَدَلِيلُهُ الْهُدَى وَرَفِيقُهُ مَحَبَّةُ الْأَخْيَارِ﴾

"میں نے امام جعفر صادقؑ (امام محمد باقرؑ بنسخہ بدل) کو فرماتے ہوئے سنا کہ آپؑ فرمارہے تھے حضرت علیؑ فرمایا کرتے تھے اے طالب علم! علم کے بہت سے فضائل ہیں۔ علم کا سر تواضع ہے، اس کی آنکھ حسد سے بری ہونا ہے، اس کے کان سمجھ ہیں، اس کی زبان سچائی ہے، اس کا حافظہ تلاش ہے، اس کا دل حسن نیت ہے، اس کی عقل اشیاء وامور کی معرفت ہے، اس کے ہاتھ رحمت اور پیر علماء کی زیارت ہیں، اس کی ہمت سلامت، اس کی حکمت پرہیزگاری، اس کا ٹھکانہ نجات، اس کا قائد عافیت اور سواری وفا ہے، اس کا ہتھیار نرم کلامی، اس کی تلوار رضامندی اور اس کی کمان رواداری ہے، اس کا لشکر علماء سے گفتگو، اس کا مال ادب، اس کا ذخیرہ گناہوں سے اجتناب، اس کا زاد معروف، اس کا پانی سازگاری اور اس کا رہنما ہدایت اور دوست نیک لوگوں سے محبت ہے"[۲]۔

حضرت امیر المومنینؑ نے جن چیزوں کا ذکر فرمایا ہے یہ سب علماء اور علم کے آثار وعلائم ہیں۔ اب

اگر کوئی علوم رسمیہ کا عالم ہے مگر ان چیزوں سے خالی ہے تو اس کو سمجھ لینا چاہئے۔ اس کے پاس علم کا کوئی حصہ نہیں ہے اور وہ اہل جہالت وضلالت سے ہے۔ دوسرے عالم میں یہ تمام مفاہیم اور جہالت مرکبہ اور سارے قال وقیل اس کیلئے ظلمانی حجاب بن جائیں گے اور قیامت میں بہت بڑی ندامت ہوگی اس لئے میزان علم یہی ہے کہ وہ علامت ونشانی ہے۔ خودی اور خودغرضی کا اس میں شائبہ تک نہ ہو۔ انانیت اس میں ختم اور نابود ہو جائے نہ یہ کہ باعث نخوت وتکبر وخود بینی وخودنمائی بنے۔

اسی طرح حضرت" نے ''محکمہ'' فرمایا ہے اس لئے کہ صحیح علم وہی ہے جس کی نورانیت اور روشنی کی وجہ سے قلب میں اطمینان پیدا ہو، شک وشبہ زائل ہو جائے اس لئے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص تمام عمر براہین ودلائل اور ان کے مقدمات میں غور وخوض کرتا ہے اور ہر ایک معارف الہیہ کیلئے متعدد براہین اور دلائل کثیرہ ذکر کرتا اور اپنے جیسوں سے مقابلہ وجدل میں برتری حاصل کر لیتا ہے، لیکن ان علوم نے اس کے دل میں کوئی اثر نہیں لیا اور نہ اس کو اطمینان بخشا، بلکہ اس کے شکوک وشبہات اور تردید میں اضافہ کر دیا۔ لہذا مفاہیم کو جمع کرنے اور اصطلاحات میں اضافے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، بلکہ یہ چیزیں قلب کو غیر خدا میں مشغول کر دیتی اور ذات پروردگار عالم سے غافل کر دیتی ہیں۔

اے عزیز! سب سے مکمل علاج یہی ہے کہ انسان کا علم الٰہی ہو جائے۔ جس علم میں بھی داخل ہو وہ جدوجہد کرے اور ہر قسم کی کوشش وریاضت کے ذریعے اپنے ارادے میں خلوص پیدا کرے (کیونکہ سرمایۂ نجات اور سرچشمۂ فتوحات یہی نیت کو صاف کرنا اور نیت خالص ہے ﴿من أخلص لله أربعين صباحاً جرت ينابيع الحكمة من قلبه على لسانه﴾ ۱۲ 'جو شخص بھی چالیس صبح تک خدا کیلئے خلوص برتے اس کے دل سے حکمت کے چشمے پھوٹ کر اس کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں''۔ چالیس دن کے خلوص کے یہ آثار وفوائد ہیں۔ اس لئے اگر آپ نے چالیس سال یا اس سے زیادہ ہر علم کی اصطلاحات ومفاہیم کو جمع کرنے میں کوشش کی اور اپنے کو ہر علم کا علامہ خیال کر لیا اور اپنے آپ کو خدا کے لشکر کا سپاہی شمار کرنا شروع کر دیا اس کے باوجود اپنے دل میں حکمت کا کوئی اثر نہ پایا اور زبان پر اس کا ایک قطرہ بھی ظاہر نہ ہو، تو یہ سمجھ لیجئے کہ آپ کی تمام تعلیم وتربیت اور زحمتیں خلوص کے ساتھ نہ تھیں، بلکہ سب شیطان اور خواہش نفس کیلئے تھیں۔ پس اب جب یہ معلوم ہو گیا کہ ان علوم سے کوئی کیفیت اور حال پیدا نہیں ہوا تو تھوڑے دنوں تک چاہے بطور تجربہ ہی سہی اخلاص نیت کے ساتھ دل کو کدورت سے پاک کرنے کی کوشش کیجئے۔ اگر

اس کا کچھ اثر دکھائی دیتا ہے تو پھر پابندی سے اس کی کوشش کیجئے۔ اگرچہ تجربے کی صورت میں باب اخلاص بند ہو جاتے ہیں مگر ہو سکتا ہے کوئی دریچہ کھل ہی جائے اور اس سے نکلنے والی روشنی تمہاری ہدایت کردے۔

بہر حال اے عزیز! ہر عالم میں خواہ برزخ ہو یا قبر اور قیامت اور اس کے درجات ہوں تم سب ہی میں معارف الٰہی، علوم حقیقی، اخلاق اور نیک اعمال کے محتاج ہو۔ تم چاہے جس منزل پر فائز ہوں اس میں کوشش کرو اور اخلاق کو زیادہ کرو، اوہام نفس اور شیطانی وسوسوں کو اپنے دل سے باہر نکال دو تو (یقیناً) تم کو اس کا نتیجہ حاصل ہوگا اور حقیقت کا راستہ کھل جائے گا۔ ہدایت کے راستے منکشف ہو جائیں گے اور خداوند عالم تمہاری دستگیری فرمائے گا۔

خدا جانتا ہے کہ اگر ان بیکار و باطل علوم، برے اوہام وخیالات، قلبی کدورتوں اور اخلاقی خرابیوں کے ساتھ (دوسرے) عالم میں منتقل ہوں گے تو کیسی مصیبتیں، بلائیں اور برے اور مہلک نتائج ہمارے سامنے آئیں گے اور یہ علوم واخلاق ہمارے لئے کیسی تاریکیاں، وحشت اور آتش فروزاں فراہم کریں گے؟

چوتھی فصل

جناب محقق فلاسفہ، صدر الحکماء والمتألہین (ملا صدراؒ) نے اصول کافی کی شرح میں شیخ غزالیؒ[۱۳] کا ایک طویل کلام نقل فرمایا ہے جس میں غزالی نے علوم کی تقسیم دنیاوی علوم اور اخروی علوم کی بنیاد پر کی ہے۔ علم فقہ کو دنیاوی علوم میں شمار کیا ہے اور اخروی علوم کی تقسیم مکاشفہ اور معاملہ کی بنیاد پر کی ہے اور علم معاملہ کو احوال قلوب کا علم شمار کیا ہے، اور علم مکاشفہ کو ایک ایسا نور قرار دیا ہے جو قلوب کو برے صفات سے پاک کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے اور اسی نور سے کشف حقائق ہوتا ہے یہاں تک کہ اسی سے ہی خدا کی ذات، اس کے صفات وافعال اور ان کی حکمتوں اور دیگر معارف کی حقیقی معرفت حاصل ہوتی ہے[۱۴]۔ اور چونکہ یہ تقسیم محقق (ملا صدراؒ) کے نزدیک پسندیدہ تھی اس لئے انہوں نے اسی حدیث کی شرح کرتے ہوئے (جس کی میں شرح کر رہا ہوں) فرمایا ہے

''بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقسیم اور یہ حصر جو رسول خداؐ نے فرمایا ہے علوم معاملات سے متعلق ہے، کیونکہ یہی وہ علوم ہیں جن سے زیادہ لوگوں کو فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ رہے علوم مکاشفات تو وہ بہت ہی کم لوگوں کو حاصل ہوتے ہیں اور وہ لوگ کبریت احمر سے زیادہ کمیاب ہیں، چنانچہ ''کتاب ایمان وکفر'' کی

احادیث اس پر دلالت بھی کرتی ہیں جن کا ذکر بعد میں آئے گا"۔ ان کے کلام کا ترجمہ اختصار کے ساتھ ختم ہوا۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے شیخ غزالی کے کلام میں اشکال ہے اور اگر بالفرض یہ صحیح بھی ہو تو جناب آخوندؒ کے قول کے مطابق اس میں دوسرا اعتراض ہے۔ اب اگر ہم غزالیؒ کے کلام کو صحیح بھی مان لیں تو ان کے کلام میں یہ اعتراض ہے کہ انہوں نے "معاملات" کے علم کو احوال قلب کے علم میں شمار کیا ہے، یعنی نجات دینے والے حالات جیسے صبر، شکر، خوف ورجاء وغیرہ کو ہلاک کرنے والے حالات جیسے کینہ، حسد، بخل، ملاوٹ وغیرہ کی طرح سمجھا ہے اور اس بنا پر رسول خدا نے جن تین علموں کا ذکر کیا ہے ان کو معاملات میں نہیں شمار کیا جاسکتا، صرف فریضہ عادلہ کا شمار ممکن ہے جیسا کہ ہم نے اس کی تفصیل پہلے ہی بیان کر دی ہے۔

اب رہا غزالی کا کلام تو اس میں دو اعتراضات ہیں۔

پہلا یہ ہے کہ انہوں نے علم فقہ کو دنیوی علوم میں اور فقہا کو علمائے دنیا میں شمار کیا ہے حالانکہ علم فقہ آخرت کے علوم میں سب سے زیادہ عزت والا ہے اور یہ بات محض حب نفس اور اس علم کی محبت سے پیدا ہوئی ہے جس کا وہ اپنے کو اہل سمجھتے ہیں، یعنی علم اخلاق اپنے معروف اور رسمی معنوں میں۔ اسی سے غزالی نے علوم عقلیہ تک کا انکار کر دیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ انہوں نے مکاشفات کو علوم کے زمرے میں قرار دیتے ہوئے علوم کی تقسیم میں اس کو بھی شمار کیا ہے، حالانکہ یہ خلاف واقع ہے، بلکہ حق یہ ہے کہ علوم میں وہ چیزیں آتی ہیں جو برہان اور فکر ونظر کے تحت واقع ہوں اور فکر کی اس میں دخالت ہو۔ رہے مکاشفات ومشاہدات تو یہ کبھی علوم حقیقیہ کے نتائج ہوتے ہیں اور کبھی اعمال قلب کے نتائج۔ خلاصہ یہ ہے کہ مکاشفات ومشاہدات اور حقائق اسماوصفات تک رسائی جیسی چیزوں کو علوم کی تقسیمات میں داخل ہی نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ مکاشفہ الگ میدان ہے اور علم دوسرے شعبے سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ امر آسان ہے۔

پانچویں فصل

جان لو بہت سے ایسے علوم ہیں جن کو ایک لحاظ سے علوم ثلاثہ کے اندر شامل کیا جاسکتا ہے جن کا رسول خدا

نے ذکر فرمایا ہے، مثلاً علم طب اور تشریح الابدان، نجوم وفلکیات، ہیئت وغیرہ کو اگر ہم ان چیزوں کو آیت وعلامت سمجھیں تو یہ چیزیں انہیں علوم میں داخل ہیں اور علم تاریخ وغیرہ کو اگر بنظر عبرت ان کی طرف مراجعہ کریں تو وہ ''آیت محکمہ'' میں داخل ہوں گے، کیونکہ انہیں کے واسطے سے خدا یا معاد کا علم حاصل ہوتا ہے یا پھر ان سے اس کی تقویت ہوتی ہے اور ان کے حصول کو کبھی ''فریضہ عادلہ'' اور کبھی ''سنت قائمہ'' میں داخل شمار کیا جاتا ہے۔ البتہ اگر ان علوم کا حصول براہ راست انہیں علوم کیلئے ہو اور اس سے دوسرے مقاصد بھی مقصود ہوں تو اگر ان علوم کا حصول ہم کو علم آخرت سے روک دے تو اس کی وجہ سے بالعرض ان کا حصول مذموم ہوگا ورنہ ان سے نہ کوئی فائدہ ہے نہ نقصان۔ جیسا کہ خود رسولخداؐ نے فرمایا ہے۔ پس تمام علوم کی تقسیم تین قسموں پر ہوگی۔

پہلے وہ علوم ہیں جو انسان کیلئے ان دوسرے نشأت کے اعتبار سے فائدہ مند ہیں جن تک رسائی ہماری غرض خلقت ہے اور اسی قسم کو رسول کرمؐ نے ''علم'' سمجھا ہے، وراس کی تین قسمیں قرار دی ہیں۔

دوسرے وہ علوم جو انسان کو ضرر پہنچاتے ہیں اور انسان کو اس کے واجبی فرائض کی ادائیگی سے روک دیتے ہیں، ان کا شمار علوم مذمومہ میں ہوتا ہے۔ ان علوم کو حاصل کرنے کیلئے کوشش نہیں کرنی چاہئے جیسے جادو، شعبدہ بازی، کیمیا وغیرہ کا علم۔

تیسرے وہ علوم ہیں جو نفع ونقصان نہیں پہنچاتے جیسے فاضل وقت میں انسان تفریح کیلئے ان میں سے کسی کو حاصل کرے، مثلاً حساب ہندسہ، ہیئت وغیرہ۔ علم کی اس تیسری قسم کو اگر انسان علوم ثلاثہ میں سے کسی پر منطبق کر سکے تو بہت عمدہ چیز ہے ورنہ حتی الامکان ان میں مشغول نہ ہونا ہی بہتر ہے۔ اس لئے کہ عقلمند انسان جب جانتا ہے کہ عمر مختصر ہے اور وقت بھی کم ہے اور موانع وحوادث بے انتہا ہیں اور (ایسی صورت میں) وہ تمام علوم کا جامع یا تمام فضائل کا حامل نہیں ہوسکتا، لہذا اس کو غور وفکر کرنا چاہئے کہ کونسا علم اس کیلئے بہتر ہے اور اسی میں مشغول ہوجائے اور اسی کی تکمیل کرلے۔

مگر یہ واضح ہے کہ جو علوم اس کی حیات ابدی اور زندگی جاوید کیلئے نفع بخش ہوں وہی سب سے بہتر اور سب سے اہم ہیں، لہذا انہیں میں مشغول ہونا بہتر ہے اور وہ وہی علوم ہیں جن کے حاصل کرنے کا حکم انبیاءؑ اور اولیاء نے دیا ہے اور ان کے طرف رغبت دلائی ہے اور وہ وہی علوم ثلاثہ ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا

والحمدللہ تعالی

توضیحات (۲۲)

۱۔ اصول کافی، ج ۱، ص ۳۲، کتاب فضل العلم، باب صفۃ العلم و فضلہ، حدیث

۲۔ شرح اصول کافی، ص ۲۸، کتاب فضل العلم، باب صفۃ العلم، حدیث ۱

۳۔ حدیث، مقدمہ پہلی فصل سے مقدمہ ۲۲ تک

۴۔ یحییٰ بن حبش (شہاب الدین سہروردی) مشہور بہ شیخ اشراق چھٹی صدی ہجری کے علماء میں سے ہیں، شیخ مقتول اور حکیم مقتول کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ انہوں نے مکتب اشراق کو زندہ کیا اور سن ۵۸۱ ہجری میں ۳۶ سال کی عمر میں قتل کر دیے گئے۔ ان کی تصانیف میں حکمت الاشراق، بستان القلوب، الواردات الالہیہ، الیروح، شرح اشارات، آواز پر جبرئیل وغیرہ مشہور ہیں۔

۵۔ شرح حکمت الاشراق، ص ۲۲-۲۵

۶۔ جامع السعادات، ج ۱، ص ۴۴

۷۔ غرر الحکم و درر الکلم، ص ۲۰۸، فصل ۳۳، حدیث ۱۔

۸۔ سورۂ بقرہ، آیت ۶۳؛ سورۂ انعام، آیت ۹۸؛ سورۂ روم، آیت ۲۱/۲۲-۲۴

۹۔ سورۂ طٰہٰ، آیت ۴۲

۱۰۔ سورۂ فاطر، آیت ۲۸

۱۱۔ اصول کافی، ج ۱، ص ۲۸، کتاب فضل العلم، باب ...، حدیث ۲

۱۲۔ بحار الانوار، ج ۶۷، ص ۲۴۲، کتاب الایمان والکفر، باب احوال، حدیث ۱۰

۱۳۔ ابو حامد محمد بن محمد غزالی (۴۵۰-۵۰۵ ھ ق) ان کا لقب حجۃ الاسلام ہے۔ شافعی فقہ کے بہت بڑے فقیہ تھے، اشعری عقیدہ رکھتے تھے۔ نیشاپور میں امام الحرمین جوینی کے شاگردوں میں شامل ہو گئے اور ان سے کسب فیض کیا۔ ملک طوسی وزیر نے ان کی تحصیل کے طور پر بغداد کا مدرسہ نظامیہ ان کے حوالے کر دیا۔ اس مدرسہ کی بڑی اہمیت تھی۔ غزالی نے ایک عرصے کے بعد چند روحانی تبدیلیوں کی بنا پر علوم رسمیہ سے علیحدگی اختیار کر لی اور تصوف و طریقت کی طرف رخ کیا۔ ان کی تصنیفات میں فقہ میں الوسیط، البسیط، احیاء علوم الدین، اصول فقہ میں المستصفی، معیار العلوم اور تہافت الفلاسفہ مشہور ہیں۔

۱۴۔ شرح اصول کافی، ص ۱۲۳، کتاب فضل العلم، باب فرض العلم، حدیث ۵

۱۵۔ شرح اصول کافی، ج ۱، ص ۱۲۸، کتاب فضل العلم، باب صفۃ العلم، حدیث ۱

پچیسویں حدیث

بِسَنَدِي الْمُتَّصِلِ إِلَى شَيْخِ الْمُحَدِّثِينَ وَأَفْضَلِهِمْ مُحَمَّدِ بْنِ يَعْقُوبَ الْكُلَيْنِيِّ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَى عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يَحْيَى، عَنْ أَحْمَدَ بْنِ مُحَمَّدٍ، عَنِ ابْنِ مَحْبُوبٍ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ سِنَانٍ قَالَ

ذَكَرْتُ لِأَبِي عَبْدِاللهِ علیہ السلام رَجُلاً مُبْتَلىً بِالْوُضُوءِ وَالصَّلاةِ، وَقُلْتُ هُوَ رَجُلٌ عَاقِلٌ

فَقَالَ أَبُو عَبْدِاللهِ علیہ السلام ﴿وَأَيُّ عَقْلٍ لَهُ وَهُوَ يُطِيعُ الشَّيْطَانَ؟

فَقُلْتُ لَهُ وَكَيْفَ يُطِيعُ الشَّيْطَانَ؟

فَقَالَ سَلْهُ هَذَا الَّذِي يَأْتِيهِ مِنْ أَيِّ شَيْءٍ هُوَ؟ فَإِنَّهُ يَقُولُ لَكَ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ﴾ [۱]

ترجمہ: عبداللہ ابن سنان کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادقؑ سے ایک شخص کے بارے میں ذکر کیا جو وسواس میں مبتلا تھا اور بار بار وضو کرتا اور نماز پڑھتا تھا، حالانکہ وہ عقلمند شخص ہے؛ حضرتؑ نے فرمایا اس کے پاس (بھلا) کونسی عقل ہے جبکہ وہ شیطان کی طاعت کرتا ہے؟ میں نے عرض کیا وہ کیونکر شیطان کی طاعت کرتا ہے؟ حضرتؑ نے فرمایا اسی سے پوچھو کہ وہ جو کچھ کرتا ہے وہ کیا ہے؟ تو وہ خود ہی کہہ دے گا یہ شیطان کا کام ہے

شرح: وسوسہ، شک، تزلزل، شرک، یہ اور اس قسم کی ساری چیزیں (دل میں پیدا ہونے والے) شیطانی خیالات اور لوگوں کے دلوں میں ابلیس کی پیدا کردہ باتیں ہیں؛ جس طرح اطمینان، یقین، ثبات، خلوص اور اس قسم کی دوسری چیزیں رحمانی افاضات اور ملکی القائات ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل مختصر طور سے یہ ہے کہ قلب انسانی نشہ ملک وملکوت اور عالم دنیا وآخرت کے

درمیان کی ایک لطیف چیز ہے۔ اس کا ایک رخ دنیا اور ملک کی طرف ہے اسی سے وہ دنیا کی آبادکاری کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور دوسرا رخ اس کا عالم آخرت وملکوت وغیب کی طرف ہے جس سے وہ عالم آخرت وملکوت کی تعمیر کرتا ہے۔ پس قلب گویا ایک دورخا آئینہ ہے کہ ایک رخ اس کا عالم غیب کی طرف ہے جس میں غیبی صورتیں دکھائی دیتی ہیں اور ایک رخ اس کا عالم شہود کی طرف ہے جس میں ملکی و دنیاوی صورتیں دکھائی دیتی ہیں اور دنیاوی صورتیں ظاہری حسی شواہد اور بعض باطنی مدارک مثلاً خیال ووہم، کے واسطے سے اس میں منعکس ہوتی ہیں۔ (لیکن) اخروی صورتیں باطن عقل اور دل کے رازوں کے ذریعے اس میں منعکس ہوتی ہیں۔ (اب) اگر قلب کا دنیاوی رخ طاقتور ہوجاتا ہے اور وہ بالکلیہ تعمیر دنیا کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے اور اس کے قصد وارادے دنیا ہی میں منحصر ہوجاتے ہیں اور وہ پیٹ پالنے اور جنسی خواہشات کی تکمیل اور دیگر دنیاوی خواہشوں اور لذتوں میں مستغرق ہوجاتا ہے تو پھر اس توجہ کی وجہ سے باطن خیال کی ملکوت سفلی سے ایک مناسبت پیدا ہوجاتی ہے جو عالم ملک وطبیعت کے تاریک سائے اور عالم جن وشیاطین ونفوس خبیثہ کے منزل کی طرح ہوتی ہے اور اس مناسبت کی وجہ سے اس میں جتنے بھی القاءات ہوتے ہیں وہ (سب کے سب) شیطانی ہوتے ہیں اور یہی القاءات باطل خیالات اور اوہام خبیثہ کا سبب بنتے ہیں اور نفس چونکہ فی الجملہ دنیا کی طرف مائل ہوتا ہے (لہذا) ان خیالات کی طرف اشتیاق پیدا کرلیتا ہے اور پھر عزم وارادہ بھی اس کے تابع ہوجاتے ہیں اس لئے پھر تمام قلبی اور جسمانی اعمال شیطانی اعمال کی طرح ہوجاتے ہیں جیسے وسوسہ، شک، تردید اور اوہام و باطل خیالات وغیرہ اور ملک بدن کے اندر اسی کے مطابق ارادے کام کرنے لگتے ہیں اور جسمانی اعمال بھی قلب کی باطنی صورتوں کے مطابق روپ دھار لیتے ہیں۔ اس لئے کہ اعمال ارادوں کے عکس اور اس کی مانند ہوا کرتے ہیں اور ارادے اوہام کی مثال ہوتے ہیں اور یہ سب قلوب کے عکس ہوتے ہیں اور چونکہ دل کا رخ عالم شیطان کی طرف ہوتا ہے اس لئے اس کے سارے القاءات شیطانی جہل مرکب کی قسم کے ہوتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ باطن ذات سے وسوسہ، شک، شرک اور شبہات باطلہ طلوع ہوکر ملک بدن میں سرایت کرجاتے ہیں۔

اسی طرح اگر قلب کا رخ تعمیر آخرت اور معارف حقہ کی طرف ہوگیا اور وہ عالم غیب کی طرف متوجہ ہوا تو ملکوت اعلیٰ سے ایک قسم کی مناسبت پیدا ہوجاتی ہے جس کو ملائکہ اور نیک نفوس طیبہ کا عالم بھی کہا جاسکتا ہے اور جو عالم طبیعت کیلئے بمنزلہ ظل نورانی بھی ہے۔ اس لئے جن علوم کا فیضان اس کی طرف ہوتا ہے وہ علوم

رحمانی ملکی اور عقائد حقہ وخطرات و لقاءات الٰہی ہوجاتے اور شکر و شرک سے پاک و پاکیزہ ہوجاتے ہیں اور (خود) نفس کے اندر بھی استقامت واطمینان کی صورت پیدا ہوجاتی ہے اور اس کے اشتیاقات بھی انہیں علوم کے مطابق ہوجاتے ہیں اور شوق کے مطابق ارادہ ہوجاتا ہے اور انجام کار تمام ظاہری و باطنی اور قلبی وجسمانی اعمال، عقل وحکمت کے مطابق ہوجاتے ہیں اور اس شیطانی و رحمانی و ملکی لقاءات کے مراتب و مقامات ہوتے ہیں جن کی تفصیل اس وقت مناسب نہیں ہے۔

ہم نے جو ذکر کیا ہے اس پر بعض روایات بھی دلالت کرتی ہیں، مثلاً مجمع البیان میں عیاشیؒ کی روایت اسی طرح ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ﴿روی العیاشی باسنادہ عن ابان بن تغلب، عن جعفر بن محمد، علیہما السلام، قال، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ما من مؤمن الا ولقلبہ فی صدرہ اذنان اذن ینفث فیہا الملک، واذن ینفث فیہا الوسواس الخناس یؤید اللہ المؤمن بالملک وھو قولہ سبحانہ وایدھم بروح منہ﴾ ۳ ''حضرت رسولخداؐ کا ارشاد ہے ہر مومن کے سینے میں جو دل ہے اس میں دو کان ہوتے ہیں ایک کان میں فرشتہ پھونکتا ہے اور دوسرے کان میں شیطان پھونکتا ہے جو وسوسہ پیدا کرنے والا ہے۔ (اور) خدا مومن کی تائید فرشتے سے کرتا ہے اور اسی بات کی طرف خدا کا یہ قول ہے ﴿وایدھم بروح منہ﴾ اور خاص اپنی روح سے (ان لوگوں کی) تائید فرمائی ہے''۔

اور مجمع البحرین میں منقول ہے ﴿انہ قال الشیطان واضع خطمہ علی قلب ابن آدم، لہ خرطوم مثل خرطوم الخنزیر یوسوس لابن آدم ان اقبل علی الدنیا، وما لا یحل اللہ فاذا ذکر اللہ خنس﴾ ۴ ''آپؑ نے فرمایا شیطان اپنے منہ کو بنی آدم کے دل پر رکھتا ہے اور اس کا منہ سور کے منہ کی طرح کا ہوتا ہے اور اس کے دل میں وسوسہ پیدا کرتا ہے کہ تو دنیا کی طرف مائل ہوجاؤ اور ان چیزوں کی طرف مائل ہوجاؤ جو حرام ہیں مگر جب (انسان) ذکر خدا کرتا ہے تو شیطان بھاگ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی روایات ہیں۔

پہلی فصل

جب اہل طریقت کے ذریعے یہ بات معلوم ہوگئی کہ وسوسہ ایک شیطانی عمل ہے۔ جیسا کہ اس حدیث شریف میں جس کی شرح کر رہا ہوں اور دوسری حدیثوں میں (بھی) ذکر ہے۔ میں مجبور ہوں کہ اس مطلب کو ایک دوسرے طرح سے ذکر کروں جو عام لوگوں کے ذہن میں نزدیک تر اور مناسب ہے۔ گزشتہ بیان،

اس کے (سمجھنے کی) اہلیت رکھنے والوں کیلئے عقلی معیارات اور دلائل و براہین کے اصول، اہل معرفت کے ذوق اور اصحاب قلوب کے مشاہدات کے مطابق ہے۔ لیکن چونکہ وہ بیان ایسے اصول وقواعد پر مبتنی ہے جو اس کتاب کے احاطہ سے خارج ہے اس لئے ہم اس سے صرف نظر کر رہے ہیں۔

پس میں عرض کرتا ہوں کہ ان وسوسوں اور اعمال کا شیطانی تماشہ ہونے اور یہ کہ یہ وسوسے اسی ملعون کے القاآت میں سے ہیں، نہ ان کے دینی کوئی محرکات ہیں اور نہ ایمانی اسباب، چاہے باطل خیال کی بناپر ایسا ہو۔ ان باتوں پر (سب سے بڑا) شاہد یہ ہے کہ (یہ وسوسے) احکام شریعت اور اخبار و آثار اہل بیت ؑ کے مخالف ہیں، مثلاً اہل بیت ؑ سے متواتر روایت کی بناپر یہ ثابت ہے کہ رسول خدا ؐ کا وضو ایک غسلہ (ایک مرتبہ دھونا) تھا۔ اور فقہ کی بدیہیات میں یہ ہے کہ ایک چلو پانی چہرے کو دھونے کیلئے اور ایک چلو پانی داہنے ہاتھ کے دھونے کیلئے اور ایک بائیں ہاتھ کے دھونے کیلئے کافی ہے۔ لیکن (ہر ایک کیلئے) دو چلو یا دو مرتبہ دھونے میں اختلاف ہے، حتی کہ وسائل الشیعہ کے قول سے عدم جواز یا عدم جواز میں تأمل کا فتویٰ ثابت ہوتا ہے اور بعض دیگر علما سے (مسئلہ میں) اختلاف نقل کیا گیا ہے۔ اگرچہ دو غسلہ بھی محل تأمل نہیں ہے، (بلکہ) شہرت عظیمہ کے ساتھ ساتھ روایت کثیرہ بھی اس کے استحباب پر ہے۔ لیکن بعید نہیں ہے کہ یک غسلہ جو پورے مقام کو دھو ڈالے، افضل ہو۔ مگر تین مرتبہ اس طرح دھونا کہ ہر مرتبہ پورا مقام دھو ڈالا جائے، بلا اشکال بدعت و حرام ہے اور اگر اسی فاضل پانی کی تری سے مسح کرے تو وہ وضو باطل ہے اور اہل بیت ؑ کے اخبار میں ہے کہ تیسری مرتبہ دھونا بدعت ہے اور ہر بدعت جہنم میں لے جانے والی ہے۔

ایسی صورت میں یک جاہل اور وہمی شخص جو وضو کی جگہ کو دس مرتبے سے زیادہ دھوتا ہے اور ہر مرتبہ پانی کو اس عضو کے تمام حصوں تک بڑی باریک بینی سے پہنچاتا ہے، بلکہ وہ پہلے تو وضو کی جگہ کو اچھی طرح بھگوتا ہے تاکہ پانی پوری طرح بہہ سکے اور شرعی دھونا حاصل ہو جائے پھر بار بار اس عمل کو انجام دیتا ہے! (آخر) اس کو کس میزان پر تولا جائے؟ اس کا یہ عمل کس حدیث یا کس فقیہ کے فتویٰ کے مطابق ہے؟ تیس سال یا اس سے زیادہ یہ بدبخت اسی طرح کے باطل وضو سے نماز پڑھتا رہا اور اپنے تقدس و طہارت کا لوگوں پر رعب جماتا رہا۔ شیطان اس سے کھیل رہا ہے اور خبیث نفس امارہ اس کو دھوکہ دیتا ہے، اس کے باوجود وہ دوسروں کو غلط بتاتا ہے اور اپنے کو حق پر سمجھتا ہے! جو چیز نص متواتر اور اجماع علما کی مخالفت کرتی ہو اس کے

اعمال کو شیطانی شمار کرنا چاہیے یا اسے کمال طہارت نفس اور تقویٰ قرار دینا چاہیے؟ اگر اس کو دین کے اندر کمال احتیاط اور تقویٰ قرار دیا جائے تو پھر یہی بے وہمی اور جاہل قسم کے عبادت گزار بہت سے ان امور میں جن کے اندر احتیاط لازم ہے یا راجح ہے کیوں احتیاط نہیں اختیار کرتے؟ ابھی تک کیا کسی ایسے شخص کو آپ جانتے ہیں کہ اموال کے سلسلے میں وہم و شک کا اظہار کرے؟ ابھی تک کسی وہمی نے ایک مرتبے کے بجائے کئی مرتبہ خمس و زکات ادا کئے ہوں یا وہم کی بنا پر ایک مرتبہ کے بجائے کئی مرتبہ حج کیلئے گیا ہو یا شبہ والی غذاؤں سے پرہیز کیا ہو؟ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ یہاں پر "اصالت الحلیۃ"[۱۲] محکم و معتبر ہے، لیکن باب طہارت میں "اصالت الطہارۃ"[۱۳] معتبر نہیں ہے؟ حالانکہ باب حلیت میں شبہات سے اجتناب راجح ہے اور حدیث تثلیث[۱۴] کی طرح دیگر احادیث شریفہ بھی اس مطلب پر دلالت کرتی ہیں، لیکن باب طہارت میں مسئلہ اس کے برعکس ہے۔ بعض ائمہ معصومین کے بارے میں روایت ہے جب وہ بیت الخلا تشریف لے جاتے تھے تو اپنی رانوں پر پانی چھڑک لیتے تھے کہ اگر کوئی پانی کا قطرہ پہنچے تو معلوم نہ ہو سکے اور یہ بے چارہ (وسواسی) جو اپنے کو اس امام معصوم کا پیرو سمجھتا ہے اور تمام احکام دین کو امام معصوم سے حاصل کرتا ہے جب اموال میں تصرف کا موقع آتا ہے تو کسی چیز سے پرہیز نہیں کرتا ہے، جس غذا کو اصالت الطہارۃ پر عمل کر کے کھاتا ہے اس کو کھانے کے بعد اپنے ہاتھ اور منہ کو پاک بھی کرتا ہے (آخر یہ کیا بات ہوئی کہ) کھانا کھاتے وقت تو اصالت الطہارۃ پر عمل کرتا ہے لیکن کھانے کے بعد کہتا ہے ہر چیز نجس ہے اور اگر (یہ وسواسی) بزعم خود اہل علم سے ہے تو جواب دے گا میں طہارت واقعی کے ساتھ نماز پڑھنا چاہتا ہوں! حالانکہ طہارت واقعی کے ساتھ نماز پڑھنے کی فضیلت ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی اور فقہائے کرام کے یہاں میں نے اس کا کوئی نام نہیں دیکھا۔ اگر آپ حقیقی اہل طہارت ہیں تو پھر اہل حلیت واقعی کیوں نہیں بنتے؟ چلیے ہم یہ بھی فرض کیے لیتے ہیں آپ حقیقی طہارت کو حاصل کرنا چاہتے ہیں تو پھر آب کر یا آب جاری میں دس مرتبہ دھونا کیا ہے؟ جبکہ جاری پانی میں ایک مرتبہ اور کر پانی میں (پیشاب اور بعض دوسری نجاستوں کے علاوہ) ایک مرتبہ، بلکہ بنا بر مشہور پیشاب کی صورت میں بھی ایک مرتبہ دھونا کافی ہے اور دو مرتبہ تو جمعاً کافی ہے، پس یہ کئی مرتبہ دھونا شیطانی وسوسہ اور نفس کی دھوکہ بازی نہیں ہے تو کیا ہے؟ اور چونکہ یہ ایک بے معنی چیز ہے اس لئے اس کو تقدس فروشی کا سرمایہ بنایا جاتا ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ بدتر اور رسوا کن ان لوگوں کا وسوسہ ہے جو نماز کی نیت اور تکبیرۃ الاحرام میں وہم

کرتے ہیں، کیونکہ یہ لوگ کئی فعل حرام کے ارتکاب کے بعد بھی اپنے کو دیندار افراد میں شمار کرتے اور اپنے اس عمل کے ذریعے اپنے لئے (دوسروں سے) فرق کے قائل ہوتے ہیں اور یہ نیت (ایک ایسی چیز ہے کہ) کسی بھی اختیاری عمل کو اس کے بغیر بجالایا نہیں جا سکتا اور یہ اختیاری اعمال کا لازمہ ہے جس کے بغیر انسان کسی عبادی یا غیر عبادی عمل کو بجا ہی نہیں لا سکتا۔ اس کے باوجود شیطانی اختلاف اور تسلط شیطان کی بنا پر کافی دیر تک اس ضروری الوجود شئے کے حصول کیلئے کوشش کرتا رہتا ہے اور بالآخر اس کو حاصل نہیں کر پاتا! اب اس امر کو شیطانی خیال اور ابلیس ملعون کا عمل سمجھا جائے کہ اس بے چارے کو لگام لگا کر ایسے ضروری امر کو اس پر مخفی رکھا اور متعدد حرام افعال کے ارتکاب میں مبتلا کر دیا، مثلاً نماز کا توڑنا (یا) اس کا چھوڑنا اور اس کا وقت کا گزرنا، اس بات کو طہارت باطن اور تقدس وتقویٰ قرار دیا جائے؟

اسی وہم وسوسہ میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ جو لوگ باعتبار نص وفتویٰ عادل ہیں اور وہ ظاہراً نیک اور صالح اور شرعی اعمال کے پابند ہیں، بہت سے لوگوں کا ان کا اقتدا نہ کرنا ہے (اور الگ نماز پڑھنا بھی ہے)۔ اب رہا ان کے باطن کا معاملہ تو اس کو خدا جانتا ہے اس کی تحقیق ہمارے لئے ضروری نہیں، بلکہ جائز نہیں ہے۔ اب ایسے پیش نماز کے بارے میں شیطان وہمی آدمی کو بہکا دیتا اور اس کو اس بات پر آمادہ کر دیتا ہے کہ وہ (دوسرے) مسلمانوں سے کنارہ کش ہو کر مسجد کے ایک گوشہ میں نماز پڑھے اور یہ وہمی آدمی اپنے اس عمل کی تاویل کرتا ہے کہ اسے (اس کے عادل ہونے میں) شبہ ہے! اور وہ اسے اچھا نہیں لگتا، لیکن یہی شخص خود نماز پڑھانے میں تامل بھی نہیں کرتا! حالانکہ پیش نمازی کا کام بہت سخت ہے اور اس میں شبہ زیادہ ہے لیکن چونکہ یہ بات اس کی خواہش نفس کے مطابق ہے اس لئے اس میں شبہ نہیں کرتا!

وہمی ورسواسی کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ وہ خود وہم میں بہت زیادہ مبتلا ہوتا ہے۔ (مثلاً) قرائت میں وسوسہ جس کی وجہ سے وہ قرائت میں تکرار کرتا اور حروف کی ادائیگی میں اتنا گاڑھا پن پیدا کرتا ہے کہ کبھی وہ قواعد تجوید سے بھی خارج ہو جاتا ہے، بلکہ کبھی تو لفظ کی صورت ہی بالکل بدل جاتی ہے، مثلاً ﴿ضآلین﴾ کو اس طرح ادا کرتا ہے کہ اس (کا تلفظ) قاف کے مشابہ ہو جاتا ہے اور ﴿رحمن ورحیم﴾ وغیرہ کے ''ح'' کو اس طرح حلق سے نکالتا ہے جس سے ایک عجیب آواز پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک ہی لفظ کے حروف میں ایسی جدائی ڈال دیتا ہے کہ لفظ کی شکل واصل چھوٹ کر اپنی اصلی صورت سے بالکل خارج ہو جاتی ہے اور آخر کار جو نماز مومنین کیلئے معراج ہے اور متقین ومقربین کیلئے ستون دین ہے وہ اپنے تمام معنوی حالات

اور الٰہی اسرار سے غفلت کی بنا پر اور تجوید کلمات کے چکر میں پھنس کر اتنی خراب ہو جاتی ہے کہ ظاہر شرع کی بنا پر بھی ناقابل جزا ہو جاتی ہے۔ اب (آپ ہی) بتایئے کہ ان اوصاف کے ساتھ یہ وسوسہ شیطانی ہے یا فیض رحمانی جو بظاہر دیانتدار اور شریف وہمی شخص کے شامل حال ہوئی ہے؟ حضور قلب اور اقبال قلب کے ساتھ نماز پڑھنے کیلئے جو روایات آئی ہیں ان سے یہ بے چارہ وسواسی عمداً و عملاً صرف نظر کرتا، سمجھ بیٹھا ہے کہ یہ محض نیت میں وسوسہ اور ﴿ولا الضّآلّین﴾ کے مد کو اندازے سے زیادہ کھینچنے، اور نماز پڑھتے وقت چشم و زبان کے ٹیڑھا کرنے کا نام ہے۔ کیا یہ مصیبت نہیں ہے کہ آدمی ساٹھ سال حضور قلب اور تشویش خاطر کے علاج سے غافل رہے اور اس کے اصلاح کی طرف بالکل توجہ نہ کرے اور عبادت کی شان نہ پہچان سکے و علمائے قلوب سے سیکھنے کی کوشش نہ کرے اور اس پر عمل نہ کرے اور ان خرافات میں پڑا رہے جو بہ نص قرآن کریم ''خناس لعین'' (۵) کی وجہ سے اور بہ نص صادقین ''یہ عمل شیطان ہے (۱)'' اور یہ فتوائے فقہا اس طرح سے پڑھنا باطل ہے۔ کیا اسی کا نام تقدس و طہارت ہے؟

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کے اندر پیدا ہونے والے وہم و وسوسے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس جیسے دیگر جاہل حضرات اس بات کو اس کے فضائل میں شمار کرتے ہیں! مثلاً اس کے تقدس و دیانت و تقویٰ کی لوگ اس طرح تعریف کرتے ہیں کہ یہ شخص تو تمام تر دیندار ہے کہ اس کی وجہ سے وہ وہم کا شکار ہو گیا ہے' حالانکہ وہم و وسوسے کا دیانت سے کوئی ربط ہی نہیں ہے، بلکہ یہ دین سے متضاد ہے، اور یہ سب جہالت و نادانی ہے۔ لیکن اصل وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے اصل حقیقت اس وہمی شخص کو بتایا نہیں اور نہ اس نے اس سے احتراز کیا اور نہ ہی اس کی سرزنش کی، بلکہ اس کے بجائے اس کی تعریفیں کرنے لگے اور اتنی مدح کی کہ وہ وہم کے حد کمال تک پہنچ گیا اور شیطان کا کھلونا بننے کے ساتھ اپنے کو شیطان کے لشکر میں شامل کر لیا اور مقربین سے بہت دور ہو گیا۔

لہٰذا میرے عزیز! اب تو پتہ چل گیا کہ عقلاً و نقلاً یہ چیزیں شیطانی وسوسے اور ابلیسی اعمال ہیں جو ہمارے اعمال کو باطل کر دیتے اور ہمارے دل کو خدا سے منحرف کر دیتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہمی شخص صرف عمل کی حد تک وہم کا شکار نہ ہو، بلکہ اپنے شاہکار کو استعمال کر کے آپ کے عقائد و دیانت میں بھی وسوسہ پیدا کر دے اور دین کی صورت میں آپ کو بے دین بنا دے۔ مبدأ و معاد کے سلسلہ میں تردید میں ڈال دے اور شقاوت ابدی تک پہنچا دے اور آپ جیسے لوگوں کو (یہ شیطان) چونکہ فسق و فجور کے راستے سے

حرہ نہیں کرسکتا اس لئے عبادت ومناسک کے ذریعے آ کر پہلے تو آپ کے ان اعمال وافعال کو جو تقرب الٰہی کا ذریعہ اور قرب حق کا وسیلہ بن سکتے تھے ان کو باطل وخراب کر کے خدا سے دور اور ابلیس سے نزدیک کردے۔ اس کے بعد یہ خطرہ لاحق ہو جاتا ہے کہ آپ کے عقائد کو بھی کہیں خراب نہ کردے۔ اس لئے جس طرح بھی ممکن ہو اور جس قسم کی ریاضت کے ذریعے بھی ہو سکے آپ اپنا علاج کریں۔

دوسری فصل

یہ قلبی مرض جس کے بارے میں خطرہ ہے کہ انسان کو ہلاک ابدی اور شقاوت سرمدی تک پہنچادے اس کا بھی علاج دیگر قلبی امراض کی طرح علم نافع اور عمل کے ذریعے بہت آسان ہے۔ لیکن سب سے پہلی چیز تو یہی ہے کہ انسان اپنے کو مریض سمجھے اس کے بعد اس کے علاج میں لگ جائے۔ لیکن سب سے زیادہ بری بات تو یہی ہے کہ شیطان نے ایسے بے چارے شخص کیلئے ایسے مقدمات فراہم کردیئے ہیں کہ وہ اپنے کو مریض ہی نہیں سمجھتا، بلکہ وہ تو دوسروں کو بے راہ اور دین سے بے پروا سمجھتا ہے!

عملی طریقہ علاج یہ ہے کہ بیان کردہ امور میں انسان خوب غور وفکر کرے اور بہتر یہ ہے کہ اس کے تمام اعمال وافعال تفکر اور تامل کے ساتھ ہوں۔ اس کو یہ سوچنا چاہئے کہ جو عمل کررہا ہے جس کے بارے میں یہ چاہتا ہے کہ وہ مرضی خدا کے مطابق ہو۔ اس کو کس سے اور کہاں سے یہ ہے کہ جس کی کیفیت چنین وچنان ہے، یہ بات تو سب ہی کو معلوم ہے کہ فقہا اور مراجع کرام قرآن وسنت اور اجتہاد کے طریقوں سے عمل کے طریقوں کو حاصل کرتے ہیں اور (اسی لئے) جب ہم فقہا کی کتابوں کو دیکھتے ہیں تو ان کتابوں میں وہمی شخص کے عمل کی نفی کی گئی ہے۔ (یہی نہیں بلکہ) اس کے بعض اعمال کو باطل شمار کیا گیا ہے اور جب ہم احادیث اور کتاب الٰہی کی طرف رجوع کرتے ہیں تو اس میں وہمی کے عمل کو شیطان کا عمل قرار دیا گیا ہے اور ایسے آدمی کو بے عقل قرار دیا گیا ہے۔ پس ایسی صورت میں عقلمند انسان بشرطیکہ اس کی عقل پر شیطان مسلط نہ ہوا ہو، تھوڑا سا غور وفکر کر کے اپنے لئے یہ لازم قرار دے لیتا ہے کہ اب میں ان کاموں سے دستبردار رہوں گا اور یہ طے کرلیتا ہے کہ اپنے اعمال کی اس طرح تصحیح کرلے گا جو مرضی حق کے مطابق ہو۔

جس شخص کے اندر ذرا بھی شائبہ ہو اسے چاہئے کہ معمولی آدمیوں کی طرف رجوع کرے اور اپنے عمل کو علماء وفقہاء کے سامنے پیش کرے اور ان سے پوچھے کہ کیا وہ مرض وسواس میں تو مبتلا نہیں ہے؟ اس لئے کہ

بسا اوقات خود وہی شخص اپنی حالت سے غافل ہوتا ہے، اپنے کو معتدل اور دوسروں کو بے پروا سمجھتا ہے، لیکن اگر وہ تھوڑا سا غور کرے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ خیال بھی خبیث شیطان کے القاآت میں سے ہے۔ اس لئے کہ خود وہ دیکھتا ہے کہ علما اور بڑے بڑے دانشور جن کے علم و عقیدے کا وہ خود بھی قائل ہے، بلکہ مرجع تقلید جن سے حلال و حرام کے مسائل پوچھے جاتا ہے ان کے اعمال بھی اس کے برخلاف ہیں اور یہ بات نہیں کہی جاسکتی کہ دیندار حضرات، علما اور بزرگان دین، دین خدا کے سلسلے میں بے پروا ہوں گے صرف وہی شخص دیندار رہے۔ پھر جب اس کو علم ہو جائے تو عمل کی اصلاح ضروری ہو جائے گی اور اس کو میدان عمل میں کود پڑنا چاہئے اور اس سلسلے میں سب سے بہتر علاج یہ ہے کہ شیطانی وسوسوں اور اس کے القاآت کی طرف توجہ ہی نہ دے۔ مثلاً اگر وضو کے سلسلے میں وہ وہم میں مبتلا ہے تو شیطان کی ناک رگڑنے کے لیے صرف ایک چلو پانی کا استعمال کرے۔ یقیناً شیطان کہے گا یہ عمل غلط ہے۔ اس کو چاہئے کہ جواب دے کہ اگر میرا عمل غلط ہے تو رسول خدا ، ائمہ معصومین اور تمام فقہا کا بھی عمل صحیح نہیں ہے۔ رسول خدا اور ائمہ معصومین نے تقریباً تین سو سال تک (اسی طرح) وضو کیا اور روایات معتبرہ کی بنیاد پر ان حضرات کا طریقہ وضو یہی تھا، پس اگر ان کا عمل باطل ہے تو چھوڑو میرا بھی عمل باطل ہے اور اگر کسی مجتہد کا مقلد ہے تو اس کو یہ جواب دینا چاہئے کہ میں جو اس طرح وضو کرتا ہوں وہ مجتہد کی رائے کے مطابق ہے۔ اگر میرا وضو باطل ہے تو خدا مجھ سے مؤاخذہ نہیں کرے گا اور نہ میرے اوپر اس کی حجت تمام ہوگی اور اگر وہ (شیطان) ملعون مجتہد کی رائے کے بارے میں تشکیک پیدا کرے کہ مجتہد نے یہ نہیں کہا ہے تو رسالہ عملیہ کو کھول کر دکھا دے۔ اگر چند مرتبہ تو نے شیطان کے قول پر عمل نہیں کیا، بلکہ اس کے خلاف کام کرتا رہا تو وہ خود ہی تم سے مایوس ہو جائے گا اور امید ہے کہ تمہارے مرض کا قطعی علاج ہو جائے گا اور احادیث میں بھی یہ مطلب موجود ہے

فمن ذلك في ما سنده عن زرارة وأبي بصير، قالا: قلنا له عليه السلام: الرّجلُ يشكُّ كثيراً في صلاته حتى لا يدري كم صلّى ولا ما بقي عليه؟ قال: يعيد. قلنا: فإنّهُ يكثُر عليه ذلك كلّما عاد شكَّ؟ قال: يمضي في شكّه. ثمّ قال: لا تُعوّدوا الخبيث من أنفسكم بنقض الصّلاة فتطمعوه، فإنَّ الشّيطان خبيثٌ معتادٌ لما عُوّد. فليمض أحدُكم في الوَهم ولا يُكثرنّ نقض الصّلاة فإنّهُ إذا فعل ذلك مرّاتٍ لم يعُد إليه الشّكُّ

قال زرارة: ثُمّ قال: إنّما يُريد الخبيثُ أن يُطاع فإذا عُصي لم يعُد إلى أحدكُم عليه السلام.

چنانچہ کافی میں زرارہؓ اور ابو بصیرؒ سے روایت ہے کہ ان دونوں نے کہا: ''ہم لوگوں نے امامؑ سے پوچھا ایک شخص اپنی نماز میں بہت شک کرتا ہے، انتہا یہ ہے کہ اس کو یہ بھی شک ہو جاتا ہے کہ پتہ نہیں کتنی رکعتیں پڑھیں اور کتنی باقی ہیں؟ حضرتؑ نے جواب دیا دوبارہ پڑھے۔ ہم نے پھر عرض کیا اس کو یہ شک بہت ہوتا ہے، جب بھی اعادہ کرتا ہے اس کو شک ہو جاتا ہے۔ (تب) حضرتؑ نے فرمایا اپنے شک کی پروا نہ کرے۔ اس کے بعد امامؑ نے فرمایا، اپنی نمازوں کو (بار بار) توڑ کر اس خبیث (شیطان) کو عادی نہ بناؤ ورنہ تمہارے بارے میں اس کو طمع لاحق ہو جائے گی، کیونکہ شیطان خبیث ہے جس کا اس کو عادی بنایا جاتا ہے وہ عادی ہو جاتا ہے۔ لہذا تم میں سے جب کسی کو یہ شک پیش آئے تو وہ اس کی پروا نہ کرے اور بار بار نماز کو نہ توڑے، کیونکہ جب وہ کئی مرتبہ ایسا کرے گا تو پھر شک نہیں ہوگا۔

زرارہ کہتے ہیں پھر امامؑ نے فرمایا شیطان خبیث چاہتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے لیکن جب اس کی نافرمانی کی جائے گی وہ تمہارے پاس پھر نہیں آئے گا''۔

وبإسنادهِ عن أبي جعفرٍ عليه السلام، قال ﴿إذا كثُرَ عليكَ السَّهوُ فامضِ في صلاتِكَ، فإنَّهُ يُوشكُ أن يدعكَ، إنَّما هُوَ منَ الشَّيطانِ﴾ ۸۔ ''امام محمد باقرؑ سے (بھی) یہ روایت منقول ہے کہ امامؑ نے فرمایا جب تم کو بہت زیادہ سہو ہونے لگے تو اپنی نماز پڑھتے رہو، کیونکہ ایسا کرنے سے امکان ہے کہ شیطان تم کو چھوڑ دے اس لئے کہ یہ سب شیطان ہی کی طرف سے ہوتا ہے''۔

لہذا جب آپ اس کی مخالفت کریں گے اور اپنے وہم اور شک کی اعتنا نہ کریں گے تو اس کی امید آپ سے ختم ہو جائے گی اور نفس کی حالت ثبات وطمأنیت پھر واپس آ جائے گی۔ مگر اس درمیان میں خدا کی بارگاہ میں تضرع وزاری کرتے رہئے اور نفس اور شیطان کے شر سے خدا کی پناہ مانگتے رہئے۔ یقیناً ایسا کرنے سے خدا آپ کی مدد کرے گا اور کافی کی روایت میں شیطان سے پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے۔

چنانچہ امام جعفر صادقؑ کی حدیث اس طرح ہے

بإسنادهِ عن أبي عبدِ اللهِ عليه السلام قال: أتى رجلٌ النَّبيَّ صلى الله عليه وآله، فقالَ ﴿يا رسولَ اللهِ أشكو إليكَ ما ألقى من الوسوسةِ في صلاتي حتَّى لا أدري ما صلَّيتُ من زيادةٍ أو نقصانٍ. فقالَ إذا دخلتَ في صلاتِكَ فاطعن فخذكَ الأيسرَ بإصبعِكَ اليُمنى المُسبِّحةِ ثُمَّ قُل ﴿بسمِ اللهِ وباللهِ، توكَّلتُ على اللهِ، أعوذُ باللهِ السَّميعِ العليمِ منَ الشَّيطانِ الرَّجيمِ﴾ فإنَّكَ تنحرُهُ

حدیث ۲۵ ...﴿۴۷۵﴾

وتطرُدهٗ ﴿۱۹﴾

امام جعفر صادقؑ سے روایت کی گئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا ''ایک شخص نے رسول خداؐ کے پاس آکر اپنے شک کی شکایت اس طرح کی اے خدا کے رسولؐ! مجھے اپنی نماز میں بہت وسوسہ ہوتا ہے یہاں تک کہ مجھے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ میں نے کتنی رکعت پڑھی ہے، کم یا زیادہ حضرتؐ نے فرمایا جب نماز شروع کرو داہنے ہاتھ کی کلمہ شہادت والی انگلی سے بائیں ران کو دباؤ اور یہ کہو ﴿بِسْمِ اللهِ وَبِاللهِ، تَوَكَّلْتُ عَلَى اللهِ، اَعُوْذُ بِاللهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ﴾ اسی طرح کرنے سے تم اس کو اپنے سے دور کر کے بھگا دو گے''۔

والحمدلله اولاً وآخراً وظاهراً وباطناً

والصلاة والسلام على محمد وآله الطاهرين

توضیحات (۲۵)

۱۔ اصول کافی، ج۱، ص۱۲، کتاب العقل والجہل، حدیث۱۰

۲۔ محمد بن مسعود بن عیاش، سلمی السمرقندی "معروف بہ عیاشی" تیسری صدی ہجری کے آٹھویں درجے کے راویوں میں سے ہیں۔ روایت میں ثقہ و متبحر ہیں۔ آپ کی دو سو سے زیادہ تصانیف ہیں جن میں سب سے مشہور "تفسیر عیاشی" ہے۔

۳۔ تفسیر برہان، ج۳، ص۱۰۳، ذیل تفسیر آیہ ۲۲ سورۂ مجادلہ، حدیث۴

۴۔ مجمع البحرین، ج۲، ص۴۰۷، مادہ عقص۔

۵ امام صادقؑ نے فرمایا ﴿والله ما کان وضوء رسول الله الا مرّةً مرّةً﴾ "خدا کی قسم رسول خدا کا وضو یہ تھا کہ ہر عضو کو ایک مرتبہ دھویا کرتے تھے۔

وسائل الشیعہ، ج۱، ص۳۰۸، کتاب الطہارۃ، باب ۳۱ از ابواب وضو، حدیث۱۰ اسی طرح، حدیث ۱ و ۳

۶۔ دوسری بار دھونے کے بارے میں تین قول ہیں۔ اکثر فقہاء نے مستحب کا حکم دیا ہے، بعض نے جواز کہا ہے اور بعض نے عدم جواز کا حکم دیا ہے۔

۷۔ چنانچہ بعض کے اصول میں اس طرح ہے ﴿باب حد غرفة واحدة في الوضوء وحكم الثانية والثالثة﴾.

وسائل الشیعہ، ج۱، ص۳۰۶، کتاب الطہارۃ، باب ۳۱۔

۸ ابن ادریس حلی "عدم جواز" کے قائل ہیں۔ مختلف الشیعہ، ج۱، ص۲۸۲۔

۹ جواہر، ج۲، ص۲۶۶

۱۰۔ وسائل الشیعہ، ج۱، ص۲۷۳، کتاب الطہارۃ، باب ۵ از ابواب وضو، حدیث۳ نیز جلد ۱، ص۳۱۰، کتاب الطہارۃ باب ۳۱ از ابواب وضو، حدیث ۲۸ و ۲۹

۱۱۔ امام صادقؑ نے فرمایا ﴿الوضوء واحدة فرض واثنتان لا يؤجر والثالث بدعة﴾ "وضو میں ایک مرتبہ دھونا واجب، دو مرتبہ دھونا اس کا کوئی اجر نہیں اور تین مرتبہ دھونا بدعت ہے"۔

وسائل الشیعہ، ج۱، ص۳۰۷، کتاب الطہارۃ، باب ۳۱ از ابواب وضو، حدیث۳۔

امام صادقؑ نے رسول اکرمؐ کا قول نقل کیا ہے کہ ﴿كلّ بدعة ضلالة وكلّ ضلالة في النار﴾ "ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی دوزخ میں لے جانے والی ہے"۔

اصول کافی، ج۱، ص۵۶، کتاب فضل علم، باب بدعات، رائے و قیاس، حدیث۱۲۔

۱۲۔ 'اصالۃ الحلیۃ' ایک فقہی قاعدہ ہے جو کسی چیز کے حرمت وحلیت میں شک ہونے پر استعمال ہوتا ہے اس قاعدے کی بنا پر ہر چیز اس وقت تک حلال ہے جب تک اس کے خلاف یعنی حرمت کا علم نہ ہو جائے

اس قاعدے کی سند عبد اللہ بن سنان کی وہ حدیث ہے جس میں امام صادقؑ سے روایت ہے ﴿کل شیء فیہ حلال وحرام فھو لک حلال ابداً حتی تعرف الحرام منہ بعینہ فتدعہ﴾ "جس چیز سے اس میں حلال اور حرام کا احتمال ہو وہ تمہارے لئے حلال ہے یہاں تک کہ تم کو یقین سے اس کی حرمت کا علم ہو جائے (اور یقین ہو جائے) تو اس کو ترک کر دو"۔

وسائل الشیعہ، ج۱۲، ص۵۹، کتاب التجارۃ، باب ۴ از ابواب ما یکتسب بہ، حدیث ۱۔

۱۳۔ 'اصالۃ الطھارۃ' یہ ایک فقہی قاعدہ ہے جس پر کسی چیز کے پاکی اور پلیدی کے لحاظ سے مشکوک ہونے کی صورت میں عمل کیا جاتا ہے۔ اس قاعدے کی بنیاد پر جس چیز کے نجس ہونے میں شک ہے جب تک اس کی نجاست ثابت نہ ہو وہ پاک ہے۔

اس قاعدے کی اسناد میں سے ایک سند امام صادقؑ سے منقول عمار بن موسیٰ کی حدیث ہے جس میں ہے ﴿کل شیء نظیف حتی تعلم انہ قذر﴾ "ہر چیز تمہارے لئے پاک ہے جب تک اس کی نجاست معلوم نہ ہو جائے"

وسائل الشیعہ، ج۲، ص۱۰۵۴، کتاب الطھارۃ، باب ۳۷ از ابواب نجاسات، حدیث ۴۔

۱۴۔ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا

﴿انما الامور ثلاثۃ امر بین رشدہ فیتبع وامر بین غیہ فیجتنب وامر مشکل یرد علمہ الی اللہ والی الرسولہ

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حلال بین وحرام بین، وشبھات بین ذلک فمن ترک الشبھات نجا من المحرمات، ومن اخذ بالشبھات ارتکب المحرمات وھلک من حیث لا یعلم﴾

امور تین قسم کے ہیں جس کا درست ہونا واضح ہو اس کو مان لینا چاہئے جس کی گمراہی واضح ہو اس کو ترک کر دینا چاہئے جو چیز مشتبہ ہے اس کا علم خدا اور رسول پر چھوڑ دینا چاہئے۔

رسول خدا کا ارشاد ہے واضح حلال ہے، اور واضح حرام ہے اور ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ چیزیں ہیں۔ جو مشتبہ چیز کو چھوڑ دے وہ حرام سے نجات پائے گا اور جو مشتبہ چیزوں پر عمل کرے گا وہ محرمات کا ارتکاب کرے گا اور اس جگہ سے ہلاک ہوگا جس کو نہیں جانتا۔

اصول کافی، ج۱، ص۶۷ و۶۸، کتاب العلم، باب اختلاف الحدیث، حدیث ۹

۱۵۔ یہ سورۂ ناس کی چوتھی، پانچویں آیت کی طرف اشارہ ہے ﴿من شر الوسواس الخناس الذی یوسوس فی صدور الناس﴾۔

۱۶۔ عبد اللہ بن سنان کی جو روایت امام صادقؑ سے ہے اس میں ہے ﴿من عمل الشیطان﴾ یہ شیطان کا کام ہے۔

وسائل الشیعہ، ج۱، ص۴۶، کتاب الطھارۃ، ابواب مقدمۃ العبادات، باب ۱۰، حدیث ۱۔

۱۷۔ فروع کافی، ج ۳، ص ۳۵۸، کتاب الصلاۃ، باب من شک فی صلاتہ، حدیث ۲۔

۱۸ کلینیؒ نے اپنے اسناد کے ساتھ امام باقرؑ سے روایت کی ہے کہ حضرتؑ نے فرمایا جب نماز میں زیادہ شک ہو (تو اس کی پرواہ نہ کرو اور) نماز پڑھتے رہو اور اسے ختم کرو یہاں تک کہ شیطان تمہارا پیچھا چھوڑ دے۔ یہ سمجھو کہ شک شیطان کی طرف سے ہے۔

فروع کافی، ج ۳، ص ۳۵۹، کتاب الصلاۃ، باب من شک فی صلاتہ، حدیث ۸۔

۱۹ فروع کافی، ج ۳، ص ۳۵۸، کتاب الصلاۃ، باب من شک فی صلاتہ، حدیث ۴۔

چھبیسویں حدیث

بالسند المتصل الی ثقة الاسلام محمد بن یعقوب الکلینی، عن محمد بن الحسن وعلی بن محمد عن سهل بن زیاد ومحمد بن یحیی، عن احمد بن محمد جمیعاً، عن جعفر بن محمد الاشعری، عن عبد الله بن میمون القداح وعلی بن ابراهیم عن ابیه عن حماد بن عیسی عن القداح، عن ابی عبد الله علیه السلام، قال:

قالَ رَسُولُ اللهِ صلی الله علیه وآله: ﴿مَنْ سلک طریقاً یطلُبُ فیه علماً، سلک اللهُ به طریقاً الی الجنّة، وانَّ الملائکة لتضعُ اجنحتها لطالبِ العلم رضاً بـه، وانّهُ یستغفرُ لطالب العلم مَنْ فی السّماء ومَنْ فی الأرض حتّی الحُوتُ فی البَحْرِ، وفضلُ العالم علی العابد کفضلِ القمرِ علی سائرِ النُّجُوم لیلة البدرِ، وانَّ العلماء ورثة الأنبیاء، انَّ الأنبیاء لم یُورِّثوا دیناراً ولا درهماً ولکنْ ورَّثوا العِلْم، فمَنْ اخذ منهُ اخذ بحظٍّ وافرٍ﴾

ترجمہ: امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ رسول خداؐ نے ارشاد فرمایا ہے: جو شخص طلب علم کے راستے پر چلے خدا اس کو جنت کے راستے پر لگا دیتا ہے اور طالب علم کی خوشنودی کیلئے ملائکہ اپنے پر بچھا دیتے ہیں اور طالب علم کیلئے آسمانوں کے رہنے والے اور زمین پر بسنے والے یہاں تک کہ سمندر کے اندر مچھلیاں بھی استغفار کرتی ہیں۔ عابد کے اوپر عالم کی فضیلت ایسی ہی ہے جیسی چودھویں رات کے چاند کی فضیلت تمام ستاروں پر ہوتی ہے اور علماء انبیاءؑ کے وارث ہیں اور انبیاءؑ کسی کو درہم و دینار کا وارث نہیں بناتے، ہاں! علم کا وارث بناتے ہیں، پس جس نے ان سے علم (کا بہت بڑا حصہ) حاصل کیا اس نے حظ وافر حاصل کیا۔

شرح: اس روایت کے الفاظ (واضح ہیں ان) کی تشریح کی ضرورت نہیں ہے لیکن رسول خداؐ نے طالب علم اور علما کے جو صفات بیان کیے ہیں ان کی مناسبت سے ان کو چند فصلوں کے ضمن میں بیان کروں گا اور خدا ہی پر بھروسہ ہے۔

پہلی فصل

تمہید کے طور پر یہ بات جان لینی چاہیے کہ عام طور پر علوم دو قسم پر منقسم ہیں

ایک تو دنیاوی علوم جن کا مقصد محض دنیوی مقاصد کا حاصل کرنا ہے، دوسرے اخروی علوم جن کا مقصد ملکوتی درجات و مقامات کا حاصل کرنا اور اخروی منازل تک پہنچنا ہے۔

اس سے پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ زیادہ تر ان دونوں قسموں میں فرق نیت و قصد پر موقوف ہوتا ہے اگر چہ خود یہ علوم اپنی جگہ پر دو قسموں پر منقسم ہیں اور اس حدیث میں علم و علما کیلئے آثار کی مناسبت سے جو بات کہی گئی ہے اس کا مقصد دوسرا علم یعنی علم آخرت مراد ہے اور یہ بات واضح ہے۔

اسی طرح پہلے یہ بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ تمام اخروی علوم تین حال سے خارج نہیں ہیں

یا وہ خدا اور معرفت خدا کے علوم کے زمرے میں آتے ہیں، یا تزکیہ نفس اور خدا کی طرف سلوک کی قسم میں شامل ہوتے ہیں، یا بندگی و عبودیت کے طور طریقوں سے متعلق ہیں۔ اب میں یہ عرض کرتا ہوں کہ اخروی زندگی کی آبادکاری انہیں تینوں امور سے وابستہ ہے اور اسی بنا پر مجموعی تقسیم کے اعتبار سے جنتوں کی بھی تقسیم تین ہی قسموں پر ہے:

جنت ذات اس کی غایت علم باللہ اور معارف الہیہ ہے۔ دوسری جنت صفات جو تزکیہ نفس اور اس کی ریاضت کا نتیجہ ہے اور تیسری جنت اعمال جو عبودیت کی ادائیگی اور اس کا نتیجہ ہے۔

اور یہ تمام جنتیں آباد نہیں ہیں۔ خود جنت اعمال کی زمین بھی ایک چٹیل میدان ہے، جیسے ابتدائے امر میں سرزمین نفس بھی ایک میدان ہوتی ہے۔ ان سب کی تعمیر و آبادی نفس کی آبادی پر موقوف ہے۔ چنانچہ اگر نفس کا مقام غیب، معارف الہیہ اور جذبات غیبیہ سے آباد نہ ہو تو انسان کو بہشت ذات اور جنت لقا حاصل نہیں ہو سکتی۔ (اسی طرح) اگر تزکیہ و زینت باطن حاصل نہ ہو اور عزم و ارادہ قوی نہ ہو، دل اسما و صفات کا آئینہ نہ ہو انسان کو بہشت اسما و صفات، یعنی جنت متوسط حاصل نہیں ہو سکتی اور اگر فرائض بندگی کو پورا نہ کرے اور اس کے اعمال و افعال، حرکات و سکنات شریعت کے قانون کے مطابق نہ ہوں تو بہشت اعمال

﴿وفیھا ما تشتھیہ الانفسُ وتلذُّ الاعینُ﴾ ہے ''کہ جس میں نفس کی ہر پسندیدہ چیز اور آنکھوں کیلئے ہر لذت بخش چیز ہوتی ہے'' اس کو حاصل نہیں ہو سکتی۔

اس تمہید کی بنا پر جو برہان حکمی اور ذوق اہل معارف و اخبار انبیاءؑ کے مطابق اور کتاب خدا سے بھی مستفاد ہے اچھا ہے جس درجے کا علم ہو خواہ علم المعارف ہو یا اس کے علاوہ دوسرا علم ہو اس کے مناسب جنت تک پہنچنا اسی کے راستے پر چلنے سے میسر ہو سکتا ہے اور آدمی جیا ہے جس راستے کا بھی سالک ہو وہ بہشت کے راستوں میں سے کسی نہ کسی راستے کا سالک ہوتا ہے اور ہم نے اس سے پہلے ذکر کیا ہے کہ علم مطلقاً عمل کا راستہ ہے یہاں تک کہ علم المعارف بھی عمل کا راستہ ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ علم المعارف قلبی اعمال اور باطنی جذبات کا نام ہے جس کا نتیجہ اعمال و جذبات ہوتے ہیں اور ان کی باطنی صورتیں جنت ذات اور بہشت لقا کی صورت ہوتی ہیں۔ پس طریق علم پر چلنا طریق جنت کے راستے پر چلنا ہے اور (اصل) راستے تک پہنچنے کا راستہ بھی راستہ ہی ہوتا ہے۔

اہم نکتہ

اس ارشاد میں ﴿سلک اللہ بہ الی الجنۃ﴾ یہ نکتہ ہے کہ سلوک علمی کی نسبت بندے کی طرف اور جنت کی طرف سلوک کی نسبت خدا کی ذات کی طرف دی گئی ہے کیونکہ مقام کثرت میں بندے کے کسب کے پہلو کو غلبہ دیا گیا ہے اور جنت کی طرف سلوک کو غلبہ دیا گیا ہے ورنہ دقت نظر سے دیکھا جائے تو ایک اعتبار سے جنت کی طرف سلوک بھی بندے ہی کی طرف منسوب ہے۔ (مثلاً) ﴿ووجدوا ما عملوا حاضرا﴾ ہے ''اور جو کچھ ان لوگوں نے (دنیا میں) کیا تھا وہ سب (لکھا ہوا) موجود پائیں گے'' اور ﴿فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ☆ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ﴾ ہے ''جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہے وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہے تو وہ اسے دیکھ لے گا'' اور ایک اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ علم کی راہ پر گامزن ہونا بھی توفیق و تائید خدا کی وجہ سے خدا ہی کی طرف منسوب ہے ﴿قل کل من عند اللہ﴾ ہے ''(اے رسولؐ) کہہ دیجئے سب کچھ خدا ہی کی طرف سے ہے''۔

جناب محقق فلاسفہ فخر مذہب حقہ، صدر المتالہین ؒ کا یہاں پر ایک بیان ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ ادراک ملایم کا نام جنت اور ادراک منافر کا نام دوزخ ہے اور علوم نفس کے ملائمات میں سے ہیں، اس

لئے بھی جنت ہیں اور جہالت نفس کے منافرات میں سے ہے لہذا ایک جہالت دوزخ ہے، حالانکہ جناب ملا صدرا" کا یہ نظریہ ان کے اسفار کے نظریئے کے مخالف ہے، کیونکہ انہوں نے (اسفار اربعہ میں) امام غزالی" کے نظریئے کو رد کیا ہے، غزالی نے نفس کو جو لذتیں حاصل ہوتی ہیں ان کو جنت قرار دیا ہے اور جو آلام ومصائب درپیش ہوتے ہیں ان کو جہنم قرار دیا ہے اور جنت ونار کے وجود ظاہری کا انکار کیا ہے! جیسا کہ ان سے نقل کی گئی ہے۔ ۱۰ اور (غزالی کا) یہ مسلک حکما کے براہین کا مخالف اور اخبار، انبیاء"، کتب سماویہ اور تمام ادیان کی ضرورت کے بھی مخالف ہے۔ خود جناب فیلسوف اعظم نے غزالی کے اس نظریئے کو مسترد کرتے ہوئے اسے باطل قرار دیا ہے، اب اگرچہ غزالی کے مسلک کی تردید کی ہے لیکن آپ" نے اسی مفہوم کے مشابہ خود یہاں پر نظریہ بیان کیا ہے! بہر حال (محقق ملا صدرا" کا) یہ بیان حقیر کی نظر میں صحیح نہیں ہے مگر اس کتاب میں اس سے زیادہ تفصیل مناسب بھی نہیں ہے۔

دوسری فصل:

فرشتے طالب علموں کیلئے اپنے پر بچھاتے ہیں

یہ بات سمجھ لو کہ خدا کے ملائکہ کی مختلف انواع واقسام ہیں اور یہی وہ جنود خدا ہیں جن کے بارے میں خدا کے علاوہ کسی کو علم نہیں ہے، ارشاد ہے: ﴿وما یعلم جنود ربک الا ھو﴾ ۱۱ "اور تمہارے پروردگار کے لشکروں کو خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا"۔

ملائکہ کی ایک قسم مجذوبین ومہیمین کی ہے جن کی نظر عالم وجود کی طرف نہیں ہے۔ ان کو بھی معلوم نہیں ہے کہ خدا نے آدم" کو پیدا کیا ہے یا نہیں۔ وہ تو جمال وجمال حق میں مستغرق رہتے ہیں اور ذات حق میں فانی ہیں۔ ۱۲

علما کا بیان ہے کہ آیہ شریفہ: ﴿ن ☆ والقلم وما یسطرون﴾ ۱۳ "ن، قلم کی اور اس چیز کی جو لکھتے ہیں (اس کی) قسم ہے" اس میں کلمہ مبارکہ ﴿ن﴾ سے انہیں ملائکہ کی طرف اشارہ ہے۔

دوسری قسم، ملائکہ مقربین اور ساکنین جبروت اعلیٰ کی ہے۔ ان کی بھی بہت سی قسمیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی عوالم کیلئے جو شان وتدبیر ہے وہ دوسرے کیلئے نہیں ہے۔

ایک اور گروہ، عوالم ملکوت اعلیٰ اور جنات عالیہ کے ملائکہ ہیں۔ ان کی بھی مختلف انواع اور متعدد

طبقات ہیں۔

ایک قسم، عالم برزخ و مثال کے ملائکہ ہیں۔

اور یک گروہ ان فرشتوں کا ہے جو عوام طبیعت و ملک پر موکل ہیں۔ ان میں سے ہر یک کسی نہ کسی کام پر مأمور اور کسی معاملے کا مدبّر ہے اور عالم ملک میں موجود تدبیر کرنے والے یہ فرشتے ان کے علاوہ ہیں جو عالم برزخ و مثال میں موجود ہیں۔ یہ تمام قسمیں اپنی جگہ پر ثابت ہیں اور روایت سے بھی یہی مستفاد ہوتا ہے۔[۱۴]

یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ ملائکہ کے تمام طبقات کیلئے بال و پر، بازو اور دیگر اعضا ثابت نہیں ہیں، بلکہ مہیمین سے لے کر ملکوت اعلیٰ کے ساکن فرشتوں تک تمام ملائکہ اس قسم کے عضو و اجزائے مقدار یہ سے منزہ و مبرا ہیں۔ ملائکہ تمام قسم کے مادوں اور ان کے لوازم، تقدرات وراس کے عوارض سے عاری ہیں ہاں! عالم مثال کے ملائکہ اور برزخ کی ملکوتی مخلوقات کیلئے اعضا و جوارح اور بال و پر کا ہونا ممکن ہے البتہ یہ سب چونکہ تقدرات برزخیہ کے عوالم اور تمثلات مثالیہ میں سے ہیں اس لئے ہر ایک مخصوص مقدار کے ہیں اور ان کیلئے مخصوص اعضا و جوارح ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے ﴿والصافات صفا﴾[۱۵] ''(عبادت یا جہاد میں) صف باندھنے والوں کی قسم'' دوسری جگہ آیا ہے ﴿اولی اجنحۃ مثنی وثلاث وربٰع﴾[۱۶] ''(فرشتوں کو اپنا قاصد بنانے والا ہے) جن کے دو دو، تین تین اور چار چار پر ہوتے ہیں'' وہ یہ سی قسم کے ملائکہ کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن ملائکہ مقربین اور جبروت اعلیٰ میں رہنے والے اپنے وجود قیومی کے حاظے کی وجہ سے جس عالم میں جاہیں اسی عالم کی شکل و صورت میں متشکل ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ جناب جبرئیلؑ چونکہ مقربین بارگاہ اور حامل وحی الٰہی اور عالم جبروت کے رہنے والوں میں سب سے اعلیٰ مرتبہ رکھنے والوں میں سے تھے اس لئے حضرت رسول اکرمؐ کیلئے مثال مقید میں ہمیشہ اور مثال مطلق میں صرف دو مرتبہ اور ملک میں کبھی کبھی ظاہر ہوتے تھے حتیٰ کہ عالم ملک میں بھی وہ ''دحیۃ الکلبی'' کی صورت میں ظاہر ہوتے تھے جو رسول خداؐ کے شیر خوار بھائی اور لوگوں میں سب سے زیادہ خوبصورت تھے۔[۱۷]

یہ بھی سمجھ لیجئے کہ ملائکہ کا ملکی صورت میں آنا بھی دیگر مخلوقات ملکیہ کی طرح نہیں ہے کہ جس کو صحیح حس رکھنے والا ہر شخص دیکھ سکے، بلکہ ان میں ملکوتی پہلوؤں کا غلبہ رہتا اور ملکی پہلو مغلوب رہتے ہیں۔ اسی سے تمثلات ملکیہ کے باوجود لوگ ان کو اپنی ظاہری آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے تھے، بلکہ تائید حق اور حضرت

رسول اکرمؐ کے اشارے پر بعض اصحاب رسولؐ جبرئیلؑ کو دحیہ کلبی کی صورت میں دیکھ لیتے تھے۔

اس بیان سے معلوم ہو گیا کہ طالبان علم و معرفت اور حق و حقیقت کی طرف متوجہ ہونے والے، رضائے الٰہی کے رستے پر چلنے والے افراد حضرت آدمؑ جو مسجود ملائکہ اور تمام دائرۂ وجود کے مطاع تھے کی روحانی اولاد ہیں اور خدا کے تمام فرشتے ان کا احترام کرتے اور ان کی تائید و تربیت پر مامور ہیں۔ اب چونکہ یہ ملکی (زمینی) ملکوتی اور زمینی سمائی ہو گئے ہیں اس لئے ملائکہ کے بازوؤں پر پیر رکھتے ہے کہ اگر ملکوتی و مثالی چشم بصیرت کھل جائے تو دیکھیں گے کہ ملائکہ کے بازوؤں پر ٹھہرے ہیں اور ان کی تائید سے راستہ طے کر رہے ہیں۔ یہ تو ان لوگوں کا حال ہے جو ملک سے ملکوت کا سفر کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے باوجود ابھی رستے ہی میں ہیں۔

لیکن جو ابھی ملکی ہیں اور ملکوت تک نہیں پہنچے ان کیلئے ممکن ہے کہ ملکوتی حضرات ان کی تائید میں مشغول ہوں اور ان کی تواضع و خوشنودی کے حصول کیلئے، نیز ان کے عمل کی وجہ سے اپنے پروں کو ان کیلئے فرش بنا دیں۔ جیسا کہ اس حدیث میں اور عوالی اللئالی والی حدیث میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ جناب مقدادؓ فرماتے ہیں ﴿قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول ان الملائکۃ لتضع اجنحتھا لطالب العلم حتی یطأ علیھا رضا بہ﴾ ۱۸؎ "میں نے رسول خداؐ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ملائکہ طالب علموں کے خوشنودی کیلئے اپنے پروں کو بچھا دیتے ہیں تا کہ طالب علم ان کو پیروں سے روندیں"۔

پس اس سے معلوم ہو گیا کہ خدا اور اس کی رضا کی طرف قدم بڑھانے والے کے پیر دوش ملک پر ہوتے ہیں اور وہ شخص ان کے بازوؤں پر بیٹھا ہے اور تعلیم و حصول علم و معارف کے آخری مرحلے تک یہ فرش رہتا ہے۔ البتہ درجوں میں فرق ہوتا ہے اور ملائکہ اور اس طالب علم کے مؤیدین کبھی کبھی بدل جاتے ہیں تا کہ سالک کا کام اس منزل تک پہنچ جائے کہ وہ ملائکہ کے سروں سے قدم اٹھا کر عوالم و مدارج کو طے کر کے ایسی جگہ پہنچ جائے جہاں ملائکۂ مقربین کا گزر نہ ہو سکے اور امین وحی جبرئیلؑ عاجز ہو کر یہ کہتے ہوئے نظر آئیں ﴿لو دنوت انملۃ لاحترقت﴾ ۱۹؎ "اگر میں (اب) ایک انگل بھی بڑھ جاؤں تو جل جاؤں گا"۔

اور چونکہ یہ مطلب برہان سے ٹکراتا نہیں ہے، بلکہ اس کے موافق ہے لہذا تاویل کی کوئی ضرورت نہیں ہے، جیسا کہ صدر المتالہینؒ نے تاویل کی ہے ۲۰؎ حالانکہ آپؒ عالم مثال کے ملائکہ اور فرشتوں کی ملکی و ملکوتی اشکال کے نہ صرف قائل ہیں، بلکہ اس کو اپنی حکمت کی کتابوں اور علمی اسفار میں بے نظیر بیانات سے

ثابت بھی کیا ہے جو آپ ؑ ہی کا طرۂ امتیاز ہیں۔

تیسری فصل

تمام آسمان و زمین کے باشندے طالبعلم کیلئے استغفار کرتے ہیں

یہ جان لو کہ یہ بات مسلّم ہے کہ حقیقت وجود تمام کمالات و اسماء و صفات کا عین ہے۔ چنانچہ وجود محض کمال محض ہے اور اسی بنا پر چونکہ خداوند عالم محض وجود ہے لہذا محض کمالات اور عین اسماء و صفات جلالیہ و جمالیہ ہے اور حدیث میں بھی ہے: ﴿عِلْمٌ كُلُّهُ، قُدْرَةٌ كُلُّهُ﴾ ۲۱ "(خدا) کل علم اور کل قدرت ہے" اور یہ بات برہان سے ثابت ہے کہ حقیقت وجود آئینوں میں عین تمام کمالات ہے اور کسی بھی کمال کا اس سے جدا ہونا ممکن نہیں ہے۔ بس اتنا ضرور ہے کہ ان کمالات کا ظہور آئینے کی وسعت و تنگی اور اس کی صفائی اور کدورتوں کے تابع ہے۔ اسی لئے تمام سلسلۂ وجود آیات ذات اور اسماء و صفات کے آئینے ہیں اور یہ مطلب براہین سے ثابت ہے، بلکہ مطالب حکمیہ میں کوئی بھی مطلب اس کی طرح قوی و مضبوط نہیں ہے اور (یہ مطلب) اصحاب شہود کے مشاہدات اور ارباب معرفت کے ذوق کے مطابق اور قرآن کریم و اخبار اہل بیت ؑ کے موافق ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں متعدد مرتبہ تمام مخلوقات کی تسبیح کا ذکر آیا ہے، (مثلاً) ﴿يُسَبِّحُ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ﴾ ۲۲ "جو چیز آسمانوں میں ہے اور جو چیز زمین میں ہے (سب) خدا کی تسبیح کرتی ہے" ﴿وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلٰكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ﴾ ۲۳ "اور ساری زمین میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اس کے (حمد و ثنا) کی تسبیح نہ کرتی ہو مگر تم لوگ ان کی تسبیح نہیں سمجھتے"۔

اور یہ بات بہت ہی واضح ہے کہ پروردگار عالم کی تسبیح و تقدیس، ذات خدا اور اس کے صفات جلال و جمال کے علم و معرفت کا لازمی نتیجہ ہے اور یہ کسی علم و معرفت کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔ حدیث شریف میں اس مقدس مفہوم کو اتنی صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جو قابل توجیہ و تاویل نہیں ہے۔ (اس کے باوجود) اہل حجاب اور رسمی فلسفہ و کلامی بحث و جدل اور معارف الہیہ سے محجوب لوگوں نے کلام خدا کی ایسی سرد تاویلات کی ہے جو بعض مقامات پر ظواہر آیات و نصوص، مثلاً سورۂ نمل ۲۴ میں چیونٹی کی گفتگو کی مخالفت پر مشتمل ہونے کے ساتھ ساتھ ائمہ معصومین ؑ کی نصوص کثیرہ کی مخالفت کے علاوہ حکمی کی مضبوط ترین

دیسوں کے بھی مخالف ہے، لیکن ان براہین اور ان کے مقدمات کا ذکر اس کتاب کی تصنیف کے مقصد کے خلاف ہے (اس سے اعراض کیا جاتا ہے)۔

اس سے معلوم ہوا کہ تمام مخلوقات کی خدا کیلئے حمد وثنا شعور وادراک سے ہوا کرتی ہے۔ (چنانچہ) حدیث میں ہے کہ رسول خدا نے فرمایا "بعثت سے پہلے جب میں بھیڑ بکریوں کو چرایا کرتا تھا تو کبھی میں دیکھتا تھا کہ گوسفند بغیر کسی وجہ کے وحشت زدہ ہو جاتے اور بھاگنے لگتے تھے۔ پھر بعثت کے بعد میں نے جبرئیل سے اس کا سبب پوچھا تو انہوں نے بتایا، یہ وحشت (وفرار) اس ضرب کی وجہ سے ہے جو کافر کو ماری جاتی ہے جس سے سننے والی تمام مخلوقات، ثقلین کے علاوہ خوفزدہ ہو جاتے ہیں" ۴۵ اور اہل معرفت کہتے ہیں "جب تک انسان ملک (دنیا) اور اس کی تدبیرات میں مشغول رہتا ہے اس وقت تک وہ ملکوت سے محجوب ترین انسان ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی مصروفیت سب سے زیادہ اور بہت طاقتور ہوتی ہے۔ لہذا، س کا احتجاب بھی سب سے زیادہ ہوتا ہے اور قرب ملکوت سے بھی سب سے زیادہ محروم ہوتا ہے"۔

نیز تمام مخلوقات کیلئے ایک ملکوتی وجہ ہے جس کے سبب وہ زندگی، علم اور زندگی کے دیگر شئون کی مالک ہوتی ہیں ﴿وَكَذَٰلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ ۴۶ "اسی طرح ہم ابراہیم کو سارے آسمان وزمین کی سلطنت کا انتظام دکھاتے رہے" ور یہ مخلوقات کے اندر علم وحیات کی موجودگی کا دوسرا سبب ہے

جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ تمام مخلوقات کو علم ومعرفت حاصل ہے اور سب کے اندر ملکوتی پہلو موجود ہے، لیکن چونکہ نسان ان تمام مخلوقات کے عرض میں واقع نہیں ہے (بلکہ طول میں واقع ہے) اور ملکوت سے بھی محجوب ہے اس لئے نہ ان کی زندگی ورنہ ہی کوائف زندگی کا علم رکھتا ہے۔ ابتہ جو انسان طریق علم کا سالک ور خدا کی طرف متوجہ ہے اور جو سلسلہ وجود کا شاہکار ور دور تحقق کا ولی نعمت ہے اس کیلئے ممکن ہے کہ یہ مخلوقات استغفار کریں اور ذات خداوند کی مقام غفاریت سے بزبان قال ولہجہ ملکوتی (جس کو کھلے ہوئے ملکوتی کان سنتے ہیں) دعا کریں کہ اس کامل مولود ملک اور فخر موالید طبیعت کو اپنے بحار مغفرت میں مستغرق کر دے ور اس کی تمام خامیوں کو چھپا دے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ دیگر مخلوقات کو علم ہے کہ انسان کامل، عالم باللہ، عارف معارف الہیہ وجامع علم وعمل کے واسطے کے بغیر ان مخلوقات کا ذات مقدس میں فنا ہونا اور بحر کمال میں ڈوب جانا ممکن نہیں ہے اور

یہ بات بھی اپنی جگہ ثابت ہے، اس وجہ سے کمال انسانی کیلئے خدا سے دعا کرتے ہیں کہ اس کو بحر عظمت میں استغراق حاصل ہوجائے تاکہ اس وسیلے سے ان مخلوقات کو بھی ان کے مناسب کمال حاصل ہوجائے واللہ العالم۔

چوتھی فصل

جس طرح چاند کو تمام ستاروں پر فضیلت ہے

اسی طرح عالم کو عابد پر فضیلت ہے

یہ جان لو کہ علم و ایمان کی حقیقت جو علم پر مبنی ہے وہ نور ہے اور یہ بات برہان و عرفان کے مطابق ہونے کے ساتھ ساتھ نصوص و اخبار اہل بیت علیہم السلام کے بھی موافق ہے۔ اس لئے کہ حقیقت نور، یعنی جو بذات واضح اور ظاہر ہو اور دوسرے کو ظاہر روشن کرنے والا ہو۔ حقیقت علم کیلئے ثابت اور اس پر صادق ہے، بلکہ حقیقت علم پر اس کا صدق حقیقت ہے اور نور حسیہ پر اس کا صدق مجاز سے زیادہ مشابہ ہے۔ اس لئے کہ نور حسی درحقیقت ظہور ذاتی نہیں رکھتا، بلکہ اس کے پہلوؤں میں سے ایک حقیقت ہے اور یہ ماہیت رکھتا ہے، لیکن حقیقت علم بذات عین وجود ہے۔ ہاں مفہوم میں ضرور مخالف ہے لیکن متن اعیان و اصل حقیقت میں اس سے موافق اور متحد ہے اور حقیقت وجود عین نور و عین علم ہے ﴿اللہ نور السموات والارض﴾ ۲۷ پس معلوم ہوا کہ علم عین نور ہے اور قرآن کی آیات شریفہ میں علم و ایمان کو نور سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (مثلاً) ﴿ومن لم یجعل اللہ لہ نوراً فما لہ من نور﴾ ۲۸ "اور جسے خدا ہی نے علم نہ دیا ہو تو اس کیلئے کوئی علم (یعنی نور) نہیں ہے" "تفسیر اہل بیت" میں آیہ شریفہ نور کی تفسیر میں نور سے مراد علم لی گئی ہے

فعن الصادق علیہ السلام: ﴿اللہ نور السماوات والأرض﴾ قال: كذلك الله عزوجل ﴿مثل نوره﴾ قال: محمد صلی اللہ علیہ وآلہ ﴿كمشكاة﴾ قال: صدر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ ﴿فيها مصباح﴾ قال: فيه نور العلم يعني النبوة ﴿المصباح في زجاجة﴾ قال: علم رسول الله صدر إلى قلب علي... الحديث. ۲۹

"امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے ﴿اللہ نور السموات والارض﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی طرح ہے، اور ﴿مثل نوره﴾ سے مراد رسالتمآبؐ ہیں، ﴿كمشكاة﴾ سے مراد رسول خداؐ کا سینہ ہے، ﴿فيها مصباح﴾ کے سینے میں امامؑ نے فرمایا ان کے اندر نور علم، یعنی نبوت ہے، اور ﴿المصباح في

زجاجۃ﴾ سے مراد رسول خداؐ کا وہ علم ہے جو حضرت علیؑ کے قلب کو ملا ''۔

وعن الباقر علیہ السلام انہ یقول: ﴿انا ھادی السماوات والارض، مثل العلم الذی اعطیتہ، وھو النور الذی یھتدی بہ۔ مثل المشکوۃ فیھا المصباح، فالمشکوۃ قلب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، والمصباح نورہ الذی فیہ العلم﴾ ۳۰ ''امام محمد باقرؑ نے فرمایا رسول خداؐ کا ارشاد ہے میں زمین و آسمان کا ہادی ہوں اور جو نور مجھے عطا کیا گیا ہے یعنی وہ نور جس سے ہدایت حاصل کی جاتی ہے وہ اس مشکات کے مشابہ ہے جس میں مصباح ہو، تو مشکات سے مراد قلب رسولؐ ہے اور مصباح سے مراد وہ نور ہے جس میں علم ہو''۔

وفی روایۃ قال: ﴿فالمؤمن ینقلب فی خمسۃ من النور مدخلہ نور، ومخرجہ نور، وعلمہ نور، وکلامہ نور، ومصیرہ الی الجنۃ یوم القیامۃ نور﴾ ۳۱ ''ایک روایت میں معصومؑ نے فرمایا مؤمن نور کی پانچ حالتوں میں منقلب ہوتا رہتا ہے اس کا مدخل نور، اس کا مخرج نور، اس کا علم نور، اس کا کلام نور اور قیامت کے دن جنت میں جانا نور ہے''۔

ایک مشہور حدیث نقل کی گئی ہے ﴿العلم نور یقذفہ اللہ فی قلب من یشاء﴾ ۳۲ ''علم ایک قسم کا نور ہے جس کو خدا جس کے قلب میں چاہتا ہے ڈال دیتا ہے''۔

اہل علم و ایمان کے مطابق اس نور کے بھی متعدد مرتبے ہیں۔ یہ بھی جان لینا چاہئے کہ یہ حقیقی نور جو اہل علم و ایمان کے قلوب میں ہے چونکہ عالم آخرت کے انوار سے ہے لہذا اس عالم میں نفس کی سرگرمیوں کی بنا پر نورانیت حسیہ کی صورت میں ظاہر ہوگا اور یہی نور صراط کو روشن کرے گا۔ کچھ لوگوں کا نور سورج کی طرح ہوگا اور کچھ کا چاند کی طرح ہوگا یہاں تک کہ کسی کا نور صرف اتنا ہوگا کہ اس سے صرف پیر کے آگے کا حصہ روشن ہوگا۔

اب معلوم ہوگیا کہ حقیقت میں بغیر کسی شائبۂ مجاز کے، علم نور ہے اور ظہور، مگر ہم بے چارے چونکہ فطرت کے تاریک پردوں اور عالم ملک کے تاریک رات میں رہتے ہیں اس لئے روز افزوں دانش و بینش کے علم و نور کے حقیقی سورج سے محروم محجوب ہیں اور ہم یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ تو مثل ہے اور مجاز و استعارات، مدائح اور تعبیر پر مبنی ہے۔ جی ہاں! جب تک ہم عاریتاً گئی زندگی کے خواب (غفلت) میں محو ہیں اور طبیعت کا نشہ ہمارے دماغوں میں چڑھا ہوا ہے اور حقیقت و مجاز میں فرق محسوس نہ کریں، ہماری مجازی

نظروں میں یہ مجازی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ عالم مجاز میں حقیقت بھی مجازی نظر آتی ہے۔ (حضرت علی کے بقول) ﴿النَّاسُ نِيَامٌ إِذَا مَاتُوا انْتَبَهُوا﴾ ۳۴ "لوگ سوئے ہوئے ہیں جب مریں گے تو بیدار ہوں گے" جب ہماری "آنکھ کھلے گی تو دیکھیں گے جس طرح سورج اور چاند منور ہیں اور روشنی بخش ہیں اسی طرح عالم کا نور بھی ہے۔ عالم اس دنیا میں اپنے علم کے نور سے تاریک دلوں کو منور کرتا اور جہالت و نادانی کے مردوں کو زندگی عطا کرتا ہے۔ اسی طرح عالم آخرت میں بھی اس کا علم محیط ہوگا اور اس کے علم کی قندیل سے روشنی حاصل کرنے والے اور اس سے ارتباط رکھنے والے اسی کی شفاعت سے بخشے جائیں گے۔

اور یہ بھی سمجھ لیجئے کہ بغیر علم کے عبادت بھی نہیں ہو سکتی، اسی لئے عابد کیلئے بھی ایک نور ہے جو خود اس کیلئے مخصوص ہے، بلکہ عبادت اور ایمان باللہ بھی نور ہی کی ایک قسم ہے۔ البتہ اتنا فرق ضرور ہے کہ عابد کا نور صرف اس کیلئے روشنی دے گا اور اسی کے پیروں کے نیچے کی جگہ کو روشن کرے گا اور دوسروں کو روشنی نہ دے گا۔ اسی لئے عبادت گزاروں کی مثال ان ستاروں کی طرح ہے جو چودھویں رات کو چاندنی بھرپور روشنی کی وجہ سے صرف اپنی جگہ پر روشنی دیتے ہیں لیکن دوسروں کو نفع نہیں پہنچا سکتے ہیں اور نہ نور عطا کر سکتے۔ پس عالم کے سامنے عابد کی مثال ستارہ جیسی ہے لیکن نہ اس ستارے کی طرح جو شب تاریک میں چمکتا ہو اور ایک حد تک روشنی دیتا ہو، بلکہ اس کی مثال اس ستارے کی طرح ہے جو چودھویں کی رات کو چمکتا ہو، ایسی حالت میں ستارہ خود تو نظر آتا ہے مگر دوسرے کو روشنی نہیں دے سکتا۔

جناب صدر المتألہین (قدس سرہ) فرماتے ہیں "اس حدیث میں عالم سے مراد غیر عالم ربانی ہے یعنی اس سے مراد وہ عالم ہے جس کا علم لدنی اور وہبی ہو جیسے انبیاءؑ و اولیاءؒ کے علوم اور اس بات کی دلیل یہ ہے کہ اس کی مثال چاند سے دی گئی ہے ورنہ اگر انبیاءؑ وغیرہ کا علم مراد ہوتا تو اس کی مثال سورج سے دینا مناسب تھی، کیونکہ انبیاءؑ کا علم براہ راست خدا سے ہوتا ہے اور اس میں کوئی واسطہ نہیں ہوتا یعنی بنی نوع و جنس میں سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا"۔ ملا صدرا (اعلی اللہ مقامہ) کا قول ختم ہوا۔ ۳۵

پانچویں فصل: علما انبیاءؑ کے وارث ہیں

علم کی جو وراثت انبیاءؑ سے ہے وہ روحانی ہے (جس طرح) ان کی ولادت ملکوتی ہے۔ انسان اگرچہ نشئہ ملکیہ (دنیویہ) و جسمانیہ کے اعتبار سے موجود ملک ہے (لیکن) انبیاءؑ کی تربیت اور مقام قلب حاصل

ہوجانے کی وجہ سے اس کی ولایت ملکوتی ہوجاتی ہے اور اس ولادت کا سرچشمہ جسمانی باپ ہوتا ہے (اسی طرح) اس ولادت کا سرچشمہ انبیائے کرامؑ ہوتے ہیں۔ اس لئے انبیاءؑ روحانی باپ ہیں اور ان کی وراثت (درحقیقت) وراثت باطنی و روحانی ہوتی ہے اور یہ ولادت، ولادت ثانوی ملکوتی ہے اور انبیاءؑ کے بعد تعلیم و تربیت علما کے ہاتھوں ہوتی ہے اور یہی علمائے کرام انبیاءؑ کے حقیقی روحانی وارث ہوتے ہیں اور انبیاءؑ اپنے اس مقام روحانیت کی بنا پر نہ تو درہم و دینار کے مالک ہوتے ہیں اور نہ عالم ملک و شئون ملکیہ کی طرف متوجہ ہوتے اور انبیاءؑ کی وراثت ان کے اس مقام کے اعتبار سے علم و معارف کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہوتی اگرچہ (انبیائے کرامؑ بھی) ملکی ولادت اور دنیاوی اعتبار سے تمام بشری حیثیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ (چنانچہ ارشاد ہے) ﴿قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ [36] "(اے رسول) کہہ دیجئے میں تم جیسا بشر ہوں" اور اس اعتبار سے علما انبیاءؑ کے وارث نہیں ہیں، بلکہ انبیاءؑ کے وارث خود ان کی جسمانی اولاد ہوگی اور اس وقت جسمانی اعتبار سے انبیاءؑ درہم و دینار کے مالک و وارث ہوا کرتے ہیں۔

اور یہ حدیث شریف وضاحت، بلکہ صراحت کے ساتھ روحانی وراثت پر دلالت کرتی ہے، جیسا کہ ذکر کیا گیا اور رسولخداؐ کی وہ حدیث جو آنحضرتؐ کی طرف منسوب ہے (یعنی) ﴿نَحْنُ مَعَاشِرُ الْأَنْبِيَاءِ لَا نُوَرِّثُ﴾ [37] "ہم گروہ انبیاءؑ وارث نہیں بناتے" کو اگر صحیح بھی مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ شان نبوت اور روحانی وراثت کے اعتبار سے وہ حضرات کسی کو مال و منال کا وارث نہیں بناتے ہیں، بلکہ ان کی میراث علم ہوتی ہے، جیسا کہ واضح ہے۔

والسلام

توضیحات (۲۹)

۱۔ اصول کافی، ج۱، ص۳۴، کتاب فضل العلم، باب ثواب العالم والمتعلم، حدیث

۲۔ حدیث ۳۴، حاشیہ ۹۔

۳۔ سورۂ زخرف، آیت ۷۱۔

۴۔ حدیث ۲۳، ۲۴۔

۵۔ سورۂ کہف، آیت ۴۹۔

۶۔ سورۂ زلزال، آیت ۷ و ۸۔

۷۔ سورۂ نساء، آیت ۷۸۔

۸۔ شرح اصول کافی، ج، ص۳۶، کتاب فضل العلم، باب ثواب العالم والمتعلم، حدیث۔

۹۔ اسفار اربعہ، ج۹، ص۱۷۲، السفر الرابع، باب ۸، فصل ۱۰۔

۱۰۔ تہافت الفلاسفہ غزالی، ص۲۶۸۔

۱۱۔ سورۂ مدثر، آیت ۳۱۔

۱۲۔ علم الیقین، ج، ص۲۵۶، مقصد۲، باب، فصل،

۱۳۔ سورۂ قلم، آیت ۱۔

۱۴۔ علم الیقین فیض کاشانی، ج، ص۲۵۹، ۲۶۸، مقصد۲، باب۲، فصل،

۱۵۔ سورۂ صافات، آیت ۱۔

۱۶۔ سورۂ طور، آیت ۱۔

۱۷۔ بحار الانوار، ج۸، ص۲۶۷، تاریخ النبی، باب۲، حدیث ۲۹۔

۱۸۔ عوالی اللئالی، ج۱، ص۱۰۶، فصل ۹، حدیث ۴۳۔

۱۹۔ بحار الانوار، ج۱۸، ص۳۸۲، تاریخ نبی، باب اثبات معراج، حدیث ۸۵

۲۰۔ شرح اصول کافی، ص۳۷، کتاب العلم، باب ثواب العالم والمتعلم، حدیث

۲۱۔ قونوی نے فصوص میں کہا ہے ﴿وُجودٌ كُلُّهُ، قُدرةٌ كُلُّهُ، حياةٌ كُلُّهُ﴾ "وہ وجود کل ہے، قدرت کل ہے، حیات کل ہے" ص۲۵۳ و ۳۱۶۔

۲۲۔ سورۂ جمعہ، آیت ۷۔

۲۳۔ سورۂ اسراء، آیت ۴۴۔

۲۴۔ تفسیر الجامع لاحکام القرآن، قرطبی، ج ۱۳، ص ۱۲۹۔ ۱۴۲۔

۲۵۔ کافی میں امام محمد باقرؑ کی روایت ہے کہ رسولؐ نے فرمایا:

"میں دنبوں اور بھیڑوں کو چراتے ہوئے دیکھتا تھا اور کوئی بھی نبی ایسا نہیں گزرا جو جانوروں کو چراتا نہ رہا ہو۔ چنانچہ میں (نبوت سے پہلے) جانوروں کو دیکھا کرتا تھا کہ وہ آرام سے ہیں اس کے ارد گرد کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ان کو گھبرا دے یہاں تک کہ وہ خود بخود خوفزدہ ہو جاتے تھے اور بھاگنے لگتے تھے تو میں نے کہا تھا یہ بات کیا ہے؟ اور مجھے تعجب ہوتا تھا یہاں تک جبرئیلؑ میرے پاس آئے اور کہا کافر کا جب مار جاتا ہے تو دنیا کی ہر مخلوق (ثقلین کے علاوہ) اس کو سن کر خوفزدہ ہو جاتی ہے۔ (منہ عفی عنہ)

۲۶۔ سورۂ نجم، آیت ۵/ ۷۔

۲۷۔ سورۂ نور، آیت ۳۵۔

۲۸۔ سورۂ نور، آیت ۴۰۔

۲۹۔ توحید ص ۱۵۰، باب تفسیر آیت نور، حدیث ۴۔

۳۰۔ روضۂ کافی، ج ۸، ص ۳۸۰، باب تفسیر آیات من القرآن، حدیث ۵۷۴

۳۱۔ برہان، ج ۴، ص ۱۳۵۔

۳۲۔ حدیث ۳۲ حاشیہ ۱۲۔

۳۳۔ یہ حدیث عنوان بصری کی طویل حدیث کے ضمن میں ہے اور شہید سعید کے اس "منیۃ المرید" کے حاشیہ پر ہے جو روض جنان کے ساتھ چھپی ہے وہاں پر متن حدیث مرقوم ہے۔ (منہ عفی عنہ)

۳۴۔ حدیث ۳۳، حاشیہ ۱۹۔

۳۵۔ شرح اصول کافی، ص ۱۳۸، کتاب فضل العلم، باب ثواب العالم والمتعلم، حدیث

۳۶۔ سورۂ کہف، آیت ۱۰۹

۳۷۔ مسند احمد حنبل، ج ۲، ص ۲۶۳۔

ستائیسویں حدیث

بالسند المتصل الی الشیخ الاجل والثقة الجلیل، محمد بن یعقوب الکلینی، رضوان الله علیه، عن عدة من اصحابنا، عن احمد بن محمد، عن ابن محبوب، عن عمر بن یزید، عن ابی عبد الله علیه السلام قال

﴿فی التوریة مکتوب یابن آدم! تفرغ لعبادتی املأ قلبک غنیً ولا اکلک الی طلبک وعلیّ ان اسدّ فاقتک واملأ قلبک خوفاً منی

وان لا تفرغ لعبادتی املأ قلبک شغلاً بالدنیا ثم لا اسدّ فاقتک واکلک الی طلبک﴾

ترجمہ: امام جعفر صادقؑ نے فرمایا توریت میں لکھا ہے: اے ابن آدم! میری عبادت کیلئے فراغت حاصل کرتا کہ میں تیرے قلب کو بے نیاز کردوں اور تجھے تیری خواہشوں کے حوالے نہ کروں اور میری ذمہ داری ہے کہ تیرے فاقہ کے راستے کو بند کردوں اور تیرے دل کو اپنے خوف سے بھردوں اور اگر تو میری عبادت کیلئے فارغ نہیں ہوتا تو میں تیرے دل کو دنیا کی مصروفیت سے بھردوں گا اور تیرے فاقے کے راستے کو بند نہ کروں گا تجھے تیرے طلب (وخواہش) کے حوالے کردوں گا۔

شرح: "تفرّغ لکذا" تفرّغ باب تفعّل سے ہے، اس کا مطلب ہے اپنے پورے وقت کو اس کیلئے کسی طرح صرف کردے کہ کسی اور کام میں مشغول نہ ہو اور عبادت کیلئے دل کو خالی کرنے کا مطلب ہے۔ اس کیلئے ہر چیز سے اپنی توجہ کو ہٹانا۔

"ملاً" "ملاء ماءً وضع فیه بقدر ما یاخُذُهُ" کا مطلب ہے اس میں اتنا پانی گرایا جس کو لے سکے۔ "أکِلُ، مِن یکِلُ" کا صیغہ متکلم ہے "وَکّل اِلَیه الأمر ای سلّمهُ" کا مطلب ہے اس کے حوالے کر دیا۔ اس کے سپرد کر دیا اور خود اس میں کوئی تصرف نہیں کیا۔ "اسُدُّ، سدَّ یَسُدُّ سدّاً" کا متکلم ہے، باب نصر سے ہے اور فتح کا نقیض ہے اسکے معنی بند کرنے کے ہیں۔ "الفاقہ" یعنی حاجت وغربت، نیاز مندی وگدائی۔

"واملأ قلبک خوفاً منّي" بظاہر یہ متکلم کا صیغہ ہے۔ امر کا صیغہ ماننا اور اول کلام پر عطف کرنا بعید ہے۔ اس حدیث کے ضمن میں جو چیزیں بیان کرنا ضروری ہیں ان کو میں انشاء اللہ چند ابواب کے اندر بیان کروں گا۔

پہلی فصل

جان لو کہ عبادات کیلئے فراغت حاصل ہونے کا مطلب اس کیلئے فارغ وقت کا ہونا اور فراغت قلب کا حاصل ہونا ہے۔ عبادت کے اندر یہ چیز بہت ہی اہم ہے کیونکہ اس کے بغیر حضور قلب پیدا نہیں ہوتا اور حضور قلب کے بغیر عبادت بے فائدہ ہے۔

حضور قلب کیلئے دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے ایک فراغت وقت اور فراغت قلب۔ دوسرا قلب کو عبادت کی اہمیت سمجھانا ہے۔ فراغت وقت سے مراد یہ ہے کہ انسان شب وروز کیلئے اپنی عبادات کا وقت معین کردے اور اپنے کو اس وقت عبادت کیلئے وقف کردے۔ اس وقت میں کوئی دوسرا کام انجام نہ دے اور جب انسان یہ سمجھ لے کہ عبادت ایک اہم چیز ہے دوسرے کاموں سے اس کی اہمیت زیادہ ہے بلکہ دوسری چیزوں کا اس سے کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے تو پھر اس کیلئے وقت معین کرے گا اور اس وقت کی پابندی کرے گا۔

ب اس کے بعد میں حتی المقدور تھوڑا سا اس سلسلے میں بیان کروں گا۔

بہر حال عبادت گزار آدمی کو اپنی عبادت کیلئے وقت معین کرنا چاہئے اور اوقات نماز کی جو اہم ترین عبادت ہے، پابندی کرنے کے علاوہ اس کو وقت فضیلت میں ادا کرنا چاہئے اور ان اوقات میں کوئی دوسرا کام نہیں کرنا چاہئے۔ جس طرح مال ومنال کیلئے (بحث) ومباحثہ اور مطالعے کیلئے وقت معین کیا جاتا ہے اسی طرح عبادت کیلئے بھی وقت معین کرنا چاہئے۔ جس میں دیگر امور سے فارغ ہو تاکہ حضور قلب حاصل ہوسکے جو لب ومغز عبادت ہے۔ لیکن اگر یہ میری طرح تکلف سے ادا کرے اور بندگی معبود کی ادائیگی کو امور

زندگی میں سے قرار دے تو پھر اس کی ادائیگی کو آخر وقت تک کیلئے موخر کر دے گا اور بجالانے کے وقت بھی چونکہ بعض امور کی انجام دہی کو جو اس کی نظر میں اہم ہیں، اس سے مزاحم سمجھتا ہے اس لئے اگر پڑھتا بھی ہے تو ہاتھ پیر تو ڑ کر پڑھتا ہے۔ البتہ اس عبادت میں نور نیت نہیں ہوتی اور ایسا شخص غضب الٰہی کا مستحق ہوتا ہے اور وہ نماز کے بارے میں سستی کرنے والوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ میں نماز کو خفیف شمار کرنے سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں۔ اس کتاب میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ اس موضوع کی روایت کو پوری طرح سے ذکر کیا جائے۔ البتہ بعض کو عبرت کیلئے ذکر کرتا ہوں۔

عن محمد بن یعقوب باسناده عن ابي جعفر علیه السلام قال: ﴿لا تتهاونّ بصلاتک، فانّ النبيّ صلی الله علیه وآله قال عند موته لیس منّي من استخف بصلاته، لیس منّي من شرب مسکراً لا یرد عليّ الحوض لا والله﴾ [۲] "زرارہ" نے امام محمد باقرؑ سے روایت کی ہے، آپؑ نے فرمایا اپنی نماز کے بارے میں سستی نہ کرو اس لئے کہ رسولِ خداؐ نے اپنی رحلت کے وقت فرمایا تھا جو شخص اپنی نماز کے بارے میں سستی کرے وہ ہم سے نہیں ہے اور وہ بھی مجھ سے نہیں ہے جو نشہ آور چیزوں کو پیئے، خدا کی قسم وہ میرے پاس حوض کوثر پر نہیں آسکتا"۔

وباسناده عن ابي بصير قال، قال ابوالحسن الاوّل علیه السلام ﴿لمّا حضرت ابي الوفاة، قال لي: یا بنيّ! لا ینال شفاعتنا من استخف بالصّلاة﴾ [۳] "ابی بصیر" سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا امام موسیٰ کاظمؑ نے فرمایا جب میرے باپ کی رحلت کا وقت قریب آیا تو مجھ سے فرمایا اے بیٹا! جو شخص نماز کے بارے میں سستی برتے اس کو میری شفاعت نصیب نہیں ہوگی"۔

اس سلسلے میں روایات تو بہت ہیں لیکن اہل عبرت کیلئے یہی کافی ہے۔ خدا جانتا ہے کہ رسولِ خداؐ سے جدائی یا آپؐ کی نظر کرم سے محروم ہونا کتنی بڑی مصیبت ہے اور آنحضرتؐ اور ان کے اہل بیتؑ کی شفاعت سے محرومی کتنی بڑی رسوائی ہے۔ یہ گمان بھی نہ کیجئے گا کہ آنحضرتؐ کی شفاعت کے بغیر کوئی رحمت حق اور بہشت موعود کا چہرہ دیکھ سکتا ہے۔ اب آپ سوچئے کہ ہر معمولی چیز کو بلکہ خیالی نفع کو اس نماز پر مقدم کرنا جو رسولِ خداؐ کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور خدا کی رحمت تک پہنچنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے اور اس کے بارے میں سستی کرنا، نیز کسی عذر کے بغیر اس کو آخری وقت تک ٹال دینا، اس کے حدود کی حفاظت نہ کرنا، نماز کو سبک سمجھنے اور اس کے بارے میں سستی کرنے کے مترادف ہے یا نہیں؟! اگر ایسا ہے تو رسولِ خداؐ اور

ان کے اہل بیت ؑ کی گواہی کی بنا پر تم ان کی ولایت سے خارج اور ان کی شفاعت سے محروم ہوگے۔ اب یہ سوچو کہ اگر تم ان حضرات کی شفاعت کے محتاج ہو اور چاہتے ہو کہ تمہارا شمار آنحضرت ؐ کی امت میں ہو تو اس امانت الٰہی (نماز) کو عظیم سمجھو اور اس کی اہمیت کے قائل ہو جاؤ ورنہ تم جانو اور تمہارا کام۔ خدا اور اس کے اولیا تمہارے عمل کے محتاج نہیں ہیں، بلکہ (سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ اگر تم نے (نماز کو) اہمیت نہ دی تو کہیں اس کا نتیجہ ”ترک نماز“ کی صورت میں ظاہر نہ ہو اور ترک نماز کے بعد انکار تک کی نوبت نہ پہنچ جائے۔ (اگر ایسا ہو گیا تو) تمہارا کام تمام ہوا اور شقاوت ابدی و ہلاکت دائمی تم کو نصیب ہوگی۔

اور وقت کی فراغت سے زیادہ اہمیت فراغت قلب کی ہے بلکہ فراغت وقت درحقیقت اس فراغت کی تمہید ہے اور وہ اس طرح کہ انسان عبادت میں مصروفیت کے وقت اپنے کو تمام دیگر مصروفیات اور دنیاوی رنج و غم سے خالی کر لیتا ہے اور قلب کی توجہ دوسرے امور و پراگندہ خیالات سے ہٹ جاتی اور دل عبادت و مناجات کیلئے بالکل خالی ہو کر خدا کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جاتا ہے اور جب تک قلب فارغ نہ ہو اس وقت تک نہ خدا کی طرف نہ اس کی عبادت کی طرف متوجہ ہو پاتا۔ لیکن ہماری بدبختی یہ ہے کہ ہمارے تمام پراگندہ و مختلف خیالات سب عبادت ہی کے وقت کیلئے ذخیرہ ہوتے ہیں کہ ادھر نماز شروع کی اور ادھر سارے خیالات و بھولی بسری باتوں کی یلغار ہو جاتی ہے۔ تکبیرۃ الاحرام کہتے ہیں گویا دوکان کا دروازہ یا حساب کا دفتر کھل جاتا ہے یا گویا مطالعہ کیلئے کتاب کھل جاتی ہے۔ دل تو دوسرے امور میں لگ جاتا اور عمل سے بالکل غافل ہو جاتا ہے اور اس وقت ہوش آتا ہے جب حسب عادت سلام پھیرتے ہیں۔ یہ عبادت رسوا کن ہے اور یہ مناجات شرم انگیز ہے۔

حق تعالٰی کے ساتھ راز و نیاز کے معاملے کو کسی حقیر بندے سے گفتگو کے مترادف سمجھو، جب آپ کسی دوست کے ساتھ بلکہ اس سے بھی آسان کسی اجنبی شخص کے ساتھ محو گفتگو ہوتے ہیں، جب تک اس کے ساتھ مصروف ہیں، دوسروں سے غافل رہ کر پوری تندہی سے اس کے ساتھ مشغول رہتے ہیں، لیکن جب ولی نعمت اور پروردگار عالم سے گفتگو اور مناجات کرتے ہیں تو اس سے بالکل غافل ہو کر دوسرے امور کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں! کیا بندوں کی عزت خدا سے زیادہ ہے یا بندوں سے گفتگو کی قیمت قاضی الحاجات کی مناجات سے زیادہ ہے؟ جی ہاں! ہم اور آپ کو نہیں معلوم کہ خدا سے مناجات کیا چیز ہے؟ ہم خدائی فرائض کو سر کا بوجھ سمجھتے ہیں اور (اس کی وجہ یہ ہے کہ) جس چیز کو آدمی پر لادا جائے اور وہ زندگی کا بوجھ بن

جائے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، اس لئے اصل بنیاد کی اصلاح کرنی چاہئے۔ خدا پر ایمان اور انبیاءؑ کے احکام کی پابندی کرنی چاہئے تاکہ اصلاح کارہو سکے۔ یہ ساری بدبختی ضعف ایمان اور سستی یقین سے پیدا ہوتی ہیں۔ سید ابن طاؤس ؒ کا ایمان ان کو ایسی جگہ پہنچا دیتا ہے کہ وہ اول بلوغ کو عید قرار دیتے تھے۔ اس لئے کہ خداوند عالم نے ان کو مناجات کرنے کی اجازت دے دی اور شرعی ذمہ داری نبھانے کے قابل بنا دیا تھا۔ واقعاً ذرا آپ سوچئے کہ کونسا قلب ہے کہ اتنی نورانیت اور صفائے باطنی رکھتا ہے۔ اگر ان سید جلیل القدر کا عمل آپ کیلئے حجت نہیں ہے تو سید الموحدینؑ اور ان کی اولاد معصومینؑ کا عمل تو حجت ہے۔ ان بزرگوں کے حالات اور عبادتوں کی کیفیت اور مناجات کو دیکھو۔ بعض حضرت ایسے تھے کہ نماز کے وقت ان کا رنگ زرد ہو جاتا اور اس خوف سے کہ کہیں امر الٰہی کے بارے میں کوئی لغزش نہ ہو جائے ان کا جسم کپکپانے لگتا تھا۔ حالانکہ یہ حضرات معصومؑ تھے۔ مولائے کائنات حضرت علیؑ کے بارے میں مشہور ہے کہ پائے مبارک میں تیر چبھ گیا تھا جس کے نکالنے کی تکلیف کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن نماز میں اس تیر کو نکال لیا گیا کہ حضرتؑ اس کی طرف متوجہ بھی نہ ہو سکے۔ ہے

عزیزم! یہ بات ناممکنات میں سے نہیں ہے۔ اس طرح کی مثال تو عام لوگوں میں بھی مل جاتی ہے (مثلاً) شدید غصہ اور محبت میں انسان ہر چیز سے غافل ہو جاتا ہے۔ میرے ایک معتمد دوست نے بتایا صفہان میں کچھ بدمعاش لوگوں سے میرا جھگڑا ہو گیا مار پیٹ کے دوران میں نے دیکھا یک آدمی مجھے گھونسے مار رہا ہے میں متوجہ نہ ہوا کہ کیا ہے؟ جب جھگڑا ختم ہو گیا اور میں اپنے آپ میں آیا تو پتہ چلا کہ چاقو سے کئی زخم ان لوگوں نے مجھے لگائے تھے جس کی بناء پر میں کئی دن بستر بیماری پر پڑا رہا اور اس کی وجہ بھی معلوم ہے کہ جب نفس کسی بات کی طرف مکمل طور پر متوجہ ہو جاتا ہے تو ملک بدن سے بالکل غافل ہو جاتا ہے اور اس کے احساسات بالکل ختم ہو جاتے ہیں، اس کی نظر میں صرف ایک ہی بات رہتی ہے۔ ہم خود بھی (علمی) بحث ومباحثے میں، نعوذ باللہ منہ، دیکھتے ہیں کہ محفل میں کچھ بھی ہو جائے ہم بالکل اس سے غافل ہوتے ہیں (بعد میں پتہ چلتا ہے)، مگر افسوس ہم ہر چیز کی طرف پوری توجہ رکھتے ہیں سوائے خدا کی عبادت کے! اسی لئے ہم کو یہ بات بعید معلوم ہوتی ہے کہ حضرت علیؑ کو پتہ ہی نہیں چلا اور ان کے پیر سے تیر نکال لیا گیا۔

بہرحال غیر حق سے قلب کا فارغ ہونا بہت ضروری ہے، اسی لئے انسان کو چاہئے ہر قیمت پر اس حالت تک رسائی حاصل کرے اور یہ حالت پیدا کرنا آسان اور ممکن ہے، تھوڑی سی مشق کے بعد اس کو

حاصل کی جا سکتا۔ کچھ مدت تک انسان کو چاہیے حائز خیال کو اپنے قبضے میں رکھے اس کو اس شاخ سے اس شاخ پر جانے نہ دے۔ (ایسا کرنے سے) تھوڑی مدت کے بعد رام ہو جائے گا اور (پھر انسان کو بھی) آرام ہو جائے گا اور دوسرے امور کی طرف سے اس کی توجہ ہٹ جائے گی اور خیر اس کی عادت بن جائے گی ﴿الخیرُ عادةٌ﴾ اور پھر وہ فارغ القلب ہو کر خدا اور اس کی عبادت کی طرف متوجہ ہو جائے گا۔

ان سب سے اہم جس کو دیگر امور کی تمہید سمجھنا چاہیے وہ حضور قلب ہے کہ یہی روح عبادت ہے اور حقیقت اسی سے وابستہ ہے، اس کے بغیر عبادت کی نہ کوئی قیمت ہے اور نہ وہ مقبول بارگاہ ہو سکتی ہے۔

چنانچہ روایات میں بھی آیا ہے كالكافي باسناده عن ابي جعفرٍ وابي عبدالله، عليهما السّلام، أنّهما قالا ﴿انّما لك من صلاتك ما اقبلتَ عليه منها، فان اوهمها كلّها او غفل عن آدابها، لُفّت فضُرب بها وجهُ صاحبها﴾ ۵ ''کافی میں حضرت امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے (فضیل بن یسار سے) فرمایا تمہاری نماز تمہارے لئے بس اسی قدر (مفید) ہے جتنے حصے میں تم کو توجہ قلب حاصل رہی ہو۔ اگر تم نے پوری نماز غلط طریقے سے پڑھی یا اس کے آداب سے غافل رہے تو اس کو لپیٹ کر پڑھنے والے کے منہ پر ماردی جائے گی''۔

وروى الشّيخ الأقدمُ محمّدُ بنُ الحسن رضوان الله عليه، في التّهذيب، بسنده عن الثّمالي قال ﴿رأيتُ عليّ بن الحسين، عليهما السّلام، يصلّي، فسقط رداؤهُ عن منكبه فلم يسوّه حتّى فرغ من صلاته قال فسألتُهُ عن ذلك، فقال ويحك، أتدري بين يدي من كنتُ؟ إنّ العبد لا يُقبلُ منه صلاةٌ إلّا ما أقبل منها فقلتُ جُعلتُ فداك! هلكنا قال كلّا انّ الله مُتمّمُ ذلك للمؤمنين بالنّوافل﴾ ۱۰

''ابو حمزہ ثمالی کہتے ہیں میں نے امام سجادؑ کو دیکھا کہ نماز پڑھتے ہوئے آپؑ کی عبا کندھے سے گر گئی اور حضرتؑ نے آخر نماز تک اس کو سیدھا نہیں کیا۔ نماز کے بعد میں نے حضرتؑ سے اس بارے میں پوچھا تو فرمایا تیرے اوپر وائے ہو! کیا تو (نہیں) جانتا میں کس کے سامنے تھا؟ (سنو) بندے کی صرف وہی نماز قبول ہوتی ہے جو توجہ قلب کے ساتھ ہو۔ میں نے عرض کیا میں آپ پر قربان جاؤں! تب تو ہم لوگ ہلاک ہو گئے! حضرتؑ نے فرمایا نہیں (بلکہ) خدا مؤمنوں کیلئے اس کی تکمیل نافلہ (نمازوں) سے کر دیتا ہے''۔

وعن الخصال باسناده عن عليٍّ عليه السلام في حديث الأربعمائة، قال: ﴿لا يقومنّ احدُكُم في

الصَّلاة مُتكاسلاً ولا ناعساً ولا تفكرنّ في نفسه، فانّه بين يدي ربّه عزّ وجلّ، وانّما للعبد من صلاته ما اقبل عليه منها بقلبه﴾[1] "حدیث اربعمائۃ میں حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا تم میں سے ہرگز کوئی شخص سستی اور اونگھ میں نماز کیلئے نہ کھڑا ہو اور نہ اپنے بارے میں سوچے اس لئے کہ وہ خدا کے سامنے ہے اور خدا بندے کی وہی نماز قبول کرتا ہے جو خلوص دل سے ہو"۔

اس طرح کی روایات بہت ہیں، اسی طرح قلبی توجہ کیلئے بھی بہت سی روایت ہیں۔ میں یہاں ان میں سے بعض کو نقل کرتا ہوں اور اسی پر اکتفا کروں گا کیونکہ اہل اعتبار کیلئے یہی کافی ہے۔

عن محمّد بن عليّ بن الحسين، صدوق الطّائفة، باسناده عن عبدالله بن ابي يعفور، قال، قال ابو عبدالله علیہ السلام ﴿يا عبد الله اذا صلّيت فصلّ صلاة مودّع يخاف ان لا يعود اليها ابداً، ثمّ اصرف ببصرك الى موضع سجودك، فلو تعلم من عن يمينك وشمالك، لاحسنت صلاتك، واعلم انّك بين يدي من يراك ولا تراه﴾[2] "امام جعفر صادقؑ نے عبداللہ بن ابی یعفور سے فرمایا اے عبداللہ! جب تم نماز پڑھو تو اس طرح پڑھو کہ گویا یہ آخری اور الوداعی نماز ہے اور اس بات کا خطرہ ہے کہ اب دوبارہ پڑھنے کی نوبت بالکل نہ آئے گی، اس کے بعد اپنی نظروں کو سجدہ گاہ پر جما دو اگر تم کو یہ معلوم ہوتا کہ تمہارے دائیں اور بائیں کون ہے تو نماز کو بہت اچھی طرح بجا لاتا۔ یہ سمجھو کہ تم اس خدا کے سامنے ہو جو تم کو دیکھ رہا ہے مگر تم اس کو نہیں دیکھ سکتے"

وباسناده عن أبي عبد الله علیہ السلام في حديث انّه قال ﴿لاحبّ للرّجل المؤمن منكم اذا قام في صلاة فريضة ان يقبل بقلبه الى الله ولا يشغل قلبه بامر الدّنيا، فليس من عبد يقبل بقلبه في صلاته الى الله تعالى الّا اقبل الله اليه بوجهه واقبل بقلوب المؤمنين اليه بالمحبّة بعد حبّ الله ايّاه﴾[3] "امام جعفر صادقؑ نے فرمایا میں تم میں سے اس مرد مؤمن کو دوست رکھتا ہوں جب وہ نماز واجب کیلئے کھڑا ہوتا ہے تو توجہ قلب کے ساتھ خدا کی طرف متوجہ ہوتا اور اپنے دل کو کار دنیا کی طرف متوجہ نہیں کرتا، جو بندہ نماز میں دل سے خدا کی طرف متوجہ ہوگا خدا بھی اس کی طرف توجہ کرے گا اور اپنی دوستی کے ساتھ قلوب مومنین کو بھی محبت سے اس کی طرف متوجہ کرائے گا"۔

اب دیکھو یہ کتنی بڑی خوشخبری ہے جو امام جعفر صادقؑ مؤمنین کو دے رہے ہیں۔ (مگر) افسوس کہ ہم سب بیچارے لوگ معرفت سے محجوب اور خدا کی دوستی سے بے بہرہ ہیں۔ خداوند عالم کی دوستی کی ہم کو خبر بھی

نہیں ہے۔ ہم خدا سے محبت کا قیاس بندوں کی دوستی پر کرتے ہیں۔ اہل معرفت کا بیان ہے خدا اپنے محبوب کیلئے رفع حجاب کر دیتا ہے۔ خدا جانتا ہے کہ اس رفع حجاب میں کتنی کرامتیں ہیں۔ اولیا کا سب سے بڑا مقصد اور سب سے اہم امید یہی رفع حجاب ہے۔ حضرت علیؑ اور ان کی معصوم اولادؑ مناجات شعبانیہ میں فرماتے ہیں:

﴿الٰهي هَبْ لي كَمالَ الانْقِطاعِ اِلَيْكَ، وَاَنِرْ اَبْصارَ قُلُوبِنا بِضِياءِ نَظَرِها اِلَيْكَ حَتّى تَخْرِقَ اَبْصارُ الْقُلُوبِ حُجُبَ النُّورِ فَتَصِلَ اِلى مَعْدِنِ الْعَظَمَةِ، وَتَصِيرَ اَرْواحُنا مُعَلَّقَةً بِعِزِّ قُدْسِكَ﴾ [۱۴] ''پروردگارا! ہم کو (دنیا سے مکمل جدائی اور) صرف اپنی طرف متوجہ ہونے کی توفیق عطا فرما ور ہمارے دل کی آنکھوں کو اپنے دیدار کی روشنی سے منور فرما جس سے دل کی آنکھیں حجاب ہائے نور کو چاک کر کے سرچشمۂ عظمت تک پہنچ جائیں اور ہماری روحیں تیری عزت و تقدس پر جم جائیں''۔

میرے معبود یہ کون سی بصیرت قلوب کی نورانیت ہے جس کی خواہش تجھ سے اولیا کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس نورانیت کے ذریعے وہ تجھ سے ملاقات کریں؟ بارالٰہا! یہ حجاب ہائے نور کیا ہیں جو ہمارے ائمۂ معصومینؑ کی زبانوں پر مشداول ہیں؟ یہ معدن عظمت و جلال اور عزت قدس و کمال کیا چیز ہے جو ان حضرات کا منتہائے مقصد ہے؟ ہم تو اس کے سمجھنے سے بھی آخر تک محروم ہیں، اس کے ذوق و شہود کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا۔ پروردگارا! ہم تو تیرے روسیاہ اور سیہ روزگار بندے ہیں، ہم کھانے پینے، سونے اور بغض و شہوت کے علاوہ نہ کچھ جانتے ہیں نہ جاننے کی فکر میں ہیں۔ (اس لئے) تو ہی ہم پر نظر لطف فرما اور ہم کو اس سے بیدار اور اس مستی سے چھڑا دے۔

بہر حال اہلیت رکھنے والوں کیلئے یہی ایک حدیث کافی ہے جس کی بنا پر انسان کو چاہئے کہ محبت الٰہی حاصل کرنے اور خدا کے دیدار کیلئے اپنی پوری عمر صرف کر دے۔ لیکن ہم جیسے لوگ جو اس شعبے سے تعلق نہیں رکھتے ورنہ اس میدان کے اہل ہیں وہ دوسری حدیثوں سے تمسک کرتے ہیں۔

عَنْ ثَوابِ الاَعْمالِ بِاِسْنادِهِ عَمَّنْ سَمِعَ اَبا عَبْدِ اللهِ علیہ السلام يَقُولُ ﴿مَنْ صَلّى رَكْعَتَيْنِ يَعْلَمُ ما يَقُولُ فِيهِما، انْصَرَفَ وَلَيْسَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ اللهِ ذَنْبٌ اِلّا غَفَرَ لَهُ﴾ [۱۵] ''راوی کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر صادقؑ کو یہ فرماتے ہوئے سنا جو شخص ایسی دو رکعت نماز پڑھے جس میں اس کو معلوم ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے جب نماز ختم کرے گا تو اس کے اور خدا کے درمیان جو بھی گناہ ہوں گے وہ بخش دیئے جائیں گے''۔

وعن رسول الله صلى الله عليه وآله، أنه قال «ركعتان خفيفتان في تفكر خير من قيام ليلة» [1]

''حضرت رسول اکرمؐ نے فرمایا غور و فکر کے ساتھ دو مختصر رکعتیں ایک رات کی عبادت سے بہتر ہیں''۔

دوسری فصل

جب یہ معلوم ہو گیا کہ عبادتوں کا قلب و روح حضور قلب ہے، اور عبادتوں کی نورانیت اور ان کا کمال حضور قلب اور اس کے درجات سے وابستہ ہے یہ بھی جان لیجئے کہ حضور قلب کے مراتب ہیں بعض مرتبے تو صرف اولیائے حق کیلئے مخصوص ہیں اور دوسرے اس بلندی تک پہنچ ہی نہیں سکتے۔ البتہ بعض مرتبے رعیت کیلئے بھی ممکن الحصول ہیں، اور یہ بھی جان لیجئے کہ حضور قلب مجموعی طور پر دو قسم کا ہوتا ہے عبادتوں میں حضور قلب اور معبود کے سامنے حضور قلب۔

اصل مطلب کو بیان کرنے سے پہلے ایک تمہید کا ذکر ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ اہل معرفت فرماتے ہیں سب عبادات مطلقاً حمد و ثنا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ان میں سے ہر ایک کے ذریعے خدا کی کسی نعمت پر یا اس کے کسی اسم پر اس کی ثنا کرنا ہے۔ صرف نماز ثنائے حق ہے اپنے تمام اسماء وصفات کے ساتھ۔ بعض احادیث کی شرح سے ابھی پہلے یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ ثنائے معبود فطری ہے جس پر تمام بشر کی تخلیق ہوئی ہے اور فطرت حکم دیتی ہے کہ یہ لازمی ہے اور یہ کامل مطلق، جمیل مطلق، منعم مطلق اور عظیم مطلق کے سامنے عجز وانکساری سے عبادت ہے۔

اور چونکہ ذات مقدس کی کیفیت ثنا کو کوئی نہیں سمجھ سکتا اس لئے کہ کیفیت ثنا ذات وصفات کی معرفت اور شہود کے ساتھ غیب اور غیب کے شہود سے رابطے کی کیفیت پر موقوف ہے جو وحی و الہام کے بغیر کسی کیلئے ممکن نہیں ہے۔ لہذا عبادات مطلقاً بیان شارع پر اور جانب خدا سے بیان پر موقوف ہیں کسی کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ اپنی طرف سے تخریج کر دے یا عبادت ایجاد کر دے۔ بزرگوں اور بادشاہوں کے یہاں جو تواضع اور احترام موسوم ہے، خداوند عالم کی بارگاہ میں اس قسم کے احترام کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اس لئے ہر شخص کو چاہئے کہ آنکھوں اور کانوں کو کھول کر وحی و رسالت کے ذریعے جو کیفیت عبادت و عبودیت کا طریقہ بیان کیا گیا ہے اس پر عمل کرے۔ اپنی طرف سے کوئی تصرف نہ کرے۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ باب عبادات کا مطلب سب ثنا خوانی معبود ہے تو یہ بھی جان لیجئے کہ حضور قلب

کی جیسے کہ پہلے اشارہ کیا گیا، وہ بہترین تقسیم ہے. عبادت میں حضور قلب اور معبود کے سامنے حضور قلب۔

عبادت میں حضور قلب کے بھی بہت سے مرتبے ہیں مگر ان میں اہم دو مرتبے ہیں: عبادت میں اجمالاً قلبی توجہ اور عبادت میں حضور قلب تفصیل کے ساتھ۔

عبادت میں اجمالاً قلبی توجہ کا مطلب یہ ہے کہ عبادت کرتے وقت، چاہے جو بھی عبادت ہو، خواہ باب طہارت سے ہو مثلاً وضو وغسل یا باب نماز وروزہ وحج اور دیگر امور ہوں سب ہی میں، انسان کو اجمالی طور سے اس بات کی طرف متوجہ رہنا چاہئے کہ وہ معبود کی ثنا کر رہا ہے، چاہے اس کو معلوم نہ ہو کہ کون سی ثنا کر رہا ہے اور خدا کے کس اسم کی تلاوت کر رہا ہے۔ ہمارے شیخ عارف کامل ؒ! اس قسم کی عبادت کیلئے مثال دیا کرتے تھے کہ جیسے کوئی شخص کسی کی مدح میں قصیدہ کہہ کر کسی ایسے بچہ کے حوالے کر دے جو اس کا مطلب نہ جانتا ہو بس اس کو یہ معلوم ہو کہ یہ قصیدہ اس شخص کی مدح میں ہے اور وہ بچہ ممدوح کے سامنے اس کو پڑھے تو وہ اجمالاً یہ جانتا ہے کہ ممدوح کی مدح کر رہا ہے، مگر اس کی کیفیت سے ناواقف ہے۔ اسی طرح ہم لوگ بھی خدا کی ثنا کرنے والے وہ بچے ہیں جن کو معلوم ہی نہیں ہے کہ ان عبادتوں کے کیا اسرار ہیں اور احوال الہیہ میں سے کون سی حالت کس اسم سے متعلق ہے اور کس کیفیت کے ساتھ حق کی ثنا ہے۔ بس ہر شخص کو تنی توجہ ہونی چاہئے کہ یہ کامل مطلق اور ممدوح ومعبود مطلق کی ثنا ہے کہ خود ذات مقدس نے اس طرح اپنی ثنا کی ہے، اور ہم کو حکم دیا ہے کہ اس طرح اس کی ثنا کیا کریں۔

عبادت میں حضور قلب تفصیل کے ساتھ اس کا مکمل مرتبہ حاصل کرنا خالص اولیائے کرام واہل معارف کے علاوہ کسی دوسرے کیلئے ممکن نہیں ہے۔ البتہ بعض پست مراتب دوسروں کیلئے بھی ممکن الحصول ہے اور اس کا پہلا مرتبہ نماز ودعا میں الفاظ کے معانی کی طرف توجہ کرنا ہے، ثواب الاعمال کی نقل کردہ ۱۹ سابقہ روایت میں اسی مرتبہ کی طرف اشارہ ہے۔ دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ (انسان) اسرار عبادات کو حتی المقدور سمجھے اور ثنائے معبود کی کیفیت کو ہر حالت میں جان لے۔ اہل معرفت نے ایک حد تک اسرار نماز اور تمام عبادات کو بیان کر دیا ہے اور روایات معصومین علیہم السلام کے اشاروں سے اس کا بقدر امکان استفادہ کیا ہے گرچہ اصل حقیقت کا سمجھنا بہت ہی کم لوگوں کیلئے ممکن ہوا ہے۔ بہر حال جتنا بھی ذکر ہوا ہے اس کی اہمیت رکھنے والوں کیلئے غنیمت ہے۔

رہا معبود کے بارے میں قلبی توجہ کی بات تو اس کے بھی کئی مرتبے ہیں جن میں سے تین مرتبے زیادہ

اہمیت کے حامل ہیں۔

تجلیات افعالی میں حضور قلب، تجلیات اسمائی وصفاتی میں حضور قلب اور تجلیات ذاتی میں حضور قلب اور مجموعی طور پر ان میں سے ہر ایک کے چار مرتبے ہیں:

۱۔ مرتبۂ علمی، ۲۔ مرتبۂ ایمانی، ۳۔ مرتبۂ شہودی، ۴۔ مرتبۂ فنائی۔

تجلیات فعلیہ میں علماً حضور قلب کا مطلب یہ ہے کہ سالک وعابد شخص علمی بنیادوں پر اور دلائل کے ذریعے اس بات کو سمجھ لے کہ تمام مراتب وجود اور غیب وشہود کے مظاہر ذات قدس الٰہی سے تجلی فیض سے پرتو ہیں اور عالم طبیعت کے آخری درجے سے سرچشمہ ملکوت اعلیٰ وجبروت اعظم تک سب ہی کسی نہ کسی طرح اس کی درگاہ مقدس میں حاضر ہیں اور سب ہی جلوۂ مشیت کے پرتو ہیں، جیسا کہ کافی کی حدیث شریف میں ہے ﴿عن ابي عبد الله علیہ السلام خلق الله المشيئة بنفسها، ثم خلق الاشياء بالمشيئة﴾[20] "خداوند عالم نے مشیت کو بذات پیدا کیا اور تمام اشیا کو مشیت کے ذریعے پیدا کیا"۔ میں ابھی اس مطلب پر برہان قائم کرنا نہیں چاہتا۔ پس عابد شخص اگر اس مطلب کو علمی بنیادوں پر دلائل کے ذریعے سمجھ لے تو اس کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ خود اور عبادت وعلم وارادہ، دل اور دل کی دھڑکنیں، ظاہر وباطن سب ہی خدا کی بارگاہ میں حاضر ہیں، بلکہ سب عین حضور ہیں اور اگر اس برہانی مطلب کو قلم عقل سے لوح قلب پر لکھ لیا جائے اور قلب اپنے علمی وعملی ریاضتوں کے ساتھ اس یقینی وبرہانی مسئلے پر ایمان لائے تو اس وقت ایمان کی بنیادوں پر تجلی میں قلبی توجہ پیدا ہوگی اور پھر قلب کے تقوائے کامل، مجاہدات وریاضات اور اس ایمان کے کامل ہونے کے بعد ہدایت الٰہی اس کے شامل حال ہو جائے گی اور تجلیات فعلی کے ذریعہ اس کے دل کو مشاہدات والشہود کا نتیجہ حاصل ہوگا اور یہ اس وقت تک رہے گا جب تک قلب مکمل طور پر تجلیات کا آئینہ بن جائے اور سالک کو فنا نتیجہ حاصل ہو جائے اور یہی حضور کا آخری مرتبہ ہے جو تجلیات افعالیہ میں فنائے حاضر کی انتہا ہے اور بہت سے اہل سلوک اسی فنا میں ہمیشہ تک باقی رہیں گے اور اپنے آپ میں نہیں آئیں گے۔

اور اگر ازل میں پرتو فیض اقدس سے قلب سالک کی صلاحیت اس سے زیادہ ہو تو فنا کے بعد وہ اپنے آپ میں آ کر اور مانوس ہوتا اور اپنی مملکت کی طرف واپس آ جاتا ہے اور تجلیات اسمائیہ کا مرکز بن جاتا ہے اور وہ انہیں مراتب کو طے کر کے فنائے صفاتی حاصل کر لیتا اور اپنے عین ثابت کی مناسبت سے کسی بھی اسم الٰہی میں فانی ہو جاتا ہے اور بہت سے اہل سلوک اسی فنائے اسمائی میں باقی رہ جاتے اور ہوش میں نہیں آتے

ہیں، ہوسکتا ہے کہ ﴿إنَّ أوليائي تحت قبائي لا يعرفهم غيري﴾ ۲۱ ''اولیا میری قبا کے نیچے ہیں، ان کو میرے سوا کوئی نہیں پہچانتا'' سے ان اولیا کی طرف اشارہ ہو۔

اور اگر تجلی فیض اقدس سے سالک کی استعداد اس انداز سے زیادہ ہو تو وہ اس فنا کے بعد بھی انس حاصل کر لیتا ہے، ور وہ اپنے آپ میں آجاتا اور تجلیات ذاتیہ کا مورد بن جاتا ہے اور آخری مرتبہ فنائے ذاتی اور فنائے کلی پر اس کی سیر تمام ہو جاتی اور اس کو فنائے تام حاصل ہو جاتی ہے۔ ﴿ومن يخرج من بيته مهاجرا الى الله ورسوله ثم يدركه الموت فقد وقع اجره على الله﴾ ۲۲ ''جو شخص اپنے گھر سے خدا ورسول کی طرف ہجرت کرنے کیلئے نکلے اور (راستے میں) اس کو موت آجائے تو اس کا اجر خدا کیلئے لازم ہے''۔ بعض علما فرماتے ہیں اس سے انہی اولیا اللہ اور سالکین الی اللہ کی طرف اشارہ ہے اور اس سالک کا اجر خدا کے علاوہ کوئی نہیں دے سکتا۔

اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس مقام پر پہنچ کر سالک کو بھی افاقہ ہو جاتا ہے تو وہ اپنی استعداد اور اپنی عین ثابت کے احاطے کی مناسبت سے ہدایت خلق کیلئے کھڑا ہو جاتا ہے ﴿يا أيها المدثر قم فأنذر﴾ ۲۳ ''اے کپڑا اوڑھنے والے اٹھ کر لوگوں کو ڈراؤ'' اور اگر (کہیں) سالک کا عین ثابت اسم اعظم کے تابع ہو گیا تو اسی پر دائرہ نبوت کو ختم کر دیا جاتا ہے جیسے کہ حضرت رسول اکرم ؐ پر خاتمہ ہو گیا اور اولین و آخرین میں سے کسی بھی مرسل کا عین ثابت اسم اعظم کے تابع نہیں تھا اور نہ ظہور ذات تمام شئون کیلئے تھا، (مگر رسول اکرم ؐ کے یہاں تھی)۔ اسی لئے آپ ؐ کی ذات نے تمام شئون کیلئے ظہور پیدا کیا اور غایت ظہور ہدایت کرنے سے ہوا اور کشف کلی ہو گیا اور آپ ؐ کی ذات پر نبوت کا خاتمہ ہو گیا اور اگر بالفرض اس ذات مقدس کی اتباع اور اس کی ہدایت کے سبب کوئی ولی اس مقام تک پہنچ جائے تو اس کا کشف بھی بعینہ یہی ہوگا اور تشریع میں شریک نہیں ہوگی۔ لہذا دائرہ نبوت آپ ؐ کے وجود پر ختم ہو گیا اور آنحضرت ؐ نے اس دائرے میں آخری اینٹ رکھ دی ۲۴ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔

یہ بھی جاننے کی بات ہے جو لوگ ان مذکورہ مقامات کے مالک ہیں ان کی عبادات اور ان میں سے ہر ایک کی معنوی کیفیت مختلف اور بہت ہی متفاوت ہیں۔ مناجات خدا سے ہر ایک کیلئے جو لطف اور حصہ ملتا ہے دوسرے شخص کیلئے جو اس مرتبے پر نہیں پہنچا وہ حصہ اور لطف نہیں ہے اور امام جعفر صادق ؑ کیلئے عبادت میں جو بات حاصل ہوئی ہے وہ دوسرے کیلئے ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ سید ابن طاوس ؒ کی کتاب فلاح

اسائل میں منقول ہے کہ:

﴿فَلَقَدْ رُوِيَ اَنَّ مَولَانَا جَعفَرَ بنَ مُحَمَّدٍ الصَّادِقَ علیہ السلام كَانَ يَتلُو القُرآنَ فِي صَلَاتِهِ، فَغُشِيَ عَلَيهِ فَلَمَّا اَفَاقَ سُئِلَ مَا الَّذِي اَوجَبَ مَا انتَهَت حَالُكَ اِلَيهِ؟ فَقَالَ مَا مَعنَاهُ: مَا زِلتُ اُكَرِّرُ آيَاتِ القُرآنِ حَتَّى بَلَغتُ اِلَى حَالٍ كَاَنَّنِي سَمِعتُهَا مُشَافَهَةً مِمَّن اَنزَلَهَا عَلَى المُكَاشَفَةِ وَالعِيَانِ، فَلَم تَقُمِ القُوَّةُ البَشَرِيَّةُ بِمُكَاشَفَةِ الجَلَالَةِ الاِلٰهِيَّةِ﴾ [۲۵] ”روایت کی گئی ہے کہ امام جعفر صادقؑ نماز میں تلاوت قرآن فرمارہے تھے کہ آپؑ کو غش آ گیا۔ جب ہوش میں آئے تو پوچھا گیا کیا بات تھی جس سے آپ کی یہ حالت ہوگئی تھی؟ حضرتؑ نے جو جواب دیا اس کا ماحصل یہ ہے: میں آیات قرآن کی تکرار کر رہا تھا کہ اتنے میں میری حالت یہ ہوگئی کہ گویا میں نے بالمشافہ واعیان اس کو اس ذات سے سنا جس نے ان کو نازل کیا تھا۔ پھر مکاشفۂ جلالیہ کو بشری طاقت نہ برداشت کرسکی اور میری یہ حالت ہوگئی جو تم نے دیکھی“۔

اور جو حالت رسول اکرمؐ پر طاری ہوتی تھی وہ تو کسی بھی مخلوق کو نہیں حاصل ہوسکی۔ چنانچہ حدیث میں ہے: ﴿لِي مَعَ اللهِ حَالٌ لَا يَسَعُهُ مَلَكٌ مُقَرَّبٌ وَلَا نَبِيٌّ مُرسَلٌ﴾ [۲۶] ”خدا کے ساتھ میرا حال یہ ہے جس کو نہ کوئی ملک مقرب برداشت کرتا ہے نہ نبی مرسل“۔ خیر چھوڑیے اس مطلب کو جس میں ہمارا کوئی حصہ ہی نہیں ہے سوائے لفظ کے۔ البتہ ہم جیسے لوگوں کیلئے جو بات اہم ہے وہ یہ ہے کہ ہم جن مقامات اولیا سے محروم ہیں ان کا انکار بھی نہ کریں، بلکہ ان کو تسلیم کرلیں، کیونکہ مراتب اولیا کا تسلیم کرنا بہت مفید ہے ورنہ نعوذ باللہ اس کا انکار بہت مضر ہے: ﴿اَللّٰهُمَّ اِنِّي مُسَلِّمٌ لِاَمرِهِم، صَلَوَاتُ اللهِ عَلَيهِم اَجمَعِينَ﴾ [۲۷] ”خدایا ہم ان کے امر کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان سب پر خدا کا درود ہو“۔

تیسری فصل

جب تک قلب کو عبادتوں کی اہمیت نہ سمجھائی جائے اس وقت تک عبادتوں میں حضور قلب نہیں حاصل ہوسکتا اور اہمیت کا سمجھنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک عبادتوں کے اسرار وحقائق نہ سمجھ میں آجائیں اور اسرار وحقائق کا سمجھنا اگرچہ ہمارے لئے ممکن نہیں ہے، لیکن ایک حد تک ہم جیسے لوگوں کیلئے جو مناسب ہے اور روایات اہل بیتؑ سے نتیجہ اخذ ہوتا ہے اور اہل معرفت کے اقوال سے مفہوم حاصل ہوتا ہے اس کتاب کی مناسبت سے میں یہاں ذکر کرتا ہوں۔

ہم نے پہلے بھی مکرر اشارہ کیا ہے کہ تمام اعمال حسنہ اور افعال عبادیہ کی ایک باطنی ملکوتی صورت ہوتی ہے اور قلب عابد میں اس کا ایک اثر ہوتا ہے۔ صورت باطنی تو وہی ہے جس سے عالم برزخ اور بہشت جسمانی کی آبادکاری ہوا کرتی ہے، کیونکہ زمین بہشت ایک چٹیل میدان ہے وہاں کوئی چیز نہیں ہے جیسا کہ روایت میں ہے[28] بہشت کی آبادکاری انہیں اعمال واذکار سے ہوتی ہے جیسا کہ حدیث میں بھی آیا ہے[29] قرآن مجید کی بہت سی آیات تجسم اعمال پر دلالت کرتی ہیں، مثلاً ﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ☆ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ﴾[30] "جس شخص نے ذرہ برابر نیکی کی ہے وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہے وہ اس کو دیکھ لے گا" اور اسی طرح ﴿وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا﴾[31] "اور جو کچھ ان لوگوں نے (دنیا میں) کیا تھا اس کو (لکھا ہوا) موجود پائیں گے" اور جو روایات تجسم اعمال اور ان کی غیبی ملکوتی صورتوں پر دلالت کرتی ہیں وہ متفرق ابواب میں بہت ہیں، میں صرف بعض کا ذکر کرتا ہوں

رَوَى الصَّدُوقُ، قُدِّسَ سِرُّهُ، بِإِسْنَادِهِ عَنْ أَبِي عَبْدِ اللهِ علیہ السلام قَالَ ﴿مَنْ صَلَّى الصَّلَوَاتِ الْمَفْرُوضَاتِ فِي أَوَّلِ وَقْتِهَا وَأَقَامَ حُدُودَهَا رَفَعَهَا الْمَلَكُ إِلَى السَّمَاءِ بَيْضَاءَ نَقِيَّةً، تَقُولُ حَفِظَكَ اللهُ كَمَا حَفِظْتَنِي، اسْتَوْدَعَنِي مَلَكٌ كَرِيمٌ وَمَنْ صَلَّاهَا بَعْدَ وَقْتِهَا مِنْ غَيْرِ عِلَّةٍ وَلَمْ يُقِمْ حُدُودَهَا، رَفَعَهَا الْمَلَكُ سَوْدَاءَ مُظْلِمَةً، وَهِيَ تَهْتِفُ بِهِ ضَيَّعْتَنِي ضَيَّعَكَ اللهُ كَمَا ضَيَّعْتَنِي، وَلَا رَعَاكَ اللهُ كَمَا لَمْ تَرْعَنِي﴾[32] "امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں جو شخص واجب نمازوں کو ان کے اول وقت میں پڑھے گا اور ان کے حدود کو قائم کرے گا (پورے اجزا و شرائط کے ساتھ نماز بجالائے گا) تو فرشتہ اس کو آسمان کی طرف لے جائے گا اس حالت میں کہ وہ سفید و پاکیزہ ہوگی (اور) وہ نماز کہے گی جس طرح تو نے میری حفاظت کی خدا تیری حفاظت کرے۔ ایک نیک فرشتے نے مجھے بطور امانت رکھ لیا اور جو شخص ان واجب نمازوں کو کسی عذر کے بغیر اول وقت کے بعد پڑھے گا اور اس کے حدود کو قائم نہ رکھے گا تو فرشتہ اس کو لے جائے گا اس حالت میں کہ وہ تاریک و سیاہ ہوں گی اور چیخ (چیخ) کر کہہ رہی ہوگی تو نے مجھے برباد کیا، جس طرح تو نے مجھے برباد کیا خدا تجھے برباد کرے اور جس طرح تو نے میری رعایت نہ کی خدا تیری رعایت نہ کرے"۔

اس حدیث شریف سے جس طرح عمل کی ملکوتی صورت ثابت ہوتی ہے اسی طرح اس کی زندگی اور شعور زندگی بھی ثابت ہوتی ہے اور یہ بھی ایک قسم کا برہان ہے اور روایات کی دلالت اس پر ہے کہ تمام اشیا

ملکوتی زندگی کے حامل ہیں اور عالم ملکوت سرتاپا زندگی وعلم سے عبارت ہے ﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ﴾ ۳۳؎ "اور آخرت ہی ابدی زندگی ہے"۔

وفي الكافي باسناده عن ابي عبد الله عليه السلام في حديث طويل

﴿اِذَا بَعَثَ اللهُ الْمُؤْمِنَ مِنْ قَبْرِهِ، خَرَجَ مَعَهُ مِثَالٌ يَقْدُمُ اَمَامَهُ كُلَّمَا يَرَى الْمُؤْمِنُ هَوْلاً مِنْ اَهْوَالِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ قَالَ لَهُ الْمِثَالُ لَا تَفْزَعْ وَلَا تَحْزَنْ وَاَبْشِرْ بِالسُّرُورِ وَالْكَرَامَةِ مِنَ اللهِ عَزَّوَجَلَّ، حَتَّى يَقِفَ بَيْنَ يَدَيِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ فَيُحَاسِبُهُ حِسَاباً يَسِيراً وَيَأْمُرُ بِهِ اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمِثَالُ اَمَامَهُ فَيَقُولُ لَهُ الْمُؤْمِنُ يَرْحَمُكَ اللهُ نِعْمَ الْخَارِجُ خَرَجْتَ مَعِي مِنْ قَبْرِي وَمَا زِلْتَ تُبَشِّرُنِي بِالسُّرُورِ وَالْكَرَامَةِ مِنَ اللهِ حَتَّى رَأَيْتُ ذٰلِكَ فَيَقُولُ مَنْ اَنْتَ؟ فَيَقُولُ اَنَا السُّرُورُ الَّذِي كُنْتَ اَدْخَلْتَهُ عَلَى اَخِيكَ الْمُؤْمِنِ فِي الدُّنْيَا خَلَقَنِي اللهُ عَزَّوَجَلَّ مِنْهُ لِاُبَشِّرَكَ﴾ ۳۴؎

"کافی میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے ایک طویل حدیث میں فرمایا جب خدا مؤمن کو اس کی قبر سے اٹھائے گا تو اس کے ساتھ ایک مثال بھی نکلے گی جو اس کے آگے آگے چلے گی۔ مؤمن جب بھی قیامت کے کسی ہول کو دیکھے گا تو وہ مثال کہے گی ذرو نہیں اور غمگین نہ ہو خدا کی طرف سے سرور وکرامت کی بشارت ہو یہاں تک کہ وہ مؤمن خدا کے سامنے حساب کیلئے کھڑا ہوگا اور خدا اس سے معمولی سا حساب لے گا اور جنت میں جانے کا حکم دیدے گا اور وہ مثال اس کے آگے آگے رہے گی۔ پھر مؤمن اس مثال سے کہے گا خدا تجھ پر رحمت نازل کرے تو وہ بہترین چیز ہے جو میرے ساتھ نکلی تو میرے ساتھ قبر سے نکلی اور برابر خدا کی طرف سے مسرت وکرامت کی خوشخبری دیتی رہی یہاں تک کہ میں نے اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اب ذرا بتا تو کون ہے؟" تو وہ مثال کہے گی میں وہ سرور ہوں جو تو دنیا میں اپنے برادر مؤمن کے دل میں ڈالتا رہتا تھا۔ خداوند عالم نے مجھے اسی سے خلق کیا ہے تاکہ تجھے خوشخبری دوں"

اس حدیث شریف میں بھی آخرت میں اعمال کے تجسم وتمثل پر واضح دلالت موجود ہے اور شیخ اجل جناب شیخ بہائیؒ ۳۵؎ نے بھی اسی حدیث کے ذیل میں فرمایا ہے "بعض روایت تجسم اعتقادات پر بھی دلالت کرتی ہیں پس صحیح اعمال وعقائد خوش منظر اور نورانی صورت میں ظاہر ہوں گے اور اپنے عمل کرنے والوں کیلئے کمال سرور ومسرت کا سبب ہوں گے اور برے اعمال وباطل عقائد، بری اور قبیح وظلمانی صورت میں ظاہر ہوں گے جو اپنے انجام دینے والوں کیلئے باعث غم واندوہ اور تکلیف ہوں گے۔ چنانچہ مفسرین کی

ایک جماعت نے اس آیت کے ذیل میں ﴿یَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهُ أَمَدًا بَعِيدًا﴾ ۳۶؎ ''جس دن ہر شخص جو کچھ اس نے (دنیا میں) نیکی کی ہے اور جو کچھ برائی کی ہے اس کو موجود پائے گا (اور) آرزو کرے گا کہ کاش اس کی بدی اور اس کے درمیان میں زمانہ (دراز) حائل ہو جاتا'' اسی بات کو کہا ہے اور کہا ہے کہ یہ آیت ہم کو خدا کے اس قول کی طرف رہنمائی کرتی ہے ﴿يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ﴾ ۳۷؎ ''اس دن لوگ گروہ گروہ (اپنی قبروں سے) نکلیں گے تاکہ اپنے اعمال کو دیکھیں'' اور جو لوگ آیت میں جزا کو مقدر مانتے ہیں اور کہتے ہیں ﴿لِيُرَوْا جَزَاءَ أَعْمَالِهِمْ﴾ ہے اور ''یرہ'' کی ضمیر کو عمل کی طرف نہیں پلٹاتے وہ حق سے بہت دور جا پڑے ہیں''۔ ۳۸؎ (شیخ بہائی) اعلی اللہ مقامہ الشریف کے قول کا ترجمہ اس مقام پر ختم ہوا۔

اس مقام پر بعض جلیل القدر محدثین کا عجیب وغریب کلام ہے ۳۹؎ جس کا ذکر نہ کرنا بہتر ہے اور ان کے ذہن میں جو بات آئی ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ ان کو گمان ہے کہ تجسم اعمال کے عقیدے اور معاد جسمانی کے عقیدے میں تضاد ہے، حالانکہ یہ مطلب تضاد نہیں رکھتا، بلکہ اس پر تاکید ہے اور لفظ ''تمثل'' جو یہاں ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے ﴿فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا﴾ ۴۰؎ ''تو وہ اچھے خاصے آدمی کی صورت بن کر ان کے سامنے آ کھڑا ہوا'' میں آیا ہے یعنی حقیقتاً بصورت جسمانیت متمثل ہوا تھا نہ کہ صرف وہم وگمان اور خواب کی حالت میں فرشتے کی شکل میں ظاہر ہوا تھا اور یہ بات برہان قوی کے مطابق ہے جو اپنی جگہ مسلم ہے۔ محض ہماری عقل میں نہ آنے کی وجہ سے اور مذہب حکماوفلاسفہ کے مطابق ہونے کی وجہ سے اس کو ناپسند نہیں کیا جا سکتا۔ بہترین بات یہی ہے کہ پروردگار عالم اور معصومین کے حضور سر تسلیم کر لیا جائے۔

پس معلوم ہوا کہ جو عمل درگاہ خداوندی میں مقبول ہو جائے وہ اچھی صورت کا ہوتا ہے اور اپنی مناسبت سے حور وقصور اور جنات عالیات اور انہار جاریت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ کائنات کے اندر کوئی مخلوق بلا وجہ پیدا نہیں ہوتی، بلکہ اس میں ایک عقلی رابطہ ہوتا ہے بس اتنی بات ضرور ہے کہ کامل اولیا کے علاوہ کوئی اس کو کشف نہیں کر سکتا۔ لہٰذا یہ باتیں میزان عقل کے تحت ہیں اور برہان حکمی کے مطابق ہے۔

جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ آخرت کی زندگی اور لذت کا دارومدار اعمال سے وابستہ ہے اور اعمال کی صورت کمالیہ ہی اس عالم میں منتقل ہوا کرتی ہے اور عمال سے مراد وہ عبادتیں ہیں جن کے بارے میں کشف تام محمدی کے طفیل امت مسلمہ مطلع ہوگئی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حسن عمل اور کمال عمل، نیت واقبال قلب اور

پابندی حدود کے تابع ہے اور اگر کسی عمل میں یہ تمام صفات یا بعض نہ ہوں تو وہ عمل درجۂ اعتبار سے ساقط ہے، بلکہ اپنی بری و قبیح صورت کے ساتھ دوسرے عالم میں منتقل ہوگا جیسا کہ روایت اور کتب میں بھی یہی آیا ہے تو عالم غیب و اخبار انبیاء" و اولیاء اور اہل معرفت پر ایمان لانے والے ہر شخص اور حیات ابدی و زندگی جاوید کے خواہشمند افراد کیلئے ضروری ہے کہ ہر قیمت پر زحمت برداشت کر کے ریاضت کے ذریعے اپنے اعمال کی اصلاح کریں اور پھر جب ظاہری طور سے ان کی صورت قواعد اجتہادیہ یا رائے فقہا کے مطابق ہو تو پھر سیرت اور ان کے باطن کی اصلاح کیلئے کوشش کریں اور زحمت برداشت کر کے کم از کم واجبات کو حضور قلب کے ساتھ بجا لائیں اور نوافل کے ذریعے اس کے نقصان کا جبران کریں اس لئے کہ حدیث میں آیا ہے کہ نوافل فرائض کی کمی کو پورا کر دیتے ہیں اور فرائض کی قبولیت کا سبب بنتے ہیں۔

فِي الْعِلَلِ بِاِسْنَادِهِ عَنْ اَبِي جَعْفَرٍ عليه السلام قَالَ ﴿اِنَّمَا جُعِلَتِ النَّافِلَةُ لِيَتِمَّ بِهَا مَا يَفْسُدُ مِنَ الْفَرِيضَةِ﴾[۱] "علل میں امام محمد باقرؑ سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا نافلہ کو اس لئے (مستحب) قرار دیا گیا ہے تاکہ فریضہ کی کمی کو اس سے مکمل کر دیا جائے"۔

وَرَوَى الشَّيْخُ، قُدِّسَ سِرُّهُ، بِاِسْنَادِهِ عَنْ اَبِي بَصِيرٍ قَالَ، قَالَ اَبُو عَبْدِ اللّٰهِ عليه السلام ﴿يُرْفَعُ لِلرَّجُلِ مِنَ الصَّلَاةِ رُبْعُهَا اَوْ ثُمْنُهَا اَوْ نِصْفُهَا اَوْ اَكْثَرُ بِقَدَرِ مَا سَهَا، وَلٰكِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يُتِمُّ ذٰلِكَ بِالنَّوَافِلِ﴾[۲] "شیخؒ نے اپنی اسناد کے ذریعے ابو بصیر سے نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں امام جعفر صادقؑ نے فرمایا انسان کی نماز کا ۱/۳ یا ۱/۸ یا ۱/۲ حصہ یا جتنا سہو[۳] ہو ہے اس سے کچھ زیادہ بلند کیا جاتا ہے (یعنی قبول کیا جاتا ہے) لیکن باقی کو خدا نوافل کے ذریعے مکمل کر دیتا ہے"۔

اس قسم کی روایت بہت ہیں اور یہ تو سب ہی کو معلوم ہے کہ ہم لوگ سہو و نسیان سے خالی نہیں ہیں، (اسی طرح) ذہنی پریشانی اور وہ چیزیں جو نماز یا کامل نماز کے منافی ہیں ان سے بھی خالی نہیں ہیں یہ تو خدا کا فضل ہے کہ اس نے نوافل کو فرائض کے نقص کا جبران قرار دیا ہے اسی لئے ضروری ہے کہ حتی الامکان اس سے غفلت نہ کریں اور نوافل کو ترک نہ کریں۔

بہرحال میرے عزیز! ذرا خواب غفلت سے بیدار ہو اور اپنے بارے میں غور و فکر کرو اور نامۂ اعمال کو دیکھو۔ اس بات سے ڈرو کہ اپنے خیال سے جس نماز، روزہ، حج وغیرہ کو تم عمل صالح سمجھتے تھے کہیں وہ عالم آخرت میں تمہارے لئے ذلت و رسوائی کا سبب نہ بن جائیں۔ اس لئے جب تک تم کو اس عالم میں فرصت

ہے خود ہی میزان عمل قائم کرو اور میزان شریعت و روایت اہل بیتؑ میں اپنے اعمال کو تولو اور ان کی صحت و سقم و نقص و کمال کو جانچ لو اور ان کا ازالہ کرلو، کیونکہ اگر یہاں پر محاسبہ نہ کیا اور اپنے اعمال کو درست نہ کیا تو وہاں تمہارے اعمال کی جانچ کی گئی اور میزان عمل قائم کی گئی تو بڑی مصیبتوں میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ میزان عدل الٰہی سے ڈرو، کسی چیز پر مغرور نہ ہو، اپنی کوششوں میں کمی نہ کرو، ذرا بھی آل رسولؐ کے اعمال کو دیکھو جو گناہ و خطا سے معصوم تھے اور اس میں غور کرو تو پتا چلے گا کہ مسئلہ کتنا سخت ہے اور راستہ تاریک و باریک ہے۔ پہلے اس حدیث شریف کو پڑھئے اور تفصیلی شرح کو اس مجلس سے سمجھئے

عَنْ فَخْرِ الطَّائِفَةِ وَسَنَدِهَا وَذُخْرِهَا وَعِمَادِهَا، مُحَمَّدِ بْنِ النُّعْمَانِ المُفِيدِ[۳۴] رِضْوَانُ اللهِ عَلَيْهِ فِي الإرْشَادِ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ كُلْثُومٍ، عَنِ الصَّادِقِ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ، عَلَيْهِمَا السَّلامُ، قَالَ

﴿وَاللهِ مَا أَكَلَ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ عليه السلام مِنَ الدُّنْيَا حَرَاماً قَطُّ حَتَّى مَضَى لِسَبِيلِهِ، وَمَا عَرَضَ لَهُ أَمْرَانِ كِلاهُمَا لِلَّهِ رِضاً إِلاَّ أَخَذَ بِأَشَدِّهِمَا عَلَيْهِ فِي بَدَنِهِ (خ ل دِينِهِ)، وَمَا نَزَلَتْ بِرَسُولِ اللهِ صلى الله عليه وآله نَازِلَةٌ قَطُّ إِلاَّ دَعَاهُ ثِقَةً بِهِ، وَمَا أَطَاقَ أَحَدٌ عَمَلَ رَسُولِ اللهِ صلى الله عليه وآله مِنْ هٰذِهِ الأُمَّةِ غَيْرُهُ، وَإِنْ كَانَ لَيَعْمَلُ عَمَلَ رَجُلٍ كَانَ وَجْهُهُ بَيْنَ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ يَرْجُو ثَوَابَ هٰذِهِ وَيَخَافُ عِقَابَ هٰذِهِ

وَلَقَدْ أَعْتَقَ مِنْ مَالِهِ أَلْفَ مَمْلُوكٍ فِي طَلَبِ وَجْهِ اللهِ وَالنَّجَاةِ مِنَ النَّارِ مِمَّا كَدَّ بِيَدَيْهِ وَرَشَحَ مِنْهُ جَبِينُهُ، وَإِنَّهُ كَانَ لَيَقُوتُ أَهْلَهُ بِالزَّيْتِ وَالْخَلِّ وَالْعَجْوَةِ، وَمَا كَانَ لِبَاسُهُ إِلاَّ الْكَرَابِيسَ إِذَا فَضَلَ شَيْءٌ عَنْ يَدِهِ دَعَا بِالْجَلَمِ فَقَصَّهُ

وَمَا أَشْبَهَهُ مِنْ وُلْدِهِ وَلا أَهْلِ بَيْتِهِ أَحَدٌ أَقْرَبُ شَبَهاً بِهِ فِي لِبَاسِهِ وَفِقْهِهِ مِنْ عَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ (عليهما السلام)، وَلَقَدْ دَخَلَ أَبُو جَعْفَرٍ عليه السلام ابْنُهُ عَلَيْهِ فَإِذَا هُوَ قَدْ بَلَغَ مِنَ الْعِبَادَةِ مَا لَمْ يَبْلُغْهُ أَحَدٌ، فَرَآهُ قَدِ اصْفَرَّ لَوْنُهُ مِنَ السَّهَرِ وَرَمَضَتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْبُكَاءِ وَدَبِرَتْ جَبْهَتُهُ وَانْخَرَمَ أَنْفُهُ مِنَ السُّجُودِ وَوَرِمَتْ سَاقَاهُ وَقَدَمَاهُ مِنَ الْقِيَامِ فِي الصَّلاةِ

وَقَالَ أَبُو جَعْفَرٍ عليه السلام: فَلَمْ أَمْلِكْ حِينَ رَأَيْتُهُ بِتِلْكَ الْحَالِ الْبُكَاءَ، فَبَكَيْتُ رَحْمَةً لَهُ، فَإِذَا هُوَ يُفَكِّرُ، فَالْتَفَتَ إِلَيَّ بَعْدَ هُنَيْئَةٍ مِنْ دُخُولِي فَقَالَ: يَا بُنَيَّ أَعْطِنِي بَعْضَ تِلْكَ الصُّحُفِ الَّتِي فِيهَا عِبَادَةُ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ عليه السلام، فَأَعْطَيْتُهُ فَقَرَأَ فِيهَا شَيْئاً يَسِيراً ثُمَّ تَرَكَهَا مِنْ يَدِهِ تَضَجُّراً وَقَالَ: مَنْ يَقْوَى عَلَى عِبَادَةِ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ عليه السلام﴾[۳۵]

حدیث ۲۷ ... (۵۱۱)

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں ''خدا کی قسم حضرت علیؑ نے دنیا سے کبھی بھی مرتے دم تک حرام شئے نہیں کھائی اور جب بھی ایسے دو امر پیش آئے جس میں خدا کی خوشنودی ہو تو آپ نے ان میں سے اسی کو اختیار کیا جو آپؑ کے بدن کیلئے زیادہ مشقت آمیز ہو (دوسرے نسخے میں ہے، جو آپ کے دین کیلئے زیادہ سخت ہو) اور رسول خداؐ پر جب بھی کوئی مصیبت نازل ہوئی ہے آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ ہی کو پکارا ہے، کیونکہ ان پر بہت زیادہ بھروسہ کرتے تھے اور اس پوری امت میں کسی کو (سوائے علیؑ کے) آنحضرتؐ کے عمل کی طاقت نہیں تھی۔ آپؑ جو کچھ بھی عمل کرتے خدا کے خوف کے ساتھ کرتے تھے اور آپؑ کا عمل جنت ونار کے درمیان ہوتا تھا (یعنی) اس (جنت) کے ثواب کی امید رکھتے تھے اور اس (جہنم) کے عقاب سے خوفزدہ تھے۔ خدا کی خوشنودی اور جہنم سے نجات کی خاطر اپنے داہنے ہاتھ کی کمائی اور اپنی محنت کی کمائی سے جس سے پسینہ ٹپکنے لگے، ایک ہزار غلام خرید کر آزاد فرمایا۔ آپؑ کے اہل وعیال کی غذا روغن زیتون، سرکہ اور کھجور تھی۔ آپؑ کا لباس کھدر کا کپڑا تھا۔ اگر آستین لمبی ہوتی تھی تو قینچی لے کر خود ہی کاٹ دیتے تھے۔ آپؑ کی اولاد اور اہل بیتؑ میں لباس اور فقہ میں امام زین العابدینؑ سے زیادہ کوئی آپؑ سے مشابہ نہ تھا چنانچہ (ایک مرتبہ) امام سجادؑ کے صاحبزادے امام محمد باقرؑ آپؑ کی خدمت میں آئے تو دیکھا حضرتؑ عبادت میں اس حد تک پہنچ گئے تھے جس حد تک کوئی نہیں پہنچا تھا۔ (آپؑ نے دیکھا کہ) امام سجادؑ کا رنگ شب بیداری سے زرد ہو چکا ہے اور گریہ وزاری سے آنکھیں سوج گئی تھیں، (کثرت سجود) سے پیشانی زخمی اور ناک پھٹ ہو گئی تھی۔ نماز میں کثرت قیام سے پنڈلیاں اور قدم مبارک ورم کر گئے تھے (یہ دیکھ کر) امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں

میں اپنا گریہ نہ روک سکا، میں رحم کھا کر رونے لگا اور آپؑ سوچ میں محو تھے۔ میرے داخل ہونے کے تھوڑی دیر بعد میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا بیٹا! ان اوراق میں سے بعض کو مجھے دو، جن میں حضرت علیؑ کی عبادت درج ہے! میں نے دیا۔ آپؑ نے تھوڑا سا پڑھ کر ناگواری کی حالت میں اس کو رکھ کر فرمایا بھلا کون حضرت علیؑ جیسی عبادت کر سکتا ہے؟''۔

وعن ابي جعفر عليه السلام: ﴿كان عليّ بن الحسين عليهما السلام يصلّي في اليوم والليلة ألف ركعة، وكانت الريح تميله مثل السنبلة﴾ ٦ع ''امام محمد باقرؑ فرماتے تھے امام سجادؑ شب وروز میں ایک ہزار رکعت نماز پڑھا کرتے تھے اور ہوا ان کو (حالت نماز میں) بالیوں کی طرح ہلا دیتی تھی''۔

میرے عزیز! ان احادیث شریفہ میں تھوڑا سا غور کرو۔ دیکھو تو امام باقرؑ جو معصوم تھے اپنے والد کی شدت عبادت اور کیفیت عبادت کو دیکھ کر روتے تھے! امام زین العابدینؑ اتنی پابندی اور کمال عبادت کے باوجود صحیفۂ علی ابن طالبؑ کو تھوڑا سا پڑھ کر، ظہار عاجزی فرماتے تھے! ویسے یہ صحیح ہے کہ مولی الموالی حضرت علیؑ کی عبادت سے سب ہی عاجز ہیں اور معصومینؑ کی عبادت سے تمام لوگ عاجز ہیں لیکن انسان کو اعلیٰ مقام تک نہ پہنچ سکنے کی وجہ سے بالکل ہی (نماز کو) نہیں چھوڑ دینا چاہیے۔

یہ بھی جان لیجئے کہ یہ عبادتیں ''معاذ اللہ'' بیکار نہیں ہیں، بلکہ راستہ خطرناک اور تنگ ہے اور موت وقیامت کی گھاٹیاں اتنی مشکل ہیں کہ حقیقی اہل معرفت بھی عجز وزاری کیا کرتے تھے اور ہماری یہ سہل انگاری ہمارے ایمان اور عقیدے کی کمزوری اور جہالت ونادانی کی وجہ سے ہے۔

بار الہا! تو بندوں کے دلوں سے آگاہ ہے، ہمارے قصور وتقصیر سے واقف ہے، ہمارے کمزوری وناتوانی سے مطلع ہے۔ سوال کرنے سے پہلے ہی تو نے ہم کو اپنی رحمتوں میں غرق کر دیا ہے۔ تیری نعمتیں بے مانگے دستیاب تیرا فضل وکرم عیاں ہے۔ ہم اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرتے ہیں، تیری بے شمار نعمتوں کا ہم نے کفران کیا ہے، ہم اپنے کو عذاب الیم اور جہنم میں داخل کا مستحق جانتے ہیں۔ ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں، کوئی وسیلہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ تو نے خود ہی اپنے انبیاءؑ کی زبانوں سے اپنے فضل وکرم اور وسعت جود ورحمت کا تعارف کرایا ہے اور ہم اپنی استعداد کے مطابق تجھے انہیں صفات سے جانتے ہیں تو ایک مشت خاک سے رحمت وفضل کے علاوہ کیا کرے گا۔

﴿اَیْنَ رَحْمَتُکَ الْوَاسِعَۃُ؟ اَیْنَ اَیَادِیْکَ الشَّامِلَۃُ؟ اَیْنَ فَضْلُکَ الْعَمِیْمُ؟ اَیْنَ کَرَمُکَ یَا کَرِیْمُ؟﴾ ''تیری وسیع رحمت کہاں ہے؟ تیری سب کو شامل نعمتیں کہاں ہیں؟ تیرا فضل عام کہاں ہے؟ اے کریم! تیرا کرم کہاں گیا؟''۔

چوتھی فصل: عبادت کیلئے فراغت غنائے قلب کا سبب ہوتا ہے

یہ بات جاننی چاہیے کہ غنا نفس کے صفات کمالیہ میں سے ہے، بلکہ ''موجود بما ھو موجود'' کے صفات کمالیہ میں سے ہے۔ اسی لئے خداوند عالم کے صفات ذاتیہ میں سے غنا کا شمار ہوتا ہے۔ (لیکن) دولتمندی اور مالداری غنائے نفسانی کا سبب نہیں ہے، بلکہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ جو لوگ غنائے نفسانی کے

مالک نہیں ہیں وہ مال ومنال اور دولت رکھنے کے باوجود حریص ہوتے ہیں اور ان کی حرص بڑھتی جاتی ہے اور چونکہ خداوند عالم کے علاوہ کوئی بھی بالذات غنی نہیں ہے اور تمام اشیاء خاک سے لے کر افلاک تک اور ہیولائے اولیٰ سے لے کر جبروت تک سب ہی غریب وضرورتمند ہیں۔ اس لئے قلبی توجہ چاہے جتنی غیر خدا کی طرف ہو اور باطنی توجہ ملک وآبادی دنیا کی طرف ہو، اس کی ضرورت اور نیازمندی بڑھتی جائے گی۔ دلی اور روحانی نیازمندی تو بہت ہی واضح ہے، کیونکہ محض لگاؤ اور تعلق ہی نیازمندی ہے اور ظاہری ضرورت جو دلی نیازمندی پر تاکید کرتی ہے وہ بھی زیادہ ہوتی جائے گی۔ اس لئے کہ کوئی بھی شخص خود بخود اپنے امور کا انتظام نہیں کر سکتا، بلکہ اس سلسلے میں دوسروں کا محتاج ہوتا ہے اور ارباب دولت چاہے بظاہر بے نیاز معلوم ہوتے ہوں لیکن اگر دقت نظر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جتنی ان کی دولت بڑھتی جاتی ہے ان کی نیازمندی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور ضرورت بڑھتی ہی جاتی ہے یوں سمجھئے کہ دولتمند افراد وہ ضرورتمند ہیں جو امارت کا لباس پہنے ایسے ضرورتمند ہیں جو بے نیازی کے لباس میں ہیں اور یہ مسلّم ہے کہ تدبیر امور اور دنیا کی آبادکاری کی طرف دل جتنا متوجہ ہوگا اسی قدر دنیا سے لگاؤ بڑھے گا ذلت ورسوائی کا لباس زیادہ ہوگا ذلت کی تاریکی اور ضرورت میں اضافہ اس کو مزید گھیر لے گا اس کے برعکس جو دنیا کے تعلق سے دور ہو اور قلبی طور سے غنی علی الاطلاق کی طرف متوجہ ہو یا مخلوقات کی ذاتی غربت کا قائل ہو اور یہ سمجھ لے کہ مخلوقات خود سے کسی چیز کے مالک نہیں ہیں اور کوئی بھی قدرت وعزت وسلطنت نہیں ہے جس نے گوش دل سے ہاتف ملکوتی اور لسان غیبی خدا کی طرف سے اس آیت کو نہ سنا ہو

﴿یا ایُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللہِ وَاللہُ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ﴾ ۴۸

"اے لوگو تم سب کے سب (ہر وقت) خدا کے محتاج ہو اور (صرف) خدا ہی سب سے بے پروا اور سزاوار حمد (وثنا) ہے" اور جو اس کا دل سے قائل ہوگا وہی دونوں عالم سے بے نیاز ہوگا اور اس کا دل اتنا مستغنی ہو جائے گا کہ ملک سلیمان بھی اس کی نظروں میں ہیچ نظر آئے گا۔ اگر زمین کے خزانوں کی کنجیاں اس کو پیش کی جائیں تو وہ اعتنا نہ کرے گا۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ "جبرئیلؑ نے زمین کے خزانوں کی کنجیاں حضرت رسول اکرمؐ کو پیش کیں مگر آنحضرتؐ نے تواضع فرمائی اور قبول نہیں فرمایا اور اپنی فقیری کو باعث فخر قرار دیا"۔ ۴۹ حضرت علیؑ نے ابن عباسؓ سے فرمایا "تمہاری یہ دنیا میری نظر میں میری اس پیوند زدہ جوتی سے بھی بدتر ہے"۔ ۵۰ حضرت سید سجادؑ نے فرمایا "مجھے یہ بات ناگوار ہے کہ دنیا کو خالق دنیا سے طلب

کروں چہ جائیکہ اپنی جیسی مخلوق سے طلب کروں"۔ ۵۱ اور نجم الدین ۵۲ "مسلسلۃ الرعیۃ الکبریٰ" میں شدید وغلیظ قسموں کے بعد فرماتے ہیں "اگر مال ومنال دنیا اور آخرت کی بہشت وحور وقصور مجھے عطا کی جائے اور امیروں کے ساتھ نشست کو اس کے ساتھ اضافہ کیا جائے اور دوسری طرف شقاوت دنیا وآخرت کے ساتھ غریبوں کی ہم نشینی ہو، اور مجھے اختیار دیدیا جائے جو چاہوں لوں تو میں غریبوں کی ہم نشینی کو لوں گا مگر امیروں کی صحبت کے عار کو نہیں خریدوں گا ﴿والفقر خیر من العار﴾ ۵۳

جی ہاں! یہ حضرات جانتے تھے کہ خزائن دنیا اور مال ومنال امیروں کی صحبت کے ساتھ قلب کو کتنا تاریک بنادیتی اور ارادے کو کتنا ضعیف اور ناچیز قرار دیتی ہے اور قلب کو نیازمند وفقیر بنادیتی ہے اور (سب سے بڑی بات یہ ہے کہ) کامل علی الاطلاق کے مرکزی نقطہ سے غافل بنادیتی ہے۔ لیکن اگر دل کو صاحب دل اور گھر کو صاحب خانہ کے سپرد کریں اور خود اس میں کوئی تصرف نہ کریں اور اس (خدا) کے سوا دوسروں کو چھوڑ دیں اور گھر کو غاصب کے حوالہ نہ کریں تو خود صاحب خانہ دل میں جلوہ گر ہوتا، دل کو دریائے عزت وغنا میں غرق کردیتا ہے اور قلب کو بے نیازی سے بھر دیتا ہے ﴿ولله العزة ولرسوله وللمؤمنين﴾ ۵۴ "عزت تو صرف خدا، رسول اور مؤمنین کیلئے ہے" اور پھر صاحب خانہ ہی گھر کے امور کا ارادہ کرتا ہے اور انسان کو اس کے حال پر نہیں چھوڑتا (بلکہ) بندے کے تمام امور میں خود متصرف ہوتا ہے اور وہی بندے کی سماعت وبصارت اور ہاتھ پاؤں بن جاتا ہے اور نتیجہ قرب نوافل پیدا ہوجاتا ہے۔

چنانچہ حدیث میں آیا ہے: الكافي باسناده عن ابي جعفر علیہ السلام في حديث ﴿وانّه ليتقرّب الَيّ بالنّافلة حتّى احبّه، فاذا احببته، كنت سمعه الّذي يسمع به، وبصره الّذي يبصر به، ولسانه الّذي ينطق به، ويده الّتي يبطش بها الحديث﴾ ۵۵ "کافی میں امام محمد باقرؑ سے نقل کیا گیا ہے کہ (خدا فرماتا ہے) میرا بندہ اپنے نوافل کے ذریعے مجھ سے قریب ہوجاتا ہے اور (جب قریب ہوجاتا ہے تو) میں اس سے محبت کرتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کی سماعت بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور بصارت بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کی زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ گرفت حاصل کرتا ہے"۔

اس کے بعد بندے کا فقر وفاقہ بالکل ختم ہوجاتا اور وہ دونوں عالم سے بے نیاز ہوجاتا ہے۔ البتہ جب یہ تجلی ہوتی ہے تو تمام مخلوقات سے اس کا خوف دور ہوجاتا ہے اور اس کی جگہ خوف خدا لے لیتا ہے اور

خدا کی عظمت وحشمت اس کے پورے دل پر چھا جاتی ہے اور وہ غیر حق کیلئے کسی قسم کی عظمت یا حشمت یا تصرف کا قائل نہیں ہوتا ہے اور ﴿لا مُؤثِّــر فِي الوُجُود اِلَّا الله﴾ کی حقیقت کو قلب سے دریافت کر لیتا ہے۔ اس حدیث شریف میں بعض ان معانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے "میری عبادت کیلئے فراغت حاصل کرو، تمہارے دل کو غنا سے بھر دوں گا" اور یہ فراغت قلب ممکن ہے سالک کو رفتہ رفتہ حضور قلب بجائے عبادت کے اعلیٰ درجے تک پہنچا دے۔

یہ وہ آثار ہیں جن کا تھوڑا سا ذکر کیا گیا۔

اگر دل (ذکر) حق سے منصرف ہو گیا اور اس کی طرف توجہ کیلئے فراغت نہ رہ گئی تو یہ غفلت تمام شقاوتوں کا سرمایہ اور تمام نقائص کا سرچشمہ اور بیماریوں کا منشا بن جاتا ہے اور اس غفلت کی وجہ سے پورے دل پر تاریکی چھا جاتی ہے اور قلب و خدا کے درمیان ایسے بڑے موٹے پردے پڑ جاتے ہیں جس کی وجہ سے نور ہدایت وہاں تک جا ہی نہیں سکتا اور وہ الٰہی توفیقات سے محروم ہو جاتا ہے اور پھر دل یکدم سے دنیا اور پیٹ کی ضروریات اور جنسی خواہشات کی تکمیل میں مشغول ہو جاتا ہے اور خود غرضی و انانیت کے پردے میں ڈوب جاتا ہے اور نفس سرکش ہو جاتا اور انانیت کی طرف بڑھنے لگتا ہے اور اس کی ذاتی ذلت اور حقیقت فقر واضح ہو جاتا ہے اور اس کے تمام حرکات و سکنات درگاہ حق سے دور ہوتے جاتے ہیں اور ذلت اس کو گھیر لیتی ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ان میں سے بعض معانی کی تعبیر کی گئی ہے، (ارشاد ہے) "میں تیرے دل کو دنیا کی مصروفیت سے بھر دوں گا اور اس کے فقر و فاقہ کو بند نہ کروں گا اور تمام امور کو اسی کے حوالے کر دوں گا"۔

نکتہ

یہ جو کہا گیا ہے کہ خدا بندے کے حوالے کر دیتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کو تفویض کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ یہ بات مشرب عرفان و مسلک برہان و مذہب حق کے نزدیک محال و باطل ہے، کیونکہ کوئی بھی مخلوق تصرف حق اور اس کی قدرت کے احاطے سے باہر نہیں ہے اور اس کا امر تصرف امور میں اس کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ بندہ خدا سے منصرف ہوتا اور امور دنیاوی میں مشغول ہو جاتا ہے طبیعت اس پر حاکم ہو جاتی اور انانیت غالب آ جاتی اور خود بینی و خود خواہی و خود پرستی اس میں کارگر ہو جاتی ہے۔ بس اسی

بات کو بندے کے حوالے کردینے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن جس بندے کا دل خدا اور ملکوت اعلیٰ کی طرف متوجہ ہے اور اس کے پورے دل کو نورِ حق نے منور کردیا ہے اس کے تصرفات مجبور الٰہی، بلکہ بعض اوقات اس کا وجود بھی حقانی ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ کافی کی حدیث شریف میں تقرب نوافل کے ضمن میں بعض الٰہی مقامات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

والله العالم

توضیحات (۲۷)

۱۔ اصول کافی، ج۲، ص۸۳، کتاب ایمان وکفر، باب العبادۃ، حدیث ۔

۲۔ فروع کافی، ج۳، ص۲۶۹، کتاب الصلاۃ، باب من حافظ علی صلاتہ وضیعہا، حدیث ۷۔

۳۔ فروع کافی، ج۳، ص۲۷۰، کتاب الصلاۃ، باب من حافظ علی صلاتہ وضیعہا، حدیث ۱۵۔

۴۔ حدیث ۹، حاشیہ ۲۳۔

۵۔ کشف الحجہ، ص۳۱، فصل ۲۸۔

۶۔ امام محمد باقرؑ نے اپنے والد کیلئے فرمایا

﴿كانَ عَليُّ بنُ الحُسَين يُصَلّي في اليَومِ واللَّيلَةِ ألفَ رَكعَةٍ وكانَ الرّيحُ تُمِيلُهُ بِمَنزِلَةِ السُّنبُلَةِ وكانَت لَهُ خَمسُمِائَةِ نَخلَةٍ، فَكانَ يُصَلّي عِندَ كُلِّ نَخلَةٍ رَكعَتَينِ، وكانَ إذا قامَ في صَلاتِهِ، غَشِيَ لَونَهُ لَونٌ آخَرُ وكانَ قِيامُهُ في صَلاتِهِ قِيامَ العَبدِ الذَّليلِ بَينَ يَدَيِ المَلِكِ الجَليلِ، كانَت أعضاؤُهُ تَرتَعِدُ مِن خَشيَةِ اللهِ، وكانَ يُصَلّي صَلاةَ مُوَدِّعٍ يَرى أنَّهُ لا يُصَلّي بَعدَها أبَدًا﴾

"آپؑ کے پاس پانچ سو کھجوروں کے درخت تھے اور آپ ہر درخت کے پاس دو رکعت نماز پڑھتے تھے اور جب نماز کیلئے کھڑے ہوتے تو آپ کا رنگ بدل جاتا تھا۔ نماز میں اس طرح کھڑے ہوتے تھے جیسے کوئی عبد ذلیل، ملک جلیل کے سامنے کھڑا ہو۔ خوف خدا سے آپؑ کے اعضا کانپتے تھے اور ہر نماز ایسی پڑھتے تھے جیسے یہ آخری ہے اور اس کے بعد نماز کی نوبت نہیں آئے گی۔

بحار الانوار، ج۴۶، ص۸۰، تاریخ سید الساجدینؑ، باب۵، حدیث ۷۵۔

۷۔ جامع السعادات، ج۱، ص۳۲۸

۸۔ فروع کافی، ج۳، ص۲۶۳، کتاب الصلاۃ، باب فضل من صلاۃ ساہی، حدیث ۴

۹۔ حدیث ۱، حاشیہ ۲۰۔

۱۰۔ وسائل الشیعہ، ج۴، ص۶۸۸، کتاب الصلاۃ، باب ۳ از ابواب فضل الصلاۃ، حدیث ۹۔

۱۱۔ خصال، ص۶۱۳، باب الواحد الی المائۃ، حدیث ۱۰، وسائل الشیعہ، ج۴، ص۶۸۷، کتاب الصلاۃ، باب ۳ از ابواب افعال الصلاۃ، حدیث ۴۔

۱۲۔ ثواب الاعمال وعقاب الاعمال ص ۵۷، ثواب الصلاۃ، حدیث ۲

وسائل الشیعہ، ج ۴، ص ۶۸۵، کتاب الصلوٰۃ، باب ۲ از ابواب افعال الصلوٰۃ، حدیث ۹۔

۱۳۔ ثواب الاعمال وعقاب الاعمال، ص ۶۳، ثواب الورع والزہد والاقبال فی الله، حدیث ۱۔

وسائل الشیعہ، ج ۴، ص ۶۸۶، کتاب الصلوٰۃ، باب ۲ از ابواب افعال الصلوٰۃ، حدیث ۹۔

۱۴۔ مناجات شعبانیہ کا حصہ۔ بحار الانوار، ج ۹۱، ص ۹۷۔ ۹۹، کتاب الذکر والدعا، باب ۳۲، حدیث ۱۴، قرب رمضان، عمل ماہ شعبان۔ مصباح المتہجد وسلاح المتعبد، ص ۳۷۴۔

۱۵۔ ثواب الاعمال وعقاب الاعمال، ص ۶۷، ثواب من صلی رکعتین یعلم ما یقول فیہما، حدیث ۱۔

وسائل الشیعہ، ج ۴، ص ۶۸۶، کتاب الصلوٰۃ، باب ۳ از ابواب افعال الصلوٰۃ، حدیث ۳۔

۱۶۔ ثواب الاعمال وعقاب الاعمال، ص ثواب من صلی رکعتین خفیفتین فی تفکر، ص ۶۷۔ ۶۸، حدیث ۱۔

وسائل الشیعہ، ج ۴، ص ۶۸۸، کتاب الصلوٰۃ، باب ۳ از ابواب افعال الصلوٰۃ، حدیث ۵۔

۱۷۔ حدیث ۱ دوسرا مقام۔

۱۸۔ مرحوم شاہ آبادی مراد ہیں۔

۱۹۔ حدیث ۲۷ فصل کا آخری حصہ

۲۰۔ اصول کافی، ج ۱، ص ۱۱۰، کتاب التوحید، باب ارادہ انہا من صفات الفعل، حدیث ۳۔

۲۱۔ حدیث ۹ احتضار

۲۲۔ سورہ یٰس، آیت ۸۲/۳۶

۲۳۔ سورہ مدثر، آیت ۳۱/۷۴

۲۴۔ رسول خدا نے فرمایا: مثلی فی الانبیاء کمثل رجل بنی دارًا فاحسنہا واکملہا واجملہا وترک فیہا موضع لبنۃ لم یضعہا فجعل الناس یطوفون بالبنیان ویعجبون منہ ویقولون لو تم موضع ھذہ اللبنۃ فانا فی النبیین موضع تلک اللبنۃ

انبیاء کے درمیان میری مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے بہت عمدہ مکمل اور خوبصورت گھر بنایا ہو (لیکن) اس میں اس اینٹ کی جگہ چھوڑ دی ہو اس کے بعد لوگ اس گھر کا طواف کرنے لگیں اور اس پر تعجب کرتے ہوئے کہنے لگیں کاش اس اینٹ کی جگہ بھی پر ہو گئی ہوتی، پس میں انبیاء میں اس اینٹ کی جگہ ہوں"۔

کنز العمال، ج ۱۱، ص ۴۲۲، حدیث ۳۱۹۸۱۔

۲۵۔ مدارج السالکین، ص ۱۰۷۔ ۱۰۸، وذکر، باب تعبد فی قرأۃ قرآن فی الصلوٰۃ

۲۶۔ اربعین مجلسی (ص ۱۷۷، شرح حدیث ۵) حدیث کے اندر "ساعت" کے بجائے (وقت) کا لفظ آیا ہے۔

۲۷۔ اس کا ترجمہ متن میں گزر چکا

۲۸۔ علم الیقین، ج ۲، ص ۱۰۶۰۔

۲۹۔ حدیث ۲۲، حاشیہ ۱۸۔

۳۰۔ سورۂ زخرف، آیت ۷/ ۹۔

۳۱۔ سورۂ کہف، آیت ۴۹/۔

۳۲۔ امالی ص ۲۵۶، مجلس ۱/۱۰، ... حدیث ... اس باب میں "اسودعنی ملکک کریم" کے بجائے "استودعک اللہ کما استودعنی ملکا کریما" آیا ہے۔

وسائل الشیعہ، ج ۳، ص ۹۰، کتاب الصلوٰۃ، ابواب المواقیت، باب ۳، حدیث ۷، حدیث اول کے مطابق ہے۔

۳۳۔ سورۂ عنکبوت، آیت ۴۳/۔

۳۴۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۹۵، کتاب ایمان و کفر، باب اخلاص ... حدیث ۸

۳۵۔ حدیث ۱، حاشیہ ۱۹۔

۳۶۔ سورۂ آل عمران، آیت ۳۰/

۳۷۔ سورۂ زلزال، آیت ۷/۔

۳۸۔ ریجال، ص ۲۹۲، شرح حدیث ۳۳

۳۹۔ مرآۃ العقول، ج ۹، ص ۹۵، کتاب ایمان و کفر، باب اخلاص ... حدیث ۸

۴۰۔ سورۂ مریم، آیت ۱۷/۔

۴۱۔ علل الشرائع، ج ۲، ص ۳۲۹، باب ۲۴، حدیث ۴، وسائل الشیعہ، ج ۳، ص ۵۴، کتاب الصلوٰۃ، باب ... عدم الفراش، حدیث ۰

۴۲۔ حوالہ سابق، حدیث ۲۔

۴۳۔ ... اس حدیث کا مطلب ... حوصلہ قلب کے ساتھ ... اہل سنت کا بیان ... سکون قلب ... کیونکہ ... (...)

۴۴۔ حدیث ۱، حاشیہ ۳۱۔

۴۵۔ ارشاد، ص ۲۵۵، ۲۵۶، باب ذکر طرف من اخبار علی بن الحسین (علیہما السلام)۔

۴۶۔ ارشاد، ص ۲۵۶، باب ذکر طرف من اخبار علی بن الحسین (علیہما السلام)

۴۷۔ اس کا ترجمہ متن میں گزر چکا۔

۴۸۔ سورۂ فاطر، آیت ۱۵/

۴۹۔ حدیث ۱۵، حاشیہ ۲۲۔

۵۰۔ ابن عباس کہتے ہیں

﴿دخلت على امير المؤمنين عليه السلام بذي قار، وهو يخصف نعله، فقال لي: ما قيمة هذا النعل؟ فقلت: لا قيمة لها فقال: والله لهي احب الي من امرتكم، الا ان اقيم حقا او ادفع باطلا﴾ "میں مقام "ذی قار" میں حضرت علیؑ کے پاس گیا اور آپؑ اپنی جوتی ٹانک رہے تھے۔ مجھ سے پوچھا اس جوتی کی کیا قیمت ہے؟ میں نے کہا: کوئی قیمت نہیں ہے۔ فرمایا خدا کی قسم یہ تمہاری حکومت سے زیادہ مجھے محبوب ہے مگر یہ کہ میں کسی حق کو قائم کروں اور باطل کو روک دوں"۔

نہج البلاغہ، خطبہ ۳۳، ص ۱۰۲۔

۵۱۔ علل الشرائع، ج ۱، ص ۲۳۰، باب ۱۶۵، حدیث ۳۔

۵۲۔ احمد بن عمر بن محمد (۵۴۰ ـ ۶۱۸ ھ ق) خوارزم کے رہنے والے صوفی تھے۔ نجم الدین کے نام سے مشہور تھے صوفیوں کے مشہور مشائخ میں سے ہیں۔ آپ کی تصانیف میں "رسالۃ الخائف الہائم عن لومۃ اللائم، فوائح الجمال، منارات السائرین و منہاج السالکین" مشہور ہیں۔

۵۳۔ منہاج السالکین، ص ۱۵۷، المنہج السادس۔

۵۴۔ سورہ منافقون، آیت ۸۔

۵۵۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۵۲، کتاب ایمان و کفر، باب من آذی المسلمین، حدیث ۸۔

اٹھائیسویں حدیث

بالسند المتصل الی ثقة الاسلام، مُحمّد بن یعقوب الکُلینی، رحمة اللہ عن مُحمّد بن یحیی، عن احمد بن مُحمّد، عن مُحمّد بن خالد والحُسین بن سعید جمیعاً عن القاسم بن مُحمّد، عن عبد الصّمد بن بشیر، عن بعض اصحابه، عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال

﴿قُلْتُ اصلحک اللہ! مَنْ احبّ لقاء اللہ، احبّ اللہ لقائه؟ ومَن ابغض لقاء اللہ، ابغض اللہ لقائه؟ قال: نعم قُلْتُ فواللہ انّا لنکرہ الموت

فقال لیس ذلک حیث تذھب انّما ذلک عند المعاینة، اذا رأی ما یحبّ فلیس شیءٌ احبّ الیه من ان یتقدّم علی اللہ، واللہ تعالی یحبّ لقائه وھو یحبّ لقاء اللہ حینئذٍ واذا رأی ما یکرہ، فلیس شیءٌ ابغض الیه من لقاء اللہ واللہ یُبغض لقائه﴾

ترجمہ راوی کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا خدا آپ کی اصلاح کرے ایک جو شخص خدا کے دیدار کا مشتاق ہو خدا بھی اس کے دیدار کا مشتاق ہوتا ہے؟ اور جو شخص خدا کی ملاقات سے ناراض ہو خدا بھی اس سے ملاقات کو ناپسند کرتا ہے؟ حضرتؑ نے فرمایا ہاں ایسا ہی ہے۔ راوی نے کہا خدا کی قسم ہم موت کو پسند نہیں کرتے ؟ حضرتؑ نے فرمایا تم جو خیال کر رہے ہو ایسی بات نہیں ہے، بلکہ یہ موت کے دیکھنے کے وقت ہوا کرتا ہے کہ جب وہ مرتے وقت اپنی محبوب چیزوں کو دیکھتا ہے تو ملاقات خدا سے زیادہ کوئی شئے اس کے نزدیک محبوب نہیں ہوتی اور خدا بھی اس کی ملاقات کو اسی طرح دوست رکھتا ہے جس طرح وہ خدا کی ملاقات کو دوست رکھتا ہے اور جب (مرتے وقت) ایسی چیزوں کو دیکھتا ہے جس کو

ناپسند کرتا ہے تو اس کے سامنے دیدار خدا سے زیادہ کوئی چیز مبغوض نہیں ہوتی اور خدا بھی اس کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے۔

شرح ''اضحک اللہ'' یہ دعائے خیر ہے اور دعا میں یہ ضروری نہیں ہے کہ جس چیز کی دعا دی جا رہی ہے وہ شئے اس میں نہیں ہے (مثلاً اگر کوئی آپ سے کہے خدا آپ کو تندرست رکھے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ مریض ہیں اس لئے تندرستی کی دعا دے رہا ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر تندرستی ہے تو باقی رہے نہیں ہے تو عطا کرے) بلکہ متعارف یہی ہے کہ اگرچہ مقصد حاصل ہو پھر بھی اس کی دعا دی جاتی ہے۔ یہاں امام جعفر صادق کو راوی نے جو صلاح و سداد کی دعا دی ہے وہ بھی بنا بر متعارف ہی ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے ﴿عفر اللہ لک﴾ خدا آپ کو بخش دے ﴿عفی اللہ عنک﴾ خدا آپ کو معاف کرے۔ یہ جملے بھی بطور دعا ان ذوات مقدسہ کیلئے درست ہیں اور بعض حضرات نے اس آیہ مبارکہ ﴿لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر﴾[۱] ''تاکہ خدا تمہاری (امت کے) اگلے اور پچھلے گناہ معاف کر دے'' کو بھی اسی مطلب پر حمل کیا ہے اور انہوں نے کہا ہے یہ آیت اس بات کے مناسب ہے کہ کہا جائے ﴿غفر اللہ لک﴾[۲] اس میں حصول مقصد کا ہونا ملحوظ نہیں ہے۔ اگرچہ یہ احتمال آیت میں بعید ہے اور میں گزشتہ حدیثوں کی کسی حدیث کی شرح میں اس کو بیان کر چکا ہوں لیکن بنیادی طور پر یہ بات کہ ان مقامات میں غالباً حقیقت میں مقصد کا حصول ملحوظ نہیں ہوتا اپنی جگہ صحیح ہے۔

''لقاء'' لام کو فتحہ یا کسرہ کے ساتھ۔ یہ ''لقي'' بروزن ''رضي'' کا مصدر ہے۔ اسی طرح ''لقائۃ لقیہ لقیٰ، لقیاناً ولقیانۃ'' یہ سب لام کے کسرہ سے ہیں اور ''ولُقیٰ لُقیٰ۔ لُقیاناً، لُقیۃ ولُقیۃ'' یہ سب لام کے ضمہ سے ہیں۔ یہ سب کے سب (چاہے لام کے ضمہ سے ہوں یا کسرہ سے) مصدر ہیں۔ اس کے معنی رؤیت و دیدار کے ہیں۔ اب اس کے بعد اس کتاب کی مناسبت سے لقاء اللہ کا بیان کیا جائے گا۔

''بغض'' یہ باب فعل سے ہے اور ''بغض'' مثل کرم، نصر و فرح۔ بغضۃ فھو بغیض'' یہ حب کا ضد ہے اور ''بغضۃ وبغضاء'' بغض کی شدت ہے۔ مختصر یہ کہ حب اور بغض ایک دوسرے کے ضد اور صفات نفسانیہ میں سے ہیں، وجدانی طور پر ان کی حقیقت واضح ہے، دیگر وجدانیات اور صفات نفسانیہ کی طرح جن کے ذاتی حقائق واضح ہیں، بیان کے محتاج نہیں ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ محبت و بغض خدا کے اعتبار سے کس طرح صحیح ہے اس کا بیان آئے گا۔

"ان لنكره الموت" چونکہ راوی کی نظر میں موت اور لقاء اللہ ایک دوسرے کے لازم ہیں یا پھر لقاء اللہ سے مراد نفس موت تھی اس لئے اس نے موت سے کراہت کی تعبیر خدا کے دیدار کو ناپسند کرنے سے کی اور یہ سوال کیا اور حضرت ؑ نے جواب دیا کہ مجموعی طور پر ناپسند کرنا معیار نہیں ہے، بلکہ مرتے وقت آثار ملکوت اور دیگر عوالم کا مشاہدہ کرنا معیار ہے۔

"ليس ذلك حيث تذهب" اس جملے کی تعبیر جو اس کے مطابق ہو فارسی میں نہیں ہے، بلکہ فارسی میں اس بات کی تعبیر (اردو کے ان جملوں کے مترادف) اس طرح ہوگی "جہاں میرا گمان ہے، میں نے گمان کیا ہے، میرے ذہن میں یہ بات آئی (وغیرہ)" عربی میں بھی اس تعبیر کا مطلب، گمان کرنے کے ہی ہیں، عربی میں اس طرح کی تعبیرات بہت ہیں، بلکہ "ذہاب" اور اس کے مشتقات کی متعارف تعبیر، ذہاب، وہم وعقیدہ وغیرہ ہے اور اسی اعتبار سے مذہب کہا جاتا ہے اور یہ استعارے پر مبنی ہے، اس لئے کہ یہ ذہاب عینی وخارجی سے ماخوذ ہے۔

"عند المعاينة" معاینہ باب مفاعلہ کا مصدر ہے۔ جب تم کسی چیز کو اپنی آنکھوں سے دیکھو تو کہا جاتا ہے "وعاينت الشيء عياناً اذا رأيته بعينك"[۵] اور وقت احتضار ووقت موت کو معاینہ کہا جاتا ہے کہ اس عالم (آخرت) کے آثار کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے اور چشم غیبی ملکوتی کھل جاتی ہے اور ملکوت کے کچھ آثار اس پر منکشف ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے بعض آثار وعمال وحور کا معاینہ کر لیتا ہے۔

حدیث شریف کی جو چیزیں محتاج ذکر ہیں ان کو میں مناسب طور سے چند فصلوں میں ذکر کروں گا اور خدا ہی پر بھروسہ ہے۔

پہلی فصل

لقاء اللہ اور اس کی کیفیت

لقاء اللہ کے سلسلے میں آیات و احادیث خواہ صراحت کے ساتھ ہوں یا بطور اشارہ و کنایہ آئی ہوں بکثرت ہیں، اس مختصری کتاب میں ان کے تفصیلی ذکر کی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ اختصار کے ساتھ میں ان کی طرف اشارہ کروں گا۔ ہاں! اگر کسی کو تفصیل کی ضرورت ہو تو مرحوم عارف باللہ الحاج میرزا جواد تبریزی ؒ کے رسالہ "لقاء اللہ" کی طرف رجوع کرے جس کے اندر کافی حد تک روایت کو جمع کر دیا گیا ہے۔

بعض علماء مفسرین نے "لقاء اللہ" کا راستہ بالکل بند کرتے ہوئے تمام مشاہدات عینیہ وتجلیات ذاتیہ

واسمائیہ کا انکار کردیا ہے اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ ذات خدا منزہ ہے "لقاء اللہ" کے سلسلے کی تمام آیات وروایات کو یوم آخرت کے لقاء اور روز ثواب وجزا و سزا پر حمل کیا ہے اور یہ حمل اگرچہ مطلق لقاء اور بعض آیت واخبار کے لحاظ سے بعید نہیں ہے، لیکن بعض معتبر دعاؤں اور معتبر کتابوں میں مذکور روایتوں اور بعض مشہور قسم کی ان روایتوں کی بنیاد پر جن سے بڑے بڑے علما نے استشہاد کیا ہے۔ البتہ یہ بعید اور سست عمل ہے۔

آپ یہ جان لیجئے کہ جن علما نے لقاء اللہ اور مشاہدۂ جلال وجمال الٰہی کے راستے کو بند نہیں کیا ہے ان کا مطلب (ہرگز) یہ نہیں ہے کہ کنہ ذات کا ادراک ممکن ہے یا علم حضوری اور مشاہدۂ یقینی روحانی کے ذریعے ذات محیط علی الاطلاق کا احاطہ ممکن ہے، بلکہ علم کلی اور فکری بنیادوں پر نیز عرفان شہودی اور بصیرت کی روشنی میں اس کا ناممکن ہونا ایک امر برہانی ہے جو عقلاء اور ارباب معارف وقلوب کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ جو حضرات لقاء اللہ کے دعویدار ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ تقوائے تام وتمام اور قلب کا تمام عوالم سے مکمل طور پر ناطہ توڑنے اور دونوں نشاتوں کو خیرباد کہنے سے، نیز انیت وانانیت کو چھوڑنے اور خدا کے اسماء وصفات کی طرف توجہ کلی اور توجہ تام کرنے اور عشق وحب ذات الٰہی میں غرق ہونے کے بعد، نیز قلبی ریاضتوں کے بعد سالک کیلئے دل کی پاکیزگی کی ایسی حالت حاصل ہوجاتی ہے جو تجلیات اسمائیہ وصفاتیہ کا مورد بن جاتی ہے اور (پھر) اسماء وصفت اور بندے کے درمیان جو سونے اور تاریک حجاب ہوتے ہیں وہ پھٹ (یا ہٹ) جاتے ہیں اور بندہ بارگاہ قدس وجلال الٰہی سے متعلق ہوجاتا اور تعلق تام ذاتی پیدا کرلیتا ہے۔ اس حالت میں پہنچ کر سالک کی روح مقدس اور خدا کے درمیان سوائے اسماء وصفات کے کوئی حجاب باقی نہیں رہتا۔

اور بعض ارباب سلوک کیلئے تو یہ بھی ممکن ہے کہ حجاب نوری اسمائی وصفاتی بھی ختم ہوجائے اور وہ تجلیات ذاتی غیبی حاصل کرلے اور خود کو ذات مقدس سے متعلق دیکھنے لگے اور اس مشاہدے میں خدا کے حاطہ قیومی اور اپنے فنائے ذاتی کا مشاہدہ کرے اور اپنی نظروں سے اپنے اور تمام مخلوقات کے وجود کو حق تعالیٰ کا سایہ سمجھنے لگے۔ چنانچہ دلیل سے ثابت ہے کہ خدا اور مخلوق اول کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہے جو تمام مواد اور رشتوں سے عاری ہے، بلکہ برہانی طور پر تمام مجردات کیلئے (بھی) کوئی حجاب نہیں ہے۔ اسی طرح یہ قلب (سالک) جس کی وسعت مجرد مخلوقات پر محیط ہوچکی ہے، بلکہ ان کے سروں پر پیر رکھ چکا ہے اس کے اور حق کے درمیان کوئی حجاب نہیں رہے گا۔ چنانچہ کافی اور توحید کی حدیث شریف میں ہے

﴿إنَّ رُوحَ الْمُؤمِنِ لَأَشَدُّ اتِّصَالاً بِرُوحِ اللهِ مِنِ اتِّصَالِ شُعَاعِ الشَّمْسِ بِهَا﴾ ۷ "سورج کی شعاعیں جس طرح سورج سے متصل ہوتی ہیں اس سے کہیں زیادہ شدید، اتصال مؤمن کی روح اور خدا کی روح میں ہوتا ہے"۔

مناجات شعبانیہ میں ہے جو علما کی نظر میں مقبول ہے اور اس کے کلمات گواہی دیتے ہیں کہ یہ معصومؑ کا کلام ہے

﴿الهي! هَبْ لي كَمَالَ الانْقِطَاعِ اِلَيْكَ، وَانِرْ اَبْصَارَ قُلُوبِنَا بِضِيَاءِ نَظَرِهَا اِلَيْكَ حَتّى تَخْرِقَ اَبْصَارُ الْقُلُوبِ حُجُبَ النُّورِ فَتَصِلَ اِلى مَعْدِنِ الْعَظَمَةِ، وَتَصِيرَ اَرْوَاحُنَا مُعَلَّقَةً بِعِزِّ قُدْسِكَ. الهي! وَاجْعَلْنِي مِمَّنْ نَادَيْتَهُ فَاَجَابَكَ وَلَاحَظْتَهُ فَصَعِقَ لِجَلَالِكَ فَنَاجَيْتَهُ سِرّاً وَعَمِلَ لَكَ جَهْراً﴾ ۸

"خدایا! مجھے اپنی طرف مکمل انقطاع عطا کر، ہمارے دل کی آنکھوں کو اپنے دیدار کے نور سے منور کر دے تا کہ دلوں کی آنکھیں حجب ہائے نور کو چاک کر دیں اور معدن عظمت تک پہنچ جائیں اور ہماری ارواح تیری بارگاہ قدس سے معلق ہو جائیں۔ پروردگارا! مجھے ان لوگوں میں قرار دے جن کو تو نے (جب بھی) پکارا تو انہوں نے جواب دیا اور (جب) تو نے ان کی طرف دیکھا، تیرے جلال کو دیکھ کر بے ہوش ہو گئے۔ پس تو نے اس سے سرگوشی کی اور اس نے تیرے لئے عمل کیا"۔

قرآن مجید میں معراج کے سلسلے میں ﴿ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى﴾ ۹ "پھر وہ سیدھا کھڑا ہوا پھر قریب ہوا۔ پس دو کمان یا اس سے بھی کم کا فاصلہ رہ گیا" اور یہ مشاہدۂ حضوریہ فنائیہ نہ تو عدم حصول کنہ ذات اور عدم احاطۂ ذات کے برہان سے اور نہ ہی اخبار و آیات سے منافات رکھتا ہے، بلکہ یہ آیات و احادیث کا مؤید و مؤکد ہے۔

اب آپ فیصلہ کیجئے کہ اس قسم کے بعید اور ہلکے تصور سے کیا فائدہ ہے؟ کیا حضرت علیؑ کے اس قول کو ﴿فَهَبْنِي صَبَرْتُ عَلٰى عَذَابِكَ، فَكَيْفَ اَصْبِرُ عَلٰى فِرَاقِكَ﴾ ۱۰ "تو فرض کر لے کہ تیرے عذاب پر صبر کروں گا لیکن تیرے فراق پر کیونکر صبر کر سکتا ہوں؟" اور اولیا کے سوز و گداز کو (محض) حور و قصور (کا لالچ) متصور کیا جا سکتا ہے؟ کیا جو فرماتے تھے: "میں خدا کی عبادت نہ شوق بہشت میں کرتا ہوں نہ خوف دوزخ سے، بلکہ آزاد لوگوں کی طرح اور صرف خدا کیلئے عبادت کرتا ہوں" اور پھر ان کے فراق کے

نالوں کو فراق بہشت اور کھانے پینے کی اشیا اور نفسانی خواہشات تک رسائی متصور کیا جا سکتا ہے؟ افسوس یہ نہایت بیہودہ بات اور غلط تصور ہے۔ کیا شب معراج میں جمال حق کی تجلیات اور اس محفل کو جس میں کسی اور مخلوق کی موجودگی تو در کنار، بلکہ امین وحیؑ جیسا محرم اسرار بھی موجود نہ تھا (اس کے بارے میں یہ) کہا جا سکتا ہے کہ صرف بہشت اور اس کے بہترین محلوں کو دکھانا اور صرف انوار عظمت و جمال اور نعمتوں کی نمائش مقصود تھی؟ کیا جو تجلیات معتبر دعاؤں میں موجود ہیں اور انبیاءؑ کو دکھایا گیا ہے وہ صرف نعمتوں، کھانے پینے کی اشیا، باغات اور محلات سے عبارت تھیں؟

افسوس (یہ ہے کہ) ہم بے چارے لوگ طبیعت کے حجاب ظلمانی میں گرفتار ہیں، امیدوں اور آرزوؤں کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں، کھانے پینے، اور شادی جیسی چیزوں کے علاوہ کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ اگر کوئی صاحب نظر یا صاحب دل ان حجابوں سے پردہ اٹھانا چاہے تو ہم سوائے اس کو غلطی کے مرتکب اور خطاکار قرار دینے کے کچھ نہیں کر سکتے۔ اور جب تک ہم عالم ملک کے ظلمانی کنوئیں میں گرے ہوئے ہیں، صاحبان معارف و مشاہدات کی کسی چیز کا ادراک نہیں کر سکتے۔

لیکن میرے عزیز! اولیا کا اپنے اوپر قیاس نہ کرو۔ انبیاءؑ اور اہل معرفت کے بارے میں گمان نہ کرو کہ ان کے دل ہماری طرح کے ہیں۔ ہمارے دلوں پر تو یہ دنیا کا غبار اور نفسانی خواہشات کی (گرد) جمی ہوئی ہے۔ شہوتوں میں ڈوب جانے کی وجہ سے ہم کبھی تجلیات حق کا آئینہ نہیں بن سکتے اور نہ جلوۂ محبوب کے لائق ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس خود بینی و خود خواہی اور خود پرستی کی وجہ سے ہم جمال و جلال حق کی تجلیات کو نہیں سمجھ سکتے۔ (یہی نہیں) بلکہ اولیا اور اہل معرفت کے کلام کو جھٹلانے لگتے ہیں اور اگر بظاہر تکذیب نہ بھی کریں تو دل سے بہرحال جھٹلاتے ہیں اور اگر جھٹلانے کا کوئی راستہ نہ مل سکے، مثلاً ہم رسولؐ اور ائمہؑ کے قائل ہوں تو توجیہ و تاویل کے دروازے کھول دیتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ ہم معرفت خدا کا دروازہ ہی بند کر دیتے ہیں اور (مولا علیؑ کے قول:) ﴿ما رَأَيْتُ شَيْئاً إلّا وَرَأَيْتُ اللهَ مَعَهُ وَقَبْلَهُ وَفِيهِ﴾ [۲] ''میں نے کوئی ایسی چیز نہیں دیکھی کہ جس کے ساتھ یا اس سے پہلے یا اس کے بعد، خدا کو نہ دیکھا ہو'' کو رویت آثار تصور کرتے ہیں۔ نیز (آپؑ کے قول:) ﴿لَمْ أعْبُدْ رَبّاً لَمْ أرَهُ﴾ [۳] ''میں نے کبھی کسی ایسے خدا کی عبادت نہیں کی جس کو نہ دیکھا ہو'' کو مفاہیم کلیہ کے علم کی بنا پر اپنے علوم کی طرح تصور کرتے۔ لقاء اللہ والی آیتوں کو روز جزا کے لقاء پر حمل کرتے ہیں۔ ﴿لي مَعَ اللهِ حالَةٌ﴾ [۴]

کو مثلاً زمہدی کی حالت پر تصور کرتے ہیں۔ ﴿وارزقنی النظر الی وجھک الکریم﴾ ۱۵؎ "مجھے اپنے وجہ کریم پر نظر کرنے کی توفیق دے" اس کو اور درد فراق کے مارے دعا کے تمام سوز وگداز کو حور العین اور بہشتی پرندوں کے فراق پر حمل کرتے ہیں اور یہ سب صرف اس وجہ سے ہے کہ ہم اس میدان کے اہل نہیں ہیں۔ حیوانی وجسمانی خواہشات کی تسکین کے علاوہ ہمیں کچھ نہیں آتا۔ ہم تو سارے معارف کے منکر ہیں اور ان تمام بدبختیوں سے بڑا تو وہ انکار ہے جو تمام معارف کو ہمارے اوپر بند کردیتا اور ہم کو طلب سے روک دیتا ہے اور حیوانیت وبہیمیت کی حد پر قانع کردیتا ہے۔ عوالم غیب وانوار الہیہ سے ہم کو محروم کردیتا ہے۔ ہم بے چارے جو مشاہدات وتجلیات سے ایک دم محروم ہیں ان معانی پر ایمان رکھنے سے بھی دور ہیں جو خود کمال نفسانی کا ایک درجہ ہے اور ہم کو کسی منزل تک پہنچا سکتا ہے۔ مرتبۂ علم سے بھی ہم بھاگتے ہیں، حالانکہ وہ مشاہدات کا بیج بن سکتا ہے۔ اپنی آنکھوں اور کانوں کو مکمل طور پر بند کرلیتے اور غفلت کی روئی کانوں میں ٹھونس لیتے ہیں کہ کہیں حرف حق نہ سن لیں۔

اگر ہم عرفان وطریقت کے کسی مجذوب یا کسی دل جلے سالک یا کسی حکیم الٰہی سے کسی قسم کے حقائق کو سن لیتے ہیں تو چونکہ ہماری سماعت اس کو برداشت نہیں کرسکتی اور حب نفس اپنی غلطی کو ماننے پر تیار نہیں ہوتا اس لئے ہر طرح سے اس پر لعن طعن اور فسق وکفر کا الزام جائز سمجھتے ہیں۔ کوئی غیبت وتہمت ایسی نہیں ہے جو اس کے خلاف روا نہ رکھتے ہوں ہم کتاب وقف کرتے ہیں مگر اس سے استفادے کیلئے شرط لگادیتے ہیں کہ روزانہ سو مرتبہ مرحوم ملا فیض کاشانی" پر لعنت کی جائے ۱۶؎ جناب ملا صدرا" کو جو اہل توحید کے پیشوا ہیں، زندیق کہیں اور ان کے بارے میں کسی قسم کی بھی توہین سے باز نہ آئیں! موصوف کی کسی بھی کتاب سے ان کا تصوف کی طرف رجحان نہیں ثابت ہوتا، بلکہ انہوں نے ایک کتاب "کسر اصنام الجاہلیہ فی الرد علی الصوفیہ" بھی لکھی ہے لیکن اس کے باوجود ہم ان کو (منفی تصوف کے قائل) صوفی کہتے ہیں! جن لوگوں کی حالت معلوم ہے اور جو رسول "وائمہ" کی زبان سے ملعون کئے گئے ہیں ان کو چھوڑ دیتے ہیں مگر جو باصدائے رسا خدا اور رسول "وائمہ" پر ایمان لانے کا اعلان کرے، اس پر لعنت کرتے ہیں! میں خود جانتا ہوں کہ ان لعنتوں اور توہینوں سے ان حضرات کا کچھ نہ بگڑے گا، بلکہ ہوسکتا ہے یہ ان کے حسنات میں اضافہ اور بلندی درجات کا سبب بن جائیں، لیکن یہ باتیں خود ہمارے لئے مضر ہیں اور بہت ممکن ہے کہ ہمارے لئے سلب توفیق کا سبب بن جائیں۔

ہمارے شیخ عارف (روحی فداہ) کہا کرتے تھے کہ کسی بھی شخص پر یہاں تک کہ اس کافر پر بھی لعنت نہ کیا کرو جس کے بارے میں معلوم نہ ہو کہ وہ کس حالت میں دنیا سے منتقل ہوا ہے، کیونکہ ہوسکتا ہے مرتے وقت وہ ایمان لا یا ہو۔ ہاں! اگر کسی کے مرنے کے بعد معصومؑ خبر دے کہ کافر مرا ہے تو لعنت کر سکتے ہو، لہذا کلی طور پر لعنت کیا کرو۔

(اب ذرا سوچئے) ایک شخص ایسے نفس قدسی کا مالک ہے کہ جو اس شخص پر بھی لعنت کرنے کیلئے راضی نہیں ہے جو بظاہر کافر مرا ہو، کیونکہ ہوسکتا ہے وہ مرتے دم مؤمن ہو گیا ہو اور ایک ہم جیسا ہوتا ہے، خدا سے میری شکایت ہے! شہر کے اس واعظ کے بارے میں جو صاحب علم وفضل ہونے کے باوجود منبر سے علما اور فضلا کی محفل میں کہتا ہے ''فلاں شخص فلسفی ہونے کے باوجود قرآن بھی پڑھتا تھا''! یا ایسے ہی ہے کہ ہم کہنے لگیں ''فلاں، حالانکہ پیغمبر تھا مبدأ و معاد پر بھی عقیدہ رکھتا تھا...'' میں خود بھی محض علم پر زیادہ عقیدہ نہیں رکھتا اور جو علم ایمان نہ پیدا کر سکے اس کو میں حجاب اکبر جانتا ہوں، لیکن جب آدمی حجاب میں داخل نہ ہو حجاب پارہ نہیں ہوسکتا۔ علوم مشاہدات کیلئے بیج کی حیثیت رکھتے ہیں، اگرچہ یہ ممکن ہے کہ اصطلاحات وعلوم کے تجربات کے بغیر انسان کسی مقام تک پہنچ جائے مگر یہ عام ڈگر سے ہٹ کر اور فطری روایات کے خلاف ہوگا ایسا بہت کم ہوتا ہے۔

لہذا رضائے الہی کے حصول اور جستجوئے خدا کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے ابتدائی اوقات کو ذکر حق میں صرف کرے اور خدا اسماء وصفات کا علم عام طریقے سے مشائخ کی خدمت میں حاصل کرے۔ اس کے بعد معارف کے علمی عملی ریاضتوں کو اپنے دل میں جگہ دے اس طرح نتیجہ حاصل ہوسکتا ہے اور اگر اہل صلاح نہیں ہے تو پھر ذکر محبوب کے علاوہ دل اور حال کو اس ذات مقدس میں مصروف رکھنے کے ذریعے بھی نتیجہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ البتہ یہ قلبی مصروفیت اور باطنی توجہ اس کی ہدایت کا سبب ہوگا اور خدا اس کی دستگیری فرمائے گا اور حجابات کے پردوں میں سے کسی حجب کو برطرف کردے گا اور وہ بھی اس عامیانہ انکار سے قدرے حذر کرے گا اور ہوسکتا ہے کہ پروردگار عالم کی خاص عنایت سے اس کیلئے معرفت کا راستہ پیدا ہو جائے۔

﴿اِنَّہٗ وَلِیُّ النِّعَم﴾

دوسری فصل

مرتے وقت بعض غیبی حالات کا انکشاف ممکن ہے

اس حدیث شریف سے پتہ چلتا ہے کہ مرتے وقت انسان پر اس کے بعض احوال ومقامات منکشف ہوجاتے ہیں اور یہ بات برہان اور احادیث کے مطابق، نیز اصحاب کشف وعیان کے مکاشفات کے موافق ہے۔ انسان جب تک اس دنیا کی آبادکاری میں لگا ہوا ہے اور اس کی قلبی توجہ اس مقام کی طرف ہے اور نشے دنیا نے اس کو مدہوش کر دیا ہے، شہوت وغضب کی نشہ آور چیزیں اس کو نشہ میں مبتلا کئے رکھتی ہیں اور وہ اپنے اعمال واخلاق کی صورتوں سے بالکل محجوب ہے اور اس کے ملکوت قلب میں ان کے آثار متروک ہیں۔ لیکن جب موت کی سختیاں اور اس کا دباؤ پڑے گا تو ایک حد تک نشہ اتر جائے گا اور اگر (مرنے والا) مومن اور اہل یقین سے ہے مگر اس کا قلب ان عوالم کی طرف متوجہ تھا تو آخر الامر طبعی طور سے اس کی قلبی توجہ اس عالم کی طرف ہوجائے گی اور روحانی طور پر رہنمائی کرنے والے اور اس پر موکل فرشتے اس کو اس عالم کی طرف لے جائیں گے اور وہ اس رہنمائی اور پلٹنے کے بعد عالم برزخ کے ایک نمونے کا مشاہدہ کرے گا، عالم غیب سے ایک دریچہ اس کی طرف کھول دیا جائے گا اور وہ ایک حد تک اپنی حالت اور اپنے مقام کا مشاہدہ کرے گا۔

چنانچہ حضرت علیؑ سے منقول ہے:

إِنَّهُ قَالَ: ﴿حَرَامٌ عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ اَنْ تَخْرُجَ مِنَ الدُّنْيَا حَتَّىٰ تَعْلَمَ اَنَّهُ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ هِيَ اَمْ مِنْ اَهْلِ النَّـــارِ﴾ بیع ''ہر نفس جب تک یہ نہ جان لے کہ وہ اہل جنت سے ہے یا اہل جہنم سے اس کا اس دنیا سے نکلنا حرام ہے''۔

اس مقام پر ایک حدیث شریف ہے اگرچہ لمبی ہے لیکن اس میں ولایت حضرت مولی امیر المومنینؑ اور اہل بیت عصمتؑ سے تمسک رکھنے والوں کیلئے خوشخبری ہے، اس لئے میں پوری حدیث کو ذکر کرتا ہوں۔ اس حدیث کو فیض کاشانیؒ نے اپنی کتاب ''علم الیقین'' میں لکھا ہے

وفي كتاب الْحُسَيْنِ بْنِ سَعِيد الأَهْوَازِيِّ، عَنْ عَبَّادِ بْنِ مَرْوَانَ، قَالَ سَمِعْتُ اَبَا عَبْدِاللهِ عليه السلام يَقُولُ ﴿مِنْكُمْ وَاللهِ يُقْبَلُ وَلَكُمْ وَاللهِ يُغْفَرُ، اِنَّهُ لَيْسَ بَيْنَ اَحَدِكُمْ وَبَيْنَ اَنْ يَغْتَبِطَ وَيَرَى السُّرُورَ وَقُرَّةَ الْعَيْنِ اِلَّا اَنْ يَبْلُغَ نَفْسُهُ هٰهُنَا وَاَوْمَى بِيَدِهِ اِلَى حَلْقِهِ

ثُمَّ قَالَ عليه السلام: فَإِذَا كَانَ ذَلِكَ وَاحْتَضَرَ حَضَرَهُ رَسُولُ اللّهِ صلى الله عليه وآله وَعَلِيٌّ وَالأَئِمَّةُ وَجَبْرَئِيلُ وَمِيكَائِيلُ وَمَلَكُ الْمَوْتِ، عَلَيْهِمُ السَّلَامُ؛

فَيَدْنُو مِنْهُ جَبْرَئِيلُ عليه السلام فَيَقُولُ لِرَسُولِ اللّهِ صلى الله عليه وآله: إِنَّ هَذَا كَانَ يُحِبُّكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ، فَأَحِبَّهُ. فَيَقُولُ رَسُولُ اللّهِ صلى الله عليه وآله: يَا جَبْرَئِيلُ إِنَّ هَذَا كَانَ يُحِبُّ اللّهَ وَرَسُولَهُ وَأَهْلَ بَيْتِهِ، فَأَحِبَّهُ. فَيَقُولُ جَبْرَئِيلُ: يَا مَلَكَ الْمَوْتِ إِنَّ هَذَا كَانَ يُحِبُّ اللّهَ وَرَسُولَهُ وَآلَ رَسُولِهِ، فَأَحِبَّهُ وَارْفُقْ بِهِ؛

فَيَدْنُو مِنْهُ مَلَكُ الْمَوْتِ عليه السلام فَيَقُولُ: يَا عَبْدَ اللّهِ أَخَذْتَ فَكَاكَ رَقَبَتِكَ؟ أَخَذْتَ أَمَانَ بَرَاءَتِكَ؟ تَمَسَّكْتَ بِالْعِصْمَةِ الْكُبْرَى فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا؟ فَيُوَفِّقُهُ اللّهُ فَيَقُولُ: نَعَمْ. فَيَقُولُ لَهُ: وَمَا ذَاكَ؟ فَيَقُولُ: وَلَايَةُ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ عليه السلام. فَيَقُولُ: صَدَقْتَ، أَمَّا الَّذِي كُنْتَ تَحْذَرُ فَقَدْ آمَنَكَ اللّهُ، وَأَمَّا الَّذِي كُنْتَ تَرْجُو فَقَدْ أَدْرَكْتَهُ، أَبْشِرْ بِالسَّلَفِ الصَّالِحِ، مُرَافَقَةِ رَسُولِ اللّهِ صلى الله عليه وآله وَعَلِيٍّ وَالأَئِمَّةِ مِنْ وُلْدِهِ، عَلَيْهِمُ السَّلَامُ؛

ثُمَّ يَسُلُّ نَفْسَهُ سَلًّا رَفِيقاً، ثُمَّ يَنْزِلُ بِكَفَنِهِ مِنَ الْجَنَّةِ وَحَنُوطِهِ حَنُوطٌ كَالْمِسْكِ الأَذْفَرِ فَيُكَفَّنُ بِذَلِكَ الْكَفَنِ وَيُحَنَّطُ بِذَلِكَ الْحَنُوطِ، ثُمَّ يُكْسَى حُلَّةً صَفْرَاءَ مِنْ حُلَلِ الْجَنَّةِ، فَإِذَا وُضِعَ فِي قَبْرِهِ، فُتِحَ لَهُ بَابٌ مِنْ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ، يَدْخُلُ عَلَيْهِ مِنْ رَوْحِهَا وَرَيْحَانِهَا، ثُمَّ يُقَالُ لَهُ: نَمْ نَوْمَةَ الْعَرُوسِ عَلَى فِرَاشِهَا، أَبْشِرْ بِرَوْحٍ وَرَيْحَانٍ وَجَنَّةِ نَعِيمٍ وَرَبٍّ غَيْرِ غَضْبَانَ.

فَإِذَا حَضَرَ الْكَافِرَ الْوَفَاةُ، حَضَرَهُ رَسُولُ اللّهِ صلى الله عليه وآله وَعَلِيٌّ وَالأَئِمَّةُ وَجَبْرَئِيلُ وَمِيكَائِيلُ وَمَلَكُ الْمَوْتِ، عَلَيْهِمُ السَّلَامُ؛

فَيَدْنُو مِنْهُ جَبْرَئِيلُ فَيَقُولُ: يَا رَسُولَ اللّهِ إِنَّ هَذَا كَانَ مُبْغِضاً لَكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ، فَأَبْغِضْهُ. فَيَقُولُ رَسُولُ اللّهِ صلى الله عليه وآله: يَا جَبْرَئِيلُ إِنَّ هَذَا كَانَ يُبْغِضُ اللّهَ وَرَسُولَهُ وَأَهْلَ بَيْتِ رَسُولِهِ، فَأَبْغِضْهُ. فَيَقُولُ جَبْرَئِيلُ: يَا مَلَكَ الْمَوْتِ إِنَّ هَذَا كَانَ يُبْغِضُ اللّهَ وَرَسُولَهُ وَأَهْلَ بَيْتِهِ، عَلَيْهِمُ السَّلَامُ فَأَبْغِضْهُ وَاعْنُفْ عَلَيْهِ؛

فَيَدْنُو مِنْهُ مَلَكُ الْمَوْتِ فَيَقُولُ: يَا عَبْدَ اللّهِ أَخَذْتَ فَكَاكَ رَقَبَتِكَ؟ أَخَذْتَ بَرَاءَةَ أَمَانِكَ؟ تَمَسَّكْتَ بِالْعِصْمَةِ الْكُبْرَى فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا؟ فَيَقُولُ: لَا. فَيَقُولُ لَهُ: أَبْشِرْ يَا عَدُوَّ اللّهِ بِسَخَطِ اللّهِ وَعَذَابِهِ وَالنَّارِ، أَمَّا الَّذِي كُنْتَ تَرْجُو، فَقَدْ فَاتَكَ، وَأَمَّا الَّذِي كُنْتَ تَحْذَرُ، فَقَدْ نَزَلَ بِكَ.

ثمّ یُسَلُّ نفسه سلاً عنیفاً، ثمّ یوکّل بروحه ثلاثمائة شیطان یبزقون في وجهه ویتأذّی بریحه فإذا وُضع في قبره فتح له باب من أبواب النار یدخل علیه من قیح ریحها ولهبها۔

راوی حدیث عباد بن مروان کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر صادقؑ کو سنا کہ فرما رہے تھے

"خدا کی قسم تم سے قبول کیا جائے گا، خدا کی قسم تم کو بخشا جائے گا۔ تمہارے اور تمہاری خوشیوں اور آنکھوں کی ٹھنڈک اور تمہارے بارے میں غبطہ کیے جانے کے درمیان صرف اتنا فاصلہ ہے کہ جان یہاں تک آ جائے (اور آپؑ نے اپنے حلق کی طرف اشارہ فرمایا)

اس کے بعد فرمایا جب ایسا ہوگا اور موت کا وقت آئے گا تو رسول خداؐ، حضرت علیؑ، ائمہؑ، جبرئیلؑ و میکائیلؑ اور ملک الموت مرنے والے کے پاس آئیں گے۔ جبرئیلؑ قریب ہو کر رسول خداؐ سے عرض کریں گے یہ شخص آپ کے اہل بیت سے مودت رکھتا تھا لہذا آپ بھی اس پر کرم کیجئے۔ (اس کے بعد) رسول خداؐ فرمائیں گے اے جبرئیلؑ! یہ شخص خدا اور رسولؐ اور اس کے اہل بیتؑ سے مودت رکھتا تھا لہذا تم بھی اس کو دوست رکھو۔ پھر جبرئیلؑ کہیں گے اے ملک الموت! یہ شخص خدا و رسول اور آل رسولؑ سے مودت رکھتا تھا لہذا تم اس کو دوست رکھو اور اس کے ساتھ نرمی برتو۔

پھر ملک الموت مرنے والے کے قریب جا کر کہیں گے، اے بندۂ خدا! کیا تو نے اپنی آزادی کا پروانہ اور امان نامہ حاصل کر لیا ہے؟ کیا تم نے اپنی دنیوی زندگی میں عصمت کبریٰ سے تمسک کیا ہے؟ اس وقت خدا اس بندے کو توفیق دے گا اور وہ (بندہ) کہے گا ہاں! اس وقت ملک الموت کہیں گے وہ کیا ہے؟ وہ جواب دے گا حضرت علیؑ کی ولایت۔ تب ملک الموت کہیں گے تم نے سچ کہا، جس چیز کا تم کو خوف تھا اس سے خدا نے تم کو امان دے دیا اور جس چیز کی آرزو تھی وہ تم کو مل گئی۔ تم کو گزرے ہوئے نیک لوگوں حضرت رسولؐ، حضرت علیؑ اور ان کی اولاد سے ہونے والے ائمہؑ کی رفاقت مبارک ہو۔ اس کے بعد ملک الموت بڑی نرمی سے اس کی روح نکالیں گے اور اس کیلئے بہشت سے کفن لایا جائے گا اور اس کا حنوط خوشبودار مشک کی طرح کا ہوگا۔ پھر وہی جنتی کفن اس کو پہنایا جائے گا اور اس خوشبودار حنوط سے اس کو حنوط کیا جائے گا۔ اس کے بعد جنت کی صنعتوں میں سے زرد خلعت اس کو پہنایا جائے اور قبر میں رکھنے کے بعد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ اس کیلئے کھول دیا جائے گا جس سے جنت کی خوشبو اور مسرت

اس کو پہنچتی رہے گی۔ پھر اس سے کہا جائے گا: جس طرح دلہن اپنے بستر پر سوتی ہے تو بھی اسی طرح سو۔ تجھے مسرت وخوشبو، جنت نعیم اور اس خدا کی بشارت ہو جو تم سے ناراض نہیں ہو گا۔

(اس کے بعد) امام جعفر صادقؑ نے فرمایا اور جب کافر مرنے لگتا ہے تب (بھی) رسول خداؐ، حضرت علیؑ، ائمہ معصومینؑ، جبرئیل ومیکائیلؑ اور ملک الموت اس کے پاس آتے ہیں اور جبرئیلؑ مرنے والے کے قریب جا کر رسول خداؐ سے کہتے ہیں اے خدا کے رسول! یہ شخص آپؐ اور اہل بیتؑ کا دشمن تھا لہذا آپ اس سے دشمنی کریں۔ (پھر) رسول خداؐ فرمائیں گے اے جبرئیل! یہ شخص خدا اور رسولؐ اور اہل بیت رسولؐ کا دشمن تھا لہذا تم اس کو دشمن رکھو۔ پھر جبرئیلؑ کہیں گے: اے ملک الموت! یہ شخص خدا، رسولؐ اور آل رسولؐ کا دشمن تھا لہذا اس سے بغض رکھو اور اس کے ساتھ سختی کرو۔

تب ملک الموت مرنے والے کے قریب آ کر کہیں گے. اے خدا کے بندے! کیا تو نے جہنم سے چھٹکارے کی سند اور امان نامہ حاصل کر لیا ہے؟ کیا تو نے اپنی دنیاوی زندگی میں عصمت کبریٰ سے تمسک حاصل کیا ہے؟ وہ کہے گا. نہیں۔ تو ملک الموت کہیں گے. اے دشمن خدا! تجھے خدا کی ناراضگی اور اس کے عذاب اور جہنم کی بشارت ہو۔ جس چیز کی تو تمنا رکھتا تھا وہ تو تجھ سے فوت ہو گئی اور جس سے تو ڈرتا تھا وہ تیرے پاس پہنچ گئی۔ پھر بڑی سختی سے اس کی روح نکالیں گے۔ اس کے بعد اس کی روح پر تین سو شیطان معین کر دیئے جائیں گے جو اس کے منہ پر تھوکیں گے اور (لوگوں کو) اس سے اذیت ہو گی اور جب اس کو قبر میں لٹا دیا جائے گا تو جہنم کے دروازوں میں سے ایک دروازہ اس کیلئے کھول دیا جائے گا جس کے ذریعے دوزخ کی ہوا اور اس کے شعلے اس پر داخل ہوتے رہیں گے"۔

یہ سمجھ لیجئے کہ ہر شخص کیلئے برزخ اس کی قیامت کا نمونہ ہو گا اور برزخ سے مراد، دنیا اور قیامت کے درمیان کا عالم ہے۔ جہنم یا بہشت کی ایک کھڑکی اس میں کھلتی ہے۔ چنانچہ اس حدیث شریف کے ذیل میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اس مشہور حدیث نبویؐ میں بھی اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: ﴿اَلْقَبْرُ اِمَّا رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ اَوْ حُفْرَةٌ مِنْ حُفَرِ النِّيْرَانِ﴾ ۲۳ "قبر یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہو گی یا جہنم کے کنوؤں میں سے ایک کنواں"۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان مرتے وقت اپنے اعمال کے اثرات اور صورتوں کا مشاہدہ کرتا اور ملک الموت سے جنت یا نار کی خبر سن لیتا ہے اور ایک حد تک یہ اثرات اس پر منکشف ہو جاتے ہیں سو وہ اثرات جو

اعمال وافعال سے قلب میں حاصل ہوتے ہیں، (مثلاً) نورانیت، فراخ دلی، وسعت وغیرہ یا ان کے اضداد جیسے کدورت، سینے کی تنگی، ظلمت، فشار وغیرہ۔

پس معاینۂ برزخ کے وقت سے دل نجات لطیفہ ولطیفۂ جمالیہ کیلئے آمادہ ہو جاتا ہے اور اس کے اندر لطف وجمال کے آثار تجلیات ظاہر ہو جاتے ہیں، بشرطیکہ وہ اہل سعادت واہل ایمان سے رہا ہو۔ پس اسی وقت سے دل میں لقاء اللہ کی محبت پیدا ہو جاتی ہے اور جمال محبوب کے شوق دیدار کی آگ اس کے دل میں بھڑک اٹھتی ہے۔ اگر وہ نیکیوں میں آگے اور محبت وجذبہ ربوبی کا مالک ہو تو خدا کے علاوہ کسی کو نہیں معلوم کہ اس تجلی وشوق میں کیا لذت اور کیا کرامت ہے۔

مرنے والا اگر اہل ایمان اور صاحب عمل صالح ہوتا ہے تو اس کے ایمان واعمال کے مطابق خداوند عالم کی کرامتیں اس کو نصیب ہوتی ہیں اور وہ مرتے وقت ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، اسی لئے اس کے اندر موت کا اور کرامات الٰہی کے ملنے کا (شدید) شوق پیدا ہوتا ہے اور وہ راحت وآرام، خوشی اور مسرت کے ساتھ اس دنیا سے منتقل ہوتا ہے۔ اس خوشی ومسرت کی لذت اور ان کرامتوں کے دیکھنے کی طاقت دنیوی آنکھوں میں اور دنیاوی لذتوں میں نہیں ہے۔

اور اگر مرنے والا اہل شقاوت وای داور کفر ونفاق سے تھا اور وہ برے اعمال وافعال کا مرتکب ہوتا رہا تھا تو ہر شخص اپنے حساب سے اور اپنے اعمال کے مطابق غضب وقہر الٰہی کا مستحق ہوگا اور بطور نمونہ دار الشقی اس کیلئے منکشف ہوگا اور اس کے اندر ایسی وحشت اور ایسا انقلاب پیدا ہوگا کہ تجلیات جلالیہ وقہریۂ الٰہی سے زیادہ کوئی بھی شئے اس کے نزدیک مبغوض نہ ہوگی اور اس بغض وعداوت کی وجہ سے اس پر ایسی سختی وفشار اور ایسی ظلمت وعذاب ہوگا جس کا اندازہ خدا کے علاوہ کسی کو نہیں ہو سکتا مگر یہ ان لوگوں کیلئے ہے جو اس دنیا میں کافر ومنافق ور خدا اور اولیائے خدا کے دشمن رہے ہوں گے۔ خطاکاروں ور بڑے گناہوں کے مرتکب ہونے والوں کیلئے ان کے اعمال کے مطابق جہنم کا نمونہ پیش کیا جائے گا ور اس وقت ان کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض چیز اس دنیا سے منتقل ہونا ہوگا۔ ایسے لوگوں کو بڑی سختی، فشار اور زحمت کے ساتھ منتقل کیا جائے گا اور ان کے دلوں میں ایسی حسرت ہوگی جس کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ احتضار (موت) کے وقت انسان ان تمام چیزوں کو دیکھے گا جو اس میں تھیں اور وہ ان پر مطلع نہیں تھا اور ان مشاہدات کا بیج اس نے اپنی مملکت وجود میں خود بویا تھا۔ ہماری خامیوں کے

سامنے زندگانی دنیا ایک پردہ پوشی تھی اور ہمارے گناہوں کیلئے یہ دنیا اہل معرفت کی نظر میں پردہ تھی۔ جب یہ پردہ اٹھ گیا اور یہ حجاب ہٹ گیا تو انسان کے اندر جو کچھ بھی تھا اور اس نے جو کچھ مہیا کیا تھا سب کو بطور نمونہ اس نے دیکھ لیا۔ دوسری دنیا میں انسان اسی عذاب اور عقاب کو دیکھے گا جس کو اس نے خود اس دنیا میں فراہم کیا ہے اور اس دنیا میں اس کے جتنے بھی اعمال صالح اور اخلاق حسنہ اور عقائد صحیحہ تھے دوسری دنیا میں ان دوسری کرامتوں کے ساتھ جو خدا نے اپنے فضل سے اس کے حوالے کیا ہے، اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔

تفسیر صافی میں آیہ شریفہ ﴿فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ﴾ ۴۳ ''جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہے وہ (اس کی جزا) پائے گا'' کے ذیل میں مجمع البیان کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے کہ حضرت علیؑ فرماتے تھے ﴿هِيَ أَحْكَمُ آيَةٍ فِي الْقُرْآنِ، وَكَانَ رَسُولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يُسَمِّيهَا الْجَامِعَةَ﴾ ۴۴ ''قرآن کے اندر یہ سب سے محکم آیت ہے اور رسول خداؐ اس آیت کو ''الجامعہ'' فرمایا کرتے تھے''۔

لہذا یہ جان لینا چاہئے کہ اگر ہم نے اس دنیا میں خدا اور اس کے اولیا سے محبت کی اور ان کی اطاعت کا طوق اپنی گردن میں پہن لیا اور قلب کی توجہ خدا کی طرف ہو گئی تو مرتے وقت عین حقیقت اپنی صورت جمیلہ کے ساتھ ہمارے سامنے ظاہر ہو گی اور اس کے برعکس اگر دلی توجہ دنیا کی طرف ہوئی اور دل حق سے منحرف ہو گیا تو ممکن ہے رفتہ رفتہ خدا اور اس کے اولیا کی دشمنی ہمارے دلوں میں پیدا ہو جائے اور مرتے وقت اس میں شدت پیدا ہو جائے اور وحشتناک اثرات اس سے ظاہر ہوں جیسا کہ آپ نے سنا۔

لہذا سب سے اہم بات یہ ہے کہ انسان پابندی کے ساتھ اپنے قلب کی توجہ کو خدا کی طرف موڑ لے اور خدا، اولیائے خدا اور دار کرامت کی طرف دلی توجہ پیدا کرے اور یہ حالت اس وقت حاصل ہو گی جب انسان خدا کی نعمتوں میں غور کرے اور اس کی اطاعت و عبادت پابندی سے کرے۔ لیکن انسان کو چاہئے کہ اپنے نفس اور اعمال پر کبھی بھروسہ نہ کرے اور ہر حالت میں خصوصاً خلوت میں خدا سے گڑگڑا کر دعا کرے کہ اپنی محبت اس کے دل میں ڈال دے اور اس کو نور معرفت اور اپنی محبت کی روشنی سے بھر دے اور دنیا و غیر خدا کی محبت اس کے دل سے نکال دے۔ یقیناً یہ دعا شروع میں بے مغز اور لقلقۂ زبانی ہو گی، کیونکہ دنیا سے شدید محبت کے بعد اس سے روگردانی کی خواہش بہت مشکل ہے۔ لیکن ایک مدت تک غور کرنے، دل کو سمجھانے اور پابندی کرنے سے محبت خدا کے اچھے نتائج اور محبت دنیا کے برے نتائج بطور حقیقت ظاہر ہو جائیں گے۔

انشاء اللہ

تیسری فصل: حب وبغض خدا کا مطلب

جان لو کہ محبت وبغض وغیرہ کی نسبت جو قرآن اور احادیث شریف میں خدا کی طرف دی گئی ہے وہ بمعنائے عرف عام نہیں ہے۔ اس سے کہ اس طرح کے صفات کا لازمہ نفسانی عذر ہے جو خدا کیلئے ناممکن ہے اور اس سلسلے میں تفصیل اس مختصر کتاب کیلئے مناسب نہیں ہے لہذا میں بعض اشارے پر قناعت کروں گا۔

یہ جان لینا چاہئے کہ بہت سے صفات اور حالتیں ایسی ہوتی ہیں جو عوالم غیبیہ تجردیہ سے تنزل کر کے نشئہ ملکیہ طبیعیہ میں آ کر آثار ولوازم کے اعتبار سے صور غیبیہ تجردیہ کے علاوہ دوسری (حالت اور صورت) اختیار کر لیتی ہیں۔ چنانچہ افلاطون اور اس کے ماننے والے تمام موجودات ملکیہ کو ارواح غیبیہ اور حقائق نازلہ ملکوتیہ کے مظاہر مانتے اور مُثُل افلاطونیہ کی طرح سمجھتے ہیں، اس بات کے بھی قائل ہیں کہ تمام وہ عوارض وکیفیات جو اس عالم میں بوجود عرضی موجود ہیں، اس عالم (آخرت) میں ان کی ذاتی تجلیات کی صورتیں، جوہر ان کے عین وجود کے ساتھ موجود ہوں گی۔ بنابریں ہم کہتے ہیں کہ ان اوصاف واحوال کی مثالیں جو عالم ملک میں ایک قسم کے تجدد وانفعال کے ساتھ عارضی طور سے پائی جاتی ہیں وہ عوالم غیبیہ اور نشآت تجردیہ میں خصوصاً عالم اسمائے الٰہی اور مقام واحدیت میں ایک ایسی صورت میں موجود ہیں جو تمام نقائص سے مبرا ومنزہ ہیں، اور ان کی تعبیرات بھی نشئہ تجردیہ یا صقع ربوبی (جگہ) کے اعتبار سے اس عالم کے برخلاف ہیں۔ مثلاً تجلیات رحمانیہ ورحیمیہ جس کو ہم تجلیات جمالیہ لطفیہ اور حبیہ ذاتیہ بھی کہتے ہیں، اگر اس عالم میں ظاہر ہوں تو محبت ورحمت وتلطف کی صورتیں نقص ہی کے ساتھ ہوں گی اور اس کی وجہ اس عالم کی شدید تنگ دامنی ہے۔ حدیث میں ہے کہ رحمت کے سو جزو ہیں ان میں سے ایک جزو اس عالم میں اتارا گیا اور اسی ایک جزو سے تمام وہ رحمتیں پیدا کی گئی ہیں جو اس عالم میں موجود ہیں[۲۵] جیسے والدین واولاد کی محبت ورحمت وغیرہ۔ قہری وجلالی تجلیات، تجلیات جلال سے رونما ہوتی اور اس دنیا میں بغض وغضب کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ باطنی محبت اور بغض وغضب اور رحمانیت وقہاریت سب تجلیات جلال وجمال کے کرشمے ہیں اور وہ تجلیات عین ذات کے ساتھ موجود ہیں، ان کے اندر کثرت تجدد اور انفعال کا کوئی سوال

ای نہیں ہے اور رحمانیت وقہاریت کا ظہور وہی محبت وبغض ہے جو اس عالم میں موجود ہیں اور چونکہ ظاہر میں مظہر فنا اور مظہر میں ظاہر متجلی ہیں، اس لئے بعض مقامات پر ایک کی تعبیر دوسرے سے کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ چنانچہ بندے سے خدا کے بغض کا مطلب اظہار قہاریت وانتقام ہے اور اس کی محبت کا مطلب اس کی رحمت وکرامت ہے۔

والله العالم

توضیحات (۲۸)

۱۔ فروع کافی، ج ۳، ص ۱۳۳، کتاب جنائز، باب مابین المومن والکافر حدیث ۱۲۔

۲۔ سورۂ فتح، آیت ۲۔

۳۔ مجمع البیان، ج ۹، ص ۱۲۹، طبرسی نے بھی اس قول کو ضعیف جانا ہے۔
بحار الانوار، ج ۶۸، ص ۲۵، کتاب ایمان و کفر، باب شکر، ذیل حدیث ۳۔

۴۔ حدیث ۲۱، ذیل شرح آیۂ فتح۔

۵۔ ترجمہ گزر چکا۔

۶۔ حاج میرزا جواد تبریزی (۱۳۴۳ھ) عظیم معاصر عالم دین، سالہا ملا حسین قلی ہمدانیؒ کی صحبت میں نجف اشرف میں رہے، تقریباً سن ۱۳۲۰ ھ ق میں تبریز واپس آئے اس کے بعد قم تشریف لائے۔ آپ کا گھر سالہا سال مجلس ذکر و موعظہ تھا۔ تہذیب و اخلاق میں ان کی گرانقدر کتابیں موجود ہیں، ان میں سے "رسالۂ لقاء اللہ"، "اسرار الصلوٰۃ"، "مراقبات فی اعمال السنۃ" قابل ذکر ہیں۔

۷۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۱۹۶، کتاب ایمان و کفر، باب اخوۃ المومنین، حدیث ۴۔

۸۔ مناجات شعبانیہ کا ایک حصہ، اقبال الاعمال، اعمال ماہ شعبان، مصباح المتہجد، ص ۳۷۴۔
بحار الانوار، ج ۹۱، ص ۹۷-۹۹، کتاب الذکر و دعاء، باب ۳۲، حدیث ۱۲

۹۔ سورۂ نجم، آیت ۸ و ۹۔

۱۰۔ حدیث ۱۹، حاشیہ ۳۹۔

۱۱۔ حدیث ۲، حاشیہ ۳۵۔

۱۲۔ سفار، ج ۲، ص ۱۱۷؛ علم الیقین، ج ۱، ص ۴۹ تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ۔ کلمات مکنونہ ص ۳

۱۳۔ علم الیقین، ج ۱، ص ۴۹، المقصد الاول فی تنزیہ جنابہ؛ توحید شیخ صدوقؒ، ص ۳۰۵، باب ۴۳، حدیث ۱

۱۴۔ حدیث ۲۷، حاشیہ ۲۶۔

۱۵۔ اسی قسم کی عبارت دعائے تجدید و پیغمبرؐ میں بھی آئی ہے

﴿اللّهمّ انّی اسئلک الرّضا بعد القضاء و برد العیش بعد الموت و لذّة النّظر الی وجهک الکریم﴾

احیاء العلوم، ج ۱، ص ۳۱۹۔

۱۶۔ محمد محسن بن شاہ مرتضیٰ (متوفی ۱۰۹۱ ھ ق) مشہور بہ فیض کاشانیؒ۔ آپ ۱۱ویں صدی ہجری کے مشہور محدث، فقیہ، عارف اور فلسفی تھے۔ آپ شیخ بہائیؒ، مولیٰ محمد صالحؒ، سید ہاشم بحرانیؒ اور ملا صدراؒ کے شاگرد تھے۔ ملا صدراؒ کے افکار و نظریات کا اثر ان کی تصانیف میں واضح ہے۔ علامہ مجلسیؒ، نعمت اللہ جزائریؒ، قاضی سعید قمیؒ اور آپؒ کے فرزند آپؒ کے شاگرد تھے۔ تقریباً ۲۰۰ تصانیف کی نسبت آپ کی طرف دی جاتی ہے جن میں تفسیر صافی، وافی در حدیث، المحجۃ البیضاء فی تہذیب الاحیاء، شافی، علم الیقین، الحقائق، کلمات مکنونہ اور اصول اصیلہ مشہور ہیں

۱۷۔ اس کتاب میں چار مقالے ہیں:

(۱) اول: مقدماتِ علم ربانی و معارفِ حقیقی و بطلان اعمالِ صوفیہ

(۲) دوم: غایتِ عباداتِ بدنی اور ریاضتِ نفسانی   سوم: ذکرِ ابرار   چہارم: حکمت پر مبنی مواعظ و نصائح۔

۱۸۔ خدا سے شکوہ کرنا چاہیے۔

۱۹۔ مرحوم مرزا علی اکبر حکیم کی مجلس ترحیم میں واعظ نے اس مطلب کو بیان کیا تھا۔ تفسیر سورۂ حمد، ص ۲، جلسۂ پنجم۔

۲۰۔ علم الیقین ج ۲، ص ۸۵۳، المقصد الرابع فی ذکر الموت

۲۱۔ علم الیقین، ج ۲، ص ۸۵۴ - ۸۵۶، المقصد الرابع فی ذکر الموت

فروعِ کافی ج ۳ ص ۱۳۱، کتاب الجنائز، باب ما یعاین المؤمن والکافر، حدیث ۴

۲۲۔ بحار الانوار، ج ۶، ص ۲۰۵، کتاب العدل والمعاد، باب ۸، احوال برزخ۔

۲۳۔ سورۂ زلزال آیت ۸، ۹۔

۲۴۔ تفسیر صافی، سورۂ زلزال، آیت کی تفسیر کے ذیل میں۔ اس حدیث کی نسبت "قیل" کی طرف دی گئی ہے اور مجمع البیان میں اسی آیت کی تفسیر کے ضمن میں عبداللہ ابن مسعودؓ سے نقل کیا گیا ہے

۲۵۔ یہ اس حدیث نبویؐ کی طرف اشارہ ہے جس کو المحجۃ البیضاء ج ۸ ص ۳۸۳ پر، کتاب ذکر الموت وما بعدہ، باب صفۃ الرحمۃ میں ذکر کیا گیا ہے۔ حدیث یہ ہے:

«إن لله تعالى مائة رحمة، أنزل منها رحمة واحدة بين الجنّ والإنس والطير والبهائم والهوامّ، فبها يتعاطفون وبها يتراحمون، وأخّر تسعة وتسعين رحمة يرحم الله بها عباده يوم القيامة»

انتیسویں حدیث

بالسّند المُتّصل الى أفضل المُحدّثين وأقدمهم مُحمّد بن يعقوب الكليني رضي الله عنه، عن مُحمّد بن يحيى، عن أحمد بن مُحمّد بن عيسى، عن عليّ بن النُّعمان، عن معاوية بن عمّارٍ قال: سمعتُ أبا عبد الله عليه السلام يقول:

﴿كان في وَصيّة النّبيّ صلّى الله عليه وآله لعليّ عليه السلام، أن قال: يا عليُّ أوصيك في نفسك بخصالٍ فاحفظها عنّي، ثُمّ قال: اللّهُمّ أعنهُ:

أمّا الأولى: فالصِّدق، ولا يخرُجنّ من فيك كذبةٌ أبداً.

والثّانيةُ: الورعُ، ولا تجترئ على خيانةٍ أبداً.

والثّالثةُ: الخوفُ من الله عزّ ذِكرُهُ كأنّك تراهُ.

والرّابعةُ: كثرةُ البُكاء من خشية الله تعالى، يُبنى لك بكُلّ دمعةٍ ألفُ بيتٍ في الجنّة.

والخامسةُ: بذلُك مالك ودمك دون دينك.

والسّادسةُ: الأخذُ بسُنّتي في صلاتي وصومي وصدقتي، أمّا الصّلاةُ فالخمسون ركعةً، وأمّا الصّيامُ فثلاثةُ أيامٍ في الشّهر، الخميسُ في أوّله والأربعاءُ في وسطه والخميسُ في آخره، وأمّا الصّدقةُ فجُهدُك حتّى تقول قد أسرفتُ ولم تُسرف.

وعليك بصلاة اللّيل، وعليك بصلاة اللّيل، وعليك بصلاة اللّيل، وعليك بصلاة الزّوال، وعليك بصلاة الزّوال، وعليك بصلاة الزّوال، وعليك بتلاوة القُرآن على كُلّ حالٍ، وعليك برفع يديك في صلاتك وتقليبهما، وعليك بالسّواك عند كُلّ وُضوءٍ، وعليك بمحاسن الأخلاق فارتكبها، ومساوئ الأخلاق فاجتنبها، فإن لم تفعل، فلا تلومنّ إلّا نفسك﴾.

ترجمہ ابن عمار کہتے ہیں: میں نے امام جعفر صادقؑ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ حضرت رسول خداؐ نے حضرت علیؑ کو اس طرح وصیت فرمائی تھی:

اے علی! میں تمہارے لئے چند باتوں کی وصیت کرتا ہوں، ان کو تم مجھ سے یاد کرلو۔ اس کے بعد فرمایا: خدایا! اس میں (تو علی کی) مدد کر!

اول سچ بولنا ہے، (اس لئے) تمہاری زبان سے کبھی بھی معمولی سا جھوٹ نہ نکلے۔

دوئم تقویٰ و پرہیزگاری ہے اور کبھی بھی خیانت نہ کرو۔

سوئم: خدا سے اس طرح ڈرو جیسے تم اس کو دیکھ رہے ہو۔

چہارم، خوف خدا میں گریہ کرو (کیونکہ) ہر آنسو کے بدلے، جنت میں تمہارے لئے ہزار گھر بنائے جائیں گے۔

پنجم: اپنے دین کی حفاظت کیلئے اپنا مال اور اپنی (جان) تک دیدو۔

ششم میری سنت پر عمل کرو۔ میری نماز، میرے روزے، میرے صدقے (میں میری پیروی کرو)، نماز پچاس رکعت (پڑھو) اور روزہ ہر ماہ میں تین دن، پہلی جمعرات، وسطی بدھ اور آخری جمعرات کو (رکھو) اور اپنی استطاعت کے مطابق صدقہ دو یہاں تک کہ تم کہنے لگو کہ میں نے اسراف کیا حالانکہ تم نے اسراف نہیں کیا ہے۔ نماز شب ضرور پڑھو، نماز شب لازمی طور سے پڑھو، نماز شب حتمی طور سے پڑھو اور نماز ظہر کی پابندی کرو، نماز ظہر پابندی سے پڑھو، نماز ظہر کی پابندی کرو اور ہر حالت میں قرآن کی تلاوت کرو اور تمہارے لئے نماز میں دونوں ہاتھوں کا اٹھانا اور گرانا ضروری ہے۔ ہر وضو کے وقت مسواک کرنا بھی ضروری ہے محاسن خلاق کے پابند رہو اور ان پر عمل کرو اور برے اخلاق (کے ارتکاب سے) احتراز کرو اور ان سے بچو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اپنے ہی نفس کو ملامت کرنا۔

شرح "خصال" "خصلت" کی جمع ہے اس کے معنی "عادت" کے ہیں، جیسا کہ صحاح میں ہے۔ اس لئے اس کا استعمال مطلق افعال و اخلاق میں مجاز ہے، جیسا کہ اس حدیث شریف میں اور اس کے علاوہ دوسری احادیث میں وارد ہے اور ممکن ہے کہ خصلت، عادت سے اعم ہو (اگر ایسا ہے تو پھر) اس طرح کے مواقع پر اس کا استعمال حقیقی معنوں میں ہوگا۔

"لورع، ورع، یرع" کا مصدر ہے اور اس کے معنی تقویٰ یا شدت تقویٰ اور کمال پرہیزگاری کے

ہیں اور ممکن ہے کہ یہ "وَزَعْتُهُ فَتوَرَّعَ" سے ماخوذ ہو، جس کے معنی "كَفَفْتُهُ" (میں نے اسے روکا) کے ہیں، کیونکہ حقیقت میں ورع کے معنی نفس کو شرع وعقل کے حدود کی خلاف ورزی کرنے سے روکنا اور اس کی حفاظت کرنا ہے یا پھر "وَزَعَ" بمعنی "رَدَّ" (منع کیا) سے ماخوذ ہے، چنانچہ "وَزَعْتُ الإبِلَ عَنِ المَاءِ" اس وقت کہتے ہیں جب اونٹ کو پانی سے روک دیا جائے اور چونکہ انسان نفس کو خواہشات نفسانی سے روکتا ہے لہذا اس کو ورع سے تعبیر کرتے ہیں۔

"لاتَسْتَجْرِئ" یہ باب استفعال سے ہے اور اس کے معنی، جسارت وشجاعت اور امور آخرت میں اقدام کرنے کے ہیں۔ الصحاح میں ابوزید سے منقول ہے: "الجُرْأَةُ مِثالُ الجُرْعةِ الشَّجاعةُ" جرأت، جرعہ کی طرح ہے اور اس کے معنی، شجاعت ہے اور خود صحاح میں ہے "الجَرِيءُ المِقْدامُ" (جری اقدام کرنے والا)۔

"فَيُجْهِدُكَ" جیم کو ضم اور فتحہ دونوں سے پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کے معنی، طاقت ومشقت کے ہیں، کہا جاتا ہے: "جَهَدَ دابَّتَهُ وَ اَجْهَدَها" یہ جملہ اس وقت بولتے ہیں جب جانور کو اس کی طاقت سے زیادہ چلایا جائے اور "جهد" سنجیدگی اور ثابت قدمی کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اس حدیث میں یہ تمام معانی مناسب ہیں۔

"عَلَيْكَ بِصَلاةِ اللَّيْلِ" علیک، اسم فعل ہے مگر فعل متعدی کے معنی میں یا اس کی جگہ استعمال ہوتا ہے: "عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ" کے معنی "اِلْزَمُوا" (پابند رہیں) کے ہیں۔ بنابریں "باء" تقویت وتاکید کیلئے ہے، تعدیہ کے لئے نہیں۔ مجمع البحرین میں ہے کہ اگر یہ لفظ "باء" سے متعدی کیا جائے تو اس کے معنی "اِسْتَمْسِكْ" ہے (پکڑو) کے ہوتے ہیں مگر اس قسم کی تعبیر فارسی میں نہیں ہے اور عربی میں کسی امر کے مبالغے کیلئے بولا جاتا ہے، فارسی میں اس سے ملتا جلتا جملہ یہ ہے "بچسب به فلان کار" (فلاں کام کے پیچھے لگ جاؤ)۔ لیکن اس کا ترجمہ "بر تو باد به فلان" (فلاں کا خیال رکھو) جیسی تعبیرات متعارفہ کے مطابق نہیں ہے اور ہم ان شاء اللہ حدیث کی مناسبات کو چند فصلوں اور مقدمے میں بیان کریں گے۔

مقدمہ

اس حدیث شریف میں جو وصیتیں حضرت رسول خدا ؐ نے حضرت علیؑ کو کی ہیں، متعدد اعتبار سے

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت رسول خدا ؐ کی نظر میں وہ بہت اہم تھیں۔

پہلی بات تو یہی ہے کہ حضرت علیؑ کو یہ وصیتیں فرمائی ہیں حالانکہ حضرت علیؑ کی شان اس سے کہیں بلند و برتر ہے کہ آپ حدود شرعیہ اور اوامر الٰہیہ میں سستی سے کام لیں! لیکن چونکہ یہ چیزیں آنحضرت ؐ کی نظر میں بہت اہم تھیں اس لئے وصیت فرمائی اور یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ جو بات کسی کی نظر میں اہم ہوتی ہے، اس کی اہمیت کی خاطر اس کے بارے میں ضرور تاکید کرتا ہے، چاہے وہ جانتا بھی ہو کہ یہ شخص اس کا پابند ہے۔

رہا یہ احتمال کہ آنحضرت ؐ نے ﴿ایاک اعنی واسمعی یا جارة﴾ [۳] کی طرح خطاب فرمایا ہے کہ مخاطب حضرت علیؑ تھے مگر مراد تمام مومنین تھے تو یہ احتمال بعید ہے، کیونکہ طرز گفتگو بتاتا ہے کہ خود حضرت علیؑ ہی مورد خطاب اور شخصاً مورد نظر تھے۔ چنانچہ کلمہ فی نفسک اور حفاظت کا حکم اور خدا سے اعانت کی دعا کرنا یہ سب (اس بات کے) شواہد ہیں اور اس قسم کی وصیتیں متعارف اور خود ائمہؑ میں ایک دوسرے کیلئے رائج تھیں اور ہر ایک کی عبادت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہی حضرات مراد ہوتے تھے (جو مخاطب تھے)، مثلاً حضرت علیؑ نے امام حسنؑ و امام حسینؑ کو وصیت فرمائی تھی ''میں تم دونوں (حسنینؑ) اور اپنے تمام اہل بیتؑ اور جس تک میری تحریر پہنچے (سب ہی) کو وصیت کرتا ہوں'' [۴] اور واضح ہے کہ اس وصیت میں امام حسنؑ و امام حسینؑ بھی داخل ہیں۔ ان وصیتوں سے پتہ چلتا ہے کہ مسئلہ کتنا اہم ہے اور ان بزرگوں کو اس سے خاص تعلق ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ وصیت کے مخاطب حضرت علیؑ کا ہونا مطلب کی بزرگی و اہمیت کو واضح کرتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ چونکہ وصیت کے مخاطب حضرت علیؑ تھے اور ان کیلئے ممکن ہی نہ تھا کہ رسول خدا ؐ کی وصیت کی مخالفت کرتے یا اس میں سستی سے کام لیتے، لیکن اس کے باوجود تین تاکید کے ساتھ مطلب کو بیان فرمایا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ جب حضور ؐ نے فرمایا میں تم کو وصیت کرتا ہوں، حضرت علیؑ کو وصیتوں کی اہمیت کی طرف متوجہ کرانے کیلئے فرمایا مجھ سے ان کو محفوظ کرلو اور چونکہ آنحضرت ؐ ان کو اہمیت دیتے تھے لہذا اس کے فوراً بعد ہی دعا فرمائی ''خداوندا! علیؑ کی اس پر مدد فرما'' اس کے علاوہ ہر جملے میں الگ الگ تاکید ہے۔ مثلاً نون تاکید کا استعمال کیا گیا ہے، تکرار فرمایا ہے وغیرہ وغیرہ۔

پس معلوم ہوا کہ یہ مطالب بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ البتہ یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ ان امور میں سے کوئی ایک بھی حضرت علیؑ کیلئے نفع کا باعث ہے، بلکہ دوسروں کو نفع پہنچانا مقصود ہے، اگرچہ حضرت علیؑ بالذات مخاطب ہیں، لیکن چونکہ یہ عام اور مشترکہ ذمہ داریاں ہیں لہٰذا حتی الامکان کوشش کرنی چاہئے کہ کہیں جناب رسول خداؐ کی وصیتیں نظر انداز نہ ہو جائیں۔ ہمیں جان لینا چاہئے کہ حضرت علیؑ سے رسول خداؐ کی حد سے زیادہ محبت، اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ان مطالب کی منفعت و اہمیت بہت زیادہ ہو اسی لئے انہیں آپؐ نے اس طرح سے بیان کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

پہلی فصل: جھوٹ کے مفاسد

رسول خداؐ کی ایک وصیت، ہمیشہ سچ بولنے اور جھوٹ سے پرہیز کی تھی اور چونکہ اس کو سب سے پہلے ذکر فرمایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کی نظر میں اس کی سب سے زیادہ اہمیت ہے اور میں (بھی) سچ کے مصالح پر جھوٹ کے مفاسد کو مقدم کروں گا۔ لہٰذا آپ یہ جان لیجئے کہ عقل و نقل دونوں اس برائی کی قباحت و فساد پر متفق ہیں اور جھوٹ فی نفسہ فواحش و گناہ کبیرہ میں سے ہے اور احادیث کی اس پر دلالت بھی ہے۔ اس کے علاوہ کبھی کذب بیانی پر ایسا مفسدہ مرتب ہوتا ہے جس کی قباحت و برائی اس سے کم نہیں ہوتی، بلکہ کبھی تو ایک جھوٹ کے کھل جانے پر آدمی نظروں سے تا گر جاتا ہے کہ آخر عمر تک اس کا ازالہ ممکن نہیں ہوتا۔ خدا نہ کرے کوئی آدمی جھوٹ میں مشہور ہو جائے، کیونکہ اس سے زیادہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو آدمی کی شخصیت کو نقصان پہنچا سکے۔ اس کے علاوہ جھوٹ کے دینی مفاسد و اخروی عقاب بھی بہت زیادہ ہیں۔ میں اس سلسلے کی بعض احادیث شریف کے ذکر پر اکتفا کرتا ہوں اور چونکہ مطلب واضح ہے لہٰذا طول کلام سے اجتناب کرتا ہوں۔

وسائل میں محمد بن یعقوب سے منقول ہے کہ امام محمد باقرؑ نے فرمایا: ﴿انّ الله عزّوجلّ جعل للشرّ اقفالاً، وجعل مفاتیح تلک الأقفال الشراب، والکذبُ شرٌّ من الشراب﴾ ۵ "خداوند عالم نے شر کیلئے بہت سے قفل قرار دیئے ہیں اور ان قفلوں کی کنجیاں شراب کو قرار دیا ہے، (مگر) جھوٹ شراب سے بھی بدتر ہے"۔

اب ذرا اس حدیث شریف کے بارے میں سوچئے جو عالم آل محمدؐ سے اسی کتاب میں مذکور ہے جو

تمام علمائے (سلف) کے نزدیک قبول تھی۔ اب دیکھئے کیا عذر کیلئے کوئی راستہ باقی رہ جاتا ہے؟ کیا جھوٹ سے سہل انگاری، اخبار اہل بیت عصمت وطہارت " پر ایمان میں کمزوری کے علاوہ کسی اور چیز کا ثبوت ہے؟ چونکہ ہم کو اعمال کی غیبی صورتوں کا علم نہیں، ملک وملکوت کے روحانی تعلقات سے ناواقف ہیں اس لئے اس قسم کی احادیث کو اہمیت نہیں دیتے اور اس قسم کی روایات کو مبالغہ پر حمل کر دیتے ہیں! حالانکہ یہ خود ایک باطل طریقہ ہے جو ہماری جہالت اور ضعف ایمانی سے پیدا ہوتا ہے۔ فرض کیجئے ہم اس حدیث کو مبالغہ پر محمول مان لیتے ہیں تو کیا یہ مبالغہ بے موقع ہے؟ کیا ہر چیز کو کہا جا سکتا ہے کہ یہ شراب سے بدتر ہے یا اس کا شر اتنا عظیم ہو کہ بعنوان مبالغہ کہہ جا سکے کہ یہ شراب سے بالاتر ہے؟

امام محمد باقرؑ نے فرمایا ﴿الكَذِبُ هُوَ خَرابُ الإيمانِ﴾ ۷ "جھوٹ ایمان کی خرابی (کی دلیل) ہے"۔ درحقیقت اس قسم کی احادیث انسان کے دل کو دہلا دیتی اور اس کی کمر توڑ دیتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جھوٹ ایسے برے اعمال میں سے ہے کہ جن کی قباحت کا احساس ہی اٹھ گیا ہے۔ مگر ایک وقت ایسا آئے گا کہ جب ہم سمجھیں گے کہ ایمان جو ہمارے عالم آخرت کا سرمایہ ہے اس ہلاکت خیز گناہ کی وجہ سے ہمارے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔

حضرت امام رضا " سے روایت کی گئی ہے کہ آپ " نے فرمایا: "رسول خدا " سے پوچھا گیا کیا مومن ڈرپوک ہوسکتا ہے؟ فرمایا ہاں! پھر پوچھا گیا کیا بخیل ہوسکتا ہے؟ فرمایا۔ ہاں! پھر پوچھا گیا۔ کیا کذاب ہوسکتا ہے؟ فرمایا نہیں!"۔ ۸

صدوق الطائفہ " ۸ سے منقول ہے کہ رسول خدا " کے ارشادات میں سے یہ (بھی) ہے: "ربا (سود) سے کہیں بڑا جھوٹ ہے"۹ حالانکہ سود کیلئے اس طرح سختی بیان کی گئی ہے جس سے انسان متحیر ہو جاتا ہے۔

اور سب سے زیادہ اس کی طرف متوجہ رہنا چاہئے کہ مذاق کے عنوان سے بھی حدیث میں جھوٹ کی ممانعت، بلکہ شدت سے ممانعت کی گئی ہے اور علما نے اس کی حرمت کا فتویٰ بھی دیا ہے۔ چنانچہ صاحب وسائل الشیعہ نے عنوان باب میں، جو ان کے فتوی کے بھی مطابق ہے فرمایا ہے ﴿أَرْبَى الرِّبَا الكَذِبُ﴾ "باب تحريم الكذب في الصَّغِيرِ وَالكَبِيرِ والجدِّ وَالهَزْلِ عدا ما اسْتُثْنِيَ "۱۰ (باب جھوٹ کے حرام ہونے میں خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا، واقعی ہو یا مزاح میں، استثنائی مواقع کے علاوہ)۔

حدیث ۲۹ ...(۵۲۵)

کافی شریف میں حضرت امام محمد باقرؑ سے مروی ہے کہ امام سجادؑ اپنے بچوں کو جھوٹ سے روکتے ہوئے فرماتے تھے "اپنی تمام گفتگو میں جھوٹ سے پرہیز کرو، خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا، سنجیدگی سے ہو یا مزاح، کیونکہ اگر انسان معمولی چیزوں میں جھوٹ بولے گا تو بڑے جھوٹ کی جرأت ہوگی۔ کیا تم نہیں جانتے کہ رسول خداؐ نے فرمایا ہے: بندۂ خدا سچائی کو اپنا پیشہ بنا لیتا ہے یہاں تک کہ خدا اس کو صدیق لکھ لیتا ہے اور جھوٹ کو پیشہ بنانے والے کو خدا کذاب لکھ لیتا ہے"۔[۱۱]

کافی میں اصبغ بن نباتہ سے منقول ہے ﴿قال امیر المؤمنین علیہ السلام: لا یجد عبدٌ طعم الایمان حتی یترک الکذب ھزلہ وجدّہ﴾[۱۲] "حضرت علیؑ نے فرمایا کہ بندے کو اس وقت تک ایمان کا ذائقہ نصیب نہیں ہوگا جب تک وہ سنجیدگی اور مزاح میں (بھی) جھوٹ نہ چھوڑ دے"۔

حضرت رسول خداؐ نے ابوذر غفاریؓ کو جو وصیت فرمائی ہے اس میں ہے ﴿یا اباذر! ویلٌ للذي یحدّث فیکذب لیضحک بہ القوم، ویلٌ لہ، ویلٌ لہ﴾[۱۳] "اے ابوذر! اس شخص پر وائے ہو جو لوگوں کو ہنسانے کے لیے جھوٹ بولے، اس پر وائے ہو، اس پر وائے ہو"۔

اب ان روایات اور رسول خداؐ اور ائمہؑ کے ان سخت بیانات کے بعد بہت بڑی بدبختی اور جرأت کا کام ہے کہ کوئی جھوٹ بولے اور جس طرح جھوٹ کو شدید قسم کی برائیوں میں شمار کیا گیا ہے، اسی طرح صدق لہجہ اور گفتگو میں سچائی کو بہت ہی اہمیت دی گئی اور روایات اہل بیتؑ میں اس کی تعریف کی گئی ہے۔ میں بعض احادیث کے ذکر پر اکتفا کرتا ہوں۔

محمد بن یعقوب نے کافی میں امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے ﴿کونوا دعاۃً للناس بالخیر بغیر ألسنتکم لیروا منکم الاجتہاد والصدق والورع﴾[۱۴] "تم لوگوں کو اپنی زبان کے علاوہ (عمل سے) دعوت دینے والے ہو تاکہ لوگ تمہارے اندر امر خیر کی طرف سنجیدگی، عبادت، سچائی اور پرہیزگاری کو ملاحظہ کریں"۔

جناب صدوقؒ نے اپنے سند کے ساتھ، حضرت رسول خداؐ کا قول نقل کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا "قیامت کے دن تم میں، مجھ سے سب سے زیادہ قریب اور جن کی شفاعت سب سے زیادہ (میرے نزدیک) ضروری ہوگی، وہ لوگ ہوں گے جو گفتگو میں سچے، امانت ادا کرنے میں پکے، خلق میں تم سب سے اچھے اور لوگوں سے قریب ہوں گے"۔[۱۵]

دوسری فصل:

تقویٰ کی حقیقت اور اس کے مراتب

تقویٰ کو منازل سالکین و سائرین میں سے شمار کیا گیا ہے اور اس کی تعریف عارف معروف ''خواجہ عبد اللہ انصاری'' نے اس طرح فرمائی ہے ﴿هُوَ تَوَقٍّ مُسْتَقْصَىً عَمَّا حَذَرٍ أَوْ تَحَرُّجٌ عَمَّا تَعْظِيمٍ﴾ [۱] ''نفس پر مکمل کنٹرول اور اس کی حفاظت کا آخری درجہ اور ساتھ ہی لغزش سے ڈرنا یا نفس پر تعظیم حق کے سلسلے میں سختی کرنے کا نام تقویٰ ہے'' اور اسی تعریف میں تمام مراتب شامل ہیں، کیونکہ تقویٰ کے بہت سے مرتبے ہیں، مثلاً

۱۔ عام لوگوں کا تقویٰ گناہان کبیرہ سے اجتناب کرنا،

۲۔ خاص لوگوں کی پرہیزگاری محرمات میں مبتلا ہو جانے کے خوف سے مشتبہ چیزوں سے اجتناب کرنا، چنانچہ ''حدیث تثلیث'' [۲] میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

۳۔ اہل زہد کا تقویٰ مباحات سے بھی ان کے بوجھ سے بچنے کیلئے اجتناب کرنا،

۴۔ اہل سلوک کا تقویٰ مقامات تک پہنچنے کیلئے ترک دنیا کر دینا،

۵۔ مجذوب لوگوں کا تقویٰ خدا کے دروازے تک رسائی اور دیدار جمال خدا کیلئے مقامات کا ترک کر دینا

۶۔ اولیا کی پرہیزگاری غایات کی طرف توجہ سے اجتناب کرنا ہے۔

ان میں سے ہر ایک کی الگ شرح ہے جو ہمارے لئے مفید نہیں ہے۔ لیکن جو بات یہاں پر قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ محارم الٰہی سے بچنا تمام معنوی کمالات اور اخروی مقامات کی بنیاد ہے، اور کسی کو بھی کوئی مقام حاصل نہیں ہو سکتا جب تک وہ محارم الٰہی سے اجتناب نہ کرے، اور جس دل کے اندر تقویٰ نہ ہو اس کو کدورت اور زنگ کی آلودگی اس طرح گھیر لیتی ہے کہ بسا اوقات اس کی نجات کی توقع ختم ہو جاتی ہے۔ نفوس کی صفائی اور چمک تقویٰ ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ عوام کیلئے یہی منزل بہت اہم ہے اور راہ آخرت کے مسافر کیلئے اس کا حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ روایات اہل بیت ؑ کے اعتبار سے اس کی فضیلت اتنی زیادہ ہے جو اس کتاب میں نہیں آ سکتی۔ میں اس سلسلے میں صرف بعض احادیث کا ذکر کروں گا۔ اگر کسی کو تفصیل کی ضرورت

ہوتو کتب اخبار کی طرف رجوع کرے۔

کافی نے امام جعفر صادقؑ سے نقل کیا ہے ﴿اوصیک بتقوی اللہ والورع والاجتهاد، واعلم انہ لا ینفع اجتہاد لا ورع فیہ﴾ ۱۸ ''میں تم کو خدا سے خوف، ورع و پرہیزگاری اور (عبادت میں) جدوجہد کی وصیت کرتا ہوں اور یاد رکھو جس عبادت میں پرہیزگاری نہ ہو اس میں کوئی نفع نہیں ہے''۔

اسی مفہوم کے ساتھ ایک اور روایت بھی ہے ۱۹ اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ بغیر پرہیزگاری کے عبادت درجہ اعتبار سے ساقط ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ عبادت کا سب سے بڑا مفہوم، یعنی نفس کی ریاضت، ملک وطبیعت پر ملکوت کی حکومت، شدید تقویٰ اور کامل پرہیزگاری کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا جو نفس، خدا کی معصیت میں مبتلا ہیں ان میں کوئی نقش نہیں ابھرتا، اس میں نقاشی بے فائدہ ہے جب تک صفحۂ دل کدورتوں اور آلائشوں سے پاک نہ ہوگا اس میں نقاشی نہیں کی جا سکتی۔ لہذا عبادت جو نفس کی صورت کمالیہ ہیں، گناہوں کی آلودگی سے نفس کی پاکیزگی کے بغیر، بے فائدہ اور ایک بے معنی صورت و بے روح قالب ہیں۔

یزید بن خلیفہ سے راوی روایت کرتا ہے ﴿وعظنا ابو عبد اللہ علیہ السلام فامر و زھد، ثم قال علیکم بالورع، فانہ لا ینال ما عند اللہ الا بالعمل والورع﴾ ۲۰ ''امام جعفر صادقؑ نے ہم کو وعظ فرمایا اور زہد کا حکم دیا۔ اس کے بعد فرمایا تمہارے اوپر تقویٰ اس لئے واجب ہے کہ خدا کے پاس جو چیز ہے وہ تم کو تقویٰ کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی''۔ پس اس حدیث شریف کے اعتبار سے جس شخص میں تقویٰ نہیں ہے وہ خدا کی عنایتوں سے محروم ہے کہ جن کا خدا نے وعدہ کیا ہے اور یہی بہت بڑی رسوائی و ذلت ہے۔

وسائل میں امام محمد باقرؑ سے روایت ہے ﴿لا تنال ولایتنا الا بالعمل والورع﴾ ۲۱ ''ہماری ولایت تقویٰ اور پرہیزگاری کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی''۔

دوسری روایت میں ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ''جس شہر میں ایک لاکھ آدمی رہتے ہوں اور اس میں ہمارا ایک شیعہ ہو جس سے کوئی اور زیادہ پرہیزگار ہو، وہ شخص ہمارا شیعہ نہیں ہے'' ۲۲ کافی شریف میں بھی اسی مضمون کی روایت موجود ہے۔ ۲۳

یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ بحسب روایات کامل تقویٰ کا معیار محرمات الہیہ سے اجتناب ہے۔ جو بھی محرمات سے پرہیز کرے گا وہ متقی ترین آدمی شمار ہوگا۔ لہذا یہ بات آپ کی نظر میں نہ آئے اور شیطان آپ

کو دھوکہ نہ دے، کیونکہ اس ملعون کی عادت ہے کہ انسان کو مایوس کر کے شقاوت ابدی کے حوالے کر دیتا ہے۔اس طرح کہ وہ آپ کو سمجھائے گا جہاں ایک لاکھ یا اس سے زیادہ لوگ ہوں بھلا کیونکر ممکن ہے انسان سب سے زیادہ متقی ہو؟ یہ شیطان لعین کی مکاری اور نفس امارہ کا وسوسہ ہے اور (شیطان کے شبہہ کا) جواب یہ ہے کہ حسب روایت جو شخص محرمات الٰہیہ سے اجتناب کرے وہ اس روایت میں شامل ہے اور متقی ترین افراد میں اس کا شمار ہے اور محرمات الٰہیہ سے اجتناب کوئی بہت مشکل کام نہیں ہے، بلکہ تھوڑی سی ریاضت کے بعد تمام محرمات کو ترک کر سکتا ہے۔ ورظاہر ہے جو شخص اہل سعادت و نجات ہونا چاہتا ہے اور وہ ولایت اہل بیت ؑ کے ذریعے عنایات الٰہی کا مستحق بننا چاہتا ہے، اس کو ترک معصیت کیلئے زحمت برداشت کر کے اتنی محنت اور ریاضت تو کرنی ہی ہوگی۔

تتمہ

خیانت کے مفاسد اور امانت کی حقیقت

اس جگہ ایک نکتے کا بیان ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ جناب رسول خدا ؐ نے تقویٰ کی وصیت کے بعد اس بات کا اضافہ فرمایا ہے کہ خیانت کی جرأت نہ کرو، حالانکہ تقویٰ مطلق محرمات سے بچنے کا نام ہے، جس میں خیانت بھی ہے اور یہ پھر اس سے عام ہے جیسا کہ پہلے کہا گیا اس لیے یا تو خیانت کو اپنے عام اور رائج معنی سے ہٹ کر ایک ایسا مفہوم دیا جائے تا کہ وہ پرہیزگاری کے مطابق ہو سکے اور وہ اس طرح کہ تمام گناہوں اور خدا کی طرف سفر کرنے میں حائل رکاوٹوں کو خیانت شمار کیا جائے، اس لئے کہ الٰہی ذمہ داریاں امانات خدا ہیں، جیسا کہ ارشاد ہے ﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ﴾ [۲۴] "ہم نے اپنی امانت کو آسمانوں و زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے اس کا (بار) اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے"۔ بعض مفسرین نے (امانت کو) الٰہی ذمہ داریاں سمجھا ہے [۲۵] بلکہ ہمارے تمام اعضا و جوارح اور قوتیں حق کی امانت ہیں اور ان کو مرضی الٰہی کے خلاف استعمال کرنا خیانت ہے اور دل کو بھی غیر حق کی طرف متوجہ کرنا خیانت کے زمرے میں آتا ہے۔

ایں جاں عاریت کہ بہ حافظ سپردہ دوست روزی رخش ببینم و تسلیم وی کنم

یا تو پھر خیانت سے وہی مشہور معنی مراد ہیں۔ شدید اہمیت کی وجہ سے بطور مخصوص اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ پس

گویا تمام حقیقت ورع امانت میں خیانت کرنے سے اجتناب کرنا ہے اور کوئی ائمہ معصومین کی ان روایات کو دیکھے جو امانت کی واپسی اور اس میں خیانت نہ کرنے سے متعلق ہیں، اس کو اندازہ ہو جائے گا کہ شارع کی نظر میں اس کی کیا اہمیت ہے؟ اس کے علاوہ اس کی ذاتی قباحت کسی بھی عاقل پر مخفی نہیں ہے (بلکہ) خائن کو تو انسانیت کے زمرے سے خارج اور پست ترین شیطانوں میں شمار کرنا چاہئے اور یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ جو شخص لوگوں کے درمیان خائن اور بدکردار کے طور پر مشہور ہو جائے اس کی زندگی اس دنیا میں بھی دشوار ہو جاتی ہے۔ دنیا کے اندر ایک دوسرے کی مدد سے ہی راحت و آرام کی زندگی بسر کی جاسکتی ہے، کسی کیلئے انفرادی زندگی ممکن نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی بشریت سے خارج ہو جائے اور وحشی جانوروں سے ملحق ہو جائے تو اور بات ہے اور اجتماعی زندگی کی گاڑی کا پہیہ لوگوں کے آپس میں اعتماد پر گھومتا ہے اگر خدا نخواستہ انسان کا ایک دوسرے پر اعتماد اٹھ جائے تو راحت و آرام کی زندگی کا بسر کرنا ناممکن ہے اور اعتماد کی سب سے مضبوط بنیاد، امانت و ترک خیانت ہے لہذا خائن قابل اعتماد نہیں ہے اور انسانی معاشرہ اور تہذیب کے دائرے سے خارج ہے۔ وہ کسی بھی اچھے معاشرہ کا رکن نہیں ہو سکتا اور ظاہر ہے کہ ایسے آدمی کی زندگی کتنی سخت ہوگی۔ میں اس سلسلے میں مکمل فائدے کیلئے اہل بیت عصمت کی چند احادیث کا ذکر کرتا ہوں امید ہے آگاہ دل اور چشم بصیرت رکھنے والوں کیلئے اتنا ہی کافی ہے۔

صاحب کافی نے نقل کیا ہے کہ امام جعفر صادق نے فرمایا ﴿لا تنظروا الی طول رکوع الرجل وسجوده، فان ذلک شیء اعتاده، فلو ترکه استوحش لذلک، ولکن انظروا الی صدق حدیثه واداء امانته﴾ ۲۶ "کسی شخص کے طویل رکوع اور سجدے کو نہ دیکھو، یہ تو عادت کے بنا پر بھی ہو سکتا ہے کہ اگر اپنی عادت چھوڑ دے تو پریشان ہو جائے۔ البتہ اس کی سچائی اور ادائے امانت کو دیکھو"۔

وباسناده عن ابي كهمس، قال: قلت لابي عبد الله علیه السلام: عبد الله بن ابي يعفور يقرئك السلام، قال: عليك وعليه السلام، اذا اتيت عبد الله فاقرئه السلام وقل له: ان جعفر بن محمد يقول لك: انظر ما بلغ به علي عند رسول الله صلی الله علیه وآله فالزمه، فان عليا علیه السلام انما بلغ به عند رسول الله بصدق الحديث واداء الامانة﴾ ۲۷

"راوی کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر صادق سے عرض کیا عبداللہ ابن ابی یعفور آپ کو سلام کہتے ہیں۔ فرمایا تم پر اور ان پر بھی سلام ہو۔ جب تم عبداللہ سے ملو گے تو میرا سلام کہنے کے بعد اس سے کہنا کہ جعفر بن محمد نے

کہا ہے تم اپنی نظر میں یہ بات رکھو کہ جس چیز کے ذریعے حضرت علیؑ نے رسول خداؐ کے پاس یہ منزلت حاصل کی ہے تم بھی وہی کرو اور حضرت علیؑ کو جو کچھ بھی حاصل ہوا ہے وہ سچی بات کہنے اور ادائے امانت کی وجہ سے حاصل ہوا ہے''

پس میرے عزیز! اس حدیث شریف میں غور کرو اور دیکھو کہ سچ بولنے اور امانتداری نے حضرت علیؑ کو کس منزل تک پہنچا دیا تھا۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول خداؐ حضرت علیؑ کے تمام صفات میں سے ان دونوں صفات کو ہر چیز سے زیادہ پسند کرتے تھے اور انہیں دونوں چیزوں نے ان کو مقرب کیا اور اس بلند مقام تک پہنچایا اور خود امام جعفر صادقؑ نے ابن ابی یعفور کو جو آپ کے مخلص و جاں نثار صحابی تھے تمام اوصاف و اعمال میں صرف انہی دونوں صفات کی تاکید فرمائی ہے جو حضرتؑ کے نزدیک بہت اہم تھیں اور آپؑ نے تاکید فرمائی کہ ان کی پابندی کرے۔

کافی میں امام محمد باقرؑ کی روایت نقل کی ہے کہ حضرتؑ نے فرمایا ﴿قال أبو ذرّ (رضي الله عنه) سمعتُ رسول الله صلى الله عليه وآله يقول: حافتا الصراط يوم القيامة الرَّحِمُ والأمانة، فإذا مرَّ الوَصُولُ للرَّحِم المؤدّي للأمانة، نفذ إلى الجنّة، وإذا مرَّ الخائنُ للأمانة القطوعُ للرَّحِم، لم ينفعْهُ معهما عملٌ وتكفّأ به الصِّراطُ في النّار﴾ ۲۸ ''ابوذرؓ نے کہا کہ میں نے رسول خداؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا قیامت کے دن جہنم کے دونوں کناروں (میں سے ایک) پر صلہ رحم اور (دوسرے پر) امانت ہوگی۔ پس جس وقت صلہ رحم کرنے والا اور امانت ادا کرنے والا وہاں پہنچے گا وہ جنت کی طرف عبور کر جائے گا اور جب خائن اور قطع رحم کرنے والا وہاں پہنچے گا تو اس کو کوئی عمل فائدہ نہیں پہنچا سکے گا اور صراط اس کو جہنم میں پہنچا دے گی''۔

اس سے معلوم ہوا کہ صلہ رحم اور امانت کی صورتیں اس عالم میں صراط کے دونوں جانب کھڑی ہوں گی و صلہ رحم کرنے والے اور امانت ادا کرنے والے کی مدد کرے گی اور اگر کسی نے ان دونوں کو چھوڑ دیا ہے تو کوئی بھی عمل اس کو فائدہ نہیں پہنچائے گا۔

کافی میں امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ حضرتؑ نے فرمایا ''امیر المؤمنینؑ کا حکم ہے امانت ادا کرو چاہے وہ اولاد انبیاءؑ کے قاتل کی ہو''۔

بإسناده عن أبي عبد الله عليه السلام في وصيّة له ﴿اعلم أنّ ضارب عليّ عليه السلام بالسّيف وقاتلَهُ

لو ائتمنني واستنصحني واستشارني ثم قبلت ذلک منه لأدّیت الیه الأمانة﴾۳۰؎ ''کافی میں امام جعفر صادقؑ کی وصیت کے یہ فقرے نقل کئے گئے ہیں یہ جان لو اگر حضرت علیؑ کو تلوار سے مارنے والا اور ان کو قتل کرنے والا مجھے کسی چیز کا امین بنائے اور مجھ سے نصیحت طلب کرے اور مجھ سے مشورہ مانگے اور میں اس کی بات قبول کر لوں تو یقیناً اس کی امانت اس کو واپس کر دوں گا''۔

محمّد بن علي بن الحسین باسناده عن أبي حمزة الثمالي، قال: سمعت سیّد العابدین علي بن الحسین بن علي بن أبي طالب علیه السلام یقول لشیعته: علیکم بأداء الأمانة فو الذي بعث محمداً صلی الله علیه وآله بالحق نبیاً، لو أنّ قاتل أبي الحسین بن علي علیهما السلام ائتمنني علی السیف الذي قتله به، لأدّیته الیه﴾۳۱؎

''محمد بن علی بن حسین، ابو حمزہ ثمالی سے نقل کیا ہے کہ میں نے امام زین العابدینؑ کو دیکھا کہ آپ اپنے شیعوں سے فرما رہے تھے تمہارے اوپر واجب ہے امانت کا واپس کرنا۔ اس خدا کی قسم جس نے محمدؐ کو حق بنا کر بھیجا ہے، اگر میرے باپ حسین بن علیؑ کا قاتل جس تلوار سے اس نے میرے باپ کو قتل کیا ہے، میرے پاس بطور امانت رکھ دے تو میں اس کو واپس کر دوں گا''۔

وباسناده عن الصادق علیه السلام عن آبائه، علیهم السلام، عن النبي صلی الله علیه وآله في حدیث المناهي أنه نهی عن الخیانة وقال ﴿من خان أمانة في الدّنیا ولم یردّها الی أهلها ثم أدرکه الموت مات علی غیر ملّتي ویلقی الله وهو علیه غضبان ومن اشتری خیانة وهو یعلم فهو کالذي خانها﴾۳۲؎ ''حدیث مناہی میں رسول خداؐ سے منقول ہے کہ آپؐ نے خیانت سے روکا ہے اور فرمایا جو دنیا میں کسی کی امانت میں خیانت کرتا ہے اور اس کے مالک کو نہیں پہنچاتا اور اسی عالم میں مر جاتا ہے وہ میری ملت پر نہیں مرتا ہے اور وہ خدا سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ خدا اس پر غضبناک ہوگا اور جو شخص مال امانت کو جانتے ہوئے خریدے وہ بھی خائن کی طرح ہے''۔ اسی طرح کی دیگر احادیث بھی ہیں

دنیا جاتی ہے کہ خدا کا بندے پر غضبناک ہونے کا انجام کیا ہوگا، بعد جو شخص مورد غضب الٰہی ہے شفاعت کرنے والے بھی اس کی شفاعت نہیں کریں گے۔ خصوصاً جبکہ خائن، ملت رسولؐ سے خارج بھی ہے (پھر شفاعت کیسی؟)

ایک اور حدیث میں ہے ''جو کسی مومن سے خیانت کرے ہم سے نہیں ہے'' ۳۳؎

دوسری حدیث میں ہے "جو کسی مؤمن سے خیانت کرے وہ دین اسلام سے خارج ہے اور اس کو ابد الآباد تک جہنم کے کنارے ڈال دیا جائے گا" ۳۴؎ اس گناہ سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔

یہ واضح ہے کہ مؤمنین سے خیانت کا مطلب ہر قسم کی خیانت سے خواہ مالی ہو یا دوسری خیانتیں ان سے بڑھ کر ہیں۔ لہذا انسان کو اس عالم میں نفس امارہ سے بہت احتیاط کرنا چاہئے، کیونکہ بہت سے امور کو نفس امارہ آسان بنا کر پیش کرتا ہے، حالانکہ وہ شقاوت ابدی اور مستقل ذلت کا سبب بن جاتے ہیں۔ یہ تو بندوں کے ساتھ خیانت کا انجام ہے، اب امانت خدا کے ساتھ خیانت کا کیا انجام ہوگا؟

خداوند عالم کی مخصوص امانتوں کی طرف اشارہ

یہ جان لینا چاہئے کہ خداوند عالم نے ہمیں تمام قوتوں اور اعضائے ظاہریہ و باطنیہ کو مرحمت فرمایا اور ہماری مملکت ظاہر و باطن میں نعمت و رحمت کو نشر کیا اور ان سب کو ہمارے تابع فرمان بنایا اور ان تمام اعضاء کو اس حالت میں بطور امانت ہمارے سپرد کیا کہ سب پاک و پاکیزہ اور صوری و معنوی آلودگیوں سے پاک تھے اور عالم غیب سے ہمارے اوپر جن چیزوں کو نازل فرمایا وہ بھی آلائشوں سے پاک تھیں۔ اب اگر ہم نے خدا سے ملاقات کے وقت ان امانتوں کو عالم طبیعت کی آلائش کے بغیر اور ملک دنیا کی غلاظتوں کے بغیر خداوند عالم کو واپس کر دیا تب تو امین ہیں ورنہ خیانت کار ہیں، بلکہ اسلام حقیقی سے خارج اور امت رسولؐ سے باہر ہیں۔

مشہور حدیث میں آیا ہے ﴿قَلْبُ الْمُؤمِنِ عَرْشُ الرَّحْمٰنِ﴾ ۳۵؎ "مؤمن کا دل عرش رحمن ہے"۔ حدیث قدسی کا مشہور فقرہ ہے ﴿لَا يَسَعُنِي أَرْضِي وَلَا سَمَائِي وَلَـٰكِنْ يَسَعُنِي قَلْبُ عَبْدِيَ الْمُؤْمِنِ﴾ ۳۶؎ "میرے آسمان و زمین میں میری گنجائش نہیں ہے۔ ہاں میرے بندۂ مؤمن کے دل میں میری گنجائش ہے"۔

مؤمن کا دل عرش و سلطنت الٰہی اور خدا کی منزل ہے اور دل کا مالک ذات خدا ہے۔ (اب اگر کسی نے غیر حق کی طرف توجہ کی تو حق سے خیانت کی اور خدا اور خدا کے مخصوص بندوں کی محبت کے علاوہ جو عین محبت خدا ہے، جس نے کسی اور سے محبت کی مشرب عرفان میں وہ خائن ہے اور ولایت اہل بیت عصمت و طہارتؑ اور خاندان رسالتؐ کی طہارت اور مودت، ان کے اعلیٰ مقام کی معرفت (یہ سب) حق کی امانت ہے۔

چنانچہ بہت سی تفسیروں میں لفظ امانت جو آیت کے اندر آئی ہے اس کی تفسیر، روایت امیر المومنین ؑ سے کی گئی ہے اور اسی سے حضرت علی ؑ کی ولایت و سلطنت کا غصب کرنا امانت میں خیانت ہے اور حضرت علی ؑ کی پیروی نہ کرنا (بھی) خیانت کا ایک مرتبہ ہے اور احادیث شریف میں آیا ہے کہ جو حضرت علی ؑ کی مکمل پیروی کرے وہی شیعہ ہے ورنہ پیروی کے بغیر تشیع کا دعویٰ شیعہ نہیں کہلائے گا۔ ۳۸؎

بہت سے خیالات جھوٹی اشتہا کے مانند ہوتے ہیں۔ (مثلاً) محض اپنے دل میں حضرت علی ؑ اور ان کی اولاد پاک ؑ کی محبت محسوس کر کے ہم مغرور ہو جاتے اور گمان کرنے لگتے ہیں کہ پیروی کے بغیر بھی یہ دوستی باقی رہ سکتی ہے! آخر اس پر کیونکر اطمینان کیا جا سکتا ہے کہ اگر انسان مراقبت نہ کرے اور آثار مودت کو ترک کر دے تب بھی یہ مودت باقی رہ سکتی ہے؟ بہت ممکن ہے کہ سکرات کی سختیاں جو غیر مومنین مخلصین کیلئے ہیں، ان کی دہشت و وحشت سے آدمی حضرت علی ؑ کو بھول جائے۔ (جیسا کہ) حدیث میں ہے "اہل معصیت کا ایک گروہ جہنم میں معذب ہوگا اور رسول خدا ؐ کا نام بھول چکا ہوگا پھر جب عذاب کی مدت گزر جائے گی اور وہ گناہوں سے پاک ہو جائے گا تو حضرت رسول ؐ کا اسم مبارک ان کو یاد آ جائے گا اور وہ بلند آواز سے فریاد کریں گے "وامحمداہ" تب جا کر مستحق رحمت ہوں گے" ۳۹؎ ہم لوگ خیال کرتے ہیں کہ واقعہ موت و سکرات اسی عالم کے حالات کے مشابہ ہوگا۔

میرے عزیز! آپ اپنے ایک معمولی مرض سے تمام یادداشت کھو بیٹھتے ہیں پھر سوچئے ان تلخیوں، مصیبتوں، وحشتوں اور تمام دباؤ کے بعد کیا حالت ہوگی؟ اگر انسان نے محبت کی اور لوازم محبت کے مطابق عمل بھی کیا، محبوب کو یاد رکھا اور اس کی پیروی کرتا رہا تب وہ محبت خداوند عالم اور رسول خدا ؐ کی نظر میں پسندیدہ ہوگی۔

لیکن اگر صرف زبانی دعویٰ کرے اور عمل نہ کرے، بلکہ مخالفت کرے تو ممکن ہے کہ اسی دنیا میں اور نہیں تغیرات و تبدیلیات اور وجوہ ہائے گوناگوں میں اس محبت سے ہی پلٹ جائے، بلکہ نعوذ باللہ ممکن ہے آنحضرت ؐ کا دشمن ہو جائے چنانچہ میں نے بعض اشخاص کو دیکھا ہے جو حضور ؐ سے محبت کا دم بھرتے تھے لیکن بری صحبتوں میں پڑ کر غلط کردار میں مبتلا ہونے کی بنا پر آپ ؐ کے دشمن ہو گئے اور ساتھ میں خدا و رسول ؐ اور اہل بیت ؑ کے بھی دشمن ہو گئے اور اگر بالفرض اس عالم سے محبت (اہل بیت ؑ) کے ساتھ گزر گیا تو اگرچہ حسب روایات و آیات اہل نجات و اہل سعادت سے ہے، لیکن برزخ اور ہول موت و قیامت میں تو مبتلا

ہو کے رہے گا۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: ''میں قیامت میں تمہاری شفاعت کروں گا مگر برزخ کی فکر تم خود کرو''۔[۲]

میں اس کے عذاب و فشار قبر اور عذاب برزخ سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں جن کی اس دنیا میں کوئی شبیہ بھی نہیں ہے اور اس دروازے سے جو جہنم سے قبر میں کھولا جائے گا، خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ اگر وہ دروازہ اس دنیا میں کھول دیا جائے تو تمام مخلوقات ہلاک ہو جائیں گے، ﴿نعوذ باللہ منہ﴾۔

تیسری فصل: خوف خدا

خوف خدا ایک ایسی صفت ہے کہ بہت کم ویسی صفت کو عموم کیلئے پایہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ خوف خدا ایک روحانی کمال ہونے کے علاوہ بہت سے نفسانی فضائل کا سرچشمہ بھی ہے اور نفس کا ایک اہم ترین مصلح ہے، بلکہ اس کو تمام اصلاحات کا سرچشمہ اور تمام روحانی امراض کے علاج کا مبدا شمار کیا جا سکتا ہے اور خدا پر ایمان رکھنے والے مومن و سالک و مہاجر الی اللہ کو تو اس منزل کو بہت اہمیت دینی چاہئے اور جو بھی چیز خوف خدا کو دل میں زیادہ اور اس کی جڑوں کو دل میں مضبوط کرے اس کی طرف بہت توجہ دینی چاہئے، مثلاً عذاب و عقاب، ہول موت کی شدت، موت کے بعد عالم برزخ و قیامت، صراط و میزان و سختی حساب اور جہنم کے گوناگوں عذاب، عظمت و جلال و قہر و سلطنت و تدبیر حق، نیز انسان کے برے انجام وغیرہ کا ذکر۔

چونکہ میں نے اس کتاب میں ان تمام مراحل کا ایک حد تک ذکر کر دیا ہے اس لئے یہاں پر خوف خدا کے سلسلے میں بعض ان فضیلتوں کا بیان کرنا چاہتا ہوں جو روایت میں ہیں۔

محمد بن یعقوب باسنادہ عن اسحاق بن عمار قال قال ابو عبد اللہ علیہ السلام: ﴿یا اسحاق! خف اللہ کانک تراہ و ان کنت لا تراہ فانہ یراک، و ان کنت تری انہ لا یراک فقد کفرت و ان کنت تعلم انہ یراک ثم برزت لہ بالمعصیۃ فقد جعلتہ من اھون الناظرین علیک﴾ [illegible] باب [illegible] ۲

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: اے اسحاق! خدا سے اس طرح ڈرو جیسے اس کو دیکھ رہے ہو اور اگر تم نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے اور اگر تم سمجھتے ہو کہ وہ تم کو نہیں دیکھ رہا ہے تو تم کافر ہو اور اگر یہ جانتے ہوئے کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے تم گناہ کرتے ہو تو تم نے اس کو دیکھنے والوں میں، سب سے کمتر سمجھا''۔

یہ جان لو کہ اگر کوئی ملک و ملکوت میں تجلی حق کی کیفیت اور زمین و آسمان میں ذات مقدس کے ظہور کو مشاہدۂ حضوریہ یا مکاشفات قلبیہ یا ایمان حقیقی کے ذریعے سمجھتا ہے اور مخلوق سے خدا کی نسبت اور خدا سے مخلوق کی نسبت کو جس طرح وہ ہے اسی طرح جانتا ہے اور تعینات میں مشیت الہیہ کے ظہور اور ان کی اس میں فنا کی کیفیت کو جیسی کہ وہ ہیں، ادراک کر لیتا ہے تو وہ یہ جان لے گا کہ خدا تمام مقامات میں موجود ہے اور تمام موجودات میں اس کا علم حضوری کے ذریعے مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ جیسے کہ حضرت صادق مصدق فرماتے ہیں ﴿ما رأيتُ شيئاً إلّا ورأيتُ الله معهُ او فيه﴾ ۳۲ "میں نے کسی چیز کو نہیں دیکھا مگر یہ کہ اس کے ساتھ خدا کو دیکھا" اور نوافل کے قرب حقیقت کے سلسلے میں فرمایا ﴿كنتُ سمعهُ وبصرهُ ويده﴾ ۳۳ "میں اس کا کان آنکھ اور ہاتھ ہو جاتا ہوں" کے قول کی حقیقت سمیت دوسری چیزیں بھی اس پر منکشف ہو جاتی ہیں۔ پس وہ اپنے درجے کے مطابق سے خدا کو تمام مراتب میں موجود دیکھتا ہے "عیناً و شہوداً" یا "ایماناً و عیاناً"۔ البتہ اس درجے میں سالک ایسا ہے جس مرتبے میں ہو خدا کی حضور موجودگی کا خیال رکھتا اور اس ذات مقدس کی مخالفت سے اجتناب کرتا ہے کیونکہ حضور محضر (الٰہی) کا احترام ایک فطری چیز ہے جس پر مخلوق کو پیدا کیا گیا ہے اور انسان چاہے جتنا بھی بے حیا ہو اس کے حضور و غیبت میں فرق ہوتا ہے، خصوصاً جب منعم عظیم کامل (کی بارگاہ میں) حاضری کی بات ہو تب تو ہر ایک کی طرف سے اس کا خیال رکھنا مسلمہ فطری امر ہے۔

حضور حق کے سلسلے میں لوگوں کا اختلاف

یہ بھی جان لینے کی بات ہے کہ اہل سلوک و ایمان اور ولایت و عرفان، اس طرح حضور (حضرت الٰہی) کی پابندی کرتے ہیں جو انہیں کیلئے مخصوص ہے۔ چنانچہ مومنین و متقین تو حضور الٰہی کی پابندی کو ترک نواہی و تعیین اوامر سمجھتے ہیں اور مجذوبین، غیر اللہ سے توجہ ہٹانے اور انقطاع تام کامل اور اپنے کامل سب غیریت و نفی انانیت کو حضور سمجھتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ صاحب قلوب و اہل معرفت کے بلند مقامات میں سے حضور حق کا مشاہدہ اور اس کی پابندی (بھی) ہے۔ چنانچہ خدا کے علم فعلی، ذات حق میں اشیاء کی فنا اور خدا کی مقدس بارگاہ میں مخلوقات کی حاضری کی کیفیت کا مشاہدہ کر کے اور اس بات پر یقین رکھتے ہوئے کہ عالم امکان خدا کی بارگاہ ہے جس

مقام پر بھی ہیں وہ حضورِ حق کا خیال رکھتے ہیں اور یہ بھی فطریات میں سے ہے۔

رسول کریمؐ نے اپنی اس وصیت میں جو حضرت علیؑ کو فرمائی ہے اور ہم جس کی شرح کر رہے ہیں، ﴿والثالثة الخوف من الله عزّ ذكره كانك تراه﴾ ''اور تیسری بات ربّ العزت سے اس طرح ڈرنا جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو'' مقام اول کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور اسحاق بن عمار کی حدیث شریف میں (بھی اسی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے)۔ ﴿خف الله كانك تراه﴾ ''خدا سے اس طرح ڈرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو''[۴] اور دوسرے مقام کی طرف امام جعفر صادقؑ نے اپنے قول ﴿وان كنت لا تراه فانه يراك﴾ ''اگر تم خدا کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تجھے دیکھ رہا ہے'' سے اشارہ فرمایا ہے اور محضرِ خداوندی کی پابندی کی فطرت کی طرف، امام جعفر صادقؑ نے اپنے اس قول سے اشارہ فرمایا ﴿وان كنت تعلم انه يراك﴾ ''اور اگر یہ جانتے ہوئے کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے...''۔

اہل ایمان وسلوک وریاضت وعرفان کے اختلاف مراتب کے اعتبار سے خوف کے متعدد مرتبے ہیں جن میں سب سے بڑا مرتبہ عظمت وتجلیات قہریہ وجلالیہ حق کا خوف ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس مقام کو مراتب خوف سے شمار نہ کیا جائے۔ چنانچہ منازل السائرین میں عارف معروف فرماتے ہیں ﴿وليس في مقام اهل الخصوص وحشة الخوف الا هيبة الاجلال﴾[۵] ''خواص کے مقام میں، ہیبت اجلال کے علاوہ کوئی خوف نہیں ہوا کرتا''۔

فضیلت گریہ

خوف خدا میں گریہ کی بہت فضیلت ہے۔ جیسا کہ اس حدیث شریف میں ہے ''ہر قطرہ کے عوض خدا بہشت میں ہزار گھر بناتا ہے'' جناب شیخ صدوقؒ نے بسند متصل، امام جعفر صادقؑ سے ان کے آباء و اجداد کے واسطے سے حضرت رسول اکرمؐ سے حدیث مناہی میں یہ حدیث بیان کی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ''جس کی آنکھیں خوف خدا میں گریاں ہو جائیں اس کے ہر قطرے کے عوض جنت میں ایک ایسا محل موتیوں وجواہر سے مزین ملتا ہے کہ نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہوگا نہ کسی کان نے سنا ہوگا اور نہ کسی بشر کے دل میں اس کا تصور پیدا ہوا ہوگا''۔[۶]

وعن ثواب الاعمال باسناده عن ابي جعفرؑ قال. قال رسول اللهؐ ﴿ليس شيء الا وله شيء يعدله الا الله، فانه لا يعدله شيء، ولا اله الا الله لا يعدله شيء ودمعة من خوف الله،

فانّہ لیس لھا مثقالٌ، فانْ سالت علی وجھہ لم یرھقہُ قترٌ ولا ذلّۃٌ بعدھا ابداً﴾[۴۷] ''امام محمد باقرؑ نے فرمایا رسول خداؐ کا ارشاد ہے خدا کے علاوہ ہر چیز کا جوڑ ہے، خدا کے برابر کوئی شے نہیں اور ﴿لا الٰہ الّا اللّٰہ﴾ کا بھی مقابلہ کسی چیز سے نہیں کیا جا سکتا اور خوف خدا میں نکلنے والے آنسو کیلئے کوئی پیمانہ نہیں ہے اور اگر آنسو کے قطرے رخسار پر جاری ہو جائیں تو پھر اس کے بعد اس (شخص) کو کبھی ذلت ورسوائی لاحق نہ ہوگی''۔

حدیث میں ہے: ''جس انسان اور بہشت کے درمیان کثرت گناہ کی وجہ سے زمین وآسمان کے فاصلے سے زیادہ فاصلہ ہو جائے اور وہ گناہوں سے پشیمان ہو کر خوف خدا سے گریہ وزاری کرے تو اس کے اور بہشت کے درمیان اتنی قربت حاصل ہوتی ہے جتنی آنکھوں اور پلکوں کے درمیان ہوتی ہے''۔[۴۸]

کافی میں حضرت امام صادقؑ سے منقول ہے ''ہر چیز کیلئے ایک وزن وپیمانہ ہے مگر (اس) گریہ کیلئے کوئی پیمانہ نہیں ہے جس کا ایک قطرہ آتش کے سمندروں کو خشک کر دیتا ہے''۔

حضرتؑ ہی نے فرمایا ''ایک امت کے اندر ایک ہی گریہ کرنے والا سب ہی کیلئے باعث رحمت ہو جاتا ہے''۔[۴۹] نیز اس قسم کی احادیث بہت ہیں۔[۵۰]

چھوٹے عمل پر بڑا ثواب بعید نہیں ہے

جس بات کی طرف اشارہ لازم ہے وہ یہ ہے کہ بعض غیر مطمئن اور کمزور نفوس، چھوٹی نیکیوں پر بہت ثواب دینے کے سلسلے میں اعتراض کرتے ہیں! حالانکہ وہ لوگ اس سے غافل ہیں کہ جو چیز ہماری نظر میں چھوٹی ہے وہ اس بات کی ہرگز دلیل نہیں ہے کہ اس کی صورت غیبی وملکوتی بھی حقیر اور چھوٹی ہو، کیونکہ بہت سی چھوٹی مخلوقات کے باطن وملکوت بہت ہی بڑے اور عظیم ہوتے ہیں، مثلاً رسول اکرمؐ کا مقدس قد وقامت اور جسمانی شکل وشمائل، اس دنیا کی ایک چھوٹی سی چیز تھی، لیکن آپؐ کی روح مقدس ملک وملکوت پر محیط اور زمین وآسمان کی تخلیق کا واسطہ تھی۔ کسی بھی چیز کی باطنی ملکوتی صورت کو دیکھ کر اس کی حقارت وچھوٹے ہونے کا حکم لگانا، اشیا کے عالم بواطن وملکوت کے علم کی فرع ہے۔ ہم جیسے لوگوں کیلئے ایسے فیصلے کا حق نہیں پہنچتا۔ ہم کو تو علمائے آخرت یعنی اولیا وانبیاءؑ کے احکام پر کھلی آنکھوں اور کانوں سے عمل کرنا چاہئے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس عالم کی بنیاد خدا کے فضل وکرم اور بیکراں رحمت پر رکھی گئی ہے اور خدا کے فضل

وکرم کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ جواد علی الاطلاق اور لا متناہی رحمتوں کے مالک کے فضل وکرم کو بعید سمجھنا نہایت نادانی ہے۔ تمام وہ نعمتیں جن کو خدا نے اپنے بندوں کو بخشا ہے اور جن کی جزئیات تو کیا، بلکہ کلیات کے شمار سے عقول عاجز وسرگرداں ہیں، یہ سب بغیر کسی سوال اور کسی استحقاق کے خدا نے مرحمت فرمائی ہیں۔ اس لئے اس میں کیا مانع ہے کہ خدا کسی وجہ کے بغیر محض اپنے فضل وکرم سے ان ثوابوں کا کئی گنا اضافہ اپنے بندوں کو مرحمت فرمادے؟ جس عالم کی بنیاد نفوذ ارادۂ انسانی پر رکھی گئی ہو اور جس کے بارے میں کہا گیا ہو کہ ﴿فِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ﴾ ۱؎ ''اس عالم میں تمام وہ چیزیں ہیں جن کی خواہش نفوس کو ہوتی ہے اور جن سے آنکھوں کو لذت ملتی ہے'' حالانکہ انسانی خواہشات کی نہ کوئی حد مقرر ہے اور نہ کوئی مقدار معین، کیا اس کے بارے میں اس قسم کے اعتراضات جائز ہیں؟ خدا نے اس عالم کو اس طرح مقرر فرمایا ہے اور ارادۂ انسانی کو اس طرح قرار دیا ہے کہ ارادہ کرنے سے جو بھی چاہے وہ شے موجود ہو جاتی ہے۔

میرے عزیز! اس قسم کے ثواب کے بارے میں صرف ایک دو یا دس (بیس) احادیث شریف نہیں ہیں کہ انسان ان کا انکار کردے، بلکہ وہ تو حد تواتر سے بھی زیادہ ہیں۔ احادیث کی تمام معتمد اور معتبر کتابیں اس قسم کی حدیثوں سے بھری پڑی ہیں، بس یوں سمجھئے کہ گویا ہم نے خود ہی اپنے کانوں سے معصومین سے سنا ہے۔ اس میں کسی طرح کی تاویل بھی نہیں ہے۔ لہذا اس مطلب کو جو نصوص متواترہ کے مطابق ہے اور برہان کے مخالف بھی نہیں، بلکہ ایک قسم کے برہان کے بھی مطابق ہے، بلا وجہ انکار کرنا ضعف ایمان اور کمال جہالت کی دلیل ہے۔ انسان کو چاہئے کہ انبیاء اور اولیاء کے فرمان کے سامنے سر تسلیم خم کردے۔ کمال انسانی کیلئے کوئی بھی چیز اولیاء کے سامنے تسلیم ہونے سے بہتر نہیں ہے، خصوصاً ان امور میں جہاں عقل کیلئے انکشاف کا کوئی راستہ نہ ہو اور وحی ورسالت کے علاوہ کسی اور ذریعے سے ان کے سمجھنے کا امکان نہ ہو اور اگر انسان اپنی معمولی عقل اور وہم وگمان کو امور غیبیہ، اخرویہ اور تعبدیہ شرعیہ میں دخل دینے لگے تو اس کا انجام ضروریات ومسلمات کے انکار پر پہنچے گا اور پھر تھوڑا تھوڑا کرکے کمی سے زیادتی کی طرف اور نیچے سے اوپر کی طرف تمام ہوگا۔

بالفرض آپ کو روایت اور ان کے اسناد میں خدشہ ہو، انکار کا مجال تو ہے نہیں، مگر قرآن مجید (کتاب آسمانی) میں تو کوئی خدشہ نہیں ہے، اس میں بھی اس قسم کے ثواب کا ذکر ہے، مثلاً ﴿لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِنْ

الف شهر﴾ ۵۲ ''شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے'' یا ﴿مثل الذین ینفقون اموالهم فی سبیل الله کمثل حبة انبتت سبع سنابل فی کل سنبلة مائة حبة والله یضاعف لمن یشاء﴾ ۵۳ ''جو لوگ اپنے مال کو راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں ان (کے خرچ) کی مثال اس دانے کی سی ہے جس کی سات بالیاں نکلیں (اور) ہر بالی میں سو (۱۰۰) دانے ہوں اور خدا جس کیلئے چاہتا ہے دوگنا کر دیتا ہے'' بلکہ راقم کا گمان ہے اس قسم کا انکار اور اس پر تعجب، تکبر اور (اپنے) اعمال کو اہمیت دینے کے مترادف ہے، مثلاً کوئی شخص اگر ایک دن کا روزہ رکھے یا ایک شب بھر عبادت کرے اور اس کے بعد سنے کہ اس کا تو بہت ثواب ہے تو بعید نہیں سمجھے گا، حالانکہ اگر معیار عمل کی مزدوری ہوتی تو بہر حال بعید سمجھتا، لیکن چونکہ یہاں اس نے خود اپنے عمل کو بڑا اور قابل توجہ سمجھا ہے لہٰذا اس کے ثواب کی تصدیق کر رہا ہے۔

اے عزیز! ہماری تمام عمر پچاس ساٹھ سال کی ہے، فرض کرو ہم نے صحیح ایمان کے ساتھ تمام شرعی فرائض ادا کرتے ہوئے عمل صالح اور توبہ کے ساتھ عمر گزار کر انتقال کیا، اب ہمارے ان اعمال و ایمان کی کیا جزا ہوگی؟ کتاب و سنت و تمام مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ ایسا شخص مشمول رحمت اور مستحق جنت ہے۔ یعنی جنت جہاں وہ ہمیشہ نعمت و راحت میں رہے گا اور دائمی رحمت و روح و ریحان کا مستحق ہوگا کیا کوئی اس کا انکار کر سکتا ہے؟ نہیں! حالانکہ اگر جزا کا معیار عمل کے مطابق ہوتا تو بفرض محال اگر ہمارے عمل کی کوئی جزا ہوتی تو یہ بہر حال نہ ہوتی کہ عقل اس کی کمیت و کیفیت کے تصور سے عاجز ہوتی۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ اس بات کی بنیاد کسی اور چیز پر اور کسی اور ڈگر پر قائم ہے۔ لہٰذا اب یہ تو بعید از عقل نہیں رہا اور نہ انکار کا کوئی راستہ باقی ہے۔

چوتھی فصل

نوافل کی تعداد

رسول خدا ؐ نے جو فرمایا ہے ''پچاس رکعت نماز میری سنت کے مطابق ہے'' اس سے مقصود تمام پنجگانہ نمازیں اور ان کی نوافل ہیں، سوائے ان دو رکعت نفل کے جو نماز عشاء کے بعد بیٹھ کر پڑھی جاتی ہے اور ایک رکعت شمار ہوتی ہے اور اس کو ملا کر واجب نمازوں اور نوافل کی تعداد روزانہ ۵۱ رکعت ہو جاتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ رسول خدا ؐ نے اس کا ذکر اس لئے چھوڑ دیا ہو کہ باقی پچاس رکعتیں سنت مؤکدہ ہیں۔ جیسا کہ ابن عمیر کی روایت اس مطلب پر دلالت کرتی ہے، وہ کہتے ہیں

﴿سَأَلْتُ أَبَا عَبْدِ اللهِ علیہ السلام عَنْ أَفْضَلِ مَا جَرَتْ بِهِ السُّنَّةُ مِنَ الصَّلَاةِ قَالَ: تَمَامُ الْخَمْسِينَ﴾ ۵۴ ''میں نے امام جعفر صادقؑ سے سنتی نمازوں میں سب سے افضل کا پوچھا تو فرمایا پوری پچاس رکعتیں'' اور بعض روایت سے پتہ چلتا ہے کہ خود رسول خداؐ کی سیرت انہیں پچاس رکعتوں کی تھی ۵۵ اگر چہ بعض دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ عتمہ (عشاء کے بعد والی دو رکعتوں) کو پڑھا کرتے تھے ۵۶ اور ہوسکتا ہے کہ اس کا ذکر نہ کرنا اور پچاس رکعتوں کا ہی سنت ہونا، اس وجہ سے ہو کہ عتمہ نماز وتر کے بدلے میں ہوتی ہے، خود مستقل کوئی نماز نہیں ہے۔ چنانچہ فضیل بن یسار کی روایت اس پر دلالت کرتی ہے ۵۷ اور روایت میں اس کا نام وتر بتایا گیا ہے ۵۸ اور بعض روایات میں ہے کہ ''اگر کوئی عتمہ پڑھ کر مر جائے تو گویا وہ وتر پڑھ کر مرا ہے'' ۵۹ پس در حقیقت یہ دو رکعت نماز وتر ہے جو حادثۂ موت کے خوف سے اپنے وقت سے پہلے پڑھی جاتی ہے، لیکن اگر وتر کا وقت آ گیا تو یہ وتر سے کفایت نہیں کرے گی اور بعض روایات میں ہے ''یہ دونوں رکعتیں پنجگانہ نمازوں میں نہیں ہیں، ان کو تو محض اس لئے اضافہ کر دیا گیا ہے تا کہ عدد مکمل ہو جائے اور نافلہ کی دونوں رکعتیں ایک رکعت واجب کے مقابلہ میں پڑھی جائیں'' ۶۰ ان احادیث میں عددوں کے اعتبار سے اختلاف نہیں ہے، بلکہ ممکن ہے سنت کے زمرے میں آنے والی افضل نمازیں وہی پچاس رکعتیں ہوں اور یہ دو رکعت سنت غیر مؤکدہ ہو، اس کو بطور احتیاط حادثۂ موت اور تکمیل عدد کیلئے قرار دیا گیا ہو۔

بہر حال نوافل یومیہ کی بہت فضیلت بیان کی گئی ہے، بلکہ بعض روایات میں ترک نوافل کو معصیت قرار دیا گیا ہے ۶۱ اور بعض میں ہے کہ ''خداوند عالم ترک سنت پر عذاب کرے گا'' ۶۲ اور بعض روایات میں اس کی تعبیر وجوب سے بھی کی گئی ہے ۶۳ اور یہ صرف تاکید اور اس کے ترک سے ممانعت کیلئے ہے۔ انسان کیلئے سزاوار ہے کہ حتی الامکان نوافل کو ترک نہ کرے، اس لئے کہ ان کے پڑھنے کی وجہ تکمیل فرائض اور اس کی قبولیت ہے ۶۴ بعض روایات میں فرمایا گیا ہے ''ہمارے شیعہ ۵۱ رکعت نماز والے ہیں'' ۶۵ حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیعہ یہ نوافل بجالاتے ہیں، نہ صرف اس پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ ان کے مدمقابل میں اہل سنت ہیں۔ چنانچہ علامات مؤمن والی حدیث سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ ۶۶

ہر ماہ تین روزے کا استحباب

رسول خدا ؐ کی دوسری سنت ہر ماہ تین روزے رکھنا ہے۔ تقریباً چالیس حدیثیں اس کی فضیلت پر دلالت کرتی ہیں۔[67] البتہ ان کی کیفیت کے بارے میں علما کے درمیان اختلاف ہے لیکن جو بات علما کے درمیان مشہور، اخبار کثیرہ کے موافق، عمل رسول خدا ؐ کی آخری عمر کے مطابق ہے اور جس پر ائمہ ہدیٰ ؑ گواہ ہیں، وہ یہ ہے کہ ہر ماہ تین دن روزہ رکھا جائے (یعنی) اس کی پہلی جمعرات جو اعمال پیش کرنے کا دن ہے اور دوسرے عشرے کا پہلا بدھ جو مسلسل روز نحس اور عذاب کا دن ہے اور آخری عشرے کی آخری جمعرات، یہ بھی اعمال پیش کرنے کا دن ہے۔[68] ایک روایت میں ہے کہ سابق امتوں میں جب بھی عذاب نازل ہوتا تھا انہیں دنوں میں سے کسی دن ہوتا تھا۔ اس لئے رسول خدا ؐ نے ان مخوف دنوں میں روزہ رکھا[69] اور حدیث میں ہے کہ ان تینوں دنوں کا روزہ ایک زمانے کے روزے کے برابر ہے۔[70] اور بعض روایت میں اس کی علت اس آیت کو بیان کیا گیا ہے ﴿من جاء بالحسنة فله عشر امثالها﴾[71] ''جو نیکی کرے گا اس کو دس گنا ثواب دیا جائے گا''۔

اور جو بعض روایتوں میں اس ترتیب کے خلاف آیا ہے وہ مراتب فضل پر محمول ہے (ان میں کوئی تعارض نہیں ہے) اور اگر بالفرض تعارض ہو بھی تو متعدد جہات سے انہیں روایات کو ترجیح دی جا سکتی، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان روایات اور مخالف روایات کا تعارض نص و ظاہر یا اظہر و ظاہر کا تعارض ہے اور مرسلۂ صدوق ؒ جس میں ہے ''اگر آخری عشرے میں دو جمعراتیں پڑ جائیں تو اس کی پہلی جمعرات کو روزہ رکھو۔ اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ دوسری جمعرات تم کو نصیب نہ ہوسکے''[72] تو یہ ان روایات کے منافی نہیں ہے، کیونکہ اس مرسلہ کا ظاہر یہ ہے کہ فضیلت کو جلدی حاصل کر لیا جائے اس لئے کہ ہوسکتا ہے دوسری جمعرات تک موت آ جائے یا کوئی اور رکاوٹ پیدا ہو جائے۔ جیسا کہ عتمہ میں بھی یہی حکمت ملحوظ ہے۔ پس یہ روایت بھی ان روایات میں سے ہے جو مقصد پر دلالت کرتی ہے۔ یعنی آخری جمعرات کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے نہ کہ یہ معارض روایات میں سے ہے اور بظاہر اگر پہلی جمعرات کو روزہ رکھ لیا اور آخری جمعرات درک کر لیا تو افضل یہ ہے کہ اس فضیلت کا ادراک کرے اور پہلا روزہ کافی نہ ہوگا اور محقق جلیل القدر، فیض کاشانی ؒ[73] اور محدث عالی شان، صاحب حدائق ؒ[74] نے جو مقام جمع میں فرمایا ہے وہ بعید ہے،

خصوصاً دوسرے بزرگ نے جو فرمایا ہے۔۵؎

صدقے کی فضیلت

رسول خدا ؐ کی تیسری خصلت صدقہ دینا اور اس میں کوشش کرنا تھی۔ پس یہ بھی مستحبات میں سے ایسا مستحب ہے کہ کوئی اور مستحب کمتر اس درجے کے ہیں۔ صدقے کے سلسلے میں روایات، یہاں تک کہ غیر مذہب والوں اور بری و بحری جانوروں کو صدقہ دینے کے بارے میں اتنی زیادہ ہیں کہ اس کتاب میں نہیں سما سکتیں۔ میں صرف بعض کے ذکر پر اکتفا کروں گا۔

مُحَمَّدُ بنُ یَعقُوب باسنادِہِ عَنْ عَبدِ اللہِ بنِ سِنانٍ فی حدیثٍ قالَ قال ابُو عبدِ اللہِ علیہ السلام ﴿لَیسَ شَیءٌ اَثْقَلَ عَلَی الشَّیطانِ مِنَ الصَّدَقَۃِ عَلَی المُؤمِنِ، وَھِیَ تَقَعُ فِی یَدِ الرَّبِّ تَبارَکَ وَتَعالی قَبْلَ اَنْ تَقَعَ فِی یَدِ العَبْدِ﴾۶؎ ”ابن سنان کا بیان ہے کہ امام جعفر صادق ؑ کا فرمان ہے مومن کو صدقہ دینے سے زیادہ کوئی بھی عمل شیطان پر گراں نہیں ہے اور صدقہ بندے کے ہاتھ میں پہنچنے سے پہلے خدا کے ہاتھ میں پہنچتا ہے“۔

وباسنادہ عَنْ اَبی عَبْدِ اللہِ علیہ السلام فی حدیثٍ قال ﴿اِنَّ اللہَ لَمْ یَخْلُقْ شَیئاً اِلّا وَلَہُ خازِنٌ یَخْزُنُہُ اِلّا الصَّدَقَۃَ، فَاِنَّ الرَّبَّ یَلِیھا بِنَفْسِہِ وَکانَ اَبی اِذا تَصَدَّقَ بِشَیءٍ وَضَعَہُ فِی یَدِ السّائِلِ، ثُمَّ ارْتَدَّہُ مِنْہُ فَقَبَّلَہُ وَشَمَّہُ، ثُمَّ رَدَّہُ فی یَدِ السّائِلِ﴾۷؎

”امام جعفر صادق ؑ نے فرمایا خدا نے کوئی بھی چیز ایسی نہیں خلق فرمائی جس کیلئے نگہبان نہ رکھا ہو کہ اس کی حفاظت کرے سوائے صدقے کے کہ خدا خود اس کی حفاظت کرتا ہے۔ میرے والد ماجد جب صدقہ دیتے تھے تو سائل کے ہاتھ میں رکھ کر اٹھا لیتے تھے پھر اس کو چوم کر اور سونگھ کر سائل کو واپس کر دیتے تھے“۔

اسی مضمون کی چند اور احادیث بھی ہیں ۸؎ جو صدقے کی عظمت شان اور بلند مرتبے پر دلالت کرتی ہیں کہ خدا نے اس کی حفاظت کسی اور کے سپرد نہیں کی، بلکہ اپنے ید قدرت اور احاطۂ قیومیت سے اس کی کامل غیبی صورت کی حفاظت فرمائی ہے۔

اس حدیث اور اس جیسی دوسری احادیث میں غور و فکر جو کتب اصحاب (حدیث) کے ابواب متفرقہ میں منقول ہیں، اہل معرفت و اصحاب قلوب کیلئے کشف توحید فعلی، تجلی قیومی حق کرتی ہیں اور جو لوگ اس اہم

کام کو انجام دیتے ہیں، ان کیلئے ایک اہم نکتے کا اشارہ ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ "صدقہ (پہلے خدا کے) ہاتھ میں گرتا ہے" نعوذ باللہ! اگر کسی قسم کا احسان کوئی فقیر پر جتانا چاہے یا اس کو اذیت دینا چاہے تو وہ پہلے خدا کے ساتھ ہوگا، جیسے کہ اگر کوئی صدقہ دینے میں تواضع وفروتنی کرے اور کمال عجز وانکسار سے صدقہ سائل مؤمن کو دے تو یہ پہلے خدا کیلئے ہوگا، جیسا کہ امام محمد باقرؑ جیسے عاشق جمال حق، سائل کے ہاتھ میں صدقہ دے کر پھر اس کو لے کر چومتے تھے اور محبوب کی بہترین خوشبو کو سونگھتے تھے اور خدا جانتا ہے کہ اس ذات مقدس اور مجذوب حق کو کتنی راحت نفس اور سکون قلب حاصل ہوتا تھا اور عشق خدا کا یہ عمل، دل میں اٹھنے والے شعلوں اور باطنی شوق کی آگ کو بجھا دیتا تھا۔

افسوس، ہزار افسوس! راقم، ہوائے نفس کے سمندر میں غرق، رذائل طبیعت میں ہمیشہ رہنے کی خواہش کے ساتھ شہوتوں میں گرفتار، شکم وفرج کا اسیر، ملک ہستی سے بے خبر، خودی وخود پرستی میں مست، یہاں دنیا میں آیا اور عنقریب یہاں سے چلا جائے گا، اس نے محبت وعشق کا کچھ بھی ادراک نہ کیا اور ان کے جذبات ومقامات ومنازل ودرجات کو کچھ نہ سمجھ سکا۔ اس کا وقوف اس عالم میں وقوف حیوانی اور حرکات حیوانی وشیطانی تھے اور اگر یہی حالت رہی تو اس کی موت بھی موت حیوانی وشیطانی ہوگی۔ ﴿اللّٰهُمَّ اِلَيْكَ الْمُشْتَكَى وَعَلَيْكَ الْمُعَوَّلُ﴾ [۷۹] "خدایا! تجھ ہی سے شکوہ وشکایت ہے اور تجھ ہی پر بھروسہ ہے"۔

خداوندا! تو اپنے نور ہدایت سے ہماری دستگیری فرما اور اس گہری نیند سے ہم کو جگا دے اور عالم غیب ونور اور دار مسرت وسرور اور خلوت انس ومحفل خاص میں دعوت دے۔

وباسناده عن أبي عبد الله عليه السلام قال قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم ﴿اَرْضُ الْقِيَامَةِ نَارٌ مَا خَلَا ظِلَّ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّ صَدَقَتَهُ تُظِلُّهُ﴾ [۸۰] "امام جعفر صادقؑ نے فرمایا رسول خدا کا ارشاد ہے قیامت کی (پوری) زمین آگ ہے سوائے مؤمن کے سایہ کے۔ اس لئے کہ اس کا صدقہ اس پر سایہ کئے رہتا ہے"۔

روایت میں ہے "خدا صدقہ کی اسی طرح تربیت کرتا ہے جس طرح تم لوگ اونٹ کے بچے کی تربیت کرتے ہو۔ اگر تم آدھی کھجور صدقے میں دو تو خدا اس کی تربیت کر کے قیامت کے دن تم کو کوہ احد جیسی سے (بھی) بڑی صورت میں دے گا" [۸۱]

اس قسم کی احادیث بہت ہیں۔ بہت سی احادیث میں آیا ہے کہ صدقے سے، انسان بری موت سے بچتا ہے، [۸۲] صدقے سے روزی زیادہ ہوتی ہے، [۸۳] قرض ادا ہو جاتا ہے، [۸۴] عمر میں اضافہ ہوتا ہے،

خدا ستر قسم کی بری موتوں سے بچاتا ہے،۸۵ خداوند عالم اس کا عوض دس سے لے کر ایک لاکھ گنا تک عطا کرتا ہے،۸۶ مال و دولت میں اضافے کا باعث بنتا ہے،۸۷ جو شخص صبح کو صدقہ دیدے وہ اس دن آسمانی بلاؤں سے محفوظ رہتا ہے۔ اگر وہ پہلی رات کو صدقہ دیدے تو وہ اس رات آسمانی بلاؤں سے محفوظ رہتا ہے،۸۸ مریضوں کا علاج صدقے سے ہوتا ہے،۸۹ اور اگر کوئی ایک مسلمان گھرانے کی کفالت کرے، ان کے کھانے پینے کا انتظام کرے، کپڑے پہنائے، ان کی عزت و آبرو بچائے تو یہ ستر حج سے زیادہ محبوب ہے، جبکہ ایک حج ستر غلاموں کے آزاد کرنے سے بہتر ہوتا ہے۹۰ اور اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ غلام آزاد کرنے کے سلسلے میں روایت کی گئی ہے کہ جو شخص ایک غلام آزاد کرے، خداوند عالم (غلام کے) ہر عضو کے مقابلے میں اس کے ہر عضو کو آتش جہنم سے بری کر دے گا۔۹۱

حضرت علی علیہ السلام نے اپنے داہنے ہاتھ کی کمائی سے ایک ہزار غلام آزاد فرمائے تھے۔۹۲ اس کے علاوہ بھی احادیث ہیں مگر اس کا ذکر طوالت کا باعث ہوگا۔

دوسرے نکتے کا بیان

میں اس بحث کو ایک قابل ذکر نکتے کے ساتھ ختم کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ آیت میں ہے: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ ۹۳ "تم ہرگز نیکی حاصل نہیں کر سکتے جب تک اپنی محبوب چیز میں سے کچھ راہ خدا میں خرچ نہ کرو"

اور حدیث میں ہے "امام جعفر صادقؑ شکر (مٹھائی) کو صدقہ میں دیا کرتے تھے۔ لوگوں نے پوچھا آخر آپ شکر کیوں صدقہ میں دیتے ہیں؟ فرمایا میں ہر چیز سے زیادہ شکر کو پسند کرتا ہوں اور چاہتا ہوں جو چیز میرے نزدیک پسندیدہ ترین ہے اسی کو صدقے میں دوں"۔۹۴

ایک اور حدیث میں ہے "حضرت علیؑ نے ایک لباس خریدا وہ آپؑ کو بہت پسند آیا، آپؑ نے صدقہ کر دیا اور فرمایا میں نے رسول خداؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے جو شخص غیر کو اپنے اوپر مقدم کرے، خدا قیامت کے دن اس کیلئے بہشت کو عطا کرتا ہے اور جو شخص کسی چیز کو پسند کرتا ہو اور پھر اس کو خدا کیلئے قرار دے تو قیامت کے دن خدا کہے گا، میرے بندے نیکی کا بدلہ ایک دوسرے کو نیکی سے دیتے ہیں اور میں آج تیری جزا جنت قرار دوں گا"۔۹۵

حدیث ۲۹ ...(۵۶۵)

روایت میں ہے کہ جب مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی تو رسول خدا کے ایک صحابی نے اپنے اس باغ کو جسے وہ بہت زیادہ پسند کرتا تھا اپنے رشتے داروں میں تقسیم کر دیا۔ رسول خدا نے فرمایا "تم کتنے خوش قسمت ہو، کتنے خوش قسمت ہو کہ یہ تیرے حق میں بہت ہی مفید ہے"۔۹۶

ایک مرتبہ ابوذرؓ کے پاس ایک مہمان آیا۔ ابوذرؓ نے کہا مجھے کام ہے، تم جاؤ جو اونٹ سب سے عمدہ ہو اسے میرے اونٹوں میں سے لے آؤ۔ مہمان گیا، لاغر اونٹ لایا۔ ابوذرؓ نے کہا تو نے میرے ساتھ ناانصافی کی۔ اس نے کہا: بہترین اونٹ تو نر اونٹ تھا مگر میں نے سوچا آپ کو اس کی ضرورت ہو سکتی ہے (اس لئے اس کو نہیں لایا)۔ ابوذرؓ نے کہا میرے لئے ضرورت تو اس وقت ہوگی جب مجھے قبر میں رکھا جائے، خدا کا حکم ہے "تم نیکی تک اس وقت تک نہیں پہنچو گے جب تک اپنی پسندیدہ ترین چیز راہ خدا میں نہ دو"۔ اس کے بعد ابوذرؓ نے کہا: مال کے تین حصے دار ہیں ایک تقدیر ہے جس کے نزدیک اچھے یا برے ہونے کی کوئی قید نہیں ہے وہ سب ہی کو تباہ کر دیتی ہے دوسرا وارث ہے جو تیری موت کا منتظر ہوتا ہے اور تیسرا تو خود ہے۔ لہذا اگر تم چاہتے ہو کہ ان دونوں سے کمزور نہ ہو تو اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ ارشاد خداوند ہے ﴿لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون﴾ ۹۷ میرے اموال میں یہ اونٹ سب سے زیادہ مجھے محبوب تھا اس لئے مجھے سب سے زیادہ یہ بات پسند تھی کہ اس کو اپنے لئے پہلے بھیج دوں۔۹۸

صدقے کا اسرار

یہ معلوم ہونا چاہئے کہ انسان مال و متاع اور زیبائش دنیا کی محبت کے ساتھ نشو و نما پاتا ہے اور یہ بات اس کے دل کی گہرائیوں میں جڑ پکڑتی ہے اور زیادہ تر اخلاقی برائیوں اور برے عمال، بلکہ دینی مفاسد کا منبع بھی ہے، جیسا کہ بہت سی حدیثوں میں بھی وارد ہوا ہے۹۹ اور ہم نے بھی بعض حدیثوں کی شرح کرتے ہوئے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔۱۰۰ لہذا اگر انسان صدقات اور ایثار نفس کے ذریعے اس محبت دنیا کو ختم یا کم کر سکے تو مادہ فساد اور برائیوں کی جڑ کو (گویا) اس نے کاٹ دیا اور حصول معارف عالم غیب و ملکوت کیلئے وقف ہو کر حصول ملکات فاضلہ و اخلاق کاملہ کا دروازہ اپنے لئے کھول لیا اور یہ واجب و مستحب انفاق کے سلسلے میں ایک اہم نکتہ ہے۔ مستحبات میں یہ نکتہ زیادہ کامل ہے، جیسا کہ واضح ہے۔

پس اس باب کے مجموعہ اخبار و آثار سے پتہ چل گیا کہ صدقہ دنیوی اور اخروی فضائل کا جامع ہے اور

صدقہ دینے کے وقت سے انسان کے ہمراہ ہے اور بلاؤ مصیبت کو دور کرتا اور انسان کو آخری وقت، یعنی بہشت اور جوارِ حق تک پہنچانے میں مددگار رہتا ہے۔

تتمہ

یہ بھی جان لینا چاہئے کہ صدقہ، مستحق کو چھپ کر دینا کھلم کھلا دینے سے افضل ہے۔ چنانچہ کافی شریف میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے ﴿یا عمّارُ! الصَّدَقةُ في السِّرِّ واللهِ أفضلُ من الصَّدَقةِ في العلانيةِ، وكذلك واللهِ العبادةُ في السِّرِّ أفضلُ منها في العَلانيةِ﴾ ۱۰۱ "اے عمار! خدا کی قسم پوشیدہ طور پر صدقہ دینا، علانیہ طور پر دینے سے افضل ہے۔ اسی طرح خدا کی قسم پوشیدہ طور پر خدا کی عبادت، علانیہ طریقے سے بہتر ہے۔"

بہت سی احادیث نقل کی گئی ہے کہ "چھپ کر صدقہ دینا، غضب پروردگار کو خاموش کر دیتا ہے"۔۱۰۲

ایک حدیث میں ہے "سات گروہ ایسے ہیں جن کو خدا اپنی پناہ میں اس دن محفوظ رکھتا ہے جس دن اس کے علاوہ کسی کی پناہ نہیں ہوتی، ان میں سے ایک، پوشیدہ طور پر اس طرح صدقہ دینا ہے کہ اگر بائیں ہاتھ سے دے تو داہنے ہاتھ کو خبر نہ ہو"۔۱۰۳ ہوسکتا ہے افضلیت کی وجہ یہ ہو کہ پوشیدہ عبادت ریاکاری سے بہت دور اور خلوص سے بہت قریب ہوتی ہے اور دوسری وجہ یہ (ہوسکتی) ہے کہ پوشیدہ طریقہ سے صدقہ دینے میں حاجتمندوں کی عزت و آبرو محفوظ رہتی ہے۔

اسی طرح رشتہ داروں اور قرابت داروں پر صدقہ کرنا دوسروں پر صدقہ کرنے سے افضل ہے اور اس پر صلۂ رحم کی عبادت کا عنوان بھی صادق آتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے "سب سے افضل صدقہ، رشتہ دار پر صدقہ کرنا ہے"۔ "مومنین سے صلہ کرنے کا اجر بیس گناہ ہے اور رشتہ داروں سے صلے کا اجر ۲۴ گنا ہے"۔۱۰۴ اور بعض روایات میں ہے کہ "اگر رشتہ دار محتاج ہو تو غیر رشتہ دار پر صدقہ کرنا قبول نہیں ہوتا"۔۱۰۵

خاتمہ

واضح ہو کہ اس حدیث شریف میں جو فرمایا گیا ہے "صدقہ دینے کی کوشش کرو یہاں تک کہ تم کو گمان ہو جائے کہ تم نے اسراف کیا ہے، حالانکہ اسراف نہیں کیا"۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صدقے میں کثرت

مطلوب ہے اور صدقہ چاہے جتنا دیا جائے اسراف نہ ہوگا چنانچہ حدیث میں آیا ہے ''امام حسنؑ نے تین مرتبہ اپنا مال فقرا کو آدھا آدھا کر کے تقسیم کر دیا تھا یہاں تک کہ دو جوتیاں یا دو جوڑے کپڑے تھے تو ان کو بھی تقسیم کر دیا تھا''۔۱۰۶

ایک اور حدیث میں ہے کہ امام رضاؑ نے امام محمد تقیؑ کو لکھا ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ جب تم سوار ہوتے ہو تو تمہارے غلام تم کو چھوٹے دروازے سے باہر لے جاتے ہیں، وہ لوگ بخل کرتے اور چاہتے ہیں تم کسی کو کچھ نہ دو۔ تم کو میرے حق کی قسم! جب بھی باہر نکلو یا اندر آؤ تو بڑے دروازے سے آمد و رفت کرو اور جب سوار ہو تو اپنے ساتھ سونا چاندی رکھو اور جو بھی تم سے سوال کرے اس کو عطا کرو۔ تمہارے چچاؤں میں سے اگر کوئی سوال کرے تو اس کو پچاس دینار سے کم نہ دو اور اگر زیادہ دینا چاہو تو تم کو اختیار ہے اور میں نے اس سے ارادہ کیا ہے کہ خدا تمہارے مقام کو بلند کرے۔ لہذا تم خرچ کرو اور اس سے نہ ڈرو کہ خدا تم پر تنگی کرے گا''۔۱۰۷

یہ حدیث، ان احادیث سے تضاد نہیں رکھتیں جن میں ہے کہ ''اتنا زیادہ صدقہ کرنا جس سے عیال پر تنگی ہو جائے اسراف ہے'' یا جن میں ہے کہ ''جو شخص اتنا خرچ کر دے کہ بچے اور اپنے عیال کیلئے کچھ نہ چھوڑے تو خدا اس کی دعا قبول نہیں کرتا''۱۰۸ یا یہ کہ حدیث میں ہے کہ ''بہترین صدقہ وہ ہے جو اپنی کفاف سے زیادہ ہو''۔۱۰۹ (ان دونوں قسم کی احادیث میں) تضاد نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ صدقے میں اتنی کثرت اور کوشش واجب نہیں ہے کہ وہ صدقہ اتنا ہو کہ باعث تنگی عیال ہو جائے، اس لئے کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنا نصف مال بھی صدقہ کر دینے کے بعد اپنے اور اپنے عیال کیلئے کافی مال باقی رکھتے ہیں اور ایسا نہیں ہوتا کہ تنگی معاش و تنگی میں مبتلا ہو جائیں۔

نماز شب کی فضیلت

اس حدیث شریف میں نماز شب اور نماز ظہر کی ادائگی کی بہت تاکید کی گئی ہے۔ نماز شب کے سلسلے میں تو میں نے پہلے بھی بعض احادیث کی شرح کرتے ہوئے بیان کیا ہے۱۱۰ یہاں پر میں تہجد کا بعض حدیثوں کے ذکر پر اکتفا کروں گا۔

وسائل میں کافی کے حوالے سے امام جعفر صادقؑ کا یہ قول نقل کیا ہے۔ ''مومن کا شرف نماز شب

پڑھنے میں ہے اور اس کی عزت لوگوں کی آبرو بچانے میں ہے"۔[۱۱]

ایک دوسری حدیث میں امام جعفر صادقؑ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے "حضرت رسول خداؐ نے جبرئیلؑ سے فرمایا مجھے کچھ موعظہ کرو۔ جبرئیلؑ نے کہا اے محمد! چاہے جتنی زندگی حاصل کرلو ایک دن بہر حال مرنا ہے، جس چیز کو چاہو پسند کرو مگر اس سے کسی نہ کسی دن جدا ہونا ہے، جو تم چاہے عمل کرو یک نہ ایک دن اس سے ملاقات کرنی ہے اور یہ جان لو کہ مؤمن کا شرف نماز شب ہے اور اس کی عزت لوگوں کی آبرو کی حفاظت ہے"۔[۱۲]

امام جعفر صادقؑ سے نقل کی گئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا "مال و اولاد، دنیوی زندگی کی زینت ہیں اور آخر شب میں آٹھ رکعت نماز، اور نماز وتر، آخرت کی زینت ہے اور کبھی خدا کسی گروہ کیلئے دونوں کو اکٹھا کر دیتا ہے"۔[۱۳]

شیخ مفیدؒ سے نقل کیا گیا ہے کہ رسول خداؐ نے فرمایا "جب کوئی بندہ اپنے (نرم و) لطیف بستر سے خدا کی خوشنودی کی خاطر، نماز شب کیلئے اونگھتے ہوئے اٹھتا ہے تو اس کی وجہ سے خدا ملائکہ پر فخر کرتا ہوا فرماتا ہے: گواہ رہنا میں نے اس کو بخش دیا"۔[۱۴]

نماز شب کی فضیلت میں اس قسم کی احادیث بہت ہیں اور ان کے ذکر کی گنجائش اس مختصر سی کتاب میں نہیں ہے

صلاۃ وسطیٰ کا بیان

اور نماز زوال جس کی رسول خداؐ نے بہت تاکید کی ہے اس سے مراد، نماز ظہر کے نوافل ہیں۔ چنانچہ دوسری روایت میں اس کی تصریح موجود ہے[۱۵] اور ان نوافل کی تاکید یا خود ان کی اپنی خصوصیت و اہمیت کی وجہ سے یا پھر اس وجہ سے ہے کہ یہ نماز وسطیٰ کے متعلقات میں سے ہیں اور اس کی قبولیت اور تکمیل کا سبب ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اس حدیث میں خود نماز ظہر مراد ہو، کیونکہ وہی نماز وسطیٰ ہے، اس لئے کہ نماز یومیہ کے وسط میں ہے اور خداوند عالم نے آیہ شریفہ ﴿حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ﴾[۱۶] "تم تمام نمازوں کی اور (خصوصاً) بیچ والی نماز کی پابندی کرو" میں مخصوص طور سے اس کی حفاظت اور اس کے قائم کرنے کا حکم دیا ہے اور فقہا کے درمیان مشہور اور اظہر، صلاۃ وسطیٰ سے مراد، نماز ظہر

ہے جس کو دیگر نمازوں کے درمیان مزید خصوصیت حاصل ہے اور یہی نماز ظہر وہ پہلی نماز ہے جس کو خدا نے جبرئیلؑ کے ذریعے حضرت آدمؑ پر اتارا تھا۔

اور رسول خداؐ کے اس فرمان ﴿علیک بصلاۃ الزوال﴾ سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ کی مراد نوافل اور اس کے وقت وحدود کی حفاظت ہے صرف اصل نماز کے پڑھنے کا حکم نہیں ہے۔ جس طرح نمازوں، خاص طور پر نماز ظہر کی حفاظت سے بھی یہی بات سمجھ میں آتی ہے۔ چنانچہ اہل بیتؑ کی روایات میں نمازوں کے اوقات کی حفاظت اور اوقات فضیلت میں ان کو ادا کرنے کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے، بلکہ کبھی تو بغیر کسی وجہ کے وقت فضیلت پر نہ پڑھنا، وقت ضائع کرنے اور تساہل وسستی برتنے کا سبب بن سکتا ہے، خصوصاً جب آدمی مسلسل اسی طرح پڑھتا ہو۔ اس لئے کہ سب ہی کو معلوم ہے جو شخص کسی چیز کو اہمیت دیتا ہے وہ اس کو جلدی اور عمدہ طریقہ سے انجام دیتا ہے۔ برخلاف اس کے کہ اگر اس کی اہمیت نہیں سمجھتا اور اس کی ادائیگی میں سستی وتغافل برتتا ہے اور خدا نہ کرے کہ یہ کام استخفاف نماز اور سہل انگاری تک پہنچ جائے، کیونکہ رسول خداؐ نے فرمایا ہے " جو نماز کا استخفاف کرتا ہے اگر وہ اسی حالت پر مر جائے اور اس کی نماز یہی ہو تو میرے دین پر نہیں مرے گا "۔ بلکہ کبھی تو سہل انگاری اور سستی کی وجہ سے معاملہ ترک نماز تک پہنچ جاتا ہے اور یہ بات فطری ہے کہ جس چیز کی اہمیت نہ ہو وہ رفتہ رفتہ نظروں سے گر جاتی ہے اور انسان اسے بھول جاتا ہے۔ دنیوی کاموں میں ہم کو فراموشی بہت ہی کم ہوتی ہے، خصوصاً جو بہت اہم ہو، کیونکہ نفس اس کی اہمیت اور بہت زیادہ محبوب رکھنے کی وجہ سے اپنی توجہ اسی کی طرف رکھتا ہے اور ہمیشہ اس کو یاد رکھتا ہے۔ ظاہر ہے ایسی چیز بھولنے والی نہیں ہوتی۔ مثلاً اگر کوئی آپ سے وعدہ کر لے کہ میں فلاں دن دوپہر کے وقت آپ کو ایک رقم دوں گا جو آپ کی نظر میں اہم ہو اور آپ اس شخص کو سچا بھی سمجھتے ہوں تو آپ اس کو اور اس وقت کو نہ بھولیں گے۔ دن گنتے رہیں گے اور مقررہ وقت پر نہایت دلجمعی اور توجہ تام کے ساتھ پہنچ جائیں گے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس چیز کی محبت اور اس کی عظمت جو آپ کی نظر میں ہے آپ کو آمادہ کرے گی اور سستی نہ کرنے دے گی۔ یہی صورت دیگر دنیوی امور میں ہے جن کی آپ کی نظر میں اہمیت ہے۔ لیکن اگر آپ کی نظر میں کوئی چیز حقیر اور پست ہوگی تو اگر نفس اس کی طرف توجہ بھی کرے گا تو وقتی ہوگی اور پھر اسے بھول جائے گا اور پھر غفلت چھا جائے گی

اسی سے پتہ چلتا ہے کہ دینی امور میں ہماری سستی کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم غیب پر ایمان نہیں

رکھتے، ہمارے یقین وایمان کی بنیاد کمزور ہے، خدا اور انبیاءؑ کے وعدے دل سے قبول نہیں، ہماری نظر میں تمام الٰہی کیفیت اور شرائع دینی پست اور کمزور ہیں اور یہی سستی رفتہ رفتہ تغافل کی طرف لے جائے گی یا اسی عالم میں ہم پر غفلت چھا جائے گی اور ظاہری دین سے بھی خارج کر دے گی یا موت کی شدت وسختی میں مکمل غفلت پیدا کرے گی۔

یہ پنجگانہ نمازیں دین کا ستون اور ایمان کی مستحکم بنیادیں ہیں۔ ایمان باللہ کے بعد اسلام میں اتنی اہمیت کسی اور چیز کو حاصل نہیں ہے اور یہ بات تو جہات نوریہ باطنیہ اور صور غیبیہ ملکوتیہ کے بعد خدا اور خاصان الٰہی کے علاوہ کسی کو نہیں معلوم۔ نماز میں مدنظر رکھے جانے والے الٰہی آداب اور کیفیات کے ساتھ ذکر خدا کا تکرار، اس کے اہم پہلوؤں میں سے ایک ہے جو خدا اور عالم غیب کے ساتھ انسان کا رابطہ مستحکم کرتا ہے، بلکہ خدا کے سامنے خضوع کی صفت کو دل کے اندر پیدا کرتا ہے۔ شجرۂ طیبۂ توحید اور وحدانیت کو اس طرح دل میں مستحکم کرتا ہے کہ وہ پھر کسی چیز سے زائل نہیں ہوتی۔ سکرات موت، ہوال مطلع اور شہودِ نمونۂ غیب کے موقع پر، انسان امتحان باری تعالیٰ میں کامیاب ہوتا ہے۔ دین مستقر ومحفوظ رہتا ہے اور عارضی اور زائل ہونے والے اور تھوڑے سے فشار سے بھول جانے والا نہیں رہتا۔

لہذا اے عزیز! ﴿اِیّاکَ ثُمَّ اِیّاکَ! وَاللہُ مُعِینُکَ فِی اُوْلٰیکَ وَاُخْراکَ﴾ ''خبردار پھر خبردار خدا دنیا وآخرت میں تمہارا مددگار رہے''۔ دینی معاملات میں، خصوصاً پانچ وقت کی نمازوں کے بارے میں سستی نہ کرنا اور ان کو کمزور نہ سمجھنا۔ خدا جانتا ہے کہ انبیاءؑ واولیاء وائمۂ ہدیٰؑ نے بندگان خدا پر بے انتہا شفقت کی بنا پر (نماز کیلئے) تی ترغیب اور تنبیہ فرمائی ہے (کہ انتہا نہیں ہے)، حالانکہ ہمارے ایمان سے ان کو نہ کوئی فائدہ پہنچے گا اور نہ ہمارے اعمال سے ان کو کوئی نفع حاصل ہوگا۔

پانچویں فصل: تلاوت قرآن کی فضیلت

رسول خداؐ کی ایک وصیت تلاوت قرآن کی ہے۔ قرآن کی تلاوت، حفظ، اس پر اعتقاد اور بھروسے، اس کی تعلیم، مسلسل اس کے دامن تھامے رکھنے، نیز قرآن کے مفاہیم اور اسرار میں غور وفکر کی فضیلت اتنی زیادہ ہے کہ ہماری ناقص سمجھ میں نہیں آسکتی اور صرف اہل بیتؑ ہی سے اس سلسلے میں جو (روایات) نقل کی گئی ہیں اس کی گنجائش اس مختصری کتاب کے اندر نہیں ہے۔ میں تھوڑا سا ذکر کرکے اسی پر قناعت کروں گا۔

کافی باسنادہ عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال ﴿القرآن عهد الله الی خلقه، فقد ینبغی للمرء المسلم ان ینظر فی عهده وان یقرأ منه فی کل یوم خمسین آیة﴾ ۱۱۹ ''امام جعفر صادقؑ نے فرمایا قرآن خدا کا وہ عہد ہے جو اس کی مخلوق سے (کیا گیا) ہے لہذا ہر مسلمان کو اس عہد کو دیکھنا چاہیے اور پچاس آیت روز پڑھنی چاہیے''۔

وباسنادہ عن الزهری قال سمعت علی بن الحسین علیهما السلام یقول ﴿آیات القرآن خزائن فکلما فتحت خزینة ینبغی لک ان تنظر فیها﴾ ۱۲۰ ''زہری کا بیان ہے کہ میں نے امام سجادؑ کو بیان کرتے ہوئے سنا کہ فرما رہے تھے قرآنی آیات خزانے ہیں، جب بھی کوئی خزانہ کھولا جائے تم کو اسے دیکھنا چاہیے''۔

ان دونوں احادیث کا ظاہر یہ ہے کہ آیات قرآنی میں تدبر اور ان کے معانی میں غور وفکر بہت اچھی بات ہے۔ آیات محکم الہیہ میں تدبر وتفکر، معارف وحکم کا سمجھنا، توحید وتفرد کا فہم (وفہام) یہ سب تفسیر بالرائے کے علاوہ ہے۔ تفسیر بالرائے کا مطلب اہل بیت وحیؑ سے جو کلام الٰہی کے مخاطب ہیں، تمسک کے بغیر اصحاب رائے اور بری خواہشات کے مطابق قرآنی متون کی تفسیر کرنا ہے جو اپنی جگہ ثابت ہے اور اس کی تفصیل یہاں نامناسب ہے۔ (آیات میں غور وفکر کیلیے) یہی آیت کافی ہے ﴿افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالها﴾ ۱۲۱ ''کیا یہ لوگ قرآن میں (ذرا بھی) غور نہیں کرتے''۔ روایت میں قرآن کی طرف رجوع کرنے اور اس کے معانی میں غور کرنے کی بہت تاکید کی گئی ہے۔ چنانچہ حضرت علیؑ سے منقول ہے: ''اس قرائت میں کوئی خیر نہیں ہے جس میں تفکر نہ ہو''۔ ۱۲۲

وباسنادہ عن ابی جعفر علیہ السلام قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ ﴿من قرأ عشر آیات فی لیلة لم یکتب من الغافلین، ومن قرأ خمسین آیة کتب من الذاکرین، ومن قرأ مائة آیة کتب من القانتین، ومن قرأ مائتی آیة کتب من الخاشعین، ومن قرأ ثلاثمائة آیة کتب من الفائزین، ومن قرأ خمسمائة آیة کتب من المجتهدین، ومن قرأ الف آیة کتب له قنطار من بر، القنطار خمسة عشر الف مثقال من ذهب، والمثقال اربعة وعشرون قیراطاً اصغرها مثل جبل احد، واکبرها ما بین السماء والارض﴾ ۱۲۳

''امام محمد باقرؑ سے روایت کی گئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا حضرت رسول خداؐ کا ارشاد ہے جو شخص رات میں

دس آیتوں کی تلاوت کرے اس کو غافلوں میں نہیں لکھا جاتا، جو پچاس آیتوں کی تلاوت کرے اس کو ذاکرین میں لکھا جاتا ہے، جو سو آیتوں کو پڑھے اس کو قانتین میں لکھا جاتا ہے، جو دو سو آیتوں کو پڑھے اس کو خاشعین میں لکھا جاتا ہے، جو تین سو آیتوں کو پڑھے اس کو فائزین میں لکھا جاتا ہے، جو پانچ سو آیتیں پڑھے اس کو مجتہدین میں لکھا جاتا ہے اور جو ایک ہزار آیات کی تلاوت کرے اس کی نیکیوں کا ایک قنطار رکھا جاتا ہے۔ یک قنطار پندرہ ہزار مثقال سونے کا ہوتا ہے اور ایک مثقال ۲۴ قیراط کا ہوتا ہے۔ سب سے چھوٹا قیراط کوہ احد کے مانند ہوتا ہے اور سب سے بڑا اتنا ہوتا ہے جتنا فاصلہ زمین و آسمان کے درمیان ہوتا ہے"۔

بہت سی روایات میں ہے کہ "قرآن بہت ہی خوبصورت شکل میں آئے گا (یا) وہ اہل قرآن اور تلاوت کرنے والوں کی شفاعت کرے گا"۱۲۴ مگر میں نے ان روایت سے صرف نظر کریں۔

حدیث میں ہے "جو مومن جوانی میں تلاوت قرآں کرتا ہے قرآن اس کے گوشت اور خون میں داخل ہو جاتا ہے اور خداوند عالم اس کو سفرائے کرام کے ساتھ نیک لوگوں میں سے قرار دیتا ہے اور قیامت میں قرآن اس کی پناہ ہے۔ قرآن خدا کے سامنے کہے گا پالنے والے! ہر عامل نے اپنا اجر پایا سوائے اس کے جو میرے اوپر عمل کرنے والا تھا۔ پس تو اپنی بہترین عطا اس کو مرحمت فرما۔ تب خدا بہشت کی خلعتوں سے اس کو خلعت پہنائے گا، اس کے سر پہ تاج کرامت رکھے گا اور خطاب کرے گا کیا تو راضی ہو گیا؟ قرآن کہے گا میں اس سے زیادہ کی امید رکھتا ہوں۔ تب امن و امان اس کے داہنے ہاتھ میں دیں گے اور خلد کو بائیں ہاتھ میں، پھر وہ بہشت میں جائے گا اور اس سے کہا جائے گا تلاوت کر اور ایک درجہ اوپر آ۔ پھر قرآن سے خطاب ہوگا۔ کیا میں نے اس کو مقامات تک پہنچا دیا اور تو راضی ہو گیا؟ قرآن عرض کرے گا میں راضی ہو گیا"۱۲۵

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا "جو قرآن کی بہت تلاوت کرے اور اس سے عہد کرے اس کے حفظ کرنے کیلئے مشقت کرنے کا (خدا) اس کو دو اجر دے گا"۱۲۶

اس حدیث شریف سے پتہ چلتا ہے کہ تلاوت قرآن کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسان کے دل کی گہرائیوں میں اتر جائے اور انسان کا باطن کلام الٰہی کی صورت بن جائے اور صفت کے مرتبے سے عمل کے مقام تک پہنچ جائے اور یہ جو فرمایا ہے کہ "جوان مومن جو تلاوت کرے، قرآن اس کے گوشت و خون میں داخل ہو جائے گا" یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ صورت قرآن اس کے قلب میں اس طرح جا کر اجاگر

ہو جائے کہ انسان کی استعداد کے مطابق اس کا باطن کلام اللہ اور قرآن مجید بن جائے اور حامل قرآن سے مراد وہ ہے کہ اس کی باطنی ذات، مکمل حقیقت کلام الٰہی بن جائے اور خود قرآن (چونکہ) جامع اور فرقان قاطع ہے (لہذا وہ بھی اسی طرح بن جائے)، جیسے حضرت علیؑ اور ان کی ذریت طاہرہؑ سراپا آیات جلیات تھے وریہی حضرات خدا کی عظیم آیات اور قرآن تام وتمام تھے۔ (یہی نہیں) بلکہ تمام عبادتوں میں یہی معنی مطلوب ہیں۔ عبادتوں اور اس کے تکرار کا سب سے بڑا راز یہی حقائق عبادات کا حصول ور باطن ذات وقلب کا عبادت کی صورت میں اجاگر ہوتا ہے اور حدیث میں آیا ہے: ''مومن کی نماز وروزہ حضرت علیؑ ہیں''۔[۱۲۷]

جوانی میں عبادت زیادہ مؤثر ہوتی ہے

جوانی میں (عبادتوں سے) قلبی تاثر اور باطنی تصور زیادہ اچھی طرح حاصل ہوتا ہے، کیونکہ جوان کا دل نرم، سادہ اور صاف ہوتا ہے ور اس میں باہر سے داخل ہونے والی مشقت آمیز چیزیں اور رکاوٹیں بہت کم ہوتی ہیں، ان کا دل سخت اثر کرنے والا اور زیادہ بات قبول کرنے والا دل ہوتا ہے، بلکہ ہر خصلت چاہے اچھی ہو یا بری، جوان کے دل میں اچھی طرح بیٹھ جاتی ہے، ور قلب بہت شدت سے اور بہت جلد اس سے متاثر ہو جاتا ہے، بلکہ زیادہ تر بغیر کسی دلیل وحجت کے جوان کا دل محض معاشرت سے حق یا باطل کو، اچھائی یا برائی کو قبول کر لیتا ہے۔ لہذا جوانوں پر لازم ہے کہ ان کا دل چاہے ایمان سے جتنا مضبوط ہو پھر بھی برے لوگ کی صحبت اور ان سے میل جول اور معاشرت کو ترک کر دیں، بلکہ تباہکاروں اور بری عادتوں اور برے عمال کے مرتکب لوگوں سے معاشرت ہر طبقے کے افراد کیلئے مضر ہے۔ اس لئے نہ کسی کو اپنے اوپر مطمئن ہونا چاہئے اور نہ اپنے ایمان، اخلاق ور اعمال پر مغرور ہونا چاہئے۔ چنانچہ احادیث شریف میں بھی اہل معاصی سے معاشرت کی ممانعت کی گئی ہے۔[۱۲۸]

قرائت کے آداب

قرآن کی قرائت کے مقاصد میں سے یک یہ ہے کہ دلوں میں اس کی صورت نقش ہو جائے، اس کے احکام ونواہی کے اثرات مرتب ہوں، اس کے پیغامات اجاگر ہو جائیں اور یہ بات اس وقت تک حاصل نہیں ہوگی جب تک قرائت کے آداب کا لحاظ نہ کیا جائے اور آداب کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے، جیسا کہ

بعض قاریوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ ساری توجہ حروف کے مخارج اور ادائے الفاظ کی طرف اس طرح رکھی جائے کہ معنی اور غور وفکر تو بجائے خود، تجوید بھی باطل ہو جائے، بلکہ بہت سے کلمات اپنی اصلی صورت سے خارج ہوکر دوسری صورت میں ڈھل جائیں اور وہ صورت بالکل بدل جائے اور یہ بھی شیطان کی ایک مکاری ہے کہ عبادت گزار انسان کو آخر عمر تک الفاظ قرآن میں سرگرم رکھتا ہے اور نزول قرآن کے مقصد، اوامر ونواہی کی حقیقت، معارف حقہ کی طرف دعوت اور اخلاق حسنہ سے یکدم غافل بنا دیتا ہے۔ پچاس سال کی قرأت کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ گاڑھے پن اور اس میں شدت کی بنا پر صورت کلام مکمل طور پر بدل کر ایک عجیب وغریب صورت پیدا کر لیتی ہے اور (یہ سب بیکار ہے)، بلکہ آداب سے مراد وہ آداب ہیں جو شریعت مطہرہ میں منظور شدہ ہیں اور ان میں بہترین صورت یہ ہے کہ آیت میں تدبر اور غور وفکر کے ذریعے عبرت حاصل کی جائے، جیسا کہ پہلے اس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔

قال ﴿إنّ هذا القرآن فيه منارُ الهُدى ومصابيحُ الدُّجى، فليَجْلُ جالٍ بصرَهُ ويَفتحْ للضياءِ نظرَهُ، فإنّ التفكّرَ حياةُ قلبِ البصيرِ كما يمشي المُستنيرُ في الظُّلماتِ بالنُّورِ﴾[۱۲۹]

''کافی میں امام جعفر صادقؑ منقول ہے اس قرآن کے اندر ہدایت کے منارے اور تاریکی شب کے چراغ موجود ہیں، لہٰذا صاحب نظر اپنی آنکھیں اچھی طرح سے کھولے اور نور قرآن سے استفادہ کیلئے چشم بصیرت کو وا کرے، اس لئے کہ قرآن میں غور وفکر بصیرت رکھنے والے کیلئے حیات ہے جس طرح تاریکیوں میں چلنے والا نور سے روشنی حاصل کرتا ہے''۔

ومن المجالس بسنده عن أمير المؤمنين عليه السلام في كلامٍ طويلٍ في وصف المُتّقين ﴿وإذا مرّوا بآيةٍ فيها تخويفٌ، أصغوا إليها مسامعَ قلوبِهم وأبصارِهم فاقشعرّت منها جلودُهم ووجلت قلوبُهم، فظنّوا أنّ صهيلَ جهنّمَ وزفيرَها وشهيقَها في أصولِ آذانِهم، وإذا مرّوا بآيةٍ فيها تشويقٌ، ركنوا إليها طمعاً وتطلّعت أنفسُهم إليها شوقاً، وظنّوا أنّها نصبَ أعيُنِهم﴾[۱۳۰]

''متقین کی صفت بیان کرتے ہوئے حضرت علیؑ نے ایک طویل حدیث میں فرماتے ہیں جب وہ کسی ایسی آیت کی طرف سے گزرتے ہیں جس میں خوف دلایا گیا ہے تو اپنے دل کی آنکھیں اور کان ادھر لگا دیتے ہیں اور اس سے ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے، ان کے دل دہل جاتے ہیں اور ان کو خیال ہونے لگتا ہے کہ جہنم کی وحشتناک چیخ وپکار ان کے کانوں کو پھاڑے دے رہی ہے اور جب کسی ایسی آیت پر پہنچتے ہیں

جس میں شوق دلایا جاتا ہے تو اس کی طرف مائل ہو جاتے اور طمع و شوق کی وجہ سے ان کے نفوس ان کی طرف دیکھنے لگتے ہیں اور وہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ان کے سامنے ہی ہے"۔

یہ بات واضح ہے کہ جو شخص قرآن کے معانی میں غور و فکر کرے گا وہ اس کے دل میں اثر کرے گا اور رفتہ رفتہ وہ متقین کے درجے تک پہنچ جائے گا اور اگر توفیق الٰہی شامل حال ہوئی تو اس سے بھی آگے بڑھ جائے گا اور اس کے تمام اعضاء و جوارح اور طاقتیں آیات الٰہی بن جائیں گی اور ہو سکتا ہے خطابات الٰہی کی چنگاریاں اس کو بے خود بنا دیں اور وہ ﴿اقرأ وَاصعد﴾ "پڑھ اور بلند ہو" کی منزل سے عالم میں چلے یہاں تک کہ وہ متکلم کے کلام کو بے واسطہ سننے لگے اور جو کچھ ہمارے اور تمہارے وہم و گمان میں نہ ہو وہ اس کو نصیب ہو جائے۔

قرائت میں اخلاص

تلاوت قرآن کا لازمی ادب جو دوسروں پر اثر انداز ہوتا ہے اور جس کے بغیر عمل کی کوئی قیمت نہیں ہوا کرتی، بلکہ عمل برباد و باطل و باعث ناراضگی خدا ہوتا ہے وہ "اخلاص" ہے جو مقامات اخروی اور تجارت آخرت کا سرمایہ ہے۔ اس سلسلے میں بھی احادیث اہل بیت میں بہت تاکید کی گئی ہے۔ ان میں سے یہ حدیث ہے جسے شیخ کلینیؒ نے روایت کی ہے:

بإسناده عن أبي جعفر عليه السلام قال: ﴿قرّاء القرآن ثلاثة: رجل قرأ القرآن فاتّخذه بضاعة واستدرّ به الملوك واستطال به على الناس، ورجلٌ قرأ القرآن فحفظ حروفه وضيّع حدوده وأقامه إقامة القدح، فلا كثّر الله هؤلاء من حملة القرآن، ورجلٌ قرأ القرآن فوضع دواء القرآن على داء قلبه فأسهر به ليله وأظمأ به نهاره وقام به في مساجده وتجافى به عن فراشه فبأولئك يدفع الله العزيز الجبّار البلاء وبأولئك يديل الله من الأعداء وبأولئك ينزّل الله الغيث من السماء، فوالله لهؤلاء في قرّاء القرآن أعزّ من الكبريت الأحمر﴾[۳۱]

"امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں قاریان قرآن کی تین قسمیں ہیں

ایک وہ گروہ ہے جو قرأت کو سرمایۂ معیشت بناتا ہے اور اس کے ذریعے بادشاہوں سے رقم اینٹھتا اور لوگوں پر بڑائی جتاتا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو قرآن کے حروف و صورت کی حفاظت کرتا (مگر) اس کے حدود کو برباد کرتا ہے اور اس کو پس پشت ڈال دیتا ہے جیسے سوار اپنے تیروں کو اپنی پیٹھ پر لٹکا لیتا ہے، خدا ایسے

حاملانِ قرآن کی تعداد زیادہ نہ کرے۔

تیسرا گروہ وہ ہے جو قرآن کی تلاوت کرتا ہے اور اس کو درد دل کا علاج قرار دیتا ہے۔ اس کیلئے شب بیداری کرتا ہے، دن کو روزہ رکھتا ہے، مسجدوں میں حاضری دیتا ہے اور اپنے بستر پر نہیں سوتا ہے، ان جیسے لوگوں کے واسطے سے خدا بلاؤں کو دور کرتا، دشمنوں کے خلاف غلبہ عطا کرتا ہے اور آسمان سے پانی برساتا ہے۔ خدا کی قسم یہ لوگ قاریان قرآن کے درمیان کبریت احمر سے زیادہ نایاب ہیں"۔

وعن عقاب الأعمال باسناده عن أبي عبد الله عليه السلام عن أبيه، عن آبائه، عليهم السلام، قال ﴿من قرأ القرآن يأكل به الناس، جاء يوم القيامة ووجهه عظم لا لحم فيه﴾ [۱۳۲] "عقاب الاعمال میں امام جعفر صادقؑ نے اپنے والد سے، انہوں نے اپنے آباء (واجداد) سے نقل فرمایا ہے جو لوگوں کے (ساتھ معاملہ کر کے اپنے کسب معاش) کیلئے تلاوت قرآن کرے وہ قیامت کے دن اس طرح آئے گا کہ اس کا چہرہ صرف ہڈی (کا ڈھانچہ) ہوگا، اس میں گوشت (کا نام تک) نہ ہوگا"۔

وباسناده عن رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم في حديث قال ﴿من تعلم القرآن فلم يعمل به وآثر عليه حب الدنيا وزينتها، استوجب سخط الله وكان في الدرجة مع اليهود والنصارى الذين ينبذون كتاب الله وراء ظهورهم

ومن قرأ القرآن يريد به سمعة والتماس الدنيا لقي الله يوم القيامة ووجهه عظم ليس عليه لحم وزخ القرآن في قفاه حتى يدخله النار ويهوي فيها مع من هوى

ومن قرأ القرآن ولم يعمل به حشره الله يوم القيامة أعمى فيقول ﴿يا رب لم حشرتني أعمى وقد كنت بصيرا ☆ قال كذلك أتتك آياتنا فنسيتها وكذلك اليوم تنسى﴾ [۱۳۳] فيؤمر به إلى النار

ومن قرأ القرآن ابتغاء وجه الله وتفقها في الدين، كان له من الثواب مثل جميع ما أعطي الملائكة والأنبياء والمرسلون

ومن تعلم القرآن يريد به رياء وسمعة ليماري به السفهاء ويباهي به العلماء ويطلب به الدنيا، بدد الله عظامه يوم القيامة ولم يكن في النار أشد عذابا منه وليس نوع من أنواع العذاب إلا سيعذب به من شدة غضب الله عليه وسخطه

ومن تعلم القرآن وتواضع في العلم وعلم عباد الله وهو يريد ما عند الله، لم يكن في الجنة

اعظمُ ثواباً منه ولا اعظمُ منزلةً منهُ ولم يكن في الجنة منزلٌ ولا درجةٌ رفيعةٌ ولا نفيسةٌ لا وكانَ لهُ فيها اوفرُ النَّصيبِ وَاشرفُ المنازلِ﴾ ۱۳۳

رسول خداؐ نے فرمایا:

"جو قرآن سیکھ کر اس پر عمل نہ کرے اور دنیا کی محبت و زینت کو اس پر مقدم کرے وہ خدا کی ناراضگی کا مستحق ہوگا اور یہود ونصاریٰ کے ساتھ ان کے درجے میں ہوگا، جو کتاب الٰہی کو پس پشت ڈال دیتے ہیں اور جو تلاوت قرآن لوگوں کو دکھانے اور دنیا طلبی کیلئے کرے وہ قیامت میں خدا سے ایسے چہرے کے ساتھ ملاقات کرے گا جس میں گوشت نہ ہوگا، ہڈی (ہی ہڈی) ہوگی اور قرآن کو اس کے پیچھے رکھ جائے گا یہاں تک کہ قرآن اس کو جہنم میں دھکیل دے اور وہ شخص دوزخیوں کے ساتھ دوزخ میں گر جائے۔

ور جو قرآن پڑھ کر اس پر عمل نہ کرے، خدا اس کو قیامت میں اندھا محشور کرے گا۔ وہ کہے گا "پالنے والے مجھے اندھا کیوں محشور کیا؟ میں تو بینا تھا! خدا کہے گا جس طرح میری آیتیں تیرے پاس آئی تھیں اور تو ان کو بھلا دیتا تھا اسی طرح آج تجھ کو بھلا دیا جائے گا"۔ پھر اس کے بعد اس کو دوزخ میں ڈال دینے کا حکم دیا جائے گا

ور جو خدا کیلئے اور دین کی گہری سمجھ پیدا کرنے کیلئے قرآن پڑھے اس کو اتنا ثواب دیا جائے گا جتنا تمام ملائکہ، انبیاء اور رسولوں کا ہوگا۔

اور جو ریاکاری اور دوسروں کو شرمانے کیلئے قرآن سیکھے اور اس کا مقصد بے وقوفوں سے جھگڑا کرنا، علماء پر فخر کرنا اور طلب دنیا مقصود ہو تو قیامت کے دن خدا اس کی ہڈیوں کو منتشر کر دے گا اور دوزخ میں اس سے زیادہ شدید عذاب والا کوئی نہ ہوگا اور عذاب کی کوئی بھی قسم باقی نہیں ہوگی جس سے خدا اپنے غصے اور ناراضگی کی وجہ سے اس پر نازل نہ کرے۔

ور جو قرآن سیکھ کر علم میں تواضع کرے اور خدا کے بندوں کو تعلیم دے کر اجر خدا کا طالب ہوگا، جنت میں نہ اس سے بلند مرتبہ اور نہ ہی کوئی زیادہ ثواب والا ہوگا اور جنت میں کوئی ایسی منزل اور کوئی ایسا بلند و نفیس درجہ نہ ہوگا جس میں اس کا بہت زیادہ حصہ نہ ہو اور سب سے بہترین منزل اس کی نہ ہو"۔

ترتیل کا مطلب

قرائت کے آداب میں سے ایک جو نفس میں اثر مرتب کرنے کا باعث بھی ہے اور قاری کو اس کی پابندی کرنی چاہیے ترتیل ہے اور اس کا مطلب، جیسا کہ حدیث میں ہے "تیز تیز اور جلدی پڑھنے اور حد سے زیادہ ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کے درمیان ایک درمیانی راستہ ہے جس سے کلمات ایک دوسرے سے واضح ہو جائیں"۔

عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يَعْقُوبَ بِاسْنَادِهِ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ سُلَيْمَانَ قَالَ سَأَلْتُ اَبَا عَبْدِ اللهِ علیہ السلام عَنْ قَوْلِ اللهِ تَعَالٰى ﴿وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا﴾، قَالَ ﴿قَالَ اَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ علیہ السلام تَبَيَّنْهُ تِبْيَانًا (تَبْيِيناً- خ ل) وَلَا تَهُذَّهُ هَذَّ الشِّعْرِ وَلَا تَنْثُرْهُ نَثْرَ الرَّمْلِ وَلٰكِنْ اَفْزِعُوا قُلُوبَكُمُ الْقَاسِيَةَ وَلَا يَكُنْ هَمُّ اَحَدِكُمْ آخِرَ السُّورَةِ﴾[۳۵] "کافی میں ہے کہ عبداللہ بن سلیمان کہتے ہیں میں نے امام جعفر صادقؑ سے اس آیت ﴿وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا﴾ "اور قرآن کو باقاعدہ ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرو" کا مطلب پوچھا تو آپؑ نے فرمایا: حضرت علیؑ کا ارشاد ہے اس کو اچھی طرح سے واضح کر کے پڑھا کرو، شعر کی طرح جلدی نہ پڑھو اور بکھری ہوئی ریت کے ذرات کی طرح اس کے اجزا کو پراگندہ نہ کرو۔ البتہ اپنے سخت دلوں کو ڈراؤ اور تمہارا مقصد (صرف) ختم سورہ نہ ہو"۔

لہذا جو شخص کلام خدا کی قرائت کرنا چاہتا ہے اور آیات الٰہیہ سے اپنے سخت دل اور امراض قلبی کا علاج کرنا چاہتا ہے اور اس غیبی روشن چراغ کے نور اور اس آسمانی ﴿نُورٌ عَلٰى نُورٍ﴾ کے ذریعے اخروی مقامات اور مدارج کمالیہ تک رسائی حاصل کرنے کے درپے ہے، اس کو چاہیے اس کے ظاہری و باطنی اسباب اور صوری و معنوی آداب کو فراہم کرے۔ نہ یہ کہ ہماری طرح کہ اگر کبھی تلاوت قرآن کی توفیق بھی ہوئی تو اس کے معانی و مطالب و مقاصد اور اس کے اوامر و نواہی اور وعظ و زجر سے بالکل غافل ہونے کے علاوہ، معلوم ہوتا ہے کہ جن آیتوں میں اوصاف جہنم اور عذاب الیم یا بہشت و کیفیات نعیم کا ذکر ہوتا ہے ان سے بھی ہمارا کوئی ربط ہی نہیں ہے اور نعوذ باللہ قرآن مجید کی تلاوت سے کہیں زیادہ قصے کہانیوں کی کتابیں پڑھنے کی طرف ہمارے دل راغب اور دھیان مائل رہتے ہیں، بلکہ اس کے ظاہری آداب سے بھی غفلت برتتے ہیں۔

احادیث شریفہ میں آیا ہے کہ "قرآن کو حزن سے اور خوش الحانی سے پڑھو"۱۳۶
حضرت امام زین العابدینؑ، قرآن اس خوش الحانی سے پڑھتے تھے کہ ادھر سے گزرنے والے سقا وغیرہ وہاں کھڑے ہو جاتے اور بعض تو غش کھا جاتے تھے۔۱۳۷
لیکن ہم جب اپنی اچھی آواز لوگوں کو سنانا چاہتے ہیں تو قرآن یا اذان کو ذریعہ بناتے ہیں، ہمارا مقصد تلاوت نہیں ہوتا اور نہ ہی استحباب پر عمل ہے۔ مختصر یہ ہے کہ شیطان و نفس امارہ کا مکر بہت ہے اور یہ حق کو باطل سے مشتبہ کر دیتا اور اچھے و برے کو آپس میں ملا دیتا ہے۔ (لہٰذا) اس کی مکاریوں سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے۔

چھٹی فصل

نماز میں رفع یدین اور تقلیب

اس حدیث شریف میں جو آیا ہے "نماز میں ہاتھوں کو بلند کرو اور ان کو پلٹنے اور ان کی تقلیب کا خیال رکھو" اس کا بظاہر مطلب یہ ہے کہ تکبیرات کہتے وقت ہاتھوں کو بلند کرو اور تقلیب کے مطلب میں احتمال ہے کہ ہتھیلیوں کو قبلے کی طرف کرو۔ چنانچہ تکبیر کہتے وقت ہاتھ اٹھانے میں ہتھیلیوں کو روبقبلہ رکھنا ایک مستحب فعل ہے اور ہو سکتا ہے اس حدیث میں ہاتھ اٹھانے سے مراد قنوت کے وقت ہاتھ اٹھانا ہو اور تقلیب سے مراد ہتھیلیوں کو آسمان کی طرف رکھنا ہو۔ چنانچہ فقہا نے اس کے مستحب ہونے کا فتویٰ دیا ہے اگرچہ اس کی دلیل میں اختلاف کیا ہے۔ لیکن متشرعہ کی سیرت قطعیہ کے بعد قنوت سے صرف یہی مطلب (ہتھیلیوں کو آسمان کی طرف رکھنا) سمجھا جاتا ہے اور رفع یدین سے مطلقاً چاہے جس طرح بھی ہو نہیں سمجھا جاتا اب مزید کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اس روایت میں اظہر، پہلا احتمال ہی ہے۔
فقہاؒ کے درمیان مشہور ہے کہ تکبیروں میں ہاتھوں کا اٹھانا مستحب ہے اور بعض علما بعض اوامر کے ظاہر پر عمل کرتے ہوئے وجوب کے قائل ہیں اور ﴿فصل لربک وانحر﴾ کی تفسیر میں آیا ہے کہ اس "نحر" سے مراد جس کا خدا نے حکم دیا ہے، تکبیروں کے کہتے وقت ہاتھ کا اٹھانا ہے۱۳۸ لیکن روایت میں بہت سے ایسے شواہد موجود ہیں جو استحباب پر دلالت کرتے ہیں، مثلاً ان روایت میں جو علتیں بیان کی گئی ہیں (ان سے وجوب نہیں ثابت ہوتا) خصوصاً فضل بن شاذانؒ والی روایت جو امام رضاؑ سے مروی ہے۱۳۹ اس کے علاوہ علی بن جعفرؒ کی صحیحہ عدم وجوب پر نص ہے۱۴۰ اور یہ روایات اگر قرائن صارفہ سے قطع نظر

کرلیا جائے تب تو وجوب پر دلالت کرتی ہیں اور ان میں جمع کا طریقہ یہ ہے کہ نص کو ظاہر پر حکومت دیتے ہوئے وجوب پر مبنی روایات کو استحباب پر حمل کر دیا جائے اور وہ روایت اگرچہ غیر امام سے رفع ید کو اٹھا دیتی ہے (ورصرف امام جماعت کیلئے ثابت کرتی ہے) مگر پھر بھی ممکن ہے کہ یہ دعویٰ کیا جائے کہ ظاہراً یہ امام وماموم دونوں کیلئے ہے۔ البتہ روایت فرادیٰ کے بارے میں خاموش ہے اور منافات نہیں ہے کہ سب ہی سے رفع واجب کر رہی ہو۔ لیکن امام کا ہاتھ اٹھانا اقتدا کرنے والوں سے اسی طرح کفایت کرتا ہے جیسے امام کی قرائت ان کی قرائت سے کفایت کرتی ہے اور اس امکان کی بنا پر جو روایت میں تمام امکانات سے واضح تر ہے، بعض متاخر محققین کا خدشہ بھی درست نہیں ہوتا کہ اس سے حمل مطلق بر مقید لازم آتا ہے: مگر ان تمام باتوں کے باوجود اس کی تفصیل کا نہ پایا جانا اور مشہور کا قدیماً وجدیداً اس کا اختیار کرنا، نیز قرائن خارجیہ وو خدیہ کی بنا پر، تمام بحث ہی کو ختم کر دیتا ہے۔ اس کتاب کے اعتبار سے اتنی بحث بھی خارج تھی لیکن اس کے باوجود یہ رفع ید (تکبیر کے وقت ہاتھوں کو اٹھانا) آداب مستحبہ میں سے ایک ہے اور حتی الامکان اس کو ترک نہیں کرنا چاہیے، خصوصاً ایسے مستحب کو جس کو بعض علما واجب کہتے ہیں، کیونکہ دین میں احتیاط کا تقاضہ بھی ہے کہ انسان، اس کو ترک نہ کرے۔

رفع یدین کا راز

بہر حال ہر نماز میں تکبیر کہتے وقت ہاتھوں کو بلند کرنا نماز کی زینت ہے اور یہ جبرئیلؑ اور ساتوں آسمان کے ملائکہ کا طریقہ ہے۔ چنانچہ اصبغ بن نباتہؒ نے حضرت علی علیہ السلام سے نقل کیا ہے۔[۱۴۱]

علل الشرائع اور عیون اخبار الرضا میں امام رضاؑ سے منقول ہے: "تکبیر میں ہاتھوں کو اٹھانے کی علت یہ ہے کہ اس میں یک قسم کا (غیر اللہ سے) انقطاع اور (خدا کے سامنے) خلوص وعجز وانکساری کا عنصر پایا جاتا ہے۔ پس خدا کو یہ بات پسند ہے کہ اس کے ذکر کے وقت، بندہ اس کی طرف منقطع ومتضرع ومخلص ہو اور یہ علت بھی ہے کہ رفع ید کی وجہ سے، انسان (خدا کی طرف) متوجہ ہو جاتا اور نیت کے ذریعے اپنے کو بارگاہ واحدیت میں حاضر کرتا اور دل سے توجہ کرتا ہے"۔[۱۴۲]

اور حضرتؑ کا یہ قول بعض اہل معرفت کے قول کے مطابق ہے کہ وہ لوگ کہتے ہیں: "رفع یدین کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز کو ہم اپنے پس پشت ڈال دیتے اور حق تک پہنچنے کے راستہ سے کانٹوں کو اٹھا

دیتے ہیں اور اپنے کو ماسوا اللہ سے منقطع اور خاص و مخلص کر کے غیر کی طرف توجہ بھی نہیں کرتے اور غیر کی شرکت، مذہب عشق و محبت میں شرک ہے۔ ہم سمجھتے ہیں اس وقت روحانی معراج حقیقی اور خدا کی طرف سفر کرتے ہیں اور یہ سفر و معراج خدا کے سوا دوسروں سے منہ پھیرے بغیر اور ترک خودی و انانیت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ساتوں افتتاحی تکبیروں سے ساتوں کلیہ ملکیہ و ملکوتیہ کے حجاب پارہ ہو جاتے ہیں"۔

پس اولیاء کی نماز ایسی ہوتی ہے کہ ہر تکبیر سے وہ ایک حجاب کاٹا کرتے ہیں اور ان حجابوں کی دنیا کو چھوڑ دیتے اور اس دنیا کے بسنے والوں کو بھی ترک کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد ان پر دوسرا حجاب منکشف ہو جاتا ہے اور ان کے دلوں پر دوسری تجلی تقییدی چھا جاتی ہے مگر وہ راستے کا کانٹا نہیں بنتی اور ان کیلئے معروفیت اور دلی یکسوئی کا سبب بنتی ہے اور اس کو دوسری تکبیر سے پارہ کر دیتے ہیں، گویا ان کا باطن قلب اس سے متاثر ہو کر نغمہ سرا ہو جاتا ہے کہ خدا اس سے کہیں بڑا ہے کہ تجلی تقییدی کے ذریعے متجلی ہو۔ چنانچہ شیخ الاولیاء والمخلصین، حضرت خلیل الرحمن نے اپنے سفر عرفانی میں شہودی اور تجلیات تقییدی فرمائی۔ پس جو سالک الی اللہ اور مسافر عشق اور مجذوب راہ وصول ہوتا ہے وہ ایک ایک حجاب کو پارہ کرتے ہوئے آخری تکبیر تک پہنچ جاتا ہے اور اس ساتویں حجاب کو چاک کر کے غیر و غیریت کو چھوڑتے ہوئے کہتا ہے ﴿وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ﴾ ۱۴۳ "میں نے اپنا چہرہ اس ذات کی طرف کر لیا ہے جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے"۔

جیسے کہ حضرت ابراہیم نے (بھی) فرمایا تھا "اس کے دروازہ کھل جاتا ہے اور بہت حجاب اس پر منکشف ہو جاتے ہیں، پھر وہ استعادہ کرتا اور خدا کا نام لے کر آگے بڑھتا ہے"۔ اسی کی طرف امام محمد باقر نے حضرت علی سے روایت فرمائی ہے کہ آپ نے فرمایا ﴿مُحَمَّدُ بْنُ عَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ، رضوان الله عليه، بإسناده، عن أبي الحسن عليه السلام أنّه رُوي لذلك علّةٌ أخرى وهي أنّ النبيّ صلى الله عليه وآله لمّا أُسري به إلى السّماء قطع سبع حُجُبٍ فكبّر عند كلّ حجاب تكبيرةً، فأوصله الله عزّ وجلّ بذلك إلى منتهى الكرامة﴾ ۱۴۴ "اس کی ایک اور علت یہ ہے کہ رسول خدا کو جب شب معراج آسمانوں کی سیر کرائی گئی تو آپ نے ساتوں حجب چاک کئے تو آپ نے ہر حجاب کو چاک کرتے ہوئے ایک تکبیر کہی۔ جس کی وجہ سے خدا نے آپ کو انتہائے کرامت (عزت و فضیلت) تک پہنچا دیا"

دوسری روایت میں اسی مضمون کے قریب کی حدیث امام موسیٰ کاظمؑ سے منقول ہے۔۱۴۵ مگر اس میں ہے کہ "ہر پردے کے ہٹنے کے بعد رسول خدا تکبیر کہتے تھے" اور یہ ذوق و مشرب عرفان کے زیادہ موافق ہے، اس لئے کہ ہر دفعہ رفع یدین کے بعد کسی حجاب کا انکار ہوتا اور کوئی پردہ چاک ہوتا تھا اور نور کرامت کے ظہور کے ساتھ آپ تکبیر کہتے تھے اور چونکہ وہ حجب نورانیت کا ایک نور تقییدی ہے لہٰذا رفع یدین کے ساتھ اٹھ جاتا تھا تا کہ تجلی ذاتی مطلق ہو جائے اور انتہائی قرب الٰہی حاصل ہو جائے جو اولیا کی غایت مقصود ہے اور اس چہل حدیث کو اس حدیث کی طرف پلٹایا جاسکتا ہے۔

بہر حال ہم تو ان معانی کے ادراک ہی سے محروم ہیں، شہود یا وصول کی منزل تو بہت دور ہے اور ہماری بڑی اور بدبختی یہ ہے کہ ہم تمام مدارج و مقامات کے منکر ہو جاتے اور معراج اولیا اور پاکیزہ لوگوں کی نماز کو اپنی طرح اور ان کے کمال کو اپنے عمل کے کمال کے مشابہ سمجھتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ جس کا تصور کر سکتے ہیں اور جس سے آگے کا ادراک نہیں کر سکتے وہ یہ ہے کہ ان کی قرائت اور تمام آداب بہت اچھے تھے، شرک اور ریا اور طلب شہرت سے خالی تھے یا یہ کہ ان کی عبادت جنت کے لالچ اور دوزخ کے خوف سے نہیں ہوتی تھی اور یہ تو ان کے مقامات رسمیہ رائجہ میں سے ایک ہے لیکن ان کی نماز میں اور معراج روحانی میں ایسے مقامات ہیں جو ہمارے تصور سے باہر ہیں۔

شیطان کی مکاری کے بارے میں تنبیہ

اس مقام پر جب قلم بے، حقیر یہاں تک پہنچ گیا ہے ایک چیز کی طرف متنبہ کرنا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ "روحانی مقامات تک پہنچنے اور حصول کمال کی راہ میں بچھے ہوئے بدترین قسم کے کانٹوں میں سے ایک جو کہ شیطان کا ایک بڑا کارنامہ ہے، مقامات و مدارج غیبیہ معنویہ کا انکار ہے اور یہ انکار تمام گمراہیوں اور جہالتوں کا سرمایہ ہے اور ترقیوں کا رک جانا ہے اور یہی انکار روح شوق کو جو وصول کمالات کیلئے براق ہے، موت عطا کرتا ہے اور آتش عشق کو جو رفرف معراج روحانی کمال ہے، خاموش کر دیتا ہے" انسان کو طلب سے روک دیتا ہے۔ (لیکن) اس کے برخلاف اگر انسان مقامات معنویہ اور معارج عرفانیہ سے خاص عقیدت رکھتا ہو اور ایمان لے آئے تو ہو سکتا ہے کہ یہ خود عشق فطری کی آتش کو جو خواہشات نفسانی کے خاک و خاکستر کے نیچے دب گئی ہے، مدد دیدے اور نور اشتیاق کو دل کی گہرائیوں میں روشن کر دے اور پھر

رفتہ رفتہ اس کی تلاش میں اٹھ کھڑا ہو اور جہاد کرے تا کہ ہدایت حق شامل حال ہو اور خدا اس کی دستگیری فرمائے۔ والحمد للہ

ساتویں فصل

مسواک کی فضیلت

یہ جان لو کہ مسواک کرنا جس کی اس حدیث شریف میں رسول خدا نے وصیت فرمائی ہے مطلق ایک شرعی مستحب ہے، ور خاص موقع پر اس کی تاکید کی گئی ہے، مثلاً وضو اور نماز سے پہلے، قرآن پڑھتے وقت، سحر کے وقت اور سو کر اٹھنے کے بعد، روایات میں اس کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے اور اس کی بہت سی خصوصیات وفوائد ذکر کیے گئے ہیں۔ میں ان میں سے بعض کو اس کتاب میں تبرکاً ذکر کرتا ہوں۔

كافي باسناده عن أبي عبد الله عليه السلام قال: ﴿في السواك ثنتا عشرة خصلة: هو من السنة، ومطهرة للفم، ومجلاة للبصر، ويُرضي الرب، ويذهب بالبلغم، ويزيد في الحفظ، ويبيض الأسنان، ويضاعف الحسنات، ويذهب بالحفر، ويشدُّ اللثة، ويشهي الطعام، ويفرح به الملائكة﴾ (۱۳۶)

"امام جعفر صادق نے فرمایا مسواک کرنے میں بارہ فائدے ہیں

مسواک (رسول خدا کی) سنت ہے، منہ کو صاف کرتی ہے، آنکھوں کی روشنی میں اضافہ کرتی ہے، خوشنودی خدا کا سبب ہے، بلغم کو دور کرتی ہے، قوت حافظہ کو بڑھاتی ہے، دانتوں کو سفید کرتی ہے، نیکیوں میں اضافہ کرتی ہے، دانت کے کھوکھلے پن کو دور کرتی ہے، مسوڑھوں کو مضبوط کرتی ہے، بھوک بڑھاتی ہے اور ملائکہ اس سے خوش ہوتے ہیں"۔

بہت سی روایت میں ہے کہ "مسواک پیغمبروں کی سنتوں میں سے ہے" ۱۳۷

دوسری حدیث میں بھی اسی مضمون پر مشتمل روایت نقل کی گئی ہے اور اس حدیث میں جن چھوٹے چھوٹے دانوں اور پھوڑوں کا ذکر ہے ان سے وہ چھوٹے چھوٹے دانے مراد ہیں جو دانتوں کی جڑوں میں پیدا ہو جاتے ہیں اور ان میں سفید اور بدبو دار مواد پیدا ہو جاتا ہے، غذا کو چباتے وقت وہ دانے پھوٹ جاتے اور اس کی گندگی غذا میں شامل ہو کر بہت سے امراض کا سبب بنتی ہے، جیسے بدہضمی وغیرہ، آج کل کے طبیب اس کو "پیوریا" کہتے ہیں اور اس کو بہت اہمیت دیتے ہیں، بلکہ اس کے علاج کیلئے دانتوں کو اکھاڑ دینے سے

بھی گریز نہیں کرتے ہیں۔ اس لئے انسان کو چاہئے کہ غیبی باطنی پہلوؤں سے قطع نظر کرتے ہوئے جن میں سب سے اہم، مرضی الٰہی ہے، حفظان صحت اور صفائی کیلئے بھی دانتوں کو صاف کرے اور بڑی اچھی بات ہے کہ پابندی سے دانتوں کو صاف کرے اور انبیاءؑ کی سنت مستمرہ پر عمل کرے۔

حدیث میں ہے کہ رسول خداؐ نے فرمایا ''جبرئیلؑ نے مجھے مسواک کی اتنی تاکید کی کہ مجھے اپنے دانتوں کے بارے میں خوف معلوم ہونے لگا''۔۱۴۸؎

نیز آنحضرتؐ نے فرمایا ''اگر میری امت کیلئے باعث مشقت نہ ہوتا تو میں ہر نماز اور وضو سے پہلے مسواک کرنا واجب قرار دے دیتا''۔۱۴۹؎

آنحضرتؐ ہمیشہ اپنے سرہانے رات کو آب وضو اور مسواک رکھا کرتے اور پانی کے برتن کو کسی چیز سے ڈھک دیا کرتے تھے اور جب بھی خواب سے بیدار ہوتے، وضو کر کے چار رکعت نماز پڑھ کر سو جاتے تھے اس کے بعد پھر جب بیدار ہوتے تو مسواک کر کے وضو کرتے اور نماز پڑھتے تھے۔ حضرت امام جعفر صادقؑ نے اس حدیث کے بعد فرمایا ''تم بھی رسول خداؐ کی نیک بات میں پیروی کرو''۔۱۵۰؎

حدیث میں ہے کہ ''مسواک کے بعد دو رکعت نماز بغیر مسواک کی ستر رکعت نماز سے افضل ہے یہاں تک کہ اگر وضو سے پہلے دانت صاف کرنا بھول جائے تو وضو کے بعد مسواک کرنا مستحب ہے اور مسواک کے بعد تین مرتبہ کلی کرنا چاہئے۔۱۵۱؎ اس بارے میں احادیث بہت ہیں، جس کو ضرورت ہو وہ علما کی کتابوں کی طرف رجوع کرے۔۱۵۲؎

آٹھویں فصل:

اخلاق حسنہ و رذیلہ کے بارے میں رسول اکرمؐ کی وصیت

گرچہ ہم نے اس کتاب میں نفس کے بہت سے اخلاق کو گن گن کر تفصیل سے بیان کر دیا ہے اور اچھے اخلاق سے متصف اور برے اخلاق، اور ان کی برائیوں سے بچنے کے طریقوں کو بطور مناسب ذکر کر دیا ہے مگر یہاں پر ایک جامع بیان کے ساتھ مزید کچھ ذکر کروں گا۔

''خلق'' اس حالت کو کہتے ہیں جب وہ انسان میں پیدا ہو جائے تو انسان بغیر کسی غور و فکر کے عمل کرنے لگتا ہے، مثلاً جس کے اندر خلق سخاوت ہو گی وہ عادت کوئی تمہید باندھے بغیر تیز کسی قسم کی مرجحات

کے، جود و انفاق پر آمادہ کرے گی گویا یہ اس کا فطری عمل ہے جیسے دیکھنا اور سننا فطری عمل ہے۔ اسی طرح عفت جس کی عادت اور خلق ہو جائے وہ اپنے نفس کا کنٹرول اس طرح کرے گا جیسے یہ اس کا طبعی فعل ہو اور جب تک ریاضت و تفکر کے ذریعے نفس اس منزل تک نہ پہنچ جائے اس کو صاحب خلق نہیں کہا جائے گا ورنہ اس کو کمال نفس حاصل ہوگا مگر خلق کیلئے یہ خطرہ لگا رہتا ہے کہ اگر وہ کمالات میں سے ہے تو زائل ہو سکتا ہے اور بری عادتیں اور برے اخلاق اس پر غالب آ سکتے ہیں۔ ہاں! اگر وہ طبعی فعل بن جائے اور قوی اور عقل سب اس کے تابع ہو جائیں اور قہر و سلطنت حق ظاہر ہو جائے تب اس کا زوال مشکل ہوتا ہے اور شاذ و نادر ہی زوال آ سکتا ہے۔

علمائے اخلاق کا کہنا ہے کہ یہ حالت اور نفس کی چھوٹی یا برائی کبھی تو طبعی ہوتی ہے اور اصل فطرت اور مزاج سے متعلق ہوتی ہے خواہ اس کا تعلق خیر سے ہو یا شر سے ہو چنانچہ مشہور ہے کہ بعض بچے بچپنے ہی سے اچھائیوں کی طرف اور بعض برائیوں کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ بعض لوگ معمولی چیز پر غضبناک ہو جاتے، بعض مختصر سی بات پر خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور ذرا سی بات پر ڈر جاتے ہیں، لیکن بعض لوگ اس کے بالکل برخلاف ہوتے ہیں اور کبھی یہ نفسانی اخلاق، عادات، رہن سہن کے طریقوں اور تدبر و سوچ سے بھی حاصل ہوتا ہے اور کبھی اس کی ابتدا تو غور و فکر سے ہوتی ہے پھر وہ عادت بن جاتا ہے یہاں پر علماء نے اختلاف کیا ہے، جس کا ذکر کرنا اور اس کے پہلوؤں کے بارے میں بحث کرنا اس کتاب کے موضوع سے خارج ہونے کے علاوہ ہم کو ہمارے اصلی مقصد سے بھی باز رکھے گا۔ اب میں ان باتوں کا ذکر کروں گا جو اس مقام کیلئے مناسب اور مفید ہیں۔

میں عرض کرتا ہوں کہ کسی خلق کے طبعی اور فطری ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ذاتی ہے اور قابل تغییر نہیں ہے، بلکہ تمام ملکات و اخلاق نفسانیہ جب تک نفس اس عالم حرکت و تغیر میں اور وقت و تجدد کے قبضے میں ہے اور وہ ہیولیٰ و قوت کا مالک ہے قابل تغییر ہیں اور انسان اپنے تمام اخلاق کو ان کے متضاد اخلاق سے بدل سکتا ہے۔ دلیل و تجربہ کے علاوہ انبیاء اور شرائع حقہ کی اخلاق حسنہ اور برے اخلاق سے روکنے کی دعوت، اس مدعیٰ پر دلالت کرتی ہے۔

یہ بھی جان لینا چاہئے کہ علمائے اخلاق نے تمام فضائل نفس کو چار چیزوں میں مقید کیا ہے اور وہ یہ ہیں حکمت، عفت، شجاعت اور عدالت۔ حکمت کو نفس ناطقہ ممیزہ کی فضیلت قرار دیا گیا ہے اور شجاعت کو نفس

غضبیہ کے فضائل میں شمار کیا گیا ہے اور عفت کو نفس شہویہ کے فضائل میں سے قرار دیا گیا ہے اور عدالت کو (دیگر) تین فضائل کا توازن شمار کیا گیا ہے اور تمام فضائل کو انہیں چاروں کی طرف پلٹایا گیا ہے، ان میں سے ہر ایک کا تفصیلی بیان اور حد بندی اس کتاب کی گنجائش سے خارج ہے اور ہم جیسے لوگوں کیلئے بہت زیادہ مفید بھی نہیں ہے۔ جو چیز ضروری ہے وہ بمطابق حدیث رسول اکرمؐ ﴿بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ﴾ ۵۳ ''مجھے اس لئے مبعوث کیا گیا کہ میں مکارم اخلاق کو درجہ کمال تک پہنچا دوں''۔ مکارم خلاق کو درجہ کمال تک پہنچانا ہے اور احادیث شریفہ میں بھی اجمالاً و تفصیلاً معارف کے بعد سب سے زیادہ مکارم اخلاق کو اہمیت دی گئی ہے اور انشاء اللہ اس کے بعد ان میں سے بعض حدیثوں کا ذکر کریں گے، مگر ان کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ ہے کہ ہم ان سے عہدہ برآ ہوسکیں۔ یہ معلوم ہے کہ آخرت کی حیات ابدی کا سرمایہ اور اس نشأہ میں عیش و آرام کا دارومدار اخلاق حسنہ کے حصول اور مکارم اخلاق سے متصف ہونے پر منحصر ہے۔ اخلاق حسنہ کی بنا پر انسان کو جو بہشت ملتی ہے وہ بہشت صفات ہوتی ہے جس کا بہشت جسمانی عملی سے کوئی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ بہشت صفات میں تمام نعمتیں اور جسمانی لذتیں بطور اتم واحسن موجود ہیں جیسے کہ برے اعمال کی وجہ سے انسان کو جو تاریکیاں اور وحشتیں نصیب ہوتی ہیں وہ ہر عذاب الیم سے بالاتر ہوتی ہیں۔

انسان جب تک اس دنیا میں ہے، اپنے کو اس ظلمت سے نجات دے سکتا ہے اور ان انوار تک رسائی حاصل کرسکتا ہے۔ جی ہاں! کر تو سکتا ہے لیکن اس سرد مہری، جمود، سستی، غفلت اور سہل انگاری سے نہیں کرسکتا جو ہمارے اندر ہے، (کیونکہ) سب ہی جانتے ہیں کہ ہمارے لئے ان روز افزوں بری عادات اور ناشائستہ طور طریقوں میں اضافہ کرنا آسان ہے جن کے ہم بچپن سے بڑھاپے تک عادی ہو چکے ہیں اور آخری وقت تک انہی پر باقی رہتے ہیں، گویا ہم کو دوسرے عالم کی فکر ہی نہیں ہے، دوسرا نشأہ آنے والا ہی نہیں ہے ''آج کے بعد کل بھی تو آنے والا ہے، افسوس اور واویلا'' ۵۴۔ معلوم ہوتا ہے کہ انبیاءؑ و اولیا کی دعوتوں کا ہم سے کوئی ربط ہی نہیں ہے اور خدا جانے ہم اپنے ان اخلاق و اعمال کے ساتھ کہاں جائیں گے اور کس طرح محشور ہوں گے! ہم اس وقت متوجہ ہوں گے جب پانی ہمارے سر سے گزر چکا ہوگا۔ حسرت وندامت ہمارا مقدر بن چکی ہوگی اور (ایسی صورت میں) اپنے علاوہ کسی کو ملامت بھی نہیں کرسکتے، (کیونکہ) انبیاءؑ نے تو سعادت کا راستہ بتا دیا تھا، علماء و حکماء نے ان کی باتوں کی تفسیر ہمارے لئے کر دی تھی اور

باطنی مراض کے علاج کا طریقہ بھی بتا دیا تھا اور مختلف روایتوں میں بتا دیا تھا اور قسم قسم کے بیانات کے ذریعے سمجھا دیا تھا (مگر) وہ باتیں ہمارے دلوں میں نہیں بیٹھ سکیں اور ہم نے آنکھوں، کانوں اور دلوں کو بند کر لیا تھا، اس لئے ملامت ہمارے لئے ہے۔ چنانچہ رسول خدا نے بھی اس حدیث میں جس کی ہم شرح کر رہے ہیں، فرمایا ہے۔ مکارم اخلاق سے اتصاف اور ان کے مقابل (برے) صفات سے اجتناب کے بارے میں اس قدر روایات اور کتابوں میں تاکید کی گئی ہے جو حد بیان سے باہر ہے اور ہماری حالت یہ ہے کہ ہم ایسی کتابوں کے مطالعے سے بھی غفلت کرتے ہیں!

ہاں، میرے عزیز! اگر آپ کو احادیث و روایات سے کچھ سروکار ہے تو احادیث کی کتب شریفہ خصوصاً کافی شریف کا مطالعہ کیجئے اور اگر علمی بیان اور علما کی اصطلاحات سے سروکار رکھتے ہوں تو اخلاقی کتابوں، مثلاً "طہارۃ الاعراق" ۱۵۵ مرحوم فیض کاشانی، علامہ مجلسی اور نراقی ۱۵۶ کی کتابوں کی طرف رجوع فرمایئے اور اگر آپ کو ان سے استفادے کی ضرورت نہیں ہے یا اخلاق حسنہ سے اتصاف اور اخلاق سیئہ سے اجتناب کو ضروری نہیں سمجھتے تو اپنی جہالت کا علاج کریئے جو اہم امراض ہے

اب میں اس مقام کو تبرکاً بعض احادیث شریفہ کے ذکر کے ساتھ جو اس باب سے متعلق ہیں ختم کرتا ہوں۔

فی کتاب من لا یحضرہ الفقیہ، باسنادہ عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال: إنّ اللہ خصّ رسولہ صلی اللہ علیہ وآلہ بمکارم الأخلاق، فامتحنوا أنفسکم فإن کانت فیکم فاحمدوا اللہ وارغبوا إلیہ فی الزیادۃ منھا. فذکرھا عشرۃ: الیقینُ والقناعۃ والصبر والشکر والحلم وحسن الخلق والسخاء والغیرۃ والشجاعۃ والمروءۃ.۱۵۷

"امام جعفر صادق نے فرمایا: خدا نے اپنے رسول کو مکارم اخلاق سے مخصوص فرمایا۔ تم اپنے نفسوں کا امتحان کر کے دیکھو اگر تمہارے اندر وہ 'مکارم اخلاق' ہیں تو حمد خدا کرو اور اس میں اضافے کی کوشش کرو۔ پھر امام نے ان کو دس صفات میں بیان فرمایا ہے یقین، قناعت، صبر، شکر، حلم، حسن خلق، سخاوت، غیرت شجاعت اور مروت"۔

یہ حدیث کئی طریقوں سے نقل کی گئی ہے لیکن معانی الاخبار میں "حلم" کے بدلے میں "رضا" ہے۔ ۱۵۸ خلاصہ یہ ہے کہ خدا نے اپنے رسول کو مکارم اخلاق سے مخصوص کیا، لہذا تم اپنا امتحان کرو، اگر تم میں یہ

صفات ہیں تو خدا کی حمد کرو اور ان میں اضافے کیلئے خدا کی طرف توجہ کرو۔ اس کے بعد ان دس صفات کو ذکر فرمایا جیسا کہ روایت میں ہے۔ کتاب "الوافی" میں یہ حدیث کافی کے حوالے سے تھوڑے سے فرق کے ساتھ نقل کی گئی ہے۔ ۱۵۹

وعن المجالس، باسناده عن الصّادق جعفر بن محمد، عليهما السلام، أنه قال ﴿عليكم بمكارم الأخلاق، فإنّ الله عزّوجلّ يُحبُّها، وإيّاكم ومذامّ الأفعال، فإنّ الله يُبغضُها الى ان قال وعليكُمْ بحُسْن الخُلقِ فانّهُ يبلُغ بصاحبه درجة الصّائم القائم الحديث﴾ ۱۶۰

"امام جعفر صادقؑ نے فرمایا مکارم اخلاق کو حاصل کرو، کیونکہ خدا ان کو پسند کرتا ہے اور برے افعال سے بچو، کیونکہ خدا ان کو پسند نہیں کرتا، یہاں تک کہ امامؑ نے فرمایا: حسن خلق کو تھام لو اس لئے کہ حسن خلق اپنے مالک کو روزہ دار اور نمازی کے درجے تک پہنچا دیتا ہے"۔

الكافي، باسناده عن أبي جعفر عليه السلام قال ﴿إنّ أكْمَلَ الْمُؤمنين إيماناً أحْسَنُهُمْ خُلُقاً﴾ ۱۶۲

"امام محمد باقرؑ کا ارشاد ہے مؤمنین میں، ایمان کے لحاظ سے سب سے زیادہ کامل وہی ہے جو از روئے خلق سب سے اچھا ہو"۔

وباسناده عن عليّ بن الحسين، عليهما السلام، قال ﴿قال رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وآله ما يُوضَعُ في ميزان امْرِئٍ يوم الْقيامة أفْضَلُ مِنْ حُسْنِ خُلُقٍ﴾ ۱۶۳ "امام سجادؑ نے فرمایا کہ رسول خداؐ کا ارشاد ہے قیامت کے دن کسی کے میزان عمل میں حسن خلق سے بہتر کوئی چیز نہیں رکھی جائے گی"۔

رسول خداؐ نے فرمایا "جو چیز سب سے زیادہ میری امت کو بہشت میں داخل کرے گی وہ پرہیزگاری اور حسن خلق ہے"۔ ۱۶۴

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا "نیکی اور حسن خلق، شہروں کو آباد کرتے اور عمر میں اضافہ کرتے ہیں"۔ ۱۶۵

معصومؑ کا ارشاد ہے "خداوند عالم حسن خلق (والے) کو راہ خدا میں جہاد کا ثواب دیتا ہے، ایسا جہاد کہ مجاہد دن رات جہاد میں مشغول ہو"۔ ۱۶۶

اس باب میں روایات بہت ہیں، مثلاً "حسن خلق، ایمان کی تکمیل، میزان (اعمال) کے بھاری ہونے اور بہشت میں داخل ہونے کا سبب ہے" اس کے برخلاف "بد خلقی ایمان کو فاسد اور انسان کو عذاب

الہی میں مبتلا کرتی ہے" جیسا کہ احادیث شریفہ میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: "بد خلقی ایمان کو اس طرح فاسد کر دیتی ہے جس طرح سرکہ شہد کو فاسد کر دیتا ہے"۔[۱۶۷]

ایک اور روایت میں ہے "بد خلقی عمل کو اس طرح خراب کر دیتی ہے جس طرح سرکہ شہد کو خراب کر دیتا ہے"۔[۱۶۸]

رسول خداؐ نے فرمایا "خدا بد خلق آدمی کی توبہ قبول نہیں کرتا۔ سوال کیا گیا ایسا کیوں ہے؟ فرمایا اس لئے کہ جب وہ ایک گناہ سے توبہ کرتا ہے تو وہ اس سے بدتر گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے"۔[۱۶۹]

(ایک اور) حدیث میں ہے "جو بد خلق ہے اس نے خود ہی اپنے کو عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے"۔[۱۷۰]

یہ سب جانتے ہیں کہ بد خلقی انسان کو ہمیشہ عذاب میں مبتلا رکھتی ہے اور دوسرے عالم میں بھی سختی اور فشار و ظلمت کا سبب ہے، جیسا کہ ہم نے بعض حدیثوں کی شرح میں بیان کر دیا ہے۔

والحمد للہ اولاً و آخراً

توضیحات (۲۹)

۱۔ روضۂ کافی، ص۷۹، حدیث۳۳۔

۲۔ مجمع البیان، ج۲، ص۲۴۴۔

۳۔ یہ مثل مشہور ہے، فارسی میں اس کے مترادف ہے "در بتو می گویم، دیوار تو بشنو" (دروازہ تجھ سے کہہ رہا ہوں، دیوار تو سن لینا) مجمع الامثال، ج۱، ص۵۰۔

۴۔ ﴿اوصیکما وجمیع ولدی واھلی ومن بلغہ کتابی﴾ نہج البلاغہ، مکتوب ۴۷۔

۵۔ اصول کافی، ج۲، ص۳۳۹، کتاب ایمان وکفر، باب الکذب، حدیث ۳

وسائل الشیعہ، ج۸، ص۵۷۲، کتاب حج، باب ۱۳۸، ابواب احکام العشرہ، حدیث ۳۔

۶۔ اصول کافی، ج۲، ص۳۳۹، کتاب ایمان وکفر، باب الکذب، حدیث ۴۔

۷۔ معمر بن خلاد عن ابی الحسن الرضا علیہ السلام قال قال ﴿سئل رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وآلہ یکون المؤمن جبانا؟ قال نعم قیل ویکون بخیلا؟ قال نعم قیل ویکون کذابا؟ قال لا﴾۔

مسند امام رضا، ج۱، ص۲۶۷، باب الذنوب، حدیث ۷۷

۸۔ حدیث حاشیہ ۳۲۔

۹۔ وسائل الشیعہ، ج۸، ص۵۷۲، کتاب الحج، باب ۱۳۸، ابواب احکام العشرہ، حدیث ۱۲۔

۱۰۔ وسائل الشیعہ، ج۸، ص۵۷۶، کتاب الحج، باب ۱۴۰، ابواب احکام العشرہ۔

۱۱۔ عن ابی جعفر علیہ السلام قال ﴿کان علی بن الحسین صلوات اللہ علیہما یقول لولدہ اتقوا الکذب الصغیر منہ والکبیر فی کل جد وھزل، فان الرجل اذا کذب فی الصغیر اجترئ علی الکبیر، اما علمتم ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ قال ما یزال العبد یصدق حتی یکتبہ اللہ صدیقا وما یزال العبد یکذب حتی یکتبہ اللہ کذابا﴾۔

اصول کافی، ج۲، ص۳۳۸، کتاب ایمان وکفر، باب الکذب، حدیث ۲۔

۱۲۔ اصول کافی، ج۲، ص۳۴۰، کتاب ایمان وکفر، باب الکذب، حدیث ۱

۱۳۔ وسائل الشیعہ، ج۸، ص۵۷۷، کتاب حج، باب ۱۴۰، ابواب احکام العشرہ، چوتھی حدیث کا حصہ۔

۱۴۔ اصول کافی، ج۲، ص۱۰۵، کتاب ایمان وکفر، باب الصدق واداء الامانۃ، حدیث ۱۰۔

۱۵۔ عن زید، عن آبائہ، عن علی علیہ السلام قال ﴿قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وآلہ ان اقربکم منی غدا واوجبکم علی شفاعۃ

اصدقکم لساناً و اداکم للامانۃ و احسنکم خلقاً و اقربکم من الناس﴾

بحار الانوار ج ۶۶ ص ۳۸۱ کتاب ایمان و کفر، باب ۳۸ حدیث ۴۱

۱۶۔ منازل السائرین، ص ۲۳، قسم ابواب، باب ورع۔

۱۷۔ حدیث ۳۵، حاشیہ ۱۳

۱۸۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۷۸، کتاب ایمان وکفر، باب الورع، حدیث ۱۔

۱۹۔ مذکورہ ماخذ، حدیث ۱، ۳، ۴۔

۲۰۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۷۶، کتاب ایمان وکفر، باب الورع، حدیث ۳۔

۲۱۔ وسائل الشیعہ، ج ۱۱، ص ۱۹۶، کتاب الجہاد، باب ۲۰، باب جہاد النفس، حدیث ۷۔

۲۲۔ عن ابی عبد اللہ قال ﴿یا عیسیٰ بن عبد اللہ لیس منا ولا کرامۃ من کان فی مصر فیہ مائۃ الف او یزیدون وکان فی ذلک المصر احد اورع منہ﴾

وسائل الشیعہ، ج ۱۱، ص ۱۹۵، کتاب جہاد، باب ۲۰، باب جہاد نفس، حدیث ۴۔

۲۳۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۷۸، کتاب ایمان وکفر، باب الورع، حدیث ۹

۲۴۔ سورہ احزاب، آیت ۷۲

۲۵۔ مصنف مجمع البیان نے سورہ احزاب کی ۷۲ویں آیت کی تفسیر میں اس قول کو ابن عباس اور مجاہد سے نقل کیا ہے۔

۲۶۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۱۰۵، کتاب ایمان وکفر، باب الصدق و اداء امانت، حدیث ۱۲۔

۲۷۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۱۰۴، کتاب ایمان وکفر، باب الصدق و اداء امانت، حدیث ۵۔

۲۸۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۵۲، کتاب ایمان وکفر، باب صفۃ المؤمن، حدیث ۔

۲۹۔ فروع کافی، ج ۵، ص ۱۳۳، کتاب المعیشہ، باب اداء امانت، حدیث ۳۔

۳۰۔ فروع کافی، ج ۵، ص ۱۳۳، کتاب المعیشہ، باب اداء امانت، حدیث ۵۔

۳۱۔ وسائل الشیعہ، ج ۱۳، ص ۲۲۵، کتاب الودیعہ، باب ۲، حدیث ۳، امالی شیخ صدوق، ص ۲۳۹، مجلس ۴۳، حدیث ۹

۳۲۔ وسائل الشیعہ، ج ۱۳، ص ۲۲۵، کتاب الودیعہ، باب ۳، حدیث ۲۔

۳۳۔ ﴿لیس منا من غش مسلماً ولیس منا من خان مؤمناً﴾۔ مذکورہ ماخذ، حدیث ۳

۳۴۔ مذکورہ ماخذ، حدیث ۵ (رسول خدا)۔

۳۵۔ بحار الانوار، ج ۵۵، ص ۳۹، کتاب السماء والعالم، باب ۴

۳۶۔ حدیث ۲، حاشیہ ۱۵

۳۷۔ عن الامام الصادق فی تفسیر الآیۃ الکریمۃ ﴿انا عرضنا الامانۃ علی السموات و الارض و الجبال

فأبين أن يحملنها وأشفقن منها وحملها الإنسان إنه كان ظلوماً جهولاً؛ قال: هي ولاية أمير المؤمنين عليه السلام﴾۔

اصول کافی، ج ۱، ص ۴۱۳، کتاب الحجہ، باب فیہ نکت ونتف من التنزیل فی الولایہ، حدیث ۲۔

۳۸۔ امامؑ فرماتے ہیں ایک شخص نے رسول خداؐ سے عرض کیا ﴿ … فقال رسول الله صلى الله عليه وآله: لا تقل إنه من شيعتنا فإنه كذب، إن شيعتنا من شيّعنا وتبعنا في أعمالنا وليس هذا الذي ذكرته في هذا الرجل من أعمالنا﴾

رسول خداؐ نے فرمایا: یہ مت کہو وہ ہمارے شیعوں میں سے ہے یہ جھوٹ ہے، ہمارا شیعہ تو وہ ہے جو ہمارے ساتھ چلے اور اعمال میں ہماری پیروی کرے، وہ جس شخص کے بارے میں تم نے کہا (ہمسائے کی حریم کی طرف دیکھنا) ہمارے اعمال میں سے نہیں ہے"۔

بحار الانوار، ج ۶۵، ص ۱۵۵، کتاب ایمان وکفر، باب ۱۹، حدیث ۱۱۔

۳۹۔ حدیث ۸، حاشیہ ۱۰۔

۴۰۔ حدیث ۲، حاشیہ ۳۳۔

۴۱۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۶۸، کتاب ایمان وکفر، باب الخوف والرجاء، حدیث ۲۔

۴۲۔ حدیث ۲۸، حاشیہ ۱۱۔

۴۳۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۵۲، کتاب ایمان وکفر، باب من آذی المسلمین، حدیث ۸

۴۴۔ انتیسویں حدیث کی طرف رجوع کیجئے۔

۴۵۔ منازل السائرین، قسم ثانی، باب خوف۔

۴۶۔ في حديث المناهي قال: ﴿ومن ذرفت عيناه من خشية الله كان له بكل قطرة قطرت من دموعه قصر في الجنة مكلل بالدر والجوهر، فيه ما لا عين رأت ولا أذن سمعت ولا خطر على قلب بشر﴾۔

وسائل الشیعہ، ج ۱۱، ص ۱۷۵، کتاب الجہاد، باب ۱۵، ابواب جہاد نفس، حدیث ۔

۴۷۔ مذکورہ ماخذ، ص ۱۷۷، حدیث ۱۶۔ ثواب الاعمال، ص ۷، ثواب من قال لا الہ الا اللہ، حدیث ۶۔

۴۸۔ قال الصادقؑ: ﴿إن الرجل ليكون بينه وبين الجنة أكثر مما بين الثرى إلى العرش لكثرة ذنوبه، فما هو إلا أن يبكي من خشية الله عز وجل ندماً عليها حتى يصير بينه وبينها أقرب من جفنه إلى مقلته﴾۔

وسائل الشیعہ، ج ۱۱، ص ۱۷۸، کتاب الجہاد، باب ۱۵، ابواب جہاد نفس، حدیث ۱۰۔

۴۹۔ عن أبي عبد اللهؑ قال: ﴿ما من شيء إلا وله كيل ووزن إلا الدموع، فإن القطرة تطفئ بحاراً من نار، ولو أن باكياً بكى في أمة لرحموا﴾۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۴۸۱، کتاب الدعاء، باب البکاء، حدیث ۱۔

۵۰۔ کلینیؒ نے کافی میں ۱۳ احادیث باب بکاء میں اور شیخ حر عاملیؒ نے ابواب جہاد نفس کے پندرہویں باب میں گریہ کی فضیلت میں احادیث نقل کی ہیں۔

۵۱۔ سورۂ زخرف، آیت/۷۱۔

۵۲۔ سورۂ قدر، آیت/۳۔

۵۳۔ سورۂ بقرہ، آیت/۲۶۱۔

۵۴۔ فروع کافی، ج ۳ ص ۴۴۳، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ النوافل، حدیث ۳۔

۵۵۔ وسائل الشیعہ، ج ۳ ص ۳۱ و ۳۲، روایت معاویہ بن عمار از امام صادقؑ حدیث ۱، روایت فضیل و فضل از امام صادقؑ، باب ۱۳، ابواب اعداد الفرائض و نوافلہا، حدیث ۳۔

۵۶۔ ستمہ سے نافلۂ عشاء مراد ہے۔ حماد کی روایت، وسائل الشیعہ، ج ۳، ص ۳۵، باب ۳، ابواب اعداد الفرائض و نوافلہا، حدیث ۵ پڑھیے

۵۷۔ مذکورہ ماخذ، ص ۳۱، حدیث ۲۔

۵۸۔ وسائل الشیعہ، ج ۳ ص ۷۰، کتاب الصلاۃ، ابواب اعداد الفرائض و نوافلہا، باب ۲۹ حدیث کی طرح احادیث ۳، ۴، ۵، ۷۔

۵۹۔ وسائل الشیعہ، ج ۳، ص ۷۰، کتاب الصلاۃ، باب ۲۹، ابواب اعداد الفرائض و نوافلہا، حدیث ۸

۶۰۔ ایک حدیث میں امام رضاؑ سے یہ مطلب نقل ہوا ہے۔ وسائل الشیعہ، ج ۳ ص ۷۰، کتاب الصلاۃ، ابواب اعداد الفرائض و نوافلہا، باب ۲۹، حدیث ۳۔

۶۱۔ تہذیب الاحکام، ج ۲، ص ۱۰، کتاب الصلاۃ، باب ۱، حدیث ۲۳۔

۶۲۔ وسائل الشیعہ، ج ۳، ص ۲۳، کتاب الصلاۃ، باب ۳، ابواب اعداد الفرائض، حدیث ۹

۶۳۔ مستدرک الوسائل، ج ۳ ص ۵۰، کتاب الصلاۃ، باب ۲، حدیث ۵،۳

۶۴۔ جیسے محمد بن مسلم کی روایت امام باقرؑ سے اور ہشام بن سالم کی روایت امام صادقؑ سے: وسائل الشیعہ، ج ۳، ص ۵۲، کتاب الصلاۃ، باب ۷، ابواب اعداد الفرائض، حدیث ۲،۳۔

۶۵۔ عن ابی بصیر قال: قال الصادقؑ: «شیعتنا اهل الورع والاجتهاد واهل الوفاء والامانة واهل الزهد والعبادة واصحاب احدی وخمسین رکعة فی الیوم واللیلة، القائمون باللیل، الصائمون بالنهار، یزکّون اموالهم ویحجّون البیت ویجتنبون کلّ محرّم» ''ابو بصیر کہتے ہیں کہ امام صادقؑ نے فرمایا ہمارے شیعہ اہل ورع و جہد، اہل وفا و امانت اور اہل زہد و عبادت ہوتے ہیں، دن رات میں ۵۱ رکعت نماز پڑھنے والے، راتوں کو عبادت گزار اور دن میں روزہ دار ہوتے ہیں، اپنے اموال کی زکات دیتے، حج کرتے اور ہر حرام شے سے بچتے ہیں۔''

وسائل الشیعہ، ج ۳، ص ۴۱، کتاب الصلاۃ، باب ۱۳، ابواب اعداد الفرائض، حدیث ۲۶

۶۶۔ حدیث امام حسن عسکریؑ، مذکورہ ماخذ، ص ۴۲، حدیث ۲۹۔

۶۷۔ وسائل الشیعہ، ج ۷، ص ۳۲۱، ۳۰۳، باب ۷، ۱۲، ابواب صوم مندوب

۶۸۔ وسائل الشیعہ، ج ۷، ص ۳۰۳۔ ۳۰۶، باب ۷، ابواب صوم مندوب، حدیث ۴، ۵، ۶ و ۸۔

۶۹۔ وسائل الشیعہ، ج ۷، ص ۳۰۴، باب ۷، ابواب صوم مندوب، حدیث ۱۔

۷۰۔ وسائل الشیعہ، ج ۷، ص ۳۰۹، باب ۷، ابواب صوم مندوب، حدیث ۱۵۔

۷ سورۂ ص، آیت ۷۰ ۔

۷۲۔ وسائل الشیعہ، ج ۷، ص ۳۰۵، باب ۷، ابواب صوم مندوب، حدیث ۳۔

۷۳۔ حدیث ۲۸، حاشیہ ۶۔

۷۴ اس سے مراد شیخ یوسف بن احمد بن ابراہیم بحرانی ہیں۔ (۱۰۷ ۔ ۱۱۸۶) جو بہت بڑے فقیہ اور عالم ربانی تھے۔ خاندان آل عصفور سے تھے، کربلا میں رہتے تھے۔ بیس سال تک وہاں کی دینی درسگاہ کے سربراہ تھے۔ مرزائے قمی، سید مہدی بحر العلوم، سید مرزا مہدی شہرستانی اور ملا محمد مہدی نراقی جیسے حضرات نے آپ سے استفادہ کیا۔ فقہ میں آپ کی سب سے مشہور کتاب "الحدائق الناضرۃ فی احکام العترۃ الطاہرۃ" ہے جو فقہ استدلالی کی بہترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔

۷۵۔ الوافی، ص ۹، کتاب الصیام، باب ۴۳، صیام السنۃ۔

الحدائق الناضرۃ فی احکام العترۃ الطاہرۃ، ج ۶، ص ۱۸۸، کتاب الصوم، فی الصوم المندوب۔

۷۶۔ فروع کافی، ج ۴، ص ۳، کتاب الزکات، باب فضل صدقہ، حدیث ۵۔

۷۷ فروع کافی، ج ۴، ص ۹، کتاب الزکات، باب صدقۃ اللیل، حدیث ۳۔

۷۸۔ مستدرک الوسائل، ج ۷، ص ۱۶۳۔ ۱۶۴، کتاب الزکات، باب ۲، ابواب الصدقہ، حدیث ۶

۷۹۔ ترجمہ متن میں گزر چکا ہے

۸۰۔ فروع کافی، ج ۴، ص ۴، کتاب الزکات، باب فضل الصدقہ، حدیث ۱۔

۸۱۔ ثم قال (ابو عبد اللہ علیہ السلام) ﴿قال اللہ تعالی: إنّ من عبادي من يتصدّق بشقّ تمرة فأربيها له كما يربي أحدكم فلوه حتى أجعلها مثل جبل أحد﴾۔ بحار الانوار، ج ۹۳، ص ۲۲ و ۲۳، کتاب الزکات، باب ۱۴، حدیث ۳۰۔

۸۲۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ ﴿الصدقة تدفع ميتة السوء﴾۔

فروع کافی، ج ۴، ص ۲، کتاب الزکات، باب فضل صدقہ، حدیث اور ص ۵، باب ان الصدقۃ تدفع البلاء، حدیث ۳۔

۸۳ قال ابو عبد اللہ علیہ السلام لمحمد ابنه ﴿يا بني كم فضل معك من تلك النفقة؟ قال: أربعون دينارا، قال: اخرج فتصدّق بها، قال: انه لم يبق معي غيرها، قال: تصدّق بها فإن الله عزّ وجلّ يخلفها، أما علمت أن لكل شيء مفتاحا ومفتاح الرزق الصدقة، فتصدّق بها، ففعل، فما لبث أبو عبد الله عشرة أيام حتى جاءه من موضع أربعة آلاف دينار، فقال: يا بني أعطينا لله أربعين دينارا فأعطانا الله أربعة آلاف دينار﴾

امام صادقؑ نے اپنے بیٹے محمد سے کہا: بیٹے! اس رقم میں سے اب کتنی تمہارے پاس باقی ہے؟ کہا چالیس دینار۔ امامؑ نے فرمایا باہر جا کر ان سب کو صدقہ کر دو۔ محمد نے کہا اس کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ امامؑ نے کہا: تم ان کو صدقہ کر دو،

خدا اس کی جگہ پر ... کر دے گا۔ کیا تم نہیں جانتے کہ ہر شئے کی ایک کنجی ہے اور رزق کی کنجی صدقہ ہے لہٰذا ان کو صدقہ کر دو۔ محمد نے صدقہ کر دیا۔ اس دن کے بعد حضرت کے پاس کہیں سے چار ہزار دینار آ گئے۔ حضرت نے کہا بیٹے! ہم نے خدا کو ۴۰ دینار دیئے تھے اور خدا نے چار ہزار دینار واپس کر دیئے"۔

ساتویں امامؑ سے منقول ہے "صدقہ دے کر (آسمان سے) نازل ہونے والا رزق حاصل کرو"۔

فروع کافی، ج۴، ص۹، ۱۰، کتاب الزکاۃ، باب فی ان الصدقۃ تزید فی المال، حدیث ۳، ۴۔

۸۴۔ امام ششمؑ نے فرمایا ﴿ان الصدقۃ تقضی الدین وتخلف بالبرکۃ﴾ "صدقہ قرض کو ادا کرتا اور مال میں برکت دیتا ہے"۔ حوالہ سابق، ص۹، حدیث ۱۔

۸۵۔ عن ابی جعفرؑ قال ﴿البر والصدقۃ ینفیان الفقر ویزیدان فی العمر ویدفعان سبعین میتۃ السوء﴾ امام باقرؑ نے فرمایا "نیکی کرنا اور صدقہ دینا دونوں فقر کو دور کرتے اور عمر بڑھاتے ہیں اور (ستر قسم کی) بری موت سے بچاتے ہیں"۔

فروع کافی، ج۴، ص۲، کتاب الزکاۃ، باب فضل الصدقۃ، حدیث ۲۔

۸۶۔ عن ابی جعفرؑ فی قول اللہ عزوجل ﴿فاما من اعطی واتقی وصدق بالحسنی﴾ قال ﴿ان اللہ یعطی بالواحدۃ عشرۃ الی مائۃ الف فما زاد ... الحدیث﴾ "سورہ لیل، آیت ۵ کے بارے میں امام باقرؑ نے فرمایا: خدا ایک نیکی کے بدلے میں دس سے لے کر ایک لاکھ اور اس سے زیادہ دیتا ہے"۔

وسائل الشیعہ، ج۶، ص۲۵۶، کتاب الزکاۃ، ابواب الصدقۃ، باب ۱، حدیث ۵

۸۷۔ رسول خداؐ نے فرمایا ﴿تصدقوا فان الصدقۃ تزید فی المال کثرۃ﴾ "صدقہ دو، صدقہ مال میں کثرت پیدا کرتا ہے"۔ فروع کافی، ج۴، ص۹، کتاب الزکاۃ، باب فی ان الصدقۃ تزید فی المال، حدیث ۲۔

۸۸۔ عن رسول اللہؐ ﴿من سرہ ان یدفع اللہ عنہ نحس یومہ فلیفتتح یومہ بصدقۃ یذهب اللہ بها عنہ نحس یومہ ومن احب ان یذهب اللہ عنہ نحس لیلتہ فلیفتتح لیلتہ بصدقۃ یدفع اللہ عنہ نحس لیلتہ﴾ "جو چاہتا ہے کہ خدا اس سے اس دن کی نحوست کو دور کرے تو وہ اپنے دن کا آغاز صدقے سے کرے، خدا اس کے دن کی نحوست دور کر دیتا ہے اور جو چاہتا ہے کہ خدا اس سے رات کی نحوست دور کرے تو اپنی رات کا آغاز صدقے سے کرے، خدا اس سے رات کی نحوست کو دفع کرتا ہے"۔

فروع کافی، ج۴، ص۷، کتاب الزکاۃ، باب ان الصدقۃ تدفع البلاء، حدیث ۹۔

۸۹۔ عن الصادقؑ ﴿داووا مرضاکم بالصدقۃ﴾ "اپنے بیماروں کا صدقے کے ذریعے علاج کرو"۔

فروع کافی، ج۴، ص۳، کتاب الزکاۃ، باب فضل الصدقۃ، حدیث ۵

۹۰۔ عن ابی جعفرؑ قال ﴿لان احج حجۃ احب الی من ان اعتق رقبۃ ورقبۃ حتی انتهی الی عشرۃ، ومثلها ومثلها حتی انتهی الی سبعین، ولان اعول اهل بیت من المسلمین اشبع جوعتهم واکسو عورتهم واکف

وَحُوهِهِمْ عن النّاس، أحَبُّ اليّ مِنْ أنْ أحُجَّ حِجَّةً وَحِجَّةً (حتى انتهى الى عشْرٍ وعشْرٍ ومثْلِها ومثْلِها حتى انتهى الى سبعين)﴾ ”امام محمد باقرؑ نے فرمایا: اگر میں ایک حج کروں تو وہ مجھے ایک غلام آزاد کرنے اور ایک دوسرے غلام کو آزاد کرنے سے زیادہ محبوب ہے (امامؑ نے اس کو دس مرتبہ تکرار فرمایا اور ستر مرتبہ تک فرماتے رہے) اور اگر ایک مسلمان گھرانے کی دیکھ بھال کروں، ان کو سیر کروں، لباس پہناؤں اور لوگوں کی نظروں میں ان کی آبرو محفوظ کرلوں تو اس سے بہتر ہے کہ میں حج کروں اور دوسرا حج کروں (اس کی بھی دس مرتبہ تکرار فرمائی یہاں تک کہ ستر تک پہنچ گئے)“۔

فروع کافی، ج۴، ص۲، کتاب الزکات، باب فضل الصدقہ، حدیث۳۔

۹۱ عَنْ جعْفَرِ بْنِ مُحمّدٍؑ أنَّهُ قال في الرَّجُلِ يُعْتِقُ المَمْلُوكَ يُعْتِقُ اللهُ عزّوجلّ بِكُلِّ عُضْوٍ مِنْهُ عُضْواً مِنَ النّارِ﴾ ”جو ایک غلام آزاد کرتا ہے خدا اس غلام کے ہر عضو کے بدلے میں اس شخص کے عضو کو جہنم سے آزاد کر دیتا ہے“۔

وسائل الشیعہ، ج۱۶، ص۲، کتاب العتق، باب۱، حدیث۱۔

۹۲۔ حوالہ سابق، ص۳، حدیث۳۔

۹۳۔ سورۂ آل عمران، آیت/۹۲۔

۹۴۔ عن ابي عبد اللهؑ قال ﴿كان يتصدّقُ بالسُّكّرِ فقيل له تتصدّقُ بالسُّكّرِ فقال نعم ليس شيءٌ احبَّ اليّ منه فانا احبُّ ان اتصدّقَ باحبِّ الاشياء اليّ﴾۔

تہذیب الاحکام، ج۴، ص۳۳۱، کتاب الصیام، باب الزیادات، حدیث۲۔

۹۵۔ قد روي عن ابي الطفيل قال ﴿اشترى عليؑ ثوباً فاعجبه، فتصدّق به وقال سمعتُ رسول الله يقول من آثر على نفسه آثره الله يوم القيامة بالجنّة، ومن احبّ شيئاً فجعله لله، قال الله تعالى يوم القيامة قد كان العباد يكافئون فيما بينهم بالمعروف وانا اكافيك اليوم بالجنّة﴾۔

مجمع البیان، سورۂ آل عمران کی ۹۲ویں آیت کی تفسیر کے ضمن میں۔

۹۶۔ روي انّ ابا طلحة قسّم حائطاً له في اقاربه عند نزول هذه الآية وكان احبَّ امواله اليه، فقال له رسول اللهؐ بخٍ بخٍ ذلك مالٌ رابحٌ لك﴾۔ مجمع البیان، سورۂ آل عمران کی ۹۲ویں آیت کی تفسیر کے ضمن میں۔

۹۷۔ سورۂ آل عمران، آیت/۹۲

۹۸۔ مجمع البیان، سورۂ آل عمران کی ۹۲ویں آیت کی تفسیر کے ضمن میں۔

۹۹ اصول کافی، ج۲، ص۳۱۵ - ۳۲۰، کتاب الایمان والکفر، باب حب الدنیا والحرص علیہا، احادیث ۱ الی ۱۷، اسی طرح دوسرے ابواب میں۔

۱۰۰۔ حدیث ۹، فصل ۲۔

۱۰۱ فروع کافی، ج۴، ص۸، کتاب الزکات، باب فضل صدقۃ السر، حدیث۲۔

۱۰۲۔ قال رسول اللهؐ ﴿صدقة السّرّ تطفئُ غضبَ الرّبّ﴾۔

فروع کافی، ج۴، ص۷، کتاب الزکات، باب فضل صدقۃ السر، حدیث ۱، ۳۔

وسائل الشیعہ، ج۹، ص۳۷۵-۳۷۸، کتاب الزکات، باب ۱۳، ابواب صدقہ، احادیث ۱، ۲، ۳، ۴ و ۷۔

۱۰۳۔ وسائل الشیعہ، ج۹، ص۳۷۷، کتاب الزکات، باب ۱۳، ابواب صدقہ، حدیث ۔

۱۰۴۔ فروع کافی، ج۴، ص۱۰، کتاب الزکات، باب صدقۃ علی قرابت، حدیث ۲ و ۳۔

۱۰۵۔ قال علیہ السلام ﴿لا صدقة وذو رحمٍ مُحتاج﴾۔

وسائل الشیعہ، ج۹، ص۳۸۲، کتاب الزکات، باب ۲۰، ابواب صدقہ، حدیث ۴ و ۷۔

۱۰۶۔ قال الصادق ﴿إنّ الحسن بن علي قاسم ربّه ثلاث مرات حتى نعلاً ونعلاً وثوباً وثوباً ودیناراً ودیناراً﴾ وسائل الشیعہ، ج۹، ص۴۳۳، کتاب الزکات، باب ۵۲، ابواب صدقہ، حدیث

۱۰۷۔ في کتاب أبي الحسن الرضا الی أبي جعفر ﴿یا أبا جعفر بلغني أنّ الموالي إذا رکبت أخرجوک من الباب الصغیر وإنما ذلک من بخلٍ بهم لئلا ینال منک أحدٌ خیراً فاسألک بحقّي علیک لا یکن مدخلک ومخرجک إلا من الباب الکبیر وإذا رکبت فلیکن معک ذهبٌ وفضّة ثم لا یسألک أحد إلا أعطیته ومن سألک من عمومتک أن تبرّه فلا تعطه أقلّ من خمسین دیناراً والکثیر إلیک ومن سألک من عماتک فلا تعطها أقلّ من خمسة وعشرین دیناراً والکثیر إلیک إني أرید أن یرفعک الله فأنفق ولا تخش من ذي العرش إقتاراً﴾۔ بحار الانوار، ج۵۰، ص۱۰۲، تاریخ امام محمد تقی، باب ۵، حدیث ۱۹۔

۱۰۸۔ سأل رجلٌ أبا عبد الله عن قول الله عزّوجلّ ﴿وآتوا حقّه یوم حصاده ولا تسرفوا إنّه لا یحبّ المسرفین﴾ فقال ﴿کان فلان بن فلان الأنصاري سمّاه وکان له حرث فکان إذا جذّ یتصدّق به فیبقی هو وعیاله بغیر شيء فجعل الله عزّوجلّ ذلک سرفاً﴾ ”ایک شخص نے امام صادقؑ سے اس آیت ﴿وآتوا حقّه یوم حصاده ولا تسرفوا إنّه لا یحبّ المسرفین﴾ کے بارے میں پوچھا تو حضرت نے فرمایا فلاں بن فلاں انصاری (ان کا نام بھی لیا) کی کھیتی تھی جب فصل کٹنے کا وقت آتا تو وہ سب صدقہ کر دیتا تھا اور خود اور بال بچے فاقہ کرتے تھے تو خدا نے اس کو اسراف قرار دیا۔“

عن أبي عبد الله أنه تصدّق علی ثلاثة من السُؤّال ثم ردّ الرابع وقال ﴿لو أنّ رجلاً کان له مال یبلغ ثلاثین أو أربعین ألف درهم ثم شاء أن لا یبقی منها إلا وضعها في حقٍّ لفعل فیبقی لا مال له فیکون من الثلاثة الذین یُردّ دعاؤهم. قلتُ: من هم؟ قال: أحدهم رجلٌ کان له مال فأنفقه في وجهه ثم قال یا ربّ ارزقني فیقال له ألم أجعل لک سبیلاً إلی طلب الرزق﴾ ”امام جعفر صادقؑ سے روایت کی گئی ہے کہ آپ نے تین سائلوں کو صدقہ دیا اور چوتھے کو رد کر دیا اور فرمایا اگر کسی کے پاس تیس یا چالیس ہزار درہم ہوں اور وہ سب کو صحیح مقامات پر خرچ کر دے حتیٰ کہ خالی ہاتھ رہ جائے تو وہ ان تین لوگوں میں سے ہے جن کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ راوی نے پوچھا وہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا ایک تو وہ جس کے پاس مال ہو اور وہ سب کو مناسب جگہ پر خرچ کر کے خدا سے دعا کرے کہ پالنے والے مجھے رزق عطا کر تو

اس سے کہا جاتا ہے کیا تجھے میں نے رزق حاصل کرنے کا راستہ نہیں بتایا تھا؟"

وسائل الشیعہ، ج۶، ص۳۲۲، ۳۲۳، کتاب الزکات، ابواب صدقہ، باب ۴۲، حدیث ۱ و ۳۔

۱۰۹۔ عن ابی عبداللہؑ قال ﴿قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم افضل الصدقۃ صدقۃ تکون عن فضل الکف﴾۔

وسائل الشیعہ، ج۶، ص۳۲۳، ابواب صدقہ، باب ۴۲، حدیث ۴۔

۱۱۰۔ حدیث ۱۲، فصل ۳۔

۱۱۱۔ عن عبداللہ بن سنان عن ابی عبداللہؑ قال ﴿شرف المؤمن صلاتہ باللیل وعز المؤمن کفہ عن اعراض الناس﴾ وسائل الشیعہ، ج۵، ص۲۶۸، کتاب الصلوۃ، باب ۳۹، حدیث ۲۔

۱۱۲۔ عن عبداللہ بن سنان، عن ابی عبداللہ علیہ السلام قال ﴿قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لجبرئیل عظنی فقال یا محمد عش ما شئت فانک میت، واحبب ما شئت فانک مفارقہ، واعمل ما شئت فانک ملاقیہ شرف المؤمن صلاتہ باللیل وعزہ کفہ عن اعراض الناس﴾۔ الخصال، ج۱، ص۷، باب الواحد، حدیث ۱۹۔

۱۱۳۔ عن جعفر بن محمدؑ قال ﴿المال والبنون زینۃ الحیاۃ الدنیا، وثمانی رکعات من آخر اللیل والوتر زینۃ الآخرۃ وقد یجمعھا اللہ لاقوام﴾

وسائل الشیعہ، ج۵، ص۲۷۶، کتاب الصلاۃ، باب ۳۹، ابواب الصلوات المندوبۃ، حدیث ۳۳۔

۱۱۴۔ وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ﴿اذا قام العبد من لذیذ مضجعہ والنعاس فی عینہ لیرضی ربہ بصلاۃ لیلۃ، باھی اللہ بہ الملائکۃ وقال اما ترون عبدی ھذا قد قام من لذیذ مضجعہ لصلاۃ لم افرضھا علیہ، اشھدوا انی قد غفرت لہ﴾۔ وسائل الشیعہ، ج۵، ص۲۷۷، کتاب الصلاۃ، باب ۳۹، ابواب بقیۃ الصلوات المندوبۃ، حدیث ۳۶۔

۱۱۵۔ وسائل الشیعہ، ج۳، ص۳۲، ۳۳، کتاب الصلوۃ، باب ۱۳، ابواب اعداد الفرائض، حدیث ۱، ۳ و ۶۔

۱۰۶۔ سورۃ البقرہ، آیت ۲۳۸۔

۱۰۷۔ بینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ جالس فی المسجد اذ دخل رجل فقام یصلی فلم یتم رکوعہ ولا سجودہ فقال صلی اللہ علیہ وآلہ ﴿نقر کنقر الغراب لئن مات ھذا وھکذا صلاتہ لیموتن علی غیر دینی﴾ امام محمد باقرؑ نے فرمایا رسول خدا مسجد میں بیٹھے تھے کہ ایک شخص مسجد میں آکر نماز پڑھنے لگا جس کے رکوع و سجود کامل نہیں تھے۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ یہ کوے کی طرح ٹھونگیں مار رہا ہے، اگر یہ مر گیا اور اس کی نماز اسی طرح رہی تو میرے دین پر نہیں مرے گا"۔

فروع کافی، ج۳، ص۲۶۸، کتاب الصلوۃ، باب من حافظ علی صلاتہ او ضیعھا

۱۱۸۔ ترجمہ متن میں گزر چکا ہے۔

۱۱۹۔ اصول کافی، ج۲، ص۶۰۹، کتاب فضل القرآن، باب فی قراءتہ، حدیث

۱۲۰۔ اصول کافی، ج۲، ص۶۰۹، کتاب فضل القرآن، باب فی قراءتہ، حدیث ۲۔ اس ماخذ میں حدیث کے آخری جملے میں "منظر والیھا" آیا ہے۔

۱۲۱۔ سورۂ محمدؐ، آیت ۲۴۔

۱۲۲۔ ﴿لا خیر فی عبادة لا فقه فیها ولا فی قراءة لا تدبّر فیها﴾۔
محجة البیضاء، ج۲، ص۲۳۷، کتاب آداب تلاوة القرآن، باب ۳۔

۱۲۳۔ اصول کافی، ج۲، ص۶۱۲، کتاب فضل القرآن، باب ثواب قراءة القرآن، حدیث ۵۔

۱۲۴۔ اصول کافی، ج۲، ص۵۹۶۔۶۰۲، کتاب فضل القرآن، حدیث ۱، ۲، ۳۔

۱۲۵۔ عن ابی عبداللهؑ قال ﴿من قرأ القرآن وهو شابّ مؤمن اختلط القرآن بلحمه ودمه وجعله الله عزّوجلّ مع السفرة الکرام البررة، وکان القرآن حجیزاً عنه یوم القیامة یقول یا ربّ إنّ کلّ عامل قد اصاب اجر عمله غیر عاملی فبلّغ به کرم عطایاک قال فیکسوه الله العزیز الجبّار حلّتین من حلل الجنّة ویوضع علی رأسه تاج الکرامة، ثمّ یقال له هل ارضیناک فیه؟ فیقول القرآن یا ربّ! قد کنت ارغب له فیما هو افضل من هذا فیعطی الامن بیمینه والخلد بیساره، ثمّ یدخل الجنّة فیقال له اقرأ واصعد درجة ثمّ یقال له هل بلغنا به وارضیناک؟﴾۔
اصول کافی، ج۲، ص۶۰۳، کتاب فضل القرآن، باب حامل القرآن، حدیث ۴
ثواب الاعمال وعقاب الاعمال، ص۱۲۶، ثواب من قرأ القرآن وهو شاب مؤمن

۱۲۶۔ ﴿انّ الذی یعالج القرآن یحفظه بمشقّة منه وقلّة حفظ له اجران﴾
مفضل کی اس روایت کے مشابہ بحار الانوار، ج۹۰، ص۸۷، کتاب القرآن، باب ۴، حدیث ۷ میں بھی ایک روایت موجود ہے

۱۲۷۔ ﴿انّ تمام الصلاة فی کتاب الله عزّوجلّ واتمّ الزکاة واتمّ الحجّ؟ فقال یا داود ذاک من الصلاة فی کتاب الله عزّوجلّ ومن الزکاة ومن الصیام ومن الحجّ﴾۔
بحار الانوار، ج۲۴، ص۳۰۳، کتاب الامامة، باب انهم الصلاة والزکاة، حدیث ۴

۱۲۸۔ اصول کافی، ج۲، ص۶۳۹۔۶۴۲، کتاب العشرة، باب من تکره مجالسته ومرافقته، حدیث ۲، ۴، ۶، ۱۰۔

۱۲۹۔ اصول کافی، ج۲، ص۶۰۰، کتاب فضل القرآن، حدیث ۵۔

۱۳۰۔ امالی (مجالس) شیخ صدوقؒ، ص۴۵۸، مجلس ۸۴، حدیث ۴
وسائل الشیعہ، ج۴، ص۸۴۹، کتاب الصلوٰۃ، باب ۳، حدیث ۹۔

۱۳۱۔ اصول کافی، ج۲، ص۶۲۷، کتاب فضل القرآن، باب نوادر، حدیث ۔

۱۳۲۔ وسائل الشیعہ، ج۴، ص۸۴۷، کتاب الصلوٰۃ، باب ۸، ابواب قراءت القرآن، حدیث ۵
ثواب الاعمال وعقاب الاعمال، ص۳۲۹، عقاب المستاکل بالقرآن، حدیث ۱۔

۱۳۳۔ سورۂ طٰہٰ، آیت ۱۲۵۔

۱۳۴۔ ثواب الاعمال وعقاب الاعمال، ص ۳۳۲، ۳۳۶، ۳۳۷،

وسائل الشیعہ، ج ۴، ص ۸۲۷، کتاب الصلوٰۃ، باب ۸، ابواب قرأت القرآن، حدیث ۸

۱۳۵۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۶۱۴، کتاب فضل القرآن، باب ترتیل القرآن بالصوت الحسن، حدیث۔

۱۳۶۔ ﴿إنّ القرآن نزل بالحزن فاقرؤوه بالحزن﴾۔

اصول کافی، ج ۲، ص ۶۱۴، کتاب فضل القرآن، باب ترتیل القرآن بالصوت الحسن، حدیث ۲، نیز "ترتیل" کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کو خوش بیانی اور آرام سے پڑھو۔ مجمع البیان ج ۱۰، ص ۳۷۸، سورۂ مزمل۔

۱۳۷۔ عن ابي الحسن قال: ﴿ذكرت الصوت عنده، فقال: إنّ علي بن الحسين عليهما السلام كان يقرأ فربما مرّ به المارّ فصعق من حسن صوته﴾

اصول کافی، ج ۲، ص ۶۱۵، کتاب فضل القرآن، باب ترتیل القرآن بالصوت الحسن، حدیث ۴۔

۱۳۸۔ تفسیر نور الثقلین، ج ۵، ص ۶۸۳، ۶۸۴، تفسیر سورۂ کوثر، حدیث ۱۷، ۱۹۔

۱۳۹۔ وسائل الشیعہ، ج ۴، ص ۷۲۷، کتاب الصلوٰۃ، باب ۹، ابواب تکبیرۃ الاحرام، حدیث ۱۔

۱۴۰۔ عن علي بن جعفر عن اخيه موسى بن جعفر عليه السلام قال: ﴿قال: على الامام أن يرفع يده في الصلاة ليس على غيره أن يرفع يده في الصلاة﴾ "علی ابن جعفرؑ نے اپنے برادر امام موسیٰ کاظمؑ سے روایت کی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: امام (جماعت) کیلئے نماز میں ہاتھوں کا اٹھانا ضروری ہے لیکن غیر امام کیلئے یہ ضروری نہیں ہے"۔

وسائل الشیعہ، ج ۴، ص ۷۲۶، کتاب الصلوٰۃ، باب ۹۔

۱۴۱۔ عن علي بن ابي طالب عليه السلام قال: ﴿لما نزلت على النبي صلى الله عليه وآله ﴿فصلّ لربّك وانحر﴾ قال: يا جبرئيل ما هذه النحيرة التي امرني بها ربي؟ قال: يا محمد انها ليست بنحيرة ولكنه يأمرك اذا تحرّمت للصلاة أن ترفع يديك اذا كبّرت واذا ركعت واذا رفعت رأسك من الركوع واذا سجدت فانها صلاتنا وصلاة الملائكة في السماوات السبع فإنّ لكلّ شيء زينة وإنّ زينة الصلاة رفع الأيدي عند كلّ تكبيرة﴾

"اصبغ بن نباتہ سے نقل کی ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا جب ﴿فصلّ لربّك وانحر﴾ نازل ہوا تو رسول خداؐ نے جبرئیلؑ سے پوچھا یہ کون سی قربانی ہے جس کا مجھے میرے رب نے حکم دیا ہے؟ جبرئیلؑ نے کہا یہ قربانی نہیں ہے مگر خدا نے آپؐ کو حکم دیا ہے کہ جب نماز پڑھنے آمادہ ہو تو تکبیر کہتے وقت، رکوع میں جاتے وقت، رکوع سے سر اٹھاتے وقت اور سجدہ میں جاتے وقت اپنے ہاتھوں کو بلند کرو کیونکہ یہی ہماری اور ساتوں آسمانوں کے ملائکہ کی نماز ہے۔ ہر چیز کا ایک زیور ہے اور نماز کا زیور تکبیر کہتے وقت ہاتھوں کا بلند کرنا ہے"

مجمع البیان، تفسیر سورۂ کوثر۔

۱۴۲۔ عن ابن سنان قال: ﴿إنّما ترفع اليدان بالتكبير لأنّ رفع اليدين ضرب من الابتهال والتبتّل والتضرّع، فأحبّ الله عزّ وجلّ أن يكون العبد في وقت ذكره له متبتّلاً متضرّعاً مبتهلاً ولأنّ في رفع اليدين احضار النيّة

واقبال القلب﴾۔ وسائل الشیعہ، ج۴، ص۷۲۷، کتاب الصلاۃ، باب ۹، ابواب تکبیرۃ الاحرام، حدیث

۱۴۳۔ سورۂ انعام، آیت ۹۱۔

۱۴۴۔ وسائل الشیعہ، ج۴، ص۷۲۲، کتاب الصلاۃ، باب ۷، ابواب تکبیرۃ الاحرام، حدیث ۵

۱۴۵۔ وسائل الشیعہ، ج۴، ص۷۲۲، ۷۲۳، کتاب الصلاۃ، باب ۷، ابواب تکبیرۃ الاحرام، حدیث ۶

۱۴۶۔ فروع کافی، ج۶، ص۴۹۵، ۴۹۶، کتاب الزی والتجمل، باب السواک، حدیث ۹

۱۴۷۔ خصال، ج۲، ص۴۲۹، باب ۱۰، حدیث ۵۱

۱۴۸ عن ابی عبداللہ علیہ السلام قال ﴿قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اوصانی جبرئیل علیہ السلام بالسواک حتی خفت علی اسنانی﴾۔ فروع کافی، ج۶، ص۴۹۶، کتاب الزی والتجمل، باب السواک، حدیث ۸۔

۱۴۹۔ عنہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ﴿لولا ان اشق علی امتی لامرتھم بالسواک عند وضوء کل صلاۃ﴾

وسائل الشیعہ، ج۱، ص۳۵۵، کتاب الطہارۃ، باب ۵، ابواب السواک، حدیث ۱۔

۱۵۰۔ عن ابی عبداللہ علیہ السلام قال ﴿ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کان اذا صلی العشاء الآخرۃ امر بوضوئہ وسواکہ یوضع عند رأسہ مخمراً فیرقد ما شاء اللہ، ثم یقوم فیستاک ویتوضأ ویصلی اربع رکعات ثم یرقد، ثم یقوم فیستاک ویتوضأ ویصلی ثم قال لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ﴾

وسائل الشیعہ، ج۱، ص۳۵۶، کتاب الطہارۃ، باب ۶، ابواب السواک، حدیث ۱۔

۱۵۱۔ عن ابی عبداللہ عن آبائہ، قال: ﴿قال رسول اللہ رکعتان بسواک افضل من سبعین رکعۃ بغیر سواک﴾۔

عن معلی بن خنیس قال ﴿سألت ابا عبداللہ عن السواک بعد الوضوء، فقال الاستیاک قبل ان تتوضأ قلت: ارأیت ان نسی حتی یتوضأ قال یستاک ثم یتمضمض ثلاث مرات﴾

بحار الانوار، ج۷۳، ص۱۳۲، ۱۳۳، کتاب الآداب والسنن، باب السواک، حدیث ۳۲، ۳۳۔

۱۵۲۔ وسائل الشیعہ، ج۱، ص۳۵۳، ۳۵۵، ۳۵۶، کتاب الطہارۃ، باب ۳، ۵، ۱۰

۱۵۳۔ مجمع البیان، تفسیر آیہ ۴ سورۂ قلم۔

۱۵۴ گر مسلمانی ازین است کہ حافظ دارد آہ اگر از پس امروز بود فردائی (حافظ)۔

۱۵۵ طہارۃ الاعراق، پانچویں صدی ہجری کے دانشور ابن مسکویہ کی تصنیف۔

۱۵۶۔ محجۃ البیضاء، کلمات مکنونہ، حیات جاوید، فیض کاشانی، حق الیقین مجلسی،

جامع السعادات ملا مہدی نراقی، معراج السعادۃ ملا احمد نراقی جو کتاب جامع السعادات سے اقتباس ہے

۱۵۷۔ خصال، ج۲، ص۴۳۱، باب ۱۰، حدیث ۲

۱۵۸۔ معانی الاخبار، ص۱۹۱، باب فی مکارم الاخلاق، حدیث ۳

۱۵۹۔ اصول کافی، ج ۳، ص ۲۶۴، کتاب ایمان و کفر باب جوامع المکارم، حدیث ۲۔

۱۶۰۔ امالی شیخ صدوق، مجلس ۵۰، حدیث ۱۰، وسائل الشیعہ، ج ۱۱، ص ۱۵۶، کتاب الجہاد، باب ۲، ابواب جہاد النفس، حدیث ۸۔ مطبوعہ نسخوں میں "زمام" فعل "ای آیا ہے۔

۱۶۱۔ وسائل الشیعہ کا جو نسخہ میرے پاس ہے اس میں اسی طرح ہے لیکن احتمال ہے کہ یہ "زمام الاخلاق" ہو اور ناسخ یا راوی سے سہو ہو گیا ہو۔ (منہ عفی عنہ)۔

۱۶۲۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۹۹ کتاب ایمان و کفر، باب حسن الخلق، حدیث۔

۱۶۳۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۹۹، کتاب ایمان و کفر، باب حسن الخلق، حدیث ۲۔

۱۶۴۔ عن ابی عبد اللہ قال ﴿قال رسول الله اكثرُ ما تلج به امّتي الجنّة، تقوى الله وحسن الخُلق﴾۔
اصول کافی، ج ۲، ص ۱۰۰، کتاب ایمان و کفر، باب حسن الخلق، حدیث ۶۔

۱۶۵۔ وعنه قال ﴿إنّ الله تبارك وتعالى ليُعطي العبد من الثّواب على حسن الخُلق كما يُعطي المُجاهد في سبيل الله، يغدو عليه ويروح﴾۔
اصول کافی، ج ۲، ص ۱۰۱، کتاب ایمان و کفر، باب حسن الخلق، حدیث ۱۲۔

۱۶۶۔ عنه قال ﴿البرّ وحسنُ الخُلق يعمران الدّيار ويزيدان في الأعمار﴾۔
اصول کافی، ج ۲، ص ۱۰۰ کتاب ایمان و کفر، باب حسن الخلق، حدیث ۸

۱۶۷۔ اصول کافی ج ۲ ص ۳۲۱، کتاب ایمان و کفر، باب سوء الخلق، حدیث ۳

۱۶۸۔ وعنه قال ﴿إنّ سوء الخُلق ليُفسد العمل كما يُفسد الخلُّ العسل﴾۔
اصول کافی ج ۲، ص ۳۲۱، کتاب ایمان و کفر، باب سوء الخلق، حدیث ۱۔

۱۶۹۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۲۲ کتاب ایمان و کفر، باب سوء الخلق، حدیث ۲۔

۱۷۰۔ اصول کافی ج ۲ ص ۳۲۱، کتاب ایمان و کفر، باب سوء الخلق، حدیث ۴

تیسویں حدیث

بِسَنَدِي الْمُتَّصِلِ إِلَى ثِقَةِ الْإِسْلَامِ، مُحَمَّدِ بْنِ يَعْقُوبَ الْكُلَيْنِيِّ رِضْوَانُ اللهِ عَلَيْهِ عَنْ عِدَّةٍ مِنْ أَصْحَابِنَا، عَنْ أَحْمَدَ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ خَالِدٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ هَارُونَ بْنِ الْجَهْمِ عَنِ الْمُفَضَّلِ، عَنْ سَعْدٍ، عَنْ أَبِي جَعْفَرٍ عليه السلام قَالَ

﴿إِنَّ الْقُلُوبَ أَرْبَعَةٌ قَلْبٌ فِيهِ نِفَاقٌ وَإِيمَانٌ، وَقَلْبٌ مَنْكُوسٌ، وَقَلْبٌ مَطْبُوعٌ، وَقَلْبٌ أَزْهَرُ أَجْرَدُ

فَقُلْتُ مَا الْأَزْهَرُ؟ قَالَ فِيهِ كَهَيْئَةِ السِّرَاجِ فَأَمَّا الْمَطْبُوعُ فَقَلْبُ الْمُنَافِقِ، وَأَمَّا الْأَزْهَرُ فَقَلْبُ الْمُؤْمِنِ، إِنْ أَعْطَاهُ شَكَرَ وَإِنِ ابْتَلَاهُ صَبَرَ، وَأَمَّا الْمَنْكُوسُ فَقَلْبُ الْمُشْرِكِ ثُمَّ قَرَأَ هَذِهِ الْآيَةَ ﴿أَفَمَنْ يَمْشِي مُكِبًّا عَلَى وَجْهِهِ أَهْدَى أَمَّنْ يَمْشِي سَوِيًّا عَلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾[1] فَأَمَّا الْقَلْبُ الَّذِي فِيهِ إِيمَانٌ وَنِفَاقٌ فَهُمْ قَوْمٌ كَانُوا بِالطَّائِفِ، فَإِنْ أَدْرَكَ أَحَدَهُمْ أَجَلُهُ عَلَى نِفَاقِهِ هَلَكَ وَإِنْ أَدْرَكَهُ عَلَى إِيمَانِهِ نَجَا﴾[2]

ترجمہ امام محمد باقرؑ نے فرمایا دل چار قسم کے ہوتے ہیں

ایک قسم کا دل وہ ہوتا ہے جس میں نفاق و ایمان ہوتا ہے، دوسری قسم کا دل الٹا ہوتا ہے، تیسرا دل مہر زدہ اور ظلمانی ہوتا ہے اور ایک دل یہ ہوتا ہے جو ازہر (نورانی) اور صاف شفاف ہوتا ہے۔

راوی کہتا ہے میں نے پوچھا ازہر کیا ہے؟ فرمایا ازہر وہ قلب ہے جو چراغ کے مانند ہے اور مطبوع (ظلمانی) منافق کا دل ہوتا ہے۔ ازہر مومن کا دل، اگر خدا اس کو کچھ عطا کرتا ہے شکر کرتا اور اگر مبتلا کرتا ہے تو

اس پر صبر کرتا ہے۔ الٹا دل مشرک کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد حضرتؑ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی ﴿أَفَمَن يَمْشِي مُكِبًّا عَلَى ...﴾ ''بھلا جو شخص اوندھا اپنے منہ کے بل چلے وہ زیادہ ہدایت یافتہ ہوگا یا وہ شخص جو سیدھا برابر راہ راست پر چل رہا ہو؟'' اور جس قلب میں ایمان ونفاق ہو وہ طائف کی ایک قوم تھی ان میں سے جس کی موت نفاق پر ہوتی تھی وہ ہلاک ہوتا تھا اور جس کی ایمان پر ہوتی وہ نجات پاتا تھا''۔

شرح ''المنكوس'' کے معنی الٹا کے ہیں، چنانچہ ''يقال نكست الشيء انكسه نكساً، قلبته على راسه'' کا مطلب ''میں نے اس کو الٹا کر دیا'' کے ہے اور صحاح میں ہے ''الولد المنكوس'' اس بچے کو کہتے ہیں جس کا پیر پہلے نکلے اور سر بعد میں۔ اس کے قریب ''مُكِبّ على وجهه'' کے معنی ہیں اور حضرتؑ نے اسی آیت سے استشہاد فرمایا ہے، کیونکہ ''اكباب'' کے معنی منہ کے بل گرنے کے ہیں اور یہ اس بات سے کنایہ ہے کہ اہل شرک کے قلوب ٹیڑھے اور ان کی حرکت اور معنوی سفر غیر صراط مستقیم پر ہے۔ انشاء اللہ اس کی تفصیل آئے گی۔

''المطبوع اي المختوم'' اس کا مطلب مہر لگا ہوا ہے۔ ''الطَّبْعُ، بالسكون'' کا مطلب مہر ہے، جیسا کہ قرآن میں ہے ﴿ختم الله على قلوبهم﴾ ''وبالتحريك، الدنس والوسخ'' اور حرکت کے ساتھ، اس کا مطلب غلاظت وگندگی ہے۔ پس اگر مختوم کے معنی مراد لئے جائیں تو یہ کنایہ ہے کہ حق بات اور حقائق الٰہی ان میں داخل نہیں ہوتے اور نہ قبول کرتے ہیں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ خدا اپنے لطف خاصہ کو اس سے روک دیتا ہے اگرچہ یہ معنی بھی درست ہے مگر جو مطلب ذکر کیا گیا وہ زیادہ مناسب ہے۔

''الأزهر: الأبيض المستنير، كما عن النهاية'' ازہر کے معنی سفید و روشن کے ہیں، جیسا کہ نہایہ میں ہے۔ ''وفي الصحاح: الأزهر النيّر ويسمّى القمر الأزهر'' اور صحاح میں ہے: ازہر نورانی کو کہتے ہیں اور اسی سے ہے قمر ازہر۔ ''قال ابن السكيت: الأزهران، الشمس والقمر، ورجل أزهر أي أبيض مشرق الوجه والمرأة الزهراء'' ابن سکیت نے کہا ہے: الزہران، چاند و سورج ہیں اور رجل ازہر یعنی گورے اور کھلے چہرے کا مالک مرد اور (اس صفت کی) عورت کیلئے الزہراء آئے گا۔ مختصر یہ ہے کہ ازہر کے معنی نورانی اور سفید کے ہیں۔ اسی لئے چاند و سورج کو زہران اور نورانی شخص کو ازہر اور گوری و نورانی عورت کو زہراء کہتے ہیں۔

"والأجرد الّذي ليس في بدنه شعر" "الاجرد" کے معنی ہیں وہ شخص جس کے بدن پر بال نہ ہوں وفي الصّحاح الجرد فضاء لا نبات فيه" ؂ اور صحاح میں ہے اجرد، وہ ماحول ہے جس میں نباتات نہ ہوں۔ یہ دنیا سے لاتعلقی کی طرف اشارہ ہے یہ صاف و بے غش ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں جو بات مناسب ہے اس کا ذکر ایک مقدمہ اور چند فصلوں کے ضمن میں کروں گا۔

مقدمہ: اصلاح قلب کی ترغیب

معلوم ہونا چاہئے کہ شریعت اور حکما و عرفا کی اصطلاح میں قلب کے اثرات ہیں۔ ان کی حقیقت کو بیان کرنے، اختلاف و اصطلاحات اور بیان مراتب قلوب و درجات میں وقت صرف کرنا اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے اور خود ہمارے لئے بھی بہت زیادہ مفید نہیں ہے۔ لہذا بہتر یہی ہے کہ احادیث شریفہ میں جس طرح اجمالاً ذکر کیا گیا ہے ہم بھی اسی طرح ذکر کریں اور جو ہمارے لئے لازم و ضروری ہے اس کو بیان کریں۔

اصطلاح میں "دل سے کوشش کرنا" یعنی سعادت و شقاوت کا سرمایہ اور محور صلاح و فساد۔ یہ بات کہیں زیادہ اہم ہے کہ ہم دل کی حقیقت کو تلاش کریں اور اس سلسلے میں رائج اصطلاحات کی اصلاح کریں کیونکہ انسانی بھلائی اور بدبختی کا انحصار دل کی اچھائی یا برائی پر ہوتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان اصطلاحات کی طرف شدت توجہ اور فہم الفاظ اور ان کے اطراف میں غور کرنے کی وجہ سے خود قلب سے بالکل غافل ہو جاتا ہے اور اس کی اصلاح کرنے سے رہ جاتا ہے۔ قلب کی ماہیت و حقیقت کی شرح تک تو وہ استاد کامل بن جاتا ہے، حکما و عرفا کی اصطلاحات کا ماہر ہو جاتا ہے، لیکن خود اس کا قلب الٹا اور مہر لگا ہوا ہوتا ہے جیسے کوئی شخص فائدہ مند اور ضرر رساں دواؤں کے نفع و نقصان سے واقف ہو اور ان کی خوب شرح کرتا ہو، لیکن مضر دواؤں سے اجتناب اور فائدہ مند دواؤں کا استعمال نہ کرتا ہو، یقیناً ایسا شخص علم ادویہ سے واقف ہونے کے باوجود ہلاک ہو جائے گا اور یہ علم اس کو بچا نہیں سکے گا۔

میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ تمام علوم عملی ہیں، حتی علوم معارف میں بھی ایک قسم کا عمل موجود ہے اور اب میں عرض کرتا ہوں کہ احوال قلوب اور ان کی کیفیت صحت و مرض اور صلاح و فساد کے علوم، خاص عمل کی تمہید اور عمل کے علاج و اصلاح کا طریقہ ہیں، ان کا ادراک اور سمجھنا انسانی کمالات میں سے نہیں ہے۔ لہذا

نسان کی پوری توجہ اور مقصد قلب کی اصلاح اور کمال کی طرف ہونے چاہیے تاکہ اس کے ذریعہ روحانی سعادت ور غیب کے عالی درجات حاصل کر سکے اور اگر وہ اہل علوم و دقائق و حقائق میں سے بھی ہے تو انفس و آفاق کے سیر کے ضمن میں سب سے عمدہ مطلب اس کیلئے یہ ہے کہ اپنے نفسانی حالات کے بارے میں معلومات حاصل کرے تاکہ اگر وہ حالات مہلک ہوں تو ان کا علاج کرے اور اگر وہ نجات دلانے والے ہوں تو ان کی تکمیل کی کوشش کرے۔

پہلی فصل۔ تقسیم قلوب کا مبنی کیا ہے؟

قلوب کی جو تقسیم اس حدیث شریف میں ہے وہ ایک کلی اور اجمالی تقسیم ہے اور ہر دل کے درجات و مراتب ہوتے ہیں چاہے وہ شرک و نفاق کے ہوں یا ایمان و کمال کے اور بظاہر قلوب کی یہ تقسیم کسب و حرکات معنوی کے بعد کی ہے، نہ اصل فطرت و خمیر نفوس کی بنا پر، کیونکہ اگر اصل فطرت کی بنا پر ہوگی تو پھر روایات فطرت کہ جن کی مٹی پر "ہر بچہ فطرت توحید پر پیدا ہوتا ہے اور شرک و نفاق عارضی چیز ہے" سے منافات لازم آئے گی۔ ویسے اگر تقسیم بحسب اصل فطرت بھی ہو تو ایک نظر سے یہ بیان صحیح ہے اور رفع منافات کیا جا سکتا ہے اور یہ لازمی لہ جبر پر بھی منتج نہ ہوگا، لیکن اعتبار و برہان سے نزدیک وہی احتمال دل ہے اور ہم نے اس سے پہلے بھی ذکر کیا ہے۔ کہ انسان جب تک دار دنیا میں رہے، جو شجرہ کہ ہیولیٰ اور جوہری و صوری و عرضی تغیرات و تبدلات سے دوچار ہے، اس وقت تک اپنے کو ہر قسم کے نقائص و شقاوت اور شرک و نفاق سے نجات دے سکتا اور مرتبہ کمال و سعادت روحانی و ریحانی تک پہنچ سکتا ہے اور یہ بات مشہور حدیث ﴿الشَّقِيُّ شَقِيٌّ فِي بَطْنِ اُمِّهِ﴾ "شقی تو اپنی ماں کے پیٹ سے شقی ہوتا ہے" کے مخالف نہیں ہے، کیونکہ حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سعادت و شقاوت ذاتی ہے اور ہٹنے جانے کی قابل نہیں ہے، بلکہ یہ حدیث برہان کے موافق ہے، کیونکہ یہ بات اپنی جگہ پر واضح ہو چکی ہے کہ شقاوت، نقص و عدم کے معنی میں ہے اور سعادت، وجود و کمال کے لحاظ سے ہے اور شجرہ طیبہ وجود سے مراد ذات حق سبحانہ ہے بہ ترتیب سباب و مسببات اور یہ طریقہ "افضل المتاخرین و اکمل المتقدمین نصیر الملۃ والدین" کا ہے یا بہ طریق ظاہریت و مظہریت و وحدت و کثرت جو اعظم الفلاسفہ علی الاطلاق حضرت صدر المتالہین" کا ہے اور جو نقص و عدم ہے وہ شجرہ خبیثہ ماہیت ہے اور جعل نہیں ہے اس لئے کہ یہ جعل سے سو ہے۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حدیث شریف بعض ہی شقاوت وسعادت کو بیان کرنا چاہتی ہے لیکن بطن ام سے مراد مطلق عالم طبیعت ہے جو بچوں کیلئے مطلقاً ماں کا درجہ رکھتی اور ان کی تربیت کا مرکز ہے اور بطن ام سے اس کے عرفی معنی مراد نہیں ہیں، کیونکہ سعادت کمالات وفعلیات میں سے ہے اس لئے یہ نفوس ہیولانی کو بالفعل حاصل نہیں ہوسکتی ہاں! بالقوہ حاصل ہوسکتی ہے اور ظاہر یہ ہے کہ جو بطن ام میں سعید ہے وہ بالفعل سعید ہے پس اس سے خلاف ظاہر کا ارتکاب کرنا پڑے گا اور ہم نے جو ذکر کیا ہے وہ برہان کے مطابق ہے اس لئے حدیث شریف کو اس پر یا ایسی چیز پر حمل کیا جا سکتا ہے جو اس کی طرف پلٹتی ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس بارے میں تفصیل اور اس کے برہان کا بیان اس کتاب کے مقصد سے خارج ہے مگر قلم کبھی سرکشی کر جاتا ہے ورخلاف مقصود جاری ہو جاتا ہے۔

قلوب کی وجہ حصر

بعض علما نے کہا ہے کہ دلوں کے چار قسموں میں انحصار کی علت یہ ہے کہ دل یا تو ایمان سے متصف ہوں گے یا نہیں ہوں گے پہلی صورت میں، یا تو وہ ان تمام باتوں پر ایمان سے متصف ہوں گے جو پیغمبر ؐ لائے ہیں تو یہ قلب مومن کا ہے، یا ان میں سے بعض پر ان کا ایمان ہوگا اور بعض پر نہیں ہوگا، وہ قلب کہ جس میں ایمان ورنفاق ہے، یا تو ظاہرا دل ایمان کا اظہار کرتا ہے جو منافق کا دل ہے یا تو وہ ظاہرا بھی ایمان کا اظہار نہیں کرتا جو مشرک کا دل ہے۔

لیکن یہ تقسیم حدیث شریف سے مطابقت نہیں کرتی، یعنی کبھی تو دل ان تمام باتوں پر ایمان رکھتا ہے جو نبی ؐ لائے ہیں اور کبھی منافق ہے اور اگر کوئی تقسیم پر مجبور ہے تو بہتر اس طرح کہے قلب یا تو تمام جو کچھ رسول ؐ لائے ہیں ان پر ایمان رکھتا ہے یا نہیں، بنابر صورت دوم، اظہار ایمان کرتا ہے یا نہیں کرتا بنابر صورت اول، یا تو اس میں ایمان مستقر ہے یا کبھی ایمان لاتا ہے اور کبھی لوٹ جاتا ہے اور اس حال میں بھی اظہار ایمان کرتا ہے اور اس حدیث کے تناظر میں معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ ایمان سے کفر ونفاق کی طرف پلٹتے ہیں ان کی بھی توبہ قبول ہو جاتی ہے چاہے وہ بار بار پلٹیں۔

اور ایک دوسری حدیث میں جو کافی شریف میں نقل کی گئی ہے، امام محمد باقر ؑ نے دلوں کو تین میں تقسیم کیا ہے ''قلب منکوس جس میں کوئی خیر نہ ہو اور وہ قلب کافر ہے' وہ قلب جس میں کالا نقطہ ہے اور خیر وشر ایک

دوسرے پر غلبہ پانے کیلئے لڑتے رہتے ہیں اور ایک قلب مفتوح (کھلا ہوا دل) ہے جس کے اندر بہت سے چراغ روشن ہیں جو قیامت تک خاموش نہ ہوں گے اور وہ قلب مؤمن ہے" ا۔ اور یہ پہلی والی حدیث شریف کے منافی نہیں ہے، اس لئے کہ اس حدیث کی پہلی قسم، پہلی والی حدیث کی دونوں قسموں سے عام ہے یعنی قلب مشرک و منافق۔ اس لئے کہ ان تینوں گروہ کے قلوب منکوس (الٹے) ہیں اور یہ منافات نہیں رکھتی اس بات سے کہ الٹا ہونا قلب مشرک و کافر کے صفات ظاہرہ میں سے ہے اور مطبوعیت (مہر لگا ہوا ہونا) قلب منافق کے صفات ظاہرہ میں سے ہے اور اسی لئے اس حدیث میں ان میں سے ہر ایک کو ایک صفت سے مخصوص کیا گیا ہے۔

دوسری فصل

حالات قلوب کا بیان

ہم پہلے قلب مؤمن کا ذکر کرتے ہیں تاکہ اسی پر قیاس کرتے ہوئے دوسرے قلوب معلوم ہو جائیں۔

یہ جان لینا چاہئے کہ معارف حقہ اور علوم عالیہ میں بڑی وضاحت کے ساتھ یہ بات معلوم ہے کہ حقیقت وجود، حقیقت نور کی اصل ہے اور یہ دونوں عنوان مختلف اور کثیر جہات کی طرف رجوع کئے بغیر ایک حقیقت بسیط وحدہ کی حکایت کرتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ جو بھی کمال و تمام کے زمرہ میں آتا ہے وہ بھی عین وجود سے متعلق ہے اور یہ ایک ایسا اصول ہے کہ جس کو یہ حاصل ہو جائے اس پر فخر کرے گا اور ابواب معارف اس پر کھل جائیں گے (مگر) ہمارے نفوس ضعیفہ اس ذات کی حقیقت کے ادراک سے در حقیقت عاجز و محروم ہیں۔ البتہ اگر غیبی مدد ہو جائے اور توفیق ازلی شامل حال ہو جائے تو اور بات ہے۔

یہ بھی معلوم ہے کہ ایمان باللہ، علم اور کمالات مطلقہ میں سے ہے۔ پس چونکہ کمالات سے ہے لہذا اصل وجود ہے اور اصل حقیقت نور و ظہور ہے اور جو چیز غیر ایمان اور اس کے متعلقات سے ہے وہ کمالات نفسانیہ انسانیہ سے خارج ہے اور ظلمات عدم و ماہیت سے متعلق ہے۔

قلب مؤمن کے اُزھر ہونے کا بیان

پس معلوم ہو گیا کہ قلب مؤمن ازہر ہے۔ کافی شریف میں امام جعفر صادق سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا "تم بعض لوگوں کو دیکھو گے کہ اچھائے فصاحت کی وجہ سے غلطی نہیں کرتے یہاں تک کہ کسی قسم

کے بام اور دو ولیں بھی منکر ان کا دل شب تاریک سے بھی زیادہ تاریک ہے اور بعض لوگ اپنے دل کی بھی بات اپنی زبان سے نہیں کہہ پاتے حالانکہ ان کا دل چراغ کے مانند روشن ہے"[۱۲] نیز قلب مومن (ہمیشہ) طریق مستقیم پر رہتا ہے اور اس کی حقیقی حرکت راہ مستقیم پر رہتی ہے، کیونکہ وہ اس اصل فطرت الٰہیہ سے خارج نہیں ہوا ہے، جس کو خدا نے اپنے دونوں دست جلال و جمال سے چالیس صبح تک خمیر کیا تھا اور اسی فطرت توحید پر جو کمال مطلق و جمال تام کی طرف توجہ کا مرکز ہے، گامزن ہے یہ معنوی (حقیقی) اور روحانی حرکت، مرتبہ فطرت مخمرہ سے غایت کمال مطلق تک بغیر کسی ٹیڑھے پن کے جاری ہے اور یہی روحانی استقامت ہے جو سیدھا راستہ ہے، باقی تمام قلوب فطرت سے خارج اور طریق مستقیم سے الگ ہیں۔ رسول خداؐ سے روایت ہے کہ آپؐ نے زمین پر ایک سیدھی لکیر کھینچ کر اس کے اطراف میں بہت سے آڑے ترچھے خطوط کھینچے اور فرمایا "یہ بیچ کی سیدھی لکیر میرا راستہ ہے"[۱۳]

مؤمن صراط مستقیم پر ہے

دوسری بات یہ ہے کہ مومن انسان کامل کے تابع ہے اور انسان کامل چونکہ تمام اسما و صفات کا مظہر اور اسم جامع خدا کا تربیت یافتہ ہوتا ہے، لہٰذا اس کے اندر کسی بھی اسم کا غلبہ و تصرف نہیں ہوتا اور وہ خود بھی چونکہ کون جامع کا رب ہے، اس لئے اس کی مظہریت بھی ایسی ہوتی ہے اور زائد بر اسم نہیں ہوتی اور وہ وسط و برزخ کبریٰ کے مقام پر فائز ہے اور اس کی سیر ہمیشہ اسم جامع کے درمیانی سیدھے راستے پر ہے اور دیگر اکوان میں سے ہر ایک پر اسمائے محیطہ یا غیر محیطہ میں سے ایک متصرف ہے اور یہ ان اسم کے مظہر ہیں اور ان سب کی ابتدا و انتہا وہی اسم ہے اور اس کے مقابل کا اسم مخفی ہے اور متصرف نہیں ہے، صرف وجہ احدیت جمع اسما کے اعتبار سے متصرف ہے مگر اس کا بیان یہاں مناسب نہیں ہے، پس (نتیجہ یہ نکلا کہ) حق تعالیٰ مقام اسم جامع اور انسانوں کے پروردگار ہونے کی وجہ سے صراط مستقیم پر ہے۔ چنانچہ خود خدا کا ارشاد ہے ﴿إِنَّ رَبِّي عَلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾[۱۴] "اس میں شک ہی نہیں ہے کہ میرا رب سیدھی راہ پر ہے" یعنی کسی صفت کو کسی صفت پر فوقیت دینے اور کسی اسم کے کسی دوسرے اسم پر ظہور کے بغیر اس کو مقام وسطیت و جامعیت حاصل ہے اور اس ذات مقدس کا مربوب بھی ایک مقام کو دوسرے مقام پر فضیلت اور ایک شان و حال کی دوسرے پر برتری کے بغیر یہاں بھی صراط مستقیم پر فائز ہے۔ چنانچہ حقیقی معراج صعودی اور انتہائے مقام

قرب پر پہنچ کر عرضِ عبودیت کے بعد اور ہر عبادت اور ہر عابد کی عبودیت کو ذات حق کی طرف ارجاع کر کے درحقیقت مقامات قبض و بسط میں اعانت کو ذات خدا میں یہ کہتے ہوئے منحصر کر کے کہ ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ فرماتے ہیں ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ اور یہی صراط ہے جس پر انسان کامل کا رب ہے، وہ ظاہریت و ربوبیت کی بنا پر ہے اور یہ مظہریت و مربوبیت کی بنا پر۔ اس کے علاوہ دوسری مخلوقات اور خدا کی طرف سفر کرنے والوں میں سے کوئی بھی صراط مستقیم پر نہیں ہیں اور ان میں کسی نہ کسی طرف جھکاؤ ہے خواہ لطف و جمال کی طرف ہو یا قہر و جلال کی طرف ہو اور مؤمنین چونکہ انسان کامل کے تابع ہیں اس لئے اپنے سفر میں اسی کے نقش قدم پر چلتے ہیں اور اسی کے مصباح معرفت اور نور ہدایت میں سیر کرتے اور انسان کامل کے سامنے تسلیم ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی طرف سے ایک قدم نہیں اٹھاتے اور خدا کی طرف روحانی سفر کی کیفیت میں اپنی عقل کو دخل نہیں دیتے، اسی لئے ان کا بھی راستہ مستقیم ہے اور ان کا بھی حشر انسان کامل کے ساتھ ہے اور ان کی (منزل) مقصود یا کمال بھی انسان کامل کے تابع ہے، بشرطیکہ اپنے پاک دلوں کو شیاطین کے غلبے اور انیت و انانیت سے محفوظ رکھیں اور اپنے کو مکمل طور پر انسان کامل کے راستے پر چلائیں اور مقام خاتمیت کے تابع ہوں۔

شیطان کی بعض مکاریاں

شیطان کے تصرفات خبیثہ میں سے ایک یہ ہے کہ انسان کو اس کے سیدھے راستے سے ہٹا کر غلط راستے پر لگا دیتا ہے۔ اس کو گستاخ بنا دیتا ہے یا اس میں بزرگی کا احساس ابھر دیتا ہے۔ شیطان جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کرتا رہتا ہے اس کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اپنی چرب زبانی اور دلفریب اداؤں کے ذریعے وہ بعض مشائخ کو بھی کان پکڑ کر کسی دلبر و ہوش ربا کے عشق میں گرفتار کر دیتا ہے اور اس گناہ کیلئے عذر نہیں کرتا، بلکہ اس شرک عرفانی کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ گویا یہ احدی التعلق (صرف ایک سے لگاؤ رکھنا) ہو تو جملہ تعلقات توڑنے کا ذریعہ بن جاتا ہے اور کبھی وہ بے وقوف قسم کے سطحی نظر رکھنے والوں کو ایک عوام فریب دیو سیرت شیخ، بلکہ یوں کہئے (ایمان کی) راہ میں ڈاکہ ڈالنے والے ایک شیطان کی طرف متوجہ کر دیتا ہے اور اس شرک جلی کی توجیہ یوں کرتا ہے کہ شیخ (موصوف) ایک انسان کامل ہے اور انسان (صرف) انسان کامل ہی کے ذریعہ مقام غیب مطلق تک جو کسی طرح ظاہر نہیں ہوتا، پہنچ سکتا ہے، اس طرح

آخر عمر تک وہ (شیخ) اپنی شوخ وچنچل محبوب کے چہرے کی یادوں میں مگن رہتے ہوئے جب کہ دوسرا (شیخ کا مرید) اس کے بد منظر چہرے کا مشتاق بن کر عالم جن وشیاطین سے ملحق ہو جاتا ہے نہ اس (شیخ) کا حیوانی جذبہ سبب ہوتا ہے، ورنہ یہ (مرید) اپنی اندھی تقلید کے ذریعہ مقصد تک پہنچ پاتا ہے۔

لیکن مؤمن کی سیر چونکہ مستقیم ہے اس کا قلب مستوی ہے اس کی توجہ خدا کی طرف، اس کی راہ سیدھی ہے، اس لئے اس عالم میں بھی اس کا راستہ مستقیم وروشن اور اس کی قامت بھی سیدھی ہے اور اس کی صورت وسیرت اور ظاہر وباطن انسانیت کی شکل وصورت پر ہے۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے قلب منحرف کو سمجھتے ہیں چونکہ اس کا قلب فطرت الٰہیہ سے خارج اور کمال کے مرکزی نقطہ سے منحرف اور نور وجمال کے دائرے سے خارج اور ہادی مطلق اور ولی کامل کی اتباع سے الگ اور حیوانیت اور شیطانیت اور دنیوی زیبائش وآرائش میں مشغول ہے، اس لئے دوسرے عوالم میں بھی وہ انسان کی سیرت وصورت مستقیمہ پر محشور نہ ہوگا (بلکہ) کسی الٹے سر والے حیوانی صورت پر محشور ہوگا، کیونکہ اس عالم میں ہیئت وصورت قلوب کے تابع ہیں اور ظاہر باطن کا سایہ ہے اور چھلکا گٹھلی کے تابع ہے اور اس عالم کے مواد اس عالم کی طرح اشکال ملکوتیہ باطنیہ کے قبول سے انکار نہیں کرتے اور یہ چیز اپنی جگہ دلیلوں سے ثابت ہے، اس لئے جو قلوب حق وحقیقت سے منحرف اور فطرت مستقیمہ سے خارج ہیں اور دنیا کی طرف متوجہ ہیں ان کا سایہ بھی انہیں کی طرح استقامت سے خارج اور اسفل دنیا کی طرف رخ کئے رہتا ہے جو اسفل السافلین ہے اور (یہ بھی) ممکن ہے کہ بعض لوگ اپنے سروں کے بل راستہ چلیں اور ان کے پیر اوپر کی طرف ہوں اور بعض پیٹ کے بل راہ طے کریں اور بعض حیوانوں کی طرح ہاتھوں اور پیروں سے چلیں، جیسا کہ اس دنیا میں ان کی چال اسی طرح کی تھی ﴿أفمن يمشي مكباً على وجهه أهدى أمن يمشي سوياً على صراط مستقيم﴾ ۱۵ ہو سکتا ہے یہ مجازجو عالم مجاز میں ہے، عالم حقیقت وظہور روحانیت میں حقیقت حاصل کرے اور حدیث شریف میں اس آیت کے ذیل میں صراط مستقیم سے حضرت علیؑ اور ائمہ معصومینؑ مراد ہیں، چنانچہ تفسیروں میں بتایا گیا ہے

عن الكافي بإسناده عن أبي الحسن الماضي عليه السلام قال: قلت: ﴿أفمن يمشي مكباً على وجهه أهدى أمن يمشي سوياً على صراط مستقيم﴾؟ قال: إن الله ضرب مثلاً من حاد عن ولاية علي عليه السلام كمن يمشي على وجهه لا يهتدي لأمره وجعل من تبعه سوياً على صراط مستقيم، والصراط المستقيم أمير المؤمنين عليه السلام ﴾ ۱۶

"راوی کہتا ہے میں نے عرض کیا ﴿افَمَنْ یَمْشِي مُكِبًّا﴾ سے کیا مراد ہے؟ فرمایا خدا نے اس آیت میں ایک مثال بیان کی ہے کہ جو لوگ حضرت علیؑ کی ولایت کا انکار کرتے ہیں وہ گویا اپنے چہروں کے بل راستے چلتے ہیں اور وہ ہدایت تک نہیں پہنچ پاتے اور جو آپؑ کے پیرو ہیں وہ صراط پر ہیں اور صراط مستقیم، حضرت علیؑ ہیں"۔

ور ایک دوسری حدیث میں بھی صراط مستقیم سے حضرت علیؑ اور ائمہ معصومینؑ ہی کو مراد لیا گیا ہے۔ ۱۷

کافی میں فضیل سے منقول ہے کہ میں نے امام محمد باقرؑ کے ساتھ مسجد الحرام میں داخل ہوا۔ حضرتؑ میرے اوپر تکیہ فرمائے ہوئے تھے اس کے بعد آپؑ نے لوگوں کی طرف دیکھا اور ہم باب بنی شیبہ میں تھے، آپؑ نے فرمایا "اے فضیل! اس طرح طواف دور جاہلیت میں بھی لوگ کرتے تھے کہ نہ وہ لوگ کسی حق کو پہچانتے تھے اور نہ کسی دین کے پابند تھے۔ اے فضیل! لوگوں کو دیکھو یہ اوندھے منہ پڑے ہیں۔ خدا ان پر لعنت کرے کہ یہ الٹی مسخ شدہ مخلوق ہیں۔ اس کے بعد آپؑ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی ﴿افَمَنْ يَمْشِي مُكِبًّا﴾ اور صراط مستقیم کی تفسیر حضرتؑ نے حضرت علیؑ اور آپؑ کی جانشینوں سے فرمائی"۔ ۱۸

ہم نے اس سے پہلے یہ بیان کر دیا ہے کہ انسان کامل کی چال اور اس کا روحانی سفر صراط مستقیم پر ہوتا ہے ۱۹ اب رہی یہ بات کہ خود انسان کامل ہی صراط مستقیم ہے تو یہ فی الحال ہمارے مقصد سے خارج ہے۔

تتمہ:

قلب منافق، اسکے اور مؤمن کے قلب کا فرق

گزشتہ فصل کے بیانات سے مؤمن و مشرک، بلکہ کافر کے قلب کا بھی حال معلوم ہو گیا اور (ان کا) موازنہ کرکے منافق کے قلب کا بھی حال معلوم کیا جا سکتا ہے، کیونکہ مؤمن کا دل تو اپنی سادہ وصاف اور اصلی فطرت سے خارج نہیں ہوتا اور جو بھی ایمانی حقیقت و معارف اس میں ڈال دیئے جاتے ہیں وہ انہیں قبول کر لیتا ہے ور غذا اور کھانے والے کے درمیان تناسب جو معارف وحقائق ور مقام فطرت قلوب ہے، محفوظ رہتا ہے۔ اسی لئے کافی شریف کی ایک دوسری حدیث میں قلب مؤمن کو "مفتوح" فرمایا گیا ہے ۲۰ اور یہ فتح ہو سکتا ہے فتوحات ثلاثہ ۲۱ میں سے کسی ایک کی طرف اشارہ بھی ہو، اگرچہ اس معنی کے اعتبار سے بھی

مناسب ہے۔

لیکن قلب منافق کدورتوں اور تاریکیوں، مثلاً جاہلی تعصب، برے اخلاق، حب نفس وحب جاہ وغیرہ فطرت کی منافی باتوں کی بنا پر سربمہر، بند اور الٹا ہوتا ہے، وہ کسی بھی طرح کلمہ حق کو قبول نہیں کرتا اور اس کا صفحہ دل کالے اور گندے کاغذ کی طرح ہے جس میں کوئی نقش نہیں ابھرتا اور ظاہری دیانت کو اپنی شیطنت کی بنا پر (حصول) دنیا و ترقی کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔

یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ (ویسے) تو منافق و کافر دونوں کے دل الٹے اور مہر شدہ ہیں، جیسا کہ معلوم وواضح ہے لیکن ہر ایک کا ایک سے اختصاص صرف اس لئے ہے کہ مشرک کا دل چونکہ عبادت اور خضوع میں معبود حقیقی کے علاوہ دوسرے کی طرف متوجہ اور غیر کمال مطلق کی طرف مائل ہوتا ہے، اس لئے اس کے قلب میں دو خصوصیات ہوتی ہیں، ایک یہی انکساری اور دوسری چونکہ یہ انکساری نقائص اور مخلوقات کیلئے ہوتی ہے اس لئے اس کے دل میں نقص وکدورت ہوتی اور اس کا دل الٹا ہوتا ہے اور یہ اس کی ظاہری صفت ہوتی ہے۔ لیکن منافق کبھی واقع کے اعتبار سے مشرک ہے اور دل کے الٹے ہونے کی وجہ سے مشرک کے برابر ہوتا ہے اور اس میں دوسری خصوصیت بھی ہوتی ہے اور کبھی واقع کے اعتبار سے وہ کافر ہوتا ہے اور اس کے اندر کوئی دین نہیں ہوتا اور اس کا دل بھی اگرچہ الٹا اور بند ہے لیکن اس کے اندر ایک بہت ہی واضح ترین خصوصیت موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ حق کو بحسب ضرورت کان دھر کے سنتا ہے اور حق کی جماعت میں داخل ہو جاتا ہے اور تمام مطالب حق جو مومنین کے کانوں میں پڑتے ہیں اس کے کان میں بھی پڑتے ہیں لیکن صفائے باطن کی وجہ سے مومن کا قلب مفتوح ہوتا ہے اور ان کو قبول کر لیتا ہے لیکن منافق کا دل تاریکی وکدورت کی وجہ سے الٹا اور سربمہر ہوتا ہے، اس لئے ان باتوں کو قبول نہیں کرتا۔

(حدیث میں) جو مومن کی طرف دو صفتوں کو مخصوص کر کے بیان فرمایا گیا ہے یعنی بلاؤں پر صبر اور عطاؤں پر شکر اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں صفتوں کو تمام صفات مومن میں امتیاز (خصوصیت) حاصل ہے اور اہم صفات جمیلہ میں ان کا شمار ہوتا ہے، کیونکہ ان دونوں سے اور بہت سے صفات جمیلہ نکلتے ہیں، میں نے سابق حدیثوں میں ان میں سے کچھ کو بیان کیا ہے۔ ۳۳

نیز صفات جمیلہ جلال وجمال اور قہر ولطف میں سے دو اوصاف کو (حدیث میں) بیان کیا گیا ہے جو عبارت ہے، عطا وابتلا کی تجلی وظہور سے۔ اگرچہ بلا صفات لطف میں سے ہے لیکن چونکہ ظاہراً قہر ہے اس

سے اسی میں شمار کیا جاتا ہے، جیسا کہ خدا کے سماوصفت کی بحث میں ذکر کیا گیا ہے اور مؤمن انہیں دو تجلیوں کے درمیان (فرائض) عبودیت کو انجام دیتا ہے۔

اختتام:

حق سے غفلت، دل کے الٹے ہونے سے ہوتی ہے

سابقہ بیانات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اگر نفوس مکمل طور پر دنیا اور تعمیر دنیا کی طرف متوجہ ہو جائیں اور حق سے پلٹ جائیں تو چاہے وہ مبدأ و معاد پر عقیدہ رکھتے ہوں پھر بھی وہ الٹے ہیں اور دلوں کے الٹے ہونے کا معیار یہ ہے کہ حق سے غفلت برتی جائے اور دلوں کے الٹے ہونے دنیا و تعمیر دنیا کی طرف مکمل طور پر متوجہ ہو جائیں اور یہ عقیدہ یا ایمان نہیں کہلاتا ہے، جیسا کہ بعض حدیثوں کی شرح میں یہ بات کہی جا چکی ہے ۲۳، یہ ایسا ناچیز و ناقص ایمان ہے جو دلوں کے الٹے ہونے کے منافی نہیں ہے، بلکہ اگر کوئی ایمان بالغیب رکھتا ہو اور حشر و نشر کا عقیدہ رکھتا ہو پھر بھی اس سے خائف نہ ہو اور یہ ایمان اس کو عمل یا ارکان تک نہ پہنچا سکے تو اس کو بجائے مؤمن کے منافقین میں شمار کرنا چاہئے اور ہو سکتا ہے کہ قسم کے صوری (ظاہری) مؤمنین اہل طائف کی طرح جن کی حدیث میں مثال بیان کی گئی ہے، کبھی مؤمن ہوں اور کبھی کافر ہوں اور خدانخواستہ یہ سب مغز ایمان جو ان کے ملک بدن میں کسی بھی طرح کی حکومت نہیں رکھتا زائل ہو جائے اور وہ پکے منافق ہو کر اس دنیا سے اٹھیں اور منافقین کے ساتھ محشور ہو جائیں اور یہ بات بہت اہم ہے، ہم ہمارے کمزور نفوس کو اس کی طرف بہت توجہ دینی چاہئے اور کوشش کرنی چاہئے کہ ایمان کے آثار ظاہر و باطن، خفیہ و علی الاعلان ہر ایک میں جاری ہو جائیں اور جیسے قلب سے ایمان کا دعویٰ ہے، ظاہر میں بھی حکم پہ اسلام کو نافذ کرنا چاہئے تاکہ دل کے اندر ایمان کی جڑیں مضبوط و محکم ہو جائیں اور کسی قسم کی رکاوٹ یا حائل کی وجہ سے اس میں تغیر و تبدل نہ ہو سکے اور اس الٰہی امانت اور طاہر و ملکوتی دل کو جو فطرت الٰہی سے خمیر ہوا تھا، شیطان کے تصرف اور دست خیانت سے بچا کر دست مقدس (خدا) کے حوالے کر دیا جائے۔

والحمد للہ اولاً و آخراً

توضیحات (۳۰)

۱۔ سورہ ملک آیت ۲۲۔

۲۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۴۲۲، کتاب ایمان والکفر، باب فی ظلمۃ قلب المنافق، حدیث ۲۔

۳۔ مطبوعہ [illegible] الطبع [illegible]

۴۔ نہایہ، ج ۲، ص ۳۲۱، ذیل مادہ زہر۔

۵۔ مدجور اس کو کہتے ہیں جس کے بدن میں [illegible] ہے۔

۶۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ علم حاصل [illegible] مقدمات [illegible] (عمل) [illegible] اصل مقصد [illegible]

۷۔ حدیث ۲۶ پہلی فصل کے آخر۔

۸۔ حدیث ۷۔

۹۔ بحار الانوار، ج ۵، ص ۵۳، کتاب العدل والمعاد، باب [illegible] حدیث [illegible]

۱۰۔ حدیث ۵ حاشیہ ۳۲۔

۱۱۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۴۲۳، کتاب ایمان والکفر، باب ظلمۃ قلب المنافق، حدیث ۳

۱۲۔ عن عمرو عن ابی عبد اللہ قال [illegible] تجد الرجل لا یخطی [illegible] ونفسہ اشد ظلمۃ من اللیل المظلم وتجد الرجل لا یستطیع ان یعبر عما فی قلبہ بلسانہ وقلبہ یزہر کما یزہر المصباح۔

اصول کافی، ج ۲، ص ۴۲۲، کتاب ایمان والکفر، باب ظلمۃ قلب المنافق، حدیث [illegible]

۱۳۔ تفسیر قرآن ملا صدرا، ج ۴، ص ۵۲، تفسیر آیت نور، [illegible] قمی، ج ۲، ص ۹۶۔

۱۴۔ سورہ ہود آیت ۵۶۔

۱۵۔ سورہ ملک آیت ۲۲۔

۶۔ کافی ج۱، ص۴۳۲، کتاب الحجۃ، باب فیہ نکت ونتف من التنزیل فی الولایۃ، حدیث ۹۱

۱۷۔ عن حمران قال: «سمعت ابا جعفرٍ یقول فی قول الله تعالیٰ: ﴿وَاَنَّ هٰذا صِراطی مُسْتَقیماً فَاتَّبِعوهُ وَلا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ﴾ قالَ: عَلِیُّ بنُ اَبی طالِبٍ وَالاَئِمَّةُ مِنْ وُلْدِ فاطِمَةَ هُمْ صِراطُ اللهِ فَمَنْ اَباهُمْ سَلَکَ السُّبُلَ».

بحار الانوار، ج۲۴، ص۱۵، کتاب الامامۃ، باب ۲۳، حدیث ۷۔

۱۸۔ عن الفضیل قال: دخلتُ مع ابی جعفرٍ علیه السلام المسجد الحرام وهو مُتَّکِئٌ عَلَیَّ فنظر الی الناس ونحن علی باب بنی شیبة، فقال: «یا فضیلُ هٰکذا کان یطوفونَ فی الجاهلیة لا یعرفون حقًّا ولا یدینون دیناً یا فضیلُ، انظر الیهم، مُکِبّینَ علی وُجُوههم، لعنهم الله من خلقٍ مسخورٍ بهم مُکِبّین علی وُجُوههم ثمّ تلا هذه الآیة: ﴿اَفَمَنْ یَمْشی مُکِبّاً عَلیٰ وَجْهِهِ اَهْدیٰ اَمَّنْ یَمْشی سَوِیّاً عَلیٰ صِراطٍ مُسْتَقیمٍ﴾ یعنی والله علیاً علیه السلام والاوصیاء (علیهم السلام...)».

روضۂ کافی، ج۸، ص۲۸۸، حدیث ۴۳۴۔

۱۹۔ حدیث ۳۰، "قلب مؤمن کے آزاد ہونے..." کے عنوان کے ضمن میں۔

۲۰۔ حدیث ۳۰ عنوان "دعا کو مختصر کرنے کی وجہ" کے ذیل میں۔

۲۱۔ تین قسم کی فتوحات یہ ہیں: فتح قریب، فتح مبین اور فتح مطلق۔

۲۲۔ حدیث ۵، ۱۰ اور ۱۶ کی طرف رجوع کیجیے۔

۲۳۔ حدیث ۹، ۲۰ اور ۲۶ ملاحظہ فرمایئے۔

اکتیسویں حدیث

بالسند المتصل الى الشيخ الجليل افضل المحدثين محمد بن يعقوب الكليني، عن علي بن ابراهيم، عن ابيه، عن حمّاد، عن ربعي، عن زرارة، عن ابي جعفر ؑ قال سمعته يقول:

﴿إنّ الله عزّ وجلّ لا يُوصَفُ وكَيفَ يُوصَفُ؟ وقال في كتابه ﴿وما قَدَرُوا اللهَ حقَّ قَدْرِه﴾[۱] فلا يُوصَفُ بقدرٍ إلّا كان أعظمَ من ذلك

وإنّ النّبيّ ﷺ لا يُوصَفُ وكَيفَ يُوصَفُ؟ عبدٌ احتجب الله عزّ وجلّ بسبعٍ وجعل طاعتهُ في الأرضِ كطاعته في السّماء، فقال ﴿وما آتاكُمُ الرّسُولُ فخُذُوهُ وما نهاكُم عنهُ فانتَهُوا﴾[۲] ومن أطاع هذا فقد أطاعني ومن عصاهُ فقد عصاني، وفوّض اليه

وإنّا لا نُوصَفُ وكَيفَ يُوصَفُ قومٌ رفع اللهُ عنهُمُ الرّجسَ؟ وهو الشّكّ

والمُؤمنُ لا يُوصَفُ، وإنّ المُؤمنَ ليَلقى أخاهُ فيُصافحُهُ فلا يزالُ اللهُ يَنظُرُ إليهما والذُّنوبُ تتحاتُّ عن وُجُوهِهما كما يتحاتُّ الورقُ عن الشّجر﴾[۳]

ترجمہ: جناب زرارہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت امام محمد باقرؑ کو فرماتے ہوئے سنا "خداوند عالم کی صفت نہیں بیان کی جا سکتی اور اس کی صفت، کیونکر بیان ہو سکتی ہے حالانکہ اس نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے "اور ان لوگوں نے خدا کی جیسی قدر کرنی چاہیے ویسی قدر نہ کی" پس خدا کی جو بھی عظمت و توصیف بیان ہوگی خدا اس سے کہیں بڑا ہے۔

(اسی طرح) رسول خداؐ کی بھی توصیف نہیں بیان کی جا سکتی اور بھلا اس بندے (رسولؐ) کی

توصیف کیونکر بیان کی جاسکتی ہے جس کو خدا نے سات پردوں میں چھپا رکھا ہو اور زمین میں اس کی اطاعت ویسی (واجب) قرار دی ہو جیسی آسمان میں اپنی اور جس کیلئے خدا نے فرمایا "رسول" جو بھی تم کو حکم دیں اس پر عمل کرو اور جس سے روک دیں اس سے رک جاؤ" جس نے اس کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے اس کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی اور خدا نے (امور کو) ان کے سپرد کر دیا۔

(نیز) ہماری بھی توصیف نہیں کی جاسکتی اور (ان حضرات کی) توصیف کیونکر کی جاسکتی ہے جن سے خدا نے رجس کو دور کر دیا ہے جو شک سے عبارت ہے۔

مومن کی بھی توصیف نہیں ہوسکتی، کیونکہ جب مومن اپنے برادر مومن سے ملاقات کر کے مصافحہ کرتا ہے تو خدا ان کی طرف نظر کرتا ہے اور (اس وقت) ان کے گناہ اس طرح گرنے لگتے ہیں جیسے (موسم خزاں میں) درخت سے پتے گرتے ہیں"۔

شرح "وما قدروا الله" جوہری نے کہا ہے "قدر" کے معنی اندازے کے ہیں اور "قدر، قدر" کے معنی ایک کے ہیں اور یہ (قدر) دراصل مصدر ہے اور خدا نے کہا ہے ﴿وما قدروا الله حق قدره، أي، ما عظموا الله حق تعظيمه﴾ انتہی (جیسا کہ تعظیم کرنا چاہئے تھا خدا کی تعظیم نہیں کی گئی)۔

مصنف کہتا ہے کہ ظاہر یہ ہے کہ قدر کے معنی وہی اندازے کے ہیں اور یہ کنایہ ہے کہ خدا کی تعظیم و توصیف جیسی ہونی چاہئے ویسی نہیں ہوتی اور توصیف خود ہر وصف میں موصوف کی اندازہ گیری ہے اور یہ غیر خدا کیلئے جائز نہیں ہے، جیسا کہ انشاء اللہ ہم اس کی طرف اشارہ کریں گے۔

"فلا یوصف بقدر" علامہ مجلسیؒ کے نسخے میں "بقدرة" "تا" کے ساتھ آیا ہے اور آپؒ نے اس کو اقرب احتمال قرار دیا ہے اور دیگر صفات میں اس کو مخصوص کرنے کی وجہ ذہنوں سے قریب ہونا قرار دیا ہے اور اس احتمال کو تقویت ملتی ہے کہ نسخہ غلط ہے اور فرمایا گیا ہے، ممکن ہے اس کو "قدر" پڑھا جائے، جیسا کہ دوسری حدیث میں آیا ہے۔ اور کتاب "الوافی" میں "بقدرة" آیا ہے، ہوسکتا ہے "بقدره" ہو جیسا کہ بعض نسخوں میں بھی ہے لیکن "بقدرة" "تا" کے ساتھ اس کے بارے میں گمان کیا جاتا ہے، بلکہ یقین ہے کہ یہ نسخہ غلط ہے، کیونکہ نہ معنی کے اعتبار سے یہ روان ہے اور نہ لفظ کے اعتبار سے حدیث صحیح ہے، کیونکہ اس کی طرف ضمیر مذکر پلٹ رہی ہے ورنہ تاویل خلاف قاعدہ ہے۔

مرحوم علامہ مجلسیؒ نے مجبوری سے یہ توجیہ کی ہے، حالانکہ فی جملہ قدرت حق کے تعقل کا امکان اور

دیگر صفات کے تعقل کا عدم امکان اور اس کے دوسرے صفات کے درمیان فرق کی کوئی وجہ نہیں ہے، اسی لئے مرحوم مجلسیؒ کی نظر میں بھی یہ احتمال معتبر نہیں تھا۔

"تتحات" جوہری نے صحاح میں کہا ہے "تحات" کے معنی ٹہنی سے پتوں کا گرنا ہے اور "تحات الشيء تناثر" اس کے معنی بھی گرنے اور منتشر ہونے کے ہیں۔ حدیث شریف کیلئے جو باتیں مناسب ہیں، ہم ان کو چند فصلوں کے ضمن میں بیان کریں گے۔

پہلی فصل

عدم توصیف حق کا کیا مطلب ہے؟

اس حدیث شریف میں جو آیا ہے کہ خدا کی توصیف نہیں کی جا سکتی اس سے وہ اوصاف مراد ہیں جو اہل جہل وجدل متکلمین وغیرہ نے ان سے خدا کی توصیف کی ہے اور وہ توصیف تحدید و تشبیہ بلکہ تعطیل لازم آتی ہے، جیسا کہ خود اس حدیث میں ﴿وما قدروا الله حق قدره﴾ سے اشارہ کیا گیا ہے اور کتاب کافی شریف میں بہت سی روایات کی دلالت توصیف کی ممانعت پر موجود ہے۔

بإسناده عن عبد الرحيم بن عتيك القصير قال: كتبت على يدي عبد الملك بن أعين إلى أبي عبد الله عليه السلام أن قوماً بالعراق يصفون الله بالصورة وبالتخطيط فإن رأيت جعلني الله فداك أن تكتب إلي بالمذهب الصحيح في التوحيد فكتب إلي:

سألت رحمك الله عن التوحيد وما ذهب إليه من قبلك فتعالى الله الذي ليس كمثله شيء وهو السميع البصير، تعالى عما يصفه الواصفون المشبهون الله بخلقه المفترون على الله.

فاعلم رحمك الله أن المذهب الصحيح في التوحيد ما نزل به القرآن من صفات الله تعالى فانف عن الله البطلان والتشبيه فلا نفي ولا تشبيه هو الله الثابت الموجود تعالى عما يصفه الواصفون، ولا تعدوا القرآن فتضلوا بعد البيان۔ (الحديث)

عبدالرحیم کہتے ہیں کہ میں نے عبد ملک کے ذریعے حضرت امام جعفر صادقؑ کو تحریر کیا "عراق میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو خدا کی توصیف صورت اور تخطیط (یعنی رگ وپے یا خدوخال) سے کرتے ہیں، میں

آپ پر فدا ہوں، اگر آپ مناسب سمجھیں تو توحید کے بارے میں صحیح مذہب تحریر فرمادیں۔ اس کے جواب میں حضرت" نے تحریر فرمایا: خدا تم پر رحمت نازل کرے، تم نے توحید کے بارے میں سوال کیا ہے اور توحید کے بارے میں تم سے پہلے والوں کے نظریئے سے متعلق پوچھا ہے، تو سنو! وہ خدا بہت بڑا ہے، جس کا کوئی مثل نہیں ہے جو (بغیر آنکھ کے) دیکھتا ہے اور (بغیر کان کے) سنتا ہے۔ توصیف کرنے والے جو اس کی مخلوق سے اس کی تشبیہ دیتے ہیں وہ اس سے کہیں عظیم و برتر ہے۔ یہ لوگ تو خدا پر جھوٹ و افترا باندھتے ہیں، لہذا، خدا تم پر رحمت نازل کرے، اس کو سمجھو کہ توحید کے بارے میں صحیح مذہب وہی ہے جس کو قرآن نے صفات الٰہی کے بارے میں بتایا ہے۔ پس خدا سے بطلان (عدم وجود) و تشبیہ کی نفی کرو۔ نفی صفات نہ کرو کہ یہ خود بطلان ہے اور نہ خدا کیلئے ایسی صفت ثابت کرو جو مخلوق سے مشابہ ہیں، کیونکہ یہی تشبیہ ہے۔ وہی اللہ ہے جو ثابت اور موجود ہے۔ توصیف کرنے والوں نے جو اوصاف بیان کئے ہیں، خدا ان سے کہیں برتر ہے۔ قرآن سے تجاوز نہ کرو ورنہ بیان و تعلیم الٰہی کے بعد ضلالت و گمراہی میں پڑ جاؤ گے"۔

اس حدیث شریف میں غور و خوض اور اس کے صدر و ذیل میں صحیح غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ توصیف حق کی نفی سے مقصد، صفات میں غور و فکر نہ کرنا اور مطلقاً خدا کی توصیف نہ کرنا نہیں ہے جیسا کہ بعض گرانقدر محدثین نے فرمایا ہے، کیونکہ اس حدیث میں تعطیل و تشبیہ کی نفی کا حکم دیا گیا ہے جیسا کہ بعض دیگر روایات میں بھی آیا ہے اور یہ چیز صفات میں تفکر اور ان کا مکمل علم حاصل کئے بغیر حاصل ہی نہیں ہو سکتی، بلکہ امام" کا مقصد یہ ہے کہ جو چیز ذات خدا کے لائق نہ ہو اس سے (خدا کی) توصیف نہ کریں، جیسے شکل وصورت، اور خد، خال وغیرہ جو مخلوق کے صفات ہیں، کیونکہ یہ چیزیں امکان و نقص کے لوازمات میں سے ہیں اور خدا ان سے بری و منزہ ہے۔

لیکن خدا کی توصیف ان چیزوں سے کرنا جو اس کی ذات کے لائق و مناسب ہیں، اور علوم عالیہ میں ان کا صحیح برہان و میزان ہے، تو یہ بات ایسی ہے جس سے قرآن و سنت رسول" اور احادیث اہل بیت" بھری پڑی ہیں (بلکہ) خود حضرت" نے بھی اجمالی طریقے سے اس حدیث میں اس کے برہانی میزان صحیح کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ ویسے اس کے بارے میں اس وقت بحث کرنا ہمارے مقصد سے خارج ہے۔

حضرت صادق" نے جو یہ فرمایا ہے "توصیف حق میں کتاب خدا سے خارج نہ ہو" یہ ان لوگوں کیلئے ایک دستور و قاعدہ ہے جو صفات کے میزان کو نہیں جانتے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ جو صفت خدا، قرآن میں

ہیں ان کے علاوہ دوسرے صفت سے اس کی توصیف جائز ہی نہیں ہے، اسی لئے خود حضرتؑ نے اپنے مقابل کو قاعدہ بتانے کے باوجود بھی خدا کی توصیف دو ایسی صفت اور اسماء سے کی ہے جو بادی النظر میں قرآن میں نہیں ہیں اور وہ لفظ ''ثابت'' اور لفظ ''موجود'' ہے۔

ہاں! اگر کوئی ایسی ناقص عقل کے ساتھ جو وہم سے ملی ہو اور نور معرفت وتائید غیبی الٰہی سے منور نہ ہو خدا کی کسی صفت سے وصف بیان کرنا چاہے تو وہ مجبوراً یا ضلالت تعطیل، بطلان میں واقع ہوگا یا ہلاکت تشبیہ میں مبتلا ہوگا۔ لہذا ہم جیسے اشخاص کیلئے کہ جن کے دلوں پر غلیظ جہالت وخود پسندی کی عادتوں اور برے اخلاق کے پردے پڑے ہوئے ہیں، ضروری ہے کہ عالم غیب کی طرف دست تصرف دراز نہ کریں اور اپنی طرف سے خدا ایجاد کریں، کیونکہ اپنے خیال سے جو کچھ ہم کریں گے وہ ہمارے نفوس کی مخلوق ہوگی (خدا نہ ہوگا)

یہ بات بھی مخفی نہ رہ جائے کہ ہم نے جو کہا ہے، ایسے اشخاص عالم غیب کی طرف ہاتھ نہ بڑھائیں، اس سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ لوگ جہالت وخود پرستی پر باقی رہیں یا نعوذ باللہ، میں ان کو الحاد یا اسماء اللہ کی دعوت دینا چاہتا ہوں ﴿وذروا الذين يلحدون في اسمائه﴾ ۹ یا (ان) معارف سے جو چشم وچراغ اولیائے خدا اور انبیاء واساس دین ودیانت ہیں روک رہا ہوں، بلکہ ان دبیز پردوں کو دور کرنے کی یہ دعوت ہے اور اس کی تنبیہ ہے کہ انسان جب تک حب جاہ ومال ودنیا ونفس اور اپنی ذات کی طرف، مصنف کی طرح جہالت وضلالت وخود بینی وخود پسندی میں مبتلا رہے گا (جو تمام ظلمانی حجابوں میں سب سے زیادہ موٹے ہیں) معارف حقہ کے حصول اور مقصود اصلی تک پہنچنے سے محروم رہے گا اور اگر خدا نخواستہ خدا کی طرف سے غیبی دستگیری یا اس کے اولیائے کامل کی مدد شامل حال نہ ہو تو معلوم نہیں اس کا انجام کیا ہوگا اور اس کی انتہائے سفر اور غایت سیر کیا ہو۔

﴿لنفسهم اليك الشكوى وانت المستعان﴾ ۱۰ ہم دیدہ جہالت سرگشتہ صحرائے ضلالت کے متحیر وپریشان، انانیت وخود پرستی میں سرگرم ہیں، ہم اس ظلمت کدہ ملک وطبیعت میں آئے اور چشم بصیرت نہ کھولی اور تیرے جمال زیبا کو ہم نے چھوٹے بڑے آئینوں میں نہ دیکھا ورنہ ہی تیرے نور ظہور کو آسمانوں اور زمینوں کے اطراف میں چمگادڑ صفت بن کر مشاہدہ کیا اور زمانے میں اور اندھی آنکھوں دل مجبور کے ساتھ زندگی بسر کی اور غفلت ونادانی کی صورت میں پوری عمر صرف کردی۔ خدایا اگر تیرا لطف بے پایاں اور

غیر متناہی رحمت ہماری مدد نہ کرتی اور دل کے اندر سوز و گداز اور قلب میں (محبت کی) چنگاری پیدا نہ ہوتی اور روحانی جذبہ عطا نہ کرتی تو ہم ابد تک اسی حیرانی میں رہتے اور کسی مقام پر نہ پہنچ سکتے۔ لیکن ﴿ما ھکذا الظن بک﴾! تیری نعمتیں تو بے مانگے ملی ہیں اور تیری رحمتیں بے انتہا ہیں۔ پروردگارا! ہم پر کرم فرما، ہماری مدد کر، اپنے جلال و جمال کے انوار کی طرف ہماری ہدایت کر، ہمارے قلوب کو اپنے اسما و صفات کے نور سے منور و روشن فرما۔

اسما و صفات کی حقیقت کا علم ناممکن ہے

یہ بات واضح ہو جانی چاہئے کہ خدا کے اوصاف کی حقیقت کا ادراک اور ان اوصاف کا احاطہ اور ان کی کیفیت کا علم ایک ایسی چیز ہے جس کی بلندی تک دست برہان کی رسائی ناممکن اور جس کے مغز تک عارفوں کی پہنچ غیر ممکن ہے۔ برہانی نقطۂ نظر سے اور حکمت رسمی کے علما کے نظریۂ تفکر سے یا اسما و صفت کے مباحث میں ارباب اصطلاحات عرفانی نے جو کچھ ذکر کیا ہے وہ سب ان کے مسلک کے اعتبار سے صحیح اور برہانی ہے لیکن خود علم ایک دبیز قسم کا حجاب ہے جب تک تقوائے کامل اور شدید ریاضت و انقطاع تام اور خدا کی بارگاہ میں سچی مناجات کے ساتھ توفیقات الٰہی کے ذریعہ اس پردے کو چاک نہ کیا جائے، سالک کے قلب میں جلال و جمال کی تجلیات طلوع نہ ہوں گی اور قلب مہ جرائی اللہ مشاہدۂ غیبیہ اور تجلیات اسمائی و صفاتی کے حضور عیانی پر فائز نہیں ہو سکتا، تجلیات ذاتی کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان طلب و بحث سے جو خود تذکر حق ہے باز رہے، کیونکہ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ علوم حقہ کا بیج بوئے بغیر اس کے متعین شرائط کے ساتھ معرفت کا شجرۂ طیبہ قلب میں اگا ہو یا پھر ثمر آور ہو۔ اس لئے شروع میں انسان کو چاہئے کہ تمام شرائط اور تمہیدات کے ساتھ علمی ریاضتوں سے دست کش نہ ہو، کیونکہ کہا گیا ہے: ﴿العُلُومُ بذرُ المُشاهدات﴾ ؎ "علوم مشاہدات کے بیج ہوا کرتے ہیں" اور اگر بعض موانع کی وجہ سے علوم اس عالم میں انسان کو بھرپور نتیجہ نہ دے سکیں تو دوسرے عوالم میں دل پسند نتائج دیں گے، مگر سب سے عمدہ اور اچھی چیز تمہیدات و شرائط کا بجا لانا ہے۔ بعض سابق حدیثوں کی شرح میں، میں نے بعض شرائط کو بیان کر دیا ہے۔

دوسری فصل

انبیاءؑ و اولیاء کی روحانی حقیقت کا علم، قدامت فکر سے حاصل نہیں ہوتا

انبیائے کرام و ائمہ معصومین (علیہم السلام) خصوصاً حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقام کمال اور ان کے روحانیت کی معرفت غور و فکر اور سیر انفس و آفاق سے ممکن نہیں ہے، کیونکہ یہ حضرات انوارِ غیبیہ الٰہیہ ہیں اور خدا کے جلال و جمال کی روشن نشانیاں اور مظاہر تامہ ہیں اور سیر معنوی و معراج مقدسہ کے سلسلے میں فنائے ذاتی کی غایۃ القصوی اور قاب قوسین اَو اَدنیٰ کے انتہائے عروج پر فائز ہیں، اگرچہ صاحب مقام بالذات خاتم المرسلین ہیں اور دیگر حضرات اس ذاتِ مقدس کے عروج میں تابع ہیں۔

میں اس وقت حضور سرور کائنات کی کیفیت سیر اور آنحضرت کے معراج روحانی اور دوسرے انبیاء و اولیائے کرام کے معراج کو بیان کرنے کے درپے نہیں ہوں، صرف ایک حدیث کے بیان پر اکتفا کرتا ہوں جو ان حضرات کی نورانیت کے سلسلے میں نقل ہوئی ہے، کیونکہ ان کی نورانیت کا ادراک بھی باطنی نورانیت اور جذبۂ الٰہی کا متقاضی ہے۔

الكافي بإسناده عن جابر، عن أبي جعفر عليه السلام قال: سألته عن علم العالم فقال لي: يا جابر إنّ في الأنبياء والأوصياء خمسة أرواح: روح القُدُس وروح الإيمان وروح الحياة وروح القوّة وروح الشّهوة، فبروح القُدُس يا جابر عرفوا ما تحت العرش إلى ما تحت الثّرى. ثمّ قال: يا جابر إنّ هذه الأربعة أرواح يصيبها الحدثان إلّا روح القدس فإنّها لا تلهو ولا تلعب ﴿۱۳﴾

"جابرؓ کہتے ہیں کہ میں نے امام محمد باقرؑ سے عالم کے علم کے بارے میں پوچھا تو حضرتؑ نے فرمایا اے جابر! انبیاءؑ اور اوصیاء میں پانچ روحیں ہوتی ہیں روح القدس، روح الایمان، روح الحیاۃ، روح القوۃ، روح الشہوۃ۔ اے جابر! روح القدس کے ذریعہ عرش سے لے کر زیر فرش تک کے سارے امور و مطالب کو (یہ حضراتؑ) جانتے ہیں۔ پھر فرمایا اے جابر ان چاروں روحوں کو آفت (و مصیبت) لاحق ہوتی ہے مگر روح القدس لہو و لعب میں کبھی مبتلا نہیں ہوتی"۔

وبسنده عن ابي بصير قال: سألت ابا عبد الله عليه السلام عن قول الله تبارك وتعالى ﴿وكذلك أوحينا إليك روحاً من أمرنا ما كنت تدري ما الكتاب ولا الإيمان﴾[۱۴] قال: ﴿خلق من خلق الله تبارك وتعالى أعظم من جبرئيل وميكائيل كان مع رسول الله صلى الله عليه وآله يخبره ويسدده، وهو مع الأئمة من بعده، صلوات الله عليهم﴾[۱۵]

"ابوبصیرؓ" کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادقؑ سے اس آیت "﴿وکذلک﴾ اسی طرح ہم نے روح کو اپنے حکم سے تمہاری طرف بھیجا (جبکہ) تم نہیں جانتے تھے کتاب و ایمان کیا ہے" کے بارے میں پوچھا کہ اس کا کیا مقصد ہے؟ تو آپؑ نے فرمایا: روح، خدا کی مخلوقات میں ایسی مخلوق ہے جو جبرئیلؑ و میکائیلؑ سے بھی بڑی ہے اور یہ رسول خداؐ کے ساتھ رہا کرتی تھی، ان کو خبر دیا کرتی تھی، رسولؐ کے بعد وہ ائمہؑ کے ساتھ رہتی ہے"۔

پہلی حدیث سے معلوم ہوا کہ انبیاءؑ و اوصیاؑ کی روحانیت بہت ہی بلند ہے جس کی تعبیر "روح القدس" سے کی گئی ہے اور اسی مقام کی وجہ سے وہ حضراتؑ تمام ذرات کائنات پر احاطہ علمی قیومی رکھتے ہیں اور اس روح کے اندر غفلت، نیند، سہو و نسیان و دیگر حوادث امکانیہ تجددات و نقائص ملکیہ کا امکان نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق عالم غیب مجرد اور جبروت اعظم سے ہے۔

اور دوسری حدیث سے معلوم ہوا کہ وہ روح مجرد کامل، جبرئیلؑ و میکائیلؑ سے بھی عظیم ہے جو مقام قرب جبروت کے رہنے والوں میں سب سے زیادہ عظیم ہیں۔ البتہ وہ خاصان خدا جن کی طینت کی تخمیر خود دست قدرت جمال و جلال نے کی ہو اور ان کے کامل آئینوں میں تمام اسماء و صفات و مقام احدیث کی تجلی ذاتی کا ظہور ہوا ہو اور ان کو خلوت گاہ غیب ہویت میں اسماء و صفات کے حقائق کی تعلیم دی گئی ہو، ان کے دامن کبریائے جلال و جمال تک اہل معرفت کے دست امیدی رسائی اور اصحاب قلوب کے پائے معرفت کا ان کے اوج کمال تک پہنچنا غیر ممکن الحصول ہے۔ (چنانچہ) حدیث نبویؐ میں ہے ﴿عليٌّ ممسوسٌ في ذات الله تعالى﴾[۱۶] راقم نے مقام نبوت و ولایت کے بارے میں بہت مختصر سا تعارف اپنی کتاب "مصباح الہدایۃ" میں اسی طرح کرایا ہے جس طرح چمگادڑ آفتاب عالمتاب کا تعارف کرانا چاہتا ہے۔

تیسری فصل

حدیث شریف کے اس فقرے میں ﴿كيف يوصف عبدٌ احتجب الله عزّ و جلّ بسبع﴾ ''اس بندے کی توصیف کیونکر ممکن ہو سکتی ہے جس کو خدا نے سات حجابوں میں چھپا رکھا ہے'' علمائے کئی احتمالات بیان کئے ہیں، میں بعض کا تذکرہ کرتا ہوں

پہلا احتمال محدث عارف کامل مرحوم فیض کاشانیؒ نے بیان کیا ہے کہ خداوند عالم کے نور و ظلمت کے ستر ہزار حجاب حدیث میں وارد ہوئے ہیں۔ اگر ان کو ہٹا دیا جائے تو جہاں تک نگاہ دیکھ سکتی ہے ان سب کو انوار جمال الٰہی خاکستر کر دیتے۔ بنابریں، احتمال ہے کہ ﴿احتجب الله بسبع﴾ کا مطلب یہ ہو کہ سارے حجابات ہٹا دیئے گئے، صرف سات حجاب باقی ہیں ۱۸! اس صورت میں تقدیر عبارت اس طرح ہوگی ﴿احتجب الله عنهُ بسبع﴾ اور لفظ جلالہ ﴿الله﴾ فاعل واقع ہوگا۔

اور شاید تمام احتمالات میں یہ احتمال سب سے زیادہ مناسب ہو لیکن اس میں ''لفظاً و معنیً'' مناقشہ ہے۔ لفظی مناقشہ تو یہ ہے کہ تعریف و توصیف کے مقام پر مناسب یہ تھا کہ اس طرح تعبیر کی جاتی ﴿ما احتجب عن الله الا بسبع﴾ دوسرے لفظوں میں اس کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ کمال پیغمبرؐ اور ان کی توصیف نہ کر سکنا ان حجابوں کے نہ ہونے کی وجہ سے ہے نہ یہ کہ سات حجابوں کی وجہ سے توصیف نہیں ہو سکتی۔ پس مناسب تھا کہ اس کو (عدم حجاب) ذکر فرماتے۔

اور معنوی مناقشہ یہ ہے کہ بظاہر یہ حجابات جو خدا کیلئے نور و ظلمت کے ہیں یہ خلقی حجاب ہیں اسمائی وصفاتی حجاب نہیں ہیں۔ پس اس کا لازمہ یہ ہوگا کہ نور رسول پاکؐ سے اقرب کوئی اور خلق ہو، حالانکہ مسلّم ہے کہ آنحضرتؐ کی ذات مبارک اول مخلوق اور حجاب اقرب ہے، بلکہ آنحضرتؐ کیلئے تو کوئی اسمائی یا صفاتی حجاب بھی نہیں ہے، جیسا کہ اپنی جگہ پر ثابت ہے۔ اسی طرح مقامات اور حضورؐ کے الطاف سے بھی خود آپؐ کیلئے حجاب نہیں ہیں۔

دوسرا احتمال جس کو علامہ مجلسیؒ نے معقول سمجھا ہے اور اس کو بعض دیگر سے بھی نقل فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ یہ جملہ ﴿كيف يوصف عبدٌ﴾ بطور مقدمہ ذکر کیا گیا ہے اور مقصد یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی توصیف ۱۹! بعد والے جملوں سے کی جائے یعنی، اس بندے کی توصیف کیونکر ممکن ہے؟ جس کو خدا نے

بندوں سے سات پردوں کے پیچھے چھپا رکھا ہو اور جس کی اطاعت کو زمین میں اپنی اطاعت کی طرح آسمان میں قرار دیا ہو جیسے کوئی بادشاہ اپنے رعایا سے سات حجابوں کے بعد بیٹھتا ہو اور رعایا کیلئے اس تک پہنچنا ممکن نہ ہو مگر یہ کہ وہ بادشاہ اپنے ایک وزیر کو رعایا کیلئے واسطہ قرار دیدے اور اس کو رعایا کی طرف بھیج دے اور ان کو لکھدے کہ اس وزیر کا حکم میرا حکم ہے اور سات حجاب سے مراد ساتوں آسمان ہیں کہ ان کے پیچھے سے خدا کی وحی، رسول کے واسطے سے ہم تک پہنچا کرتی ہے۔[۲۰]

ایک اور احتمال اسی کے قریب دیا گیا ہے مگر اس میں سات حجاب سے مراد حجب نوریہ اساسیہ لی گئی ہے اس احتمال میں اگرچہ مناقشہ معنوی تو نہیں ہے لیکن بحسب لفظ و مقام یہ توصیف بھی بعید ہے، بلکہ سابق سے زیادہ بعید ہے۔

اس جگہ ایک اور احتمال بھی ہے جو معنی کے اعتبار سے صحیح و دلچسپ ہے اور بحسب مقام بھی مناسب ہے مگر اس احتمال کی صحت دو باتوں میں سے کسی ایک پر مبنی ہے اور وہ دونوں یہ ہیں

الف۔ احتجب متعدی ہو اور ''حجب'' کے معنی میں استعمال ہوا ہو۔

ب۔ یا اس کا ''باء'' سے متعدی کرنا جائز ہو اور دونوں صورتوں میں مفعول مقدر ہو۔ اب اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک بات صحیح مان لی جائے تو وہ احتمال یہ ہے، اس بندے کی توصیف کیونکر ممکن ہے جس کو خدا نے سات حجابوں میں چھپائے رکھا ہو اور اس کے جمال و روحانیت کیلئے جو مشیت کے ہم افق ہے، مرتبۂ طبیعت سے مشیت مطلقہ کے مرتبے تک سات حجب قرار دیئے گئے ہوں یا خود آنحضرت کا مرتبہ ملک طبیعت سے مقام غیب ہویت تک (سات حجاب قرار دیئے گئے ہوں) لیکن (مشکل یہ ہے کہ) لغت اور استعمالات میں احتجب کے متعدی ہونے پر مجھے کوئی شاہد نہیں ملا، اگرچہ بعض علمائے ادب نے فرمایا ہے کہ ''باء'' سے متعدی کرنے میں کوئی مانع نہیں ہے۔ ﴿والعلم عند اللہ، ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا﴾[۲۱]

چوتھی فصل

رسول خدا کو ''تفویض امر'' کا مطلب

جیسا کہ اس حدیث اور دیگر احادیث میں بھی اس پر دلالت موجود ہے۔

اس بات کو سمجھو کہ تفویض کا ایک مطلب تو وہ ہے جو جبر و تفویض کی بحث میں بیان کیا جاتا ہے اور وہ یہ

ہے کہ خدا عالم غیب و مجرد کی انتہائے تخلیق سے عالم خلق و تکوین کی منتہی الیہ تک کسی بھی امر کو نعوذ باللہ اپنے تصرف قیومی سے معزول کر کے اس امر کو کسی بھی مخلوق کے حوالے کر سکتا ہے خواہ وہ کامل و تام و روحانی اور صاحب ارادہ و اختیار ہو یا ایک قدرتی اور شعور و ارادے سے عاری مخلوق، اس طرح کہ وہ مخلوق اس امر میں مستقل تصرف تام رکھے اور اس معنی کے اعتبار سے نہ تو امور تشریعی میں تفویض ممکن ہے اور نہ ہی امور تکوینی میں اور نہ سیاست عباد اور نہ تادیب عباد میں کسی کیسے ممکن ہے اور یہ تفویض واجب میں مستلزم نقص و امکان ہے اور ممکن میں باعث نفی احتیاج و امکان ہے۔

اس تفویض کے مقابلے میں "جبر" ہے، جس کا مطلب تمام مراتب وجود سے آثار خاصہ کا سلب کرنا، یک دم سے اسباب و مسببات کی نفی کرنا اور وسائط کا ساقط کر دینا ہے اور یہ جبر بھی مطلقاً باطل اور برہان قوی کے مخالف ہے اور یہ بھی افعال مکلفین سے مخصوص نہیں ہے جیسا کہ مشہور ہے، بلکہ اس معنی سے جبر و تفویض کی نفی خدا کی وہ سنت ہے جو تمام مراتب وجود اور مشاہد غیب و شہود میں جاری ہے۔ لیکن اس کی تحقیق اس کتاب کے دائرے سے خارج ہے اور جو روایات جبر و تفویض کی نفی کرتی ہیں وہ تفویض کے اسی معنی پر محمول ہیں۔

اور جو روایات تفویض کو ثابت کرتی ہیں خواہ بعض احکام کی تشریع ہو، جیسے کافی کی وہ روایت جس میں امام محمد باقرؑ نے فرمایا ہے "رسول خداؐ نے آنکھ اور نفس کی دیت معین فرمائی اور نبیذ (جو کی شراب) اور ہر نشہ آور شے کو حرام قرار دیا ہے۔ ایک شخص نے پوچھا کیا کوئی چیز (یعنی وحی) آئے بغیر خود سے حرام کی ہے؟ فرمایا ہاں تاکہ معلوم ہو جائے کہ کون رسول خداؐ کی طاعت کرتا ہے اور کون معصیت کرتا ہے"[۲۲] یا جیسے نمازوں میں چند رکعتوں کا اضافہ کرنا[۲۳] اور ماہ شعبان کے روزوں کا مستحب کرنا یا ہر ماہ کے تین دن کے روزوں کا مستحب کرنا[۲۴] یا مخلوق کے مطلق امور کی تشریع جیسا کہ دیگر روایات میں ہے، مثلاً کافی کی روایت باسنادہ عن زُرارۃ قال سمعتُ ابا جعفرٍؑ و ابا عبد اللہؑ یقولان ﴿انّ اللہ عزّ وجلّ فوّض الی نبیّہ امرَ خلقہ لینظرَ کیف طاعتُہم ثمّ تلا ھذہ الآیۃ ﴿ما آتاکُم الرّسولُ فخذوہُ وما نہاکُم عنہُ فانتہوا﴾﴾[۲۵] "زرارہ کہتے ہیں، میں نے امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کو فرماتے ہوئے سنا خدا نے اپنے نبی کے سپرد اپنی مخلوق کے امور کر دیے تاکہ ان کی اطاعت کو دیکھے پھر اس آیت کی تلاوت فرمائی جس کا رسولؐ حکم دیں اس کو بجا لاؤ اور جس سے روک دیں اس سے باز آجاؤ"

اور دیگر روایات جو اسی مضمون کے قریب ہیں وہ دوسرے معنی پر محمول ہیں۔

علمائے اعلام نے (اس سلسلے میں) چند وجوہ اور چند محامل کا ذکر فرمایا ہے (ان میں سے) ایک وجہ یہ ہے جس کو محدث خبیر مجلسی ؒ نے ثقۃ الاسلام کلینی ؒ اور اکثر محدثین سے نقل فرمایا ہے اور خود نے بھی اس کو اپنا مختار قرار دیا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ خداوند عالم نے رسول اکرم ؐ کو اس طرح مکمل کرنے کے بعد کہ آنحضرت ؐ کسی ایسی چیز کو اختیار نہ کریں جو حق وصواب کے موافق نہ ہو اور (اسی طرح) آنحضرت ؐ کے دل میں کوئی ایسی چیز خطور نہ کرے جو مرضی خدا کے مخالف ہو، بعض امور کی تعیین تفویض فرمائی۔ مثلاً واجب نمازوں کی رکعتوں میں اضافہ کرنا، نماز وروزہ میں نوافل کا معین کرنا وغیرہ اور یہ تفویض بارگاہ قدس الٰہی میں حضور ؐ کی کرامت وشرف کے اظہار کیلئے ہے، ورنہ آنحضرت ؐ کی اصل تعیین اور ان کا اختیار وحی والہام کے علاوہ کسی اور طریقے سے نہیں ہے، پھر جب آنحضرت ؐ کسی چیز کو اختیار کر لیتے ہیں تو وحی کے ذریعے[۲۶] اس کی تاکید ہو جاتی ہے۔ علامہ مجلسی ؒ نے اسی وجہ کے قریب قریب کچھ دوسری وجوہ بھی شمار کی ہیں۔ (مثلاً) مرسیاست وتعلیم وتادیب مخلوق آنحضرت ؐ کو تفویض کی گئی یا بیان احکام اور اس کا اظہار بھی حضور اکرم ؐ کو تفویض کیا گیا یا مصالح اوقات کے پیش نظر اس کا عدم اظہار، مثلاً تقیہ کا وقت، رسول ؐ اور ائمہ ؑ کیلئے تفویض کیا گیا ہے[۲۷] لیکن ان بزرگوں نے جو وجوہ واسباب بیان کئے ہیں ان میں سے کسی میں بھی بطور ضابطہ یہ ہانیہ تفویض امر کی ایسی کیفیت نہیں بیان کی گئی ہے جو اصول حق سے منافات نہ رکھتی ہو۔

اسی طرح تفویض جائز اور تفویض محال میں کوئی فرق نہیں بیان کیا گیا ہے، بلکہ علما کے کلمات سے خصوصاً مجلسی ؒ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایجاد وتخلیق اور موت وحیات اور رزق واحیا کے مطلق امر خدا کے علاوہ کسی اور کے ہاتھوں انجام پائے تو یہ تفویض ہے اور اس کا قائل کافر ہے اور کوئی بھی صاحب عقل اس کے کفر میں شک نہ کرے گا اور (ان حضرات علما نے) کرامات ومعجزات کو مطلقاً از قبیل استجابت دعا قرار دیتے ہوئے ان امور کا فاعل خدا کو قرار دیا ہے، البتہ تفویض تعلیم وتربیت خلق، انفال وخمس کا دینا یا نہ دینا اور بعض احکام کا بتانا، اس کو صحیح اور جائز قرار دیا ہے، لیکن یہ بحث ان مباحث میں سے ہے جس کے سلسلہ میں تنقیح کم ہوئی ہے چہ جائیکہ کسی میزان صحیح کے تحت بحث کی گئی ہو۔ شاید مطلب کے ایک گوشہ کو لے کر اس سے بحث کی گئی ہے۔ مصنف اپنے دست کوتاہ اور قلت استعداد واطلاع وکاغذ پارہ وشکستہ قلم کے ساتھ اس وادی حیرت انگیز میں ورود کے مقدمات قدم نہیں رکھ سکتا، لیکن ایک اجمالی اشارہ بطور نتیجہ بیان کرنے پر مجبور ہوں اور

اظہارِ حق کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔

تفویض کے معنی کی طرف اشارہ

یہ جان لینا چاہئے کہ تفویض باطل (کا مطلب) یہ ہے کہ خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے اور بندے کے ارادے کو مستقل اور اس کی تاثیر قدرت کو تسلیم کریں اور اس سلسلہ میں چھوٹے اور بڑے امور میں کسی فرق کے قائل نہ ہوں اس لئے زندہ کرنا، موت عطا کرنا، پیدا کرنا، کسی شئے کو معدوم کر دینا، ایک عنصر کو دوسرے عنصر میں بدل دینا، یہ (سب چیزیں) تفویض نہیں ہے اور تنکے، پتے کو حرکت دینا بھی تفویض نہیں ہے چاہے ملک مقرب یا نبی مرسل کیلئے ہی ہو، عقول مجردہ اور ملکین جبروت عالی سے لے کر ہیولیٰ تک اسی طرح ہے۔

کائنات کا ہر ذرہ خدا کے ارادۂ کاملہ کا تابع فرمان ہے۔ کسی بھی امر میں وہ کسی طرح کا اختیار نہیں رکھتا اور سب کے سب اپنے وجود اور کمال وجود میں، حرکات و سکنات میں ارادہ و قدرت (بلکہ) تمام شعبوں میں محتاج و فقیر، بلکہ فقر محض اور محض فقر ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ خدا کی قیومیت اور بندوں کے حقیقی نور ارادۂ الٰہی کے ظہور و نفوذ اور امور عظیمہ و صغیرہ کے درمیان جاری ہونے میں کوئی فرق نہیں ہے چنانچہ ہم جیسے ضعیف و ناتواں خدا کے بندے جس طرح چھوٹے موٹے کاموں پر قادر ہیں، مثلاً حرکت و سکون و دیگر افعال، اسی طرح اس کے خاص بندے اور ملائکہ مجردہ بڑے بڑے افعال پر قادر ہیں، جیسے زندگی عطا کرنا، موت اور رزق دینا، پیچیدہ تخلیق، اور فنا و عدم میں مبتلا کر دینا استجابت دعا کی طرح نہیں ہے اور حضرت اسرافیل کا زندگی پر موکل ہونا، استجابت دعوت کی مانند نہیں ہے اور تفویض باطل بھی نہیں ہے، اسی طرح اگر کوئی ولی کامل اور طاقتور پاکیزہ نفس والا جیسے نبیؑ ہو اور وہ موت و حیات اور تخلیق و فنا پر خدائی دی ہوئی قدرت کی بنا پر قادر ہوں تو یہ تفویض محال نہیں ہے اور نہ اس کو باطل شمار کرنا چاہئے۔ (اسی طرح) بندوں کے امور کو کسی ایسی کامل روحانیت کے سپرد کر دینا جس کی مشیت خدا کی مشیت میں فنا ہو، جس کا ارادہ، ارادۂ الٰہی کا سایہ ہو، جس کا ارادہ عین ارادۂ خدا ہو، جس کی ہر حرکت نظام صحیح کے مطابق ہو خواہ وہ تخلیق و پیچیدہ سے متعلق ہو خواہ تشریع و تربیت سے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، بلکہ حق ہے اور یہ درحقیقت تفویض بھی نہیں ہے جیسا کہ اس مطلب کی طرف اشارہ "ابن سنان" کی حدیث میں ہے جو اس کے بعد والی فصل میں

ذکر کی جائے گی۔

خلاصہ یہ ہوا کہ پہلے معنی کے اعتبار سے تفویض کسی امر میں جائز نہیں ہے اور مضبوط ترین دلیلوں کے خلاف ہے اور دوسرے معنی کے اعتبار سے تمام امور میں جائز ہے، بلکہ نظام بغیر اسباب ومسببات کی ترتیب کے درست ہی نہ ہوگا ﴿أبی اللهُ أنْ یُجْرِیَ الأمُورَ اِلاّ بِأسْبابِها﴾[۲۸] ”خدا نہیں چاہتا کہ تمام امور اپنے اسباب کے بغیر انجام پائیں“۔

یہ تمام مطالب جو ابھی ذکر کیے گئے، برہانی ہیں اور صحیح برہانی میزان اور ذوق ومشرب عرفانی اور سمعی شواہد کے مطابق ہیں۔ واللہ الهادی

پانچویں فصل: مقامات ائمہؑ

اہل بیت عصمت وطہارتؑ کیلئے سیر معنوی الی اللہ کے سلسلے میں وہ روحانی بلند مقامات حاصل ہیں جن کا علم وادراک بھی طاقت بشری سے خارج اور ارباب عقول کی عقلوں واصحاب عرفان کے شہود سے بہت بالاتر ہیں اور احادیث شریفہ سے ثابت ہے کہ مقام روحانیت میں وہ رسول اکرمؐ کے شریک ہیں اور ان کے انوار مقدسہ عوام مخلوق کی تخلیق سے بہت پہلے ذات خدا کی تسبیح وتحمید میں مشغول تھے۔ (مثلاً) کافی میں ”محمد بن سنان“ سے روایت کی گئی ہے کہ وہ کہتے ہیں

باسناده عن محمد بن سنانٍ قال: كنتُ عند أبي جعفرٍ الثاني علیه‌السلام فأجريتُ اختلافَ الشيعة، فقال: ﴿يا محمّدُ إنّ الله تبارك وتعالى لم يزلْ منفرِداً بوحدانيّته، ثمّ خلق محمّداً وعليّاً وفاطمة فمكثوا ألفَ دهرٍ، ثمّ خلق جميع الأشياء فأشهدهُم خلقَها وأجرى طاعتهم عليها وفوّض أمورها إليهم، فهم يُحلّون ما يشاؤون ويُحرّمون ما يشاؤون، ولن يشاؤوا إلاّ أن يشاءَ اللهُ تعالى. ثمّ قال: يا محمّدُ هذه الدِّيانةُ الّتي من تقدّمها مرق ومن تخلّف عنها مُحِق ومن لزمها لحق، خُذها إليكَ يا محمّدُ﴾

”میں (محمد بن سنان) حضرت ابوجعفر ثانیؑ کی خدمت میں حاضر تھا اور میں نے شیعوں کے اختلاف کا ذکر چھیڑ دیا تو حضرتؑ نے فرمایا اے محمد! خدا ہمیشہ اپنی وحدانیت میں منفرد رہا۔ پھر اس نے محمدؐ وعلیؑ وفاطمہؑ کو خلق فرمایا پھر یہ حضرات ایک ہزار زمانہ تک ٹھہرے رہے تب خدا نے اشیا کو پیدا کیا اور اشیا کی

پیدائش پر ان کو شاہد بنا کر ان کی طاعت کو ہر چیز پر واجب قرار دیا اور اشیا کے امور ان کے حوالہ کر دیئے۔ لہذا ان کو حق ہے جو چاہے حلال کریں اور جس چیز کو چاہیں حرام کریں۔ البتہ یہ اسی چیز کو چاہیں گے جس کو خدا چاہے گا۔ اس کے بعد فرمایا اے محمد! یہی (اصل) دین ہے جو اس سے آگے بڑھا وہ دین سے خارج ہو گیا اور جو اس سے پیچھے رہ گیا (منکر ہوا) وہ مٹ گیا اور جو اس قاعدہ پر باقی رہا وہی حق سے ملحق ہوا۔ اے محمد! اس کو مضبوطی سے پکڑ لو"۔

کافی میں مفضل سے روایت ہے ﴿وباسناده عن المفضل قال قلت لابي عبد الله علیه السلام كيف كنتم حيث كنتم في الاظلة؟ فقال يا مفضل كنا عند ربنا ليس عنده احد غيرنا في ظلة خضراء نسبحه ونقدسه ونهلله ونمجده، وما من ملك مقرب ولا ذي روح غيرنا حتى بدا له في خلق الاشياء فخلق ما شاء كيف شاء من الملائكة وغيرهم، ثم انهى علم ذلك الينا﴾ ۳۰

"میں نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا: آپ حضرات زیر سایہ الٰہی کیونکر تھے؟ فرمایا اے مفضل! ہم اپنے رب کے پاس اس وقت ایک سبز سائے میں تھے جبکہ کوئی بھی وہاں ہمارے علاوہ نہ تھا۔ ہم خدا کی تسبیح وتقدیس اور تہلیل وتمجید کرتے تھے اس وقت ہمارے علاوہ نہ کوئی ملک مقرب موجود تھا نہ کوئی دوسرا ذی روح یہاں تک کہ خدا نے اشیا کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا پھر اس نے جس طرح چاہا اور جس کو چاہا ملائکہ وغیر ملائکہ کو پیدا کیا پھر ان سب کا علم ہمارے سپرد کیا"۔

اور وہ احادیث جو تخلیق طینت ابدان اور تخلیق روح اور ان کے قلوب اور جو احادیث ان حضراتؑ کو اسم اعظم دیئے جانے اور خزانہ غیب الٰہی سے مخصوص علوم کے مرحمت کئے جانے پر (اور) علوم انبیاءؑ و ملائکہ اور اس سے بھی بالاتر علوم کے دیئے جانے پر جو ہمارے اور تمہارے تصور میں بھی نہیں آسکتے اور وہ احادیث جو ان حضراتؑ کے فضائل پر دلالت کرنے والی ہیں اور اصحاب کے معتبر کتابوں میں چھپی ہوئی ہیں، خصوصاً اصول کافی میں اس قدر ہیں کہ عقلیں دنگ رہ جاتی ہیں اور خود ان ذوات مقدسہ کے علاوہ کوئی بھی ان کے اسرار وحقائق پر آگاہ نہیں ہو سکتا۔ خود اس حدیث شریف میں جس کی میں شرح کر رہا ہوں، صرف ایک فضیلت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے اور وہ آیت تطہیر ہے جس کے بارے میں بطور تواتر اخبار عامہ وخاصہ سے ثابت ہے کہ اہل بیتؑ کی شان میں وارد ہوئی ہے۔ شیعوں کا تو اتفاق ہے مگر اہل سنت کی بھی روایات تواتر کے ساتھ یا کم از کم بطور استفاضہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اہل بیتؑ سے مراد اہل بیت

عصمت وطہارت" ہیں اور اس کا ذکر توضیح واضحات کے مترادف ہے۔

حقیقت عصمت کا بیان

اس حدیث شریف میں اور دیگر احادیث شریفہ میں بھی "رجس" کی تفسیر "شک" سے کی گئی ہے اور بعض احادیث میں رجس کا مطلب تمام عیوب سے پاکیزگی بتایا گیا ہے اور بعض سابق احادیث کی شرح سے معلوم ہو چکا ہے کہ نفی شک قلبی وقالبی عیوب کے نفی کے مستلزم ہے، بلکہ مستلزم عصمت ہے، اس لئے کہ عصمت برخلاف اختیار ایک امر ہے اور فطری وجبلی امور میں سے نہیں ہے، بلکہ یہ ایک ایسی نفسانی حالت اور باطنی نور ہے جو یقین کامل اور اطمینان تام سے حاصل ہوتا ہے اور انسان سے جو معصیت وخطا ہوتی ہے وہ یقین واطمینان میں کمی کی وجہ سے ہوتی ہے اور یقین وایمان کے درجات میں اتنا فرق ہے جس کو بیان کرنا مشکل نہیں، ناممکن ہے۔ انبیائے کرام کو مشاہدہ حضوریہ کے ذریعے جو یقین کامل اور اطمینان تام حاصل ہوتا ہے وہی ان کو معصوم بنا دیتا ہے۔ حضرت علیؑ کے یقین نے ان کو اس منزل تک پہنچا دیا تھا کہ فرماتے تھے "اگر مجھ کو تمام عالم اس شرط پر دیا جائے کہ چیونٹی کے منہ میں جو دانہ ہے اس سلسلے میں اس پر ظلم کروں تو ہرگز نہ کروں گا"۔ ۱۳۹

بہرحال شرک وشک کا زائل ہونا، عالم طبیعت کے خباثتوں اور پلیدیوں اور غیر خدا کے تعلقات کی تاریکیوں سے پاک ہونا اور کدورت انیت وانانیت کے دبیز پردوں کو ہٹا کر حق کی روشنی کا حصول، اور انوار قدسیۂ الٰہیہ اور آیات تامہ ربوبیہ کے ذریعہ ارادۂ ازلیہ کے سبب رؤیت غیریت اور ان کا اپنے خالص ور خالص ترین بندوں کیلئے عطا فرمانا یہ سب وہ مقامات ہیں جو وصف وبیان میں نہیں آسکتے اور عنقائے مغرب کی طرح دست امید کی غیب ہویت اس کے جلال کی چوٹی تک نہیں پہنچ سکتی "عنقا شکار کس نہ شود دام باز گیر"۱۴۰

چھٹی فصل

ایمان کی توصیف نہیں ہوسکتی

ایمان بھی ان روحانی کمالات میں سے ہے جس کی نورانی حقیقت سے بہت کم لوگ آگاہ ہیں۔ خود مومنین بھی جب تک اس دنیا میں ہیں خدا کے نزدیک اپنے ایمان کی نورانیت اور کرامت سے ناواقف

ہیں۔ انسان جب تک اس دنیا میں رہتا ہے اس دنیا کے اوضاع وعادات سے اس طرح مانوس ہو جاتا ہے جب بھی آخرت کی نعمتوں اور کرامتوں یا عذاب و رسوائیوں کو سنتا ہے فوراً دنیاوی صورتوں پر قیاس کرنے لگتا ہے، مثلاً خداوند عالم نے مؤمنین سے جن کرامتوں کا وعدہ کیا ہے اور جن نعمتوں کو ان کیلئے مہیا کیا ہے اور انبیاءؑ نے خبر دی ہے ان کا اپنے بادشاہوں اور بزرگوں کی نعمتوں پر یا ان سے کچھ نفیس واعلیٰ پر قیاس کرنے لگتا ہے، حالانکہ یہ قیاس باطل ہے، کیونکہ آخرت کی نعمتوں اور روح وریحان کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے اور ہمارے دل میں اس کا خیال بھی نہیں آ سکتا ہم تو اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ شراب بہشت کی ایک گھونٹ تمام متصورہ لذتوں کی جامع ہو سکتی ہے، جس طرح کی (نعمتیں) ہوں ایک دوسرے سے ممتاز ہوں گی، ہر لذت کی کیفیت کو یہاں کی لذتوں کے مشابہ بھی نہیں کہا جا سکتا

اس حدیث میں مومنین کی کرامتوں میں سے ایک کرامت کا ذکر کیا گیا ہے جس کا مقابلہ اصحاب معرفت اور ارباب قلوب کے نزدیک نہ کسی چیز سے کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی میزان میں تولا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ مؤمن جب کسی برادر مومن سے ملاقات کرکے اس سے مصافحہ کرتا ہے تو خدا ان دونوں کی طرف برابر نظر (رحمت) ڈالتا ہے۔ دیگر بہت سی روایت میں بھی اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

چنانچہ کافی میں امام محمد باقرؑ کا ارشاد ہے ﴿إِنَّ الْمُؤْمِنَيْنِ إِذَا الْتَقَيَا فَتَصَافَحَا، أَقْبَلَ اللهُ تَعَالَى عَلَيْهِمَا بِوَجْهِهِ وَتَسَاقَطَتْ عَنْهُمَا الذُّنُوبُ كَمَا يَتَسَاقَطُ الْوَرَقُ مِنَ الشَّجَرِ﴾ ۲۳ "دو مؤمن جب ملاقات کرکے مصافحہ کرتے ہیں تو خدا ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور ان کے گناہ اس طرح جھڑنے لگتے ہیں جیسے (موسم خزاں میں) درخت کے پتے"۔

خدا جانتا ہے کہ پروردگار کی یہ نظر اور اس کی توجہ باطن میں کونسی نورانیت اور کرامت رکھتی ہے اور خدا اور بندۂ مومن کے درمیان کونسے پردے اٹھا دیتی ہے اور مومن کی کیسی کیسی مدد کرتی ہے لیکن یہ بھی جاننا چاہئے کہ ان کرامتوں کا حقیقی راز اور نکتہ کیا ہے اور انسان کو اس سے غافل نہ ہونا چاہئے قلبی توجہ اسی کی طرف ہونی چاہئے تاکہ اس کے اتباع میں عمل نورانی وکامل ہو جائے اور قالب روح میں محبت الٰہیہ پھونکا جا سکے اور وہ حقیقی نکتہ اور راز محبت ومودّت (اہل بیتؑ کو) مضبوط بنانا اور عہد اخوت فی اللہ کو مستحکم کرنا ہے۔ چنانچہ احادیث شریفہ میں اس نکتے کو بہت اہمیت دی گئی ہے اور اس باب کی احادیث میں بھی اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔

چنانچہ کافی میں امام محمد باقرؑ کا ارشاد ہے ﴿ اِنَّ الْمُؤْمِنَيْنِ اِذَا الْتَقَيَا وَتَصَافَحَا، اَدْخَلَ اللّٰهُ يَدَهُ بَيْنَ اَيْدِيهِمَا فَصَافَحَ اَشَدَّهُمَا حُبّاً لِصَاحِبِهِ﴾ ۳۴؎ "دو مؤمن جب ملاقات کر کے مصافحہ کرتے ہیں تو ان کے ہاتھوں کے درمیان خدا اپنے ہاتھ بھی داخل کر کے اس سے مصافحہ کرتا ہے جو اپنے اس برادر مؤمن سے زیادہ محبت رکھتا ہو"۔

دوسری روایت میں ہے "جب دو مؤمن ملاقات کر کے مصافحہ کرتے ہیں تو خدا ان کی طرف اپنی رحمت بھیجتا ہے۔ ان میں نو حصے تو اس شخص کیلئے ہوتے ہیں جس کی محبت اپنے دوست سے زیادہ ہوتی ہے اور اگر محبت میں دونوں برابر ہوں تو رحمت الٰہی دونوں کو اپنے گھیرے میں لے لیتی ہے"۔ ۳۵؎

اس باب میں احادیث بہت ہیں مگر ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

والحمد للہ اولاً وآخراً

توضیحات (۳۱)

۱۔ سورۂ انعام، آیت/۹۱؛ سورۂ حج، آیت/۷۴؛ سورۂ زمر آیت/۶۷۔

۲۔ سورۂ حشر، آیت/۲۳۔

۳۔ اصول کافی، ج۲، ص۱۸۲، کتاب ایمان و کفر، باب مصافحہ، حدیث ۱۶

۴۔ مرآۃ العقول، ج۹، ص۱۷، کتاب ایمان و کفر، باب مصافحہ، حدیث ۹۔

۵۔ الوافی، ج۵، ص۶۱۳۔

۶۔ اصول کافی، ج۱، ص۱۰۰، کتاب التوحید، باب النہی عن الصفۃ بغیر ما وصف بہ تعالیٰ، حدیث ۔

۷۔ اصول کافی، ج۱، ص۳۷۶، کتاب التوحید، باب النہی عن الصفۃ بغیر ما وصف بہ تعالیٰ، حدیث

۸۔ التوحید، شیخ صدوق، صفحہ ۳ سے آگے، باب ۲ مخصوصاً حدیث ۳)
بحار الانوار، ج۳، ص۲۵۷ سے آگے، کتاب التوحید، باب ۹ حدیث ۳

۹۔ سورۂ اعراف، آیت/۱۸۰۔

۱۰۔ خدایا تجھی سے شکایت کی جاتی ہے اور تیرے سوا کوئی مدد کرنے والا نہیں ہے۔

۱۱۔ دعائے کمیل، مصباح المتہجد، ص۵۸۷

۱۲۔ اسفار اربعہ، ج۹، ص۲۳ تفسیر صدر المتألہین، تفسیر آیت سورۂ علق

۱۳۔ اصول کافی، ج۱، ص۴۰۲، کتاب الحجۃ، باب فیہ ذکر الارواح التی فی الائمہ، حدیث ۲

۱۴۔ سورۂ شوریٰ، آیت/۵۲۔

۱۵۔ اصول کافی، ج۱، ص۲۷۳، کتاب الحجۃ، باب الروح التی یسدد اللہ بہا الائمہ، حدیث ۱

۱۶۔ بحار الانوار، ج۳۶، ص۳۰۳، تاریخ امیر المومنین، باب ۸۸، حدیث ۵۔

۱۷۔ مصباح الہدایۃ الی الخلافۃ والولایۃ، امام خمینیؒ کی ایک گرانقدر کتاب ہے جو ۱۳۴۹ھ ق، ۱۳۰۸ھ ش، ۱۹۲۹ء میں لکھی گئی ہے۔ اس میں ایک مقدمہ، دو مشکات اور ایک خاتمہ ہے۔ پہلا مشکات میں خلافت محمدیؐ اور ولایت علویؑ پر مشتمل ہے اور دوسرا مشکاۃ غیبی اور عالم امر و خلق میں اسرار خلافت و ولایت و نبوت پر مشتمل ہے۔ حضرت امام خمینیؒ نے مقدمہ میں کتاب کے موضوع کے سلسلہ میں تحریر فرمایا ہے: میں چاہتا تھا کہ اس رسالہ میں حقیقت خلافت محمدیؐ کی بنیاد اور اسی طرح حقیقت ولایت علویؑ کی ایک جھلک کو تمہارے لئے واضح کروں اور یہ بیان کروں کہ یہ دونوں حقیقتیں کیونکر عوالم غیب و شہادت

میں جاری ہیں اور مراتب نزول وصعود میں کیونکر نافذ ہیں۔

۱۸۔ الوافی، ج ۵، ص ۶۷۳، کتاب ایمان وکفر، باب مصافحہ، حدیث ۱۴۔

۱۹ ۲۰۔ مرآۃ العقول، ج ۹، ص ۷، کتاب ایمان وکفر، باب مصافحہ، حدیث ۶۔

۲۱۔ علم تو خدا کے پاس ہی ہو سکتا ہے، خدا اس کے بعد کچھ ظاہر کرے۔

۲۲۔ اصول کافی، کتاب حجہ، باب التفویض الی رسول اللہؐ والی الائمہؑ فی امر الدین، حدیث ۷۔

۲۳۔ وسائل الشیعہ، ج ۳، کتاب الصلوۃ، باب ۱۳، ابواب اعداد الفرائض، حدیث ۲، ۱۴۔

۲۴۔ وسائل الشیعہ، ج ۷، ص ۳۷۶، باب ۲۸، ابواب صوم مندوب، حدیث ۵۔

۲۵۔ اصول کافی، ج، ص ۲۶۶، کتاب الحجہ، باب التفویض الی رسول اللہؐ والی الائمہؑ فی امر الدین، حدیث ۴۔

۲۶۔ مرآۃ العقول، ج ۳، ص ۱۴۳، کتاب حجہ، باب التفویض الی رسول اللہؐ، حدیث

۲۷۔ مرآۃ العقول، ج ۳، ص ۱۴۰، کتاب حجہ، باب التفویض الی رسول اللہؐ، حدیث۔

۲۸۔ اصول کافی، ج ۱، ص ۸۳، کتاب حجہ، باب معرفۃ الامام والرد الیہ؛

بصائر الدرجات، ص ۲۶، ج ۱، باب ۳، حدیث ۲۔

۲۹۔ اصول کافی، ج ۱، ص ۴۴۱، کتاب حجہ، باب مولد النبیؐ و وفاتہ، حدیث ۵۔

۳۰۔ اصول کافی، ج، ص ۴۴۱، کتاب الحجہ، باب مولد النبیؐ و وفاتہ، حدیث ۷۔

۳۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۲۱۵۔

۳۲۔ حافظ (علیہ الرحمہ) فرماتے ہیں

"عنقا شکار کس نشود دام باز گیر کانجا همیشه باد به دست است دام را"

۳۳۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۱۸۰، کتاب ایمان وکفر، باب مصافحہ، حدیث ۳۔

۳۴۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۱۷۹، کتاب ایمان وکفر، باب مصافحہ، حدیث ۲۔

۳۵۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۱۸۱، کتاب ایمان وکفر، باب مصافحہ، حدیث ۱۳۔

بتیسویں حدیث

بالسند المتصل الی محمد بن یعقوب الکلینیؒ عن الحسین بن محمد عن معلی بن محمد، عن الحسن بن علي الوشاء، عن عبد الله بن سنان عن ابی عبد الله علیه السلام قال

﴿من صحة یقین المرء المسلم أن لا یرضی الناس بسخط الله، ولا یلومهم علی ما لم یؤته الله، فانّ الرزق لا یسوقه حرص حریص ولا یردّه کراهیة کاره، ولو انّ احدکم فرّ من رزقه کما یفرّ من الموت لادرکه رزقه کما یدرکه الموت

ثمّ قال: انّ الله بعدله وقسطه جعل الرّوح والرّاحة في الیقین والرّضا، وجعل الهمّ والحزن في الشکّ والسّخط﴾

ترجمہ: امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا ''مسلمان مرد کے صحیح یقین (کی علامت یہ ہے کہ) خدا کو ناراض کرکے لوگوں کو راضی نہ کرے اور جو چیز خدا نے ان کو نہیں دی ہے، اس پر ان کی ملامت نہ کرے، اس لئے کہ حریص کا لالچ نہ رزق کو کھینچ کر لا سکتا ہے ورنہ کراہت کرنے والے کی کراہت اس کو واپس کر سکتی ہے۔ اگر تم میں سے کوئی اپنے رزق سے اس طرح فرار کرے جیسے موت سے فرار کیا جاتا ہے تو اس کا رزق اس کو اسی طرح پالے گا جیسے موت اپنے مطلوب کو پہنچتی ہے۔

اس کے بعد حضرتؑ نے فرمایا خدا نے اپنے عدل وانصاف کے ساتھ راحت وآرام کو یقین ورضا میں اور رنج وغم کو شک وناراضگی میں قرار دیا ہے''۔

شرح: جوہری نے کہا ہے ''سخط'' بروزن ''فرس'' ہے اور ''سخط'' بروزن ''قفل'' رضا

کے متضاد کو کہتے ہیں اور "فقد سخط ای غضب" (ناراض ہوا) کے معنی میں ہے "فھو ساخط" (غضب کرنے والا)۔

"القسط" عدل کے معنی میں ہے، لہذا "بعدلہ وقسطہ" میں قسط عطف تفسیری ہے۔

"الرَّوحُ و الرَّاحة" دونوں کے معنی ایک ہیں، یعنی راحت و آرام، جیسا کہ جوہری نے کہا ہے۔ پس یہ بھی عطف تفسیری ہے یا "روح" کے معنی راحت قلب اور "راحہ" کا مطلب راحت بدن ہے، جیسا کہ مجلسی نے فرمایا ہے۔[۲]

"وَ الهَمُّ وَ الحُزن" جوہری" دونوں کے معنی ایک قرار دیتا ہے۔ اس بنا پر عطف تفسیر بھی ہوسکتا ہے اور علامہ مجلسی" فرماتے ہیں ہوسکتا ہے "لھــــم" کا مطلب اضطراب ہو اس کے حصول کے وقت اور "حزن" کا مطلب اضطراب کے ختم کے بعد غم واندوہ کا ظہار ہو۔[۳]

پہلی فصل

قولہ ﴿ولا یلومھم علی ما لم یؤتہ﴾ اس عبارت میں دو احتمال دیئے گئے ہیں۔

پہلا احتمال لوگوں کی شکایت و مذمت اس بات پر نہ کرے کہ انہوں نے اس کو عطا کرنا چھوڑ دیا ہے، اس لئے کہ یہ چیز قدرت و تقدیر الہی کے ماتحت ہے۔ (ممکن) ہے خدا نے اس کی روزی ان عطایا میں قرار نہ دی ہو اور جو لوگ اہل یقین ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ تقدیر الہی ہے، لہذا کسی کو ملامت نہیں کرنی چاہئے۔ یہ احتمال جناب محقق فیض" نے دیا ہے[۴] اور محدث خبیر علامہ مجلسی" نے اس کو تقویت دی ہے۔[۵]

دوسرا احتمال یہ بھی جناب فیض" نے دیا ہے کہ خدا نے لوگوں کو جو کچھ نہیں دیا ہے اس پر ان کی ملامت نہ کرے، کیونکہ خدا نے لوگوں کو عطیہ میں مختلف قرار دیا ہے، اس میں کسی کو ملامت نہیں کرنی چاہئے۔ یہ اس روایت کے مانند ہے جس میں فرمایا گیا ہے "اگر لوگوں کو پتہ چل جائے کہ اس نے مخلوق کو کس طرح پیدا کیا ہے تو کوئی کسی کی ملامت نہ کرے"۔[۶]

علامہ مجلسی" فرماتے ہیں اس احتمال کا بعید ہونا پوشیدہ نہیں ہے، خصوصاً اس علت کو دیکھتے ہوئے کہ ﴿فَإنّ الرِّزْقَ لا یَسُوقُہُ﴾ ہے۔[۷]

میری نظر میں یہی دوسرا احتمال (جس کو علامہ مجلسی" نے بعید قرار دیا ہے) پہلے احتمال سے زیادہ

مناسب ہے، خصوصاً اسی تعلیل کی بنا پر جو ذکر کی گئی ہے۔ اس لئے کہ لوگوں کی غربت اور تنگدستی پر ملامت اسی وقت کی جا سکتی ہے جب رزق کا مسئلہ ان کے اختیار میں ہو اور سعی و کوشش سے اس میں وسعت ممکن ہو، اس وقت انسان کہہ سکتا ہے "میں نے سعی و کوشش کی لہذا تونگر ہو گیا، تم نے نہیں کی لہذا غریب رہ گئے" مگر اہل یقین جانتے ہیں، رزق میں حرص و تحصیل کو کوئی دخل نہیں ہے، اس لئے دوسروں کی ملامت نہیں کی جا سکتی۔

رزق کا مقدر ہونا اور زیادتی رزق کی دعا!

یہ جان لینا چاہئے کہ جو احادیث شریفہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ رزق مقسوم و مقدر ہے اور قرآنی آیات کی دلالت بھی اسی پر ہوتی ہے وہ ان روایات کے منافی نہیں ہیں جن میں حصول معاش اور تجارت کی تاکید کی گئی ہے، بلکہ ترک تجارت کو مکروہ کہا گیا ہے اور اس پر ملامت کی گئی ہے اور جو لوگ طلب رزق کی کوشش نہیں کرتے ان کا شمار ان لوگوں میں کیا گیا ہے جن کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں اور خدا ان کو روزی نہیں دیتا۔ اس قسم کی احادیث بہت ہیں (لیکن) ہم صرف ایک حدیث کا ذکر کرتے ہیں۔

عنْ مُحمّدِ بنِ الحسنِ الشيخِ الطّائفةِ، قدّسَ سرُّهُ، بإسنادِهِ عن عليِّ بنِ عبدِ العزيزِ قال: قال أبو عبدِ اللهِ عليه السلام: «ما فعلَ عُمرُ بنُ مُسلمٍ؟ قلتُ: جعلتُ فداكَ، أقبلَ على العبادةِ وتركَ التّجارةَ. فقالَ: ويحهُ! أما علمَ أنّ تاركَ الطّلبِ لا يُستجابُ له دعوةٌ؟ إنّ قوماً من أصحابِ رسولِ اللهِ صلى الله عليه وآله لمّا نزلتْ ﴿ومنْ يتّقِ اللهَ يجعلْ له مخرجاً ويرزقْهُ من حيثُ لا يحتسبُ﴾ ۸ أغلقوا الأبوابَ وأقبلوا على العبادةِ وقالوا: قد كُفينا. فبلغَ ذلكَ النّبيَّ صلى الله عليه وآله فأرسلَ إليهم فقالَ: ما حملكُمْ على ما صنعتُمْ؟ فقالوا: يا رسولَ اللهِ تكفّلَ اللهُ لنا بأرزاقنا فأقبلْنا على العبادةِ. فقالَ: من فعلَ ذلكَ لم يُستجبْ له، عليكم بالطّلبِ» ۹

"راوی کہتا ہے کہ امام جعفر صادق نے پوچھا عمر بن مسلم کیا کرتا ہے؟ میں نے عرض کیا میں آپ پر قربان ہو جاؤں انہوں نے تجارت چھوڑ کر عبادت کو اپنا مشغلہ بنا لیا ہے۔ امام نے فرمایا اس پر وائے ہو! کیا وہ نہیں جانتا کہ روزی نہ کمانے والے کی دعا قبول نہیں ہوتی؟ جب یہ آیت نازل ہوئی ﴿ومن یتق اللہ﴾ تو اصحاب کی ایک جماعت نے گھروں کے دروازے بند کر لئے اور عبادت میں مشغول ہو گئے اور کہنے لگے "اب ہمارے لئے کافی ہے" اس کی خبر رسول خدا کو ہوئی تو آپ نے ان کو بلا کر پوچھا تم لوگوں

کو یہ کیا سوجھی؟ انہوں نے کہا: اے رسول خدا اب تو خدا نے ہمارے رزق کی کفالت کری لہذا ہم عبادت میں مشغول ہو گئے۔ آنحضرت ؐ نے فرمایا تم میں سے جو ایسا کرے گا اس کی دعا قبول نہ ہوگی۔ تلاش معاش تم پر واجب ہے"۔

ان روایت میں عدم منافات اس طرح ہے کہ طلب کے بعد بھی رزق اور دیگر امور سب ہی دست قدرت میں ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ ہماری طلب اور تلاش معاش مستقل طور سے حصول رزق کی علت ہو، بلکہ تلاش معاش بندوں پر فرض ہے۔ رہا امور کی ترتیب اور ظاہری وغیر ظاہری اسباب کا جمع کرنا، جن میں زیادہ تر بندوں کے اختیار سے خارج ہوتے ہیں، یہ سب تقدیر باری تعالیٰ پر موقوف ہے، لہذا جو انسان راسخ العقیدہ اور روزمرہ معاملات سے واقف ہوتا ہے وہ تلاش معاش سے نہ رکنے کے علاوہ اپنے عقلی وشرعی فرائض کو انجام دینے کے ساتھ ساتھ جھوٹی خواہشات کی بنا پر اپنے اوپر طلب کے دروازوں کو بند نہیں کرتا اور اسی کے ساتھ ہر چیز کو خدا کی طرف سے جانتا ہے۔ وہ کسی بھی مخلوق کو وجود اور کمالات وجود میں مؤثر نہیں جانتا۔ طالب وطلب اور مطلوب سب اسی سے ہیں اور اس حدیث شریف میں ہے کہ صحیح یقین والا لوگوں کی عدم وسعت رزق پر ملامت نہیں کرتا، یعنی اگر لوگوں نے عام اندازے کے مطابق طلب کیا تو یہ بات قابل ملامت نہیں ہے، حالانکہ ایک گروہ کی ملامت کرنا جو فریضہ طلب کو پورا نہیں کرتا اس وقت تک راجح ہے جب تک اس کو طلب پر آمادہ کرے، جیسا کہ روایات میں اس کی مثال موجود ہے۔

مختصر یہ ہے کہ یہ بات جبر وتفویض کا ایک شعبہ ہے، اس لئے جس نے اس کی تحقیق کی ہوگی وہ تو اس کی حقیقت پر مطلع ہو سکتا ہے، اس کی تفصیل ہماری ذمہ داری سے خارج ہے۔

دوسری فصل: صحیح یقین کی علامتیں

اس حدیث شریف میں دو چیزوں کو یقین کی صحت وسلامتی کی علامت قرار دیا گیا ہے

پہلی یہ کہ خدا کی ناراضگی وغضب کے بدلے، لوگوں کی رضامندی وخوشنودی نہ خریدے اور دوسری یہ ہے کہ جو کچھ خدا نے ان کو دیا ہے اس پر لوگوں کی مذمت نہ کرے۔

یہی دو باتیں کمال یقین کا ثمرہ اور نتیجہ ہیں اور ان کے مقابلہ میں ضعف یقین اور ایمان کی کمزوری وبیماری ہے۔ اس کتاب میں جہاں تک میرے بس میں تھا اور مناسب تھا میں نے ایمان ویقین اور ان کے

نتائج کی شرح کردی اور اس وقت بھی اجمالی طور پر یقین کی صحت وسلامتی اور ان کے مقابلات پر ان دونوں صفات کے مرتب ہونے کو بیان کروں گا۔

یہ معلوم ہونا چاہئے کہ جو شخص لوگوں کی خوشنودی اور رضامندی کا طالب ہے اور اس کی پوری توجہ لوگوں کے دل جیتنے کی طرف ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ ان کو ان امور میں موثر سمجھتا ہے جو اس کے دلخواہ ہیں۔ مثلاً جو شخص دولت پرست ہے وہ ارباب ثروت کے سامنے ہر وقت سر تسلیم خم کرنے پر آمادہ رہتا اور ان کی چاپلوسی کرتا رہتا ہے اور جو لوگ طالب جاہ ومنصب ہیں اور ظاہری عزت واحترام کے دلدادہ ہیں وہ اپنے ماتحتوں کی خوشامد کرتے ہیں، ان کے ساتھ فروتنی برتتے ہیں۔ جس طرح بھی ہو ان کے دل کو موہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ چرخ نیلی فام اسی طرح بطور دور وتسلسل چلتا رہتا ہے، کمزور لوگ جاہ ومنصب کی خواہش رکھنے والوں سے اور طالبان منزلت ومقام اپنے بے وقوف چاہنے والوں کی خوشامد کیا کرتے ہیں۔ اس سے صرف وہی لوگ مستثنیٰ ہیں جنہوں نے نفسانی ریاضت سے خود اپنی تربیت کرلی ہے اور رضائے الٰہی کے طالب ہیں اور دنیا وزیبائش دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ مقام ومنصب میں خدا کی رضا کے طالب اور تحقیق میں حق کے طالب اور حق پسند رہتے ہیں۔

لوگوں کے دو طبقے ہیں

دنیا کے لوگ عام طور پر ان دو طبقات میں تقسیم ہوتے ہیں۔ پہلا: جن کے یقین نے ان کو اس منزل تک پہنچا دیا ہے کہ وہ تمام ظاہری اسباب وصوری موثرات کو خدا کے ارادہ ازلی وجوبی کاملہ کے تحت مسخر جانتے ہیں، وہ حق کے علاوہ نہ کچھ دیکھتے ہیں اور نہ چاہتے ہیں۔ ان کا ایمان ہے کہ دنیا وآخرت میں خدا ہی موثر اور مالک ہے، وہ قرآن کی اس آیت پر ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ﴾[1] حقیقی ایمان اور ایسا یقین رکھتے ہیں جس میں نقص وتردید وشک کا شائبہ بھی نہ ہو۔ خدا کو ملک ہستی کا مالک جانتے اور تمام عطیات کو خدا کی طرف سے مانتے ہیں، فیض وسط، وجود وکمال وجود کو خدا کی طرف سے بحسب ترتیب نظام وپوشیدہ مصالح جانتے ہیں۔ ایسے لوگوں کیلئے خدا ان کے سامنے معرفت کے ابواب کھول دیتا ہے اور ان کے قلوب، قلوب الٰہی ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کی رضامندی یا ناراضگی ان کی نظروں میں کچھ بھی نہیں ہوتی، وہ مرضی الٰہی کے علاوہ کسی چیز کے طالب نہیں ہوتے۔ خدا کے

سوا کسی کی طرف اپنی چشم طمع وطلب کو باز نہیں کرتے۔ ان کا دل ان کی زبان گویا ہے کہ "خدایا اگر تو مجھے عطا کرد تو کوئی اس کو روک نہیں سکتا اور اگر تو کسی چیز کو روک دے تو کون ہے جو عطا کر سکے؟" پس وہ لوگ اپنی آنکھوں کو لوگوں اور ان کی عطیات اور ان کی دنیا سے بند رکھتے ہیں اور ہمیشہ خدا کی طرف چشم نیاز کھولے رکھتے ہیں، اور ایسے ہی حضرات تمام مخلوقات کی رضامندی حاصل ہو جانے کیلئے بھی خدا کی ناراضگی کو قبول کرنے سے گریز کرتے ہیں، جیسا کہ حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام نے فرمایا ہے۔

حالانکہ یہی لوگ باوجودیکہ خدا کے علاوہ کسی اور کیلئے کسی چیز کے قائل نہیں ہیں، تمام مخلوقات کو خدا کی حاجتمند جانتے ہیں اور اسی کے ساتھ سب کو عظمت ورحمت ومہربانی کی نظر سے دیکھتے ہیں اور کسی کو کسی بات پر ملامت نہیں کرتے سوائے اصلاح حال اور تربیت کے، جیسا کہ انبیاءؑ بھی اسی طرح تھے، کیونکہ انبیاء کرام خدا سے وابستہ اور جلال وجمال خدا کے مظہر تھے، بندگان الٰہی پر صرف لطف ومحبت کی نظر کرتے تھے اور کسی کو اس کی خامی یا نقص پر ملامت نہیں کرتے تھے۔ ہاں! وہ مفاد عامہ اور افراد بشر کی اصلاح کیلئے حسب ظاہر ملامت کرتے تھے اور یہ نتیجہ وثمرہ تھا شجرۂ طیبہ یقین وایمان کا اور حدود الٰہی کی معرفت کا۔

دوسرا گروہ، وہ ایسا ہے جو حق سے بے خبر ہے، اور اگر خبر رکھتا ہے تو ناقص اور نامکمل ایمان رکھتا ہے۔ یہ لوگ چونکہ کثرتوں اور اسباب ظاہری کو دیکھ کر مسبب اور اسباب سے غافل ہو چکے ہیں اور مخلوق کی رضامندی تلاش کرتے ہیں، اور کبھی ان کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ بہت ہی کمزور مخلوق کی رضایت کے طالب ہوتے ہیں اور خدا کی ناراضگی کے اسباب فراہم کرتے ہیں۔ چنانچہ کبھی تو اہل معصیت سے موافقت کرتے ہیں یا وقت پر امر بمعروف ونہی از منکر کو ترک کر دیتے ہیں یا باطل فتویٰ دے دیتے ہیں یا بے موقع (کسی چیز کی) تصدیق یا تردید کر دیتے ہیں یا مؤمنین کی غیبت کرتے یا اہل دنیا کی توجہ موڑنے کیلئے اور ظاہری منصب پر فائز لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کیلئے مؤمنین پر الزام لگاتے ہیں۔ یہ ساری باتیں ایمان کی کمزوری کی بنا پر ہیں، بلکہ یہ شرک کا ایک مرتبہ ہے۔ یہ نظریہ انسان کو بڑے بڑے مہلکوں سے دوچار کر دیتا ہے۔ انہیں میں سے ایک وہ ہے جس کی طرف اس حدیث شریف میں اشارہ ہے۔ ایسا شخص بندگان خدا سے بدظن ہو جاتا ہے اور ان سے عداوت ودشمنی پیدا کر لیتا ہے اور (مختلف) امور میں ان کی ملامت کرتا وغیر ذلک۔

تیسری فصل

اشعرہ، معتزلہ اور مذہب حقہ کے اقوال

محدث مجلسیؒ نے مرآۃ العقول میں اس حدیث شریف کے ضمن میں ایک بحث فرمائی ہے کہ کیا خدا کی طرف سے رزق مقسوم، حرام پر بھی شامل ہوتا ہے یا اس کا تعلق صرف رزق حلال سے ہے؟ فخر رازی کی تفسیر سے اشاعرہ و معتزلہ کے اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے دونوں کی دلیلوں کو قرآن و حدیث سے ذکر کرنے کے بعد امامیہ کی موافقت، معتزلہ سے فرمائی ہے کہ رزق مقسوم میں حرام شامل نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق صرف حلال سے ہے اور معتزلہ کی دلیلوں کو بعض آیات و روایات کے ظواہر اور ظاہر لغت "رزق" سے جو اشاعرہ و معتزلہ کا طریقہ ہے، نقل فرمایا ہے۔!!

مجلسیؒ نے معتزلہ کے قول کو چونکہ امامیہ کے مشہور قول کے موافق پایا ہے اس نے معتزلہ کے دعوٰی کو قبول فرمایا ہے لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ قضیہ بھی جبر و تفویض کا ایک شعبہ ہے اور اس سلسلے میں مذہب امامیہ نہ معتزلہ کے موافق ہے نہ اشاعرہ کے، بلکہ معتزلہ کا قول تو اشاعرہ سے زیادہ بے معنی و لغو ہے، اس لئے اگر بعض متکلمین امامیہ اس کی طرف مائل ہو گئے ہوں تو حقیقت حال و مآل کی غفلت کی بنا پر ایسا ہوا ہے۔ چنانچہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ جبر و تفویض کا مسئلہ بہت مجمل ہے اور غالباً فریقین سے یہاں بھی نہ صرف مجمل ہے، بلکہ محل نزاع، صحیح میزان کے مطابق بیان بھی نہیں کیا گیا ہے۔ اس لئے اس مسئلے کا ربط مسئلہ جبر و تفویض سے کیونکر ہے؟ شاید یہ بھی معلوم نہ ہو، حالانکہ یہ اہم نکتہ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر اشاعرہ کہتے ہیں کہ حرام و حلال دونوں مقسوم ہیں اور اس طرح کہتے ہیں کہ جو مستلزم جبر ہوتا ہے یا معتزلہ کہتے ہیں کہ صرف حلال مقسوم ہے، حرام مقسوم نہیں ہے اور اس طرح کہتے ہیں کہ مستلزم تفویض ہے تو یہ دونوں باطل ہیں اور ان کا فساد اپنی جگہ پر ثابت کیا جا چکا ہے۔

لیکن ہم بحسب اصول مقررۂ مذہب، حلال و حرام دونوں کو خدا کی طرف سے مقسوم سمجھتے ہیں جیسے گناہوں کو بھی ہم بہ تقدیر و قضائے الٰہی سمجھتے ہیں، لیکن اس طرح کہ مستلزم جبر و تفویض نہیں ہے (مگر) چونکہ یہ کتاب دلیل و برہان کیلئے نہیں لکھی گئی اور میں نے بھی اپنے سے یہ شرط کر لی ہے کہ علمی مطالب سے متعلق بحث نہ کروں گا، ویسے میں خود بھی اس کی حقیقت سے بے بہرہ ہوں!! لہذا اسی مقدار پر

قناعت کرتا ہوں۔ واللہ الہادی

علامہ مجلسیؒ نے اس حدیث شریف کے ضمن میں ایک دوسری بحث بھی چھیڑی ہے اور وہ یہ ہے کہ کیا خدا پر تمام بندوں کا رزق مطلقاً واجب ہے یا جب وہ کسب وسعی کریں تب واجب ہے؟ الخ یہ ایک ایسا مطلب ہے جو متکلمین کے اصول کے مناسب ہے، لیکن برہانی میزان اور یقینی ضابطے کی بنا پر ان مباحث میں دوسری روش اختیار کرنی پڑے گی، لیکن بہتر ہے کہ اس قسم کے مباحث میں نہ پڑیں، کیونکہ کوئی خاص فائدہ نہیں ہے۔ ہم اس سے پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ ارزاق کی تقسیم بحسب قضائے الٰہی سعی وکوشش کے منافی نہیں ہے۔

چوتھی فصل

روح وراحت کو خدا نے یقین ورضا میں قرار دیا ہے اور رنج وغم کو شک وناراضگی میں قرار دیا ہے اور یہ عین تصوف کے مطابق ہے۔ یہ راحت وآرام اسی طرح رنج وغم جو حدیث شریف کے ذیل میں آیا ہے، تقدیر وتقسیم رزاق کے ذیل میں مذکور ہونے کی مناسبت سے، امور دنیا وتحصیل معاش کے سلسلہ کا حصہ ہے۔ اگرچہ ایک بیان کے اعتبار سے امور آخرت کے بارے میں بھی یہ تقسیم صحیح ہے مگر میں فی الحال اس حدیث شریف کے بیان کے درپے ہوں۔

پس یہ سمجھ لو کہ انسان خدا پر اور اس کی تقدیر پر یقین رکھنے والا اور ایسے قادر علی الاطلاق پر اعتماد کرنے والا ہے جو تمام امور کو از روئے مصلحت مقرر کرتا ہے اور رحمت مطلقہ کاملہ کا مالک ہے۔

خلاصہ یہ کہ وہ رحیم علی الاطلاق اور مطلق بخشنے والا ہے اور جب ایسا یقین ہوگا تو اس کے سبب سے تمام مشکل امور آسان اور تمام مصائب سہل ہو جائیں گے اور تحصیل معیشت کے سلسلے میں اس کی طلب اہل دنیا اور اہل شک وشرک کی طلب سے بہت فرق رکھتی ہے۔ جو لوگ ظاہری اسباب پر اعتماد رکھتے ہیں ان کے حصوں میں ہمیشہ تزلزل اور اضطراب پایا جاتا ہے۔ اگر ان کو کوئی صدمہ پہنچ جائے تو بہت ہی ناگوار گزرتا ہے کیونکہ وہ نہیں سمجھتے کہ یہ مصالح غیبیہ سے گھرا ہوا ہے۔ مختصر یہ کہ جو شخص اس دنیا کے حصوں کو اپنے لئے حد دست سمجھتا ہے وہ اس کے حصوں میں رنج وغم اٹھاتا ہے، اس کا راحت وآرام ختم ہو جاتا ہے، اس کا سارا وقت اور ساری فکر اسی میں لگی رہتی ہے۔ جیسا کہ ہم خود بھی دیکھتے ہیں کہ اہل دنیا ہمیشہ تعب وغم میں ہیں، ان کے پاس قلبی وجسمانی راحت نہیں ہے۔

اسی طرح اگر ان کے ہاتھوں سے دنیا نکل جائے تب بھی بے انتہا رنج و غم میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اگر کوئی مصیبت آ جائے تو تاب و طاقت کھو بیٹھتے ہیں اور حادثے پر صبر نہیں کر پاتے اور یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ وہ قضا و عدل الٰہی میں شک و تزلزل رکھتے ہیں اور اس کا نتیجہ اسی قسم کے امور ہوتے ہیں۔ میں اس سے پہلے اس کی شرح کر چکا ہوں لہٰذا اب تکرار نہیں کرتا ہے

اب رہی یہ بات کہ ان آثار کا یقین و رضا اور شک و غضب پر مرتب ہونا خدا کی طرف سے ہے اور یہ عمل عادلانہ ہے۔ یہ اس پر موقوف ہے کہ خدا کی فاعلیت تمام مراتب وجود میں (بغیر اس کے کہ جبر محال لازم آئے) نافذ ہے اور حمیت نظام وجود کے بیان عینیت پر موقوف ہے اور یہ دونوں چیزیں اس کتاب کے فرائض سے خارج ہیں۔

والحمدللہ اولاً و آخراً

توضیحات (۳۲)

۱۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۵۷، کتاب ایمان و کفر، باب فضل الیقین، حدیث ۲۔

۲۔ مرآۃ العقول، ج ۷، ص ۳۵۹، کتاب ایمان و کفر، باب فضل الیقین، حدیث ۲۔

۳۔ مرآۃ العقول، ج ۷، ص ۳۵۹، کتاب ایمان و کفر، باب فضل الیقین، حدیث ۲

۴۔ وافی، ج ۳، ص ۲۷۹۔

۵۔ مرآۃ العقول، ج ۷، ص ۳۵۶، کتاب ایمان و کفر، باب فضل الیقین، حدیث ۲۔

۶۔ وافی، ج ۳، ص ۲۷۰۔

۷۔ مرآۃ العقول، ج ۷، ص ۳۵۷، کتاب ایمان و کفر، باب فضل الیقین، حدیث ۲۔

۸۔ جو خدا سے ڈرتا ہے خدا اس کیلئے نکلنے کی ایک جگہ قرار دیتا ہے، وہ اس کو ایسی جگہ سے روزی دیتا ہے جہاں سے اس کو گمان بھی نہ ہو۔ سورۂ طلاق، آیت ۳۔

۹۔ وسائل الشیعہ ج ۱۲، ص ۱۵، کتاب التجارۃ، باب ۵، باب مقدمات تجارت، حدیث ۷

۱۰۔ سورۂ آل عمران آیت ۲۶

۱۱۔ تفسیر کبیر ج ۲ ص ۳۰

۱۲۔ مرآۃ العقول، ج ۷، ص ۳۵۸، کتاب ایمان و کفر، باب فضل الیقین، حدیث ۲

۱۳۔ اس مسئلہ کی تحقیق اچھی طرح سے تیسویں حدیث میں کی ہے (جہاں پر) ﴿عرفت اللہ بفسخ العزائم و نقض الھمم﴾ کا ذکر ہے۔ (منہ عفی عنہ)

سینتیسویں حدیث

بالسند المتصل الى الشيخ الاقدم محمد بن يعقوب الكليني رضوان الله عليه عن احمد بن محمد عن الحسين بن سعيد، عمن ذكره عن عبيد بن زرارة، عن محمد بن مارد قال: قلت لأبي عبدالله عليه السلام

﴿حديث روي لنا انك قلت: اذا عرفت فاعمل ما شئت فقال: قد قلت ذلك قال، قلت: وان زنوا وان سرقوا وان شربوا الخمر؟

فقال لي: ﴿انا لله وانا اليه راجعون﴾ والله ما انصفونا ان نكون اخذنا بالعمل ووضع عنهم، انما قلت: اذا عرفت فاعمل ما شئت من قليل الخير وكثيره، فانه يقبل منك﴾

ترجمہ: راوی کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا آپ کی ایک حدیث ہم تک پہنچی ہے کہ حضور نے فرمایا جب تم کو (امامؑ کی) معرفت ہوگئی تو جو چاہے کرو! حضرتؑ نے فرمایا ہاں میں نے یہ بات کہی ہے۔ میں نے عرض کیا چاہے (اس کے بعد) لوگ زنا کریں، چوریاں کریں، شراب پئیں؟ حضرتؑ نے فرمایا ﴿انا لله وانا اليه راجعون﴾ خدا کی قسم! ہمارے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔ ہم تو عمل پر پکڑے جائیں اور لوگوں سے عمل اٹھا لیے جائیں؟ بلکہ میں نے کہا تھا جب تم کو معرفت حاصل ہوگئی تو چاہے تھوڑا عمل خیر کرو یا زیادہ وہ قبول کر لیا جائے گا"۔

شرح: "حديث" مبتدا اور اس کی خبر "روي" ہے اور "انك" مبتدائے محذوف کی خبر ہے، یعنی

"هو أنك" " داعرفت" اس حدیث میں معرفت سے مراد امامؑ کی معرفت ہے۔

"قال قلت" ممکن ہے یہ "قُلْتُ" متکلم کا صیغہ ہو اور ممکن ہے کہ "قُلْتَ" خطاب کا صیغہ ہو۔

"و ن ز ر ســـو ،" میں کلمہ "ان" وصلیہ ہے یعنی جب معرفت حاصل ہو جائے تو جو بھی گناہ کبیرہ چاہیں کریں؟۔ "انا للہ" کلمہ استرجاع کو مصیبت کی شدت و عظمت کے وقت استعمال کرتے ہیں اور چونکہ یہ بہتان یا ناحق بہت بڑی مصیبت تھی اس لئے حضرتؑ نے کمال افسوس کے موقع پر استعمال فرمایا۔

"أن سكون ، ي هي أن يكون" یعنی اس بارے میں ہمارے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا، اس لئے کہ ہم پر تو اس عمل کی ذمہ داری ہوگی اور اس پر ہم سے مؤاخذہ ہوگا لیکن ہم پر عقیدہ رکھنے کی وجہ سے ان سے ذمہ داری اٹھالی جائے اور ان کے اعمال کے بارے میں کوئی پرسش نہ ہو (یہ کیسے ممکن ہے؟)۔ چنانچہ اس کے بارے میں انشاء اللہ اشارہ کیا جائے گا۔

پہلی فصل

جو روایات فعل عبادت وترک معاصی پر ابھارتی ہیں

اور بظاہر اس کے خلاف روایات کے درمیان، جمع کی صورت

جان لو کہ جو شخص رسول خداؐ وائمہ ہدیؑ کے حالات، ان کی عبادت کی کیفیت اور اس میں ان کی سعی وکوشش اور خداوند عالم کی بارگاہ میں ان کی ذلت ومسکنت اور خوف وحزن سے متعلق روایات کی طرف رجوع کرے گا اور قاضی الحاجات کی بارگاہ میں ان کی مناجات کا مطالعہ کرے گا جو حد تواتر سے بالاتر ہے اور سینکڑوں سے بھی زیادہ ہے، اسی طرح رسول خداؐ نے حضرت علیؑ کو اور ائمہؑ نے جو ایک دوسرے کو وصیتیں کی ہیں ان کی طرف رجوع کرے گا اور ان وصیتوں کو دیکھے گا جو ائمہؑ نے اپنے خالص شیعوں اور خاص دوستوں کو فرمائی ہیں اور ان تاکیدوں کو ملاحظہ کرے گا جو ان حضراتؑ نے کی ہیں اور خدا کی ـ سے روکا ہے جس سے اصول وفروع کی کتابیں بھری پڑی ہیں تو اس کو یقین ہو جائے گا کہ جو روایت ظاہراً ان حدیثوں کی مخالف ہیں ان کا ظاہر مراد نہیں ہے۔ لہذا اگر ان روایات کی ایسی تاویل ممکن ہو جو احادیث قطعیہ صریحہ کی مخالف نہ ہو جو ضروریات دین سے بھی ہیں تو ہم ویسی تاویل کریں گے یا اگر جمع عرفی ممکن ہوگی تو جمع عرفی کریں گے ورنہ ان روایات کے علم کو ان کے قائل کی طرف لوٹا دیں گے۔ سردست

میں اس کتاب میں ان روایات کے دسویں کا دسواں حصہ بھی نہیں بیان کر سکتا ورنہ ان کی جمع کی صورت کا ذکر کر سکتا ہوں تاہم دونوں طرف کی بعض روایتوں کو ذکر کروں گا تاکہ حقیقت حال معلوم ہو سکے

کافی میں امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے ﴿شیعتنا (هم) الشاحبون الذابلون الناحلون الذين اذا جنّهم الليل استقبلوه بحزن﴾ [۱] "ہمارے شیعہ وہ ہیں جو حزن واندوہ والے اور شدت حزن وعبادت سے کمزور جسم والے ہیں، وہ ایسے ہیں کہ جب رات کی تاریکی چھا جاتی ہے تو اس کا استقبال حزن کے ساتھ کرتے ہیں"۔ اس طرح کی علامات شیعہ کو بیان کرنے والی روایات بہت زیادہ ہیں۔

کافی ہی میں امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ آپؑ نے مفضل سے فرمایا ﴿اياك والسفلة فانما شيعة عليؑ من عف بطنه وفرجه واشتد جهاده وعمل لخالقه ورجا ثوابه وخاف عقابه فاذا رأيت أولئك، فاولئك شيعة جعفر﴾ [۳] "پست قسم کے لوگوں سے بچو حضرت علیؑ کے شیعہ وہی ہیں جن کے شکم وشرمگاہ حرام سے محفوظ ہوں، جہاد میں شدید ہوں، اپنے خالق کیلئے عمل کرتے ہوں، اس کے ثواب کی امید رکھتے ہوں، اس کے عقاب سے ڈرتے ہوں، اگر ایسے لوگوں کو دیکھو تو یہ حضرت جعفر صادقؑ کے شیعہ ہیں"۔

وعن الامالي، للحسن بن محمد الطوسي شيخ الطائفة رحمه الله باسناده عن الرضاؑ عن ابيه عن جده عن ابي جعفر عليهم السلام انه قال لخيثمة ﴿ابلغ شيعتنا انا لا نغني من الله شيئاً وابلغ شيعتنا انه لا ينال ما عند الله الا بالعمل، وابلغ شيعتنا ان اعظم الناس حسرة يوم القيامة من وصف عدلاً ثم خالفه الى غيره وابلغ شيعتنا انهم اذا قاموا بما امروا انهم هم الفائزون يوم القيامة﴾ [۲]

شیخ الطائفہ طوسیؒ کی امالی میں امام رضاؑ کے واسطہ سے امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے خیثمہ سے فرمایا ہماری شیعوں کو بتادو ہم خدا سے بے نیاز نہیں ہیں اور ہمارے شیعوں کو یہ خبر بھی دے دو کہ خدا کے پاس جو چیزیں ہیں وہ بغیر عمل کے نہیں مل سکتیں اور (یہ بھی) ہمارے شیعوں سے کہہ دو کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ حسرت وافسوس اس کو ہوگا جو عدل وانصاف کی توصیف کرے اور اس کی (عملاً) مخالفت کرے اور اس کو چھوڑ کر کسی اور صفت کو اپنائے اور یہ بھی خبر دے دو کہ اگر انہوں نے حکم خدا پر عمل کیا تو قیامت کے دن وہی کامیاب ہوں گے"۔

کافی میں امام محمد باقرؑ نے فرمایا ﴿لا تذهب بكم المذاهب، فوالله ما شيعتنا إلا من أطاع الله﴾ ۵ ''معصیت میں عذر تراشی نہ کرو اور باطل باتوں کی پیروی نہ کرو کہ ہم تو شیعہ ہیں اور یہی بات ہماری نجات کیلئے کافی ہے، خدا کی قسم ہمارا شیعہ وہی ہے جو خدا کی اطاعت کرے''۔

وباسناده عن جابر، عن أبي جعفر علیہ السلام قال: قال لي ﴿يا جابر! أيكتفي من ينتحل التشيع أن يقول بحبنا أهل البيت؟ فوالله ما شيعتنا إلا من اتقى الله وأطاعه، إلى أن قال: فاتقوا الله واعملوا لما عند الله، ليس بين الله ولا بين أحد قرابة، أحب العباد إلى الله تعالى وأكرمهم عليه أتقاهم وأعملهم بطاعته، يا جابر! والله ما يتقرب إلى الله تعالى إلا بالطاعة، ما معنا براءة من النار ولا على الله لأحد من حجة، من كان لله مطيعاً فهو لنا ولي، ومن كان لله عاصياً فهو لنا عدو، وما تنال ولايتنا إلا بالعمل والورع﴾ ۶۔

''امام محمد باقرؑ نے جابر سے فرمایا اے جابر! جو لوگ اپنے کو شیعہ کہتے ہیں کیا صرف ہماری محبت کا قائل ہونا ان کیلئے کافی ہے؟ خدا کی قسم ہمارا شیعہ صرف وہی ہے جو تقوئے الٰہی رکھتا ہو اور خدا کی اطاعت کرتا ہو، یہاں تک کہ فرمایا پس خدا سے ڈرو اور جو خدا کے پاس ہے (ثواب) اس کیلئے عمل کرو۔ خدا اور کسی کے درمیان کوئی رشتہ داری نہیں ہے۔ خدا کے نزدیک سب سے محبوب اور سب سے محترم وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی اور سب سے زیادہ اس کی اطاعت کرنے والا ہو۔ اے جابر! خدا کی قسم خدا سے تقرب صرف اطاعت کے ذریعے حاصل ہوسکتا، ہمارے پاس آتش جہنم سے برأت کی چٹھی نہیں ہے، اور نہ کسی کے پاس خدا کے خلاف کوئی حجت ہے۔ جو خدا کا مطیع ہے وہ ہمارا دوست ہے۔ جو خدا کا نافرمان ہے وہ ہمارا دشمن ہے اور ہماری ولایت کا حصول صرف عمل و تقویٰ ہی سے ہوسکتا ہے''۔

کافی شریف میں منقول ہے کہ حضرت امام محمد باقرؑ نے فرمایا ''اے شیعیان آل محمدؐ کی جماعت! تم حد وسط میں رہو کہ غالی لوگ تمہاری طرف رجوع کریں اور تالی تم سے ملحق ہو جائیں۔ انصار میں سے کسی شخص نے جس کا نام سعد تھا، عرض کیا میں قربان جاؤں غالی کیا ہے؟ فرمایا غالی ایک قوم ہے جو ہمارے بارے میں ایسی باتیں کہتی ہے جو ہم اپنے بارے میں نہیں کہتے۔ نہ یہ لوگ ہم سے ہیں اور نہ ہم ان سے ہیں۔ سعد نے پھر پوچھا تالی کیا ہے؟ فرمایا وہ شخص ہے جو طالب ہدایت ہے مگر اس کا راستہ نہیں جانتا، وہ چاہتا ہے کہ اس کو خیر ملے اور وہ عمل کرے۔ اس کے بعد امامؑ شیعوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا خدا کی

قسم ہمارے پاس خدا کی طرف سے برائت اور آزادی (کا پروانہ) نہیں ہے۔ ہمارے اور خدا کے درمیان کوئی رشتہ داری نہیں ہے اور نہ ہی ہم خدا پر کوئی حجت رکھتے ہیں ہم بھی خدا سے تقرب، اس کی طاعت وفرمانبرداری کے ذریعے حاصل کرتے ہیں تم میں سے جو خدا کا مطیع وفرمانبردار ہوگا ہماری ولایت ودوستی اسی کو فائدہ پہنچائے گی اور جو مطیع وفرمانبردار نہ ہوگا ہماری ولایت اس کو فائدہ نہ پہنچائے گی تم پر وائے ہو! مغرور نہ ہو تم پر وائے ہو! مغرور نہ ہو"۔ ۷

نیز کافی شریف میں منقول ہے کہ حضرت امام محمد باقرؑ نے فرمایا "رسول خداؐ نے کوہ صفا پر کھڑے ہو کر فرمایا اے اولاد ہاشم! اے اولاد عبدالمطلب! میں تمہارا رسول ہوں۔ میں تم پر مہربان ہوں لیکن میرا عمل میرے لئے ہے اور تم میں سے ہر ایک کا عمل اس کیلئے ہے۔ یہ نہ کہنا کہ محمد ہم سے ہیں اور جہاں وہ داخل ہوں گے عنقریب ہم بھی وہیں داخل ہوں گے۔ نہیں! خدا کی قسم ایسا نہیں ہے۔ اے عبدالمطلب کی اولاد! تم میں اور دوسروں میں بھی میرا دوست وہی ہے جو متقی وپرہیزگار ہے۔ آگاہ ہو جاؤ! اگر تم قیامت میں اپنی پیٹھ پر دنیا لادے ہوئے آئے اور دوسرے لوگ آخرت لادے ہوئے آئے تو میں تم کو نہیں پہچانوں گا"۔ ۸

جابرؓ کی جو روایت گزر چکی اس میں ہے کہ امام محمد باقرؑ نے فرمایا: "اے جابر! مذاہب و باطل آراء تم کو دھوکہ نہ دیں کہ تم یہ گمان کر لو کہ صرف حضرت علیؑ کی محبت کافی ہے۔ کیا اگر کوئی شخص کہے میں علیؑ کو دوست رکھتا ہوں اور ولایت علیؑ کا قائل ہو لیکن فعال نہ ہو اور کثرت سے عمل نہ کرتا ہو تو کیا یہ اس کیلئے کافی ہو سکتا ہے؟ اگر کوئی کہے میں رسول خداؐ کو دوست رکھتا ہوں (باوجودیکہ رسولؐ علیؑ سے بہتر ہیں) لیکن رسولؐ کی سیرت پر عمل نہ کرے اور آپؐ کی سنت کی پیروی نہ کرے تو کیا آنحضرتؐ کی محبت سے اس کو کچھ نفع پہنچے گا؟"۔ ۹

طاؤس کی مشہور روایت میں ہے کہ راوی نے سنا کسی طرف سے آہ وزاری کی آواز آ رہی ہے تھوڑی دیر کے بعد آواز رک گئی لگتا تھا کہ تضرع کرنے والا بے ہوش ہو گیا، جب یہ اس کے سرہانے پہنچے تو دیکھا امام زین العابدینؑ تھے۔ انہوں نے حضرتؑ کا سر اپنی گود میں رکھا اور کہنے لگا آپؑ تو فرزند رسولؐ ہیں جگر گوشہ بتولؑ ہیں، بہشت تو آپ ہی کی ہے! اس پر امامؑ نے فرمایا خدا نے جنت اس کیلئے پیدا کی ہے جو اس کا مطیع وفرمانبردار ہو خواہ غلام حبشی ہی کیوں نہ ہو اور جہنم ان لوگوں کیلئے خلق کیا ہے جو نافرمان ہیں چاہے سید قرشی ہوں"۔ ۱۰

یہ وہ چند صریح وواضح احادیث شریفہ ہیں جو بتاتی ہیں کہ ہم اہل دنیا جو جھوٹی امید رکھتے ہیں وہ غلط وباطل اور شیطانی خواہشات ہیں اور عقل ونقل کے مخالف ہیں اور قرآن کی آیات شریفہ، اس کے علاوہ ہیں، مثلاً خداوند کا ارشاد ہے۔ ﴿كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ﴾ ۱؎ ومثلُ قوله تعالى: ﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ☆ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ﴾ ۲؎ ومثلُ قوله تعالى۔ ﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾ ۳؎

اس کے علاوہ دیگر آیات شریفہ ہیں جو تقریباً قرآن کے ہر صفحہ پر موجود ہیں اور ان میں تاویل وتصرّف خلاف ضرورت ہے۔

ان احادیث کے مقابلہ میں دوسری حادیث بھی ہیں وہ بھی معتبر کتابوں میں مذکور ہیں لیکن نوعاً جمع عرفی صحیح رکھتی ہیں ور اگر جمع پسند نہ ہو اور تاویل کے بھی قائل نہ ہوں تو پھر، چونکہ یہ تمام صحیح وصریح اور متواتر حادیث ہیں جو ظواہر قرآن ونصوص فرقان وعقل سلیم وضرورت مسلمین کے تحت ان کی تائید ہوتی ہے اس لئے ان کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے ایک روایت وہ ہے جسے شیخ کلینیؒ نے روایت کی ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ﴿الايمانُ لا يَضُرُّ مَعَهُ عَمَلٌ وكذلك الكُفْرُ لا يَنفَعُ مَعَهُ عَمَلٌ﴾ ۴؎

”ایمان کے ساتھ کوئی بھی عمل مضر نہیں ہے، جیسے کفر کے ساتھ کوئی عمل فائدہ مند نہیں ہے“۔

اسی مضمون کی چند اور حادیث منقول ہیں۔ ۵؎ محدث جلیل علامہ مجلسیؒ نے اس قسم کی روایات میں حمل کیا ہے کہ یہاں ضرر سے مراد جہنم میں دخول یا آتش دوزخ میں ہمیشہ باقی رہنا ہے ۶؎ اور اگر جہنم میں دخول مراد لیا جائے تو یہ برزخ اور مواقف قیامت میں ہونے والے دیگر عذابوں کے منافی نہیں ہے۔

مصنف کا خیال ہے کہ ان روایت کو اس بات پر حمل کیا جا سکتا ہے کہ ان کا مطلب ہے ایمان دل کو اتنا منور کر دیتا ہے کہ بافرض اگر کبھی انسان سے گناہ یا خطا سرزد ہو جائے تو اس نور اور ملکۂ ایمان کی وجہ سے انسان فوراً توبہ کر کے خدا کی طرف رجوع کر لیتا ہے اور خدا و روز قیامت پر ایمان رکھنے والا اپنے عمل کو روز حساب پر نہیں اٹھا رکھتا۔ پس ان روایت کا مطلب ایمان سے تمسک اور اس پر بقا کے جذبے کو اجاگر کر ہے۔ چنانچہ اس کی نظیر جناب موسیٰؑ وخضرؑ کی وہ روایت ہے جو کافی شریف میں مذکور ہے کہ جناب موسیٰؑ نے حضرت خضرؑ سے کہا ”آپ کی فیض صحبت سے میں صاحب شرافت اور محترم ہو گیا لہذا آپ مجھے وصیت فرمائیے تو جناب خضرؑ نے کہا ایسی چیز حاصل کرو جس کے ہوتے ہوئے کوئی اور چیز تجھے نقصان

پہنچا سکے، اسی طرح اس کے سوا کوئی اور چیز تجھے فائدہ نہ پہنچا سکے''۔[18]

ان روایات میں سے ایک وہ ہے جو ابن ریان سے نقل کی ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ''حضرت علیؑ اپنے خطبے میں اکثر فرمایا کرتے تھے لوگو! اپنے دین کی حفاظت کرو اس لئے کہ دین میں رہتے ہوئے گناہ کرنا بے دینی کے نیک عمل سے اچھا ہے۔ دین میں رہتے ہوئے گناہ بخش دیا جائے گا لیکن غیر دین میں رہ کر اس کی نیکی بھی قبول نہ ہوگی''۔

یہ حدیث شریف اور اس جیسی دوسری حدیثیں، مذہب حقہ سے وابستگی پر ترغیب دلاتی ہیں اور اس پر دلالت کرتی ہیں کہ مؤمنین اور دین حق کے پیروؤں کے گناہ بہر حال بخش دیئے جائیں گے، جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ﴿إِنَّ اللهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعاً﴾[19]

اسی لئے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان کے گناہ دوسروں کی نیکیوں سے بہتر ہیں، کیونکہ وہ نیکیاں قبول نہ ہوں گی، بلکہ شاید وہ حسنات جن میں ایمان و ولایت جیسی شرائط قبولیت نہ ہوں خود ان کے اندر ایسی ظلمت و تاریکی ہے جو مؤمنین کے گناہوں کی تاریکی سے کہیں زیادہ شدید ہے، کیونکہ مؤمنین تو اپنے نور ایمان کی وجہ سے خوف و رجا کی حالت میں ہیں (جو ان کے یہاں مفقود ہے)۔ مختصر یہ کہ اس حدیث کی دلالت اس بات پر بہر حال نہیں ہے کہ گنہگار اہل ایمان سے کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا اور یہ مطلب واضح ہے۔

اور ان احادیث میں سے جو مشہور بین الفریقین ہیں، یہ حدیث ہے ﴿حُبُّ عَلِيٍّ حَسَنَةٌ لَا يَضُرُّ مَعَهَا سَيِّئَةٌ وَبُغْضُهُ سَيِّئَةٌ لَا يَنْفَعُ مَعَهَا حَسَنَةٌ﴾[20] ''علیؑ کی محبت وہ نیکی ہے جس کے ساتھ کوئی گناہ ضرر نہیں پہنچا سکتا اور علیؑ کی دشمنی وہ گناہ ہے جس کے ساتھ کوئی نیکی نفع نہیں پہنچا سکتی''۔

یہ حدیث شریف بھی اسی حدیث کی ایک کڑی ہے جس کو ہم ایمان کے سلسلے میں پہلے بیان کر چکے۔ اس حدیث کا مطلب وہی ہے جو علامہ مجلسیؒ نے ذکر فرمایا ہے کہ ضرر سے مراد یہ دخول جہنم یا آتش دوزخ میں ہمیشہ رہنا ہے، یعنی مولائے کائناتؑ کی محبت وہ سرمایۂ ایمان اور تمام و کمال ایمان ہے کہ جس کی وجہ سے شفاعت کرنے والوں کی شفاعت، انسان کو نصیب ہوگی اور وہ دوزخ سے نجات پا جائے گا اور یہ مطلب، جیسا کہ میں نے عرض کیا، برزخ کے گونا گوں عذاب کے منافی نہیں ہے۔ جیسا کہ خود حدیث میں بھی ہے ''تم اپنے برزخ کا انتظام کرو، ہم قیامت میں تمہاری شفاعت کریں گے''[21] یا پھر حدیث کا وہ مطلب ہے جو ہم نے عرض کیا ہے کہ مولاؑ کی محبت دل میں وہ نورانیت اور ملکۂ ایمان پیدا کر دیتی ہے۔

کہ آدمی گناہ سے بچنے لگتا ہے اور اگر کبھی مبتلا ہو بھی گیا تو توبہ وانابت کے ذریعہ اس کی اصلاح کر لیتا ہے، یا تاخیر نہیں کرتا کہ معاملہ ہاتھ سے نکل جائے۔

تفسیر سورۂ فرقان کی آیات کے ذیل میں اسی مضمون کی روایات وارد ہوئی ہیں۔

قال تعالی ﴿وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُونَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ يَلْقَ أَثَامًا ☆ يُضَاعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَيَخْلُدْ فِيهِ مُهَانًا ☆ إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا﴾ ۲۲ ''جو لوگ خدا کا کوئی شریک نہیں قرار دیتے اور نہ ہی جس نفس کو خدا نے قتل کرنا حرام قرار دیا ہے اسے قتل کرتے ہیں، البتہ حق کی صورت میں (جیسے قصاص وغیرہ میں) قتل کرتے ہیں اور نہ ہی زنا کرتے ہیں، وہ خدا کے خاص بندے ہیں، مگر جو لوگ یہ سب کام کریں گے وہ اپنی پوری سزا پائیں گے اور قیامت میں ان پر دگنا عذاب ہوگا اور ذلت ورسوائی کے ساتھ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ہاں! اگر کوئی توبہ کر لے اور ایمان لے آئے اور عمل صالح بجا لائے تو خدا اس کی برائیوں کو نیکیوں سے بدل دے گا اور خدا تو غفور رحیم ہے ہی''۔

اس آیت کے ضمن میں بہت سی روایات نقل کی گئی ہیں مگر میں صرف ایک کو بیان کرتا ہوں، کیونکہ باقی سب معنی ومضمون کے اعتبار سے قریب قریب ایک ہیں

عن الشيخ في أماليه بإسناده عن محمّد بن مسلم الثقفيّ، قال: سألتُ أبا جعفرٍ محمّد بن عليّ عليهما السلام عن قول الله عزّ وجلّ ﴿فأولئك يُبدّلُ اللهُ سيّئاتهم حسناتٍ وكان اللهُ غفوراً رحيماً﴾ فقال عليه السلام ﴿يُؤتى بالمؤمن المذنب يوم القيامة حتّى يقام بموقف الحساب، فيكونُ الله تعالى هو الّذي يتولّى حسابهُ لا يُطلعُ على حسابه أحداً من النّاس، فيُعرّفُهُ ذنوبهُ حتى إذا أقرَّ بسيّئاته قال اللهُ عزّ وجلّ للكتبة بدّلوها حسناتٍ وأظهروها للنّاس فيقولُ النّاسُ حينئذٍ ما كان لهذا العبد سيّئةٌ واحدةٌ ثمّ يأمرُ اللهُ به إلى الجنّة فهذا تأويلُ الآية، وهي في المُذنبين من شيعتنا خاصّةً﴾ ۲۳

''امالی میں محمد بن مسلم سے نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے امام محمد باقرؑ سے قول خدا ﴿فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ﴾ کے بارے میں سوال کیا تو حضرتؑ نے فرمایا: گنہگار

حدیث ۳۳ . . (۲۵۵)

مؤمن کو قیامت کے دن موقف حساب میں لا کر کھڑا کیا جائے گا اور خود خدا اس کا حساب لے گا، اس کے حساب پر کسی شخص کو مطلع نہیں کیا جائے گا۔ مؤمن اپنے گناہوں کو پہچان کر جب اقرار کر لے گا تو خدا، کاتبین سے کہے گا ان گناہوں کو نیکیوں سے بدل دو اور لوگوں کو دکھا دو، اس وقت لوگ کہیں گے یہ ایسا بندہ ہے کہ اس کے دفتر میں ایک بھی گناہ نہیں ہے؟ پھر خدا اس کو جنت جانے کیلئے حکم دے گا۔ یہ ہے آیت کی تاویل اور یہ صرف ہمارے گنہگار شیعوں کیلئے مخصوص ہے۔"

میں نے اس آیت کو اس لئے پورا لکھا اور کلام کو اس لئے طول دیا کہ یہ بہت اہم نکتہ ہے اور بہت سے مقررین عوام کو اس قسم کی روایات کا مطلب غلط سمجھاتے ہیں، حالانکہ ان لوگوں کو ربط آیت کے ذکر کے علاوہ کچھ اور نہیں معلوم ہوتا اس لئے طول کلام کیلئے معذرت خواہ ہوں۔ جو شخص بھی آیت کی ابتدا و انتہا کو غور سے پڑھے گا وہ سمجھ لے گا کہ ہر شخص مطلقاً اپنے اعمال میں گرفتار ہے اور اپنی برائیوں کے بارے میں جوابدہ ہے صرف وہ شخص جس نے ایمان لایا اور توبہ کی اور عمل صالح بجا لایا یعنی یہ تین باتیں اس میں جمع ہو گئیں وہ کامیاب اور الطاف الٰہی کا مستحق اور خدا کی نزدیک محترم ہے، اس کے سارے گناہ نیکیوں میں بدل جائیں گے۔ حضرت امام باقرؑ نے بھی یہی تاویل فرمائی ہے کہ ایسے ہی اشخاص کا موقف حساب اس ترتیب سے ہے، کیونکہ حضرت علیؑ اور ان کی معصوم اولادؑ کی ولایت کے بغیر ایمان حاصل ہی نہیں ہو سکتا، اسی لئے امامؑ نے فرمایا یہ صرف شیعوں کیلئے ہے، بلکہ خدا اور رسولؐ پر ایمان بھی ولایت کے بغیر قبول نہ ہوگا، جیسا کہ اس کے بعد والی فصل میں انشاء اللہ ذکر کیا جائے گا۔ لہٰذا اس آیت اور ان روایات کو بنیادی دلائل میں شمار کرنا چاہئے، اس لئے اگر کوئی مؤمن ہے اور اپنے گناہوں کا ازالہ توبہ و عمل صالح سے نہیں کرتا تو اس آیت میں شامل نہیں ہوگا۔

لہٰذا میرے عزیز! تم کو شیطان دھوکہ نہ دے، خواہشات نفس کے چکر میں نہ پھنسو اس مصنف کی طرح سست، کاہل اور شہوتوں اور محبت دنیا و جاہ و مال میں گھرا ہوا شخص ہمیشہ اپنی سستی کیلئے تاویلیں ڈھونڈھتا رہتا ہے، جو چیز اس کی خواہش اور نفس کے مطابق ہوتی اور شیطانی خیالات کی مؤید ہوتی ہے وہ فوراً اس کو قبول کر لیتا ہے اور اس کیلئے آنکھ کان کھلے رکھتا ہے۔ نہ اس کی حقیقت تلاش کرتا اور نہ ہی اس کے مقدمات و معارضات پر نظر کرتا ہے۔۔۔

بے چارہ محض تشیع اور محبت اہل بیتؑ کے دعوے کی بنا پر ہر حرام کے ارتکاب کو جائز سمجھتا ہے اور خود

باللہ سمجھتا ہے کہ اس کے اعمال نامے پر کچھ نہیں لکھا جاتا ہے۔ وہ بدبخت یہ نہیں سمجھتا کہ شیطان اس کو دھوکہ دے رہا ہے اور آخری عمر میں یہ بھی خطرہ ہے کہ بے مغز و بے فائدہ محبت بھی کہیں اس کے ہاتھ سے نہ نکل جائے ورنہ خالی ہاتھ رہ جائے اور نواصب کی صف میں محشور ہو، کیونکہ جس کے پاس دلیل نہ ہو اس کے محبت کا دعویٰ قابل قبول نہیں ہوتا۔ میں اگر آپ کا مخلص ہوں اور آپ سے محبت کرتا ہوں تو یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ آپ کے تمام اغراض و مقاصد کے خلاف اقدام کروں۔ درخت محبت کا ثمرہ و نتیجہ یہ ہے کہ اس کے مطابق عمل کریں اور اگر وہ ثمرہ نہ ہو تو سمجھنا چاہئے کہ محبت ہی نہیں تھی، صرف محبت کا خیال تھا۔

دیکھئے رسول کرمؐ اور آپؐ کے اہل بیت مکرمؑ تمام عمر احکام و اخلاق و عقائد کی اشاعت میں مشغول رہے۔ ان کا واحد مقصد احکام خدا کی اشاعت اور صلاح بشر تھا اور اس مقدس مقصد کیلئے ہر قسم کے قتل و غارت اور دست و اہانت کو برداشت کیا مگر اپنے عمل سے باز نہیں آئے۔

لہذا ان حضراتؑ کا محب و شیعہ وہی ہے جو ان کے مقاصد میں شریک ہو اور ان کے آثار و احادیث کی پیروی کرے اور روایت میں ایمان کے مقدمات میں جو "زبانی اقرار اور ارکان پر عمل" کو شمار کیا گیا ہے یہ ایک فطری راز اور سنت الٰہی ہے، چونکہ حقیقت ایمان اور عمل لازم و ملزوم ہیں اور عاشق کی فطرت میں ظہور عشق اور شان معشوق میں تغزل لازم ہے۔ اسی طرح ایمان و محبت خدا کے لوازم میں سے عمل کرنا بھی ہے، اگر کوئی عمل نہیں کرتا وہ مومن نہیں ہے ور محبت بھی نہیں رکھتا اور یہ (بے عمل) والا ایمان اور کھوکھلی محبت معمولی حوادث اور رو سے ختم ہو جاتی ہے اور انسان خالی ہاتھ جزائے اعمال کیلئے عالم (آخرت) کی طرف خروج کرتا ہے۔

دوسری فصل

محبت اہلبیتؑ قبولیت اعمال کی شرط

حدیث شریف کے آخر میں، قبولیت اعمال کی شرط ولایت و معرفت ہے اور یہ بات مسلمات، بلکہ مذہب شیعہ کی ضروریات میں سے ہے۔ اس سلسلے میں اتنی روایات ہیں جو اس مختصر کتاب میں نہیں بیان کی جا سکتیں اور وہ حد تواتر سے زیادہ ہیں اور میں تبرکاً بعض کا ذکر کرتا ہوں

عن الكافي باسناده عن أبي جعفرؑ قال: ﴿ذروة الأمر وسنامه ومفتاحه وباب الأشياء ورضى الرحمن، الطاعة للإمام بعد معرفته. اما لو أن رجلاً قام ليله وصام نهاره وتصدق

بجمیع مالہ وحج جمیع دھرہ ولم یعرف ولایۃ ولی اللہ فیوالیہ ویکون جمیع اعمالہ بدلالتہ الیہ، ما کان لہ علی اللہ حق فی ثوابہ ولا کان من اھل الایمان﴾ ۲۴ ''امام محمد باقرؑ نے فرمایا معاملات کی حقیقت اور مغز اور ان کی بلندی اور کنجی، اشیاء کا دروازہ اور خدا کی رضا وخوشنودی، خدا کی معرفت کے بعد امامؑ کی معرفت ہے۔ آگاہ ہو جاؤ! اگر کوئی شخص راتوں کو جاگ کر عبادت کرے، دنوں کو روزہ رکھے، اپنا پورا مال صدقہ کر دے، زندگی بھر حج کرے مگر ولی خدا کی معرفت نہ رکھتا ہو کہ اس سے محبت کرے اور اس کے حکم کے مطابق تمام اعمال بجا لائے تو خدا کے نزدیک اس کیلئے کوئی ثواب نہیں ہے ورنہ وہ اہل ایمان سے ہے''۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ﴿من لم یأت اللہ عز وجل یوم القیامۃ بما انتم علیہ، لم یتقبل منہ حسنۃ ولم یتجاوز لہ سیئۃ﴾ ۲۵ ''جو شخص تم لوگوں کا عقیدہ لے کر قیامت میں نہ آئے تو نہ اس کی کوئی نیکی قبول ہوگی اور نہ کوئی گناہ بخشا جائے گا''۔

وباسنادہ عن ابی عبد اللہ علیہ السلام فی حدیث قال ﴿واللہ لو ان ابلیس سجد للہ بعد المعصیۃ والتکبر عمر الدنیا، ما نفعہ ذلک ولا قبلہ اللہ ما لم یسجد لآدم کما امرہ اللہ عز وجل ان یسجد لہ، وکذلک ھذہ الامۃ العاصیۃ المفتونۃ بعد ترکھم الامام الذی نصبہ نبیھم لھم، فلن یقبل اللہ لھم عملاً ولن یرفع لھم حسنۃ حتی یاتوا اللہ من حیث امرھم ویتولوا الامام الذی امرھم اللہ بولایتہ ویدخلوا من الباب الذی فتحہ اللہ ورسولہ لھم﴾ ۲۶

''امام جعفر صادقؑ نے فرمایا خدا کی قسم! اگر ابلیس لعین تکبر کے بعد دنیا کی عمر کے برابر خدا کا سجدہ کرتا رہتا تو اس کیلئے نہ وہ فائدہ مند ہوتا نہ خدا قبول کرتا جب تک وہ حکم خدا کے مطابق آدمؑ کو سجدہ نہ کر لیتا۔ اسی طرح یہ امت گنہگار اور فتنہ پرور ہے اس امامؑ کو ترک کرنے کے بعد جس کو نبیؐ نے ان کیلئے معین کیا تھا ایسی ہی ہوگی کہ جب تک خدا کے سامنے اس حالت میں نہیں آئے گی جس کا خدا نے حکم دیا ہے اور اس امامؑ کی ولایت کو تسلیم نہیں کرے گی جس کی ولایت کا خدا نے حکم دیا ہے اور جب تک اس دروازے سے نہ داخل ہوگی جس کو خدا اور رسولؐ نے ان کیلئے کھولا ہے اور جب تک وہاں نہ آئے گی جہاں آنے کا حکم دیا گیا ہے، نہ خدا ان کے اعمال قبول کرے گا اور نہ ان کی نیکیاں بلند کرے گا''۔

اس باب میں اور اس مضمون کی روایات بہت زیادہ ہیں اور ان تمام روایات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ

اعمال کا قبول ہونا ولایت سے مشروط ہے، بلکہ ایمان باللہ و نبوت رسول خداؐ کی قبولیت کیلئے بھی یہی شرط ہے۔ لیکن عمل کے صحیح ہونے کیلئے مشروط ہونا، جیسا کہ بعض علماء نے کہا ہے، معلوم نہیں ہے، بلکہ ظاہر یہ ہے کہ شرط نہیں ہے، جیسا کہ بہت سی روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ ان میں وہ روایت بھی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ''جو سنی شیعہ ہو جائے اس پر زکات کے علاوہ کسی بھی گزشتہ عمل کی قضا واجب نہیں ہے۔ زکات کی قضا تو اس لئے ہے کہ گمراہی کے زمانے میں نا اہل کو دے دیا تھا۔ دیگر اعمال کی قضا نہ کرے خدا اس کا اجر دے گا'' ۲۷۔ اور دوسری روایت میں ہے کہ ''دیگر اعمال جیسے نماز، روزہ، حج، صدقہ یہ تم کو مل جائیں گے اور تمہارے پیچھے آئیں گے، لیکن زکات چونکہ نا اہل کو دی ہے لہذا اس کو اس کی جگہ دینا ہوگا'' ۲۸۔

بعض روایت میں ہے ''تمام اعمال جمعرات کے دن رسول خداؐ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں اور روز عرفہ خدا ان کی طرف توجہ دیتا ہے اور سب کو ﴿هباءً منثوراً﴾ بنا دیتا ہے۔ پوچھا گیا کن لوگوں کے اعمال ﴿هباءً منثوراً﴾ قرار دیئے جاتے ہیں؟ فرمایا ہمارے اور ہمارے شیعوں کے دشمنوں کے اعمال''۔ پس یہ روایت اعمال کے عدم صحت اور عدم قبولی پر دلالت کرتی ہے، جیسا کہ واضح ہے۔ بہر صورت یہ بحث ہماری ذمہ داری سے خارج ہے۔

والحمد للہ اولاً و آخراً

توضیحات (۲۳)

۱۔ اصول کافی، ج۲، ص۴۶۳، کتاب ایمان وکفر، باب ان الایمان لا یضر معہ سیئۃ، حدیث ۵
بعض نسخوں میں "ولا زنوا او سرقوا او شربوا" آیا ہے

۲۔ اصول کافی، ج۲، ص۲۳۳، کتاب ایمان وکفر، باب المومن وعلاماتہ، حدیث ۷

۳۔ اصول کافی، ج۲، ص۲۳۳، کتاب ایمان وکفر، باب المومن وعلاماتہ، حدیث ۹۔

۴۔ امالی شیخ طوسی، ج۱، ص۳۸۰

۵۔ اصول کافی، ج۲، ص۷۳، کتاب ایمان وکفر، باب الطاعۃ والتقویٰ، حدیث ۱

۶۔ اصول کافی، ج۲، ص۷۴، کتاب ایمان وکفر، باب الطاعۃ والتقویٰ، حدیث ۳۔

۷۔ اصول کافی، ج۲، ص۷۵، کتاب ایمان وکفر، باب الطاعۃ والتقویٰ، حدیث ۶۔ متن جس میں [illegible] کا مفہوم نقل ہوا ہے۔

۸۔ روضۂ کافی، ج۸، ص۱۸۶، حدیث ۲۰۵۔

۹۔ اصول کافی، ج۲، ص۷۴، کتاب ایمان وکفر، باب الطاعۃ والتقویٰ، حدیث ۳

۱۰۔ بحار الانوار، ج۴۶، ص۸۱ و ۸۲، تاریخ علی بن الحسینؑ، باب ۵، حدیث ۷

۱۱۔ ہر شخص اپنے عمل کے بدلے گروی ہے۔ سورۂ مدثر، آیت ۳۸۔

۱۲۔ جو ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اسے دیکھے گا، اور جو ذرہ برابر بدی کرے گا وہ اسے دیکھے گا۔ سورۂ زلزال، آیت ۷ و ۸

۱۳۔ ہر نفس کیلئے اس کی حاصل کردہ نیکیوں کا فائدہ بھی ہے اور اس کی کمائی ہوئی برائیوں کا نقصان بھی
سورۂ بقرہ، آیت ۲۸۶۔

۱۴۔ اصول کافی، ج۲، ص۴۶۳، کتاب ایمان وکفر، باب ان الایمان لا یضر معہ سیئۃ، حدیث ۳۔

۱۵۔ حوالہ سابق، حدیث ۳ و ۵

۱۶۔ مرآۃ العقول، ج۱۱، ص۳۹۶، کتاب ایمان وکفر، باب ان الایمان لا یضر معہ سیئۃ، حدیث ۲

۱۷۔ اصول کافی، ج۲، ص۴۶۳، کتاب ایمان وکفر، باب ان الایمان لا یضر معہ سیئۃ، حدیث ۲۔

۱۸۔ اصول کافی، ج۲، ص۴۶۴، کتاب ایمان وکفر، باب ان الایمان لا یضر معہ سیئۃ، حدیث ۶۔

۱۹۔ یقیناً خدا تمام گناہوں کو بخشتا ہے۔ سورۂ زمر، آیت ۵۳۔

۲۰ مناقب ج ۳ ص ۱۹۷۔

۲۱ حدیث ۴، حاشیہ ۳۳۔

۲۲ سورۂ فرقان، آیات ۶۸ سے ۷۰ تک

۲۳۔ بحار، ج ۳، ص ۷۰

۲۴۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۱۹، کتاب ایمان و کفر، باب دعائم الاسلام، حدیث پنجم کا کچھ حصہ۔

۲۵ وسائل الشیعہ ج ۱ ص ۹ کتاب الطہارۃ، باب ۲۹، ابواب مقدمۃ العبادات، حدیث ۳۔

۲۶۔ حوالہ سابق ص ۹۲، حدیث ۵۔

۲۷۔ وسائل الشیعہ، ج ۱، ص ۹۷، کتاب الطہارۃ، باب ۳۱، ابواب مقدمۃ العبادات، حدیث

۲۸۔ وسائل الشیعہ، ج ص ۹۷، کتاب الطہارۃ، باب ۳۱، ابواب مقدمۃ العبادات، حدیث ۱۔

۲۹۔ بحار الانوار، ج ۲۳، ص ۳۳۵، کتاب الامامۃ، باب ۲۰، حدیث ۲۷

چونتیسویں حدیث

بالسَّنَدِ المُتَّصِلِ إلىٰ ثقةِ الإسلامِ مُحَمَّدِ بنِ يعقوبَ الكُلَيْنِي قُدِّسَ سِرُّهُ عن عِدَّةٍ مِن أصحابِنا، عن أحمدَ بنِ مُحَمَّدِ بنِ خالدٍ، عن إسماعيلَ بنِ مِهرانَ، عن أبي سعيدٍ القمّاطِ، عن أبانِ بنِ تغلبَ، عن أبي جعفرٍ عليه السلام قال:

﴿لمّا أُسْرِيَ بالنّبيِّ صلى الله عليه وآله قال: يا ربِّ! ما حالُ المُؤمنِ عندكَ؟ قال: يا مُحمَّدُ مَنْ أهانَ لي وليّاً فقد بارَزَني بالمُحارَبةِ وأنا أسرعُ شيءٍ إلى نُصرةِ أوليائي، وما تردَّدتُ في شيءٍ أنا فاعِلُهُ كتردُّدي في وفاةِ المؤمنِ يكرهُ الموتَ وأكرهُ مساءَتَهُ.

وإنَّ مِنْ عبادي المُؤمنينَ مَن لا يُصلِحُهُ إلّا الغِنى، ولو صرفتُهُ إلى غيرِ ذلكَ لهلكَ. وإنَّ مِنْ عبادي المُؤمنينَ مَنْ لا يُصلِحُه إلّا الفقرُ، ولو صرفتُهُ إلى غيرِ ذلكَ لهلكَ. وما يتقرَّبُ إليَّ عبدٌ مِنْ عبادي بشيءٍ أحبَّ إليَّ ممّا افترضتُ عليهِ، وإنّهُ ليتقرَّبُ إليَّ بالنّافلةِ حتّى أُحِبَّهُ، فإذا أحببتُهُ كنتُ إذاً سمعَهُ الّذي يسمعُ بهِ وبصرَهُ الّذي يُبصِرُ بهِ ولسانَهُ الّذي ينطقُ بهِ ويدَهُ الّتي يبطشُ بها، إنْ دعاني أجبتُهُ، وإنْ سألني أعطيتُهُ﴾

ترجمہ: حضرت امام محمد باقرؑ نے فرمایا جب رسول خداؐ کو شب معراج بیت المقدس تک لے جایا گیا تو آپؐ نے عرض کیا خدایا! مومن کی قدر و منزلت تیرے نزدیک کیا ہے؟ جواب آیا اے محمدؐ! جو میرے کسی دوست کی توہین کرے وہ مجھ سے جنگ کیلئے آمادہ ہو گیا ہے اور میں ہر چیز سے زیادہ جلدی اپنے دوستوں کی مدد کرتا ہوں۔ میں جو بھی کام کرتا ہوں ان میں کبھی اس طرح متردد نہیں ہوتا جس طرح ک

مومن کی موت میں متردد ہوتا ہوں جو موت کو ناپسند کرتا ہو اور میں اس کو تکلیف پہنچانے کو ناپسند کرتا ہوں۔

میرے بندوں میں بعض ایسے ہیں جن کی اصلاح دولتمندی اور بے محتاجی کے علاوہ کچھ نہیں ہے اگر میں اس کو کسی اور طرف موڑ دوں تو وہ ہلاک ہو جائے۔ (اسی طرح) بعض بندوں کی اصلاح ان کی غربت میں ہے، اگر اس کو کسی اور طرف موڑ دوں تو وہ ہلاک ہو جائے گا۔

میرے بندوں میں سے کوئی بھی بندہ مجھ سے تقرب حاصل نہیں کر سکتا ان فرائض سے زیادہ کسی محبوب شئے کے ذریعے جن کو میں نے اس کیلئے واجب قرار دیا ہے (بندے کو مجھ سے قریب کرنے والی اشیا میں فرائض سب سے زیادہ پسندیدہ شئے ہے) اور میرا بندہ نوافل کے ذریعہ بھی تقرب حاصل کرنا چاہتا ہے یہاں تک کہ میں اس کو چاہنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کا وہ کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی وہ آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کی وہ زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے اور اس کا وہ ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ (شی کو) پکڑ لیتا ہے۔ اگر وہ مجھے پکارتا ہے تو جواب دیتا ہوں اور اگر سوال کرتا ہے تو عطا کرتا ہوں"۔

شرح "أسري" فعل مجہول ہے اس کے معنی رات کو سفر کرانا ہیں۔ جوہری نے کہا ہے: "سريتُ سرى ومسرىً وأسريتُ بمعنى اذا سرت ليلاً وبالألف، لغة اهل الحجاز" اس وقت بولا جاتا ہے جب تم رات کو سفر کرو اور "الف" کے ساتھ اہل حجاز کی لغت ہے۔ انتہی

اس بنا پر رات کے سفر کو "اسراء" کہیں گے تو پھر آیت معراج ﴿سُبْحانَ الَّذي أَسْرى بِعَبْدِه لَيلاً﴾[2] میں "ليلاً" کی قید لگانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا نکرہ ہونا اس بات پر دلالت کرے کہ اسراء کی مدت بہت کم تھی جبکہ مسجد الحرام اور مسجد اقصیٰ کا فاصلہ چالیس رات کا ہے، جیسا کہ شیخ بہائیؒ نے فرمایا ہے[3] یا پھر اسی مطلب کیلئے مبنی بر تجرید ہے اور "أسري بالنبيّ" حذف کر دیا گیا ہے اور باقی متعلقات بھی معہود ہونے کی وجہ سے محذوف ہیں، یعنی "أسري به الى مقام القُرب" (اسے رات کے وقت مقام قرب کی طرف لے جایا گیا)۔

"ما حال المؤمن؟" یعنی مومن کی قدر و منزلت تیرے نزدیک کیا ہے؟

"من اهان لي وليّاً" اهانهٗ اي استخفّ به، واستهان به وتهاون فيه، اي استحقره يقال رجلٌ فيه مهانةٌ، اي ذلٌّ وضعفٌ[4] اہان کے معنی ہیں کسی کو ذلیل و حقیر کرنا (یا) ذلیل و حقیر شمار

کرنا، کسی سے بے ہے ''سهل به''، یعنی اس کو حقیر سمجھا۔ بولا جاتا ہے ''رجل فیه مهانه'' یعنی وہ شخص ذلیل وکمزور ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اس کا مطلب ذلیل وخوار اور حقیر سمجھنا ہے اور بظاہر ظرف لغو، یعنی اہانت کے متعلق ہے اس وقت ترجمہ یہ ہوگا ''جو مومن کی اہانت اس کے ایمان پر خدا اور خدا کی وجہ سے کرے'' اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''ولیاً'' سے متعلق ہو تو پھر اس وقت ترجمہ یہ ہوگا ''جو میرے ولی اور دوست کی اہانت کرے چاہے جس وجہ سے بھی ہو'' اور ولی کا مطلب دوست ومحب کا ہوگا۔

''بارزني'' ''برز الرجل يبرز بروزا'' اسی طرح اس کا مطلب خروج کرنا ہے اور یہاں پر محاربہ ومقابلہ اور جنگ کیلئے نکلنا یا اس کا اظہار کرنا مراد ہے۔

''مساءته'' یہ ''ساءه'' کا مصدر میمی ہے جس کے معنی کراہت دلانے کے ہیں۔

''انّ من عبدي من لا يصلحه الا الغنى'' محقق شیخ بہائی فرماتے ہیں ''نحوی قاعدے کے مطابق ''من لا يصلحه'' موصول کو مبتدا، اسم ان، اور ''من عبدي'' جار ومجرور کو خبر ہونی چاہیے، اس وقت ترجمہ یہ ہوگا کہ خدا خبر دے رہا ہے کہ ''بعض لوگ جن کی اصلاح غربت کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں کرسکتی وہ میرے بعض بندے ہیں'' ظاہر ہے کہ یہ مقصد نہیں ہے، بلکہ مقصد اس کے برعکس ہے (میرے بعض بندے ایسے ہیں جن کی اصلاح غربت ہی پر موقوف ہے)۔ لہذا بہتر ہے کہ ظرف کو اسم قرار دیں اور موصول کو خبر، یہ بات اگرچہ روایت سے ہٹ کر ہے مگر بے نظیر نہیں ہے، جیسے کہ بعض علماء نے ﴿ومن الناس من يقول آمنا بالله وباليوم الآخر وما هم بمؤمنين﴾ میں بھی احتمال دیا ہے۔ انتہی کلامہ۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس قسم کے مقامات میں مبتدا محذوف ہو اور جار حذف پر دلالت کرتا ہو، اس صورت میں نحوی قاعدے کی بھی خلاف ورزی نہ ہوگی اور صاحب کشاف سے نقل کیا گیا ہے کہ ''جار ومجرور کو مبتدا کی تاویل میں قرار دیں گے'' بے اس بنا پر کسی تاویل کی ضرورت نہیں ہے۔

یہاں پر ایک سوال کی گنجائش تھی کہ جو لوگ نظام اتم اور تقاضائے تجلی الٰہی سے ناواقف ہیں وہ یہ سوال کرسکتے ہیں کہ جب بندۂ خدا کی اپنے پروردگار کے نزدیک اتنی عظمت ہے تو وہ غربت وہلاکت میں کیوں مبتلا ہے؟ اگر دنیا کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے تو بعض اتنے دولتمند اور بعض اتنے غریب کیوں ہیں؟ اس پیدا ہونے والے احتمالی سوال کا جواب دیا جا رہا ہے کہ میرے بندوں کے حالات اور ان کے دلوں کے حالات مختلف ہیں، بعض کا علاج غربت کے علاوہ کچھ بھی نہیں اس لئے اس کی اصلاح حال کی خاطر اس کو غریب بنا

دیا گیا اور بعض کی اصلاح بے نیازی اور دولت پر موقوف تھی اس لئے ان کو مالدار بنایا گیا اور یہ دونوں باتیں مؤمن کی کرامت اور خدا کے نزدیک اس کی قدر و منزلت ہیں۔

''وَمَا يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ عَبْدٌ مِنْ عِبَادِي'' یہ جملہ اور اس کے بعد والے جملے کا ذکر کامل ترین مؤمنین کے تقرب کا بیان ہے، گویا جب رسول خدا ؐ سے مؤمنین کا حال بیان کیا گیا، اس طرح ابتدا و اختتام ہوتا ہے کہ پہلے اجمالاً مطلق مؤمنین کا حال بیان کیا جاتا ہے کہ جو ان کی اہانت کرے گا اس نے مجھ سے جنگ چھیڑ دی اس کے بعد مؤمنین کی دو قسمیں بیان کی جاتی ہیں، بلکہ اہل معرفت کے حساب سے تین قسمیں کی جاتی ہیں

پہلی قسم ''مَا تَرَدَّدْتُ فِي أَمْرٍ'' سے شروع ہو کر ''مَا يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ'' تک عام مؤمنین سے متعلق بیان ہے۔ عام مؤمنین ہی موت سے کراہت کا ظہار کرتے ہیں اور غربت و امارت نہیں کے دلوں میں تغیر پیدا کرتی ہیں، یہ دونوں صفت کامل ترین مؤمنین میں نہیں پائی جاتیں، بلکہ عام اہل ایمان میں پائی جاتی ہیں۔ اس مطلب کے بعد ب ظاہر حدیث پر نہ کوئی اعتراض ہے اور نہ یہ اس بات کی منافی ہے کہ خالص مؤمن موت سے کراہت کا ظہار نہیں کرتا، چنانچہ احادیث شریف سے معلوم ہوتا ہے، اور نہ اس جواب کی ضرورت ہے جس کو علامہ شیخ بہائیؒ نے شیخ شہیدؒ کے حوالے سے نقل کیا ہے، اگر آپ کا جی چاہے تو شیخ بہائیؒ کی کتاب اربعین ملاحظہ فرمایئے۔

دوسری قسم ''مَا يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ عَبْدٌ'' سے آخر حدیث تک کامل ترین مؤمنین سے متعلق ہے، لیکن اہل معرفت کے نزدیک یہ سب فقرے دو گروہوں سے متعلق ہیں

ایک گروہ تو وہ ہے جو فریضہ کے ذریعے خدا سے قریب ہوتا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو نافلہ کے ذریعہ تقرب حاصل کرتا ہے اور حدیث کے ذیل میں انہیں کے مقام کی طرف اشارہ ہے اور ان کے تقرب کا نتیجہ ہے۔ ہم انشاء اللہ اس کے بعد اجمالاً دونوں مقامات کی طرف اشارہ کریں گے۔

''بطش'' جوہری کا کہنا ہے: ''البطشة السطوة و الاخذ بالعنف وقد بطش به يبطش بطشا'' لیکن یہاں پر مطلق گرفت مراد ہے، بلکہ ظاہراً استعمال بھی شاید مطلق ہی میں ہے۔

شیخ محقق بہائیؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے اور یہ ان احادیث میں ہے جو عامہ و خاصہ میں مشہور ہے، تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ عامہ نے اس حدیث کو اپنی صحاح میں نقل کیا ہے، اس کے

بعد آپ ؒ نے عامہ کی صحاح سے اس حدیث کو تھوڑے سے تفاوت کے ساتھ نقل فرمایا ور کتاب ربعین کے حاشیہ پر فرمایا ہے ''اس حدیث کی سند میں جو لوگ ذکر کئے گئے ہیں ان میں سے ایک ''علی بن براہیم'' بھی ہیں اور سی عتبار سے یہ روایت صحیح ہے اور عامہ نے اس حدیث کو صحیح طریقے سے نقل کیا ہے اور یہ حدیث اہل اسلام کے نزدیک متفق علیہ اور مشہور حدیثوں میں سے ہے۔ نتہی۔

پہلی فصل:

خدا کیطرف تردد کی سبب کی توجیہات

اس سے پہلے بعض حدیثوں کی شرح میں ہم نے مومنین کی توہین کی وضاحت کر دی ہے۔ لہذا یہاں تکرار نہیں کریں گے، البتہ بعض دوسرے جملوں کی تشریح کروں گا

اس حدیث شریف میں جو خدا کی طرف تردد کی نسبت دی گئی ہے (یا) سی طرح بعض دیگر مور جو صحیح حدیثوں میں، بلکہ قرآن میں مذکور ہیں (مثلاً) مداء، امتحان وغیرہ جو خدا کی طرف منسوب ہیں ان کے بارے میں علماء نے اپنی آراء کا اظہار کیا ہے اور ہر ایک نے اپنے مسلک و مشرب کے اعتبار سے اس کی توجیہ وتاویل کی ہے، چنانچہ شیخ بہائی ؒ نے بھی اپنی کتاب ربعین میں اس کی تین توجیہات بیان کی ہیں جن کی طرف میں مختصراً اشارہ کرتا ہوں

ول یہ کہ کلام میں اضمار ہے، یعنی اگر میرے لئے تردد جائز ہو۔

دوم یہ کہ چونکہ جس کا لوگ حترام کرتے ہیں ان کے ساتھ بے دبی کرنے میں وہ شک وتردید کا شکار ہوتے ہیں، لیکن دوسروں کے بارے میں وہ یسا نہیں کرتے، اس لئے ہوسکتا ہے بطور ستعارہ احترام سے بارے میں تردد کا ستعمال کیا ہو ور مقصد یہ ہو کہ مؤمن کی طرح کوئی بھی مخلوق ہماری نظر میں قدر و حترام نہیں رکھتی۔

سوم جیسے کہ حدیث میں بھی ہے، خداوند عالم، مرتے وقت بندہ مؤمن کیلئے بشارت اور نعمتوں کا ظہار کرتا ہے تا کہ موت سے اس کی کراہت زائل ہوجائے ور دار قرار کی طرف سے میں رغبت پید ہوجائے، پس اس حالت کی تشبیہ اس شخص کی حالت سے فرمائی ہے جو اپنے دوست کو تکلیف پہنچانے کا رادہ رکھتا ہے صرف اس لئے کہ اس کے بعد اس دوست سے بڑا فائدہ پہنچے ور وہ شخص اس بات میں شک وتردید

کرنے لگے کہ اپنے دوست کو کس طرح ایسے رنج پر آمادہ کرے جس میں اس کی تکلیف واذیت کم ہو؟ اس لیے ہمیشہ ترغیب دینے والی چیزوں کا اظہار کرتا ہے تاکہ وہ اس کو قبول کرے۔ انتہی ۱۳

عرفانی توجیہ

لیکن اس سلسلے میں اور اس جیسے دیگر ابواب میں حکما اور عرفا کا طریقہ دوسرا ہے تاہم چونکہ وہ طریقہ ذہنوں سے بہت دور ہے اس لئے اس سے متعلق تفصیل بیان نہ کروں گا اور نہ اس کے مقدمات کا ذکر کروں گا، بلکہ صرف اس چیز کا ذکر کروں گا جو کسی حد تک اعتبار کے قریب اور ذوق کے موافق ہو۔

یہ بات جان لینی چاہیے کہ تمام مراتب وجود، روح ملکوت کی غایت اور جبروت کی چوٹی کی انتہا سے لے کر عالم ظلمت وہیولی کی انتہائے نہایت تک سب کے سب جمال وجلال حق کے مظاہر اور تجلیات ربوبیت کے مراتب ہیں۔ کسی بھی مخلوق کو ذاتی استقلال حاصل نہیں اور یہ محض ذات حق علی الاطلاق سے یک ربط وتعلق ہے۔ اور وہ عین فقر واحتیاج ہے، اور یہ سب بلا استثنا امر حق کے تابع اور حکم الٰہی کے مطیع ہیں اور اس مطلب کی طرف متعدد آیات قرآنی میں ارشاد موجود ہے، مثلاً ارشاد خدا ہے ﴿وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی﴾ ۱۴ "(اے رسول!) جب تم نے تیر مارا تو تم نے کچھ نہیں مارا، بلکہ خود خدا نے تیر مارا ہے" یہ اثبات ونفی، مقام "فرق بین الامرین" کی طرف اشارہ ہے، یعنی اے رسول! آپ نے کنکریاں پھینکیں، لیکن درعین حال مستقل طور پر بذات خود آپ نے کنکریاں نہیں پھینکیں، بلکہ قدرت حق کا ظہور آپ کے آئینے میں ہوا اور نفوذ قدرت الٰہی آپ کے ملک وملکوت میں واقع ہوئی ہے، پس اے رسول! آپ تیر پھینکنے والے ہیں اور عین اسی حال میں خدا تیر پھینکنے والا ہے، اور اس کی مثال وہ آیات شریفہ ہیں جو سورۂ کہف میں جناب موسیٰ وخضر کے قصے میں مذکور ہیں جس میں جناب خضر نے اپنے اعمال کے اسرار کو بیان فرمایا ہے ایک جگہ پر کشتی میں نقص پیدا کردینے کی نسبت اپنی طرف دی ہے اور دوسری جگہ جو منزل کمال تھی، اس کی نسبت خدا کی طرف دی ہے اور تیسری جگہ، دونوں نسبت کو ثابت کیا ہے، ایک جگہ فرمایا ﴿فاردت﴾ "میں نے ارادہ کیا" اور دوسری جگہ فرمایا ﴿فاراد ربک﴾ "تمہارے رب نے ارادہ کیا" اور تیسری جگہ ارشاد فرمایا ﴿فاردنا﴾ "ہم نے ارادہ کیا" اور یہ سب صحیح ہے۔ ۱۵

اسی طرح ہے خداوند عالم کا یہ ارشاد ﴿اللہ یتوفی الانفس حین موتہا﴾ ۱۶ "خدا ہی لوگوں کے

مرنے کے وقت ان کی روحیں (اپنی طرف) کھینچ لیتا ہے" حالانکہ ملک الموت نفوس کی وفات پر موکل ہیں۔ (اسی طرح) خدا نے ہدایت و گمراہی کی نسبت اپنی طرف دی، مثلاً ﴿یضل من یشاء ویهدي من یشاء﴾۱۷ "خدا جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے" حالانکہ جبرئیل ہادی ہیں اور رسول اکرمؐ ہادی ہیں ﴿إنما أنت منذر ولكل قوم هاد﴾۱۸ "(اے رسول!) تم تو صرف (خوف خدا سے) ڈرانے والے ہو اور ہر قوم (کیلئے) ایک ہدایت کرنے والا ہے" اور شیطان گمراہ کرنے والا ہے۔ اسی طرح ہے نفخۂ الٰہیہ، حضرت اسرافیل کے صور میں پھونکا جائے گا۔

ایک اعتبار سے اسرافیلؑ، عزرائیلؑ، جبرئیلؑ، حضرت محمدؐ، تمام انبیاءؑ اور تمام عالم تحقق کچھ نہیں جو مُلک مَلِکِ علی الاطلاق اور خدا کے ارادۂ نافذہ کے مقابلہ میں کسی چیز کی نسبت ان کو دی جائے۔ یہ سب مظاہر قدرت اور ارادۂ حق ہیں ﴿هو الذي في السماء إله وفي الأرض إله﴾۱۹ "وہی زمین میں بھی خدا ہے اور آسمان میں بھی خدا ہے"۔

اور ایک اعتبار سے یعنی نظر کثرت اور اسباب و مسببات کا رویت نگاہ سے، تمام اسباب اپنی جگہ پر درست ہیں اور نظام اتم میں ایک اعظم ترتیب کے ساتھ بترتیب مسببات پر اسباب کے ساتھ ان کا ربط ہوتا رہتا ہے کہ اگر ایک معمولی سے سبب یا واسطے کو اس کے کام سے روک دیا جائے تو دائرۂ وجود کی گردش رک جائے گی اور معین واسطوں کے ذریعے گر حادث (مخلوق) کا ثابت (خدا) سے ربط رہتا ہے تو فیض الٰہی و رحمت خدا ٹھہر جائے اور اگر کوئی شخص معین مقدمات و مبانی کے ساتھ اپنی جگہ پر خصوصاً بڑے عرفاء کی کتابوں کو اور فلسفہ میں ملا صدرا۲۰ کی کتابوں کا مطالعہ کرکے اس تیرہ یعنی مشرب کا ادراک کرے اور مقام قلب تک پہنچا دے تو یہ دروازے اس پر منکشف ہو جائیں گے اور وہ سمجھ لے گا کہ عرفانی تحقیق کے مرحلہ میں یہ تمام نسبتیں صحیح ہیں، اس میں مجاز کا شائبہ بھی نہیں ہے، جیسے کہ بعض وہ ملائکہ جو خود مومنین پر اور ان کی قبض ارواح پر موکل ہیں، جب خدا کے سامنے مومنین کے بلند مقامات کو دیکھتے اور مومنین کی طرف سے (موت کی) کراہت کو دیکھتے ہیں تو ان کے نزدیک ترین اور شک و تردید کی حالت پیدا ہو جاتی ہے اسی حالت کی خدا نے اپنی طرف نسبت دی ہے۔ جیسے اصل موت دینے کے عمل اور ہدایت و گمراہی کی نسبت اپنی طرف دی ہے اور جس طرح عرفانی مسلک کی بنا پر وہ صحیح ہے، یہ بھی صحیح ہے۔ لیکن اس مسلک (عرفانی) کا ادراک حسن طبع اور لطافت و سلامت ذوق پر موقوف ہے۔ ﴿والله العالم والهادي﴾

یہ بات بھی جان لینی چاہئے کہ چونکہ حقیقت وجود میں حقیقت کمال وتمام ہے، کسی بھی قبیح یا نقص کی نسبت خدا کی طرف نہیں دی جاسکتی اور نہ وہ قابل جعل ہے، جیسا کہ اپنی جگہ مقرر اور ثابت ہے۔ اسی لئے فیض جتنا بھی افق کمال سے نزدیک ہوگا اور ضعف وفتور سے مبرا ہوگا، حق کے ساتھ اس کا رابطہ اتم اور ذات حق کی طرف اس کی نسبت صحیح ہوگی اور جس قدر ظلمت تعین وعدم کا غلبہ ہوگا اور حدود ونقائص زیادہ ہوں گے تو اسی قدر خدا سے ربط ناقص اور نسبت بعید ہوگی۔ اسی لئے اہل اخبار کو شریعت کی زبان میں حق سے زیادہ تر نسبت دیتے ہیں اور اقوال تجدّدی ملکی کی نسبت کم دیتے ہیں اور اگر کسی کی آنکھیں کھلی ہوں، دل بیدار ہو اور وہ نقص کو کمال سے، برائی کو بھلائی سے اور قبیح کو حسن سے تمیز دے سکتا ہو تو باوجودیکہ تمام عالم تحقق، تجلی فعلی حق ورائی کی طرف منسوب ہے، وہ سمجھ سکتا ہے کہ ذات مقدس خداوند کے تمام افعال، جمیل وکامل ہیں اور نقص وقبیح کی کسی بھی قسم کی نسبت اس کی طرف دی نہیں جاسکتی، بلکہ اس کا انتساب عرضی ہے، جیسا کہ حکما کی زبان پر شائع اور حکمت کی ابتدائی تعلیم میں رائج ہے۔ اس جگہ کچھ اشتباہات بھی ہیں مگر ان سے روگردانی کرنا بہتر ہے۔

اس نکتے کے بیان کرنے کے تین مقاصد ہیں

ایک تو یہ کہ بعض برے خیالات کا ازالہ ہو جائے جو ممکن ہے معارف سے عاری، جاہل شخص کو پیش آئیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ تردید اور دعوی کی ترجیح چونکہ بعض ملکوتیوں کی طرف سے بھی ہوتی ہے اس لئے حق سے ان کی نسبت ان امور سے اتم ہیں جو اس عالم میں واقع ہوتے ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ حقائق کی معرفت رکھنے والے شخص کو چاہئے کہ اس تردید اور ترجیح دواعی میں کمال ونقص کی جہات میں فرق کو سمجھنے کے بعد جہت کمال کو حق کی طرف منسوب سمجھے اور جہت نقص کو سلب کرے۔

تتمہ اس حدیث کی دوسری توجیہ

اس مقام پر حدیث شریف کی ایک دوسری توجیہ بھی ہے جو ماضی میں میرے ذہن میں آئی تھی اور وہ یہ ہے کہ بندگان خدا کی تین قسمیں ہیں

۔عرفاواولیاء یہ حضرت سیرالی اللہ کے ذریعے ارباب قلوب کی صف میں شامل ہیں۔ یہ گروہ مجذوب حق ورائی ہے جو بے مثال کے شیفتہ ہیں اور ان کی امیدوں کا مرکز اور توجہ کا قبلہ صرف ذات پروردگار

ہے، وہ خدا کے علاوہ پوری کائنات میں کسی کی طرف حتیٰ اپنے اور اپنے کمال کی طرف بھی نظر نہیں رکھتے ہیں۔

۲۔ خالص دنیا دار جو زیبائش دنیا وحب جاہ و مال کی تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں ان کے قلوب کی پوری توجہ اپنی ذات و انانیت کی طرف ہے اور عالم قدس و محفل انس پر نظر نہیں رکھتے ﴿وھم لملحدون فی اسماء اللہ﴾۔۲۱

۳۔ مومنین کی جماعت: یہ لوگ اپنے نور ایمان کے اعتبار سے عالم قدس کی طرف متوجہ ہیں اور اس عالم کی طرف توجہ کی کمی کے مطابق موت سے کراہت رکھتے ہیں۔ خداوند عالم نے اس کو ملکی و ملکوتی، الٰہی و خلقی اور آخرتی و دنیاوی کشش کے اعتبار سے تردد سے تعبیر فرمایا ہے۔ چنانچہ مسئلے کے دونوں فریق میں اس جذب دنیا کی وجہ سے تردد ہے، گویا کہ خداوند عالم نے فرمایا: "مخلوقات میں سے کسی بھی مخلوق میں وہ ملکی وملکوتی کشش نہیں ہے جو مومن کے یہاں ہے۔ ایک طرف تو وہ عالم ملک (دنیا) کی طرف توجہ رکھنے کی وجہ سے موت سے کراہت رکھتا ہے اور دوسری طرف جاذبہ الٰہیہ اس کو اپنی طرف کھینچتا ہے تاکہ اس کو کمال تک پہنچا سکے" لہٰذا خداوند عالم اس کی جانب سے موت کی ناپسندیدگی کا ذکر کرتا ہے، جس کا مطلب ہے وہ ملک میں باقی رکھنا پسند کرتا ہے جبکہ موت کو ناپسند کرتا ہے۔ لیکن دوسرے لوگ اس طرح نہیں ہیں، کیونکہ اولیاء ملکی کشش ہی نہیں رکھتے اور خالص دنیادار لوگ ملکوتی کشش نہیں رکھتے ہیں اور خدا کی طرف اس کشش کی نسبت دینا اسی طرح ہے جو پہلے بیان ہو چکا ہے۔

یہاں پر محقق کبیر میر باقر داماد اور ان کے شاگرد رشید۲۲ کی تحقیقات۲۳ رکھتے ہیں جن کا ذکر سبب طوالت ہے۔

دوسری فصل

مومنین کی اصلاح عزت و امارت کے ذریعے

اس حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ "میرے بعض بندوں کی اصلاح غربت کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں کر سکتی، اگر میں ان سے غربت لے لوں تو وہ ہلاک ہو جائیں گے۔ اسی طرح بعض کی اصلاح دولتمندی اور بے نیازی پر موقوف ہے، اس کے بغیر وہ ہلاک ہو جائیں گے" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم مومنین کو جو کچھ بھی دیتا ہے چاہے وہ دولتمندی ہو یا غربت، صحت ہو یا بیماری، امن ہو یا بے امنی یا دیگر

امور اور وہ سب مؤمنین کی اصلاح کیلئے اور ان کے دلوں کو خالص اور پاک کرنے کیلئے ہوتا ہے۔

یہ حدیث شریف ان دیگر کثیر حدیثوں کے منافی نہیں ہے جن میں آیا ہے کہ مؤمنین کو بیماریوں، درد و رنج، غربت اور فاقہ کشی اور دیگر مصائب میں مبتلا کر کے خدا ان کا شدید امتحان لیتا ہے، کیونکہ خدا اپنی وسیع رحمت اور ہمہ گیر فضل و کرم کی وجہ سے ایک معالج طبیب اور ہمدرد تیماردار کی طرح ہے جو ہر شخص کو الگ طریقے سے دنیا سے بچاتا ہے، (مثلاً) کبھی کسی کو مالدار بنا کر اس کے ایمان کے ضعف و شدت اور نقص و کمی کے اعتبار سے دیگر بلاؤں میں مبتلا کرتا ہے، بلکہ اس کی دولت و امارت کو اس طرح بلاؤں کے گھیرے میں قرار دیتا ہے کہ اس کو دنیا اور حب دنیا سے متصف کر دے۔ اب اگر خدا اس کو غریب بنا دیتا تو ہوسکتا تھا وہ سعادت کا معیار، مال و منال کو قرار دے کر دنیا کی طرف متوجہ ہو جاتا اور دنیا کے حصول کے سلسلے میں اپنے کو ہلاکت ابدی میں ڈال دیتا۔ لیکن جب دنیا اس کے حوالے کر کے اس کو زحمتوں اور صدموں کے جھنور میں ڈال دیا تو یہ چیز دنیا سے متنفر بنانے کیلئے کافی ہے۔ ہمارے ایک بزرگ متعدد بیویاں رکھنے کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ "انسان سمجھتا ہے کہ یہ دنیا میں داخل ہونے اور اس کی طرف متوجہ ہونے کا راستہ ہے لیکن جب اس میں خود مبتلا ہوتا ہے تو سمجھتا ہے کہ یہی وہ سب سے بڑی چیز ہے جو انسان کو دنیا سے متنفر کر دیتی ہے"۔

اس لئے خدا کبھی مؤمنین کو غربت میں مبتلا کر کے ان کی اصلاح کرتا اور ان کے دلوں کو دنیا سے پھیر دیتا ہے اور کبھی اس کو مالدار بنا کر دولت و ثروت میں مبتلا کر دیتا ہے، اور عین اس حال میں جب لوگ اس کے بارے میں خیال کرتے ہیں کہ یہ تو عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہا ہے، وہ زحمت و تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے اور ساتھ ہی اس بات میں کوئی منافات نہیں ہے کہ غریب مسلمانوں کا مقام خدا کے نزدیک بلند ہو، جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ اس بات کے تھوڑے حصہ کی شرح ہم سابقہ حدیثوں کی شرح میں کسی حدیث کے ضمن میں کر چکے ہیں۔[۲۴]

تیسری فصل

واجبات ونوافل کا سبب تقرّب ہونا

اور اہل ذوق وسلوک کی روش کے اعتبار سے ان کے نتائج

سالک الی اللہ اور نفس کے تاریک گھر سے کعبۂ حقیقی تک سفر کرنے والے کیلئے ایک سفر روحانی اور

سلوک عرفانی ہوتا ہے جس کی ابتدا نفس اور انانیت سے ہوتی اور اس کی منزلیں مراتب تعینات آفاقی و نفسی و ملکی و ملکوتی ہیں جن کو نورانی و ظلمانی حجب کہا جاتا ہے

﴿انّ للّٰہ سبعین الف حجاب من نور و ظلمۃ﴾[۲۳] "خدا کیلئے نور و ظلمت کے ستر ہزار حجب ہیں" یعنی انوار وجود و ظلمات تعین (کے حجب) یا انوار ملکوت و ظلمات ملک (کے حجابات) اور نفس سے متعلق امور کی ظلمانی آلودگیوں اور دل سے تعلق رکھنے والی پاک و پاکیزہ روشنیوں (کے حجابات) اور ان ستر ہزار نوری و ظلمانی حجابوں کی تعبیر کبھی سات حجابوں سے کی جاتی ہے۔ چنانچہ نماز کی تکبیرات افتتاحیہ کے سلسلے میں ائمہ معصومین سے منقول ہے کہ "ہر تکبیر ایک حجاب کو چاک کرتی ہے"[۲۶] اور خاک شفا پر سجدہ کرنے کے سلسلے میں آیا ہے "خاک شفا پر سجدہ کرنا ساتوں حجابوں کو چاک کر دیتا ہے"[۲۷] ایک مشہور عارف کا کہنا ہے

ھفت شھر عشق را عطار گشت   ما ھنوز اندر خم یک کوچہ ایم[۲۸]

یہ حجابات چھوٹے انسان کے اندر لطائف سبعہ سے تعبیر کئے گئے ہیں[۲۹] اور کبھی ان کو تین کلی حجاب میں منحصر کیا گیا ہے[۳۰] آفاق کی تعبیر "عوالم ثلاثہ"[۳۱] اور انفس کی "مراتب ثلاثہ"[۳۲] سے تعبیر کی گئی ہے اور کبھی اوسط نظر کے مطابق (خدا کی طرف) سفر کرنے والوں کے نزدیک ہزار منزلوں اور ایک اعتبار سے سو منزلوں اور دوسرے اعتبار سے دس منزلوں پر تقسیم کیا گیا ہے۔[۳۳]

شیخ عارف کامل شاہ آبادی نے سفر کرنے والوں کی ہر منزل کیلئے بہترین طریقے سے دس بیت مقرر کئے ہیں اس ترتیب سے اس کا مجموعہ ہزار بیت ہوتا ہے اور حضرت ابراہیمؑ نے اپنے سیر روحانی میں جس کی حکایت خدا نے قرآن میں کی ہے، ان منزلوں کی تین مقام سے تعبیر کی ہے ایک کو "کوکب" دوسرے کو "قمر" اور تیسرے کو "شمس" سے تعبیر فرمایا ہے۔[۳۴]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ روحانی سفر کا مبدا نفس کا تاریک گھر ہے اور اس کی منازل، آفاق و انفس کے مراحل و مراتب ہیں اور اس کی مقصد بندائے امر میں انسان کامل کیلئے تمام اسماء و صفات کے ساتھ ذات مقدس حق ہے اور آخر امر میں اس کے اندر اسماء و صفات کا مضمحل ہو جانا ہے اور انسان غیر کامل کیلئے اسماء و صفات و تعینات کا اسمی و صفتی و تعینی ہونا ہے۔

جب انسان سالک اپنی ذات و انانیت کے سر پر پیر رکھ دیتا اور اس گھر سے خارج ہو جاتا ہے اور اپنے

اصل مقصد وخدا جوئی کی طلب میں تعینات کی منازل ومراحل کی سیر کر کے ہر ایک کے سر پر پیر رکھ کر ظلمانی ونورانی پردوں کو چاک کر کے تمام مخلوقات وکائنات سے دل کو الگ کر لیتا ہے اور کعبۂ دل سے اولیائے خدا کی محبت کے ذریعے بتوں کو توڑ دیتا ہے اور اس کے افق دل سے ستارے، چاند اور سورج ڈوب جاتے ہیں اور اس کے دل کا رخ یکسوئی کے ساتھ غیر اللہ سے لاتعلق ہو کر خدائی سمت اختیار کر لیتا ہے اور دوں کا حال ﴿وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ﴾ ۳۵ کی شکل میں نمودار ہوتا اور وہ اسماء وذات وافعال خدا میں فانی ہو جاتا ہے تو خود سے بے خود ہو جاتا اور مکمل طور پر محو حاصل کر لیتا ہے اور صعق مطلق اس کیلئے درپیش ہوتا ہے، پھر اس کے وجود میں حق کی کارفرمائی ہو جاتی ہے "وہ سنتا ہے تو حق کے کان سے، دیکھتا ہے تو حق کی آنکھ سے، گرفت کرتا ہے تو دست قدرت سے، بولتا ہے تو زبان حق سے" (یعنی) حق سے دیکھتا ہے اور سوائے حق کچھ نہیں دیکھتا حق سے گفتگو کرتا ہے اور حق کے سوا بولتا ہی نہیں، غیر حق کی طرف سے گونگا، بہرا اور اندھا ہوتا ہے۔ اس کے کان اور اس کی آنکھیں حق کے علاوہ کسی کیلئے نہیں کھلتیں۔ یہ مقام صرف جذبۂ الٰہیہ اور آتش عشق کی چنگاری کی بناء پر حاصل ہوتا ہے اور عشق الٰہی کی اس نہ بجھنے والی روشنی کے ذریعے وہ حق کے نزدیک ہو جاتا ہے اور اس جذبہ ربوبیہ کی وجہ سے جو حب ذات کے پیچھے ہوتا ہے، مدد حاصل کرتا ہے تاکہ اس وادی حیرت میں لغزش نہ کھا جائے اور "شطح" وغیرہ کی طرح کی باتوں میں مبتلا نہ ہو جائے جو انانیت کی باقیات میں سے ہیں اور اس حدیث میں ان دو باتوں کی طرف اشارہ ہوا ہے ﴿وانَّهُ يتقرّبُ اِلَيَّ بالنافلة حتى احبّه﴾ بندے کا تقرب، عشق الٰہی کی چنگاری سے ہے اور جذبۂ الٰہیہ حق، محبت سے ہے۔

تا کہ از جانب معشوق نباشد کششی کوشش عاشق بیچارہ بہ جائی نرسد ۳۶

پس قرب نوافل کی انتہا فنائے کلی، اضمحلال مطلق، ورفنائے تام ہے اور اس کا نتیجہ ﴿كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ﴾ "میں اس کا وہ کان تھا جس سے وہ سنتا تھا" ہوتا ہے۔ پھر اس فنائے کلی، محو تام، فنائے مطلق وصعق تمام کے بعد کبھی تو عنایت ازلی اس کے شامل حال ہو جاتی اور اس کو اپنے آپ میں راتی ورائی مملکت کی طرف پلٹا دیتی ہے پھر اس کیلئے حالت "صحو" یعنی ہوش میں آنا درپیش ہوتی اور انس واطمینان کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس پر سبحات جلال وجمال منکشف ہو جاتے ہیں اور اس حالت صحو میں آئینۂ ذات میں صفت اور صفات میں اعیان ثابتہ اور اس کے لوازم منکشف ہو جاتے ہیں اور اہل سلوک کی حالت یہاں بھی مقام اول کی طرح ہے، یعنی عین ثابت ہونے کے باوجود ہر اسم کے تابع ہوتے اور اسی میں فنا ہو جاتے

اور اسی اسم کے ساتھ باقی رہتے ہیں نیز حالت صحو میں بھی وہی اسم ان پر کشف ہوتا ہے اور اسی اسم کا تابع، عین ثابت اس پر منکشف ہو جاتا ہے۔

نبوت میں انبیاءؑ کے اختلاف کا راز

پس (معلوم ہو گیا کہ) نسان کامل اسم جامع اعظم کے تحت، عیان ثابتہ کے کشف مطلق ور اس کے وزم کے ساتھ ازلاً و ابداً اسی کی طرف پلٹتا ہے اور مخلوقات کی متعدد و کشف حالات اور کیفیت سلوک اور ن کے وصول کا نقشہ (بھی) ن ہی کی طرف پلٹتا ہے ور خلعت خاتمیت و نبوت آخر جو کشف مطلق کا نتیجہ ہے، انہی (حضور اکرمؐ) کے قد زیبا پر درست آتی ہے۔

رہے دوسرے انبیاءؑ تو وہ جس اسم کی مظہریت رکھتے تھے اسی کی مناسبت سے اور اسی کے دائرۂ وسعت کے مقدار کے مطابق اس اسم کے تابع اعیان کو کشف کرتے ہیں اور ہاب کمال و نقص، شرافیت و عدم اشرافیت اور دعوت کے دو ئرے کی تنگی ور وسعت کی ابتداو ہیں سے ہوتی ہے ور سمائے لٰہیہ کی متابعت رجوع کرتی ہے، جس کی تفصیل ہم نے ''مصباح لہدایۃ'' میں ذکر کردی ہے۔[۳۷]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس حالت کے بعد جب صحو بعد المحو کی کیفیت طاری ہوتی ہے اس کا وجود، وجود حقانی ہو جاتا ہے اور خدا اس کے آئینۂ جمال میں دوسری مخلوقات کا مشاہدہ کرتا، بلکہ مشیت کے ہم فق ہو جاتا ہے اور اگر نسان کامل ہو تو مشیت مطلقہ کے ہم افق ہو جاتا ہے اس کی روحانیت عین مقام ظہور فعلی حق ہو جاتی ہے، اس وقت خدا اس کے ذریعے دیکھتا ہے اس کے ذریعے سنتا ہے اور س کے ذریعے گرفت کرتا ہے اور وہ حق کا رادہ نافذہ و مشیت کا مدو علم فعلی ہوتا ہے ﴿فالحقُّ یسمعُ به ویبصرُ به ... الحدیث﴾ ﴿علیٌّ عینُ الله وسمعُ الله وجنبُ الله﴾ ہے۔[۳۸]

پس قرب فرائض، صحو بعد الصحو ہے اور اس کا نتیجہ وہ چیزیں ہیں جن کو آپ نے سنا۔

یہ بھی جان لیجئے کہ اسی محو اور رجوع بکثرت کو ''قرب'' کہتے ہیں، کیونکہ یہ صحو بعد الصحو اس حالت غفلت کے علاوہ ہے جو ہم کو حاصل ہوتی ہے ور فنائے محض کے بعد وقوع در کثرت اس کثرت کے علاوہ ہے میں ہم واقع ہیں، کیونکہ کثرت تو ہمارے لئے حق کے دیدار کے سامنے حجاب ہے اور ن کیلئے مشاہدے آئینہ ﴿ما رأیتُ شیئاً الّا ورأیتُ الله معهُ وفیه وقبلهُ وبعدهُ﴾[۳۸] ''میں نے کوئی چیز نہیں دیکھی

سوائے اس کے کہ خدا اس کے ساتھ تھا، اس کے اندر تھا، اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی تھا"۔

اور قرب نوافل کو فنائے اسمائی اور اقرب فرائض کو فنائے ذاتی سمجھا جا سکتا ہے، اس بنا پر قرب فرائض کا نتیجہ محو مطلق ہو گا۔ اس کی تفصیل یہاں پر اس سے زیادہ مناسب نہیں ہے، اتنا بھی اس کتاب کی گنجائش سے خارج ہے۔

چوتھی فصل
شیخ بہائیؒ کا قول

عارف وا مقام شیخ بہائیؒ اپنی کتاب "اربعین" میں اس حدیث شریف کے ذیل میں فرماتے ہیں "اصحاب قلوب کیلئے اس جگہ ایسے اہل اللہ ملفوظات، خفیہ اشارے اور ذوق کے مطابق کنائے و نکات ہیں جو مشام ارواح کو معطر کر دیتے اور بوسیدہ ہڈیوں میں جان ڈال دیتے ہیں، مگر ان معانی اور حقائق تک صرف وہی لوگ پہنچ سکتے ہیں جو ریاضتوں اور مجاہدوں کے ذریعے اپنے آرام کو ترک کر دیں یہاں تک کہ اس کے آب شیریں کا مزہ چکھ سکیں اور مطلب تک پہنچ سکیں۔ لیکن جو لوگ ان ملفوظات کے اسرار سے بے خبر ہیں وہ پست دنیا کی نفسانی خواہشات میں غرق ہونے اور جسمانی لذتوں میں ڈوبے رہنے کی وجہ سے ان ملفوظات کے خزانہ معارف سے محروم ہیں۔ وہ ان ملفوظات کے سننے سے عظیم خطرے میں ہیں اور اس بات کا خطرہ ہے کہ وہ الحاد سے دوچار نہ ہو جائیں اور حلول و اتحاد کے وہم میں گرفتار نہ ہو جائیں ﴿تعالى الله عن ذلك علوا كبيرا﴾"۔ ۲۰۲

ہم یہاں پر بہت ہی سادہ طریقے سے بیان کرتے ہیں تا کہ بات سمجھنے میں آسانی ہو، لہذا عرض ہے کہ یہ کلام قرب میں مبالغہ ہے وہ اس بات کا بیان ہے کہ بندے کے ظاہر و باطن اور سر و علن پر سلطان محبت کا غلبہ ہے، بہذ مقصود یہ ہے کہ جب میں کسی بندے کو دوست رکھتا ہوں تو اس کو محل انس میں جذب کر لیتا ہوں اور اسے عالم قدس کی طرف متوجہ کر دیتا اور اس کی فکر کو اسرار ملکوت میں مستغرق کر دیتا ہوں اور اس کے حواس کو انوار جبروت کے اخذ پر محدود کر دیتا ہوں، اس وقت بندے کا قدم مقام قرب میں ثابت رہ جاتا ہے اور محبت اس کے خون و گوشت میں اس قدر مخلوط ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے آپ سے بے پروا اور اپنے حساسات سے غافل ہو جاتا ہے۔ اغیار اس کی نظر سے محو ہو جاتے ہیں یہاں تک وہ "جیسے کہ میں اس کی آنکھ اور کان بن جاتا ہوں" کا مصداق ہو جاتا ہے۔

چنانچہ شاعر نے کہا ہے:

حُبّي فيك لا يخفى　　وناري منك لا يخبو

فأنت السمع والأبصار　　والأركان والقلب [۴۱]

انتہی کلامہ رفع مقامہ" [۴۲]

قول محقق طوسیؒ

افضل المتأخرین واکمل المتقدمین، خواجہ نصیر الدین طوسیؒ فرماتے ہیں "عارف جب اپنے سے منقطع ہو کر حق سے متصل ہو جاتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ تمام طاقتیں، قدرت حق میں مستغرق ہیں اور تمام معلوم، علم حق میں مستغرق، نیز تمام ارادے اس کے ارادے میں مستغرق ہیں، پس عارف تمام وجودات اور ان کے کمالات کو اسی سے صادر اور اسی کی طرف سے جاری دیکھتا ہے اور اس وقت پروردگار اس کی سماعت وبصارت اور طاقت و علم و وجود ہو جاتا اور عارف متخلق باخلاق اللہ ہو جاتا ہے"۔ انتہی کلامہ مزید علو مقامہ [۴۳]

کلام علامہ مجلسیؒ

علامہ مجلسیؒ کا بھی یہاں ایک کلام ہے جس کا خلاصہ یہ ہے "انسان اگر اپنی طاقتوں کو نفسانی خواہشات اور شیطانی راستوں میں صرف کرتا ہے تو ان میں کچھ باقی نہیں رہتا سوائے حسرت وندامت کے اور اگر اپنی طاقتوں کو طاعت خدا کی راہ میں استعمال کرتا ہے تو خدا ان قوتوں کو روحانی قوتوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ پس اس کی سماعت وبصارت سب روحانی ہو جاتی ہے اور پھر وہ اپنی سماعت سے ملائکہ کے الفاظ سنتا ہے۔ مرنے کی وجہ سے اس کی سماعت وبصارت ضعیف نہیں ہوتی اور قبر میں اسی روحانی سماعت وبصارت سے سوال وجواب ہوتا ہے اور قیامت میں اسی روحانی سماعت وبصارت کی وجہ سے صاحب سمع وبصر رہتا ہے۔ لیکن جو شخص ایسی سماعت وبصارت کا حامل نہیں ہے وہ اندھا اور بہرا محشور ہوتا ہے۔ اسی بخشش وعطیہ خداوندی کی وجہ سے خدا نے فرمایا ﴿كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ　　الحديث﴾" [۴۴] یہ قول مجلسیؒ سے بعید لگتا ہے۔

تتمہ

شیخ اجل بہائیؒ نے فرمایا "یہ حدیث شریف صراحت کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ

واجبات، مستحبات سے افضل ہیں۔ رہا یہ اعتراض کہ حدیث میں غیر واجب کی افضیت کی نفی کی گئی ہے اور یہ ایسی بات (غیر واجب کے افضلیت کی نفی) افضیت واجب کے منافی نہیں ہے، کیونکہ ممکن ہے وہ مساوی ہو، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کی ترکیب اکثر لغات میں (ہمیشہ) افضیت پر دلالت کرتی ہے۔ (البتہ) شیخ شہید، رضوان اللہ علیہ، نے اس کلیہ سے چند مواقع کو مستثنیٰ قرار دیا ہے:

ان میں سے ایک قرض سے مقروض کو بری کر دینا ہے جبکہ وہ تنگدست ہو، مہلت دینے سے افضل ہے، حالانکہ بری کرنا مستحب، اور مہلت دینا واجب ہے۔ دوئم سلام میں پہل کرنا جو سلام کے جواب دینے سے افضل ہے (لیکن سلام میں پہل کرنا مستحب اور جواب سلام جواب ہے)۔ سوئم فرادی نماز پڑھنے والا جماعت کے ساتھ نماز کا اعادہ کرے، وغیرہ"۔ انتہی [۵]

بعض علما نے ان سب باتوں میں بحث کی ہے جس کا ذکر ضروری نہیں ہے۔

یہ سمجھ لیجئے کہ ظاہر حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ واجبات، مستحبات سے افضل ہیں، چاہے وہ ایک قسم کے نہ ہوں، مثلاً سلام کا جواب دینا افضل ہے حج مندوب، بڑے مدرسے کی تعمیر اور زیارت حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے۔ یہ بات اگرچہ بعید معلوم ہوتی ہے، اسی لئے علامہ مجلسیؒ نے فرمایا ہے کہ "ممکن ہے اس کو چند چیزوں کے ایک اصل سے ہونے پر مخصوص کر دیا جائے"۔ [۶] لیکن جب دلیل موجود ہے تو محض استبعاد کی وجہ سے یہ بات نہیں کی جاسکتی اور (بہت) ممکن ہے کہ فریضے کا انصراف فرائض تعبدیہ کی طرف کر دیا جائے، جیسے نماز، روزہ، حج، زکات وغیرہ نہ کہ دیگر فرائض، مثلاً تنگدست مقروض کو مہلت دینا، جواب سلام دینا وغیرہ اگرچہ یہ قابل غور ہے۔

والحمد للہ اولاً وآخراً

توضیحات (۳۴)

۱۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۵۲، کتاب الایمان والکفر، باب من اذی المسلمین واحتقرہم، حدیث ۸

۲۔ وہ خدا (ہر عیب سے) پاک ہے جس نے اپنے بندے کو راتوں رات مسجد الحرام (خانہ کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (آسمانی مسجد) تک کی سیر کرائی۔ سورۂ بنی اسرائیل آیت ۱/

۳۔ اربعین، حدیث ۳۵، ص ۲۹۶۔

۴۔ اس کی اہانت کی، یعنی اس کی تذلیل کی، اس کی توہین اور بے عزتی کی، یعنی اس کو پست شمار کیا، کہتے ہیں وہ ایک ایسا مرد ہے جس میں پستی ہے، یعنی وہ خوار و ناتواں ہے۔

۵۔ اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو (زبان سے تو) کہتے ہیں ہم خدا اور قیامت پر ایمان لائے حالانکہ وہ (دل سے) ایمان نہیں لائے۔ سورۂ بقرہ، آیت ۸/

۶۔ اربعین، حدیث ۳۵، ص ۲۹۶۔

۷۔ تفسیر کشاف، ج ۱، ص ۱۶۷، تفسیر سورۂ بقرہ، آیت ۸/

۸۔ اربعین، حدیث ۳۵

۹۔ شیخ بہائیؒ نے فرمایا ہے کہ نوافل تمام وہ غیر واجب اعمال ہیں جو خدا کی خوشنودی کیلئے بجا لائے جاتے ہیں۔ نوافل کا صرف نماز کے ساتھ اختصاص بعد کی اصطلاح ہے۔ مفتاح الفلاح، ص ۳۹۰۔

۱۰۔ المحاربہ: جنگ کرنا اور سختی اور شدت سے پکڑنا۔

۱۱۔ اربعین، حدیث ۳۵، ص ۲۹۵ اور عامہ میں سے بخاری نے اپنی صحیح کی کتاب الرقاق ج ۲۳ ص ۲۲ پر اور ابن حنبل نے مسند کی ج ۶، ص ۲۵۶، پر نقل کیا ہے۔

۱۲۔ حدیث ۱۹، فصل ۴۔

۱۳۔ اربعین، حدیث ۳۵، ص ۳۰۰۔

۱۴۔ سورۂ انفال، آیت ۱۷/

۱۵۔ سورۂ کہف، آیت ۷۹ تا ۸۲۔

۱۶۔ سورۂ زمر، آیت ۴۲۔

۱۷۔ سورۂ نحل، آیت ۹۳۔

۱۸۔ سورۂ رعد، آیت ۲۷۔

۱۹۔ سورۂ زخرف، آیت ۸۴۔

۲۰۔ مراد صدر المتالہین ملا صدرا ؒ ہے۔

۲۱۔ یعنی وہ لوگ ہیں جو نام خدا سے اعراض کرتے ہیں

۲۲۔ حکیم الٰہی میر داماد، وہ ان کے شاگرد ملا صدرا۔

۲۳۔ قبسات ص ۲۶۹، ۲۷۰ اسفار جلد ۸ ص ۳۹۵ اور اس کے بعد، سفر ۳، موقف ۲، فصل ۱۳۔

۲۴۔ حدیث ۱۵ فصل ۲۔

۲۵۔ بحار الانوار، ج ۵۵ ص ۳۵، کتاب السماء والعالم، باب ۵، حدیث ۱۳۔

۲۶۔ ہشام بن حکم کہتے ہیں

سات تکبیروں کے لیے دوسری دلیل فرمائی ہے چنانچہ فرماتے ہیں جب رسول ؐ کو معراج پر لے جایا گیا تو سات حجاب

چاک کیے گئے ہر حجاب کے پاس ایک تکبیر کہی اس لئے خدا نے آپ کو انتہائے کرامت تک پہنچایا

وسائل الشیعہ، ج ۴ ص ۷۲۲، کتاب الصلوٰۃ، باب ۷ تکبیرۃ الاحرام حدیث ۵۔

۲۷۔ شیخ طوسی نے مصباح میں معاویہ بن عمار سے روایت کی ہے کہ امام ششم ؑ کے پاس زرد رنگ کی دیبا کی ایک تھیلی تھی

جس میں خاک شفا تھی جب نماز کا وقت ہوتا تھا تو آپ اس کو سجادہ پر پھیلا کر اس پر سجدہ کرتے تھے اور فرماتے تھے خاک

شفا پر سجدہ سات حجابوں کو چاک کر دیتا ہے۔

وسائل الشیعہ، ج ۳ ص ۶۰۸، کتاب الصلوٰۃ، باب ۱۶ از ابواب ما یسجد علیہ، حدیث ۳

۲۸۔ ترجمہ: عطار نے عشق کے سات شہروں میں گردش کر لی لیکن ہم ابھی ایک گلی کے موڑ ہی پر ہیں

یہ شعر مولانا روم کی طرف منسوب ہے لیکن بعض کا خیال ہے کہ یہ جامی ؒ کا ہے

۲۹۔ مرحوم شاہ آبادی نے وجود آدمی کے سات لطائف کو اس طرح شمار کیا ہے ''نفس، عقل، قلب، روح، سر، خفی اور اخفی''

رشحات البحار، رسالہ الانسان والفطرۃ، ص ۔۔۔

۳۰۔ مراد آیات اسماء و صفات کے حجابات ہیں متن سے رجوع کیجئے

۳۱۔ عوالم ثلاثہ سے مراد عالم طبیعت، عالم مثال اور عالم عقل ہے۔ ملا صدرا نے عوالم کے تین میں انحصار کی دلیل یہ قرار دی

ہے کہ ادراکات حسی، خیالی اور عقلی تین ہی قسم کے ہوتے ہیں۔ شواہد ربوبیہ، ص ۳۴۰۔

۳۲۔ مرتبہ ظاہر نفس کی طرف اشارہ ہے جو بدن میں مرتبہ ظہور نفس ہوتا ہے اور مرتبہ برزخ نفس کا مرتبہ تجرد مثالی

ہوتا ہے، باطن ہیں اور مرتبہ عقل تجرد کامل ہے۔

۳۳۔ جناب عبداللہ انصاری منازل السائرین کے مقدمہ میں تحریر کرتے ہیں ابوبکر کتانی نے بندہ و حق کے درمیان ہزار

مقام نورانی وظلمانی قرار دیے ہیں اور میں نے ان مقامات کو سو تک محدود کیا ہے جو دل کی قصر پر منقسم ہوتے ہیں اور میں ان کی یہاں شرح کروں گا

۳۴۔ یہ سب سورۂ انعام کی آیات ۷۶، ۷۷، ۷۸ اور ۷۹ کی طرف اشارہ ہے۔

۳۵۔ میں نے تو اس کی طرف اپنا چہرہ کر لیا جس نے بہت سے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ سورۂ انعام آیت ۱۰۰

۳۶۔ بستان و حکم، دفتر ا، ج ا، ص ۵۳۷۔

۳۷۔ مصباح الہدایہ، ص ۱۹۲ ۔ ۱۹۵ ۔

۳۸۔ علیؑ خدا کی آنکھ، خدا کے کان اور خدا کے پہلو ہیں۔

ابو حمزہؒ سے فرمایا حضرت علیؑ کا ارشاد ہے میں علم خدا ہوں، میں خدا کا قلب حافظ، خدا کی زبان ناطق، خدا کی آنکھ اور خدا کے ساتھ ہوں، میں ید اللہ (خدا کا ہاتھ) ہوں۔

توحید صدوقؒ ص ۱۶۴، باب ۲۲، معنی جنب اللہ، حدیث

۳۹۔ حدیث ۳۸، حاشیہ ۲

۴۰۔ خدا اس سے کہیں برتر و بزرگ ہے۔

۴۱۔ میرا جنون تیرے بارے میں ایسا ہے جو مخفی نہیں ہے اور میری آتش عشق جو مشتعل ہوئے وہ بجھ نہیں سکتی، تو ہی میری حاجت اور میری ضرورت ہے اور تو ہی میرا آخری ارادہ ہے۔

۴۲۔ اربعین، حدیث ۳۵ ص ۲۹۹۔

۴۳۔ شرح اشارات، ج ۳، ص ۳۸۹، نمط ۹، فصل ۹۔

۴۴۔ مرآۃ العقول، ج ۱۰، ص ۳۹۲، کتاب ایمان و کفر، باب من آذی المسلمین، حدیث ۹

۴۵۔ اربعین، حدیث ۳۵، ص ۳۰۲۔

۴۶۔ مرآۃ العقول، ج ۱۰، ص ۳۸۳، کتاب ایمان و کفر، باب من آذی المسلمین، حدیث ۲

پینتیسویں حدیث

بالسند المتصل الی عماد الاسلام والمسلمین، محمد بن یعقوب الکلینی، رضوان اللہ علیہ، عن محمد بن یحییٰ، عن احمد بن محمد، عن احمد بن محمد بن ابی نصر قال قال ابو الحسن الرضا علیہ السلام

﴿قالَ اللّٰهُ: يا ابْنَ آدَمَ! بِمَشِيَّتِي كُنْتَ اَنْتَ الَّذي تَشاءُ لِنَفْسِكَ ما تَشاءُ وبِقُوَّتِي اَدَّيْتَ فَرائِضِي وَبِنِعْمَتِي قَوِيْتَ عَلى مَعْصِيَتِي جَعَلْتُكَ سَمِيعاً بَصِيراً قَوِيّاً، ما اَصابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَما اَصابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ، وذٰلِكَ اَنِّي اَوْلى بِحَسَناتِكَ مِنْكَ وَاَنْتَ اَوْلى بِسَيِّئاتِكَ مِنِّي، وَذاكَ اَنِّي لا اُسْأَلُ عَمّا اَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ﴾

ترجمہ: امام رضا فرماتے ہیں خداوند عالم نے فرمایا: "اے اولاد آدم! میری ہی مشیت کے ساتھ تو اپنے لئے جو چاہتا ہے خواہش کرتا ہے۔ میری (دی ہوئی) قوت کے سہارے تو نے اپنے فرائض ادا کئے۔ میری ہی نعمت (کے بدولت) سے تو میری معصیت پر قادر ہوا۔ میں نے تجھے سننے والا، دیکھنے والا اور طاقتور بنایا، جو نیکی تجھے ملتی ہے وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو برائی تم کو پہنچتی ہے وہ تمہاری وجہ سے ہے، اس لئے کہ تیری نیکیوں کیلئے تجھ سے زیادہ میں اولیٰ ہوں اور تیری برائیوں کا مجھ سے زیادہ تو اولیٰ ہے، اس لئے کہ میں جو بھی کرتا ہوں مجھ سے اس کے بارے میں سوال نہیں کیا جا سکتا مگر ان (بندوں) سے (ان کے افعال کے بارے میں) پرسش ہوگی"۔

شرح: اس حدیث شریف میں ماقل الطیبہ اعلیٰ علوم کے ایسے اہم نکات اور اہم مسائل مذکور ہیں جن

کو گر تمہیدات کی تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے تو اس کتاب کی گنجائش سے خارج اور باعث طولت ہوں گے۔ اس لئے حد وسط کی بنیاد پر، بطور خلاصہ بعض مسائل کو بطور مجیز یہاں چند فصلوں کے ضمن میں بیان کریں گے۔ وَعَلَى اللهِ التُّكلان

پہلی فصل: اسمائے خدا کے دو مقامات

یہ جان لو کہ مشیت الٰہی، بلکہ اسماوصفات، جیسے علم وقدرت وحیات وغیرہ، کے دو مقامات ہیں

پہلا: اسماوصفات ذاتیہ کا مقام ہے۔ برہان سے ثابت ہے کہ ذات واجب الوجود بہ حیثیت وحدہ وجہت بسیط، تمام کمالات اور اسماوصفات کا مجموعہ ہے اور وہ تمام کمالات اور اسماوصفات جمال وجلال کی حیثیت بسیط وجودیہ سے متعلق ہیں اور وجود کے ماسوا جو کچھ بھی ہے وہ نقص وقصور واعدام ہے اور چونکہ اس کی ذات مقدس صرف وجود اور وجود محض اور صرف کمال ہے (لہذا) ﴿عِلْمٌ كُلُّهُ، قُدْرَةٌ كُلُّهُ، حَياةٌ كُلُّهُ﴾ "وہ مکمل علم، مکمل قدرت اور پوری کی پوری حیات ہے"۔

دوسرا: اسماوصفات فعلیہ کا مقام ہے۔ یہی اسماوصفات ذاتیہ کے ظہور کا مقام اور صفات جلالیہ وجمالیہ کے تجلی کا مرتبہ ہے اور یہ مقام، مقام "معیت قیومیہ" ہے ﴿هُوَ مَعَكُمْ﴾[۲] و ﴿مَا مِنْ نَجْوَىٰ ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ﴾[۳] اور مقام وجہ اللہ ہے ﴿أَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ﴾[۴] اور مقام نوریت ہے ﴿اللَّهُ نُورُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾[۵] اور مقام مشیت مطلقہ ہے ﴿وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ﴾[۶] ﴿خلق الله الأشياء بالمشيئة وخلق المشيئة بنفسها﴾[۷] البتہ اہل اللہ کی زبان میں ان کی دوسری اصطلاحات والقاب ہیں۔ خداوند عالم کی کتاب کی اس آیہ شریفہ میں بعض اعتبار سے دونوں مقامات کی طرف اشارہ ہے ﴿هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾[۸]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مقام مشیت فعلیہ مطلقہ تمام موجودات ملکیہ وملکوتیہ اور تمام مخلوقات پر ان کے تعینات کے ساتھ ایک اعتبار سے احاطہ قیومیہ رکھتی ہے اور ایک اعتبار سے یہ تمام اس کے مظاہر ہیں اور اس مقام کے مطابق مشیت فعلیہ ومظہریت اور اس میں فنائے مشیت عباد، بلکہ خود بندوں کی مظہریت ومراتب اور ان کے تمام شئون کو اس حدیث شریف میں بیان کیا گیا ہے "اے پسر آدم! میری مشیت سے تو وہ شخص ہوا ہے جو مشیت (وارادہ) کرتا ہے، تیری ذات اور تیری ذات کے کمالات سب عین میری مشیت ہیں، بلکہ

تو خود اور مظاہر و تعینات سمیت تیرے سارے کمالات میری مشیت ہیں ﴿وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی﴾ ۹؎ جیسی دیگر آیات (سے بھی) اس عرفانی نکتے کیلئے بہت سے شواہد ہیں، جن کا ذکر کرنا غیر ضروری ہے۔

شیخ جلیل اشراقی اشیا کے بارے میں خدا کے تفصیلی علم کو اسی مقام کے مطابق سمجھتے ہیں ۱۰؎ اور محقق طوسیؒ نے بھی اس مسئلے میں اشراقی کی پیروی کی ہے ۱۱؎ لیکن جناب صدر المتالہین (ملا صدراؒ) خدا کے علم تفصیلی کو اسی مقام ذات بسیط کو قرار دیتے ہیں ۱۲؎ اور اشراقیؒ وطوسیؒ کا کلام ان کو پسند نہیں ہے، لیکن میں مصنف ان سب کے کلام کی روح کو ایک ہی سمجھتا ہوں اور اس نزاع کو نزاع لفظی قرار دیتا ہوں ایک ایسے بیان کے ساتھ جو اس مقام پر مناسب نہیں ہے۔

اس بیان سے معلوم ہوا کہ اس عالم امکان میں جو کچھ بھی ہوتا ہے خواہ جواہر قدسیہ الٰہیہ سے ہو یا ملکیہ طبیعیہ سے یا اعراض سے ہو اور خواہ ذوات و اوصاف و افعال ہوں، وہ سب کے سب قیومیت و نفوذ قدرت اور احاطہ قوت حق کے ماتحت متحقق ہوتے ہیں لہذا یہ بات صاف و درست ہوتی ہے کہ ﴿بقوتي اديت فرائضي﴾ اور یہی مقام مشیت مطلقہ مقام رحمت واسعہ و نعمت جامعہ ہے جیسا کہ فرمایا ﴿وبنعمتي قويت على معصيتي﴾ ''اور میری نعمت کے ذریعے تجھے میری معصیت کرنے کی طاقت ملی''۔

دوسری فصل: جبر و تفویض کی طرف اشارہ

اس حدیث شریف میں مسئلہ جبر و تفویض کی طرف واضح اشارہ کرتے ہوئے مذہب حق کو جو منزلت بین المنزلتین اور مسلک اہل معرفت و طریقۂ اصحاب قلوب کے مطابق ہے، ذکر فرمایا ہے، کیونکہ بندے کیلئے مشیت و ارادہ اور قوت کے اثبات کے ساتھ ساتھ ان چیزوں کو مشیت حق قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے ''تو نے ارادہ کیا اور میری مشیت کے ساتھ تیری مشیت ظاہر ہوئی ہے۔ تو نے فریضہ کو ادا کیا اور تیری قوت میری قوت کا ظہور ہے اور میری نعمت کی وجہ سے جو بسط رحمت واسعہ ہے، تجھے معصیت پر قدرت و طاقت حاصل ہوئی۔ لہذا تجھ سے مطلقاً افعال و اوصاف و وجودات کو سلب نہیں کیا جا سکتا جس طرح اثبات مطلق بھی نہیں کیا جا سکتا تو نے ارادہ کیا اور تیرا ارادہ میری مشیت میں فانی اور اس کا ظہور و یقین ہے۔ تو اپنی طاقت سے اطاعت و معصیت پر قدرت رکھتا ہے اس کے ساتھ ساتھ تیری طاقت و قدرت میری قوت

وقدرت کا ظہور ہے"۔ یہاں پر ایک اعتراض کا امکان تھا کہ اس بنا پر تمام نقائص ورذائل ومعاصی کی نسبت خدا کی طرف دی جا سکتی ہے، لہذا بطور حکمی برہانی وذوقی عرفانی اس کا جواب دیا گیا کہ خداوند عالم چونکہ محض کمال وخیر وجمال وبہاء ہے اس لئے اس کی طرف سے جو بھی ہوگا وہ کمال وخیر ہی ہوگا، بلکہ خود پورا نظام وجود وہستی غیب وشہود میں عین کمال اور اصل تمامیت وجمال ہے اور جو نقص وبرائی اور شر ووبال ہے وہ عدم سے متعلق ہے اور لوازم ماہیت سے ہے جو متعلق جعل اور فیضان حق سے غیر متعلق ہے، بلکہ عالم طبیعت اور ملک کی تنگ نشہ کے اندر جتنے بھی شر ہیں وہ موجودات وکائنات کے تضاد کی وجہ سے ہیں اور ان کا تضاد متعلق جعل نہیں ہو کرتا، لہذا جتنی بھی نیکیاں اور کمالات وحسنات ہیں وہ سب خدا کی طرف سے ہیں اور جتنے نقائص وشرور ومعاصی ہیں وہ مخلوق کی طرف سے، اسی لئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے۔

﴿مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللهِ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ﴾

لہذا تمام دنیوی اور اخروی سعادتیں اور تمام ملکی وملکوتی نیکیاں مبدأ فیاض کی طرف سے ہوتی ہیں اور تمام دنیوی واخروی بدبختیاں نیز اس عالم اور دوسرے عالم کے تمام شرور خود مخلوقات کی ذاتی کوتاہیوں اور خامیوں سے حاصل ہوتے ہیں۔

اور یہ جو زبان زد ہے کہ سعادت وشقاوت جعل جاعل سے متعلق نہیں ہیں، بلکہ اشیا کی ذاتی چیز ہے یہ سعادت کی حد تک تو اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے، کیونکہ سعادت مجعول حق سبحانہ ہے۔ یہ نہ کسی بھی ذات کی ذاتی ہے اور نہ کسی ماہیت کی ماہیتی، بلکہ ہر شے کی مکمل شقاوت اور محض ہلاکت کا مرجع ماہیت ہے۔ ہاں! یہ کلیہ شقاوت کی حد تک درست ہے، کیونکہ شقاوت ماہیت سے متعلق اور غیر مجعول ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مرتبہ جعل تک نہیں پہنچتی۔ رہی مشہور حدیث ﴿السَّعِيدُ سَعِيدٌ فِي بَطْنِ اُمِّهِ﴾[13] تو اس کا مطلب دوسرا ہے جو علم ساہ وصفت سے متعلق ہے اور اس کا ذکر مناسب نہیں ہے۔

اس حق برہانی نکتے کے بیان کے بعد ایک دوسرے شبہ کا امکان تھا اور وہ یہ ہے کہ نیکیوں کے سلسلے میں موجودات کا عزل لازم آتا تھا، اور شرور کے سلسلے میں قدرت واجبہ قدیمہ کا عزل لازم آتا تھا اور یہ مستلزم جبر وتفویض ہے اور جبر وتفویض مسلک عرفان اور طریقہ برہان کے خلاف ہے، لہذا اس دلیل ہی میں اس کی رد فرما، اور اس کی تفصیل وتحقیق یہ ہے کہ خدا حسنات کیلئے بہ نسبت بندوں کے اولیٰ ہے اور بندے شرور کیلئے بہ نسبت خدا کے اولیٰ ہیں اور اس اثبات اولویت میں دونوں طرف سے انتساب ثابت ہے۔ اب رہی

یہ بات کہ نیکیوں میں خدا کو اولویت ہے اور اس کا اصل انتساب بندوں سے اس وجہ سے ہے کہ مبدأ البروی (خدا) کی طرف نیکیوں کی نسبت نسبت وجود بالذات ہے، کیونکہ نیکیاں وجود کیلئے ذاتی ہیں اور یہ واجب میں تو عین ذات ہیں لیکن ممکن میں جعل وافاضہ کی وجہ سے ہیں۔ پس بنیادی طور پر نیکیوں کا سرچشمہ خدا ہے۔ ممکن صرف مظہر اور آئینۂ ظہور ہے اور اس ظاہریت و دامنے کی نسبت مظہریت قابلی سے اتم ہے، لیکن شرور و برائیوں میں صورتحال اس کے برعکس ہے۔ البتہ دونوں نسبتیں محفوظ ہیں، کیونکہ جس چیز کا فیضان خدا کی طرف سے ہے وہ نیکیاں ہیں اور ان کا لازمہ بطور تبعیت درمیان میں شرور کا وقوع ہے پس عرضی طور پر اس کی طرف منسوب ہیں۔ لیکن بالذات یہ ذات کا نقصان اور ماہیت کا قصور ہے اور خود آیت میں بھی ان دونوں نقطہ ہائے نگاہ سے دونوں معنوں کا ذکر ہے۔ ایک تو وہاں پر جہاں وحدت کا غلبہ ہے اور کثرت و نقائص کو مضمحل قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے ﴿قُلْ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ اللهِ﴾[۴] اور دوسرا اس جگہ پر جہاں تحلل کثرت کو بالعرض ملاحظہ کر کے واسطہ کو مقرر فرمایا وہاں ارشاد فرمایا ﴿مَا اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللهِ﴾[۵]

تیسری فصل

خدا سے سوال نہ ہوگا، مخلوقات سے سوال کیا جائے گا

محققین فلاسفہ کے نزدیک خدا کے فعل مطلق کیلئے ذات مقدس حق اور اس کی ذاتی تجلیات کے علاوہ کوئی غرض وغایت نہیں ہے۔ ایجاد اشیا کے سلسلے میں سوائے اپنی ذات اور اس کی تجلی وظہور کے علاوہ ممکن نہیں ہے کہ حد کوئی دوسری غایت رکھتا ہو، اس لئے کہ جو بھی فاعل اپنی ذات کے علاوہ کسی بھی قصد یا غرض کے پیش نظر کسی چیز کو پیدا کرتا ہے خواہ وہ دوسرے کو نفع وثواب ہی پہنچانا ہو یا عبادت ومعرفت یا حمد وثنا کیلئے ہو وہ فاعل اس غرض کے ذریعے کمال کو پہنچتا ہے اور اس کا وجود اس کیلئے عدم سے اولیٰ ہوتا ہے اور اس بات کا لازمہ نقص وقصور اور فوائد ہیں اور نقص وقصور ذات کامل علی الاطلاق وغنی بالذات وواجب من جمیع الجہات (خدا) کیلئے محال ہے۔ لہذا خدا کے افعال میں نہ تو نفی واعتراض کا مقام ہے اور نہ ہی اعتراض ووضاحت کے بارے میں اس سے سوال کیا جا سکتا ہے ﴿وَلَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ﴾[۶] البتہ خدا کے علاوہ تمام موجودات اپنے افعال میں اپنی ذات کے علاوہ دوسرے اغراض ومقاصد رکھتی ہیں۔ پس عشاق جمال حق ومقربین ومجذوبین کے افعال کا مقصد خدا کے حضور میں اور لقاء اللہ کے مقام تک پہنچنا ہے اور دیگر موجودات

اپنے کمال ونقص اور شدت وضعف کے اعتبار سے اپنی ذات سے الگ غرض رکھتے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ (خدا) جو ذات کمال مطلق اور واجب بالذات ہے وہ من جمیع الجہات واجب ہے اور جس طرح خدا کی ذات نفی واعتراض سے مبرا ہے اس کے افعال بھی اس سے مبرا ہیں اور یہ بات دیگر موجودات میں نہیں ہے۔

نیز چونکہ ذات خدا کامل مطلق اور جمیل علی الاطلاق ہے اس لئے یہ تمام موجودات کی امیدوں کا کعبہ اور تمام سعادۂ کائنات کا انتہائی مقصد ہے۔ مگر خود خدا نہ کوئی امیدوں کا کعبہ رکھتا ہے اور نہ اپنی ذات کے علاوہ کوئی غایت ومقصد رکھتا ہے۔ اس لئے کہ ہر موجود ناقص بالذات ہے اور ہر ناقص فطرتاً اپنی ذات سے گریزاں ہوتا ہے جیسے ہر کامل مرغوب فیہ ہوتا ہے، لہذا تمام افعال وحرکات کی غایت ذات مقدس ہے اور ذات مقدس کیلئے اپنی ذات کے علاوہ کوئی غایت نہیں ہے ﴿فلا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَھُمْ یُسْئَلُوْنَ﴾۔

نیز چونکہ ذات خدا بدرجہ اتم جمال وکمال ہے (لہذا) نظام کائنات جو ذات جمیل کا سایہ ہے، امکان کے انتہائی درجے پر ہے اور یہ مجموعی نظام تمام متصورہ نظاموں میں کامل ترین ہے، اس سے نفی واعتراض اور غایت وغرض کا سوال جہالت کے علاوہ کوئی فائدہ نہیں رکھتا، جیسے کہ ابلیس لعین سے سات سوال کئے گئے تھے اور خدا نے بطریق احسن وبطور جو درستگی کا بوجہ احسن اجمالاً ایک ہی جواب دیا ہے ۱۸؎ پس چونکہ خدا کا فعل غایت کمال پر مشتمل ہوتا ہے، اس لئے اس کے بارے میں سوال نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ دیگر موجودات، چونکہ ذاتاً وفعلاً ناقص ہیں اس لئے ان کے بارے میں سوال ہو سکتا ہے۔

نیز چونکہ خدا حکیم علی الاطلاق ہے اس کا ہر فعل انتہائی مضبوط ومستحکم ہوتا ہے اس لئے اس کے بارے میں سوال کی گنجائش ہی نہیں ہے برخلاف دیگر موجودات کے۔

نیز چونکہ خدا سے صادر ہونے والا ہر فعل اس کی اصل حقیقت اور اس کی خاص ماہیت ہے اور دیگر موجودات ایسے نہیں ہیں لہذا، خدا بالذات فاعل ہے اور اس کے افعال کے بارے میں کیوں کہنا باطل ہے برخلاف دیگر موجودات کے اور چونکہ ارادہ ومشیت وقدرت (الٰہی) عین ذات خدا ہیں اس لئے خدا کے اندر فاعلیت بالذات ارادہ وقدرت کے ذریعے فاعلیت کے عین مطابق ہے اور شبہہ بالطبع کی گنجائش نہیں ہے (اس لئے خدا کے افعال کے بارے میں نفی واعتراض بے معنی چیز ہے) یہ بھی ایک ایسی اعلیٰ بحث ہے جو اپنی جگہ ادلہ وبراہین سے ثابت ہے اور اس سے متکلمین کے بہت سے وہ شبہات جو مختلف ابواب معارف

الٰہیہ میں ہیں، حل ہو جاتے ہیں۔

ہمارے ان بیانات سے حدیث شریف کے جملوں کا آپس میں ارتباط اور ہر ایک کا دوسرے کیلئے علت ہونا معلوم ہو جاتا ہے۔ اب چونکہ فعل خدا حکیم اور نظام اتم کے مطابق ہوتا ہے لہذا وہ جو کرتا ہے کسی سے سوال نہیں کیا جا سکتا، مگر دوسرے ایسے نہیں ہیں۔ لہذا ان سے سوال ہوگا اور یہ علت اس لئے ہے کہ خدا حسنات کیلئے اولیٰ ہے اور بندے سیئات کیلئے اور اس کی یہ علت کہ برائیاں بندوں کی طرف سے ہیں اور حسنات خدا کی طرف سے نیز دوسرے دلائل سے بھی یہ تعلقات واضح ہو سکتے ہیں جن کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

والحمد للہ اولاً وآخراً

توضیحات (۳۵)

۱۔ اصول کافی، ج ۱، ص ۱۵۲، کتاب توحید، باب المشیة و الارادة، حدیث ۶۔

۲۔ اور تم (چاہے) جہاں رہو وہ تمہارے ساتھ ہے۔ سورۂ حدید، آیت ۴/

۳۔ جب تین (آدمیوں) کا خفیہ مشورہ ہوتا ہے تو وہ (خدا) ضرور ان کا چوتھا ہے اور جب پانچ کا (مشورہ) ہوتا ہے تو وہ ان کا چھٹا ہے اور اس سے کم ہوں یا زیادہ وہ جہاں کہیں ہوں وہ ان کے ساتھ ضرور ہوتا ہے پھر جو کچھ وہ (دنیا میں) کرتے رہے قیامت کے دن ان کو اس سے آگاہ کر دے گا، بے شک خدا ہر چیز سے خوب واقف ہے۔ سورۂ مجادلہ/۷

۴۔ جدھر بھی منہ کرو ادھر خدا کا چہرہ ہے۔ سورۂ بقرہ، آیت ۱۱۵/

۵۔ خدا آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ سورۂ نور، آیت ۳۵/

۶۔ وہ وہی چاہتے ہیں جو خدا چاہتا ہے۔ سورۂ دہر، آیت ۳۰۔

۷۔ خدا نے چیزوں کو مشیت سے پیدا کیا اور مشیت کو خود اس سے پیدا کیا

اصول کافی، ج ۱، ص ۱۱۰، کتاب توحید، باب ارادة انہا من صفات الفعل، حدیث ۴۔

۸۔ سورۂ حدید، آیت ۳/۔ ۹۔ سورۂ کافروں، آیت ۱۷/۔

۱۰۔ شرح حکمت الاشراق، ص ۳۵ و ۳۵۸، مقالہ دوئم از قسم دوئم۔

۱۱۔ شرح اشارات محقق طوسی، فصل ۱۷، نمط ۳ اور مصارع المصارع، ص ۱۳۱۔

۱۲۔ اسفار، ج ۲، ص ۲۶۳۔ ۲۷۷، سفر سوئم، موقف سوئم، فصل ۱۲۔

۱۳۔ نیک (انسان) ماں کے پیٹ ہی سے نیک ہوتا ہے اور شقی ماں کے پیٹ ہی سے شقی ہوتا ہے۔

بحار الانوار، ج ۵، ص ۵۳، کتاب العدل والمعاد، باب ۱، حدیث ۱، عبارت میں تھوڑی تبدیلی کے ساتھ۔

۱۴۔ اے رسول کہہ دیجئے سب خدا کی طرف سے ہے۔ سورۂ نساء، آیت ۷۸/۔

۱۵۔ سورۂ نساء، آیت ۷۹/۔ ۱۶۔ سورۂ انبیاء، آیت ۲۳/۔

۱۷۔ جو کچھ وہ کرتا ہے اس کی پوچھ گچھ نہیں ہوسکتی البتہ لوگوں سے بازپرس ہوگی۔ یہ سورۂ انبیاء کی تیسویں آیت کا اقتباس ہے۔

۱۸۔ ابلیس کے سات شبہات کیلئے شہرستانی کی کتاب "ملل ونحل" ترجمہ افضل الدین صدر ترکہ اصفہانی، ص ۱۸ کی طرف رجوع کریں۔

چھتیسویں حدیث

بالسند المتصل الی ثقة الاسلام، محمد بن یعقوب الکلینی عن علی بن ابراهیم، عن محمد بن خالد الطیالسی، عن صفوان بن یحیی عن ابن مسکان، عن ابی بصیر قال

سمعت ابا عبدالله علیه السلام یقول ﴿لم یزل الله عزوجل ربنا، والعلم ذاته ولا معلوم، والسمع ذاته ولا مسموع، والبصر ذاته ولا مبصر، والقدرة ذاته ولا مقدور، فلما احدث الاشیاء وکان المعلوم وقع العلم منه علی المعلوم والسمع علی المسموع والبصر علی المبصر والقدرة علی المقدور

قال قلت فلم یزل الله متحرکا؟ قال فقال تعالی الله عن ذلک، ان الحرکة صفة محدثة بالفعل قال فقلت فلم یزل الله متکلما؟ قال فقال ان الکلام صفة محدثة لیست بازلیة، کان الله عزوجل، ولا متکلم﴾

ترجمہ: ابوبصیر کا کہنا ہے میں نے حضرت امام جعفر صادقؑ کو فرماتے ہوئے سنا ”خداوند عزوجل ہمیشہ سے ہمارا پروردگار تھا جبکہ علم اس کی ذات تھا لیکن کوئی معلوم موجود نہیں تھا، شنوائی اس کی ذات تھی جبکہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو سنی جاسکے، بینائی اس کی ذات تھی جبکہ دیکھی جانے والی کوئی چیز نہیں تھی، قدرت اس کی ذات تھی جبکہ کسی مقدور کا وجود تک نہیں تھا۔ پھر جب اس نے اشیا کو پیدا کیا اور معلوم وجود میں آ گیا تو اس کا علم معلوم پر، سماعت مسموع پر، بینائی دیکھی جانے والی چیز پر اور اس کی قدرت مقدور پر واقع ہوئی۔

ابوبصیر کہتے ہیں میں نے عرض کی: تو کیا خدا ہمیشہ سے متحرک تھا۔ جواب میں آپؑ نے فرمایا خدا اس

سے برتر ہے، یقیناً حرکت ایک حادث صفت ہے فعل کیلئے۔ میں نے عرض کی تو کیا خدا ہمیشہ سے متکلم تھا؟ جواب میں آپؑ نے فرمایا کلام ایک ایسی صفت ہے جو حادث ہے ازلی نہیں ہے جبکہ اس وقت خدائے عزوجل تھا درحالیکہ کوئی متکلم نہیں تھا"۔

شرح "لم یزل اللہ عزوجل ربنا" ظاہراً "ربنا" "زال" کی خبر ہے اور جملہ والعلم ذاتہ اس کیلئے حال ہے لیکن اس سے جملہ سلیس اور مقصود حاصل نہیں ہوتا، کیونکہ یہاں پر مقصود ربوبیت کے ازلی ہونے کا اثبات نہیں ہے، بلکہ معلوم سے قبل علم کی ازلیت کا اثبات مقصود ہے۔ البتہ کہا جا سکتا ہے کہ مجموعی طور پر اس ترکیب سے مقصد حاصل ہو جاتا ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ "ربنا" اس مقام پر مرفوع ہو اور "زال" کے اسم کے تابع ہو جبکہ خبر محذوف ہو اور جملہ "والعلم ذاتہ" اس پر دلالت کرتا ہو۔ ایسی صورت میں عبارت یوں ہوگی "لم یزل اللہ ربنا عالماً و العلم ذاتہ" اور یہ بھی احتمال ہے کہ "زال" تامہ ہو اور صرف مرفوع پر اکتفا کرتا ہو اس بنا پر یہ "زال یزول" ہوگا نہ کہ "زال یزال" کیونکہ "یزال" کا ماضی ہمیشہ ناقص ہوتا ہے جبکہ یزول کا ماضی ہمیشہ تام ہوتا ہے۔

"وکان المعلوم" کی عبارت میں "کان" تامہ ہے یعنی جب اشیا کو ایجاد کیا تو معلوم وجود میں آ گیا۔

"محدثۃ بالفعل" کی عبارت میں اس بات کا احتمال ہے کہ "بالفعل" بالقوہ کے مقابلے میں ہو۔ مختصر یہ کہ معنی مصدری کا حامل ہو، یعنی جو صفت ایجاد سے ہوگی وہ حق تعالیٰ کی صفت نہیں ہوگی۔ بہر حال اس حدیث شریف میں نہایت اہم اور قابل احترام مطالب ہیں جن میں سے بعض کا تذکرہ ہم ان کے اپنے مقام پر کریں گے۔

پہلی فصل

ذات کے ساتھ صفات حق کی عینیت

جان لو کہ اس حدیث شریف میں صفات کمالیہ حقیقیہ کے ساتھ ذات اقدس حق کی عینیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جیسے علم، قدرت اور سمع و بصر۔ البتہ یہ مباحث بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں لیکن اس مقام پر ان کی تفصیل مناسب نہیں ہے۔ البتہ ہم فلاسفہ کے محکم دلیل و برہان اور اہل معرفت کے طریقے کے مطابق اس سلسلے میں مذہب حق کی طرف ضرور اشارہ کریں گے۔

اپنے مقام پر یہ بات مکمل طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ جو چیز کمال کی قسم اور جمال کی صنف سے ہے اور تام و تمام ہے وہ عین وجود اور اصل حقیقت ہستی سے متعلق ہے اور عالم وجود میں ایک ہی محترم بنیاد کے علاوہ کچھ بھی نہیں جو تمام کرامت کا سرچشمہ اور تمام نیکیوں کا منبع ہے اور وہ حقیقت وجود ہے اور اگر تمام کمالات عین حقیقت وجود نہ ہوں اور کسی نہ کسی اعتبار سے عینیت کی گہرائی میں اس سے جدا ہوں اور دونوں کے درمیان دوگانگی پائی جاتی ہو تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ عالم امکان میں دو بنیادیں اور اصول موجود ہیں اور یہ بات بہت سے مفاسد کی حامل ہے۔ پس جو چیز بھی کمال ہے وہ مفہوم اور ماہیت کے اعتبار سے کمال نہیں ہے، بلکہ نفس عین میں تحقق وحصول کی بنیاد پر کمال ہے۔ جو چیز نفس عین اور نفس الامر کی گہرائیوں میں متحقق ہے وہ ایک ہی چیز ہے جسے وجود کہا جاتا ہے۔ پس ہر کمال ایک بنیاد یعنی حقیقت وجود کی طرف لوٹتی ہے۔

اور یہ بات بھی پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ حقیقت وجود تمام پہلوؤں سے بسیط محض ہے اور اس کا مقام ربوبیت اس وقت تک ہر قسم کی ترکیب سے مبرا ہے جب تک وہ اپنی ذات محض کی حیثیت میں اور خالص حیثیت کے ساتھ ہوتی ہے لیکن اگر وہ اپنی اصل حقیقت سے تنزل کر جائے تو مشہود مصادر کے اعتبار سے عقلی وخارجی ترکیب اس پر عارض ہو جائے گی۔ لیکن وہ اپنی ذات کے اعتبار سے بسیط ہے جبکہ ترکیب اس کیلئے ایک اجنبی اور عرضی چیز ہوگی۔

مذکورہ بیانات سے دو مقدس اصول اخذ کیے جا سکتے ہیں

ایک اصل یہ کہ بسیط من جمیع الجہات اپنی واحد احد منفرد حیثیت کے اعتبار سے تمام کمالات کا حامل ہے۔ وہ جس حیثیت سے موجود ہے اسی حیثیت سے عالم، قادر، حی اور صاحب ارادہ بھی ہے اور دیگر اسماء وصفات جمال وجلال کا مصداق بھی۔ وہ جس جہت سے قادر ہے اسی جہت سے عالم بھی ہے اور جس جہت سے عالم ہے اسی جہت سے قادر بھی ہے۔ حتی اس میں فرض عقلی اور اعتبار عقلی کے لحاظ سے بھی کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن اسماء کے مفہوم اور جس کیلئے ان لغات کو وضع کیا گیا ہے اس میں اختلاف ایسے مفاہیم عقلیہ کے اعتبار سے ہے جو لابشرط ہیں (مدلول بسیط یا مرکب سے قید کے بغیر)، حقیقت عینیہ میں اختلاف سے اس کا تعلق نہیں ہے اور یہ بات بھی واضح ہو چکی ہے کہ کمال کے مختلف مفاہیم ایک ہی چیز سے نکلتے ہیں، بلکہ سابقہ بیان سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ تمام مفاہیم کمال حیثیت واحدہ سے نکلتے ہیں اور مفاہیم کمال مختلف حیثیتوں

اور جہات سے نکلتے ہیں جیسا کہ بعض ممکنات میں اسی طرح سے ہے تو یہ بالعرض ہے اور حقیقت وجود کے تنزل اور بالعرض اعدام کے ساتھ مشابہت کے اعتبار سے ہے۔

دوسری اصل یہ ہے کہ جو ہر جہت سے کامل اور کمال و خیر محض ہے اسے بسیط من جمیع الجہات بھی ہونا چاہئے، نیز انہی دونوں اصولوں سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اس میں ترکیب کا کوئی امکان نہیں ہے۔ ترکیب چاہے کسی بھی نوعیت کی ہو وہ ہر جہت سے کامل نہیں ہوسکتی اور نقص وعدم کا بھی اس میں امکان پیدا ہو جاتا ہے اور ناقص چیز کبھی بسیط مطلق نہیں ہوسکتی۔

پس حق تعالیٰ چونکہ بسیط تام ہے اور ترکیب کا جو امکان وفقر اور غیر سے وابستگی کی موجب ہے، اس میں مطلق کوئی شائبہ نہیں ہے، وہ ہر جہت سے کامل اور تمام اسماء وصفات کا حامل ہے۔ وہ اصل حقیقت اور صریح ماہیت ہستی ہے جبکہ اس کے وجود میں غیر وجود، ور کمال میں غیر کمال کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ پس وہ وجود محض ہے، کیونکہ اگر اس میں غیر وجود کا کوئی امکان ہوتا تو اس میں ترکیب کی بدترین قسم یعنی وجود وعدم کی ترکیب پائی جاتی۔ پس وہ علم محض، حیات محض، قدرت محض، بصیر وسمیع محض اور دیگر کمالات محضہ کا حامل ہے۔ اس بنا پر امام صادقؑ کا یہ فرمان بھی سمجھ میں آ جاتا ہے ﴿وَالْعِلْمُ ذَاتُهُ وَالْقُدْرَةُ وَالسَّمْعُ وَالْبَصَرُ ذَاتُهُ﴾

نقل قول اور تحقیق مطلب

اوصاف حق کی تقسیم کے سلسلے میں حکماء کا بیان

جان لو کہ حکمائے الٰہی نے صفات حق تعالیٰ کو تین طرح سے تقسیم کیا ہے۔

اول صفات حقیقیہ اور اس کی خود دو قسمیں ہیں پہلی، صفات حقیقیہ محضہ، جیسے حیات، ثبات، بقا اور ازلیت وغیرہ۔ دوسری، صفات حقیقیہ ذات الاضافہ جیسے علم، قدرت اور ارادہ جو معلوم ومقدور ومراد کی طرف اضافہ ہوتا ہے اور ان دونوں قسم کی صفات کو ''عین ذات'' کہا جاتا ہے۔

دوئم: صفات اضافیہ محضہ، جیسے مبدئیت، رازقیت، راحمیت، عالمیت اور قادریت وغیرہ۔

سوئم صفات سلبیہ محضہ، جیسے قدوسیت، فردیت اور سبوحیت وغیرہ اور ان دونوں قسم کی صفات کو ''زائد بر ذات مقدس'' کہا جاتا ہے اور ہر سلب کو سلب واحد کی طرف یعنی سلب امکان کی طرف لوٹایا جاسکتا

ہے۔ اسی طرح تمام اضافات کو اضافۂ واحدہ موجدیت کی طرف لوٹاتے ہیں اور مبدأ اضافات کو اضافۂ اشراقیہ اور اضافۂ نوریہ کی طرف لوٹایا جا سکتا ہے[۲] اور صفات حقیقیہ میں یہ تقسیمات وعینیت اور صفات اضافیہ اور سلبیہ میں زیادت کا ذکر جس طرح کیا گیا ہے اور اس پر برہان قائم کیا گیا ہے، راقم کے نزدیک صحیح نہیں ہے اور محکم فلسفی دلیل و برہان اور صحیح عرفانی اعتبار کے مطابق نہیں ہے، کیونکہ اگر اسماء وصفات کے مفاہیم کا باب کھلتا ہے اور ہم کثرت مفہومی کی طرف نظر کرتے ہیں تو کسی صفت کو بھی عین ذات قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ اگر ذات کو عین اوصاف اضافیہ یا اوصاف سلبیہ قرار دیں تو اس کا لازمہ حق تعالیٰ کے اضافۂ محض اور عین حیثیت سلبیہ ہونے کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اسی طرح اگر ہم حق تعالیٰ کو عین اوصاف حقیقیہ قرار دیں تو اس کا لازمہ حق تعالیٰ کے نفس مفاہیم اعتباری اور نفس معانی عقلی ہونے کی صورت میں ظاہر ہوگا جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بالاتر ہے اور اگر ہم حقائق اوصاف اور اسماء وصفات کے عینی مصداق کو مدنظر رکھیں تو تمام اسماء وصفات اضافی وحقیقی عین ذات مقدس ہوں گے اور عالمیت وعلم، قادریت اور قادر کے درمیان صرف مفہومی اعتبارات کے لحاظ سے فرق رہ جائے گا اور تمام اوصاف اضافیہ رحیمیت اور رحمانیت ذاتی کی طرف لوٹ جائیں گے یہاں تک کہ رازقیت اور خالقیت وغیرہ بھی

اور یہ جو ہر سب کو سلب امکان اور تمام اضافات کو اضافۂ واحدہ کی طرف لوٹایا گیا ہے اور اوصاف حقیقیہ میں سے کسی چیز کی طرف نہیں لوٹایا گیا یہاں پر بھی اگر مفاہیم کو دیکھا جائے تو ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسرے کی طرف نہیں لوٹایا جا سکتا نہ تو سلبیوں اور اضافات میں اور نہ ہی اوصاف حقیقیہ میں اور اگر حقائق کی طرف نظر کی جائے تو تمام اوصاف حقیقیہ بھی حقیقت واحدۂ واجبہ کی طرف لوٹیں گے۔

ذات مقدس کے ساتھ اوصاف کی عینیت کا تحقیقی جائزہ

مختصر یہ کہ اوصاف کے باب میں حکمت نظری کے حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اوصاف حقیقی اور اضافی مطلقاً مفاہیم کے اعتبار سے مختلف ہیں اور ان میں سے کوئی ایک بھی عین ذات مقدس نہیں ہے اور حقیقت کے مطابق یہ تمام عین ذات مقدس ہیں تاہم اوصاف کیلئے دو مرتبے ہیں ایک ذات اور اوصاف ذاتی کا مرتبہ جس سے علم وعالمیت اور قدرت وقادریت کو اخذ کیا جا سکتا ہے اور ایک اوصاف فعلی کا مرتبہ ہے جس سے بھی علم وعالمیت اور قدرت وقادریت کو اخذ کیا جا سکتا ہے لیکن اوصاف سلبیہ جیسے قدوسیت

وسبوحیت اور سماتنزیہ ذات مقدس کے لوازم میں سے ہیں اور ذات مقدس ان کے اعتبار سے مصداق بالعرض ہے، کیونکہ حق تعالیٰ کمال مطلق ہے اور کمال مطلق بالذات کا اس پر اطلاق ہوتا ہے، کیونکہ اصل حقیقت وہی ہے اور اس سے نقائص کو سلب کرنا اس کے لوازم میں سے ہے اور سلب نقص کا عرض مصداق کمال ہے اور اہل معرفت واصحاب قلوب ''فیض اقدس'' کے اعتبار سے مقام تجلی کو مبدئے اسما ذاتی قرار دیتے اور فیض مقدس کے اعتبار سے مقام تجلی کو مبدئے اوصاف فعلی جانتے ہیں[۳] اور فیض مقدس کے اعتبار سے تجلی کو ''غیر'' قرار نہیں دیتے جیسا کہ ''عین'' بھی قرار نہیں دیتے اور اگر اس سلسلے میں بحث کو جاری رکھا گیا تو ان کے طریقوں پر اسما وصفات کی بحث میں داخل ہونا پڑے گا جو ہمیں اپنے مقصد سے دور کر دے گا۔

اور بعض (محققین) نے صفات حق تعالیٰ کو امور عدمی کی طرف لوٹایا ہے اور ''علم'' کو عدم جہل اور ''قدرت'' کو عدم عجز سے تعبیر کیا ہے۔ اہل معرفت میں سے مگر میں نے کسی کو اس بات پر اصرار کرتے دیکھا ہے تو وہ عارف جلیل قاضی سعید قمی[۴] ہیں جنہوں نے اس سلسلے میں اپنے استاد کی اتباع کیا ہے جو ظاہر ''ملا رجب علی''[۵] ہیں اور ان کا بیان شرح ''توحید''[۶] میں مذکور ہے۔ ہم پہلے ہی ان کے برہان کا جواب دے چکے ہیں۔ اسی طرح بعض حدیث کے ظواہر سے انہوں نے تمسک کیا ہے، ہم اس کا جواب بھی برہانی انداز میں دے چکے ہیں۔

دوسری فصل

تخلیق سے قبل علم کی ماہیت کا بیان

مقدس ترین مباحث میں سے ایک جس کی طرف اس حدیث شریف میں اشارہ کیا گیا ہے وہ ازل میں تخلیق وایجاد سے پہلے اپنے معلول کا علم ہے۔ اس مسئلے میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے کہ آیا خود یہ علم اور اس کی کیفیت اجمالی ہے یا تفصیلی یا یہ کہ زائد بر ذات ہے یا عین ذات یا ایجاد سے قبل ہے یا ایجاد وتخلیق کے بعد؟ البتہ اس کی تفصیل ہمارے علما کی کتابوں میں موجود ہے لیکن اس مقام پر ہم صرف اس نکتے کی تحقیق پر اکتفا کریں گے اور دوسرے اقوال پر تنقیدی نگاہ ڈالنے سے صرف نظر کریں گے

ارباب برہان اور اصحاب عرفان کے نزدیک جو چیز ثابت شدہ ہے اسی کی طرف اس حدیث شریف میں اشارہ کیا گیا ہے یعنی ایجاد وتخلیق سے قبل ازل سے ہی معلوم سے متعلق علم ہے اور وہ علم عین ذات ہے

اور اس علم کے تفصیلی ہونے کی طرف حدیث میں یوں اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ اشیاء کو دیکھتا ہے جبکہ دیکھی جانے والی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ وہ سمیع ہے جبکہ کوئی مسموع نہیں ہے، کیونکہ بصیر و سمیع ہونا تفصیلاً مبصرات و مسموعات کے شہود ہیں جیسا کہ یہ ایک امر واضح ہے۔ اسی طرح اس جگہ پر بھی علم تفصیلی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جیسا امام علیہ السلام نے فرمایا ہے: ﴿فلما احدث الأشياء وكان المعلوم وقع العلم منه على المعلوم﴾ کیونکہ ایجاد و تخلیق کے بعد بھی علم میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے، بلکہ متحقق ہونے کے بعد علم معلوم پر واقع ہوا اور ہم اس کے بعد معلوم پر وقوع علم کا مطلب بیان کریں گے۔

محقق فلاسفہ کے نزدیک ایمان سے متعلق اس شریف مطلب کا بیان کچھ یوں ہے کہ جب گزشتہ باب میں یہ بات ثابت ہو گئی کہ حق تعالیٰ صرف وجود اور صرف کمال ہے اور صرف وجود بساطت کے ساتھ جو وحدت تامہ رکھتا ہے اس کی وجہ سے وہ تمام کمالات کا جامع اور مکمل طور پر تمام وجودات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور جو چیز اس کے وجود کی حدود سے باہر ہے وہ عدم اور نقص اور مجموعی طور پر شر ہے اور اس ذات مقدس کے ساتھ دیگر مراتب وجود کی نسبت اس طرح ہے جس طرح کمال کے ساتھ نقص کی نسبت ہوتی ہے اور کمال مطلق کا علم بغیر کسی نقص و عیب کے مطلق کمال کا علم ہے اور یہ بسیط کا عین کشف تفصیلی کل ہے اگرچہ اس کے دائرۂ علم سے اصلاً و ابداً کوئی موجود خارج نہیں ہے لیکن اس میں کسی لحاظ سے بھی کثرت اور ترکیب کا گزر نہیں ہے۔۸

لیکن عرفا کی روش کے مطابق حق تعالیٰ مقام حضرت "واحدیت" اور مقام جمع اسمائی میں مستجمع جمیع اسماء و صفات ہے اور اعیان ثابتہ تمام موجودات ازل سے ایجاد و تخلیق سے قبل حضرت جمع میں اسماء الٰہیہ کے لوازم میں سے ہے اور تجلی مطلق ذات کا تعلق مقام احدیت اور مقام غیب ہویت، تمام اسماء و صفات کے کشف اور ان کے لوازم میں سے ہے جو تجلی واحد اور کشف بسیط مطلق کے اعتبار سے تمام موجودات کے اعیان ثابتہ ہیں۔ پس عین کشف علمی کے اعتبار سے تجلی فیض اقدس کے ذریعے ذات و اسماء و صفات و اعیان کا کشف ہوتا ہے جبکہ اس میں کسی ترکیب اور کثرت کا بھی گزر نہیں۔۹

اور یہ دو طریقے نہایت مستحکم، متین اور عظیم ہیں لیکن چونکہ بہت زیادہ باریک نکات پر مشتمل ہیں نیز اہل علم لوگوں کی اصطلاحات اور فلسفہ و اصحاب قلوب کے بیان کردہ بہت سے اصولوں پر مستور رہیں لہٰذا جب تک وہ مقدمات حاصل نہ ہوں اور پوری طرح ان سے انس حاصل نہ ہو اور ان میں مکمل مہارت حاصل نہ

کریں اور علمائے باللہ پر کامل حسن ظن نہ ہو، اس وقت تک ان بیانات سے کچھ حاصل نہ ہوگا، بلکہ حیرت میں مزید اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ اس لحاظ سے بہتر اور مناسب یہی ہے کہ اس مسئلے کو زیادہ سادہ انداز میں جو عوام الناس کے اذہان کے بھی قریب تر ہو، بیان کیا جائے۔

واجب الوجود تعالیٰ شانہ کی علیت و مبدئیت طبیعی فاعلوں کی علیت کی مانند نہیں ہے کہ جو پہلے سے موجود مواد کو آگے پیچھے کرتے ہیں جیسے بڑھئی جو پہلے سے موجودہ مواد میں تبدیلی لاتا ہے، کبھی ان کو جوڑتا ہے اور کبھی توڑتا ہے یا ایک مستری جو پہلے سے موجود سامان کو ترتیب دیتا ہے، بلکہ حق تعالیٰ فاعل الٰہی ہے جو اشیا کو بغیر کسی سابقے کے اپنے ارادے کے ذریعے وجود میں لاتا ہے اور خود اس کا علم اور ارادہ اشیا کے وجود وظہور کی علت ہے۔ پس عالم امکان اس کے دائرۂ علم میں ہے اور اسی کے اظہار سے پوشیدہ خزانۂ غیب ہویت سے اشیا ظاہر ہوتی ہیں ﴿وعندہ مفاتح الغیب لا یعلمھا الا ھو﴾ ۔ علما کے نزدیک ذات مقدس کی نسبت صفحۂ اعیان سے بالکل ایسے ہی ہے جیسے اذہان کی نسبت نفس انسانی کے ساتھ جو ارادے کے ذریعے ہی پیدا کرتا اور جو چیز غیب ہویت میں ہے، سے ظہور میں لے آتا ہے۔ پس تمام ذرۂ تحقق علم کے احاطے میں ہے، وہاں سے ہی ہر چیز ظاہر ہوتی ہے، و اس جگہ پر ہر چیز کو لوٹ کر واپس جانا ہے ﴿انا للہ وانا الیہ راجعون﴾۔

زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ کسی سبب اور شے کی علت تامہ کا علم اس شے کا علم بھی ہوتا ہے، مثلاً ایک نجومی ایک خاص دن کے کسی مخصوص وقت میں سورج اور چاند گرہن کا علم ان کے اسباب سے مطلع ہونے کی بنا پر حاصل کرتا ہے، کیونکہ وہ پہلے سورج، چاند اور کرۂ ارض کی گردش کو نوٹ کرتا ہے اور اس کے بعد شمس وقمر کے درمیاں زمین کے حائل ہونے، نیز زمین وسورج کے درمیان چاند کے حائل ہونے کا وقت معلوم کر لیتا ہے اور اگر اس نے صحیح طور پر اندازہ لگایا ہے تو اس میں ایک سیکنڈ کا بھی فرق نہیں ہوگا اور چونکہ اسباب ومسببات کا تمام سلسلہ ذات مقدس مبدء المبادی پر ہی ختم ہوتا اور حق تعالیٰ اپنی ذات کا علم رکھتا ہے جو تمام موجودات کا سبب ہے سبب کے علم کی بنا پر وہ مسببات کا بھی علم رکھتا ہے۔

ہر شخص اپنے مرتبے کے مطابق ان مذکورہ صورتوں میں سے کسی ایک صورت کو اختیار کرتا ہے۔ البتہ ان میں سے بعض صورتیں بعض کی نسبت زیادہ مضبوط، استوار اور مقصد کے زیادہ قریب ہیں۔

تیسری فصل:

حق تعالیٰ کے سمیع وبصیر ہونے کے معنی

فلاسفۂ عظام کے درمیان حق تعالیٰ کے اسماوصفات کے باب میں ایک بحث حق تعالیٰ کے "سمیع وبصیر" ہونے کا اثبات ہے، چنانچہ اکثر حکما اور ماہرین علم کلام نے سمع وبصر کو علم پر منحصر سمجھا ہے جبکہ شیخ اشراق نے علم کو "سمع وبصر" ہی کی طرف لوٹایا ہے۔ البتہ ہر ایک نے ایک مخصوص طرز بیان کے ساتھ اس بحث کو موضوع گفتگو بنایا ہے جسے اختصار کے پیش نظر یہاں پر بیان نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ ہم بزرگ علما کے مسلک ومکتب کو اس انداز میں ایک طریقے سے بیان کریں گے جس سے مطلق اسماوصفات کے سلسلے میں حق واضح ہو جائے۔

بے شک بہت سے فلاسفہ اور اکابر علما نے بعض جہات سے غفلت اور سہل انگاری کی بنا پر بعض اسما وصفات کو بعض دیگر اسماوصفات کی طرف لوٹایا ہے، چنانچہ ان کے درمیان معروف ومسلّم یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا ارادہ خیر ونیکی اور نظام اکمل کے علم سے عبارت ہے یا مثلاً "سمع وبصر اور علم" کے باب میں پایا جانے والا اختلاف اور ان میں سے ہر ایک کو دوسرے کی طرف لوٹانے کا مسئلہ، چنانچہ اس بات کو بیان کیا جا چکا ہے اور یہ نکتہ خلاف تحقیق اور بعض جہات سے غفلت کا نتیجہ ہے، کیونکہ اگر ارادے کا خیر ونیکی کے علم کی طرف لوٹنے یا علم کا سمیع ہونے یا سمیع ہونے کا علم کی طرف لوٹنے سے مراد یہ ہے کہ حق تعالیٰ نہ تو ارادہ رکھتا ہے اور نہ ہی سمیع وبصیر ہے، بلکہ اسی علم کو ارادہ اور سمع وبصر قرار دیا گیا ہے تو یہ بات نہایت باطل اور رسوا کن ہے، کیونکہ اس کا لازمہ یہ ہوگا کہ حق تعالیٰ ارادہ واختیار کے بغیر مبدئے وجود ہو۔ علاوہ ازیں حق تعالیٰ کے اوصاف کمالیہ کے ساتھ متصف ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ صفت "موجود بما ہو موجود" کیلئے صفت کمال ہو۔ مختصر یہ کہ صفت کو چاہیے کہ وہ خود حقیقت وجود ہو اور اصل ذات وجود کے کمالات میں سے ہو اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ "ارادہ" حقیقت مطلق وجود کے صفت کمال میں سے ہے، پس وجود جتنا گھٹتا چلا جائے گا اور مقام سے تنزل کرے گا اتنا ہی اس میں ارادہ ضعیف وکمزور ہوتا چلا جائے گا یہاں تک کہ ایک مقام ایسا آئے گا جب اس وجود سے ارادہ مکمل طور پر سلب ہو جائے اور اکثر لوگ اسے صاحب ارادہ قرار نہیں دیتے۔ جیسے معدنیات اور نباتات وغیرہ جیسی قدرتی چیزیں اور وجود جتنے کمالات اور اعلیٰ مدارج کی بلندیاں

طے کرتا جائے گا اتنا ہی اس میں ارادہ زیادہ ظاہر اور قوی ہوتا چلا جائے گا۔ چنانچہ طبیعی موجودات میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ مقام ہیولیٰ، جسم و عنصر اور معدن و نبات کے مرتبے سے جونہی خارج ہوتے ہیں، علم و ارادہ ان میں ظاہر ہونا شروع ہو جاتا ہے اور جس قدر وہ اعلیٰ مدارج طے کرتے جاتے ہیں یہ شریف و مقدس جوہر ان میں کامل تر ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ انسان کامل ایسے ارادۂ کامل کا حامل ہوتا ہے جو صرف ارادے کے ذریعے ایک عنصر کو دوسرے عنصر میں تبدیل کر دیتا ہے اور عالم طبیعت اس کے ارادے کے سامنے خاضع ہوتا ہے۔ پس یہاں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ارادہ، وجود اور موجود بما ہو موجود کی صفات کمالیہ میں سے ہے اور ذات حق تعالیٰ کیلئے اس حقیقت (ارادہ) کو بھی کسی دوسری حقیقت کی طرف لوٹائے بغیر ثابت کر سکتے ہیں۔

اسی طرح تحقیق کے مطابق "سمع و بصر" بھی کمالات موجود مطلق کی تصدیق ہے اور سننے اور دیکھنے کی حقیقت نہ جسمانی آلات پر منحصر ہے اور نہ ہی ابزار و آلات پر منحصر علوم پر، بلکہ آلات کی ضرورت عالم طبیعت اور ملک بدن میں نفس کی قوت سماعت و بصارت کے ظہور میں ہے، چنانچہ علم کو بھی ملک طبیعت میں ظہور کیلئے ام الدماغ کی ضرورت ہے اور یہ عالم طبیعت اور ملک بدن کے ناقص ہونے کی بنا پر ہے نہ کہ علم و سمع و بصر میں سے کوئی ناقص ہے ( )۔ (وگرنہ بھی نفس ناطقہ) حقائق عالم غیب کا مشاہدہ کرتا ہے اور ملائکہ و روحانیین کے ملکوتی کلام کو سنتا ہے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام مناجات کے دوران کلام حق کو سنتے تھے اور حضرت ختمی مرتبت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ملائکہ سے تکلم فرماتے اور حضرت جبرئیل ؑ کو ملکوتی صورت میں دیکھتے تھے جبکہ کوئی اور کان اس (خدا کی) آواز کو نہ سنتا اور نہ ہی کوئی آنکھ انہیں (ملائکہ ؑ کو) دیکھ پاتی تھی، حالانکہ (لوگ) نزول وحی کے وقت ایک ہی محفل میں رسول اللہ ؐ کے ہمراہ ہوتے تھے۔

مختصر یہ کہ سمع و بصر کا تعلق بھی ایسے علوم سے ہے جو اصل علم سے زائد، حقیقت علم کے علاوہ اور مطلق وجود کے کمالات میں سے ہیں۔ پس حق تعالیٰ کیلئے ان کا اثبات لازم اور ضروری ہے جو مبدأ اصل وجود اور سرچشمۂ کمال ہستی ہے۔

اگر ارادہ و سمع و بصر کو علم کی طرف یا علم کو ان کی طرف لوٹانے والوں کی مراد یہ ہے کہ علم و ارادہ ایک ہی جہت و حیثیت سے حق تعالیٰ کیلئے ثابت ہیں اور ذات مقدس میں سمع و بصر و علم کی مختلف جہات اور حیثیتیں نہیں ہیں تو یہ بات برحق اور دلیل و برہان کے موافق ہے۔ لیکن اس چیز کو نہی اوصاف کے ساتھ مختص کرنے

کی کوئی دلیل نہیں ہے، بلکہ مطلق اوصاف اسی حقیقت کی طرف لوٹتے ہیں جو وجود محض ہے اور یہ مفہوم ذات حق کیلیے مختلف و متکثر اوصاف کے اثبات کے منافی نہیں ہے، بلکہ اسی پر تاکید ہے، کیونکہ یہ ایک ثابت شدہ امر ہے کہ وجود جس قدر وحدت کے زیادہ نزدیک اور کثرت کے افق سے زیادہ دور اور مبرا ہوگا، اتنا ہی اسماء و صفات کی نسبت زیادہ جامع ہوگا یہاں تک کہ محض وجود اور حقیقت بسیط واجب ﴿جلت عظمته وعظمت قدرته﴾ کا مرتبہ حاصل کرے جو وحدت و بساطت کی غایت، تمام کمالات کا مرکز اور تمام اسماء وصفات کا جامع ہے، نیز در حقیقت تمام مفاہیم کمال اور معانی جلال و جمال اسی پر صادق آتے ہیں۔ ذات مقدس حق پر ان کا اطلاق استحقاق اور اولویت کے تمام مراتب کی نسبت زیادہ حق اور اولویت کا حامل ہے۔

اس کا اجمالی بیان یہ ہے کہ وحدت جتنی اقوی و کمل ہوگی مفاہیم کا اطلاق اتنا ہی زیادہ ہوگا اور اسما وصفت میں اضافہ ہوگا اس کے برعکس، ایک موجود جتنا افق کثرت سے نزدیک تر ہوگا، اتنا ہی مفاہیم کمال اس پر کمتر صادق آئیں گے اور صادق آنے کے اعتبار سے بھی ضعیف تر اور مجاز کے قریب تر ہوں گے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وحدت مساوق وجود ہے اور "موجود بما ہو موجود" کے کمالات میں سے ہے اور یہاں پر مساوق ہونے سے مراد یہ ہے کہ اگرچہ "وجود" اور "وحدت" کا مفہوم مختلف ہے لیکن عالم عین میں حقیقت وجود عین حقیقت وحدت ہے۔ چنانچہ کثرت جس جگہ بھی پڑاؤ ڈالتی ہے وہاں پر نقص و عدم شر وضعف اور سستی و بے حالی بھی اپنے قدم جما لیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وجود نقص کی منزلوں کی طرف جتنا تنزل کرتا ہے، وہاں کثرت تمام مراتب وجود سے زیادہ ہوتی ہے، اور مقام ربوبیت وساحت مقدس کبریائی جل وعلا، صرف وجود اور صرف وحدت و بساطت ہے، اس میں کثرت و ترکیب کا کوئی گزر نہیں ہے اور اس سے قبل ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ وجود اصل حقیقت کمال اور سرچشمۂ جلال و جمال ہے، لہذا صرف وجود، صرف وحدت و صرف کمال ہے پس صرف وحدت بھی صرف کمال ہے، لہذا جس کی وحدت اعلیٰ مرتبے پر ہو تمام اسماء وصفات و کمالات کا اس پر اطلاق ہوتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کا اس پر اطلاق ہونا احق و اولیٰ ہے جبکہ اس کے برعکس، جتنا کثرت سے نزدیک ہوگا اتنا ہی اس میں نقص زیادہ ہوگا اور اسی اعتبار سے اس پر مفاہیم کمالات و اسماء وصفات کی صداقت بھی ناقص ہوگی اور اس کے صادق آنے کی کیفیت بھی ضعیف تر ہوگی پس حق تعالیٰ جلا جلالہ تمام کمالات کا حامل اور مستجمع جمیع اسماء وصفات ہے جبکہ ان میں سے کوئی اسم، صفت یا کمال دوسرے کی طرف بھی نہیں لوٹتا، بلکہ ہر ایک اپنی حقیقت کے مطابق اس کی ذات مقدس پر

صادق آتا ہے اور ذات مقدس میں کسی اعتبار سے بھی کثرت لازم آئے بغیر اس کے سمع و بصر اور ارادہ و علم سب حقیقی معنوں میں ہیں ﴿فلهُ الأسماءُ الحُسنىٰ وَالأمثالُ العُليا وَالكِبرياءُ وَالآلاءُ﴾[۱۳]

چوتھی فصل:

معلومات کے ساتھ علم حق تعالیٰ کے تعلق کی کیفیت

جان لو! جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ حق تعالیٰ کے علم بسیط ذاتی اور کشف وحدانی کی بنا پر تمام موجودات اپنے موجود ہونے کے لحاظ سے اور کمال کے اعتبار سے جہات وجودیہ کمالیہ، خدا کے نزدیک معلوم و مکشوف ہیں اور یہ کشف عین بساطت اور وحدت کے ساتھ تام تفصیلی ہے یہاں تک کہ سماوات، ارواح اور اراضی اشباح میں سے ایک ذرہ بھی ازلاً اور ابداً اس کے دائرۂ علم سے خارج نہیں ہے اور یہ علم اور کشف ازلی اور عین ذات مقدس ہے اور معلومات اپنے تعینات اور حدود کے ساتھ جن کی بازگشت عدم اور نقص کی طرف ہے، ایجاد و تحقیق کے بعد بالعرض حاصل ہو جاتی اور علم بالعرض سے متعلق ہو جاتی ہیں، اور یہ تعلق بالعرض ایجاد و تخلیق کے بعد ہوتا ہے اور اس حدیث شریف میں اسی چیز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یعنی ﴿فلما أحدث الأشياءَ وكان المَعلومُ، وقعَ العِلمُ منهُ على المَعلومِ﴾ اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ عبارت تجلی فیض مقدس سے حاصل ہونے والے علم فعلی کی طرف اشارہ ہو اور معلومات سے مراد معلومات بالذات ہوں کہ جو فیض مقدس سے متعلق وجودی حقائق اور یک ظہوری نوری تجلی ہیں۔

پس پہلے احتمال کی بنا پر عبارت یوں ہوگی: ﴿فلما تجلّى بفيضِهِ المُقدَّسِ وظهرَ الكونُ بالعرضِ، وقعَ العلمُ على المعلومِ أي ظهرَ الفيضُ في مرآةِ المُستفيضِ بالعرضِ﴾[۱۴]

اور دوسرے احتمال کی بنا پر عبارت یوں ہوگی ﴿فلمّا تجلّى بفيضِهِ المُقدَّسِ وظهرَ وُجودُ الكونِ بالذّاتِ أي بلا حيثيّةٍ تقييديّةٍ، وقعَ الفيضُ على المُستفيضِ بالذّاتِ﴾[۱۵]

دونوں تعبیروں کے لحاظ سے فیض مقدس کے سبب سے ہونے والی تجلی زمانے کے حوادث و تغیرات اور تبدیلیوں کے زیر اثر نہیں ہیں اور حق تعالیٰ کی ایجاد و تخلیق تغیر و تجدد، بلکہ تعین و تحدید سے بھی مبرا و منزہ ہے۔ چنانچہ علم ذاتی تمام پہلوؤں کے اعتبار سے بسیط اور تمام حیثیات پر محیط ہے۔ علم فعلی جو حق کی حقیقی علامت اور اس کے علم ذات کا ظہور و آئینہ ہے، بسیط تام اور واحد مطلق ہے اور پورے دائرۂ امکان پر محیط

ہے جبکہ اس میں تعین وتجدد اور ترکیب کا بھی کوئی گزر نہیں ہے۔ نہایت کلام یہ ہے کہ وہ متقوم بالذات ذات مقدس کبریا کے سہارے قائم ہے اور نفس ارتباط محض ہے۔ اسی لئے کبریائے حق کی ذات میں فانی اور ذوالجلال کے سامنے سراپا حضور ہے اور اسی حوالے سے، اسے علم حق قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ عالم عقل میں نفس ناطقہ حقائق عقلی کی تخلیق اور لوح خیال میں مثل خیالی کی ایجاد علم فعلی نفس ہے اور اس کی ذات میں ذاتی ہے۔

فلاسفہ کے بقول ''حق تعالیٰ سے لوح نفس الامر کی نسبت ایسے ہی ہے جیسے نفس کے ساتھ صور علمیہ کی نسبت'' اسی وسیع احاطے اور بساطت ونفوذ کی بناپر کہا گیا ہے کہ حق تعالیٰ عالم کے کلی علم کے اعتبار سے جزئیات کا عالم ہے، یعنی معلوم میں جزئیت، محاطیت اور محدودیت علم کو محدود کرنے کا سبب نہیں بنتیں۔ جبکہ علم محیط، قدیم وازلی، اور غیر متغیر ہے جبکہ معلوم ایک خاص احاطے میں منحصر، محدود، حادث اور متغیر ہے، وران کے اقوال سے ناواقف افراد نے یہ خیال کیا ہے کہ انہوں نے جزئیات کے علم کی نفی کی ہے اور کلیت وجزئیت کو اہل منطق ولغت کے درمیان عام طور سے مروج معنی میں لیا ہے، حالانکہ وہ اس چیز سے غافل ہیں کہ اہل معرفت کی اصطلاح میں کلیت وجزئیت کا کچھ اور ہی معنی ہے۔ اسی طرح اہل نظر نے بھی بعض جگہوں پر ان ہی کی پیروی کی ہے، بلکہ درحقیقت یہ مفہوم علم واجب الوجود جل سمہ وتعالیٰ شانہ کے باب میں اہل معرفت، حکماء سے اخذ کیا گیا ہے۔

پانچویں فصل

صفات ثبوتیہ وسلبیہ کا معیار

ذات مقدس واجب جل اسمہ کیلئے صفات ثبوتیہ اور صفات سلبیہ کا معیار یہ ہے کہ ہر وہ وصف جو اوصاف کمالیہ اور صفات جمالیہ میں سے ہے اور اصل حقیقت وجود وصرف ذات ہستی کیلئے ہے بغیر کسی تعین کے اور کسی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف تبدیلی کے بغیر۔ مختصر یہ کہ جو صفت عین ثبوت ہستی اور ذات نوریہ وجودیہ کی طرف لوٹتی ہے وہ ذات مقدس تعالیٰ شانہ کیلئے لازم الثبوت اور واجب التحقق ہے، کیونکہ اگر ذات مقدس کیلئے وہ صفت ثابت نہ ہو تو پھر اس کا لازمہ یہ ہوگا کہ یا ذات مقدس وجود محض اور ہستی محض نہیں ہے یا صرف وجود، کمال محض اور جمال محض نہیں ہے اور یہ دونوں صورتیں کتب عرفان اور مسلک

برہان کے نزدیک باطل ہیں، جیسا کہ اپنے مقام پر اس بات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

اور ہر وہ صفت جو کسی موجود کیلئے ثابت نہ ہو مگر تعینات کے مراتب میں سے ایک مرتبے کی طرف تنزل کئے بغیر اور اقسام تقییدات میں سے کسی ایک قسم میں تبدیلی کے بغیر یا ناقص مراتب میں سے کسی ایک مرتبے کے ساتھ ہم رکاب ہوئے اور کمزور وضعیف حدود میں سے کسی حد کا جزو لازم بنے بغیر یا مختصر الفاظ میں جو چیز ذات ہستی میں سے نہیں ہے اور حدود اور ماہیات کی طرف لوٹتی ہے اس کا مطلق طور پر کامل ذات (خدا) سے سلب کرنا ضروری ہے، اور (اس صفت) کا اس (خدا) پر بالکل اطلاق نہیں آسکتا، کیونکہ ذات کامل مطلق اور ذات صرف وجود جیسا کہ صرف کمال کا مصداق ہے، اسی طرح سلب نقائص سلب حدود و اعدام اور سلب ماہیات کا مصدوق علیہ بھی ہے۔

اور یہ جو محققین کے درمیان مشہور ہے کہ صفت سلبیہ، سلب واحد کی طرف لوٹتی ہیں جو سلب امکان ہے [۶]، راقم کی نظر میں درست نہیں ہے، بلکہ جیسے ذات مقدس تمام صفت کمال کا ذاتی مصداق ہے اور کوئی صفت دوسری صفت کی طرف رجوع نہیں کرتی، جیسا کہ پہلے واضح ہو چکا ہے، اسی طرح ہر نقص کے سلب کیلئے مصدوق علیہ اور مصداق بالعرض ہے اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عدم اور نقائص دونوں ایک ہی پہلو کے حامل ہیں ﴿وَلَا مِيْزَ فِي الْأَعْدَامِ﴾ کیونکہ گرنفس واقع اور نفس الامر کے اعتبار سے دیکھا جائے تو عدم مطلق یک ہی پہلو کا حامل ہونے کے باوجود ہر عدم کو بھی شامل ہے۔

وجود مطلق بھی حیثیت واحدہ ہے اور ہر قسم کے کمالات کا حامل ہے۔ پس جب مقام احدیت اور مقام غیب الغیوب کو ملحوظ خاطر رکھا جائے تو اس کیلئے کوئی صفت ثابت نہیں کی جا سکتی، نہ تو صفات حقیقیہ ثبوتیہ کو ثابت کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی صفات سلبیہ جلالیہ کو۔ لیکن مقام واحدیت اور مقام جمع اسماء و صفات کو اگر نظر میں رکھا جائے تو چونکہ صفات ثبوتیہ کمالیہ متکثر ہیں اور ہر صفت کمال کا، نہ سلب صفت نقص ہے جو اس کے مقابل پر ہے اور ذات مقدس حق ذاتی طور پر عالم کا مصداق اور "جاہل نہیں ہے" یا بالعرض مصداق ہے اور چونکہ وہ قادر ہے لہذا عاجز نہ ہونے کا بھی بالعرض مصداق ہے اور جیسا کہ علم اسماء کے باب میں ہے کہ اسماء (و صفات ثبوتیہ) کیلئے محیطیت و محاطیت اور ریاست و ماتحتی ہے اسی طرح اسماء و صفات سلبیہ کیلئے بھی یہی عناوین قابل تصور ہیں۔

مختصر یہ کہ جب صفات ثبوتیہ و سلبیہ کا معیار سمجھ میں آ گیا تو یہ بھی سمجھ میں آ سکتا ہے کہ ذات مقدس حق

تعالیٰ میں اس حرکت کا کوئی امکان نہیں جو طاقت اور ہیولیٰ کے ذریعہ قائم ہے اور جس کی ذات میں ہی تغیر وتبدل پایا جاتا ہے۔

اس عرفی و رائج مفہوم میں جس "تکلم" کے بارے میں راوی نے سوال کیا ہے وہ ایک محدث ومتجددہ صفت ہے جس سے حق تعالیٰ منزہ ومبرا ہے اور یہ چیز مقام ذات میں حق تعالیٰ کیلئے تجدد وحدوث سے مبرا مقدس مفہوم میں کلام وتکلم ذاتی کے اثبات کے منافی نہیں ہے۔

اجمالی طور پر اس مقدس نکتے کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ "حقیقت تکلم" کسی خاص مقام سے کلام ظاہر ہونے پر موقوف نہیں ہے اور عام طور پر اور عرف لغت میں کلام کے ساتھ جو اس قسم کی قید لگائی جاتی ہے یا کلام کا لفظ آتے ہی جو اس طرح سمجھا جاتا ہے تو یہ ہمارے انس وعادت کے ساتھ ساتھ خیالات اور سوچ کا نتیجہ ہے وگرنہ حقیقی معنی کے اعتبار سے کلام کو مقید نہیں کیا گیا اور نہ ہی (کسی خاص چیز کیلئے خود بخود) متعین ہوگیا ہے۔ علم محض دانش وفہم اور عالم کے نزدیک شئے کے ظہور سے عبارت ہے ورعلم اس بات پر منحصر نہیں ہے کہ کسی مادی چیز مثلاً دماغ یا معنوی وسیلے مثلاً حس مشترک اور لوح خیال سے حاصل ہو۔

اگر فرض کریں کہ کوئی اپنے ہاتھ یا پاؤں سے کسی چیز کا علم پیدا کرتا ہے یا کوئی چیز سنتا یا دیکھتا ہے تو علم سمع وبصر کا اطلاق اس پر ہوسکتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی عالم خواب میں کچھ دیکھتا، سنتا یا گفتگو کرتا ہے اور احساس کرتا ہے تو ان تمام معانی کا اطلاق حقیقتاً اس پر ہوتا ہے، اگرچہ اس میں ان محسوس اور مخصوص آلات ووسائل میں سے کسی کا استعمال نہیں ہوا ہے۔ پس معانی ومفاہیم کے اطلاق کیلئے ایک مخصوص ادراک ہی معیار ہوتا ہے اور حقیقت "تکلم" کسی مخصوص عضو کو کام میں لائے بغیر دل کی بات اور مافی الضمیر کا اظہار ہے۔

اگر بالفرض لغت اور عرف کے اعتبار سے یہ مجاز بھی ہو تب بھی معانی اور حقائق میں اس طرح کی قیود نہیں ہیں اور عقل کے اعتبار سے یہ معانی اس پر صادق آتے ہیں اور ہمیں اسماء وصفات کے باب میں لغوی بحث سے کوئی سروکار نہیں، کیونکہ مقصود نفس حقائق کا اثبات ہے، اگرچہ لغت اور عرف اس کا ساتھ نہ بھی دیتے ہوں۔

پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ حقیقت کلام مافی الضمیر کا اظہار ہے چاہے وہ حسی وسائل وآلات کے ذریعے ہو یا غیر محسوس ذرائع سے اور چاہے بات، آواز والفاظ کی صورت میں یا باطن سے نکلنے والی سانس کی شکل

میں ہویدا نہ ہو۔

بنابرایں، کلام اس حقیقت کے اعتبار سے وجود کے اوصاف کمالیہ میں سے ہے، کیونکہ ظہور واظہار کا تعلق حقیقت وجود سے ہے اور حقیقت میں وجود ہی ہے اور وجود جس قدر کمال وقوت کی طرف جاتا ہے اس کا ظہور واظہار بھی اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ افق اعلیٰ اور مقام اعلائے واجب تک پہنچ جائے جو ﴿نُورُ الأَنْوَارِ، نُورٌ عَلى نُورٍ وظُهُورٌ على ظُهُورٍ﴾ ہے اور وہ اطلاقی فیض مقدس اور کلمہ ''کُن'' وجودی کے ساتھ واحدیت کے مقام غیب کی باتوں کا اظہار کرتا ہے اور فیض اقدس اور تجلی ذاتی احدی کے ساتھ غیب مطلق اور مقام لا مقامی احدیت کا اظہار فرماتا ہے اور اس تجلی احدی میں متکلم وہ ذات مقدس احدی ہے جو مستجمع جمیع اسماوصفات ہے جبکہ کلام خود ذات مقدس کا فیض اور اس کی تجلی ہے، اور سننے والے اسما وصفات ہیں اور اس تجلی کے ساتھ اسماوصفات کے تعینات اس کی اطاعت میں علمی طور پر وجود میں آتے ہیں اور تجلی واحدی میں فیض مقدس (الٰہی) کے ذریعے، متکلم خود وہ ذات مقدس ہے جو تمام اسماوصفات کا جامع ہے اور تجلی بذات خود کلام ہے اور دائرہ امکان میں اعیان علمیہ جو اسماوصفات کا لازمہ ہیں، سننے اور اطاعت کرنے والے عناصر ہیں جو ''کُن'' کے حکم سے عینی وجود حاصل کرتے ہیں ﴿فَاذا قالَ لِكُلِّ عَيْنٍ أَرادَ إيجادَها، كُنْ فَيُطِيعُ الأَمْرَ الالهيّ فَيَكُونُ وَيَتَحَقَّقُ﴾ بہرحال اس باب میں سنے گئے شواہد بہت زیادہ ہیں جن کے ذکر سے ہم اجتناب کر رہے ہیں۔

والحمد للہ اولاً وآخراً

توضیحات (۳۶)

۱۔ اصول کافی، ج۱، ص۱۰۷، کتاب توحید، باب صفات الذات، حدیث

۲۔ سفار اربعہ، ج۶، ص۱۱۸، سفر۳، موقف۲، بحث صفات

وایضاً ملاحظہ ہو اس مقام پر حاشیہ حکیم سبزواری۔

۳۔ مصباح الانس، ص۱۳۰ و۱۳۱، نقد النصوص، فصل ۲، ص۳۸ و۳۹۔

۴۔ محمد سعید بن محمد مفید قمی، معروف بہ "قاضی سعید" نامور اور عظیم شیعہ عالم ہوے ہے علاوہ حدیث، حکمت اور فنون ادب کے علما میں بھی ان کا شمار ہوتا ہے۔ "عرفان" کی طرف ان کا بہت رجحان تھا۔ آپ ملا محسن فیض، ملا عبدالرزاق لاہیجی اور ملا رجبعلی تبریزی کے شاگرد تھے۔ قاضی سعید ایک عرصے تک قم میں منصب قضاوت پر فائز رہے۔ اسی لئے آپ کو قاضی بھی کہا جاتا ہے۔ آپ نے ۱۱۰۳ھ ق میں قم میں وفات پائی۔ آپ کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں
الاربعون حدیثاً، اسرار الصلوٰۃ، حاشیہ اثولوجیا، حاشیہ شارات، حقیقۃ الصلوٰۃ، شرح توحید صدوق، مواق مثلہ اور کلید بہشت۔

۵۔ ملا رجب علی تبریزی (۱۰۸۰ھ) میر فندرسکی کے شاگردوں میں سے ہیں۔ اصفہان میں کثرت سے شاگرد ان کا تعلق تھا۔ اہل یونانی کتابیں پڑھاتے تھے۔ قاضی سعید قمی اور محمد تنکابنی آپ کے شاگردوں میں سے تھے۔ کلید بہشت اور اثبات واجب کے سلسلے میں فارسی کتابچہ آپ کی اہم تصنیفات ہیں۔

۶۔ شرح توحید، ج۳، ص۵۴ (قلمی نسخہ، کتب خانہ مرحوم آیت اللہ مرعشی نجفی)

۷۔ سفار اربعہ، ج۶، ص۲۸۴، ۱۷۶، سفر۳، موقف۳، بحث علم حق تعالیٰ

شرح اشارات، نمط ۷، فصل ۱۵۔۲۰۔

۸۔ سفار اربعہ، ج۶، ص۲۶۳، ۲۷۰، سفر۳، موقف۳، فصل ۲ (بحث علم حق تعالیٰ)۔

۹۔ اسفار اربعہ، ج۶، ص۲۸۰۔۲۹۰، سفر۳، فصل ۱۲۔

۱۰۔ "غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں اور اس کے سوا ان سے کوئی آگاہ نہیں" سورۂ انعام، آیت ۵۹/۔

۱۱۔ "بے شک ہم خدا کی طرف سے آئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے" سورۂ بقرہ، آیت ۱۵۶/۔

۱۲۔ شرح حکمۃ الاشراق، ۳۵۸۔۳۶۶ در علم حق تعالیٰ

اسفار اربعہ، ج۶، ص۲۲۳، سفر۳، موقف۹۔

۱۳۔ "اللہ کیلئے ہی ہیں نیک نام، اعلیٰ مثالیں اور کبریائی و نعمتیں"۔

۱۴۔ جب فیض مقدس متجلی ہو گیا اور وجود باعرض ظاہر ہو گیا تو علم نے معدوم کے ساتھ تعلق پیدا کیا یعنی فیض وجود مستفیض باعرض کے آئینے میں ظاہر ہوا۔

۱۵۔ جب فیض مقدس نے تجلی دکھائی اور موجودات کا وجود ذاتی طور پر منصۂ ظہور پر آیا یعنی تقییدی حیثیت کے بغیر فیض نے مستفیض کے ساتھ ذاتی طور پر تعلق پیدا کیا

۱۶۔ اسفار اربعہ ج ۶، ص ۱۸، سفر ۳، موقف ۲، بحث صفات حق تعالیٰ۔

۱۷۔ جب بھی کسی چیز کے وجود میں آنے کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے "ہو جا" تو وہ چیز فرمان الٰہی کی اطاعت کرتے ہوئے وجود میں آجاتی ہے

سینتیسویں حدیث

بالسند المتصل الی محمد بن یعقوب، عن علی بن محمد، عمن ذکره عن احمد بن محمد بن عیسی، عن محمد بن حمران، عن الفضل بن السکن، عن ابی عبد الله علیه السلام قال

قال امیر المؤمنین علیه السلام

﴿اعرفوا الله بالله، والرسول بالرسالة، واولی الامر بالمعروف والعدل والاحسان﴾

ترجمہ امام صادقؑ نے فرمایا کہ حضرت علیؑ فرمایا کرتے تھے "خدا کو خدا سے، رسولؐ کو رسالت سے اور صاحب امر کو امر معروف، عدل و انصاف اور نیکی کرنے سے پہچانو"۔

شرح معرفت، علم، شناسائی اور دانائی میں واضح فرق پایا جاتا ہے علما کا کہنا ہے اصل لغت میں علم، مخصوص ہے کلیات سے (جیسے) معرفت مخصوص ہے جزئیات وشخصیات سے۔ علما کہتے ہیں عارف باللہ وہ ہے جو حق کو مشاہدہ حضوریہ سے پہچانے اور عالم باللہ وہ ہے جو حق کو فلسفی دلیلوں سے پہچانے بعض علما نے کہا ہے علم وعرفان میں دو جہت سے فرق ہے ایک تو متعلق کے اعتبار سے جیسے کہ ذکر ہوا، دوسرے معرفت کے لحاظ سے جس میں بھول اور نسیان کا سابقہ لاحق ہوتا ہے۔ لہذا جس چیز کا ادراک ابتدا میں ہو اس کو علم کہتے ہیں اور جو چیز معلوم رہی ہو مگر بھول جانے کے بعد یاد آئے اس کو معرفت کہتے ہیں اور عارف کو اسی لئے عارف کہتے ہیں کہ وہ کوان سے نفس کون ملکی کی سابقہ شناختوں اور اپنے نشئہ طبیعیہ کا متذکر ہوتا ہے۔

اور بعض اہل سلوک تو تذکر عام ذر تک کے مدعی ہیں، وہ کہتے ہیں اگر حجاب طبیعت جو اس غفلت

ونسیان کا موجب ہے سالک کی آنکھوں کے سامنے سے اٹھالیا جائے تو وہ عوالم سابقہ کا متذکر ہو جائے گا اور بعض اہل ذوق فرماتے تھے کہ معراج روحانی ومعنوی کی حقیقت ایام سلف کی یاد ہے۔ اگر ہم اپنے سابقہ حوال کی طرف پلٹ کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ہر شخص کسی نہ کسی حد تک اپنی پچھلی زندگی کو یاد کر سکتا ہے۔ بعض سات سال کی عمر تک کے حالات اور بعض پانچ سال یا تین سال کی عمر کے واقعات یاد رکھتے ہیں۔ اس سے کم کے حالات کا یاد ہونا نادر ہے۔ ہاں الشیخ الرئیس (بوعلی سینا) سے نقل کیا گیا ہے کہ وہ کہتے تھے "مجھے اپنی پیدائش کا ابتدائی دور یاد ہے اور اس سے پہلے کے حالات بھی یاد کر سکتا ہوں، مثلاً جب وہ رحم، ور یا پشت پدر میں تھے اسی طرح ملک میں جتنی تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کو یاد کیا جا سکتا ہے، نیز پیچھے مڑتے مڑتے کون عام سے ملکوت اعلیٰ تک اور جبروت سے جبروت اعلیٰ تک کے حالات یاد رکھے جا سکتے ہیں یہاں تک کہ سلسلہ نشأئے علم ربوبی تک پہنچ جائے اور یہی یادیں حقیقت معراج اور روحانی عروج کی انتہا ہیں" (بوعلی سینا) کا بیان ختم ہوا۔

ہوسکتا ہے یہ مطلب اپنی جگہ پر صحیح ہو لیکن حقیقت معرج مسلک عرفان میں اس طرح پیچھے کی طرف پلٹنے کو نہیں کہتے اور نہ ہی یہ بات اصحاب قلوب کے نزدیک صحیح ہے، بلکہ معراج روحانی اس حرکت معنویہ انعطافیہ کا نام ہے جس سے دائرہ وجود کی تکمیل ہوتی ہے اور جس کی وجہ سے سلسلہ شہود میں پائی جانے والی تمام چیزیں عالم غیب کی طرف پلٹتی ہیں اور یہ قوس صعودی وحرکت انعطافی کی صورت میں ہوتا ہے اور یہ قہقری (الٹی) ورجوعی حرکت، موجودات میں جاری، اللہ کی سنت کے خلاف ہے۔ خصوصاً انبیاء اور بالخصوص خاتم انبیاء کے سلسلے میں بالکل ہی یہ درست نہیں ہے۔ سلوک کا یہ طریقہ ملائکہ کے اس صنف کی مجذوبیت کے مشابہ ہے جن کو ذات کبریہ کے بارے میں ہیمہ متحیرہ کہا جاتا ہے جو کثرات سے مکمل طور پر غفلت رکھتے ہیں اور جن کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ آدم وآدمی خلق ہوئے ہیں (یا نہیں) شیخ عارف کامل شاہ آبادی فرماتے تھے کہ "حضرت آدم کی روحانی حالت یہ تھی کہ اپنے ملک کی طرف توجہ نہیں رکھتے تھے، ور مجذوب عالم غیب ومقام قدسی تھے اور یہ حرکت آدم کو مقام آدمیت سے سب کردیتی تھی اس لئے خدا نے ان پر شیطان کو مسلط کیا تاکہ وہ ان کو شجرۂ طبیعت کی طرف متوجہ کرائے اور ان کے جذبۂ ملکوتی کو ملک کی طرف پلٹا دے"۔

"والعدل والاحسان" ظاہر یہ ہے کہ یہ دونوں امر بامعروف پر عطف ہیں، یعنی ﴿اغفر لھم

بالأمرِ بالمعْرُوفِ وبالعدْلِ والاحْسانِ﴾ ''ان کو پہچانو امر بالمعروف، عدل وانصاف اور احسان کے ذریعے'' اور یہ بھی احتمال ہے کہ بمعروف پر سب عطف ہوں، یعنی ﴿اعْرِفُوهُمْ بالأمرِ بالمعروف وبالأمرِ بالعدْلِ وَالاحْسانِ﴾۔

پہلی فصل: ﴿اعْرِفُوا اللهَ باللهِ﴾ کا مطلب

آپ یہ سمجھ لیں کہ علمائے کرام نے اس حدیث شریف کی شرح اور ﴿اعرفوا الله بالله﴾ کے جملے میں اپنے اپنے مسلک علمی اور مشرب وفلسفہ وحکمت کے اعتبار سے معانی بیان فرمائے ہیں۔ میں بطور خلاصہ بعض کو تبرکاً بیان کروں گا۔

اول جناب ثقۃ الاسلام کلینیؒ نے جو بیان فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے ''پروردگار عالم نے بدان وارواح اور انوار کو خلق فرمایا اور وہ ان چیزوں کی تخلیق میں متفرد (یکتا) ہے۔ کوئی اس میں شریک نہیں ہے اور نہ خدا ان میں سے کسی ایک کے مشابہ ہے۔ پس جس نے خدا کی ان میں سے کسی ایک سے تشبیہ دی س نے خدا کو نہیں پہچانا اور جس نے خدا کو ان کی شباہت سے منزہ تسلیم کیا اس نے حق کو پہچان لیا'' انتہیٰ۔

عجیب وغریب بات یہ ہے کہ صدر المتألہین (قدس سرہ) نے اس قول کو حدیث کا تتمہ سمجھا ہے ور اپنے مسلک کے مطابق س کی طویل توجیہات پیش فرمائی ہیں۔ [۳]

دوم شیخ صدوقؒ کا بیان ہے ور اس کا ماحصل یہ ہے ''خدا کی معرفت خدا سے حاصل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم خدا کو اپنی عقلوں سے پہچانیں خدا ہی نے ہم کو یہ عقول عطا فرمائی ہیں ور گر خدا کو انبیاءؑ وحجج کے ذریعہ پہچانیں (تب بھی خدا ہی کے ذریعے ہم نے خدا کو پہچانا، کیونکہ) خدا نے ن حضرت کو مبعوث کیا اور حجت قرار دیا ہے اور گر اپنے نفوس سے (خدا کو) پہچانیں (جب بھی خدا ہی کے ذریعے ہم نے خدا کو پہچانا ہے کیونکہ) نفوس کا خالق خدا ہے''۔ [۴]

سوم جناب ملا صدراؒ نے شارہ فرمایا ہے ''خدا نے متعال کی معرفت کے دو طریقے ہیں ایک طریقہ، مشاہدہ وصریح عرفان کا ہے۔ دوسرا طریقہ، تنزیہ وتقدیس کا ہے اور چونکہ پہلا طریقہ سوائے انبیاءؑ اور کامل ترین بندوں کے کسی کیلئے ممکن نہیں ہے اسی لئے حدیث میں دوسرے طریقے کا ذکر کیا گیا ہے'' انتہیٰ۔

ملا صدرا" کی یہ تفسیر اس بات پر مبنی ہے کہ شیخ کلینی" کے قول کو انہوں نے حدیث شریف کا جزو اور تفسیر امام صادق" کو قول حضرت علی" سمجھا ہے۔

چہارم جناب ملا فیض کاشانی" کی تفسیر ہے۔ ان کے قول کا ماحصل یہ ہے کہ "ہر موجود کیلئے ایک ماہیت اور وجود ہے۔ کسی بھی شئے کی تفسی تعینات اور اس کی وجہ ذاتی اس شئے کی ماہیت ہیں اور ان کا وجود پروردگار کے بعد (یلی الرب) کی حیثیت سے ہے جس کی بنا پر اشیا کی ذات قائم ہے اور ان کے آثار ظاہر ہوتے اور ان کی طاقت وقوت ہوتی ہے۔ پس اگر کوئی ماہیات اور اشیا کے جہت تعینات، نیز اشیا کے مکان اور حق کی نسبت ان کی ضرورت کو دیکھ کر خدا کو پہچانتا ہے تو اس نے خدا کو اشیا سے پہچانا ہے، نہ حق سے اس کے علاوہ یہ علم ومعرفت فطری ہے کسبی نہیں۔ لیکن اگر کوئی حق کو جہات وجود یہ سے پہچانے جو وجہ الی اللہ اور جہات یلی اللہ ہیں اور جن کی طرف اشارہ ﴿هو معكم أينما كنتم﴾ اور ﴿كُلُّ شيءٍ هالكٌ إلَّا وجهه﴾ سے کیا گیا ہے تو اس نے حق کو حق سے پہچانا ہے"۔

پنجم وہ احتمال ہے جو مصنف کی نظر میں ہے مگر یہ ایک ایسے مقدمہ کے بعد واضح ہوگا جو علم اسما وصفات میں طے شدہ ہے اور وہ یہ ہے کہ خداوند عالم کیلئے کچھ اعتبارات ہیں اور ہر اعتبار کیلئے ایک اصطلاح معین ہے۔

پہلا اعتبار اعتبار ذات من حیث ہی، (ذات، ذات ہونے کی بنا پر) ہے۔ اس اعتبار سے ذات مجہول مطلق ہے نہ اس کیلئے کوئی اسم ہے اور نہ کوئی رسم (جس سے اس کو پہچانا جا سکے)، دست امید عرفا اور آرزوے اصحاب قلوب واولیاء اس سے کوتاہ ہیں۔ ارباب معرفت کی زبان میں کبھی اس کو "عنقائے مغرب" کہتے ہیں "عنقا شکار کس نشود دام باز گیر"[8]

بعض وقت "عماء" یا "عمی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ روایت ہے کہ رسول خدا" سے پوچھا گیا مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے آپ کا خدا کہاں تھا؟ تو آپ" نے فرمایا فی عماء[9] اور کبھی اس کی تعبیر غیب الغیوب اور غیب مطلق وغیرہ سے بھی ہوئی ہے، حقیقت یہ ہے کہ تمام تعبیرات اس سے کوتاہ ہیں اور عنقاء عماء دیگر تعبیرات حسب ذوق عرفانی اس مقام سے متعلق کسی دلیل و برہان سے نہیں ہیں۔

دوسرا اعتبار اعتبار ذات ہے مقام تعین غیبی اور عدم ظہور مطلق کے ساتھ اور اسی مقام کو احدیت کہتے ہیں اور وہ تعبیرات زیادہ تر اسی مقام سے مناسبت رکھتی ہیں۔ اصطلاح علمائے اسما کی رو سے اسی مقام پر

اعتبار اسمائے ذاتیہ کا اطلاق ہوتا ہے، جیسے "باطن مطلق" اور "مطلق اور علی" و "عظیم"، چنانچہ کافی کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ خداوند عالم نے اپنے لئے سب سے پہلا نام جو اختیار کیا وہ ﴿العلیّ﴾ اور ﴿العظیم﴾ تھے۔[۱]

تیسرا اعتبار: اعتبار ذات ہے بحسب مقام واحدیت و جمع اسماء و صفات اور اس مقام کی تعبیر مقام "واحدیت"، "مقام حضرت جمع اسماء" اور "جمع الجمع" سے کی جاتی ہے اور اس مقام کو اعتبار حضرت کے لحاظ سے مقام حضرت جمع، مقام اسم اعظم اور اسم جامع اللہ کہتے ہیں۔

چوتھا اعتبار: اعتبار ذات ہے بحسب فیض مقدس کی تجلی کے مرتبے کے مطابق اور عینی روئیت کے مقامات میں اسمائی وصفاتی ظہور کے مقام کے لحاظ سے۔ جیسے کہ مقام واحدیت "فیض اقدس" کی تجلی کی وجہ سے ہے اور اس مقام ظہور اسمائی کو مقام ظہور اطلاقی اور مقام الوہیت اور مقام اللہ بھی کہتے ہیں۔ یہ ان اعتبارات کی وجہ سے ہے جو اسماء وصفات میں مقرر ہیں اور میں (راقم الحروف) نے مصباح الہدایۃ میں اس کی شرح کی ہے۔[۱]

یہ بھی جان لینا چاہئے کہ اہل معرفت اور اصحاب قلوب کی زبان میں، رائج یہ تمام اعتبارات ان کے پاکیزہ دلوں پر تجلیات حق کے نقشہ کی خبر دینے والی ہیں اور یہ تجلیات مقامات اور سلوک الی اللہ کے مراتب، نیز حق کی طرف سفر کرنے والوں کی منازل و مراحل سفر کے لحاظ سے اسمائی وصفاتی ظہور کے مقام سے شروع ہوتی ہیں جو مقام الوہیت ہے اور اس کو اللہ بھی کہا جاتا ہے ﴿اللہ نور السموات والارض﴾[۲] کو اسی کی طرف اشارہ قرار دیتے ہیں اور (یہ تجلیات) مقام غیب احدی اور مرتبہ اسمائے ذاتیہ اور اسم "مستاثر" پر ختم ہوتی ہیں جو غایت سفر اور منتہائے مقصد ہے اور ہوسکتا ہے کہ ﴿او ادنی﴾[۳] کے ذریعے اشارہ ہونے والے خداوند عالم کے ارشاد کا اشارہ یہی مقام ہو۔

اب اس مقدمہ کے تمام ہونے کے بعد میں عرض کرتا ہوں کہ جب تک طالب حق اور اللہ کی طرف سفر کرنے والے کا قدم فکر و استدلال کی سرحدوں میں ہے اس کی سیر عقلی علمی ہے اور وہ اہل معرفت و اصحاب عرفان سے نہیں ہے، بلکہ جب تک عالم اکبر میں واقع ہے خواہ ماہیات اشیاء میں نظر کرکے ان کے ذریعہ حق کو طلب کرے جو حجابہائے ظلمانی ہیں اور چاہے ان کے وجودات کے ذریعہ تلاش حق کرے جو حجابہائے نورانی ہیں اور جناب فیض" کا قول اسی تناظر میں ہے۔

لیکن اللہ کی طرف سفر پر گامزن ہونے کی پہلی شرط نفس اور خود پرستی و خود خواہی کے گھر سے نکلنا ہے جیسے حسی سفر میں جب تک انسان ایک مقام یا منزل پر ٹھہرا ہوا ہے جس قدر سفر کا خیال کرے اور کہے میں مسافر ہوں عملی طور پر سفر کا اطلاق نہیں ہوگا۔ شرعی مسافرت اسی وقت ہوگی جب وہ گھر سے نکل جائے اور آثار بعد ناپید ہو جائیں اسی طرح خدا کی طرف عرفانی سفر اور شہودی ہجرت اس وقت تک نہیں ہوگی جب تک نفس کے تاریک گھر سے نہ نکل جائیں اور اس کے آثار چھپ نہ جائیں جب تک تعینات کی دیواریں کھڑی ہیں اور کثرت کی اذانیں دی جا رہی ہیں، انسان مسافر نہیں ہے، صرف گمان مسافرت ہے اور دعوے سیر و سلوک ہے ﴿وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ﴾ [۱]

اس کے بعد کہ سالک الی اللہ کامل تقویٰ اور قدم ریاضت کے ساتھ اپنے گھر سے نکلتا ہے اور اپنے ہمراہ کوئی تعلق و تعین نہیں رکھتا، اور سفر الی اللہ شروع ہو جاتا ہے تو اس کے مقدس قلب پر سب سے پہلی تجلی جو خدا کی طرف سے ہوتی ہے، وہ تجلی الوہیت و مقام ظہور اسماء و صفات کی ہوتی ہے اور یہ تجلی بھی ایک منظم ترتیب سے محاط (گھرے ہوئے) سے سائے محیط تک پہنچتی ہے۔ سفر کرنے والے کے قلب کی قوت وضعف کے مطابق ایسا ہوتا ہے، مگر اس کی تفصیل اس مختصر میں بیان نہیں کی جا سکتی، یہاں تک کہ عالم وجود کے تمام تعینات کے چھوڑ دینے کا مرحلہ آ پہنچتا ہے چاہے وہ اپنے سے ہوں یا غیر سے جب کہ اس کے بعد وے مراحل و منازل میں تو یہ خود اسی سے ہیں اور پھر رفض مطلق کے بعد الوہیت و مقام اللہ کی جلوہ گری ہوتی ہے جو مقام، حدیث جمع اسمائے ظہوری ہے اور ﴿اغْرِفُوا اللَّهَ بِاللَّهِ﴾ مرتبہ نازلہ اولیہ کا ظہور حاصل کرتا ہے۔

عارف جب اس منزل و مقام پر پہلی مرتبہ پہنچتا ہے تو اس تجلی میں فنا ہو جاتا ہے اور، گر عنایت ازلی شامل ہو جائے تو وہ ایسا انس حاصل کر لیتا ہے جس سے سفر کی ساری وحشت اور تمام تعب دور ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ہوش میں آ جاتا ہے اور اسی مقام پر قانع نہیں ہوتا، بلکہ قدم عشق سے سیر کی ابتدا کرتا ہے۔ البتہ عشق کے اس سفر میں حق ہی ابتدا و انتہائے سفر ہوتا ہے۔ مسافر انوار تجلیات میں قدم زن ہوتا ہے اور تقدم (آگے بڑھو) کی آواز سنتا ہے یہاں تک کہ مقام واحدیت میں اسماء و صفات اس کے قلب پر منظم ترتیب سے تجلی کرتے ہیں یہاں تک کہ مقام احدیت جمعی اور مقام اسم اعظم ظہور پیدا کرتے ہیں کہ وہی اسم "اللہ" ہے اور

اسی جگہ ﴿اعْرِفُوا اللّٰہَ بِاللّٰہِ﴾ (خدا کے ذریعے، خدا کو پہچانو) کا اعلیٰ مقام جاگزیں ہوتا ہے۔ اس کے بعد بھی ایک اور مقام ہے جو سردست ہمارے مقصد سے خارج ہے۔

اسی ترتیب سے جو ذکر کی گئی، رسول ؐ کو رسالت سے اور اولی الامر کو امر بمعروف، عدل وانصاف اور حسن سے پہچاننے کی عرفانی ترتیب ایک دلچسپ امر ہے جو مقام رسالت وولایت کی تفصیل پر منحصر ہے، مگر وہ اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے۔ البتہ سابق الذکر کتاب اس کے بیان کا متکفل ہے۔

ایک گمان کا ازالہ

معارف کے سلسلے میں وارد ہونے والی حدیثیں عام معانی پر حمل نہیں کی جاسکتیں

یہ گمان نہ ہو کہ اس حدیث شریف کی تعبیرات سے ہمارا مقصد، مفہوم حدیث کو مسلک اہل عرفان کی طرح اسی پر محدود کرنا ہے تاکہ تفسیر بالرائے اور رجم بالغیب کے زمرے میں شامل ہو جائے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ عام طور سے معرفت کے بارے میں جو احادیث منقول ہیں ان کے بارے میں یہ طے کر لینا کہ ان سے صرف عرفی معانی مراد ہیں یہ غلط ہے، کیونکہ جو شخص بھی ائمہ معصومین ؑ کے اسلوب کلام کا عارف ہے وہ جانتا ہے کہ عقائد و معارف میں نقل ہونے والی حدیثوں کا مطلب صرف مفہوم عرف کے مطابق نہیں ہوتا، بلکہ ائمہ ؑ نے اپنی حدیثوں میں باریک ترین فلسفی معانی اور اہل معرفت کے نزدیک اعلیٰ ترین مطالب کو سمو دیا ہے۔ ہر وہ شخص ہماری اس بات کی تصدیق کرے گا جو اصول کافی اور توحید صدوق ؒ کا مطالعہ کرے گا اور یہ مطلب مراد لینے سے اس میں کوئی منافات نہیں ہے کہ ائمہ ؑ اہل معرفت اور خدا کی معرفت رکھنے والے اپنے کلام کو اس جامع طریقہ سے ادا کریں کہ ہر گروہ اپنے مسلک کے حساب سے اس سے استفادہ کرے اور ان میں سے کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ مفہوم حدیث کو اسی مطلب میں منحصر کر دے جس کو اس نے خود سمجھا ہے۔ مثلاً یہی حدیث جو زیر بحث ہے اس کے ظاہر الفاظ اور استظہار عرف کے اعتبار سے یک عرفی معنی مراد لئے جائیں کہ ﴿اعْرِفُوا اللّٰہَ بِاللّٰہِ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ خدا کو اس کی صناعی کے آثار اور ان کے استحکام کے ذریعے جو الوہیت کے آثار ہیں، پہچانا جائے۔ رسول ؐ کو ان کی رسالت کے ذریعے اور اولی الامر کو ان کی کیفیت اعمال، مثلاً امر بالمعروف اور عدل وانصاف کے ذریعے پہچان لینا چاہئے، یعنی ہر ایک کو اس کے آثار سے پہچانا جائے، تو یہ معنی اس بات کے منافی نہیں ہے کہ اس حدیث کا ایک دوسرا مطلب بھی ہو جو اس

سے لطیف تر ہو اور وہ بمنزلہ بطن کے ہو، بلکہ (یہ بھی ممکن ہے کہ) اس سے بھی زیادہ کوئی لطیف تر مفہوم ہو جو بطن بطن ہو۔ مختصر یہ کہ اولیا کے کلام کا قیاس اپنے کلام پر نہ کرو۔ جس طرح ان کا قیاس اپنے اوپر کرنا باطل و غلط ہے۔ اس اجمال کی تفصیل اور اس نکتے کی تشریح اس وقت ہم نہیں کر سکتے۔

یہاں پر ایک عجیب و غریب بات بعض حضرات نے بطور طعن و اشکال کہی ہے کہ "ائمہ ہدیٰ" کا ہر کلام لوگوں کی ہدایت و ارشاد کیلیے ہوتا ہے اس لئے اس کا فہم عرف کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ باریک فلسفی یا عرفانی معانی ان کی طرف سے صادر نہیں ہونے چاہئیں" یہ بہت بڑا افترا ہے اور بہت بڑی تہمت ہے، جس کی وجہ اخبار اہل بیتؑ میں تدبر نہ کرنے اور ان کا تلاش نہ کرنے کے علاوہ بعض دیگر امور بھی ہے۔

بڑے تعجب کی بات ہے اگر توحید اور معارف کی باریکیوں کو انبیاء و اولیا (علیہم السلام) نہیں سمجھائیں گے تو پھر کون ان کی تعلیم دے گا؟ کیا توحید اور دوسرے معارف باریک نکات پر مشتمل نہیں ہیں؟ کیا تمام لوگوں کی معرفت یکساں ہے؟ کیا ہماری اور امیر المؤمنینؑ کی معرفت ایک ہے؟ دونوں کی معرفت وہی عامیانہ ہے یا دونوں میں فرق ہے؟ کیا معرفت کی تعلیم لازم نہیں ہے؟ کیا معرفت بہت ہی آسان ہے اور اس میں رجحان بھی نہیں اور ائمہؑ نے اس کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی ہے؟ جو حضرات خواب و خوراک اور بیت الخلاء کے مستحب آداب تک کو ترک نہ کریں، کیا وہ معارف الہیہ کو جو اولیا کا انتہائی مقصد ہے، ترک کر دیں گے؟!

اس سے بھی زیادہ تعجب اس پر ہے کہ بعض ایسے حضرات ان مفاہیم کے تو منکر ہیں لیکن فقہ سے متعلق روایات کے سلسلے میں جس کا سمجھنا عرف پر موقوف ہے، بحث کا اتنا وسیع دائرہ پھیلا دیتے ہیں جس کو سمجھنے سے عرف کی کیا بات، عقل عاجز ہو جاتی ہے اور کہتے ہیں یہ تو عرف کا ایک انحصاری مسئلہ ہے! جس کو یقین نہ ہوتا ﴿علی الید ما أخذت حتی تؤدي﴾۱۶ اور اس قسم دیگر قواعد کلیہ کی طرف رجوع کرے، خصوصاً معاملات کے باب میں۔

بہر حال ہم موضوع سے ہٹ گئے اور قلم اپنی حد سے آگے بڑھ گیا۔ راقم خدا کو گواہ کر کے کہتا ہے کہ میرا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ اپنے برادران ایمانی کو معارف الہیہ سے آشنا کراؤں۔

﴿واستغفر الله من الزلل والفشل والكسل﴾

﴿والحمد لله أولاً وآخراً﴾۱۷

توضیحات (۴۷)

۱۔ اصول کافی ج ۱، ص ۳، کتاب التوحید، باب انہ لا یعرف الا بہ، حدیث ۱۔

۲۔ اصول کافی ج ۱، ص ۸۵ کتاب التوحید باب انہ لا یعرف الا بہ، حدیث ۱ کا ضمیمہ۔

۳۔ شرح اصول کافی ص ۲۳۳، ۲۳۴۔

۴۔ توحید ص ۲۹۰، باب ۴۱۔

۵۔ شرح اصول کافی ص ۲۳۳، ۲۳۴۔

۶۔ وہ تم (جہاں ہے) جہاں کہیں رہو وہ تمہارے ساتھ ہے۔ سورۂ حدید آیت ۴۔

۷۔ اس کی ذات کے علاوہ ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ سورۂ قصص، آیت ۸۸۔

۸۔ اس کا دوسرا مصرع یہ ہے کانجا ہمیشہ باد بدست است دام را (حافظ)۔

۹۔ روایت کی گئی ہے کہ حضور اکرمؐ سے کسی نے پوچھا آپ کا رب مخلوقات کو خلق کرنے سے پہلے کہاں تھا؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ ایک بادل میں تھا

عوالی اللآلی ج ۱، ص ۵۴، مسند احمد بن حنبل، ج ۴، ص ۱۱۔ عبارت میں تھوڑا سا فرق ہے

۱۰۔ عن ابن سنان قال: سألت أبا الحسن الرضا علیه السلام: هل كان الله عزّ وجلّ عارفاً بنفسه قبل أن يخلق الخلق؟ قال: نعم. قلت: يراها ويسمعها؟ قال: ما كان محتاجاً إلى ذلك، لأنه لم يكن يسألها ولا يطلب منها، هو نفسه ونفسه هو، قدرته نافذة فليس يحتاج أن يسمّي نفسه، ولكنه اختار لنفسه أسماءً لغيره يدعوه بها، لأنه إذا لم يُدعَ باسمه لم يُعرف، فأوّل ما اختار لنفسه: العليّ العظيم، لأنه أعلى الأشياء كلها، فمعناه الله واسمه العليّ العظيم، هو أوّل أسمائه، علا على كلّ شيء۔

ابن سنان کہتے ہیں کہ میں نے امام رضاؑ سے پوچھا: کیا خدا مخلوقات کو پیدا کرنے سے پہلے اپنی ذات سے آگاہ تھا؟ فرمایا: ہاں۔ میں نے پھر پوچھا: کیا اس کو دیکھتا اور سنتا تھا؟ فرمایا: اس کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ نہ اس کے بارے میں کوئی سوال کرنے والا تھا اور نہ اس کی کوئی خواہش تھی، خود اس کی ذات تھی اور ذات خود وہی تھا۔ اس کی قدرت نافذ تھی لہٰذا نام رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ مگر اس نے اپنے لئے اس لئے نام رکھے ہیں کہ دوسرے اس کو ان ناموں سے پکاریں، اس لئے کہ اگر اس کو اس کے نام سے نہ پکارا جاتا تو وہ پہچانا نہ جاتا۔ اس نے اپنے لئے سب سے پہلا نام "علی عظیم" انتخاب کیا، کیونکہ وہ ہر چیز سے برتر ہے اور اس کے معنی "اللہ" کے ہیں اور اس کا نام علی عظیم ہے، وہ ہر چیز پر برتر و عالی ہے۔

اصول کافی، ج ۱، ص ۱۱۳، کتاب توحید، باب حدوث الاسماء، حدیث ۲۔

۱۱۔ مصباح الہدایۃ الی الخلافۃ و الولایۃ، ص ۳۲۔۳۸۔

۱۲۔ سورۂ نور، آیت/۳۶۔

۱۳۔ پھر قریب ہو پھر وہ کمان یا اس سے بھی کم کا فاصلہ رہ گیا۔ سورۂ نجم، آیت/۹۔

۱۴۔ اور جو شخص اپنے گھر سے جلا وطن ہو کے خدا اور رسول کی طرف نکل کھڑا ہو پھر اسے منزل مقصود تک پہنچنے سے پہلے موت آجائے تو خدا پر اس کا ثواب لازم ہوگا۔ سورۂ نساء، آیت/۱۰۰۔

۱۵۔ "آگے بڑھو" یہ شب معراج رسول خدا سے اللہ کا خطاب تھا۔

۱۶۔ یہ ایک مشہور فقہی قاعدہ کی طرف اشارہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی چیز کو لے لے تو اس کی ذمہ داری ہے کہ اس کو واپس کرے۔ فقہاء نے اس میں سنجیدگی اور باریکی سے تفصیلی بحث کی ہے۔

ملاحظہ ہو "عوائد الایام، مصنفہ ملا احمد نراقی"، قاعدہ ۳۳۔

القواعد الفقہیہ، آیت اللہ بجنوردی، ج ۴، ص ۴۷۔۹۹۔

۱۷۔ حد سے اپنی عرض سستی و کاہلی کی معذرت چاہتا ہوں۔ اور آخر میں حمد و ستائش خدا ہی کیلئے مخصوص ہے۔

اڑتیسویں حدیث

بالسند المتصل الى الشيخ الجليل عماد الاسلام، محمد بن يعقوب الكليني، رضوان الله عليه، عن عدة من اصحابنا، عن احمد بن محمد بن خالد، عن أبيه، عن عبد الله بن بحر، عن أبي أيوب الخزاز، عن محمد بن مسلم قال

سألت أبا جعفر عليه السلام عما يروون ان الله خلق آدم عليه السلام على صورته فقال

﴿هي صورة محدثة مخلوقة (و) اصطفاها الله واختارها على سائر الصور المختلفة، فأضافها الى نفسه كما اضاف الكعبة إلى نفسه، والروح الى نفسه، فقال "بيتي" وَ "نفخت فيه من روحي"﴾

ترجمہ: محمد بن مسلم کہتے ہیں کہ میں نے امام محمد باقرؑ سے اس بارے میں پوچھا کہ جو لوگ روایت کرتے ہیں کہ "خداوند عالم نے جناب آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے" حضرتؑ نے فرمایا وہ تازہ پیدا کی گئی صورت تھی۔ خدا نے اس صورت کو منتخب کیا اور تمام مختلف صورتوں میں اس صورت کو اختیار فرمایا اور اس کی نسبت اپنی طرف دے دی جیسے کعبہ اور روح کی نسبت اپنی طرف دی اور کہا "میرا گھر" "میں نے اس میں اپنی روح پھونک دی"۔

شرح: اس حدیث شریف کا ابتدائی حصہ ائمہؑ کے زمانے سے ہمارے زمانے تک مشہور رہا ہے اور کئی شیعہ کتابوں میں اس سے استشہاد کیا جاتا رہا ہے۔ امام محمد باقرؑ نے بھی صحت حدیث کی تصدیق فرمائی ہے، بس اتنی سی بات ہے کہ آپؑ نے حدیث کا مقصد بھی بیان فرمایا۔ لیکن شیخ صدوقؒ نے عیون اخبار

الرضا" میں حضرت امام رضا" سے ایک حدیث نقل فرمائی ہے جس کے معنی یہ ہیں:

''حسین بن خالد کہتے ہیں کہ میں نے امام رضا" سے پوچھا اے فرزند رسول" لوگ کہتے ہیں، حضرت رسول" نے فرمایا خدا نے آدم" کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔ امام ہشتم" نے فرمایا خدا ان کو غارت کرے جنہوں نے حدیث کی ابتدا کو حذف کر دیا ہے۔ (قصہ یہ ہے کہ) رسول خدا" کا گزر ایسے دو آدمیوں کی طرف سے ہوا جو ایک دوسرے کو گالی دے رہے تھے۔ حضرت" نے سنا، ان میں سے ایک شخص اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا ''خدا تیرے چہرے کو اور جس کا چہرہ تیرے چہرے کے مشابہ ہے اس کو بھی خراب کرے'' اس پر آنحضرت" نے فرمایا اے بندۂ خدا! اپنے برادر مؤمن کیلئے یہ مت کہہ کیونکہ خدا نے آدم" کو اس کی صورت پر پیدا کیا ہے''۔[۲]

اسی وجہ سے علامہ مجلسی" نے حضرت امام محمد باقر" والی حدیث کو تقیہ پر حمل فرمایا ہے اور یہ بھی احتمال دیا ہے کہ حدیث کا یہ مطلب بر فرض تسلیم ہے[۳] (مگر) یہ احتمال بہت بعید ہے، بلکہ احتمال یہ ہے کہ امام رضا" والی حدیث ﴿انّ اللہ خلق آدم علیٰ صورتہ﴾ کو حدیث اوّل کی طرف لوٹایا جائے کہ آدم سے مراد، نوع آدمی ہے اور ﴿علیٰ صورتہ﴾ کی ضمیر، خدا کی طرف پلٹتی ہے اور چونکہ مخاطب معنائے حدیث کو سمجھنے کی اہلیت نہ رکھتا ہوگا اس لئے امام رضا" نے صدر حدیث کو ذکر کر دیا تا کہ وہ خیال کرے کہ آدم سے مراد، ابوالبشر حضرت آدم" ہیں اور ''علی صورتہ'' کی ضمیر اس شخص کی طرف پلٹ رہی ہے۔ یہ مقام قابل غور ہے۔

اور ہو سکتا ہے کہ یہ دو، الگ الگ حدیثیں ہوں۔ آنحضرت" نے ایک مرتبہ حدیث شریف کو بغیر کسی سابقے کے ابتدائی طور پر فرمایا ہو اور یہ وہ حدیث ہے جس کی تاویل امام محمد باقر" نے فرمائی ہے اور ایک مرتبہ حضور" نے حدیث کو سابقے کے ساتھ فرمایا ہو اور راوی کے نا سمجھ ہونے کی وجہ سے امام رضا" نے اس کو متوجہ کیا ہو کہ حدیث مسبوق بہ سابقہ ہے اور اس مطلب کا ثبوت یہ ہے کہ بعض روایت میں ﴿علی صورتہ﴾ کے بجائے ﴿علی صورۃ الرّحمٰن﴾ آیا ہے[۴] اور یہ مضمون والی حدیث سے مناسبت بھی نہیں رکھتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر ہم فرض کرلیں یہ حدیث شریف منقول ہی نہیں ہوئی ہے اس کے معنی احادیث شریفہ میں ضرور چھپے ہوئے ہیں جو ہمارے آنے والے بیان سے واضح ہو جائے گا۔

اب آیئے حدیث شریف کے الفاظ کی تشریح کرتے ہیں

"آدم" صحاح میں ہے "آدم کی اصل دو ہمزے سے ہے، کیونکہ یہ افعل کے وزن پر ہے دوسرے ہمزہ کو الف سے بدل دیا گیا اور جب اس کو متحرک کرنا چاہتے ہیں تو دوسرے ہمزے کو و سے بدل دیتے ہیں اور جمع میں "اوادم" کہتے ہیں"۔ شاید آدم کو ابو بشر کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ "اسمر اللون" یعنی گندمی رنگ کے تھے، کیونکہ لغت میں ہے: "الادم من الناس الاسمر" (لوگوں میں آدم، سانولے شخص کو کہتے ہیں) اور بعض روایات میں ہے کہ آدم کو اس لئے آدم کہتے ہیں کہ وہ "ادیم الارض" سے (زمین سے پیدا کئے گئے) جو صورت کے معنی میں ہے اور ادیم ارض کے معنی روئے زمین کے ہیں۔

"علی صورته" لغت میں صورت کے معنی شکل و ہیئت کے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک معنائے عام مراد ہو جو تمام امور میں مشترک ہو اور وہ "شئے کی شیئیت اور اس کی فعلیت" ہے۔ بس یہ تو ضرور ہے کہ ہر چیز کیلئے ایک فعلیت ہے اور اسی اعتبار سے اس کو "ذوالصورۃ" اور اس فعلیت کو "صورت" کہتے ہیں۔ یہ جو "صورت" کو فلسفے کی زبان میں چند امور پر اطلاق کرتے ہیں تو ان سب کا مجموعہ وہی فعلیت شئے اور اس کی شیئیت ہے اور وہ بھی لغت کے خلاف نہیں ہے اور نہ ہی یہ تقارن وضعی اور اصطلاح کی مانند ہے۔

اسلامی فلاسفہ کے سربراہ، شیخ بوعلی سینا "الٰہیات شفا" میں کہتے ہیں "کبھی صورت کا اطلاق ہر اس ہیئت اور فعل پر ہوتا ہے جو قائم وحدانی یا مرکب ہو یہاں تک کہ حرکات و عراض بھی صورت ہوتی ہے اور اس چیز کو صورت کہتے ہیں جس سے مادہ بالفعل متقوم ہوتا ہے اس اعتبار سے جواہر عقلیہ اور عراض کو صورت نہیں کہا جا سکتا اور جس چیز سے مادہ کامل ہوتا ہے اس کو صورت کہا جاتا ہے چاہے بالفعل اس سے متقوم نہ بھی ہو جیسے صحت اور ہر وہ چیز کہ جس کی طرف شئے بالطبع متحرک ہو، نیز کسی شئے کی نوع، جنس اور فصل کو بھی صورت کہا جاتا ہے، اسی طرح اجزاء کے اندر کل کی کلیت بھی صورت ہے" انتہیٰ۔

ان تمام مقامات میں غور کرنے سے جن میں "صورت" استعمال ہوتی ہے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان سب میں میزان وہی فعلیت ہے جو تمام مقامات میں بطور اشتراک معنوی استعمال ہوتی ہے یہاں تک کہ خدا کو بھی "صورۃ الصور" کہا جاتا ہے۔

"اصطفاها" "صفوت" کدورتوں سے صاف و خالص کو کہا جاتا ہے اور "اصطفاء" کے معنی خالص اور صاف چیز کو حاصل کرنے کے ہیں، مگر یہ مجازی معنی ہیں۔ لیکن جوہری وغیرہ نے "اصطفاء" کے معنی "اختیار" بتائے ہیں، چنانچہ لغت میں اصطفا کے یہ معنی بھی بیان کئے گئے ہیں۔ یہ تفسیر بھی بمعنی مجازی ہے،

کیونکہ اختیار کے معنی، خیر اور نیکی کا اختیار کرنا بھی ہے، اسی لئے ظاہر میں یہ اصطفٰی سے ملازم ہے اس کا مفہوم نہیں۔

''الکعبہ'' کعبہ خانۂ خدا کا نام ہے۔ بعض علما نے کہا ہے چونکہ یہ عمارت مکعب کی مانند ہے اس لئے اس کو کعبہ کہا گیا ہے یا پھر اس کے چار سمتوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے اس کو کعبہ کہا گیا ہے۔ ماہرین ریاضیات کی اصطلاح میں ''مکعب'' اس جسم کو کہتے ہیں جس کو چھ سطحوں نے مساوی طور سے زاویہ قائمہ کے عنوان سے گھیر رکھا ہو۔

''الرُّوح'' اطباء کی اصطلاح میں روح اس لطیف بھاپ کو کہتے ہیں جو خون حیوان کی حرارت سے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ (طبا) کہتے ہیں دل کے دو خانے ہوتے ہیں، ایک داہنی طرف جس میں جگر سے خون جذب ہوتا ہے اور وہیں پر دل کی حرارت اس کو تبخیر کرتی ہے اور وہ بخارات دل کے بائیں خانے میں جاری ہوتے ہیں اور وہاں پر دل کے افعال کے نتیجے میں وہ لطیف بن جاتے ہیں اور جن سے روح حیوانی کی تشکیل ہو کر دل کے انقباض وانبساط کی وجہ سے رگوں میں اسی طرح جاری ہو جاتی ہے جس طرح اپنی جگہ پر مذکور ہے۔ پس اس روح حیوانی کا منبع قلب ہے اور رگیں اس کا مجرا ہیں۔

کبھی روح کا اطلاق اس خون پر ہوتا ہے جو جگر میں متمرکز ہے اور اس کا مجرا گردن کی شہ رگ ہیں جس کو روح طبیعی کہتے ہیں۔ جیسے حکما کے یہاں کبھی روح کا اطلاق روح نفسانی پر ہوتا ہے کہ جس کا مبدأ دماغ اور مجرا اعصاب ہیں اور وہ ایسے امر کی روح مجرد کا ظہور ونازل ہے جو سرّ سبحانی اور ''روح اللہ'' سے عبارت ہے، چنانچہ ارشاد خداوندی ﴿ونفختُ فیه من رُوحی﴾ میں اشارہ کیا گیا ہے اور اس کے بعد انشاء اللہ ہم یہ بیان کریں گے کہ یہ روح ایسی ہے جس میں خدا کی روح پھونکی گئی ہے اور یہ خداوند متعال کی اختیار کردہ ہے۔

پهلی فصل

آدم مظهر تام و اسم اعظم الٰهی هیں

ارباب معرفت واصحاب قلوب فرماتے ہیں: تمام اسمائے الہیہ کیلئے حضرت واحدیت میں ایک صورت ہے جو بواسطہ حبّ ذاتی اور طلب مفاتیح غیب کہ ﴿لا یَعلَمُها الّا هو﴾ ''جنہیں خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا'' حضرت علمیہ میں فیض اقدس کی تجلی کے تابع ہے اور اس صورت کو اہل اللہ کی اصطلاح میں

''عین ثابت'' کہا جاتا ہے اور فیض اقدس کی اس تجلی سے پہلے تو تعینات اسمائیہ حاصل ہوتے ہیں اور عین اسی تعین اسی سے صور اسمائی جو اعیان ثابتہ ہیں، نمودار ہوتے ہیں اور سب سے پہلا اسم جو تجلی احدیت اور فیض اقدس سے حضرت علمیہ واحدیہ میں ظہور حاصل کرتا اور اس تجلی کا آئینہ بنتا ہے وہ اسم اعظم جامع الٰہی ومقام اسمائے ''اللہ'' ہے جو وجہ غیبیہ میں عین تجلی بہ فیض اقدس ہے اور کمال جلاء واستجلاء کے تجلی ظہور میں ایک اعتبار سے عین مقام جمع واحدیت ہے اور ایک اعتبار سے کثرت اسمائیہ ہے اور اس جامع کا تعین اور اس کی صورت عبارت ہے ''عین ثابت انسان کامل وحقیقت محمدیہ'' سے، جیسے کہ مظہر تجلی یعنی فیض اقدس، فیض مقدس ہے اور مقام واحدیت کا مظہر تجلی مقام الوہیت ہے اور عین ثابت انسان کامل کا مظہر تجلی روح اعظم ہے اور تمام موجودات اسمائیہ وعلمیہ وعینیہ انہیں حقائق ورقائق کے مظاہر کلیہ وجزئیہ ہیں۔ اسی ترتیب بدیع کے ساتھ جس کی تفصیل اس مختصر میں نہیں آسکتی اور ہم نے ''مصباح الہدایہ'' میں اس کی تفصیل بیان کی ہے۔[۸]

یہیں سے معلوم ہو گیا کہ انسان کامل اسم جامع کا مظہر اور اسم اعظم کی تجلی کا آئینہ ہے۔ چنانچہ کتاب وسنت میں اس مطلب کی طرف بہت جگہوں پر اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے ﴿وَعَلَّمَ آدَمَ الأَسْمَاءَ كُلَّهَا﴾[۹] دست جلال وجمال سے باطن آدم کے اعتبار سے ہونے والی اس تخمیر غیبی معنوی کی تعلیم حضرت واحدیت میں ہوئی ہے، جیسے کہ آدم کی صورت اور ظاہر کی تخمیر عالم شہادت میں بہ ظہور دست جلال وجمال مظہریت طبیعت میں ہوئی ہے، نیز ارشاد خداوندی ہے ﴿إِنَّا عَرَضْنَا الأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ﴾[۱۰] اور امانت سے مراد اہل عرفان کے یہاں ولایت مطلقہ ہے، کیونکہ انسان کے علاوہ کوئی بھی موجود اس کے لائق نہیں ہے اور یہ ولایت مطلقہ وہی مقام فیض مقدس ہے جس کی طرف قرآن نے ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلاَّ وَجْهَهُ﴾[۱۱] کہہ کر اشارہ فرمایا ہے۔ کافی کی ایک حدیث شریف میں حضرت امام محمد باقرؑ نے فرمایا ہے ﴿نَحْنُ وَجْهُ اللهِ﴾[۱۲] اور دعائے ندبہ میں ہے ﴿أَيْنَ وَجْهُ اللهِ الَّذِي إِلَيْهِ يَتَوَجَّهُ الأَوْلِيَاءُ، أَيْنَ السَّبَبُ الْمُتَّصِلُ بَيْنَ أَهْلِ الأَرْضِ وَالسَّمَاءِ﴾[۱۳] اور زیارت جامعہ کبیرہ میں ہے ﴿وَالْمَثَلُ الأَعْلَى﴾[۱۴] اور یہ مثلیت ووجہیت وہی ہے جو حدیث شریف میں ہے ﴿إِنَّ اللهَ خَلَقَ آدَمَ عَلَى صُورَتِهِ﴾ یعنی آدم مثل اعلائے حق اور آیت اللہ کبریٰ، مظہر اتم، تجلیات اسماء وصفات کا آئینہ اور وجہ اللہ، عین اللہ، ید اللہ وجنب اللہ ہیں ﴿هُوَ يَسْمَعُ وَيُبْصِرُ وَيَبْطِشُ بِاللهِ، وَاللهُ يُبْصِرُ وَيَسْمَعُ وَيَبْطِشُ بِهِ﴾[۱۵]

اور یہ وجہ اللہ وہی نور ہے جس کے بارے میں قرآن کا ارشاد ہے۔ ﴿اللّٰہُ نُورُ السَّماواتِ وَالأرْضِ﴾ ۱۶ اور امام پنجم نے کافی کی حدیث شریف میں ''ابو خالد کابلی'' سے فرمایا ﴿ ... وَهُمْ وَاللّٰہِ نُورُ اللّٰہِ الَّذي أنزل، وهُمْ واللّٰہِ نُورُ اللّٰہِ في السّمواتِ والأرْضِ﴾ ۱۷ ''یہی حضرات (ائمہؑ) خدا کی قسم وہ نور خدا ہیں جن کو خدا نے نازل فرمایا ہے اور یہی لوگ خدا کی قسم آسمانوں اور زمین میں خدا کے نور ہیں''۔ کافی شریف میں حضرت امام محمد باقرؑ سے ﴿عَمَّ يَتَساءَلُونَ ☆ عَنِ النَّبَإِ العَظِيمِ﴾ ۱۸ کی تفسیر میں روایت کی گئی ہے کہ اس سے مراد حضرت علیؑ ہیں۔ حضرت علیؑ فرمایا کرتے تھے ﴿ما لِلّٰہِ آيَةٌ هِيَ أكْبَرُ مِنّي، ولا لِلّٰہِ مِن نَبَأٍ أعْظَمُ مِنّي﴾ ۱۹ ''خدا کی کوئی آیت مجھ سے بڑی نہیں ہے اور نہ خدا کی کوئی نبأ (خبر) مجھ سے اعظم ہے''۔

خلاصہ یہ ہے کہ انسان کامل ہی خدا کی عظیم ترین آیت اور مظہر اسماوصفات اور مثل اور آیت حق تعالیٰ ہے اور جناب آدمؑ اس کے مصادیق میں سے ایک مصداق تھے اور خدا مِثل یعنی شبیہ سے منزہ و مبرا ہے۔ لیکن خدا کو مَثَل یعنی آیت وعلامت سے منزہ نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ ﴿ولہُ المَثَلُ الأعْلىٰ﴾ ہے۔ کائنات کے تمام ذرے خدائے جمیل کی تجلیات کا آئینہ اور نشانیاں ہیں۔ بس اتنا ضرور ہے کہ ہر ایک اپنے ظرف کے اعتبار سے ہے لیکن کوئی بھی آیت اسم اعظم جامع یعنی ''اللہ'' نہیں ہے سوائے حضرت کون جامع ومقام مقدس برزخیت کبریٰ کے ﴿جلّتْ عَظَمَتُهُ بعظمة باريه، فاللّٰہُ تعالىٰ خلق الإنسان الكامل وَالآدمَ الأوّل على صُورَتِه الجامعةِ وجعلهُ مرآة أسمائِه وصفاته﴾

قال الشَّيخُ الكَبِيرُ

﴿فظهر جميعُ ما في الصُّورة الإلٰهيّة من الأسماء في هذه النَّشأة الإنسانيّة، فحازتْ رُتْبَةَ الإحاطةِ والجمعِ بهذا الوُجُودِ وبه قامت الحُجّةُ لله على الملائكة﴾ ۲۱ ''پس خدا نے انسان کامل اور آدم اول کو ان کی صورت جامعہ پر خلق فرمایا اور انہیں کو اپنے اسماوصفات کا آئینہ قرار دیا''۔

شیخ کبیر فرماتے ہیں ''صورت الٰہیہ میں جتنے بھی اسما اس نشأت انسانیہ میں تھے وہ سب کے سب ظاہر ہو گئے، پس اس نشأت نے اپنے اس وجود کے ساتھ احاطہ وجمع کا مرتبہ حاصل کر لیا اور اسی کے ذریعے خدا کی حجت ملائکہ پر قائم ہو گئی''۔

اس بیان سے معلوم ہو گیا کہ خداوند عالم نے مختلف اکوان کی مختلف صورتوں میں سے صورت جامعہ

انسانیہ ہی کو کیوں انتخاب واختیار کیا؟ اور حضرت آدمؑ کو تمام ملائکہ پر کیوں مکرم کیا؟ ورتمام مخلوقات میں انہیں کو شرف کیوں بخشا؟ اور ﴿ونفخت فيه من روحي﴾[۲۲] میں ان کی روح کو اپنی طرف کیوں منسوب کیا؟

چونکہ اس کتاب میں اختصار مدنظر ہے اس لئے نفخۂ الہیہ کی حقیقت اور آدم میں اس کی کیفیت اور تمام مخلوقات میں آدم کے ساتھ اختصاص کی وجہ وغیرہ سے صرف نظر کرتا ہوں۔

والحمد لله أولاً وآخراً

توضیحات (۳۸)

۱۔ اصول کافی، ج۱، ص۱۳۴، کتاب التوحید، باب الروح، حدیث۴۔

۲۔ عن الحسین بن خالد قال، قلت للرضا:

﴿یابن رسول الله ان الناس یروون ان رسول الله قال: إن الله عزّوجلّ خلق آدم علی صورته. فقال: قاتلهم الله

لقد حذفوا اول الحدیث ان رسول الله مرّ برجلین یتسابّان، فسمع احدهما یقول لصاحبه: قبّح الله

وجهک ووجه من یشبهک، فقال: یا عبد الله لا تقل هذا لاخیک فان الله عزّوجلّ خلق آدم علی صورته﴾۔

عیون اخبار الرضا، ج۱، ص۱۱۹، باب۱۱، حدیث۱۲۔

۳۔ مرآۃ العقول، ج۲، ص۸۴، کتاب التوحید، باب الروح، حدیث۴۔

۴۔ تفسیر القرآن الکریم، ملا صدرا، ج۴، ص۳۳۵؛

فتوحات مکیہ (تحقیق عثمان یحیی) ج۱، ص۸۔

۵۔ عن ابی عبد الله قال: ﴿انما سمی آدم آدم، لانه خلق من ادیم الارض﴾۔ علل الشرائع، ج۱، ص۲۶

۶۔ مجمع البیان، تفسیر آیت ۹۷ سورۂ مائدہ؛ قاموس اللغۃ، ذیل کلمہ کعب، کعبہ۔

۷۔ ﴿وعنده مفاتح الغیب لا یعلمها الا هو﴾ ''اور اس کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی دوسرا

نہیں جانتا'' اس آیۂ شریفہ کی طرف اشارہ ہے۔ سورۂ انعام، آیت/۵۹۔

۸۔ مصباح الہدایۃ الی الخلافۃ والولایۃ، ص۲۸، ۳۲، ۵۴، ۵۶۔

۹۔ خدا نے آدم کو تمام اسما کی تعلیم فرمائی۔ سورۂ بقرہ، آیت/۳۱۔

۱۰۔ ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا مگر سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا، اور ڈر گئے مگر

انسان نے اٹھا لیا یقیناً وہ ظالم اور نادان ہے۔ سورۂ احزاب، آیت/۷۲۔

۱۱۔ سورۂ قصص، آیت ۸۸۔

۱۲۔ خدا کا چہرہ ہم ہیں۔ اصول کافی، ج۱، ص۱۴۵، کتاب توحید، باب نوادر، حدیث۷۔

۱۳۔ کہاں ہے وہ خدا کا چہرہ جس کی طرف اس کے دوست رخ کرتے ہیں، کہاں ہے زمین اور آسمان والوں کو جوڑنے

والا واسطہ؟۔ زاد المعاد، باب۱، ص۳۹۹؛ مفاتیح الجنان، ص۵۳۷۔

۱۴۔ اعلیٰ ترین مثال ہیں۔ من لا یحضرہ الفقیہ، ج۲، ص۳۷۵، باب زیارت جامعہ؛

عیون اخبار الرضاؑ، شیخ صدوقؒ، باب ۲۸، حدیث ۱۔

۱۵۔ اصول کافی، کتاب الایمان والکفر، باب کن ... المسلمین، حدیث ۲

۱۶۔ سورہ نور، آیت ۳۶۔

۱۷۔ اصول کافی، ج ۱، ص ۱۹۴، کتاب حجت، باب ان الائمۃ نور اللہ، حدیث ۱

۱۸۔ "یہ لوگ کس چیز کے بارے میں پوچھتے ہیں کیا اس عظیم خبر کے بارے میں؟" سورہ نبا، آیت ۱، ۲

۱۹۔ اصول کافی، ج ۱، ص ۲۰۷، کتاب حجت، باب ان الآیات التی ذکرھا اللہ فی کتابہ، حدیث ۳۔

۲۰۔ یہ آیت ﴿وله المثل الاعلی فی السموات والارض﴾ (روم: ۲۷) اور اس میں اس کی جانب اعلیٰ شان و مرتبہ

ہے کی طرف اشارہ ہے۔ سورہ روم، آیت ۲۷

۲۱۔ ترجمہ متن میں گزر چکا ہے۔

۲۲۔ سورہ حجر، آیت ۲۹، اور سورہ ص، آیت ۷۲۔

انتالیسویں حدیث

بالسند المتصل الی رکن الاسلام، محمد بن یعقوب الکلینی رضوان اللہ علیہ، عن عدۃ من اصحابنا، عن احمد بن محمد بن خالد، عن ابن محبوب وعلی بن الحکم عن معاویہ بن وھب قال

سَمِعتُ اَبا عَبدِاللّٰہِ علیہ السلام یَقُولُ

﴿اِنَّ مِمّا اَوحَی اللّٰہُ اِلیٰ مُوسی علیہ السلام واَنزَلَ عَلَیہِ فِي التَّوراۃِ اَنّي اَنا اللّٰہُ لا اِلٰہ اِلّا اَنا، خَلَقتُ الخَلقَ وخَلَقتُ الخَیرَ واَجرَیتُہُ علی یَدَي مَن اُحِبُّ، فَطُوبی لِمَن اَجرَیتُہُ علی یَدَیہِ واَنا اللّٰہُ لا اِلٰہَ اِلّا اَنا، خَلَقتُ الخَلقَ وخَلَقتُ الشَّرَّ واَجرَیتُہُ علی یَدَي مَن اُرِیدُہُ، فَوَیلٌ لِمَن اَجرَیتُہُ علی یَدَیہِ﴾!

ترجمہ۔ معاویہ بن وہب کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادقؑ کو فرماتے ہوئے سنا
خداوند عالم نے جناب موسیٰؑ پر جن باتوں کی وحی فرمائی تھی اور ان کو توریت میں نازل کیا تھا ان میں سے یہ بات بھی تھی "بے شک میں اللہ ہوں، میرے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے۔ میں نے مخلوق اور خیر کو پیدا کیا اور خیر کو اس ذات کے ہاتھوں اجرا کرایا جس کو میں دوست رکھتا ہوں۔ پس کیا کہنا اس کا جس کے ہاتھوں میں نے خیر کا اجرا کیا۔
اور میں اللہ ہوں۔ میرے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے۔ میں نے مخلوق اور شر کو پیدا کیا اور شر کو جس کے ہاتھوں چاہا اجرا کرایا۔ پس ویل ہو اس شخص کیلئے جس کے ہاتھوں سے شر کا اجرا کرایا"۔

شرح ""لہ"" "أله، الهة" کے معنی "عَبَدَ عبادة" "(پرستش کی) کے ہیں اور "اله" بروزن فعال بمعنی مفعول ہے جیسے "امام" بمعنی "من یؤتم به" ۲ کے ہے۔

"الــہ" کی اصل "الله" تھی، الف ولام کے داخل ہونے کے بعد ہمزہ کو تخفیف کیلئے گرا دیا گیا۔ لیکن بعض علما کا خیال ہے، الف ولام ہمزہ کے بدلے میں لائے گئے ہیں ۳ ان میں سے ہر ایک کے پاس اپنی دلیل بھی ہے مگر اس کا ذکر لازم نہیں ہے۔ البتہ اہل اللہ کی زبان میں الٰہیت اور الوہیت کو زیادہ تر مقام تجلی بہ فعل اور مقام فیض مقدس کیلئے استعمال کرتے ہیں اور اللہ کو جو اسم جلالہ ہے زیادہ تر مقام ذات مستجمع صفات کیلئے اطلاق کرتے ہیں اور کبھی اس کے برعکس استعمال کرتے ہیں۔

اس حدیث شریف میں ہوسکتا ہے لغوی معنی میں عرفی استعمال ہوا ہو، یعنی میں معبود ہوں اور میرے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے اور اگر یہ معنی مراد ہیں تو پھر قصر عبودیت یا تو اس بات پر مبنی ہے کہ کوئی دوسرا اس کا مستحق نہیں ہے، چاہے وہ لوگوں کو خطا اور غلطی کی بنا پر معبود واقع ہو یا پھر اصحاب قلوب و ارباب معرفت کے اس قول پر مبنی ہے کہ عبادت خواہ کسی مظہر میں ہو وہ عبادت کامل مطلق ہے اور انسان حسب ﴿فِطْرَتَ اللهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾ مطلق طور پر جمیل و حسین ذات کا طالب ہوتا ہے، اگرچہ خود اس فطرت سے محجوب ہے، اور اپنے کو متعین و تعین سے وابستہ گمان کرتا ہے۔

لیکن ذیل حدیث کو دیکھ کر جس میں خیر و شر کی نسبت اپنی طرف دی ہے اس سے اس احتمال کو تقویت ملتی ہے کہ "اله" سے مراد وہی مقام الوہیت ہے اور یہ توحید افعالی کی طرف اشارہ ہے جس کی تعبیر بڑے بڑے حکما کی زبان میں ﴿لا مُؤَثِّرَ فِي الْوُجُودِ اِلاَّ اللهُ﴾ "اللہ کے سوا کوئی اور اثر انداز نہیں ہے" سے کی گئی ہے اور اس مطلب کی طرف بعد میں اشارہ کیا جائے گا۔

"بحار" محدثین کے محقق علامہ مجلسیؒ اس حدیث شریف کے ذیل میں فرماتے ہیں "خیر و شر کا اطلاق (جہاں) اطاعت و معصیت پر ہوتا ہے (وہیں) ان کے اسباب و علل، اسی طرح مفید مخلوقات جیسے غذا، میوے اور کھائے جانے والے جانور، نیز موذی اور ضرر رساں مخلوقات جیسے بچھو، سانپ وغیرہ اور نعمتوں و مصیبتوں پر (بھی) ہوتا ہے۔ اشاعرہ کہتے ہیں یہ سب خدا کا فعل ہے۔ لیکن امامیہ و معتزلہ نے افعال عباد کے بارے میں اس کی مخالفت کی ہے اور جو آیات و روایات منقول ہوئی ہیں کہ خدا خالق خیر و شر ہے، امامیہ و معتزلہ نے ان کی تاویل افعال عباد کے علاوہ دیگر معانی سے کی ہے"۔ اس کے بعد علامہ مجلسیؒ نے فرمایا

ہے۔ "اب رہے حکما تو ان میں سے اکثر کہتے ہیں ﴿لا مؤثر فی الوجود الا اللہ﴾ اور بندوں کے ارادے اس بات کے ممد و معاون ہوتے ہیں کہ خدا افعال عباد کو اپنے ہاتھوں ایجاد کرے اور یہ بات خود حکما اور اشاعرہ کے مطابق ہے۔ ویسے اس قسم کی روایت کو تقیہ پر حمل کیا جا سکتا ہے"۔ انتہی کلامہ رفع مقامہ

تحقیق خیر و شر

خیر و شر کا اطلاق ذات یا صفات میں کمال یا نقص کے معنی میں ہوتا ہے اور وجود و کمالات وجود میں بھی ہوتا ہے اور جتنی بھی نیکیاں ہیں وہ بالذات حقیقت وجود کی طرف پلٹتی ہیں اور دوسری چیزوں پر جو ان کا اطلاق ہوتا ہے وہ ان کے طریقۂ وجود کا لحاظ کر کے بولا جاتا ہے، جیسے شر بالذات عدم وجود یا عدم کمال وجود کا نام ہے اور دوسری چیزوں پر اس کا اطلاق بالعرض ہوتا ہے، جیسے اذیت پہنچانے والی اشیا اور موذی حیوانات پر اطلاق عرضی ہے۔ اطراف کے تصور کے ساتھ اس کو بدیہیات میں شمار کیا گیا ہے حالانکہ اس پر برہان قوی بھی موجود ہے۔

علامہ مجلسیؒ (و دیگر علما) نے جو یہ فرمایا ہے: "افعال عباد کے خلق کے بارے میں امامیہ اور معتزلہ نے اشاعرہ کی مخالفت کی ہے اور جو آیات و احادیث خیر و شر کی نسبت خدا کی طرف دیتے ہیں ان کی تاویل کی ہے" (تو اس سلسلے میں عرض کرتا ہوں) اشاعرہ کی مخالفت تو بالکل صحیح ہے، کیونکہ یہ لوگ مسلک جبر کے پیرو ہیں اور ان کا مسلک صریح عقل و برہان و وجدان کے خلاف ہے۔ لیکن آیات و احادیث کو مذہب معتزلہ پر حمل کرنا (بھی) بے معنی بات ہے، کیونکہ یہ لوگ مسلک تفویض کے پیرو ہیں اور ان کا مذہب اشاعرہ کے مسلک سے بھی زیادہ باطل اور اس کی قباحت و رسوائی اس سے کہیں زیادہ ہے۔

البتہ حضرات امامیہ، اہل بیت عظامؑ کے نور ہدایت اور خاندان وحی و عصمتؑ کی بدولت مسلک حق کو اختیار کر چکے ہیں جو آیات شریفہ اور مضبوط دلیلوں کے موافق اور عظیم ترین عرفا کے مسلک اور اصحاب قلوب کے ذوق کے مطابق ہے۔ اس کی بنا پر وہ ان آیات و روایات کثیرہ کی تاویلات کے محتاج نہیں ہیں جن معنوں میں علامہ مجلسیؒ نے تاویل کی ہے، بلکہ امامیہ اور ان کے ائمہؑ افعال عباد میں سے کسی بھی فعل کو ارادۂ حق سے معزول سمجھتے ہیں اور نہ کسی چیز کی (مکمل طور پر) بندوں کو سپردگی کے قائل ہیں۔

اور علامہ مجلسیؒ نے جو کلام کے آخر میں فرمایا "﴿لا مؤثر فی الوجود الا اللہ﴾ اکثر حکما نے کہی ہے

فرمایا ہے اور یہ مذہب حکما اور اشاعرہ کے موافق ہے" تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ ﴿لَا مُؤَثِّرَ فِي الْوُجُودِ إِلَّا اللّٰهُ﴾ کا قول اکثر حکما کا مسلک ہے، یہ صحیح ہے، بلکہ تمام حکما اور اہل معرفت کا یہی مذہب ہے، بلکہ کہا جاتا ہے "حکما میں سے جو بھی اس بات کا قائل نہ ہو تو رحکمت اس کے دل میں اترا ہی نہیں اور اس کے باطن نے معرفت کو چھو یا ہی نہیں ہے" مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بندے کا ارادہ، ایجادِ حق تعالیٰ کیلئے مددگار ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس کے اہل کے نزدیک واضح ہے اور اس کا مذہب اشاعرہ کے موافق ہونا قابل قبول نہیں ہے اور اس سے بھی عجیب بات یہ ہے کہ علامہ مجلسیؒ نے مذہب اشاعرہ کو مذہب حکما و فلاسفہ پر عطف فرمایا ہے، حالانکہ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے، ور بہت کم ایسے محقق حکیم و فلسفی ہوں گے جو مذہب اشاعرہ کو باطل نہ سمجھتے ہوں اور اس کے مخالف نہ ہوں۔

ورعلامہ مجلسیؒ نے یہ جو فرمایا ہے "ممکن ہے ان اخبار کو تقیہ پر محمول کر دیا جائے" تو پہلی بات یہ ہے کہ یہ حمل بلاوجہ ہے، کیونکہ ان اخبار کے ظواہر مذہب حقہ کے موافق اور برہان کے مطابق ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ روایات واخبار قرآن مجید کی بہت سی آیتوں کے موافق ہیں، لہذا ان آیات، نیز ان اخبار کو جو ان آیات کے موافق ہیں، تقیہ پر حمل کرنے کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ ان اخبار کا معارض بھی نہیں ہے تاکہ مقام معارضہ میں تقیہ پر حمل کر دیا جائے جو مرجحات کی ایک قسم ہے، نیز یہ اخبار ان روایت کے ساتھ قابل جمع ہیں جن کی دلالت اس بات پر ہے کہ انسان خیر وشر کا فاعل ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ خود علامہ مجلسیؒ نے فرمایا ہے "یہ اخبار مذہب اشاعرہ کے مطابق ہیں" علی الظاہر مذہب اشاعرہ (اس وقت) اکثریت کا مسلک نہیں تھا، لہذا اسی صورت میں حمل بر تقیہ نا قابل توجیہ ہے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ یہ باب اور اس کی مانند دیگر ابواب، باقی عقیدتی معاملوں میں، متعارض روایات کے سلسلے میں مرجحات میں شمار نہیں ہوتی، جیسا کہ واضح ہے۔

"طُـوبـی" جوہری نے کہا ہے "طوبیٰ بروزن فُعلیٰ" ہے اور طیب سے ماخوذ ہے۔ یہ طیبیٰ تھا مگر "یہ" کا ما قبل حرف مضموم تھا اس لئے "واو" سے "یہ" کو بدل دیا گیا اور مجمع میں ہے کہ "طوبیٰ لہم" کا مطلب "ان کیلئے اچھی زندگی" ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ طوبیٰ کا مطلب خیر اور انتہائے آرزو ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ طوبیٰ جنت میں یک درخت کا نام ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لغت اہل ہند میں طوبیٰ بہشت کا

نام ہے۔ "وطوبیٰ لک وطوباک" اضافت کے ساتھ بھی استعمال ہوا ہے۔ رسول اکرمؐ کی روایت ہے کہ "طوبیٰ بہشت میں ایک درخت ہے جس کی جڑ میرے گھر میں ہے اور اس کی شاخ علیؑ کے گھر میں ہے"۔ ۷

"ویل" جوہری کا کہنا ہے "ویح" کلمۂ رحمت ہے اور "ویل" کلمۂ عذاب ہے۔ یزیدی کہتا ہے دونوں کے ایک معنی ہیں "ویلٌ لزیدٍ و ویحٌ لزیدٍ" کو بنا بر مبتدا ہونے کے مرفوع اور فعل کو مقدر مان کر منصوب پڑھا جا سکتا ہے، جیسے ﴿الزمہ اللّٰہ الویل﴾ ہے بعض نے کہا ہے: "ویل جہنم کی ایک وادی ہے کہ اگر پہاڑ کو اس میں ڈال دیں تو شدت تمازت سے پگھل جائے گا" ۸ بعض نے کہا ہے "دوزخ کے ایک کنویں کا نام ہے"۔ ۹

پہلی فصل

خیر وشر، متعلق ایجاد

اور قضائے الٰہی میں وقوع شر کی کیفیت

جان لو کہ علوم عالیہ میں یہ بات بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کی جا چکی ہے کہ نظام وجود، خیر وکمال کے اعلیٰ درجے اور حسن وجمال کے انتہائی بلند مرتبے پر فائز ہے اور یہ اجمالی طریقے سے ایک قسم کے دلیل لمّی سے اور دوسرے اعتبار سے تفصیلی طور پر ثابت ہے، اگرچہ اس کی تفصیل پر اطلاع صرف اس کے خالق کو ہے یا پھر وحی وتعلیم الٰہی پر موقوف ہے لیکن جو چیز یہاں پر اس کتاب کے مناسب ہے اور سابق اس کی طرف اشارہ بھی کر دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جو چیز کمال وجمال وخیر سے حیثیت رکھتی ہے وہ اصل حقیقت وجود سے خارج نہیں ہے، کیونکہ وجود کے علاوہ کسی اور چیز کا تحقق ہی نہیں ہے اور یہ معلوم ہے کہ حقیقت وجود کے مد مقابل، عدم یا ماہیت ہے اور بحسب ذات خود ان دونوں میں سے کوئی کچھ نہیں ہے، یہ باطل یا محض اعتباری ہیں، جب تک یہ چیزیں نور وجود سے منوّر اور ظہور وجود سے ظاہر نہ ہوں ان کیلئے کوئی ثبوت نہیں ہے، نہ ثبوت ذاتی نہ صفاتی وآثاری۔ جب ان کے سروں پر وجود سایہ فگن ہوتا ہے اور دست رحمت واسعہ ان کے سروں پر کھینچ جاتا ہے تب ان میں سے ہر ایک ظہور وخاصیت وآثار کا مالک ہوتا ہے۔ پس تمام کمالات مطلق طور پر جمیل وحسین اس ذات کے حسن وجمال کا پرتو ہیں اور تجلّی نور مقدس کامل مطلق ہے۔ دیگر مخلوقات کے اپنے پاس کچھ بھی نہیں ہے وہ تو فقر محض ولاشے مطلق ہیں۔ پس تمام کمالات اس سے ہیں اور اسی کی

طرف پلٹتے ہیں۔![١٠]

اسی طرح یہ اپنی جگہ ثابت ومقرر ہے کہ ذات مقدس سے جو چیز صادر ہوتی ہے وہ اصل حق وجود وخالص متن ہستی ہے، بغیر اس کے کہ وہ عدم یا ماہیت سے متعلق کسی حدود میں محدود ہو، کیونکہ عدم وماہیت غیر صادر ہوتے اور فیض میں محدودیت فیض حاصل کرنے والے کی محدودیت سے ہوتی ہے اور جس شخص کو کیفیت افاضہ وفیض کا علم اس طرح ہوگا جس طرح اہل معرفت نے بیان کیا ہے وہ اس بات کی تصدیق کرے گا کہ فیض باری میں کسی قسم کی بھی حد بندی اور قید کا تصور نہیں ہے۔ لہذا جس طرح ذات مقدس کو نقص وامکان ومحدودیت سے منزہ سمجھا جاتا ہے اسی طرح فیض مقدس کو بھی تمام امکانی حدود اور امکانات راجعہ بہ ماہیات اور تقییدات راجعہ بہ حدود ونقائص سے منزہ ومقدس ماننا چاہیے۔ پس اس کا فیض بھی جو جمیل مطلق کا سایہ ہے، جمیل مطلق اور مکمل جمال وکمال ہے ﴿فَهُوَ جَمِيلٌ فِي ذَاتِهِ وَصِفَاتِهِ وَأَفْعَالِهِ﴾ "وہ اپنی ذات، صفات اور افعال میں جمیل وحسین ہے" اور سوائے اصل وجود کے (کوئی بھی شے) جعل وایجاد سے متعلق نہیں ہوسکتی۔![١١]

نیز یہ بات بھی اپنی جگہ ادلہ وبراہین سے ثابت ہے کہ اس عالم طبیعت اور ہاویہ مظلمہ کے تنگ مقام میں جتنے بھی شرور، ناگہانی موت، ہلاکتیں، امراض، عجیب وغریب مہلک حوادث اور موذی چیزیں وغیرہ ہیں یہ سب کے سب مخلوقات کے باہمی ٹکراؤ اور تضاد سے ہوا کرتے ہیں، جہات موجودیہ کی وجہ سے نہیں ہوا کرتے، بلکہ مخلوقات کی جگہ کی تنگی اور نقص کی وجہ سے ہے اور یہ سب حدود ونقائص کی طرف پلٹتی ہیں جو مکمل طور پر نور جعل کی حدود سے خارج اور حقیقت میں جعل کے خلاف ہیں۔ وجود خود، حقیقت ہے جو تمام برائیوں، خامیوں اور نواقص سے بری ہے اور نقائص وشرور، ور معترواذیت رساں اشیاء، اگرچہ نقص وضرر کے پہلوؤں کے ساتھ بالذات مورد جعل نہیں ہیں لیکن بالعرض، بحث ونظر اور ادلہ وبرہان کے زاویہ نگاہ سے مجعول ہیں۔ اس لئے کہ اگر اصل عالم طبیعت متحقق نہ ہو اور جہات وجودیہ کے لحاظ سے یہ متعلق جعل نہ ہو تو پھر نقائص وشرور اس میں اسی طرح پیدا نہ ہوں گے جس طرح نفع وخیر وکمال اس میں پیدا نہ ہوں گے، کیونکہ اس طرح کے اعدام، اعدام مطلقہ نہیں ہیں، بلکہ اعدام مضافہ ہیں جن کیلئے ملکات کے ضمن میں ایک عرضی تحقق بہرحال ہوتا ہے اور ان سے پیدا شدہ قضیہ، قضیہ معدولہ یا موجبہ سالبۃ المحمول ہوتا ہے نہ کہ سالبہ محصلہ۔![١٢]

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ جو چیز بالذات خلقت سے متعلق اور جعل الٰہی کی زد میں آتی ہے وہ صرف حسنات وکمالات ہوا کرتے ہیں اور قضائے الٰہی میں شرور، ضرر رساں اشیا وغیرہ کا عمل عرضی ہوتا ہے۔ ﴿ما اصابک من حسنۃ فمن اللہ وما اصابک من سیئۃ فمن نفسک﴾ ۱۳؎ اس آیت میں پہلے مقام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور مقام دوم کی طرف اس آیت میں یہ شارہ ہے ﴿قل کل من عند اللہ﴾ ۱۴؎ اور آیات شریفہ و احادیث اہل بیت عصمت ؑ میں ان دونوں مقامات کی طرف بہت زیادہ اشارہ کیا گیا ہے ان میں سے یہ حدیث شریف بھی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "خیر وشر دونوں جعل وخلقت سے متعلق ہیں"۔

دوسری فصل

خیر وشر کا بندوں کے ذریعے اجرا کی کیفیت

سابقہ مطالب میں غور وخوض سے جو لوگ اہل ہیں ان کو معلوم ہو جائے گا کہ مخلوقات کے ہاتھوں خدا خیر وشر کو کیونکر اجرا کراتا ہے کہ جس سے کوئی جبر کا مفسدہ لازم نہیں آتا۔ البتہ اس طرح کی تحقیق جس سے مطلب واضح ہو جائے اور اس سلسلے میں ہونے والے تمام اعتراضات رفع ہو جائیں وہ مسالک ومکاتب کے تفصیلی بیان پر موقوف ہے اور اس کیلئے ضروری ہے کہ بہت سے مقدمات کا ذکر کیا جائے، مگر اس کتاب میں اس کی تفصیل بیان کرنے سے میں قاصر ہوں۔ البتہ ایک اجمالی اشارہ ضرور کرنا چاہتا ہوں جو بحث کے تناظر میں مناسب ہے۔

پس آپ یہ سمجھ لیں کہ موجودات میں سے کوئی بھی موجود اپنے کسی بھی عمل میں اس وقت تک مستقل نہیں ہو سکتا جب تک فاعل وموجد معلول کے عدم میں رہنے والے تمام اسباب کو سو فیصد ختم نہ کر دے۔ مثلاً ایک معلول کے وجود میں آنے کیلئے سو شرطیں ہیں اور فاعل ۹۹ کو پوری کرتا اور ایک کو چھوڑ دیتا ہے تو معلول موجود نہیں ہو سکتا اور نہ اس فاعل کو علت مستقلہ کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ کسی بھی علت کا مستقل ہونا اس بات پر موقوف ہوتا ہے کہ وہ علت تمام ان چیزوں کو معدوم کر دے جن کا معدوم ہونا معلول کے وجود کیلئے ضروری ہے تاکہ معلول کو وجود کی حد تک پہنچائے اور وہ وجود میں آ جائے، نیز یہ امر مسلمہ ہے اور دلائل کی رو سے بھی یہ بات معلوم ہے کہ یہ تمام دائرۂ ممکنات ساکنین جبروت عقلی وملکوت علیا سے لے کر عالم ملک وطبیعت کے بسنے والوں تک تمام سرگرم باطنی وظاہری قوتوں کے بس کی بات نہیں ہے، کیونکہ پہلا عدم جو

معلول پر جائز ہے عدم علت فاعلہ وموثرہ پر اس کا عدم ہے اور ممکنات کے سلسلے میں ایسا کوئی موجود نہیں ہے جو اس لحاظ سے عدم معلول کو روک سکے، کیونکہ ایسا ہونے کا لازمہ امکان ذاتی کا وجوب ذاتی سے بدلنا اور ممکن کا دائرۂ امکان سے خارج ہوجانا ہے اور یہ "انقلاب" بدیہی طور پر محال ہے۔ پس ثابت ہوا کہ ایجاد میں استقلال کیلیے وجود میں استقلال ضروری ہے اور یہ بات ممکنات میں ممکن نہیں ہے۔

اسی بیان سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ تفویض نہ صرف ایجاد میں، بلکہ موجودات کے شؤون وجودی میں سے کسی بھی شأن میں ممکن نہیں ہے۔ یہ صرف مکلّفین یا افعال مکلّفین سے مخصوص نہیں ہے (جیسا کہ ہمارے علما عنوان بحث قرار دیتے ہیں)، اگرچہ یہ متکلمین کی زبانوں سے جاری ہونے والے کلمات سے اختصاص ہی سمجھا جاتا ہے، لیکن متفرق ابواب کے ملاحظے سے بحث کی عمومیت کو سمجھا جاسکتا ہے۔ ہاں! اتنی بات ضرور ہے کہ طریقہ اصحاب کلام میں افعال مکلّفین کی بحث زیادہ اہم ہے، اسی لئے نزاع کو اس سے مخصوص کیا گیا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ہم کو متکلمین کے نزاع سے کوئی غرض نہیں ہے۔ ہم حق کی تحقیق وجستجو کرنا چاہتے ہیں اور یہ بات ثابت ہوگئی کہ موجودات کے کسی بھی امر میں تفویض ممکن نہیں ہے۔

جبری مسلک کا بطلان

جہاں تک جبری مسلک کے بطلان کا تعلق ہے انکے مسلک کے ذکر کے بعد یہ بھی معلوم ہوجائے گا۔

جبر کے ماننے والے کہتے ہیں "مخلوقات کی پیدائش میں کسی بھی وسائط وجودی کو کسی قسم کا دخل حاصل نہیں ہے، صرف انسان کو مدخلیت کا توہم ہوتا ہے۔ مثلاً قوۂ ناریہ، حرارت میں بالکل موثر نہیں ہے، بس خدا کی سنت جاری ہے کہ جب بھی آگ کی صورت جاری ہوگی اس کے بعد ہی وہ حرارت ایجاد کردے گا بغیر اس کے کہ صورت ناریہ کو اس میں کوئی مدخلیت ہو (یا ایسے ہی ہے کہ) اگر خدا صورت ناریہ کے بعد سردی پیدا کردیتا تو جو صورت، حرارت کی اس وقت ہے، اس میں اور اس سنت میں کوئی فرق نہ ہوتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ وسائط کو ذریعہ قرار دیئے بغیر خود خدا کی مقدس ذات، تمام افعال مکلّفین وآثار موجودات کا مباشر ہے[۱۵] ان لوگوں نے اپنے خیال سے اس نظریے کو خدا کی تنزیہ وتقدیس کیلیے اختیار کیا ہے تاکہ خدا کے ہاتھوں کو بندھے ہوئے نہ سمجھیں ﴿غُلَّتْ اَیْدِیھِمْ وَلُعِنُوا﴾[۱۶] "خود ان کے ہاتھ باندھے جائیں اور ان پر لعنت ہو" اس تنزیہ وتقدیس کے ذریعے، دلیل وبرہان اور مذہب عرفان کے مطابق، مستلزم نقص وتشبیہ ہے اور وہ

مستلزم تعطیل ہے۔ جیسا کہ ہم نے گزشتہ فصل میں اس کی طرف اشارہ کیا کہ حق تعالیٰ کمال مطلق، وجود محض ہے، اس کی ذات وصفات میں تحدید یا نقص کا تصور بھی نہیں ہے اور جو چیز متعلق ایجاد وجعل الٰہی ہے وہ موجود مطلق وفیض مقدس اطلاقی ہے اور یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ اس ذات مقدس سے وجود محدود وناقص صادر ہو۔ ایجاد کے اندر کسی قسم کا نقص ہے ہی نہیں، بلکہ تمام تحدیدات ونقائص مستفیض ومعلول کی تحدید ونقص ہوا کرتے ہیں، جیسا کہ ماہرین علم کلام نے تصور کیا ہے اور یہ بات اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ پس جتنے وجود ومعلول کا ارتباط ذات مقدس حق تعالیٰ سے بدون واسطہ ممکن ہے وہ موجود مطلق وصریح الوجود ہے اور وہ یا تو فیض مقدس ہے بنا بر مسلک عرفا یا عقل مجرد ونور شریف اول ہے بنا بر مسلک حکما۔

دوسرے الفاظ میں، اس میں تو شک نہیں ہے کہ قبولیت وجود میں موجودات مختلف ہیں۔ بعض موجودات ابتدائی اور مستقل طور پر وجود کو قبول کرتے ہیں، جیسے جواہر اور بعض موجودات دوسری شئے کی موجودگی کے ضمن میں اور اس کی پیروی میں وجود کو قبول کرتے ہیں، جیسے اعراض اور ایسی چیزیں جو ضعیف الوجود ہیں، مثلاً زید کی باتوں کا وجود میں آنا ان امور میں سے ہے جو جسمیت کے بغیر وجود میں نہیں آسکتے۔ اسی طرح اعراض واوصاف، جواہر اور موصوفات کے بغیر نہیں پائے جاسکتے اور یہ مخلوقات کا اپنا ذاتی اور وجودی نقص ہے، خداوند عالم کی فاعلیت اور موجدیت کا نقص نہیں ہے۔ اس بیان سے یہ مسئلہ واضح ہوگیا کہ سلسلۂ موجودات میں جبر اور نفی وسائط وجودیہ کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ اس باب میں محکم ترین دلیل یہ ہے کہ ”جس طرح ماہیات ذاتی طور پر تاثیر اور تاثر کی قدرت نہیں رکھتیں اور بذات جعل ان سے متحقق نہیں ہوسکتا، اسی طرح حقیقت وجود بذات خود منشأ تاثیر ہے کہ اگر اس سے مطلقاً نفی تاثیر کردی جائے تو یہ انقلاب ذاتی کا باعث بن جائے گا۔ لہٰذا بغیر ذات کے نفی آثار مراتب وجود کی ایجاد مطلق طور پر ممکن نہیں ہے اور یہ کسی شئے کی اپنی ذات کی نفی کے باعث بھی ہے“۔

حاصل کلام یہ ہوا کہ مسلک جبر ومسلک تفویض دونوں، برہان تام اور ضوابط عقلیہ کی بنا پر باطل وناممکن ہیں۔ اہل معرفت اور حکمت عالیہ میں مسلک ”الأمْرُ بينَ الأمرَين“ ثابت ہے، اگر چہ اس کے معنی میں بھی علما کے درمیان اختلاف عظیم ہے۔ اس میں جو چیز تمام مذاہب میں مستحکم، بحث ومباحثے سے محفوظ اور مسلک توحید کے مطابق اور عرفائے کرام واصحاب قلوب کے موافق ہے وہ یہ ہے کہ یہ مسلک تمام معارف الٰہیہ میں ”المُسْهِلُ المُمْتَنِع“ کی طرح ہے جس کا حل، بحث وبرہان سے ممکن نہیں ہے اور مکمل

قلبی تقویٰ وتوفیق الٰہی کے بغیر دست امید اس کو حاصل کرنے سے عاجز ہے۔ اس لئے اس کو اس کی اہلیت رکھنے والوں، یعنی اولیائے حق پر چھوڑنا چاہئے اور ہمیں اصحاب بحث کے طریقے پر اس میدان میں قدم رکھنا ہوگا اور وہ یہ ہے کہ،

تفویض کا مطلب، تاثیر میں مخلوقات کی خودمختاری ہے اور جبر، نفی تاثیر کا نام ہے اور ہم ان دونوں (جبر وتفویض) کی نفی کر کے دونوں مرتبوں کے درمیانی مرتبے کو اختیار کریں جو تاثیر کا اثبات اور خودمختاری کی نفی سے عبارت ہے اور یہ کہیں کہ ایجاد وپیدائش کا مرحلہ وجود واوصاف کی مانند ہے، جیسے کہ موجودات موجود ہیں مگر وہ وجود میں مستقل نہیں ہیں اور اوصاف ان کیلئے ثابت ہیں لیکن ان میں وہ مستقل نہیں ہیں۔ آثار وافعال ان کیلئے ثابت ہیں جو ان سے صادر ہوتے ہیں لیکن وہ وجود میں غیر مستقل ہیں اور فاعلیت وپیدائش میں غیر مستقل فواعل وموجدات ہیں۔

یہ بھی جان لیجئے کہ گزشتہ فصل کے مطالب میں غور وفکر کرنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ نیکیوں اور برائیوں دونوں کی نسبت حق اور خلق، دونوں کی طرف بھی دی جاسکتی ور دونوں صحیح ہیں۔ اسی لئے اس حدیث میں فرمایا ہے، "نیکیوں اور برائیوں کو میں نے اپنے بندوں کے ہاتھوں اجرا فرمایا" اس کے باوجود نیکیاں ذاتی طور پر حق تعالیٰ سے منسوب ہیں اور بندوں ور موجودات کی طرف بالعرض جبکہ شرور اس کے برعکس دیگر موجودات کی طرف بالذات اور خدا کی طرف بالعرض منسوب ہیں۔ اسی مطلب کی طرف حدیث قدسی میں ارشاد ہے "اے اولاد آدم! میں تیرے حسنات کیلئے تجھ سے اولیٰ ہوں اور تو اپنے گناہوں کیلئے مجھ سے اولیٰ ہے"[۸] ہم پہلے بھی اس کی طرف اشارہ کرچکے ہیں، اس لئے اس وقت اس کو بیان کرنے سے صرف نظر کرتے ہیں۔

والحمد للہ أولاً وآخراً

توضیحات (۳۹)

۱۔ اصول کافی، ج۱، ص۵۴۳، کتاب التوحید، باب الخیر والشر، حدیث۱

۲۔ "جس شخص کی پیروی کی جائے"۔

۳۔ پہلے قول کے سلسلے میں بحارالانوار، ج۴، ص۱۸۷، باب۳، ابواب اسمائہ تعالی وحقائقہا وصفاتہ ومعانیہ کی طرف رجوع کیجئے اور دوسرے قول کے سلسلے میں مجمع البیان، ذیل آیۂ بسم اللہ الرحمن الرحیم از سورۂ حمد کی طرف رجوع کیجئے۔

۴۔ سورۂ روم، آیت ۳۶۔

۵۔ مرآۃ العقول، ج۲، ص۱۷۱ اور ۱۷۲، کتاب التوحید، باب الخیر والشر، حدیث ۱۔

۶۔ حاکم حسکانی نے امام ہفتم سے انہوں نے اپنے جد سے اور انہوں نے پیغمبر اکرمؐ سے روایت کی ہے کہ رسول اکرمؐ سے طوبی کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا

"ایک درخت ہے جس کی جڑ میرے گھر میں ہے اور اس کی شاخ اہل فردوس پر سایہ فگن ہے"۔ دوبارہ پوچھے جانے پر فرمایا "وہ درخت علیؑ کے گھر میں ہے"

مجمع البیان، تفسیر سورۂ رعد، آیت ۲۹۔

۷۔ "خداوند عالم نے اس کو عذاب سے دوچار کر دیا"۔

۸۔ مجمع البحرین، ولسان العرب، لفظ "ویل" کے ذیل میں۔

۹۔ قاموس المحیط، ذیل لفظ "ویل" اور پیغمبر اکرمؐ سے ایک روایت آئی ہے کہ "ویل جہنم میں ایک وادی ہے، کافر چالیس موسم خزاں گزرنے کے بعد اس کی گہرائی تک پہنچتا ہے"۔

تفسیر نور الثقلین، ج۱، ص۹۳، تفسیر کبیر، ج۳، ص۱۴۰۔

۱۰۔ اسفار اربعہ، ج۲، ص۲۹۲

اور اس کے بعد، اسفار اربعہ، ج۱، بحث اصالۃ الوجود۔

۱۱۔ اسفار اربعہ، ج۲، ص۲۹۲، فصول ۲۵ و ۲۹۔

۱۲۔ اسفار اربعہ، ج۷، ص۵۸۔۶۲، سفر ۳، موقف ۸، فصل ۲۔

۱۳۔ سورۂ نساء، آیت ۷۹۔

اور زیر نظر کتاب کی حدیث ۲، حاشیہ ۲۳ کی طرف رجوع کیجئے۔

۱۴۔ سورۂ اسراء، آیت ۷۸/

اور زیر نظر کتاب کی حدیث ۳، حاشیہ ۶۔

۱۵۔ کشف المراد، ص ۲۳۹، ۲۲۰

نیز علم کلام، ج ۲، ص ۶۴، ۷۸، ۷۹

۱۶۔ سورۂ مائدہ، آیت ۶۴/

اور زیر نظر کتاب کی حدیث ۲۱، حاشیہ ۳۷

۱۷۔ اسفار اربعہ، ج ۲، ص ۲۷ اور اس کے بعد سفر ۲، مرحلہ ۶، بحث علت و معلول، بالخصوص فصل ۲، ۳، ۱۴، ۲۵، ۲۶، ۲۸، ۲۹

اور جلد ۶، ص ۳۴۰ کے بعد سفر ۳، موقف ۴، فصل ۳۔

۱۸۔ عن الرضا علیہ السلام ﴿قال الله یابن آدم، انا اولی بحسناتک منک وانت اولی بسیئاتک منّی﴾۔

بحارالسعد، ص ۴۲۹۔

چالیسویں حدیث

بالسند المتصل الى الشيخ الاقدم والركن الاعظم محمد بن يعقوب الكليني رضي الله عنه عن محمد بن يحيى، عن احمد بن محمد، عن الحسين بن سعيد، عن النضر بن سويد عن عاصم بن حميد قال:

قال: سئل علي بن الحسين عليهما السلام عن التوحيد، فقال:

﴿ان الله عزوجل علم انه سيكون في آخر الزمان اقوام متعمقون فانزل الله تعالى ﴿قل هو الله احد﴾ والآيات من سورة الحديد الى قوله ﴿وهو عليم بذات الصدور﴾ فمن رام وراء ذلك فقد هلك﴾

ترجمہ: عاصم کہتے ہیں کہ امام زین العابدینؑ سے توحید کے بارے میں پوچھا گیا تو حضرتؑ نے فرمایا: "خدا کو معلوم تھا آخری زمانے میں گہری نظر رکھنے والی اقوام پیدا ہوں گی لہذا اس نے ﴿قل هو الله احد﴾ اور سورہ حدید کی آیات اول سے ﴿وهو عليم بذات الصدور﴾ تک نازل فرمائیں۔ اب اگر کوئی اس کے غیر کو طلب کرے تو یقیناً وہ ہلاک ہوگا"۔

شرح: حضرت صدر المتالہینؒ فرماتے ہیں "عاصم بن حمید کا زمانہ حضرت سجادؑ سے متصل نہیں تھا لہذا حدیث مرفوع ہے"۔[۱] لفظ قال کی تکرار شاید حدیث کا سلسلہ ٹوٹنے کی وجہ سے ہو اور ہو سکتا ہے نسخہ بردار کی غلطی کی بنا پر ہو یا یہ وجہ ہو کہ فاعل کا ذکر کیا گیا تھا لیکن قلم کے لکھنے سے رہ گیا ہو یا فاعل محذوف ہو بنابر جواز حذف یا یہ کہ فاعل اول ضمیر ہو جو نضر بن سوید کی طرف پلٹتی ہے مگر یہ احتمال بہت ہی بعید ہے۔

"التوحید" بروزن تفعیل ہے اور یہ تو فعل میں تکثیر کیلئے ہے، وحدت کے کمال اور بساطت کی انتہا میں قرار دینے کے معنوں میں یا پھر اصل فعل کی طرف انتساب مفعول کے مفہوم میں ہے، جیسے تکفیر وتفسیق (لیکن) بعض اہل فضل کی رائے ہے کہ باب تفعیل بمعنائے انتساب مفعول آیا ہی نہیں اور تفسیق وتکفیر بھی اس معنی سے غلط ہیں، بلکہ یہ سب فسق وکفر کی طرف دعوت کے مفہوم میں ہیں اور یہاں پر تکفیر کے بجائے اکفار استعمال ہونا چاہئے اور خود قاموس میں بھی لفظ کفر سے تکفیر، کفر کی طرف انتساب کے معنی میں نہیں آیا ہے۔ راقم عرض کرتا ہے. میں نے بھی قاموس میں تکفیر بمعنائے انتساب بہ کفر نہیں دیکھا ہے، بلکہ علامۂ لغویین، جوہری ؒ نے بھی یہ معنی نہیں لکھے ہیں۔ البتہ "اکفار" کو اس معنی میں لکھا ہے جیسا کہ اس فاضل نے کہا ہے۔ مگر ادب کی کتابوں میں باب تفعیل کے ایک معنی اصل فعل کی طرف مفعول کا انتساب شمار کیا گیا ہے، وراس کی مثال تفسیق سے دی گئی ہے۔ خلاصہ یہ کہ توحید کا مطلب وحدانیت کی طرف نسبت ہے۔

"مُتَعَمِّقُون" "عمق وعموق" کنویں کی تہ اور گڑھے کی تہ کو کہتے ہیں۔ اسی اعتبار سے ماہرین ریاضیات عمق یا گہرائی کو جسم کے تیسرے پہلو سے تعبیر کرتے ہیں جو بالائی سطح سے شروع ہو کر نچلی سطح پر ختم ہوتا ہے۔ چنانچہ طول کو پہلا پہلو اور عرض کو دوسرا پہلو کہتے ہیں اور اسی اعتبار سے زیادہ گہری نظر رکھنے والے شخص کو "متعمق" اور گہری نظر کو نظر عمیق کہا جاتا ہے۔ غیر گہری نظر کو سطحی نظر کہا جاتا ہے۔ گویا علمی نکات کیلئے بھی عمق یا گہرائی ورتہ ہوتی ہے اور گہری نظر رکھنے والا متعمق شخص نکتے کی تہ تک چلا جاتا اور حقائق کو نکال لاتا ہے اور سطحی نظر رکھنے والا اوپری حصے تک رہتا اور گہرائی تک نہیں جا پاتا ہے۔

"فمن رام" "رَامَ یرُومُ" کے معنی طلب کرنے کے ہیں اور "مرام" کے معنی مطلب کے ہیں۔

"وراء ذلک" "وراء" یعنی پیچھے اور کبھی آگے کے معنی میں بھی آیا ہے۔ پس یہ اضداد میں سے ہے وراس کا استعمال ان مقامات پر مناسبت کے ساتھ معنی اول میں ہوتا ہے۔

پہلی فصل:

سورۂ توحید کی تفسیر کی طرف اشارہ

یاد رکھیے سورۂ مبارکہ توحید، نیز سورۂ مبارکہ حدید کی ابتدائی آیتوں کی تفسیر ہم جیسے افراد کے بس سے باہر ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی تفسیر میں ہاتھ ڈالنا اپنی ذمہ داریوں سے ہٹ کر قدم اٹھانے کے مترادف

ہے، بھلا مجھ جیسے آدمی کیلئے الفاظ کہاں جائز ہے کہ میں ایسی چیز کی تفسیر کرنے لگوں جس کو خدا نے گہری نظر رکھنے والے افراد اور علمائے محقق کیلئے نازل فرمایا ہے۔ تفسیر برہان میں ہے کہ حضرت امام محمد باقرؑ نے لفظ مبارکہ ''الصمد'' کے کچھ اسرار بیان کرنے کے بعد فرمایا ''خداوند عالم نے مجھے جو علم عطا فرمایا ہے اگر میں اس کے حامل افراد کو پاتا تو ''الصمد'' کے اندر جو توحید، اسلام، ایمان، دین و شریعت ہے اس کو نشر کر دیتا''۔

عظیم فلسفی ملا صدراؒ سورۂ حدید کی آیتوں کے بارے میں فرماتے ہیں ''یہ چھ آیتیں جن کی طرف حدیث میں اشارہ ہے ان میں سے ہر یک علم توحید والہیت کے عظیم باب پر مشتمل ہے اور صمدیت و ربوبیت کے محکم احکام پر مشتمل ہے کہ اگر زمانہ مہلت دے اور وہ ہر یک ایسے عارف ربانی یا ایسے حکیم الٰہی کی مدد کرے جس کا علم مشکات نبوت محمدیہ ﴿علیہ وعلی آلہ افضل السلام والتحیۃ﴾ سے ماخوذ ہو اور اس کی حکمت مقتبس ہو حدیث اصحاب عصمت وطہارت ﴿علیہم السلام﴾ سے تو یقیناً اس شخص اور ان آیات کا حق تھا کہ ہر آیت کیلئے یک بڑی جلد، بلکہ متعدد جلدیں تحریر کی جائیں''۔ انتہیٰ

خلاصہ یہ ہے کہ مجھ جیسے افراد اس میدان کے شہسوار نہیں ہیں لیکن چونکہ عقل کا فیصلہ ہے کہ مشکل کی وجہ سے آسان کو نہیں چھوڑ دینا چاہئے اس لئے مشائخ عظام اور کتب ارباب معرفت اور اہل بیتؑ کے مشکات نور ہدایت سے جو کچھ بھی میں نے حاصل کیا ہے، اجمالاً و اشارۃً اس کا ذکر کرنا چاہتا ہوں ﴿ومن اللہ الھدایۃ﴾

بسم اللہ کی طرف اشارہ

یہ معلوم ہونا چاہئے کہ مسلک اہل معرفت کے مطابق ہر سورے کی ﴿بسم اللہ﴾ خود اسی سورے سے متعلق ہے (لفظ مستتر) ''استعین'' وغیرہ سے متعلق نہیں ہے، کیونکہ اسم ''اللہ'' مقام ظہوری کے مطابق تمام مشیت ہے اور تجلی احدی کے اعتبار سے مقام فیض قدس ہے اور مقام واحدیت کے لحاظ سے مقام جمع احدی اسماء ہے اور باعتبار جمع حدیت، جمیع عالم ہے جو کہ سلسلۂ طولیہ صعودیہ ونزولیہ کون جامع اور مراتب وجود ہے ور سلسلۂ عرضیہ میں ہر ایک، ہویت عینیہ ہے اور اسم کے ہر اعتبار کے لحاظ سے ''اللہ'' کے معنی میں فرق ہو جاتا ہے، اس لئے کہ وہ ان اسماء کا مسمّیٰ ہے ور قرآن مجید کے ہر سورے کے اعتبار سے جو لفظ میں ''بسم اللہ'' سے متعلق اور مفہوم میں اس کا مظہر ہے، ''بسم اللہ'' کے معنی مختلف ہو جاتے ہیں، بلکہ ہر اس

فعل کے اعتبار سے جس سے "بسم اللہ" کی ابتداء کی گئی ہے اس کے معنی مختلف ہو جاتے ہیں اور وہ اسی فعل سے متعلق ہوتا ہے۔ مظاہر وظہورات اسمائے الٰہیہ کا عارف جانتا ہے کہ تمام افعال واعمال اور اعیان واعراض، اسم شریف اعظم ومقام مشیت مطلقہ کے سبب ظاہر ومتحقق ہیں۔ پس اس عمل کے بجالاتے وقت اور یہ ذکر کرتے وقت دل میں اس معنی کا متذکر ہوتا ہے اور ان کو مرتبہ طبیعت اور اپنے ملک تک جاری کرتا ہے اور کہتا ہے: "بسم اللہ" یعنی مقام مشیت مطلقہ صاحب مقام رحمانیت جو بسط وجود ہے اور مقام رحیمیت جو بسط مقام کمال وجود ہے یا صاحب مقام رحمانیت جو مقام تجلی بہ ظہور وبسط وجود ہے اور مقام رحیمیت جو مقام تجلی بہ باطنیت وقبض وجود ہے ﴿آکُلُ وَاَشْرَبُ وَاَکْتُبُ وَاَفْعَلُ کَذا وَکَذا﴾ "میں کھاتا ہوں، پیتا ہوں اور لکھتا ہوں اور فلاں فلاں کام کرتا ہوں"۔

پس سالک الی اللہ اور عارف باللہ ایک ہی نظر میں تمام افعال وموجودات کو ظہور مشیت مطلقہ اور اسی میں فانی دیکھتا ہے اور اس نظر میں سلطان وحدت کا غلبہ ہوتا ہے اور "بسم اللہ" کے معنی کو تمام قرآنی سورتوں اور تمام افعال واعمال میں ایک سمجھتا ہے اور جس نظر میں عالم فرق وفرق الفرق کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس وقت ہر "بسم اللہ" کیلئے ہر سورۃ اور ہر کام کی ابتدا میں ایک معنی کو دیکھتا اور کسی اور کا مشاہدہ کرتا ہے۔

یہ مقام جو سورۂ شریفہ توحید کی تفسیر کا مقام ہے یہاں پر "بسم اللہ" کو لفظ ﴿قُــــلْ﴾ سے بھی متعلق کر سکتے ہیں، ایسی صورت میں "بسم اللہ" سے مراد کسوۂ تجرید وغلبہ توحید کی صورت میں مقام مشیت مطلقہ ہے اور کسوہ تکثیر ومقام توجہ بہ کثرت میں اس کے تعینات ہیں اور مقام جمع میں مقامین جو مقام برزخیت کبریٰ ہے، مشیت بمقام وحدت وکثرت وظہور وبطون اور رحمانیت ورحیمیت دوسرے معنے ہے اور سورۂ شریفہ ﴿قُلْ هُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ﴾ میں چونکہ احدی غیبیہ اور الوہیت اسمائیہ کے درمیان جمع ہے اس لئے "اسم اللہ" تیسرے مقام کے مطابق یعنی مقام برزخیت مراد ہے۔

اس کے بعد مقام غیب احدی سے قلب تقی نقی احدی احمدی محمدی ﷺ سے خطاب ہوا ﴿قُــلْ﴾ اس نشأہ برزخیہ کے اعتبار سے "اسم اللہ" کے ظہور کیلئے کہہ دیجئے! جو مقام مشیت مطلقہ وصاحب تعین اور عین رحیمیت میں رحمانیت کا ظہور اور عین قبض میں بسط ہے۔

﴿هُــوَ﴾ یہ مقدس لفظ مقام ہویت مطلقہ کی طرف اشارہ ہے "من حیث ہی ہی" (جس طرح ہے اسی اعتبار سے) بغیر اس کے کہ متعین بہ تعین صفاتی یا متجلی بہ تجلیات اسمائی ہو حتی اسمائے ذاتیہ جو مقام احدیت میں

معتبر ہوتا ہے اور یہ اشارہ اس دل کے مالک اور اس مقام پر فائز ہستی کے علاوہ کسی اور کی طرف ناممکن ہے اور اگر حق کی ان نسبتوں کے اظہار پر مامور نہ ہوتا تو ازل و ابد اس مقدس لفظ کو زبان پر بھی جاری نہ کرتا مگر قضائے الٰہی میں یہ بات حتمی تھی کہ حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی اس اشارے کا اظہار کریں اور چونکہ جذبہ مطلقہ میں کچھ باقی نہ تھا اور (نبیؐ) مقام برزخیت کے مالک تھے اس لئے فرمایا ﴿اللّٰہ احد﴾۔

﴿اللّٰہ﴾ اسم جامع، اعظم اور رب مطلق خاتم ہے اور برزخی ہونے کے ساتھ ساتھ ظہور و احدیت کے اعتبار سے کثرت اسمائی اور عین تجلی غیبی خفائی بہ مقام احدیت ہے۔ یہ سالک کے قلب پر نہ تو احدیت کا پہلو واحدیت پر غلبہ رکھتا ہے اور نہ واحدیت، احدیت پر۔

لفظ ''اللہ'' کو ''احد'' پر مقدم کیا گیا ہے حالانکہ اسمائے ذاتیہ اعتبار میں مقدم ہوا کرتے ہیں مگر یہاں پر شاید سالک کے دل پر تجلی کے مقام کی طرف اشارہ مقصود ہے، کیونکہ قلوب اولیاء کیلئے ذاتی تجلیات میں پہلے اسمائے صفاتیہ کی تجلی ہوتی ہے جو حضرت واحدیت میں ہے اس کے بعد اسمائے ذاتیہ احدیہ کی تجلی ہوتی ہے۔

لفظ ''اللہ'' کا ذکر اور اسماء میں اس کا اختصاص، دو میں سے ایک نکتے کی وجہ سے ہوسکتا ہے یا تو یہ اس بات کا عندیہ ہے کہ کسی بھی اسم کی تجلی ''اللہ'' کے نام کی تجلی ہے، تحت ظاہر مظہر کے باب کے مطابق خاص طور پر حضرت الٰہیت میں، یا تو یہ غایت سلوک واحدی کا عندیہ ہے کہ جب تک وہ حاصل نہ ہوگا سالک سلوک احدی کا آغاز نہیں کرتا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس بیان کے مطابق ''ہو'' ایک ایسے مقام کی طرف اشارہ ہے جہاں پر اشارہ اور عارفوں کی امیدیں منقطع ہو جاتی ہیں اور مقام اسم و رسم سے مبرا اور تجلی و ظہور سے منزہ ہے اور ''احد'' اسمائے باطنیہ غیبیہ کی تجلی کی طرف اشارہ ہے اور ''اللہ'' تجلی باسمائے ظاہریہ کی طرف اشارہ ہے اور ان تینوں کے اعتبارات اولیہ سے حضرت ربوبیت کا تحقق ہوتا ہے اور چار دوسرے اسماء کہ صمدیت ان کی جامع ہے بحسب بعض روایات[۱] از اسمائے سلبیہ تنزیہیہ ہیں جن کا اعتبار اسمائے ثبوتیہ جمالیہ کے ضمن میں ہوتا ہے چنانچہ کسی حدیث کے ذیل میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ اس بنا پر ہے کہ ''بسم اللہ'' کو لفظ ''قل'' سے متعلق مانا جائے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سورہ کے ہر جزء سے ''بسم اللہ'' متعلق ہو اور ان میں سے ہر ایک کے مطابق سورہ اور

اس کے "بسم اللہ" کی تفسیر مختلف ہوگی مگر چونکہ اس کا ذکر باعث طوالت ہے اس لئے اس سے صرف نظر کرتے ہیں۔

ہمارے شیخ عارف کامل شاہ آبادی (روحی فداہ) فرماتے تھے "ہو، چھ ناموں کا برہان اور دوسرا کمال ہے جو سورۂ مبارکہ توحید میں اس مبارک لفظ کے بعد ذکر ہوا ہے، کیونکہ ذات مقدس "ہو" کی طرح مطلق اور خالص وجود کی طرف اشارہ اور تمام کمالات اسمائیہ کا مجموعہ ہے تو پھر "اللہ" ہے اور چونکہ حقیقت بسیط میں خالص وجود، تمام اسماء وصفات رکھتا ہے اور یہ کثرت اسمائی وحدت ذات مقدس کو ختم نہیں کرسکتی (اس لئے) "احد" ہے اور چونکہ صرف کیلئے ماہیت نہیں ہے (اس لئے) "صمد" ہے اور چونکہ صرف میں نقص نہیں ہوسکتا اور غیر سے (بھی) حاصل نہیں ہوتا اور تکرار اس پر محال ہے (لہذا) "والد ومولود" نہیں ہے اور کوئی "کفو (ہم سر)" نہیں رکھتا" انتہیٰ

یہ بھی جان لینا چاہئے کہ احادیث شریفہ میں "صمد" کے بہت سے معانی اور اسرار کثیرہ ذکر کئے گئے ہیں جس کا بیان کرنا اس کتاب کی گنجائش سے باہر ہے اور اس کیلئے ایک جداگانہ کتابچے کی ضرورت ہے، یہاں پر صرف ایک نکتے کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ اگر "صمد" بحسب بعض اعتبارات نفس ماہیت کی طرف اشارہ ہے اور "اللّٰہُ الصَّمَدُ" کے اندر اللہ کے معانی مقام واحدیت ومقام احدیت جمع اسماء کے اعتبار سے ہے، اور اگر صفت اضافی کی طرف عندیہ ہو جیسے کہ بعض روایات سے استفادہ ہوتا ہے تو حضرت تجلی میں فیض مقدس کی طرف جمع اسماء کی احدیت کی نشاندہی کرتا ہے اور اس کے معنی ﴿اللّٰہُ نُورُ السَّماواتِ وَالأرْضِ﴾ کے موافق ہیں۔

دوسری فصل

سورۂ حدید کی پہلی آیات کی اجمالی تفسیر

پہلی آیت شریفہ ﴿سَبَّحَ لِلّٰہِ ما فِي السَّماواتِ والأرْضِ وَهُوَ العَزِيزُ الحَكِيمُ﴾ کی دلالت اس بات پر ہوتی ہے کہ تمام مخلوقات یہاں تک کہ نباتات وجمادات بھی تسبیح الٰہی کرتے ہیں۔ اب اس تسبیح کو ذوی العقول کیلئے مخصوص کرنا ارباب عقول کی عقلوں پر پردہ ڈالنا ہے اور اگر بالفرض یہ آیت شریفہ قابل تاویل بھی ہے تو دوسری آیات شریفہ اس تاویل کے قابل نہیں ہیں، مثلاً ﴿أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهُ مَنْ فِي

السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَکَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ﴾ اور تسبیح کی تاویل تکوینی یا فطری سے کرنا بعید قسم کی تاویلات میں سے ہے جس سے اخبار وآیات شریفہ انکار کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ محکم فلسفی دلائل اور عرفان کے شیریں مشرب کے بھی خلاف ہے۔

مگر فیلسوف اور عظیم دانشور، ملا صدرا" سے تعجب ہے کہ موصوف مخلوقات کی اس تسبیح کو تسبیح نطقی نہیں مانتے! اور بعض جمادات، مثلاً سنگریزے کے نطق کو وں کے نفس مقدس کی انشاء کی مانند لفاظ اور اصوات کو ن کے حالات کے مطابق جانتے ہیں اور بعض اہل معرفت کے اس قول کو کہ "تمام مخلوقات حیات نطقی کے مالک ہیں" مخالف برہان اور تعطیل ودوام قسر سے ملازم سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ملا صدرا" نے جو کچھ فرمایا ہے وہ سب خود ان کے اصول کے خلاف ہے اور حتماً یہ قول (حیات نطقی) صریح حق اور عرفان کا سب لباب اور کسی بھی مفسدے کا باعث نہیں ہے۔ اگر طول کا خوف نہ ہوتا تو مقدمات کے ساتھ ہم اس کی تشریح کرتے لیکن یہاں ایک اجمالی جائزے پر اکتفا کرتے ہیں۔

پہلے بھی ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ حقیقت وجود (عبارت ہے) عین شعور وعلم وارادہ وقدرت وحیات ودیگر شئون حیاتیہ سے۔ بایں معنی کہ اگر اشیا میں سے کوئی شئے اگر مکمل طور پر علم وحیات کی مالک نہ ہو تو وہ وجود سے بھی محروم ہوگی اور جو شخص بھی حقیقت اصالت وجود اور عرفانی ذوق کے ساتھ اس کے معنوی اشتراک کا ادراک کرسکتا ہے وہ ذوقاً یا علماً سب مخلوقات کے اندر تمام شئون حیاتیہ کے ساتھ جاری زندگی کا بھی دراک کرسکتا ہے، جیسے علم وارادہ وتکلم وغیرہ اور اگر کوئی معنوی ریاضتوں کی وجہ سے مشاہدہ وعیان کے مقام پر فائز ہو جائے تو وہ مخلوقات کی تسبیح وتقدیس کے زمزمے کو عیاناً مشاہدہ کرسکتا ہے (لیکن) ابھی یہ سکر طبیعت جس نے ہماری آنکھوں، کانوں اور دیگر حواس پر یک قسم کا نشہ طاری کر رکھا ہے وہ ہم کو حقائق وجودیہ اور ہویات عینیہ پر اطلاع حاصل کرنے نہیں دیتا۔ چنانچہ ہمارے اور حق کے درمیان ظلمانی حجاب اور نورانی فاصلے ہیں (اسی طرح) ہمارے اور دیگر مخلوقات یہاں تک کہ اپنے نفس کے درمیان بھی حجب وفاصلے ہے جس نے ہم کو زندگی وعلم اور ان کے دیگر شئون سے محجوب کر رکھا ہے۔ لیکن ان تمام حجابوں میں سب سے سخت تر افکار محجوبہ کے ذریعہ انکار ہے جو انسان کو تمام چیزوں سے روک دیتا ہے اور ہم جیسے محجوبین کیلئے بہترین وسائل آیات اور اولیائے خدا کی روایات واحادیث کو تسلیم کرنا اور ان کی تصدیق کرنا اور تفسیر

بارانے کے دروازے کو بند کرنا اور عقل ضعیف سے تحقیق کو ترک کرنا ہے۔

جیسے بالفرض اگر آیات تسبیح کی تاویل ناپسندیدہ تسبیح تکوینی یا شعوری فطری سے ممکن بھی مان لی جائے تو آیہ ﴿قَالَتْ نَمْلَةٌ يَا أَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوا مَسَاكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمَانُ وَجُنُودُهُ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ﴾ [۱] اور شہر سبا سے ہدہد کا جناب سلیمانؑ کیلئے خبر لانے اور مختلف ابواب میں اہل بیت عصمت وطہارتؑ کی روایت کے بارے میں کیا تاویل کیجئے گا؟ وہاں تو (نطق صریح کے علاوہ) ایسی کسی تاویل کی گنجائش ہی نہیں ہے!

مختصر یہ ہے کہ اشیا میں زندگی وحیات کی اجزا اور ان کی تسبیح شعوری علمی کو فلسفہ عالیہ اور ارباب شرائع وعرفان کے مسلمات میں شمار کرنا چاہئے۔ البتہ ہر موجود کی تسبیح اور ذکر خاص جو ہر ایک سے مخصوص ہے (لیکن ہم کو نہیں معلوم) اور ذکر جامع کا مالک انسان ہے۔ دیگر مخلوقات اپنے نشہ کے مطابق اپنا ذکر رکھتے ہیں اجمالی طور سے اس کا ایک علمی وعرفانی میزان ہے جو علم الاسما سے متعلق ہے۔ البتہ اس کی تفصیل علوم کشفی وعیانی سے ہے جو کامل ترین اولیا کے ساتھ مخصوص ہے اور جس طرح ہم نے پہلے ذکر کیا کہ ہر سورے کی ''بسم اللہ'' خود اسی سورے سے متعلق ہے یہاں بھی ''سبح للہ'' سے تعلق ہے اور اسے مسئلۂ جبر وتفویض میں مسلک اہل حق نے مستفاد کیا ہے۔

دوسری آیہ شریفہ ﴿لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ [۲] یہ اشارہ ہے کہ حق جل جلالہ ملکوت سماوات وارض کا مالک ہے اور اسی مالکیت وائرۂ مملکت، اثر ورسوخ اور قدرت وتسلط کے نتیجے میں زندگی وموت، ظہور ورجوع اور بسط وقبض واقع ہوتے ہیں اور تصرف وتدبیر حق میں جو انتہا ہے توحید فعلی ہے تمام تصرفات وتدبیرات کی نابودی یا ضعف وناتوانی عمل میں آتی ہے اور اس نے زندگی اور موت کو جو ملکوتی تصرف وقبضے کا بہت بڑا مظہر یا مکمل قبض وبسط ہے، خود ذات مقدس کی مالکیت کی طرف نسبت دی ہے، حالانکہ حیات رحمانیت کے شئون میں سے ہے اور موت عطا کرنا مالکیت کے شئون سے ہے، مگر دونوں کو مالکیت کی طرف منسوب فرمایا ہے اور یہ بات، ممکن ہے ایک بڑے عرفانی نکتے کی بنا پر ہوا اور وہ یہ ہے کہ احدی اور غیبی پہلوؤں کے لحاظ سے ہر اسم، تمام اسما کا جامع ہوتا ہے مگر دست اس کو بیان نہیں کیا جاسکتا اور صدر وذیل آیت ممکن ہے وحدت در کثرت اور کثرت در وحدت کی طرف اشارہ ہو، تجلی فعلی یہ فیض اقدس کے مقام پر، اس لئے کہ یہاں ہر دو نسبتیں، یعنی ''اسم اللہ'' کی طرف نسبت جو

مقام مشیت فعلیہ ہے اور آسمانوں و زمین میں پائی جانے والی اشیا کی طرف نسبت، ایک خوبصورت انداز میں دی گئی ہیں جو ارباب شہود و معرفت کے کشف کا مقصد آخر ہے اور مشیت خدا کی طرف نسبت کو مقدم کرنے کا مقصد حق تعالیٰ کی قیومیت کو سمجھنے اور "یلی اللہ" کے پہلو کی "یلی الخلق" کے پہلو پر برتر قرار دینے کیلئے ہے

اور اگر طوالت کا ڈر نہ ہوتا تو ہم (مندرجہ ذیل) حقائق کو بیان کرتے، یعنی تسبیح کی حقیقت اور تحمید کے ساتھ اس کے لازمے کی حقیقت اور یہ کہ ہر تسبیح اور حمد کرنے والے کی تسبیح و تحمید حق کیلئے ہوتی ہے، نیز "اسم اللہ" کیلئے اور "اسم اللہ" کی طرف تسبیح و تحمید کا بیان (اسی طرح) "العزیز الحکیم" کے دو اسمائے مبارکہ کی تخصیص کی تشریح، نیز ان دونوں کی "اللہ" سے نسبت اور تسمیہ میں مذکور (لفظ جلالہ) "للہ" و آیہ شریفہ ﴿سبح للہ﴾ میں آنے "اللہ" میں فرق، نیز "سماوات" و "ارض" اور مسلک اہل معرفت و فلسفی مشرب کے لوگوں کے درمیان اختلاف کے اعتبار سے جو چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں ان کا بیان اور عرفان سے تیرے مشرب کے مطابق اس آیہ شریفہ میں موجود لفظ "ہو" کا آیہ شریفہ ﴿قل ھو اللہ احد﴾ میں مذکور لفظ "ہو" سے فرق کا بیان۔

لیکن اس وقت ہم اس بات کی رعایت کرنے کے پابند ہیں کہ صرف اجمالی جائزے اور اشارے پر اکتفا کریں جیسا کہ اہل حضرات کیلئے واضح ہے۔

ضمیر "ہ" بظاہر "للہ" کی طرف پلٹ رہی ہے اور ممکن ہے "عزیز و حکیم" کی طرف پلٹ رہی ہو اور اس صورت میں آیہ شریفہ کے معنی میں فرق ہوگا جو تھوڑے سے تامل کے ساتھ اس کے اہل پر واضح ہو جائے گا

اور بیان کیفیت ملکیت حق اور "یحیی و یمیت" مضارع کے صیغے میں استمرار پر دلالت کرتا ہے اور "ہو" کی ضمیر کا مرجع اور مراجع کے اختلاف کی صورت میں معانی کا فرق اور یہ بیان کرنا کہ "محیی و ممیت و قادر" اسمائے ذات میں سے ہیں یا اوصاف و افعال میں سے یہ سب اپنی اپنی جگہوں پر (زیر بحث آسکتے ہیں) جیسے زندہ اور مردہ کرنے کی کیفیت اور حقیقت صور اسرافیل اور زندگی اور موت سے متعلق دو قسم کی نفخ اور حضرت اسرافیل و عزرائیل کے امور اور ان کی شان و منزلت اور ان کے زندگی اور موت دینے کی کیفیت جن میں سے ہر ایک کیلئے طویل عرفانی بیانات اور فلسفی دلائل موجود ہیں۔

تیسری آیہ شریفہ ﴿هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾[۱۳] تو ارباب معرفت ویقین کے معارف حقہ کے جاننے والے اور اصحاب قلوب وسالکین کے راستے پر چلنے والے کو معلوم ہے کہ سالکوں کے سلوک کی انتہا اور عارفوں کی انتہائے امید اسی ایک آیت محکمہ کا سمجھنا ہے اور اپنے دوست کی جان کی قسم توحید ذاتی واسمائی کی حقیقت کیلئے اس سے بہتر تعبیر نہیں ہے اور مناسب تو یہ ہے کہ تمام اصحاب معارف اس عرفان تام محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور کشف جامع احمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آیہ محکمہ الٰہی کیلئے سجدہ کریں اور خاک پر گر پڑیں۔ حقیقت عرفان وعشق کی قسم عارف مجذوب اور جمال محبوب عاشق کو اس آیہ شریفہ کے سننے کے بعد ایک ایسی ملکوتی مسرت اور ایسا الٰہی سرور حاصل ہوتا ہے کہ لباس بیان اس قامت پر کوتاہ نظر آتا ہے اور کوئی مخلوق اس کو برداشت نہیں کرسکتی ﴿فَسُبْحَانَ اللّٰهِ أَعْظَمَ شَأْنَهُ وَأَجَلَّ سُلْطَانَهُ وَأَكْرَمَ قُدْرَتَهُ وَأَمْنَعَ عِزَّتَهُ وَأَعَزَّ جَنَابَهُ﴾[۱۴]

جو لوگ عظیم ترین عرفاء، علمائے باللہ اور اولیائے رحمان پر اعتراض کرتے رہتے ہیں، ذرا دیکھیں کہ کس عارف ربانی یا سالک مجذوب نے اس آیہ مبارکہ تامہ اور نامہ اقدس الٰہی سے بڑھ کر کوئی بات کہی ہے یا کوئی نئی چیز بازار معارف میں لے کر آیا ہے؟ آپ دیکھیں کہ آیہ کریمہ ہے اور عرفان عرفاء سے بھری کتابیں ہیں۔ اگرچہ سورہ مبارکہ "حدید" بالخصوص اس کی ابتدائی آیات شریفہ ایسے معارف پر مشتمل ہیں کہ دست امید کی اس تک رسائی ممکن نہیں ہے لیکن راقم کی نظر میں یہ آیہ شریفہ ایک علیحدہ خصوصیت رکھتی ہے جو دوسری آیتوں میں نہیں ہے، اور اولیت وآخریت وظاہریت وباطنیت حق، ایسی چیز نہیں ہے جو بیان کی جاسکے یا قلم کو جرأت جسارت ہو۔ لہذا اس کو چھوڑتے ہیں اور قلوب محبین واولیاء کے واگزار کرتے ہیں۔

اور چوتھی آیت ﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾[۵] میں چھ دن کے اندر آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور عرش پر استواء کا ذکر ہے۔ ارباب عقول کی عقلیں اس آیت کی تفسیر میں حیران وسرگردان ہیں۔ ہر شخص نے علم وعرفان میں اپنے مسلک کے اعتبار سے اس کی تفسیر کی ہے۔ چنانچہ علمائے ظاہر کا کہنا ہے "چھ دن میں خلق کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر ظرف زمان سے اس کو ناپا جاتا تو چھ دن کے مطابق ہوتا" اور فیلسوف عظیم الشان جناب ملا صدرا (قدس سرہ) نے "اس کو ایام ربوبیت کے حساب سے چھ دن قرار دیا ہے، جس میں (ہر دن) ایک

ہزار سال کا ہوتا ہے اور نزول آدمؑ سے آفتاب محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طلوع تک کے عرصے کو جو چھ ہزار سال بنتے ہیں، چھ دنوں سے تطبیق کی ہے اور ابتدائے طلوع یوم الجمعہ و یوم اجمع کو قرار دیا ہے جو ساتواں دن اور روز قیامت اور عرش پر خدائے رحمان کے استواء کا پہلا دن ہے"۔ اس کے اجمال کو شرح اصول کافی میں اور تفصیل کو اپنی تفسیر میں بیان فرمایا ہے۔[۱۲]

بعض اہل معرفت نے ایام ستہ کو نزول وصعود کے ۲ تینوں میں وجود کے سورج کی روشنی کی گردش سمجھا ہے۔

بمطابق مسلک عرفانی مراتب نزول وجود تا آخر نزول (کہ) تعینات کے حجابوں میں مرتبہ احتجاب شمس وجود ہے اور وہ حقیقت ﴿لَیۡلَۃُ الۡقَدۡرِ﴾ اور ابتدائے یوم قیامت ہے۔ ملک سے ملکوت کی طرف رجوع کے پہلے مرتبے، ورخرق حجب تعینات سے آخری مراتب ظہور و رجوع تک (مرتبہ) جو ظہور تام قیامت کبریٰ ہے۔ یہ چھ دن جن میں آسمانوں اور زمین کی تخلیق کامل ہوئی اور عرش .لقد و عرش الرحمٰن تک، منتج ہوتی ہے جو استواء، واستیلاء وقہریت حق کی غایۃ الغایات ہیں۔ یہ عالم کبیر میں مراتب شش گانہ صعودی ہیں اور عرش استواء حق جو قہریت تامہ و ملکیت کا ظہور ہے، مرتبہ مشیت وفیض مقدس رحمانی ہے، جس کا ظہور تام رفع تعینات اور تخلیق زمین وآسمان کے بعد ہوا ہے اور جب تک آسمان وزمین موجود ہیں اہل معرفت کے نزدیک بمقتضائے ﴿کُلَّ یَوۡمٍ ہُوَ فِیۡ شَاۡنٍ﴾ [۱۷] ان کی تخلیق تمام نہیں ہوتی ہے ورتجلی میں عدم تکرار کا تقضا ہے اور انسان کبیر و عالم اکبر میں اس کے چھ مراتب اور ساتواں لطیف (مرتبہ) عرش الرحمٰن ہے جو مرتبہ قلب حقیقی ہے۔

اگر طول کا خوف نہ ہوتا تو میں اس وجہ کے تمام وجوہ سے انسب ہونے کی وجہ کو مفصل طرح سے بیان کرتا، اگرچہ کتاب الٰہی کا علم صرف خدا اور مخصوصین خطاب کے پاس ہے، لیکن ہم امکانات اور مناسبتوں کے مطابق بات کرتے ہیں۔ جب ظاہر پر حمل کرنا محال ہوتا ہے (تو اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں ہے)

یہاں پر ایک اور احتمال بھی ہے جو بیان عرفانی کے خلاف بھی نہیں ہے اور وہ احتمال عصر حاضر کی ہیئت کے حساب سے ہے، جس نے ہیئت "بطلیموسی" پر خط بطلان کھینچ دیا اور وہ یہ ہے کہ ہمارے نظام شمسی کے علاوہ دوسرے بہت سے نظام ہائے شمسی موجود ہیں جن کا کوئی شمار نہیں کرسکتا اور اس کی تفصیل کتب ہیئت جدیدہ میں ہے۔ (ہوسکتا ہے) سماوات وارض سے مراد یہی نظام شمسی، اس کے مدار اور اس کے سیارے ہوں لیکن

چھ روز کی حد کا تعین کسی اور نظام شمسی کے اعتبار سے کیا گیا ہو۔ یہ احتمال تمام احتمالات سے ظاہر کے قریب ور احتمالات عرفانیہ کے خلاف بھی نہیں ہے، کیونکہ وہ قرآن کے بعض بطون کے مطابق ہے۔

اور ذیل آیہ شریفہ میں ﴿یعلم ما یلج فی الأرض﴾ کے ارشاد کے ذریعے سلسۂ غیب وشہود نزول وصعود میں مرتب وجود کے جزئیات سے علم خدا کے تعلق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور ﴿ھو معکم﴾ کے ذریعے "معیت قیومیۂ حق" اور جزئیات کے بارے میں حق تعالیٰ کے علم کو جو بطریقہ احاطۂ وجودیہ اور سعۂ قیومیہ ہے، بیان کیا گیا ہے اور حق کی اس قیومیت کی حقیقت کا ادراک اولیاء اللہ کے علاوہ کوئی اور نہیں کرسکتا۔

پانچویں آیہ شریفہ ﴿لہ ملک السموات والأرض والی اللہ ترجع الأمور﴾ ۱۸ یہ اشارہ ہے مالکیت حق کی طرف اور اس بات کی طرف کہ تمام دائرۂ وجود حق کی طرف پلٹتا ہے اور یہ اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ اسم مالک سے متعلق ہے، جیسا کہ سورۂ مبارکہ حمد میں فرمایا ہے: ﴿مالک یوم الدین﴾ لیکن ان میں سے ہر ایک امر کی تفصیل وتفسیر کیلئے دوسرے مقامات ہیں۔

اور چھٹی آیہ شریفہ ﴿یولج اللیل فی النھار ویولج النھار فی اللیل وھو علیم بذات الصدور﴾ ۱۹ شب وروز کے اختلاف کی طرف اشارہ ہے اور یہ کہ ان میں سے جو کم ہوتا ہے وہ دوسرے میں ملا دیا جاتا ہے یا اس کے برعکس، اور اس اختلاف میں بہت سے فوائد ہیں جن کا ذکر ہمارے فریضے سے خارج ہے۔ اس آیہ شریفہ کا ایک دوسرا عرفانی مطلب بھی ہے جس کے بیان سے ہم اجتناب کر رہے ہیں۔

اختتام

حدیث شریف کے ذیل میں جو آیا ہے کہ "جس نے اس کے علاوہ کا قصد کیا وہ ہلاک ہوا" اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان آیات شریفہ میں اور سورۂ مبارکہ توحید میں جو معارف بیان کئے گئے ہیں وہ علوم بشری کی آخری حد اور معارف کی انتہا ہے۔ اگر کوئی یہ خیال کرے کہ اس کے پاس اس سے بلندتر معارف ہیں تو وہ یقیناً غلطی پر ہے اور جس طرح یہ آیات بنی نوع انسان کو حد اعلائے معارف کی تعلیم دے رہی ہیں اسی طرح ان سے قصور بھی سبب ہلاکت اور مقام ربوبیت سے ناواقفیت ہے۔

البتہ یہ حدیث شریف شوق اور ترغیب دلا رہی ہے کہ ان آیات میں تعمق وتفکر کیا جائے لیکن ہر علم

کیلئے اہل ہوتے ہیں اور ہر میدان کیلئے شہسوار۔ البتہ کسی کو یہ خیال کرنا چاہئے کہ توحید کی نشانیوں کو خواہ وہ سورۂ توحید میں ہوں یا ان آیات شریفہ میں یا قرآن کی دیگر آیتوں میں اور اسی طرح ائمہ علیہم السلام کی احادیث شریفہ، ان کے خطبے، دعائیں اور مناجاتیں جو معارف سے بھری پڑی ہیں، ان کو انسان اپنی فکر سے یا ان کے ظہور عرفی سے خود ہی سمجھ لے گا ایسا ہرگز نہیں ہے) یہ تو ایک خام خیالی اور شیطانی وسوسہ ہے، کیونکہ انسانیت کی راہ کے اس ڈاکو (شیطان) نے جال پھیلا رکھا ہے تاکہ جس سے لوگوں کو معارف سے روک سکے اور انسان پر حکمت و معرفت کے دروازے بند کردے اور آدمی کو وادی حیرت و ضلالت میں سرنگوں کردے۔

خدا گواہ ہے ﴿وَكَفىٰ بِهِ شَهِيداً﴾[20] اس بیان سے میرا مقصد فلسفہ رسمیہ یا عرفان رسمی کا بازار چمکانا نہیں ہے، بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ میرے برادران ایمانی خصوصاً اہل علم کچھ معارف اہل بیت اور قرآن کی طرف بھی توجہ کریں اور اس کو طاق نسیان کے حوالے نہ کردیں، کیونکہ بعثت رسل اور نزول کتب کا اہم ترین مقصد، معرفت الٰہی تھا جس کے زیر سایہ تمام دنیاوی و آخروی سعادتیں حاصل ہوتی ہیں، مگر افسوس یہ ہے کہ انسان جب تک اس عالم میں رہتا ہے مختلف قسم کے حجابوں میں گرفتار رہتا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی سعادت کی تشخیص نہیں دے پاتا اور اولیاء و انبیاء جتنی نصیحت کریں اور اس کو بلائیں، انسان نہ خواب غفلت سے بیدار ہوتا ہے اور نہ غفلت کی روئی اپنے کانوں سے نکالتا ہے۔ وہ غفلت کی نیند سے اس وقت بیدار ہوتا ہے جب سرمایۂ حصول سعادت اس کے ہاتھوں سے نکل چکا ہوتا ہے اور سوائے حسرت و ندامت کے کچھ باقی نہیں رہتا۔

دعا و خاتمہ

خدایا! تو نے اپنے اولیاء کے قلوب کو نور محبت سے منور فرمایا، عشاق جمال کی زبان کو "ہم" اور "میں" سے منع کردیا، پست اور خودخواہ لوگوں کے ہاتھوں کو اپنے دامن کبریائی سے کوتاہ کردیا، ہم کو بھی غرور دنیا کی مستی سے ہوشیار کردے، طبیعت کے سنگین خواب سے بیدار اور خودپسندی و خودپرستی کے دبیز اور موٹے پردوں کو اپنے ایک اشارے سے چاک کردے۔ ہم کو اپنی بارگاہ کے پاک لوگوں کی محفل اور خداخواہ

مخلصوں کی مقدس محفل میں (بیٹھنے کی) اجازت دے۔ اس دو صفتی، بدخوئی، سخت گوئی، خود آرائی اور کج نمائی سے نجات دے۔ ہمارے حرکات وسکنات، افعال واعمال، اول وآخر اور ظاہر وباطن کو اخلاص عقیدت عطا فرما۔

بار الہا! تیری نعمتیں ابتدائی (بغیر سوال کے ملتی) ہیں (داد حق کیلئے قابلیت شرط نہیں ہے)! الٰہا! تیری بخششیں غیر متناہی، تیری رحمت اور عطا کے دروازے کھلے ہوئے ہیں، تیری نعمتوں کا وسیع دستر خوان بچھا ہوا ہے، (مجھے) شوریدہ دلی، آشفتہ حالی، داغدار قلب، اشکبار آنکھ، بے قرار سودائی سر اور ہر دم سلگتا ہوا سینہ مرحمت فرما۔ ہمارا انجام اپنے مخلصین کے ساتھ اور اپنی بارگاہ کے خاص بندوں "جو کہ محمد ﷺ اور اہل بیت اطہار علیہم السلام، جو دفتر وجود کا دیباچہ اور غیب وشہود کے طومار کا خاتمہ ہیں" کی عقیدت کے ساتھ کر۔

الحمد للہ اولاً وآخراً وظاہراً وباطناً

یہ کتاب مصنف فقیر کے دست فانی سے

عصر بروز جمعہ ۲ محرم الحرام ۱۳۵۱ھ کو اختتام پذیر ہوئی

وعلی اللہ التکلان فی الافتتاح والاختتام

توضیحات (۴۰)

۱۔ اصول کافی، ج ۱، ص ۹۳، کتاب توحید، باب النہی، حدیث ۳۔

۲۔ شرح اصول کافی، ص ۲۲۶، کتاب توحید، باب النہی، حدیث ۳

۳۔ البرہان فی تفسیر القرآن، ج ۴، ص ۵۲۶۔

۴۔ ''اس کے منور کرنے والے اور ان کی آل پاک پر بہترین سلام ہو''۔

۵۔ شرح اصول کافی، ص ۲۲۸۔

۶۔ توحید صدوق، ص ۹۱، باب ۴، حدیث ۳،

تفسیر برہان، ج ۴، ص ۵۲۵۔

۷۔ اصول کافی، ج ۱، ص ۱۲۴، کتاب التوحید، باب تاویل الصمد، حدیث ۲۔

۸۔ ''زمین و آسمان میں جو بھی ہیں وہ خدا کی تسبیح کرتے ہیں خدا عزیز و حکیم ہے''۔

۹ ''کیا تم نے اس کو بھی نہیں دیکھا کہ جو لوگ آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور بہت سے لوگ خدا کا سجدہ کرتے ہیں''۔ سورۂ حج، آیت ۱۸/۔

۱۰۔ شرح اصول کافی، ص ۲۲۸، کتاب التوحید، باب النہی، حدیث ۳۔

۱۱ ''ایک چیونٹی نے کہا: اے چیونٹیو! تم سب اپنے اپنے بلوں میں چلی جاؤ تاکہ سلیمان اور ان کی فوج تم کو لاعلمی میں روند نہ ڈالے''۔ سورۂ نمل، آیت ۱۸/۔

۱۲۔ ''آسمانوں اور زمین کی بادشاہی خدا کیلئے ہے وہی حیات و موت دیتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

۱۳ ''وہی سب سے پہلے اور سب سے آخر ہے اور (اپنی قدرتوں سے سب پر) ظاہر اور (نگاہوں سے) پوشیدہ ہے اور وہی سب چیزوں کو جانتا ہے''۔ سورۂ حدید، آیت ۳/۔

۱۴۔ ''خدا پاک و منزہ ہے، اس کی شان و مرتبہ کتنی عظیم ہے۔ اس کی قدرت کتنی جلیل ہے اور اس کی قدر کتنی بلند ہے اور اس کی شوکت نا قابل رسائی ہے اور اس کی بارگاہ کتنی سر بلند ہے''۔

۱۵ ''اسی نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا اور پھر عرش پر مستقر ہوا اور وہ ہر اس چیز کو جانتا ہے جو زمین میں داخل ہوتی ہے یا زمین سے خارج ہوتی ہے اور تم جہاں رہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور وہ تمہارے اعمال کو دیکھنے والا ہے''۔ سورۂ حدید، آیت ۴/۔

۱۶۔ شرح اصول کافی، ص۲۴۹ و ۲۵۰۔

تفسیر ملا صدرا، ج۶، ص۱۶۰۔ ۱۹۴، تفسیر سورۂ حدید۔

۱۷۔ "وہ ہر روز (مخلوق کے) ایک نئے کام میں ہے"۔ سورۂ رحمٰن، آیت ۲۹۔

۱۸۔ "آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ای (خدا) کیلئے ہے، وہ تمام امور کی بازگشت اسی کی طرف ہے"۔ سورۂ حدید/۵۔

۱۹۔ "وہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور وہ دلوں کے بھید سے آگاہ ہے" سورۂ حدید/۶

۲۰۔ سورۂ نساء، آیت ۷۹ سے اقتباس۔

۲۱۔ زیرِ نظر کتاب کی حدیث ۲۷، حاشیہ ۱۳ کی طرف رجوع کیجئے

﴿ الفہـــرست ﴾

کلام ناشر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۷

پیش لفظ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۹

پہلی حدیث (جہاد نفس)

مقام اول

فصل ۱ نفس کے مقام اول ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۳

فصل ۲ غور و فکر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۴

فصل ۳ عزم و ارادہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۶

فصل ۴ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۷

فصل ۵: عہد، مراقبہ و احتساب نفس ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۷

فصل ۶: (ذکر و) تذکر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۹

مقام دوئم

فصل ۱: نفس کے باطنی رحمانی و شیطانی لشکروں کی جنگ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۱

فصل ۲ بعض باطنی قوتیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۳

تفصیل ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۳

فصل ۳ انبیاءؑ کی فطری میلانات پر معقول پابندی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۶

فصل ۴ قوت تخیل کی تہذیب ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۷

فصل ۵: موازنے سے متعلق ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۹

فصل ۶: اخلاقی امراض کا علاج ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۶

خاتمہ ۴۹

توضیحات ۵۰

دوسری حدیث (ریاکاری)

ریاکاری اور اس کے درجات ۵۱

ریاکاری کا اظہار چند مقامات پر ہوتا ہے ۵۲

مقام اول

فصل ۱ مذہبی عقائد میں ریاکاری ۵۳

فصل ۲ علم و ایمان کا فرق ۵۴

فصل ۳ ریا کی برائیاں ۵۶

فصل ۴ ریا کی بیخ کنی کا علمی طریقہ ۵۷

فصل ۵ خلوص عمل ۶۰

دوسرا مقام

فصل ۱ .... ۶۳

فصل ۲ .... ۶۵

تیسرا مقام

فصل ۱ .... ۶۶

فصل ۲ ریاکاری کے بارے میں غور و فکر ۶۷

فصل ۳ خلوص کی دعوت ۷۱

فصل ۴ حدیث علوی کا بیان ۷۵

تتمہ ۷۸

توضیحات ۷۹

تیسری حدیث (عجب)

فصل ۱ خودپسندی کے مراتب ۸۵

فصل ۲ اہل فساد کا عجب ۸۷

فصل ۳ شیطان کی مکاریاں ۸۹

فصل ۴: خودپسندی کی برائیاں ۹۰

فصل ۵ عجب کا سرچشمہ حب نفس ہے ۹۵

توضیحات ۳ .... ۱۰۱

چوتھی حدیث (تکبر)

فصل ۱ تکبر کے درجات کا بیان .... [illegible]

فصل ۲: تکبر کا اصلی سبب ۱۰۹

فصل ۳: تکبر سے پیدا ہونے والی برائیاں ۱۱۳

فصل ۴: تکبر کے اسباب و علل ۱۱۸

فصل ۵ تکبر کا علاج ۱۲۴

بیداری انسانیت کی پہلی منزل ۱۲۹

فصل ۶ حسد بھی کبھی غرور کا مبدأ ہوتا ہے ۱۳۰

توضیحات ۴ .... ۱۳۳

پانچویں حدیث (حسد)

اقسام حسد ۱۳۸

فصل ۱ حسد کی بعض اسباب کا ذکر ۱۳۹

فصل ۲ حسد کے کچھ مفاسد ۱۴۰

فصل ۳ خلاقی برائیوں کی جڑ ۱۴۵

فصل ۴ حسد کا عملی علاج ۱۴۷

فصل ۵: حدیث رفع کا ذکر ۱۴۸

توضیحات ۵ .... ۱۵۰

چھٹی حدیث (حب دنیا)

فصل ۱ مذموم دنیا کے بارے میں علامہ مجلسی کا بیان ۱۵۴

فصل ۲ حب دنیا کے زیادہ ہونے کے اسباب ۱۵۶

فصل ۳: دنیاوی لذتوں کی دلوں میں تاثیر اور اس کے مفاسد ۵۸

فصل ۴ .... ۱۶۳

توضیحات ۶ ۱۶۷

ساتویں حدیث (غضب)

فصل ۱: قوۂ غضبیہ کے فوائد ۱۷۰
فصل ۲: غصے میں افراط کی مذمت ۱۷۳
فصل ۳: غصہ بھڑکنے کی صورت میں اس کا علاج ۱۷۶
فصل ۴: غصے کا علاج اور اس کے اسباب کی بیخ کنی کرنا ۱۷۸
توضیحات ۷ ۱۸۲

آٹھویں حدیث (تعصب)

فصل ۱ عصبیت کی برائیاں ۱۸۷
فصل ۲ عصبیت کی ملکوتی صورت ۱۸۹
فصل ۳ اہل علم کا تعصب ۱۹۲
توضیحات ۸ ۱۹۳

نویں حدیث (نفاق)

فصل ۱ نفاق کے مراتب ۱۹۶
فصل ۲ ۱۹۷
فصل ۳ نفاق کا علاج ۱۹۹
فصل ۴ نفاق کی بعض قسموں کا بیان ۲۰۰
توضیحات ۹ ۲۰۵

دسویں حدیث

(خواهشات کی پیروی اور لمبی امیدیں)

پہلا مقام

خواہش نفس کی پیروی کی مذمت

فصل ۱: انسان ابتدائے امر میں حیوان بالفعل ہے ۲۱۰
فصل ۲: خواہش نفس کی پیروی کی مذمت ۲۱۲
فصل ۳ نفسانی خواہشات کی تعداد ۲۱۵

دوسرا مقام

لمبی امیدوں کا بیان

فصل ۱ لمبی امیدیں، آخرت بھولنے کا سبب ۴۱۷
فصل ۲ .... ۴۱۸
توضیحات ۱۰ ۴۲۱

گیارھویں حدیث (فطرت اللہ)

فصل ۱ فطرت کے معنی ۴۲۳
فصل ۲: احکام فطرت کی تشخیص ۴۲۴
فصل ۳: فطری احکام کی طرف اشارہ ۴۲۵

پہلا مقام

وجود خدا فطری ہے ۴۲۶

دوسرا مقام

توحید اور خدا کی دوسری صفت کا فطری ہونا ۴۲۹

تیسرا مقام

معاد کا فطریت سے ہونا ۴۳۰
توضیحات ۱ ۴۳۳

بارھویں حدیث (تفکّر)

فصل ۱ فضیلت تفکّر کا بیان ۴۳۷
تتمیم: خدا کے بارے میں جائز و ناجائز تفکّر ۴۳۸
فصل ۲: مصنوعات میں تفکّر ۴۴۲
فصل ۳ احوال نفس میں تفکّر ۴۴۵
فصل ۴: شب بیداری کی فضیلت ۴۵۰
فصل ۵: تقویٰ کے بارے میں ۴۵۴
فصل ۶ عام تقویٰ کا بیان ۴۵۵
توضیحات ۱۲ ۴۶۰

تیرھویں حدیث (توکل)

فصل ۱: توکل اور اس کے درجات کا بیان ۲۶۹
فصل ۲: توکل اور رضا کا فرق ۲۷۰
فصل ۳ تفویض و توکل اور ثقہ کا فرق ۲۷۰
توضیحات ۳ ۲۷۳

چودھویں حدیث (خوف ورجا)

فصل ۱ عارف انسان کی دو نظریں ہوتی ہیں ۲۷۶
فصل ۲ عبادت خدا سے ممکن (بالذات) کی عاجزی ۲۷۸
فصل ۳ رجا و غرور کا فرق ۲۸۲
فصل ۴ خوف ورجا کے موازنہ کی علت ۲۸۳
توضیحات ۴ ۲۸۷

پندرھویں حدیث (امتحان الٰہی)

فصل امتحان اور اس کے نتیجے کی خدا کی طرف نسبت کی وجہ ۲۹۱
فصل ۲ انبیاءؑ، اوصیاءؑ اور مومنین کے شدید ابتلا کی وجہ ۲۹۳
فصل ۳ ۲۹۸
فصل ۴: دنیا دار ثواب و عقاب نہیں ہے ۳۰۱
فصل ۵ شدید روحانی بلا شدید ادراک کے تابع ہے ۳۰۲
توضیحات ۵ ۳۰۳

سولھویں حدیث (صبر)

فصل ۱ شہوت تمام گرفتاریوں کی جڑ ہے ۳۱۱
فصل ۲ ۳۱۴
فصل ۳ صبر قید نفس سے آزادی کا نتیجہ ہوتا ہے ۳۱۶
فصل ۴ صبر کے نتائج ۳۱۸
فصل ۵. صبر کے درجات ۳۲۲
فصل ۶: اہل معرفت کے درجات صبر ۳۲۳

توضیحات ۱۶ ۳۲۶

سترہویں حدیث (توبہ)

حقیقت توبہ ۳۳۰
فصل ۱ اہم نکتہ ۳۳۱
اہم نکتہ ۳۳۲
فصل ۲ ارکان توبہ ۳۳۳
فصل ۳ شرائط توبہ ۳۳۵
فصل ۴ استغفار کا نتیجہ ۳۴۰
فصل ۵ توبہ نصوح کی تفسیر ۳۴۱
تکمیل تمام موجودات علم وحیات رکھتے ہیں ۳۴۲
توضیحات ۱۷ ۳۴۳

اٹھارہویں حدیث (ذکر)

خدا کی قیومی کا احاطہ ۳۴۶
فصل ۱ ۳۴۸
فصل ۲ تفکر وتذکر کی منزل کا فرق ۳۴۹
فصل ۳ ذکر تمام مملکت وجود میں سرایت کرتا ہے ۳۵۰
فصل ۴ ذکر خدا کی فضیلت میں چند احادیث ۳۵۲
توضیحات ۱۸ ۳۵۵

انیسویں حدیث (غیبت)

فصل ۱ غیبت کی تعریف ۳۵۹
فصل ۲ ۳۶۱
فصل ۳ غیبت کے معاشرتی نقصانات ۳۶۷
فصل ۴ اس ہلاکت خیز برائی کا علاج ۳۷۰
فصل ۵ جائز مقامات پر بھی ترک غیبت اولیٰ ہے ۳۷۲
فصل ۶ غیبت سننا حرام ہے ۳۷۴

تتمیم کلام شہید ثانیؒ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۷۶
توضیحات ۱۹ ۳۷۹

بیسویں حدیث (اخلاص)

فصل ۱ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۸۳
خدا کی طرف جہلا کو منسوب کرنے کی توجیہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۸۳
فصل ۲ خشیت و نیت صادق، صحت عمل کے باعث ہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۸۵
فصل ۳ اخلاص کی تعریف ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۸۹
فصل ۴ عمل کے بعد کا اخلاص ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۹۰
توضیحات ۲۰ ۳۹۵

اکیسویں حدیث (شکر)

فصل آیت کی عرفانی توجیہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۰۲
فصل ۲ شکر کی حقیقت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۰۳
فصل ۳ کیفیت شکر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۰۶
تکملہ احادیث میں شکر کی فضیلت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۰۹
تتمیم ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۱۱
فصل ۴ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۱۲
توضیحات ۲۱ ۴۱۵

بائیسویں حدیث (موت)

فصل ۱ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۲۲
فصل ۲ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۲۵
توضیحات ۲۲ ۴۲۸

تیئسویں حدیث (طالبان علم)

فصل ۱ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۳۶
فصل ۲ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۳۹
فصل ۳ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۳

فصل۴ ۔۔۔۔۔۔ ۳۴۵

توضیحات۲۳ ۳۴۷

چوبیسویں حدیث (علوم)

فصل۱ ۔۔۔۔۔۔ ۳۵۰

فصل۲ ۔۔۔۔۔۔ ۳۵۵

فصل۳ ۔۔۔۔۔۔ ۳۵۷

فصل۴ ۔۔۔۔۔۔ ۳۶۰

فصل۵ ۔۔۔۔۔۔ ۳۶۱

توضیحات۲۴ ۳۶۳

پچیسویں حدیث (وسوسہ)

فصل۱ ۔۔۔۔۔۔ ۳۶۷

فصل۲ ۔۔۔۔۔۔ ۳۷۳

توضیحات۲۵ ۳۷۶

چھبیسویں حدیث (طالبعلم)

فصل۱ ۔۔۔۔۔۔ ۳۸۰

اہم نکتہ ۔۔۔۔۔۔ ۳۸۱

فصل۲: فرشتے طالب علموں کیلئے اپنے پر بچھاتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ ۳۸۲

فصل۳ تمام آسمان وزمین کے باشندے طالبعلم کیلئے استغفار کرتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ ۳۸۵

فصل۴ جس طرح چاندکوتمام ستاروں پرفضیلت ہےاسی طرح عالم کوعابد پرفضیلت ہے ۔۔۔۔۔۔ ۳۸۷

فصل۵: علماانبیاءؑ کے وارث ہیں ۔۔۔۔۔۔ ۳۸۹

توضیحات۲۶ ۳۹۱

ستائیسویں حدیث (عبادت)

فصل۱ ۔۔۔۔۔۔ ۳۹۳

فصل۲ ۔۔۔۔۔۔ ۵۰۱

فصل۳ ۔۔۔۔۔۔ ۵۰۵

فصل ۲۔ عبادت کیلئے فراغت غنائے قلب کا سبب ہوتا ہے ۵۱۲

نکتہ ۵۱۵

توضیحات ۲۷ ۵۱۷

اٹھائیسویں حدیث (لقاء اللہ)

فصل ۱۔ لقاء اللہ اور اس کی کیفیت ۵۲۳

فصل ۲ مرتے وقت بعض غیبی حالات کا انکشاف ممکن ہے ۵۲۹

فصل ۳ حب و بغض خدا کا مطلب ۵۳۵

توضیحات ۲۸ ۵۳۷

انتیسویں حدیث (نیک خصلتیں)

مقدمہ ۵۴۱

فصل ۱۔ جھوٹ کے مفاسد ۵۴۳

فصل ۲۔ تقویٰ کی حقیقت اور اس کے مرتبے ۵۴۶

تتمہ: خیانت کے مفاسد اور امانت کی حقیقت ۵۴۸

خداوند عالم کی بعض امانتوں کی طرف اشارہ ۵۵۲

فصل ۳۔ خوف خدا ۵۵۴

حضور حق کے سلسلے میں لوگوں کا اختلاف ۵۵۵

فضیلت گریہ ۵۵۶

چھوٹے عمل پر بڑا ثواب بعید نہیں ہے ۵۵۷

فصل ۴۔ نوافل کی تحدید ۵۵۹

ہر ماہ تین روزے کا استحباب ۵۶۱

صدقے کی فضیلت ۵۶۲

دوسرے نکتہ کا بیان ۵۶۴

صدقے کا ایک راز ۵۶۵

تتمہ ۵۶۶

خاتمہ ۵۶۶

نماز شب کی فضیلت ---------- ۵۶۷

صلاۃ وسطیٰ کا بیان ---------- ۵۶۸

فصل ۵: تلاوت قرآن کی فضیلت ---------- ۵۷۰

جوانی میں عبادت زیادہ مؤثر ہوتی ہے ---------- ۵۷۳

قراءت کے آداب ---------- ۵۷۳

قراءت میں اخلاص ---------- ۵۷۵

ترتیل کا مطلب ---------- ۵۷۸

فصل ۶: نماز میں رفع یدین اور تقلیب ---------- ۵۷۹

رفع یدین کا راز ---------- ۵۸۰

شیطان کی مکاری کے بارے میں تنبیہ ---------- ۵۸۲

فصل ۷: مسواک کی فضیلت ---------- ۵۸۳

فصل ۸: اخلاق حسنہ و رذیلہ کے بارے میں رسول اکرمؐ کی وصیت ---------- ۵۸۴

توضیحات ۲۹ ۵۹۰

تیسویں حدیث (قلوب اربعہ)

مقدمہ: اصلاح قلب کی ترغیب ---------- ۶۰۵

فصل ۱: تقسیم قلوب کا مبنا کیا ہے؟ ---------- ۶۰۶

قلوب کی وجہ حصر ---------- ۶۰۷

فصل ۲: حالات قلوب کا بیان ---------- ۶۰۸

قلب مؤمن کے ازہر ہونے کا بیان ---------- ۶۰۸

مؤمن صراط مستقیم پر ہے ---------- ۶۰۹

شیطان کی بعض مکاریاں ---------- ۶۱۰

تتمہ: قلب منافق، اس کے اور مؤمن کے قلب کا فرق ---------- ۶۱۲

اختتام: حق سے غفلت، دل کے الٹے ہونے سے ہوتی ہے ---------- ۶۱۳

توضیحات ۳۰ ۶۱۵

اکتیسویں حدیث (عدم توصیف حق)

فصل ۱: عدم توصیف حق کا کیا مطلب ہے؟ ---- ۶۱۹

اسماء وصفات کی حقیقت کا علم ناممکن ہے ---- ۶۲۲

فصل ۲: انبیاءؑ واولیا کی روحانی حقیقت کا علم، قدامت فکر سے حاصل نہیں ہوتا ---- ۶۲۳

فصل ۳ ---- ۶۲۵

فصل ۴: رسول خداؐ کو "تفویض امر" کا مطلب ---- ۶۲۶

تفویض کے معنی کی طرف اشارہ ---- ۶۲۹

فصل ۵: مقامات ائمہؑ ---- ۶۳۰

حقیقت عصمت کا بیان ---- ۶۳۲

فصل ۶: ایمان کی توصیف نہیں ہو سکتی ---- ۶۳۳

توضیحات ۳۱ ---- ۶۳۵

بتیسویں حدیث (رضا وسخط)

فصل ۱ ---- ۶۳۸

رزق کا مقدر ہونا اور زیادتی رزق کی دعا ---- ۶۳۹

فصل ۲: صحیح یقین کی علامتیں ---- ۶۴۰

لوگوں کے دو طبقے ہیں ---- ۶۴۱

فصل ۳: اشاعرہ، معتزلہ اور مذہب حقہ کے اقوال ---- ۶۴۳

فصل ۴ ---- ۶۴۴

توضیحات ۳۲ ---- ۶۴۶

تینتیسویں حدیث (عمل خیر)

فصل ۱: جو روایات فعل عبادت و ترک معاصی پر ابھارتی ہیں

اور بظاہر اس کے خلاف روایات کے درمیان، جمع کی صورت ---- ۶۴۸

فصل ۲: محبت اہل بیتؑ قبولیت اعمال کی شرط ---- ۶۵۶

توضیحات ۳۳ ---- ۶۵۹

چونتیسویں حدیث (حال مؤمن)

فصل ۱: خدا کی طرف تردد کی نسبت کی توجیہات ۶۶۵

عرفانی توجیہ ۶۶۶

تتمہ: اس حدیث کی دوسری توجیہ ۶۶۸

فصل ۲: مؤمنین کی اصلاح غربت وامارت کے ذریعے ۶۶۹

فصل ۳: واجبات ونوافل کا سبب تقرب ہونا

اور اہل ذوق وسلوک کی روش کے اعتبار سے ان کے نتائج ۶۷۰

نبوت میں انبیاءؑ کے اختلاف کا راز ۶۷۳

فصل ۴: شیخ بہائیؒ کا قول ۶۷۴

قول محقق طوسیؒ ۶۷۵

کلام علامہ مجلسیؒ ۶۷۵

تتمہ ۶۷۵

توضیحات ۳۴ .... ۶۷۷

پنتیسویں حدیث (مشیت الٰہی)

فصل ۱: اسمائے خدا کے دو مقامات ۶۸۲

فصل ۲: جبر وتفویض کی طرف اشارہ ۶۸۳

فصل ۳: خدا سے سوال نہ ہوگا، مخلوقات سے سوال کیا جائے گا ۶۸۵

توضیحات ۳۵ .... ۶۸۸

چھتیسویں حدیث (صفات حق)

فصل ۱: ذات کے ساتھ صفات حق کی عینیت ۶۹۰

اوصاف حق کی تقسیم کے سلسلے میں حکماء کا بیان ۶۹۲

ذات مقدس کے ساتھ اوصاف کی عینیت کا تحقیقی جائزہ ۶۹۳

فصل ۲: تخلیق سے قبل علم کی ماہیت کا بیان ۶۹۳

فصل ۳: حق تعالیٰ کے سمیع وبصیر ہونے کے معنی ۶۹۷

فصل ۴: معلومات کے ساتھ علم حق تعالیٰ کے تعلق کی کیفیت ۷۰۰

فصل ۵: صفات ثبوتیہ وسلبیہ کا معیار ——— ۷۰۱
توضیحات ۳۶ ۷۰۵

سینتیسویں حدیث (معرفت حق)

فصل ۱: ﴿اعرفوا اللہ باللہ﴾ کا مطلب ——— ۷۰۹
ایک گمان کا ازالہ ——— ۷۱۳
توضیحات ۳۷ ۷۱۵

اڑتیسویں حدیث (خلقت آدمؑ)

فصل ۱: آدمؑ مظہر تام واسم اعظم الٰہی ہیں ——— ۷۲۰
توضیحات ۳۸ ۷۲۴

انتالیسویں حدیث (خلقت خیر وشر)

تحقیق خیر وشر ——— ۷۲۹
فصل ۱: خیر وشر، متعلق ایجاد اور قضائے الٰہی میں وقوع شر کی کیفیت ——— ۷۳۱
فصل ۲: خیر وشر کا بندوں کے ذریعے اجرا کی کیفیت ——— ۷۳۳
جبری مسلک کا بطلان ——— ۷۳۴
توضیحات ۳۹ ۷۳۷

چالیسویں حدیث (توحید)

فصل ۱: سورۂ توحید کی تفسیر کی طرف اشارہ ——— ۷۴۰
بسم اللہ کی طرف اشارہ ——— ۷۴۱
فصل ۲: سورۂ حدید کی پہلی آیات کی اجمالی تفسیر ——— ۷۴۴
اختتام ——— ۷۵۰
دعا و خاتمہ ——— ۷۵۱
توضیحات ۴۰ ۷۵۳

﴿والحمد للہ علی کل حال﴾